DUE DATE

Cl. No. [illegible] ACC. No. 147038

Late Fine Rs. 1-00 per day for first 15 days
Rs. 2-00 per day after 15 days of the due date

محکمۂ تعلیمات کراچی ۔ پشاور ۔ کوئٹہ ۔ راولپنڈی
آئی ٹی وی ۔ آرمی ایجوکیشن اور ایئر ہیڈ کوارٹر سے منظور شدہ

جاری شدہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۴۵ء
ٹیلیفون نمبر ۔ ۷۷۶۵۵۶۱

افکار

سردار جعفری نمبر

: مدیر :

صہبا لکھنوی

: نمائندہ اعزازی :

راشد نور

قیمت سردار جعفری نمبر
۱۰۰ سو روپے

زیرِ اہتمام افکار فاؤنڈیشن کراچی

۱۰۵/ سی نیشنل آٹو پلازہ ۔ مارسٹن روڈ ۔ کراچی ۔ ۷۴۴۰۰

1941 1991

50 Golden Years...

and now looking ahead

گولڈن جوبلی سال

۱۹۴۱ - ۱۹۹۱

حبیب بینک قائداعظم کی نیک خواہشات اور اپنے بہتر خدمت کے جذبے کے ساتھ ۱۹۴۱ء میں قائم ہوا۔ سال بہ سال ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا اور بینکاری میں قیادت حاصل کی۔ چنانچہ آج حبیب بینک دنیا بھر میں پاکستان کے اولیں بینک کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔

الحمدللہ! اب ہم ۱۸۳۸ اندرونِ ملک اور ۶۶ بیرونِ ملک، آف شور بینکنگ یونٹس، نمائندہ دفاتر، مشترکہ کاروبار، ملحقہ اور ذیلی اداروں، مینیجنگ ایجنسیوں اور غیر ممالک میں ۱۸۰۰ نمائندوں کے ذریعے عالمی سطح پر بینکاری کی مختلف النوع خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ہم نے موجودہ ترقی پسند حکومت کی قابلِ عمل پالیسیوں سے متاثر ہوکر قومی مقاصد کے حصول کے لئے کاروبار، تجارت، صنعت اور زراعت کے شعبوں میں اعلیٰ خدمات انجام دینے کا عزمِ نو کیا ہے۔

ملک کی اقتصادی ترقی میں سرِفہرست

حبیب بینک لمیٹڈ

جعفری نمبر

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا (اقبال)

ترتیب

سرِ ورق : زہ بی

مہمان مدیر

حالاتِ زندگی

افکارِ تازہ

جعفری البم

روبرو

شخصیت کے خدوخال

انتخابِ کلام

تنقیدی جائزے

چند منتخب تحریریں

پیغامات۔ تاثرات

نذرانے

سال: ۴۷ — نومبر دسمبر ۱۹۹۱ء — شمارہ: ۲۶۰-۲۶۱

علی سردار جعفری۔ دار و رسن سے کوچۂ دلدار تک

ماہنامہ فنکار نے بالآخر علی سردار جعفری نمبر کا معرکہ بھی سر کر لیا۔

جب ادارہ فنکار نے آج سے سال قبل اردو کے اس اہم اور ہمہ جہت انقلابی شاعر پر خصوصی نمبر پیش کرنے کا اعلان کیا تھا تو فنکار اور علی سردار جعفری کے درمیان کافی فاصلے کے باعث درپیش آسکنے والی مشکلات کا صحیح تو پورا اندازہ لگایا جا سکتا تھا اور پھر فنکار کی یہ روایت بھی ثابت ہوئی کہ ایک چیلنج تھی کہ اندازہ رہے۔ اب تک جتنی اہم ادبی شخصیات پر خاص نمبر نکلے ہیں وہ پاکستان میں زندہ دوستی کی روایت کے ساتھ ساتھ ہم عصری ادب کی تفہیم میں بھی تاریخی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ہر نمبر اپنی جگہ ایک اہم ادبی واقعہ اور مستقبل کے محققین کے لیے ایک اہم وسیلہ ثابت ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ علی سردار جعفری نمبر بھی ہماری سابقہ خصوصی اشاعتوں کی طرح ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوگا۔ انشاءاللہ



علی سردار جعفری کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی ادبی تاریخ میں علی سردار جعفری نے ایک نقطۂ نظر کی حد تک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ بسا اوقات علی سردار جعفری کے مواقف ترقی پسند تحریک کے رہبر اصول و نظریات سمجھے گئے ہیں اور آج بھی جب علی سردار جعفری اپنی عمر کے ۸۰ ویں سال میں داخل ہو چکے ہیں ان کی شاعری اپنے ارد گرد کے حالات کے بارے میں ایک حساس شاعر کا طاقتور اور مؤثر ردِعمل نظر آتی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی قابل ذکر سماجی، معاشی اور سیاسی صورت حال ہو جس کے بارے میں ترقی پسند حسیت نے سوچا سمجھا ردِعمل پیش نہ کیا ہو۔ اس حقیقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ علی سردار جعفری وقت گزراں کی سماجی، سیاسی اور معاشی حقیقتوں کے ردِعمل میں کسی نہ کسی انداز میں جمالیاتی پیکر تراشنے میں قائدانہ کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

ناسپاسی ہوگی اگر افکار جدید اردو شاعری کے سب سے معمّر

اور فعال فن کار کی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار نمبر پیش کرنے میں کوتاہی برتتا۔ ماہنامہ افکار نے اب تک جوشؔ، حفیظؔ، فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، نذر اختر حسین رائے پوری اور نذر زوبلی کی شکل میں ادب اور فنون لطیفہ کی منتخب روزگار شخصیات کی خدمات کے اعتراف میں تاریخی اشاعتیں پیش کی ہیں۔ علی سردار جعفری نمبر کافی تاخیر سے پیش کیا گیا ہے لیکن یہ نمبر بالآخر تاریخ اردو ادب کے حوالے کیا جا رہا ہے اور ہم نے بساط بھر اسے حسن و معیار کی دیرینہ روایت کا آئینہ دار بنانے کی سعی و کاوش کی ہے۔

علی سردار جعفری صرف شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ایک انشا پرداز، خطیب، صحافی، محقق اور دستاویزی فلموں کے کامیاب فلم ساز اور ہدایت کار بھی ہیں، وہ اردو دنیا کے معدودے چند اہم اقبال شناسوں میں ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے قومی شاعر کے صد سالہ جشن پیدائش کے سلسلے میں نہایت والہانہ انداز میں ہندوستان کے دانشوروں اور صوبائی و مرکزی حکومتوں کی توجہ مبذول کروائی اور وہ اپنے مشن میں کامیاب و کامران رہے۔ ان کی مساعی اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر نے علی سردار جعفری کی ادبی خدمات کے سلسلے میں اور جد و جہد آزادی کے لیے ان کی مساعی کے اعتراف میں ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری دیتے ہوئے علی سردار جعفری کی ہمہ جہتی کی جانب جس بلیغ انداز میں اعتراف کیا تھا (یہ اعتراف نامہ اس نمبر میں شامل ہے) وہ فرزندانِ علی گڑھ کے لیے لائقِ صد افتخار ہے۔ علی سردار جعفری نمبر سات سال کے عرصے پر محیط کاوشوں کا نچوڑ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا ہمیں محسوس ہوتا رہا کہ علی سردار جعفری کے بارے میں خاصا مواد بہم ہو سکتا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ حاصل شدہ مواد کا بہترین حصہ آپ کی تحویل میں آجائے۔ دیکھیے ہمیں کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

علی سردار جعفری سوویت انقلاب کے وقت چار سال کے تھے انھوں نے سوویت روس کی جوانی اور کہولت بھی دیکھی اور اپنے مانوس نظریات پر قائم مملکتی ڈھانچے کو زمین بوس ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس سلسلے میں ان کی تازہ ترین نظم "الوداع"، ایک کامیاب توجہ بھی ہے اور حقیقت پسندانہ احساس کا خوب صورت جمالیاتی پیکر بھی۔ ایک طرح سے سردار جعفری کی شعری کائنات، "نئی دنیا کو سلام" اور "الوداع" مختلف سیاسی کیفیات کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ سردار جعفری نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز افسانہ نگار کی حیثیت سے کیا تھا۔ پھر وہ شاعری کی طرف آگئے اور شاعری سے تنقید، کلاسیکی ادب کے بارے میں تحقیق اور تدقیق اور اردو و ہندی کے کلاسیکی شعرا کے منتخب کلام کی تدوین (مع تشریحات) کے مراحل سے گزرتے ہوئے دستاویزی فلموں کی ہدایت کاری کے مختلف النوع میدانوں میں قدم رکھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ جس میدان میں بھی اترے وہ میدان ان کے ہاتھ رہا۔

علی سردار جعفری آج جس موڑ پہ کھڑے ہیں وہ بہت اہم ہے۔ جو نظریہ اپنے اصل منشا سے یکسر مختلف صورت اختیار کر چکا ہو اور زیادہ سے زیادہ جمہوریت دینے کے بجائے سراسر ظلم اور گھٹن کا موجب بن چکا ہو اس کی عملی صورت کا دفاع ناممکن ہو جاتا ہے۔ علی سردار جعفری جیسے نظریاتی ادیب نے اس حقیقت کا اعتراف کر کے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے، لیکن وہ اپنے خوابوں سے منحرف ہونے والے نہیں ہیں اور وہ اس لیے

کہ شمال شمال ہے اور جنوب جنوب۔ ہمارے منطقے میں نوآبادیاتی دور کا استحصالی گورکھ دھندا ابھی تک موجود ہے اور ہمارے یہاں یہ استحصالی ڈھانچہ ناکام ہوا ہے۔ زیادہ منصفانہ اور جمہوری معاشرے کے خواب دیکھنے والے ابھی تک عادتاً خواب دیکھ رہے ہیں اور آپ لاچار انسانیت سے ان کے خواب نہیں چھین سکتے۔ البتہ ایسے حالات ضرور پیدا کیے جا سکتے ہیں جن سے ایک بہتر زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ عادلانہ سماج کی تشکیل کی جا سکے

سردار جعفری ہمارے دور کے خوابوں کے اہم صورت گر ہیں۔ ان کی شاعری روز بروز نکھر رہی ہے۔ اس شاعری کی اوائلی کھردراہٹ اب اطلس و کمخواب کی سی ملائمیت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ سردار جعفری کی جذباتیت تعقل میں اور ان کا جلال جمال میں ڈھلتا رہا ہے انتہائی فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ۔ سردار جعفری کے ایک شعری مجموعے کا نام بھی "ایک خواب اور" ہے اور آج وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ قسمت کے ابلیس اعظم سے نبردآزمائی کے لیے درکار حوصلہ اور جرأت کا خواب۔

ہم ان کی شاعری کے گراف پر نظر دوڑاتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک خواب ٹوٹتا ہے تو دوسرا خواب سامنے آجاتا ہے جب ایک رندِ خانہ کا جام شکستگی کے عذاب سے دوچار ہوتا ہے تو ایک نیا جام اس کے سامنے آجاتا ہے، خزاں کے بعد بہار کے موسم کی آمد کے مانند۔ زندگی پیہم رواں دواں ہے۔ زندگی ایک زندہ رود ہے جو مرت اصفہان کے نزدیک نہیں بہتی "جاوید نامہ" میں اقبال کا روپ نہیں دھارتی بلکہ ہم سب زندگی کی علامتیں ہیں۔ ہم گزشتگان کا خواب ہیں اور آیندگان ہمارے خواب کا روپ دھارتے نظر آئیں گے اور یوں تاریخ کا چکر اپنا وظیفہ ادا کرتا رہے گا۔ تاریخ کا ہر چکر انسانی زندگی کے تضادات کم سے کم تر کرتا ہوا چلتا ہے۔ اقبال نے اس حقیقت کو تسلیم کیا تھا۔ وہ مغربیت اور جدیدیت میں فرق روا رکھتے تھے اس لیے "تشکیلِ جدید" میں اصولِ حرکت یعنی اجتہاد کو سب سے بڑا محرک اور اجتہاد جدید علوم کی تحصیل کے بغیر لایعنی۔ اس طرح اجتہاد اور جدید علوم لازم و ملزوم ٹھہرتے ہیں اور جدید علوم کے بارے میں۔ اور جدید علوم کے تعین میں کسی قسم کا اشکال ممکن نہیں ہے۔ جدید علوم کی تحصیل کے لیے، مستقبل کے لیے خود کو تیار کرنے والے طالبانِ علم کی قطاریں جن ممالک کے سفارت خانوں کے سامنے لگی ہوئی ہیں وہ قطاریں اور ان قطاروں کی منزلیں جدید علوم کے فانوسوں کی روشنی سے منور ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک نوآبادیاتی دور کا ذہن نوآبادیاتی نظام اور جدید علوم کے مابین مفاہمت تلاش کرنے کے درپے ہے جبکہ یہ زمانہ آزاد ذہن کے ذریعے جدید علوم کی تحصیل کے لیے ذہنی تحفظات کی نفی کا دور ہے۔ علی سردار جعفری کی شاعری کا رویہ علوم کی جدید روشنی کے استقبال کا رویہ ہے۔ جس طرح انھوں نے ہیئت کے میدان میں نظمِ آزاد کو کامیابی کے ساتھ اپنایا اور اسے اپنے نظریاتی مخالفین کا محبوب ذریعۂ اظہار سمجھ کر رد نہیں کیا بالکل اسی طرح وہ جدید علوم کے ذریعے حاصل شدہ رازہائے کائنات کو انسان شناسی کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ یہی وہ سائنسی فکر ہے جو علی سردار جعفری کے یہاں انیس، اقبال اور جوش کی قدرتِ کلام کے ساتھ مل کر ایک ایسی شعری کیمیا تخلیق کرتی ہے جو روایتی زبان کے ساتھ لاتعلقی اور تنافر کے بجائے شیفتگی پیدا کرتی ہے۔ علی سردار جعفری کی شاعری محاکات اور تلازمات کے ہجوم میں بھی ابلاغ ہی ابلاغ ہے۔

اگر علی سردار جعفری کے قارئین افکار کے علی سردار جعفری نمبر سے مہمیز پاکر علی سردار جعفری کی شعری دنیا کے سفر پر روانہ ہونے کا فیصلہ کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ نظریاتی تصادم کے عروج کے دور میں ان کی فکر کے حامیوں اور مخالفین نے

جس آسانی کے ساتھ "اپنا" اور "غیر" سمجھا تھا وہ فیصلے خالص جذباتی نوعیت کے تھے۔ علی سردار جعفری کی شاعری سب سے پہلے ایک خاص مکتب نگارش یعنی ادعائیت (DIDACTIC) کی ہے۔ ملٹن کی شاعری بھی اسی نوع کی تھی، لیکن اس کے باوجود اسے عظیم شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ (T.S. ELIOT) نے ملٹن کو چاہے اچھا شاعر نہ مانا ہو لیکن عظیم شاعر تو بہر طور تسلیم کیا ہے۔ خود ہمارے نظیر، چکبست، اقبال اور جوش کی شاعری پر ادعائی عنصر غالب رہا ہے۔ پھر آج سردار جعفری کی ادعائی شاعری سے کیونکر اغماض برتا جا سکتا ہے اور خاص کر ایک ایسے دور میں جب ان کی شاعری میں موسیقی نزول نہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ سردار جعفری کی ادعائیت پر انگلیاں اٹھانے والے نقاد اور تبصرہ نگار حضرات گزشتہ دس برس کے سردار جعفری کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعے سے اس خوشگوار نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کے سیاسی نظریے میں لچک کی وجہ سے سردار جعفری کے یہاں شعری اوزاروں کے استعمال میں بھی لچک پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ غیر منطقی تمثالوں سے بھی شغف رکھتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ شاعری آخری تجزیے میں سائنس یا ریاضی کا نعم البدل نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی فن کار کی آزادی پرواز کی آئینہ دار رہی ہے۔

علی سردار جعفری کی اہمیت کا راز یہی ہے کہ وہ شاعری کے کوزہ گر کے ہاتھوں میں نرم مٹی ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ تخلیقی شاعر ہیں، لیکن ایک فرق کے ساتھ۔ وہ اپنی فکری طہارت پر اصرار کرتے ہیں اور وہ اس لیے کہ یہی وہ "آواز دوست" ہے جو خشک چوب بانسری کا نغمہ بھی ہے اور رنگ بھی۔

علی سردار جعفری عرصہ دراز تک جس نظریے کے وکیل اور مؤید رہے ہیں اس کا زمانی و مکانی حوالہ بہت اہم ہے۔ درست ہے کہ تمام اشیا اور تیار شدہ مصنوعات کی طرح نظریات بھی اب کھلی منڈی میں ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کرتے نظر آتے ہیں۔ کیا ایسا پہلی بار ہو رہا ہے؟ اپنے محبوب نظریے کے مخالفین کو اختلاف رائے کا حق دے کر اور سیاسی قوت کے حصول کے لیے یکساں جمہوری مواقع فراہم کر کے ہی اگلا قدم اٹھایا جا سکتا ہے۔ ادب میں بھی جمہوری کلچر کے فروغ کی ضرورت ہے اور ہمیں اپنے معروف کی تخلیقات کا مطالعہ اس دردمندی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ آخر اس شاعر یا ادیب کی تحریروں میں وہ کون سا عنصر ہے جو ہمارے تعصبات کی عینکوں کی نذر ہو گیا۔ ہمیں اپنے فیصلوں پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ یہ عمل وقتے وقتے کے ساتھ دہرانا چاہیے تاکہ ادبی ماحول زیادہ صاف زیادہ پاکیزہ اور زیادہ پرتپاک بنایا جا سکے۔ نومبر اردو کے اس بہت اہم شاعر کا ماہ پیدائش ہے اور اسی ماہ اس خصوصی پیشکش کے پس پشت یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ ہم اپنے اور اپنے قارئین کی جانب سے علی سردار جعفری کو سالگرہ کا یہ تحفہ پیش کر سکیں۔

علی سردار جعفری کی شاعری خود ایک بڑا تحفہ ہے اور اس شاعری کے خالق کے لیے ہمارا تحفہ گراں بہا نہ سہی، لیکن زندہ دوستی کی ایک بڑی روایت کی، جو ہمارے جریدے کے ساتھ بطور خاص مخصوص ہے۔ اہم کڑی ضرور ہے۔

سات آٹھ سال کی سعی و کاوش کے دوران جن رفیقوں نے اس خاص نمبر کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایا ان میں حسن عابدی، حمایت علی شاعر، اشفاق حسین، نکہت بریلوی اور راشد نور بطور خاص دلی شکریے کے مستحق ہیں۔ ان بے شمار اہل قلم رفیقوں کے ساتھ جن کی نگارشات اس خاص نمبر کی زینت ہیں۔

علی سردار جعفری کی سالگرہ پر پرتپاک تالیاں اور دلی مبارکباد۔

محمد علی صدیقی
(مہمان مدیر)

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی • صہبا لکھنوی

علی سردار جعفری

زندگی، شخصیت اور فن کا مستند جائزہ

ؔ نومبر میرا گہوارہ ہے یہ میرا مہینہ ہے

خاندانی نام: علی سردار جعفری
خاندان: سادات جعفری
وطن: بلرام پور (ضلع گونڈہ)
تاریخ پیدائش: ۲۹، نومبر ۱۹۱۳ء۔ بمقام بلرام پور

اب و جد

والد کا نام: سید جعفر طیار جعفری
والدہ کا نام: زاہدہ خاتون جعفری
دادا کا نام: سید مہدی حسن جعفری

بہن بھائی

سات بہنیں بالترتیب۔ زبیدہ خاتون، جعفری خاتون، فخر النساء، صادقہ خاتون، قمر النساء، رباب بانو اور شہر بانو۔ دو آخر الذکر بہنیں حیات ہیں۔ بڑے بھائی ظفر عباس

تعلیم

• بی اے۔ دہلی یونیورسٹی • مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۳۶ء میں انگریزوں کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے جرم میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکلنا پڑا)، • ایم۔ اے سال لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ (۱۹۳۹-۴۰ء میں اپنی شاعری میں مخالف جنگ پروپیگنڈا کرنے پر انہیں فائنل کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا گیا اور گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور جیل سے رہائی پر بلرام پور میں نظر بند رہے۔

اساتذہ

سردار جعفری نے جن ممتاز اساتذہ سے فیض اٹھایا ان میں سے چند یہ ہیں: پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد اشرف، خواجہ منظور حسین، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر سعد حامد وغیرہ

شادی

۱۹۴۸ء میں سلطانہ منہاج سے بمبئی میں شادی ہوئی۔

اولاد

دو بیٹے اور ایک بیٹی

پسندیدہ رنگ

سرخ، سبز، نیلا۔

زبانوں سے واقفیت

اردو، فارسی، انگریزی

ملازمت، صحافت، ادارت

ملازمت کہیں نہیں کی • "نیا ادب" لکھنؤ کے مدیر رہے • "قومی جنگ" بمبئی کی مجلس ادارت کے رکن رہے • "گفتگو" بمبئی کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ • ہندوستانی بک ٹرسٹ کے مدیر اور "کتاب نما" دہلی کے مہمان مدیر رہے۔

اعزازات وانعامات

• سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۶۵ء • پدم شری ۱۹۶۷ء • جواہر لال نہرو فیلوشپ ۱۹۶۹ء • سجاد ظہیر ایوارڈ لکھنؤ ۱۹۷۳ء • اتر پردیش اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۶ء • اقبال میڈل پاکستان ۱۹۷۷ء • آندھرا پردیش اکیڈمی ایوارڈ ۱۹۷۹ء • مخدوم ایوارڈ۔ اردو اکیڈمی حیدرآباد ۱۹۸۰ء • میر تقی میر ایوارڈ۔ اردو اکیڈمی بھوپال ۱۹۸۲ء • کمارن آسن ایوارڈ۔ ملیالم ۱۹۸۳ء • ہند سوویت دوستی میڈل ۱۹۸۴ء • ڈی۔لٹ۔ اعزازی سند مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۸۶ء (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اب تک صرف چار شاعروں کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، مسز سروجنی نائیڈو، جگر مرادآبادی اور علی سردار جعفری شامل ہیں)

پہلا شعر

یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلا شعر کب، کہاں اور کس عمر میں کہا۔ لیکن پہلا شعر جو یاد ہے۔ وہ یہ ہے

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

رکنیت

• رکن سینٹ بمبئی یونیورسٹی بمبئی (دو بار) • وزٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی جموں • جنرل سکریٹری آل انڈیا اقبال صدی کمیٹی • صدر انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) • رکن نیشنل بک ٹرسٹ • اعزازی پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو اور ٹی وی • صدر فلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی • نائب صدر، مہاراشٹر اردو اکیڈمی • اردو کے فروغ کے لیے گجرال کمیٹی کی سفارشات کو بروئے عمل لانے کے لیے مرکزی حکومت نے جو کمیٹی بنائی تھی اس کے صدر رہ چکے ہیں۔ اس کمیٹی میں راج بہادر گوڑ، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر محمد حسن، کنور مہندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، آنند سروپ، کشمیری لال ذاکر۔

امرتا پریتم، ڈاکٹر ممتاز احمد، رام لعل، پروفیسر نامور سنگھ، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر شکیل الرحمٰن اور یکے۔ کے کھنہ چیئرمین اراکین شامل تھے۔ کمیٹی اپنی رپورٹ پیش کرچکی ہے۔

• کمیونسٹ پارٹی • کانگریس • انجمن ترقی پسند مصنفین۔

مشاہیر عالم سے ملاقاتیں

ٹیگور، سروجنی نائیڈو، جواہر لال نہرو، پابلو نرودا، ناظم حکمت۔ جولیو کیوری، ایلیا اہرن برگ، پال رابسن، لوئی آراگاں، فدیئف، زسون تا، فرزشیدوف، یوری گگارین، ناظم حکمت، شیخ محمد عبداللہ، اماست تکرچیتی، پنڈت روی شنکر، استاد اللہ رکھا، طبلہ نواز، پنڈت اوم کار ناتھ ٹھاکر (موسیقی)، ایم۔ ایف حسین (مصور) جیمنی رائے (پنٹر)، ستیہ جیت رے، یوسف خاں، عرف دلیپ کمار، پرتھوی راج کپور، راج کپور، نرگس وغیرہ

فلم۔ ڈاکومینٹری فلمیں

• پھر یوں ہوا، سنت کبیر (کہانی اور مکالمے) • ڈاکٹر محمد اقبال (کہانی اور مکالمے) • ہندوستان ہمارا (کہانی اور مکالمے) • جدوجہد آزادی کے سو سال۔ انگریزی (کہانی اور مکالمے تین حصوں میں)

ٹی۔ وی

• پرواز (جشن آزادی) (پانچ سال) • آج تک۔ اٹھارہ ایپی سوڈ پر مشتمل ایک ٹی۔ وی سیریل • "کہکشاں" سیریل بنا رہے ہیں جس میں مولانا حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، اسرارالحق مجاز پر EPISODE شامل ہیں۔ اس کی موسیقی مشہور غزل گائیک جگجیت سنگھ نے دی ہے۔

پہلا مرثیہ

۱۹۲۸ء کے آس پاس سترہ سال کی عمر میں لکھا۔ پہلا بند یہ ہے

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے
ہاتھوں میں جام سرخ شہادت لیے ہوئے
لب پر دعائے بخشش امت لیے ہوئے
اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

سیر وسیاحت

پاکستان، عراق، خلیجی ممالک، قطر، یمن (شمالی وجنوبی)، لبنان، مصر، یونان، فرانس، ڈنمارک، سویڈن، ناروے، انگلستان، امریکہ، کینیڈا، جرمنی، چیکوسلاواکیہ، بلغاریہ، سوویت یونین، تاجکستان، ازبکستان، روس، سائبیریا، جارجیا، آذربائیجان وغیرہ۔

حلقۂ یاراں

ڈاکٹر ملک راج آنند، پنڈت سمترا نندن پنت، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مجاز، سبط حسن، جذبی، سجاد ظہیر، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ڈاکٹر عبدالعلیم، وامق جونپوری

تحریکات یا سیاسی جماعتیں

جن میں نمایاں حصہ لیا۔

حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی
اختر الایمان، آل احمد سرور، مجروح سلطانپوری، سعادت حسن منٹو
احمد لدھیانوی، ن ۔ م ۔ راشد، سکندر علی وجد، رہبر انگاہ، ماجد علی
حمید اختر، عبدالرحمن بغتانی، صادقین، داجعفری، ماجد و سرور
صدیق مستور، اسمٰعیل خان، حسن عابدی، شوکت صدیقی، قتیل شفائی
ابراہیم جلیس، قرۃ العین حیدر، احتشام حسین، رام لعل، گوپی چند نارنگ
شمس الرحمٰن فاروقی، عابد علی خاں، سید انتظار ضیا، صبا لکھنوی
بیدار رخشت، شوقا، عزیز مُتون حسن خاں، حکیم نا کلا آزاد ر
اشفاق حسین، محمد علی صدیقی، اختر سعید خاں، احمد فراز، زاہدہ
زیدی، ساجدہ زیدی، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس اور بیشمار
نام ۔ اس میں عہد اور رتبے کے لحاظ سے کوئی ترتیب نہیں ۔ اگر
کوئی نام رہ گیا ہو تو اس کے لیے دلی معذرت

نام کا مسجع

والد کے ایک دوست نے کہا ع
بہ فیض احمد مرسلؐ ہوئے علی سردار
حافظ کے ایک قصیدے میں نام کا مسجع اس طرح ہے ع
علی امام و علی سرور و علی سردار
(یہ نام اس سے پہلے کہیں نہیں سنا گیا)
بچپن کی ایک رباعی ۔

نور نظر احمد مختار ہوئے ہیں
قلب و جگر حیدر کرار ہوئے ہیں
ہیں فتح و ظفر قوت بازو سردار
یعنی پسر جعفر طیار ہوئے ہیں

قید و بند

پہلی بار سردار جعفری
۲ دسمبر ۱۹۴۰ء کو لکھنؤ میں گرفتار
ہوئے اور لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل اور
بنارس سنٹرل جیل میں قید رہے (تقریباً آٹھ ماہ) دوسری بار
۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو بمبئی میں گرفتار کیے گئے۔ بھیمڑی کانفرنس
بمبئی کے وزیر اعلیٰ مرار جی ڈیسائی نے پابندی عائد کردی تھی اور
کانفرنس کی مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے سردار جعفری کو
گرفتار کرکے آرتھر روڈ جیل میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے باوجود
بھیمڑی کانفرنس منعقد ہوئی اور چار روز جاری رہی۔ تقریباً
دو سو مندوبین کے قیام و طعام کے سارے انتظامات عصمت
چغتائی، شاہد لطیف اور کیفی اعظمی وغیرہ نے کیے ۔ اس کی تفصیلی
روداد ماہنامہ انکار بھوپال نے بھیمڑی کانفرنس نمبر میں شائع کی ہے
تیسری گرفتاری ۱۹ اپریل ۱۹۴۹ء کو عمل میں آئی اور سردار جعفری
آرتھر روڈ جیل بمبئی اور سنٹرل جیل ناسک میں مقید رہے ۔
(تقریباً پندرہ ماہ بلا جواز) رہائی جولائی ۱۹۵۰ء میں ملی جب کہ رت

پہلا مشاعرہ

اٹاوہ میں پڑھا ۱۹۳۳ء اور بطور نذرانہ
صرف پچیس روپے ملے ۔

روشنی اور آواز کے اسکرپٹ

(SOUND AND LIGHT)

سردار جعفری نے روشنی اور آواز کے جو اسکرپٹ اب تک تیار کیے ہیں ان میں ● لال قلعہ دہلی ۱۹۶۵ء بے حد مقبول ہے اور آج تک مسلسل جاری ہے اس کے علاوہ انھوں نے ● شالیمار باغ سری نگر کشمیر ۱۹۶۸ء ● سابرمتی آشرم احمد آباد ۱۹۶۹ء اور ● تین مورتی ہاؤس (جواہر لال نہرو کی قیامگاہ) ۱۹۷۰ء میں تیار کیے۔ یہ پروگرام بھی اپنی انفرادیت کی بنا پر ہر حلقے میں پسند کیے گئے۔

تصانیف و تالیفات

مطبوعہ کتابیں: (۱) منزل (افسانے) ۱۹۳۶ء (۲) پرواز (نظمیں) ۱۹۴۳ء (۳) کس کا خون ہے (امن نامہ) ۱۹۴۳ء (۴) پیکار (ڈرامے) ۱۹۴۳ء (۵) نئی دنیا کو سلام (طویل تمثیلی نظم) ۱۹۴۷ء (۶) خون کی لکیر (نظمیں) ۱۹۴۹ء (۷) امن کا ستارہ (طویل نظمیں) ۱۹۵۰ء (۸) ایشیا جاگ اٹھا (طویل نظم)

۱۹۵۰ء (۹) ترقی پسند ادب (نثر) ۱۹۵۳ء (۱۰) پتھر کی دیوار (نظمیں) ۱۹۵۳ء (۱۱) لکھنؤ کی پانچ راتیں (نثر) ۱۹۶۲ء (۱۲) ایک خواب اور (نظمیں) ۱۹۶۵ء (۱۳) پیراہن شرر (نظمیں) ۱۹۶۵ء (۱۴) پیغمبرانِ سخن (کبیر، میر، غالب) ۱۹۷۰ء (۱۵) اقبال شناسی (نثر) ۱۹۷۷ء (۱۶) لہو پکارتا ہے (نظمیں) ۱۹۷۸ء (۱۷) انگریزی زبان میں قرۃ العین حیدر کے ساتھ GHALIB AND HIS POETRY ۱۹۶۹ء (۱۸) ترقی پسند ادب کی نصف صدی (۱۹) نظامِ اردو خطبات (دہلی یونیورسٹی)

مضامین: ادب، ثقافت اور سیاست پر اردو اور انگریزی میں تین سو سے زائد مضامین۔

تدوین و ترتیب: (۱) دیوانِ غالب (۲) دیوانِ میر (۳) کبیر بانی (۴) پریم وانی

تراجم: سردار جعفری کی منتخب نظموں کا روسی، ازبک اور فارسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ بعض نظمیں انگریزی، فرانسیسی، عربی اور متعدد ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ ایک طویل نظم "امن کا ستارہ" بارہ ہندوستانی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ایک طویل ڈرامائی نظم "نئی دنیا کو سلام" کو چودہ زبانوں میں ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اب تک سات ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔

مستقل پتا: عنبر، سیتا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی

علی سردار جعفری ۲۹ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کی جامعات میں تعلیم حاصل کی۔ اوائلِ زندگی ہی میں وہ مارکسی اور کمیونسٹ رہنماؤں کے حلقے میں داخل ہو گئے اور جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں رکھی گئی تو وہ سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور ڈاکٹر محمود الظفر کے ساتھ بانیوں میں سے ایک ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں وہ جنگ کے خلاف نظمیں لکھنے کی پاداش میں گرفتار کیے گئے اور قید و بند کے مراحل سے گزرے۔ رہائی کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "قومی جنگ" کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ وہ مجلہ "نیا ادب" کے بھی بانی اور مدیر تھے۔ اس مجلے کی ادارت میں مجاز اور سبط حسن ان کے ساتھ تھے۔ جب ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے تو جعفری نے بڑی مؤثر شاعری تخلیق کی۔ ان کی نظم "خون کی لکیر" نے بہت شہرت پائی۔ وہ ۱۹۴۹ء میں بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کر لیے گئے۔ انھوں نے اس عرصے میں "پتھر کی دیوار" تخلیق کی۔

پہلی نثری تصنیف

منزل۔ افسانوں کا مجموعہ ۔ ۱۹۳۸ء

پہلی شعری تصنیف

پرواز۔ نظموں کا مجموعہ ۔ ۱۹۴۳ء

علی سردار جعفری کی شاعری کے اب تک دس مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان مجموعوں میں ہمارے عوام کی کشمکشِ زیست اور ملک کی عکاسی ہوتی ہے اور علاوہ ازیں انسانیت کی ابدی امنگوں کی ناقابلِ فراموش الفاظ میں عکاسی بھی۔

وہ نت نئے اسالیبِ شاعری کے خصوصیت کے ساتھ نظمِ آزاد کے مجدد رہے ہیں۔ انھیں خاص طور پر الفاظ کے نت نئے مفاہیم کی ادائیگی پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے ان کی شاعری کے مجموعے "نئی دنیا کو سلام" چودہ ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کی متعدد نظمیں بیرونی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔

جعفری اردو کے ایک اہم نقاد بھی ہیں۔ اس شعبے میں

دو تاریخ ساز تقریبات

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جانب سے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری کا رسمی اعلان

جنابِ چانسلر صاحب

مجھے بڑی مسرت ہے کہ میں اب آپ کی خدمت میں ہندوستان کے مشہور شاعر اور ترقی پسند ادیب جناب علی سردار جعفری کو پیش کر رہا ہوں

اردو زبان کی حد تک چار تصانیف اور انگریزی زبان میں ایک تصنیف شائع ہو چکی ہے۔ میر، غالب، اقبال اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں ان کے خیالات بہت اہم اور سارنع تسلیم کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کبیر، میر اور غالب پر تفصیلی مطالعے اردو اور ناگری رسم الخط میں بیک وقت شائع کر کے ان شعراء کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔

جعفری نے "سرمایۂ سخن" کا بھی اجرا کیا جس نے اردو ادب کی بڑی خدمت کی۔ ان کی دلچسپیاں صرف تخلیق ادب اور صحافت تک محدود نہیں ہیں۔ انھوں نے کبیر، اقبال اور جنگ آزادی کے موضوعات پر دستاویزی فلمیں بھی تیار کی ہیں۔

علی سردار جعفری نے عالمی امن کے کاز کے لیے اور اقوام عالم میں باہمی آشتی اور دوستی کے لیے جرأت رندانہ کے ساتھ کام کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان اور دیگر ممالک کے مابین تعلقات کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

جعفری نے اب تک متعدد قومی اور بین الاقوامی انعام حاصل کیے ہیں جو ان کے کمالات کا محض جزوی اعتراف ہیں۔ انھوں نے اردو اور ملک کے لیے لافانی خدمات انجام دی ہیں۔ آج جب کہ انجمن ترقی پسند مصنفین اپنی پچاسویں سالگرہ منا رہی ہے یہ امر بطور خاص موزوں و مناسب ہے کہ ہماری جامعہ اپنے بہت معروف بیٹوں میں سے ایک بیٹے کی خدمات کا اعتراف کرے۔ اسی وجہ سے جناب چانسلر کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ از راہ کرم علی سردار جعفری کو ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگری عطا فرمائیں۔

اقبال اعزاز کے لیے جیوری کی رپورٹ

محکمۂ ثقافت مدھیہ پردیش (بھوپال) کے ذریعے قائم کردہ اقبال اعزاز کی جوری کی نشست بتاریخ ۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء بھوپال میں منعقد ہوئی جس میں ۱۹۸۶ء کا پہلا اقبال سمان تجویز کرنے کے معاملے پر غور کیا گیا۔ نشست میں درج ذیل ممبران نے شرکت فرمائی

(۱) جناب خواجہ احمد عباس (۲) پروفیسر گیان چند جین
(۳) پروفیسر قمر رئیس (۴) جناب شمس الرحمٰن فاروقی

اراکین جیوری نے اس بات پر غور کیا کہ یہ اعزاز طویل اور قابل قدر تخلیقی کارناموں کے اعتراف کے لیے ہے۔ اقبال سمان کے شرائط کی رو سے یہ سمان ایسے ادیب کو دیا جانا چاہیے جو اس وقت بھی ادب کے میدان میں سرگرم عمل ہو اور اس کا پورا کارنامہ جیوری کے پیش نظر ہونا چاہیے۔

جیوری کے سامنے جو کاغذات پیش کیے گئے ان کی رو سے حکومت مدھیہ پردیش کے محکمۂ ثقافت نے ۳۹۶ ادیبوں، شاعروں، ناقدوں اور دانشوروں سے سفارشات منگوائی تھیں ۱۱۲ حضرات نے ۸۵ نام تجویز کیے۔

جیوری نے ان تمام سفارشات کا مفصل جائزہ لیا اور اقبال سمان کے رہنما اصولوں کو پوری طرح دھیان میں رکھتے ہوئے کافی غور و خوض اور بحث کے بعد متفقہ فیصلہ کیا کہ ۱۹۸۶ء کا اقبال سمان جناب علی سردار جعفری کو دیا جائے۔ اراکین جیوری نے شاعر اور تخلیقی فن کار کی حیثیت سے سردار جعفری کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور کہا کہ جدید اردو شاعری میں سردار جعفری انتہائی منفرد اور معتبر مرتبے کے مالک ہیں۔ سردار جعفری نے کلاسیکی نظم و ضبط اور شائستگی کے ساتھ ساتھ جدید اسالیب اظہار و بیان کو بڑی خوبی سے اپناتے ہوئے آج کی دنیا خاص کر تیسری دنیا کے انسان کی آواز کو اپنی آواز میں سمو لیا ہے۔ ان کی شاعری اور فکر دونوں نے گزشتہ چالیس سال کے عرصے میں اردو ادب پر نمایاں اثر ڈالا اور آج بھی اردو ادب کے منظر نامے میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

دستخط — گیان چند — خواجہ احمد عباس
قمر رئیس — شمس الرحمٰن فاروقی

افکارِ تازہ

جعفری نمبر

سردار جعفری

آبلہ پا

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

(غالب)

سائے میں درختوں کے
بیٹھے ہوئے اِن تو
ہے وقت کا رہنما تو
کس دیس سے آئے ہو
کس دیس کو جانا ہے
اے سوختہ سامانو

یہ وسعتِ میدان ہے
یا درد کا صحرا ہے
اک دھوپ کا جنگل ہے
یا پیاس کا دریا ہے
دریا کے پرے کنارے
پتھر ہے کہ چشمہ ہے

نغمہ ہے کہ نالہ ہے
شبنم ہے کہ شعلہ ہے
شاید کوئی ساحر ہے
مجبور ہے سعدی کا
دروازے پہ جیا ہے

افسانہ تماشا ہے

(۲)

ہے رات گزاری یوں ہی
تاروں کا سفر جاری
اور ہے دل بیابانی
سرمست و غزل خواں ہے
ہر ذرے کے سینے میں
اک شمع فروزاں ہے
ہر خار رم نیزے
خوابوں کا گلستاں ہے

(۳)

اے عشق جنوں پیشہ
رستہ سمت یوں چلنا ہے

ڈوبا ہے جہانِ سوز نہ
نکلا ہے جہانِ سوز نہ

وہاں نہ ریت کے ٹیلے پر
یا ناقۂ سیلیٰ ہے
یا محمل سلمیٰ ہے

(۴)

صد قافلے نیستی ہے
صد قافلہ پیدا ہے
آوازِ جرس لیکن
اس دشت میں تنہا ہے

صدیوں سے اسی صورت
ہے قائم سفر جاری
زمانے ستم جاری
اعلانِ کرم جاری

(۵)

پھولوں کے کٹوروں میں
شبنم کی گلابی ہے

اور باد سحر گاہی
بد مست شرابی ہے

کل صبح کے دامن میں
تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

بس ریت کے سینے پر
کچھ نقش قدم ہوں گے

سائے میں درختوں کے
پھر لوگ بہم ہوں گے

کس دیس سے آئے ہو
کس دیس کو جانا ہے

اے وقت کے رہنماؤ
اے شمع تمنا پر
جلتے ہوئے پروانو
اے سوختہ سامانو

[illegible]

سردار جعفری

غزل

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں حسن کی آیات کے بعد

اے وطن، خاکِ وطن، وہ بھی تجھے دے دیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد

نارِ نمرود یہی اور یہی گلزارِ خلیل
کوئی آتش نہیں آتش کدۂ ذات کے بعد

رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی امیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد؟

ہم کو معلوم ہے وعدوں کی حقیقت کیا ہے
پرسشِ سنگِ ستم جامِ مدارات کے بعد

تشنگی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی سردار
بڑھ گئی کوثر و تسنیم کی سوغات کے بعد

سردار جعفری

غزل

یہ بیکس و بیقرار چہرے
صلیب پر ہیں سوگوار چہرے

مٹی میں ہیرے دمک رہے ہیں
ہیروں کی طرح ہزار چہرے

لے جا کے ہم انہیں کہاں سجائیں
یہ بھوک کے شاہکار چہرے

افریقہ و ایشیا کی زینت
یہ نادر روزگار چہرے

ماضی کے کھنڈر کس طرح دلکش
یہ شعلہ سر شرار چہرے

کھوئی ہوئی عظمتوں کے وارث
کمال رفتہ کے یادگار چہرے

ہمارے سفید سے رنگین
اس دور کے داغدار چہرے
پھیکے ہیں قدرتی رنگ کا وصف
کہ بندہ ہیں خاکسار چہرے
گزر رہے ہیں نگاہ و دل سے ہو کر
ہر طرح کے بے شمار چہرے
مغرور انا کے گھونسلوں میں
بیٹھے ہوئے کم عیار چہرے
نہ قابل التفات آنکھیں
نہ قابل اعتبار چہرے
شہرت کے سائبانِ آسمان پر
چھٹتے ہوئے انار چہرے
پل بھر میں دھواں دھواں مگر سب
پل بھر میں فقط غبار چہرے
سونے کا چڑھا ہوا ہے پانی
پیتل کے یہ شاندار چہرے

پہنچے ہیں تو اب یار رسائی
مہتاب ہم سر رہ گزار چہرے

ان سب کے گرد جو ہیں تیر بیں
رنداں کے ہر اک نگار چہرے

جیتے ہوئے نیزے کی دستاں پر
وہ شبنم نو کی اجالے چہرے

چپکے چپکے سلگ رہے ہیں
آتش کدۂ بہار چہرے

شعلوں کے مزاج آشنا ہیں
سرتاب سے بے شرار چہرے

امید کی شمع سے فروزاں
کشتۂ انتظار چہرے

سردار جعفری

اشعار

ہوسِ دل ہے کہ رقصِ مہ و سال اور ابھی
لطفِ معشوقۂ خورشید جمال اور ابھی

در ابھی بند نہ ہو شوق پہ میخانے کا
جامِ جم اور ابھی جام سفال اور ابھی

اک غزل اور کسی دشمنِ جاں کی خاطر
وہی آتشکدۂ ہجر و وصال اور ابھی

بس بکھرنے ہی کو ہے درد کے شعلے کا جمال
چشمِ مظلوم میں تھوڑا سا جلال اور ابھی

O

سردار جعفری

کربلا

(ایک رجز)

پھر العطش کی ہے صدا
جیسے رجز کا زمزمہ
پھر ریگِ صحرا پر رواں
ہے اہلِ دل کا کارواں
نہرِ فرات آتش بجاں
راوی و گنگا خوں چکاں
کوئی یزیدِ وقت ہو
یا شمر ہو یا حرملہ
اس کو خبر ہو یا نہ ہو
روزِ حساب آنے کو ہے
نزدیک ہے روزِ جزا
اے کربلا اے کربلا

(۲)

گونگی نہیں ہے یہ زمیں
گونگا نہیں ہے آسماں
گونگے نہیں حرف و بیاں
گونگی اگر ہے مصلحت
زخموں کو ملتی ہے زباں
وہ خوں جو رزقِ خاک تھا
تابندہ ہے پائندہ ہے
معصوم لبوں کی تشنگی سے ہی
انسان اب بھی زندہ ہے
زندہ ہے اعجازِ خیال
ہر ذرّہ پامال میں
دل کے دھڑکنے کی صدا
اے کربلا اے کربلا

(۳)

دشمن رعونت کے خدا
ارض ستم کے دیوتا
یہ ٹین اور لوہے کے بُت
یہ سیم و زر کے کبریا
بارود ہے جن کی نوا
راکٹ کی ہے جن کی صدا
طوفانِ غم سے بے خبر
یہ بے سواد و کم ہنر
نکلے ہیں لے کر اسلحہ
لیکن جل اٹھا ریزہا
ریگِ نواحِ کاظمہ
ایک نواحِ نینوا
آندھی ہے مشرق کی ہوا
شعلہ فلسطیں کی فضا
اے کربلا اے کربلا

(۴)

یہ مدرسے دانش کدے
علم و ہنر کے میکدے
ان میں کہاں سے آ گئے
یہ نرگسوں کے گھو نسلے
[illegible] کی پرچھائیاں
بیسی ہوں انگڑائیاں
[illegible] ان پہ یقیں
[illegible] دفتر کے امیں
انقلاب کے خوابِ سرا
ان کے تصرف میں نہیں
خونِ بہارِ زندگی
ان کے تصرف میں نہیں
خونِ حیاتِ جاوداں
برہم ہے ان سے رنگِ گل
آزردہ ہے بادِ صبا
اے کربلا اے کربلا

(۵)

لیکن یہی دانش کدے
ہیں عشق کے آتش کدے
ہیں حسن کے تابش کدے
پلتے ہیں جن کی گود میں
نے کرانو کھا بانکپن
عصرِ رواں کے کوہکن
میرے جوانانِ چمن
بلبل نوا، شاہیں ادا
اے کربلا اے کربلا

(۶)

اے غم کے فرزندو اٹھو
اے آرزومندو اٹھو
زلفوں کی گلیوں میں رواں
دل کی نسیمِ جانفزا
ہونٹوں کی کلیوں میں جواں
بوئے گل و بوئے وفا
آنکھوں میں تاروں کی چمک
ماتھوں پہ سورج کی دمک
دل میں جمالِ شامِ غم
رخ پہ جلالِ بے نوا
گونجی ہوئی زیرِ قدم
تاریخ کی آوازِ پا
شمشیر ہیں دستِ دعا
اے کربلا اے کربلا

(۷)

پیاسوں نے آ گے [illegible]
آئیں [illegible]
آسودگانِ جام [illegible]
سب صاحبان [illegible]
کھل جائے [illegible]
جھک جائے تیغ [illegible]
پیش سفیر [illegible]
رخشندہ [illegible]
تابندہ ہے [illegible]
سردار کے [illegible]
خون [illegible]
[illegible]

نومبر — میرا گہوارہ

(منظوم خود نوشت سوانح ۔ جزائی ترتیب حصہ ۔ ۲

یعنی غلطیاں

۱۔ کھولی آنکھیں میری دیکھ ملک رہو یہ نقشہ دیکھو
۲۔ اقرا
۳۔ قدرت کی فیاضیاں
۵۔ دیکھا سر پہ پرنس کا ... پھر سال اپنا
۶۔ ... ناخواندہ
۷۔ صحیفۂ کائنات
۸۔ حرف بد
۹۔ حسد
۱۰۔ قاتل کی شکست

نومبر، میرا گہوارہ

(آپ بیتی اور جگ بیتی، منظوم سوانح عمری)

۱۔ رقصِ تخلیق

جب کہیں پھول مہکتے
جب کوئی طفل سرِ راہ ملے
رات کی شاخِ سیہ رنگ پہ جب چاند کھلے
دل یہ کہتا ہے حسیں ہے دنیا
پھول، کلیوں ہی میں، سبھی ماہ جبیں ہے دنیا
دستِ صیاد بھی ہے بازوئے جلاد بھی ہے
رقصِ تخلیق جہان گزراں جاری ہے

۲۔ کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

نومبر میرا گہوارہ ہے یہ میرا مہینہ ہے
اسی ماہِ منور میں
مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
مرے تارِ نفس میں جنبشِ بادِ صبا آئی
مشامِ روح میں
مٹی کی خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی
لہو نے گیت گایا
شمعِ ہستی جگمگا اٹھی
یہ لمحہ میلادِ آدم تھا

سردار جعفری

میں ستّر سال پہلے اس تماشا گاہِ عالم میں
اک آفاقی کھلونا تھا
ہوا کے ہاتھ سہلاتے تھے میرے نرم بالوں کو
مری آنکھوں میں راتیں نیند کا کاجل لگاتی تھیں
سحر کی پہلی کرنیں چومتی تھیں میری پلکوں کو
مجھے چاند اور تارے مسکرا کر دیکھتے تھے
موسموں کی گردشیں جھولا جھلاتی تھیں
بھری برسات میں بارش کے چھینٹے
گرمیوں میں لو کے جھونکے
مجھ سے ملنے ایسے آئے
وہ کہتے تھے ہمارے ساتھ آؤ
چل کر کھیلیں باغ و صحرا میں
مری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو
مری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا

وہ چہرہ کیا تھا
سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا
وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوب صورت
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا

جو اپنے دل کے خوابوں، پیار کی کرنوں سے روشن تھا

وہ پاکیزہ، مقدس سینۂ زرّیں
وہ اس میں دودھ کی نہریں
وہ موج کوثر و تسنیم تھیں
یا شہد و شبنم تھیں
انھیں کی چند بوندیں آج اعجاز سخن بن کر
انھیں کی چند بوندیں سحر حرف و جادوئے لفظ و بیاں بن کر
مرے ہونٹوں سے خوشبوئے زباں بن کر
سر لوح و قلم آتی ہیں تو شمشیر کی صورت چمکتی ہیں
حسینوں کے لیے وہ غازۂ رخسار و عارض ہیں
کھنکتی چوڑیوں، بجتی ہوئی پائل کو اک آہنگ دیتی ہیں
زمین کی گردشوں تاریخ کی آواز پا میں ڈھلتی جاتی ہیں

جو اب میری زباں ہے
مرے بچپن میں وہ میری ماں کی لوری تھی
یہ لوری اک امانت ہے
مرا ہر شعر اب اس کی حفاظت کی ضمانت ہے

۳۔ اقراء — علم الانسان بالقلم

مرا پہلا سبق اقرا
ہے تحسین قلم جس میں
ہے تکریم قلم جس میں
قلم تحریک ربانی

قلم تخلیق انسانی
قلم تہذیب روحانی
قلم میں شاخ طوبیٰ بھی ہے انگشت حنائی بھی
مرے ہاتھوں میں آ کر رقص کرتی ہے
ہزاروں دائروں میں چاند اور سورج کی نوائیں
درخشاں علم اور حکمت کی قندیلیں
ہلال نو کا سینہ ماہ کامل کا خزینہ ہے

مری انگلی نے پہلا خاک کے سینے پہ حرف آرزو لکھا
پھر اس کے بعد تختی پر قلم کا نقش تابندہ
قلم انگشت انسانی کا جلوہ ہے
عروج آدم خاکی کا دلکش استعارہ ہے

۴۔ فطرت کی فیاضیاں

مجھے سورج نے پالا
چاند کی کرنوں نے نہلایا
ہر اک شے مجھ سے تھی مانوس
مجھ سے بات کرتی تھی
درختوں کی زباں
چڑیوں کے نغمے میں سمجھتا تھا
ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں
میں اُن کے ساتھ اُڑتا تھا
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
میں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا

ارشد عزمی

اندھیرا کانپتا تھا بجلیوں کے تازیانوں سے
میں اس پر مسکراتا تھا
مگر جیسے بادلوں سے دوستی تھی
خاک پر چلتے ہوئے کیڑوں پہ بے حد پیار آتا تھا
ہر اک شے جیسے میری ذات تھی میری حقیقت تھی
انا الحق کی صداقت تھی
ہرے نیلے سنہری سرخ انڈے
آشیانوں میں پرندوں کے
وہ سب میرے کھلونے تھے
میں آفاقی کھلونا تھا
میں خود فطرت تھا فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں
مسیں بھیگیں رگ و پے میں جنوں کا بانکپن آیا
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چمن آیا
ہر اک شمشاد پیکر لے کے فردوس بدن آیا

جدھر دیکھو اُدھر برنائیاں ہیں
جدھر دیکھو ادھر رعنائیاں ہیں
شفق کے رنگ میں بھیگی ہوئی پرچھائیاں ہیں

مرے لغزیدہ لغزیدہ قلم نے
ایک رنگیں اور خوشبو دار کاغذ پر
بڑی مشکل سے رُکتے رُکتے حرفِ عشق لکھا
اور کسی کی بارگاہِ حسن میں بھیجا

دیا کی شمع جل اٹھی حریم دلربائی میں
گھمایا سر جھکا کر دیر تک کنگن کلائی میں

۵۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

کہاں سے آئی ہو
کون ہو تم
نہ گل نہ خوشبو
مگر تمہارا وجود خود روحِ گلستاں ہے
وہ کائنات سرور جس کا
خود اپنا سورج ہے چاند اپنا
میں کائناتِ سرور میں سانس لے رہا ہوں
شکنتلا ہے یہاں نہ ہیلن
نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ ہے
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن گیا ہے
کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے دلبری میں
کوئی نہیں مجھ سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں
ہر ایک سے تم حسین تر ہو
ہر ایک سے میں عظیم تر ہوں

تمہارے ہونٹوں کے خم میں جو لفظ بن رہے ہیں
وہ میرے سینے میں پھول کی طرح کھل رہے ہیں
تمہاری "ہاں" اک گلاب ہے تازہ و شگفتہ

کہ جس سے ایوانِ جاں معطر
"نہیں" یہ ننھی سی اک کلی ہے
جو زندگی کی نازک سی شاخ میں سو رہی ہے
خوابِ بہار بن کر
یہ خواب تعبیرِ گلستاں کا منتظر ہے
تمہارے دلکش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے
تمہاری آنکھوں سے جھانکتا ہے
تمہاری سانسوں میں کانپتا ہے
مجھے "نہیں" کی کلی عطا ہو
کہ جس سے "ہاں" کا گلاب مہکے

تمہارے شہرِ جمال میں
میرے دل کا کاسہ
بھٹک رہا ہے

تم اپنے ہونٹوں کا شہد
آنکھوں کے پھول
ہاتھوں کے چاند دے دو
یہ مفلسی کی سیاہ راتیں وجود پر طنز کر رہی ہیں

زمین کا رنگ تم زمیں کا جمال تم ہو
زمیں کی دولت
زمیں کی بیٹی
تم اپسراؤں سے اور حوروں سے پاک تر ہو

کہ وہ تصور کے آسمانوں کی پُتلیاں ہیں
تمام وہم و گماں کے پیکر
مگر تم اس خاک کی چمک ہو
کہ جس کی نس نس میں
سیب، انگور اور گیہوں کی فصلوں کا خوں رواں دواں ہے
سحر کا سورج تمہارے ماتھے کو چومتا ہے
یہ تتلیوں کی شبنم کی روشنی ہے

ہوائیں جو میری رازداں ہیں
وہ میرے ہونٹوں سے لفظ لے کر
تمہارے کانوں کی سیپیوں میں
گہر کے مانند ڈالتی ہیں
میں مسکراتا ہوں
تم بھی ہنستی ہو
اور دونوں
نئی تمناؤں کے جزیروں میں گھومتے ہیں
نہ کوئی محکوم ہے نہ حاکم
نہ کوئی قانون ہے نہ سختی
بس ایک زنجیرِ زلف، شمشیرِ دلربائی

۶۔ ورقِ ناخواندہ

میں ایک ورق ہوں
لکھا ہے کس نے
پڑھا ہے کس نے

ہر اک درخت اک قلم ہے ہر شاخ اک قلم ہے
سمندر [illegible]
زمیں پہ بکھری چاندنی کی روشنائی
فضا کے سیال نیلگوں سے
ہواؤں کے ہاتھ لکھ رہے ہیں
ستاروں کا نور لکھ رہا ہے
زمیں کا رقص لکھ رہا ہے
زمیں کی پشت سے نکلتا گلابی سورج
سنہری کرنوں سے لکھ رہا ہے
گزرتے لمحات اپنے تیروں سے لکھ رہے ہیں
گزرتی تاریخ اپنے نیزوں سے لکھ رہی ہے
تمام احباب لکھ رہے ہیں
تمام اغیار لکھ رہے ہیں
حریفوں کے خنجروں پہ خوں ہے
سیاست مکر وفن کی تلوار لکھ رہی ہے
مہکتے زخموں کے پھول الفاظ بن گئے ہیں
تبسّم لطف یار کا حرف حرف ہے غنچۂ شگفتہ
حسد کے خاروں کی نوک میں جنبش قلم ہے
زبانِ دشنام لکھ رہی ہے
زبانِ بدنام لکھ رہی ہے
زبانِ ناکام لکھ رہی ہے
مگر مرا دل، مرا جنوں بھی تو لکھ رہا ہے
میں اک ورق ہوں
تمام احساس ناتمامی

مگر مکمل کتاب چاہیے
جو پڑھ سکوں تو مجھے بتا دو کہ اس صحیفے میں کیا لکھا ہے

۷۔ صحیفۂ کائنات

یہ دو ورق ہیں
زمین اور آسمان جن پہ
صحیفۂ کائنات تحریر ہو رہا ہے
فسانہ ہستی کا نیستی کا
فسانہ نیکی کا اور بدی کا
فسانہ ظلمت کا روشنی کا
فسانہ کائنات تحریر ہو رہا ہے
جو کل کلی تھی
وہ آج گل ہے
جو آج گل ہے
وہ کل ثمر ہے

ہر ایک شے وقت کی ہواؤں کی زد پہ
اک شمع رہگزر ہے
جو بجھ رہی ہے
جو جل رہی ہے
وجود پر ناز کر رہی ہے

ہواؤں کے تند و تیز جھونکے
جب آندھیوں کا لباس پہنے

آتشیں [illegible] چمن پر
وہ شاخِ گل پر [illegible] سلام کرتی ہے
اور پھر سر اٹھائے [illegible] ہے
اور کہتی ہے [illegible] دیکھو
میں قطرات لالہ زار کا رنگ [illegible] شاعری [illegible]
[illegible] کا فیصلہ [illegible] ہوا
جسے مٹانے کی کوششیں [illegible]
وہ مر چکا ہے [illegible] ملے گا
[illegible] سے آئے گا
مرے لہو سے طلوع ہوگا

[illegible]

مرے خلاف اٹھایا قلم حریفوں نے
مرا غرور بڑھا اور سر بلند ہوا
یہی سلیقہ ہے بس حرفِ بد سے بچنے کا
کہ اپنی ذات کو اتنی بلندیاں دے دو
کسی کا سنگِ ملامت وہاں تک آ نہ سکے
صدائے کوئے ملامت تلاش کرتی رہے
مگر نوائے بہار آشنا کو پا نہ سکے
چراغِ علم و ہنر کو کوئی بجھا نہ سکے

جیو تو اپنے دل و جاں کے میکدے میں جیو
خود اپنے خونِ جگر کی شرابِ ناب پیو
جہاں کے سامنے جب آؤ تازہ رو آؤ

حضورِ محتسب و شیخ میں سُبو لاؤ
جو زخم خوردہ ہے وہ نغمۂ گلو لاؤ
دلِ شکستہ میں بڑھنے لگی روشنی غم کی
یہ روشنی تو ہے میراث ابنِ آدم کی
یہ روشنی کہ جو تلوار بھی سپر بھی ہے
مری نگاہ میں پیمانۂ ہنر بھی ہے

۹۔ حسد

حسد کی آنکھوں کا رنگ دیکھو
جو دل کے اندر بھرے ہوئے ہیں
وہ زہر آلودہ سنگ دیکھو
جو ہاتھ میں ہیں وہ پھول دیکھو
جو روح میں ہیں ببول دیکھو
لبوں پہ جو ہے وہ حرف دیکھو
حقیر کتنا ہے ظرف دیکھو
کہ دوست ہے
اور دوست کے منہ پہ بات کہنے سے ڈر رہا ہے
وجود ظاہر میں ہے مکمل
مگر وہ اندر بکھر رہا ہے
وہ اپنی نفرت کا زہر لے کر
خود اپنے خوں میں اُتر رہا ہے
وہ تنگ دل بھی ہے تنگ جاں بھی
تُنک ضمیر اور تُنک زباں بھی
خبر نہیں اس کو وہ کہاں ہے

سردار جعفری

کہ ہر طرف ایک شخص ایسا نظر کے اندر بسا ہوا ہے

کہ جس کے سب سے ... کا پتا ہے

جب اپنا اندازہ ... پتا ہے

وہ اپنے ... [illegible]

جو ہمارا ... غریب شہر ... خود ہے

[illegible] ... آشنا نہیں ہے

مگر اسی دوست کی بدولت

میں خود کو پہچاننے لگا ہوں

میں اس کا احسان مانتا ہوں

خدا کرے اس کا دل کہیں سے

سکون کی دولت تلاش کر لے

۱۰۔ قاتل کی شکست

اس کمین گاہ میں ہیں کتنے کماندار بتاؤ

تیر کتنے ہیں سیہ ترکش میں

گن کے دیکھو تو ذرا

کون سا تیر ہے مخصوص مرے دل کے لیے

ابنِ مریم کو کیا تم نے سرِ دار بلند

اور وہ زندہ ہے

تشنگی تم نے محمدؐ کے نواسے کو دی

چشمۂ فیض حسینؑ ابنِ علیؑ جاری ہے

ابنِ مریمؑ نہ حسینؑ ابنِ علیؑ ہوں لیکن

خون میں ہے خونِ شہادت کی حرارت پنہاں

وہ جو صدیوں سے دہکتا ہوا انگارہ ہے

اور سینے میں مرے

ایک نہیں، سیکڑوں لاکھوں دل ہیں

وہ کسی دیس کا دل ہو کہ کسی قوم کا دل

وہ کسی فردِ بشر کا دل ہو

زخم خوردہ ہو کہ نغموں سے بھرا

میرے سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل بن کر

کتنے دل قتل کرو گے آخر

کتنے جلتے ہوئے تاروں کو بجھا سکتے ہو

کتنے خورشیدوں کو نیزوں پہ اٹھا سکتے ہو

قتل کرتے کرتے خود تم کو جنوں ہو جائے گا

(نامکمل ...)

سردار جعفری

شعلۂ خورشید محشر

(مشرقی یورپ اور سوویت یونین کے نئے انقلاب سے متاثر ہو کر ایک پرانی زمین میں کچھ نئے اشعار)

عجب رت ہے کہ ہر اک شمعِ جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر زرّیں چراغوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمین کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی

اگر یوں ہے تو کیوں ہے، یوں نہیں تو کیوں نہیں آخر
یقیں محکم ہے، لیکن دل کی حیرانی نہیں جاتی

لہو جتنا کہ تھا سارا صرفِ مقتل ہو گیا لیکن
شہیدانِ وفا کے رخ کی تابانی نہیں جاتی

پریشاں روزگار، آشفتہ حالاں کا مقدر ہے
کہ اس زلفِ پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی

ہر اک شے اور مہنگی اور مہنگی ہوتی جاتی ہے
بس اک خونِ بشر ہے جس کی ارزانی نہیں جاتی

نئے خوابوں کا دل میں شعلۂ خورشید محشر ہے
ضمیرِ حضرتِ انساں کی سلطانی نہیں جاتی

لگاتے ہیں لبوں پر مہر اربابِ زباں بندی
علی سردار کی شانِ غزل خوانی نہیں جاتی

(بمبئی ۲۵ دسمبر ۱۹۸۹ء)

(ماخوذ از "نگار" مارچ ۱۹۹۰ء)

سردار جعفری

الوداع

الوداع اے سُرخ پرچم سرخ پرچم الوداع
اے نشانِ رزمِ مظلومانِ عالم الوداع

اے لباسِ آبروئے ابنِ آدم السّلام
اے ردائے سر برہنہ بنتِ مریم الوداع

اے فراتِ تشنہ کامانِ جہادِ زندگی
قلزمِ تشنہ لبی کی موجِ برہم الوداع

اے جلالِ کاوۂ آہن گرِ ضحاک[1] کش
اے زوالِ نخوتِ اسکندر و جم الوداع

آفتابِ بطنِ گیتی[2] کی شعاعِ شب شکن
اے متاعِ انقلابِ دورِ عالم الوداع

اے خس و خاشاکِ گلشن کے لیے برقِ تپاں
روئے گل پر پرتوِ خورشیدِ شبنم الوداع

اے غرورِ دستِ محنت اے شکوہِ بے نوا
حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع

تو نے دیکھا ہے عروج اور تو نے دیکھا ہے زوال
کاش پھر آئے نہ خونباری کا موسم الوداع

دیدۂ پُرنم سے کل دل نے کہا تھا "مرحبا"
کہہ رہی ہے آج لیکن چشمِ پُرنم "الوداع"

جس کی چنگاری کا اک شعلہ تھی انگڑائی تری
دل میں روشن ہے وہ آتش خانۂ غم الوداع

رزم گاہِ خیر و شر میں یاد آئے گی تری
ہم ہیں اب اور لشکرِ ابلیسِ اعظم الوداع

---

[1] فردوسی کے شاہنامے میں ایک خونخوار بادشاہ ضحاک کا ذکر ہے جس کے شانوں پر دو سانپ تھے وہ روزانہ دو انسانوں کا مغز کھاتے تھے اس خونخوار بادشاہ کی سفاکی کے خلاف ایک لوہار نے بغاوت کی جس کا نام کاوہ تھا۔ وہ کاوہ آہن گر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے پیر پر بندھے ہوئے چمڑے کو بھر دربار میں فوج کر اپنا پرچم بنایا تھا جو ایران کا قومی پرچم بن گیا اور درفشِ کاویانی کے نام سے مشہور ہوا ضحاک کو قتل کرنے کے لیے جو لشکر گیا تھا اس کا پرچم آہن گر کا پرچم تھا۔

[2] اشارہ ہے اقبال کے شعر کی طرف جو انقلاب روس کی تہنیت کا شعر ہے ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

(ستمبر ۱۹۹۱ء)

سردار جعفری

کمیونزم کی ناکامی؟

کمیونزم روس میں ختم ہوا۔ یہ ہمارے زمانے کا نہیں، کمیونزم تو ... عمل ایک تصور ہے بہتر زندگی کا تو کچھ سوویت یونین میں تھا وہ کمیونزم نہیں تھا بلکہ کمیونزم کی طرف جانے کا پہلا قدم تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے سامراجی طاقتوں کو ہلا دیا تھا اور پھر روس ایک نئے نظام زندگی کی طرف گامزن ہوا جس میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۲ء کے بعد سے تعمیر شروع ہوئی اس نظام کو بہتر اور زیادہ خوب صورت نظام زندگی دیا۔ بھوک کا علاج کیا۔ موٹی جھوٹی روٹی سب کو ملنے لگی۔ موٹا ہی سہی لیکن کپڑا بھی ملنے لگا۔ تعلیم مفت ہوئی اور حفظان صحت کا سب کے لیے انتظام ہوا۔ اس عمل میں ایک دوسرا منفی عمل بھی موجود تھا اور وہ یہ تھا کہ روس ایک پچھڑا ہوا ملک تھا اور پچھڑے ہوئے ملک میں سوشلزم آیا وہ بھی نسبتاً پچھڑا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے روس نے جو صنعت کاری کی اس میں بہت مظالم ہوئے اور لاکھوں بے گناہوں کا خون بہا۔ اس کے علاوہ دوسری چیز یہ ہوئی کہ پارٹی کی جو تنظیم بنائی گئی تھی وہ زارشاہی دور کی تھی۔ اس میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی اکثریت کی رائے سے مخالفت کرنے کا حق نہیں تھا۔ تمام اخبارات پارٹی کے تھے۔ اس طرح تحریر و تقریر کی آزادی پر پابندی کی وجہ سے جو مظالم اس اسٹالنی دور میں ہو رہے تھے ان کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھا سکا۔ یہ چیزیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ یہ جبر اور خوف کا نظام بن گیا اور وہ نظام جو ایک برکت بن کر آیا تھا اپنی سیاسی، تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے لعنت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے ساتھ جو عمل شروع ہوا وہ دوسری جنگ عظیم سے تعلق رکھتا ہے۔

اس میں سوویت یونین نے بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ فاشزم کا مقابلہ کیا۔ دو کروڑ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ بیواؤں، یتیموں کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں پہنچ گئی لیکن انسانیت کو فاشزم کے جبر و استحصال سے بچانے میں روس نے ایک شاندار کردار ادا کیا۔ جنگی تباہی کے ساتھ معاشی تباہی آئی۔ روس کا عالمی وقار اور رعب بڑھ گیا لیکن اندر سے حیثیت کمزور ہوتی چلی گئی۔ جنگ کے فوراً بعد سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں "ایٹم بم" آگیا۔ اس کے مقابلے میں روس نے بھی ایٹمی ہتھیار بندی شروع کر دی۔ اس میں روس امریکہ کے ساتھ دوسری بڑی طاقت بن کر ابھرا لیکن صرف فوجی طاقت اور اسلحہ کی طاقت کے اعتبار سے، معاشی اعتبار سے وہ اور زیادہ کمزور ہو گیا اور ۱۹۸۵ء تک بحران کے آثار زیادہ گہرے ہو گئے۔

کمیونزم کی ناکامی؟

جعفری نمبر

سردار جعفری

خروشچیف نے ۱۹۵۶ء میں استالنی نظام کا پردہ چاک کیا تھا جن کے مزید انکشافات گورباچوف نے کیے [illegible] اس کے ساتھ مغربی دنیا کی صارفین سوسائٹی (CONSUMER) کی چمک دمک نے سوویت عوام [illegible] اور جمہوری [illegible] کرنے میں گورباچوف نے بہت سارے [illegible] کارنامہ انجام دیا۔ لیکن گورباچوف سوویت سماج کو [illegible] سامراجی یلغار سے بچانے میں ناکام ہو گیا۔ اس وقت جو بحران ہے وہ اتنا [illegible] ہے کہ سوویت یونین میں خانہ جنگی کی صورت [illegible] سکتی ہے اور مغربی طاقتوں کی [illegible] وقت نظر سوویت یونین [illegible] طاقت [illegible] جس کو وہ تباہ کرنا چاہتے ہیں جس طرح عراق میں انھوں نے ایٹمی طاقت کو تباہ کیا۔ سوویت یونین [illegible] اس طرح [illegible] دیکھتے ہیں مغربی سامراجی نیت [illegible] نہیں ہے اور سوویت یونین اس [illegible] مزید [illegible] ہو گیا اور روس کی آسانی [illegible] ہم [illegible] دنیا کے لوگ ہیں ہمارے سامنے [illegible] جیسے مسائل ہیں [illegible] آپ کو ان غلطیوں سے بچانا پڑے گا جو سوویت [illegible] کے دور میں ہوئیں۔ ایک اور اہم بات۔ یہ ہے کہ اشتراکی نظام نے جو خواب دیکھے تھے ان [illegible] کچھ [illegible] سرمایہ داری نظام نے اپنے نظام پر [illegible] کر لیا۔ آج جو فلاحی ریاست [illegible] وہ سوشلسٹ نظام کی دین ہے [illegible] ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ صارفین کی سوسائٹی ایک طرح کا سرطانی مزاج رکھتی ہے [illegible] اس کی اخلاقی [illegible] سارے عالم انسانیت کے لیے خطرہ ہیں۔ سوویت عوام اس سے دوچار رہیں گے تو ان کو [illegible] نے ان [illegible] جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ ہم توقع ضرور کرتے ہیں کہ سوویت کے اندر جو اقتدار کی کشمکش ہے اس [illegible] رہے [illegible] مقابلہ [illegible] لیڈرشپ ہے وہ قابلِ اعتبار نہیں، خود مغرب [illegible] اس [illegible] خیال [illegible] اپنے احساسات کو دو سال پہلے ایک نظم میں پیش کیا تھا جس کا ایک شعر [illegible] کر رہا ہوں ؎

خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمینِ کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی

سوویت یونین سے سرخ پرچم کو اتار دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے پر زار کے زمانے کا ترنگا لہرایا [illegible] بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نیشنلزم کی انتہا پسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے۔


۴ رنگوں کا جادو
...کی نئی پیشکش
National
نیشنل
سپر کوئنٹرکیس
رنگین ٹیلیویژن
پکچر ٹیوب کی گارنٹی ۳ سال
پرزہ جات اور سروس ایک سال تک مفت
اصلی جاپانی پرزہ جات سے تیار شدہ
PEC 1 91
ASIATIK





دنیا کی بہترین
Brooke Bond
Brooke Bond
SUPREME
SUPREME
سپریم
نمبر 1 کوالٹی چائے
IAL-BBP-4-91



جواں سال سردار جعفری
ایک مصور کی نظر میں

[illegible]



میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں مصروف سفر جو رہتا ہے

(فوٹو: ۱۹۸۰ء)

[illegible]

[illegible]

جب آتش جواں تھا

[illegible] دور رفیق سفر سلطانہ او جعفری

ہر عاشق ہے سردار یہاں ہر معشوقہ سلطانہ ہے

[illegible]



میں ایک گریزاں لمحہ ہوں ایّام کے افسوں خانے میں



سردار جعفری — مختلف ادوار میں



سلطانہ جعفری اور سردار جعفری اسابان
(دورہ ۱۹۵۵ء)



سلطانہ جعفری، سردار جعفری
پشت پر کھڑے ہوئے دونوں بیٹے
ناظم جعفری اور حکمت جعفری
(دورہ ۱۹۶۶ء)









سردار جعفری۔ ڈاکٹر ملک راج آنند اور صدر جمہوریہ ہند
ڈاکٹر راجندر پرشاد دیوناگری رسم الخط میں دیوان
غالب دیکھ رہے ہیں



سردار جعفری مشہور عالم مصور حسین کے ساتھ
درمیان میں جعفری کا پوتا اقبال جعفری (عمر تین سال)
(فوٹو: ۱۹۸۷ء)



سردار جعفری اور رضا دقین --- دہلی میں



اختر سعید خاں، غلام ربانی تاباں، عصمت چغتائی
اور سردار جعفری بھوپال میں
(فوٹو: ۱۹۸۵ء)



ہاجرہ مسرور، سردار جعفری اور احمد علی خاں کراچی میں
(فوٹو: ۱۹۸۳ء)



محسن بھوپالی، سردار جعفری اور محمد علی صدیقی
کراچی میں (فوٹو: ۱۹۷۱ء)



سردار جعفری پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ
(فوٹو ۱۹۶۲ء)



سردار جعفری شہرۂ آفاق شاعر پابلو نرودا کے ساتھ دہلی میں
(فوٹو ۱۹۵۱ء)



صدر جمہوریہ ہند رادھا کرشنن سردار جعفری کو پدم شری
کا اعزاز دے رہے ہیں۔
(فوٹو ۱۹۶۷ء)



اسٹاک ہوم میں بلونت گارگی۔ سردار جعفری۔ بیگم پابلو نرودا اور
ایلیا اہرن برگ (فوٹو ۱۹۵۷ء)



—— غالب ایوارڈ حاصل کرنے والے دانشوروں کا گروپ فوٹو —— ایوانِ غالب نئی دہلی میں ——

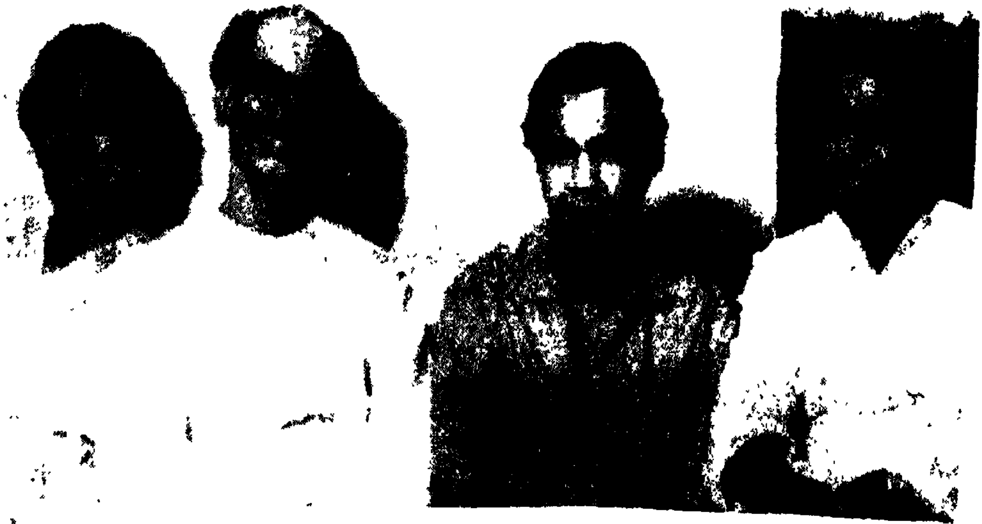
دائیں سے : پروفیسر عبدالمغنی ۔ علی جواد زیدی ۔ رفعت سروش ۔ نائب صدر جمہوریہ ہند شنکر دیال شرما ۔ سردار جعفری ۔ عابدہ بیگم ۔ نہال سیوہاروی ۔
کنور مہندر سنگھ بیدی ۔ رام لال ۔ پروفیسر ہیرا لال چوپڑہ ۔ (فروری ۱۹۹۶ء)

انجمن ترقی پسند مصنّفین کی گولڈن جوبلی معقدہ لکھنؤ کے دو یادگار گروپ فوٹو





(اوپر دائیں سے) کوٹھیاوی راہی۔ رام لال۔ سردار جعفری۔ غلام ربّانی تاباں۔ رضیہ سجّاد ظہیر اور ڈاکٹر قمر رئیس
(نیچے) سیّد سبط حسن۔ پروفیسر سبحان سنگھ۔ پروفیسر نامور سنگھ اور سردار جعفری۔ (فوٹو: ۱۹۸۶ء)





اوپر کی تصویر میں ۔ (دائیں سے) اختر الایمان ۔ سردار جعفری ۔ سکندر علی وجد اور سلطانہ جعفری (فوٹو: ۱۹۵۱ء
(نیچے) سری نواس لاہوٹی ۔ مخدوم محی الدین ۔ سردار جعفری ۔ ساحر لدھیانوی اور اندرا دھن راج گیر ۔
(فوٹو: ۱۹۶۱ء



تصویر میں: علامہ اقبال کی
... سالگرہ کے موقع پر
... ڈاکٹر شارب ردولوی
... عابد جعفری ... سردار جعفری
سلطانہ جعفری ...
انتظار حسین (فوٹو: ۱۹۸۶ء)



تصویر میں ـــ بیدار بخت،
سردار جعفری اور مریم بیدار بخت
(فوٹو: ۱۹۸۰ء)



مشاعرہ ... حمایت علی شاعر
افتخار عارف، قتیل شفائی، سردار جعفری،
ثریا ... جعفری اور احمد فراز
(فوٹو: ۱۹۸۵ء)



جاوید منزل ۔ لاہور میں
سردار جعفری ۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور خواجہ احمد عباس
(فوٹو: ۱۹۷۶ء)



دہلی میں سردار جعفری اور قتیل شفائی
(فوٹو: ۱۹۵۲ء)



ملا فخرالدین (سکریٹری سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی ۔ بھوپال)
اور سردار جعفری (فوٹو: ۱۹۶۸ء)



مدھیہ پردیش اردو کنونشن بھوپال

(دائیں سے) سید محمد عسکری - اختر سعید خاں - سردار جعفری - عادل رشید - ایم عرفان

(فوٹو: بہ شکریہ ایم عمران ۱۹۵۹ء)



جامعہ کراچی کی ایک ادبی تقریب میں۔ سردار جعفری۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری۔ جمیل اختر خاں۔ سحر انصاری کلام سنا رہے ہیں۔ (فوٹو: ۱۹۷۷ء)



سردار جعفری ——— غالب لائبریری میں مرزا ظفر الحسن کے ساتھ

(فوٹو: ۱۹۷۷ء)



مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں علی سردار جعفری کو ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری تفویض کیے جانے
کی تقریب کا ایک فوٹو [illegible] پرنسپل [illegible] پروفیسر ... علی خاں، شمیم جاوید، علی سردار جعفری۔
(فوٹو: اپریل ۱۹۸۶ء)



ایشیائی ادیبوں کی پہلی کانفرنس۔ منعقدہ دہلی
(دائیں سے) کرشن چندر، سجاد ظہیر اور سردار جعفری۔ روسی مندوبین کے ساتھ۔ (فوٹو: ۱۹۵۶ء)

روبرو

انٹرویو

گفتگو

بات چیت

حسن عابدی

سوویت روس میں نئی تبدیلیوں کا پس منظر

سردار جعفری کا یہ انٹرویو روزنامہ ڈان کے شمارہ ۷ جون ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ انٹرویو حسن عابدی نے کیا، انگریزی متن کا اردو ترجمہ نذر قارئین ہے۔ پاکستان میں سردار جعفری کا یہ تازہ ترین انٹرویو ہے۔ (مدیر)

سردار جعفری ۷۸ کے پیٹے میں ہیں، لیکن اس سے کہیں کم عمر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ان چند سرکردہ ارکان میں شامل ہیں جو بفضلہ بقید حیات ہیں۔ یہ وہی تحریک ہے جس نے پورے برصغیر کے ادبی منظر پر ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا۔

سردار صاحب! کیا آپ بھی تحریک کے بانی ارکان میں شامل تھے؟ اس سوال کے جواب میں سردار صاحب بولے "جی نہیں۔" ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستگی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے صریح طور پر اس بات سے انکار کیا کہ وہ اس تحریک کے پہلے گروپ میں شامل تھے۔ انہوں نے کہا "۱۹۳۹ء میں جب کلکتہ میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس ہوئی، اس وقت میں اس میں شریک ہوا" یاد رہے کہ عظیم شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔

سردار جعفری بلرام پور (یوپی) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں (۳۷ء ـ ۱۹۳۰ء کے دوران) تعلیم پائی۔ طالب علمی کے اس دور کو یاد کرتے ہوئے سردار صاحب نے کہا "یونیورسٹی اس زمانے میں مخالف سامراج قیادت اور تحریک کا مرکز تھی" ان کے اس دور کے رفقاء میں سبط حسن، اسرار الحق مجاز اور معین احسن جذبی بھی شامل تھے۔ خواجہ احمد عباس، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور حیات اللہ انصاری ان سے سینئر تھے۔ آزادی کی تحریک اس زمانے میں اپنے شباب پر تھی پوری سیاسی فضا پر انقلابی افکار کا غلبہ تھا۔ ۱۹۳۶ء کی کانفرنس سے پہلے ہی پورے ملک میں انقلابی افکار کے نشو و ارتقا کے لئے سازگار ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ سبھی لوگ تحریک میں شامل ہو گئے اور ہر ایک نے ترقی پسند ادب کے فروغ کے لئے سرگرمی سے کام شروع کیا۔

میں نے کہا، سردار صاحب! آپ کی شاعری مواد کے اعتبار سے بنیادی طور پر انقلابی ہے، تاہم آپ نے خواب کا

استعارہ اکثر و بیشتر استعمال کیا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے ایک مجموعے کا نام ہی "ایک خواب اور" ہے۔ کیا آپ ہمیں یہ بتائیں گے کہ آیا آپ کے کسی خواب نے حقیقت کا قالب اختیار کیا۔

"ایک بھی نہیں" انھوں نے برجستہ جواب دیا، تاہم ان کے لہجے میں تاسف شامل نہ تھا۔ گفتگو جاری رکھتے ہوئے سردار صاحب نے کہا "خواب کبھی پورے نہیں ہوتے" پیغمبروں کے خواب بھی کبھی پورے نہیں ہوئے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آدمی کو خواب دیکھتے رہنا چاہیئے۔ اس سے انسانی زندگی میں بہتری کی صورت نکلتی ہے۔ اگر تمہارے کچھ خواب ہیں زندگی میں کچھ مقاصد ہیں تو انھیں تازہ رکھو اور ان کے حصول کی جدوجہد کرتے رہو۔ خواب تمھیں پیہم جدوجہد پر آمادہ رکھتے ہیں۔ ان سے تمہاری تحریروں میں ایک گہرا جمالیاتی احساس پیدا ہوگا۔

سردار صاحب کہہ رہے تھے کہ ہمارے درمیان دو طرح کے ادیب تھے۔ ادیبوں کا ایک گروہ تو وہ تھا جو ادب کی تخلیق میں ہمہ تن اور پوری یکسوئی سے مصروف تھا اور دوسرے گروہ میں، جن کے درمیان میں خود کو بھی شامل کرتا ہوں وہ ادیب تھے جن کی وابستگی کانگریس اور کمیونسٹ پارٹی سے بھی تھی اور جو کہانیاں لکھنے اور ادب تخلیق کرنے کے علاوہ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لے رہے تھے۔"

سردار صاحب! سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ملکوں میں رونما ہونے والے سوشلسٹ انقلاب سے آپ کی شیفتگی ایک معلوم حقیقت ہے، لیکن اب جو سوشلسٹ دنیا میں بغاوت کی لہر اٹھی ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس نے ان دنوں بہت سے ذہنوں میں اضطراب پیدا کر دیا ہے۔

اس سوال کے جواب میں سردار جعفری نے گذشتہ کئی دہائیوں کے تاریخی واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سوشلسٹ نظام میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اور جنھوں نے آگے چل کر ایک بحران کی صورت اختیار کر لی، ان کی کچھ جھلکیاں میری ان نظموں میں مل جائیں گی جو ۱۹۵۳ء اور ۱۹۶۳ء کے دوران میں لکھی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں آپ ایک نظر میرے دیباچے پر ڈال لیجیے جو مختصر ترین دیباچہ ہے اور جسے میں نے اپنے مجموعے "ایک خواب اور" کے لئے تحریر کیا۔ اس کی عبارت یہ ہے۔

"خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا۔ اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔"

سردار جعفری کہہ رہے تھے "۱۹۵۴ء میں میں سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرنس میں شرکت کے لئے ماسکو گیا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں ادیبوں کو دو نہایت پیچیدہ سوالات درپیش تھے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ آیا سوویت نظام میں کچھ منفی کرداروں کا وجود ہے یا سرے سے نہیں ہے اور اگر اس نظام میں کچھ منفی کردار موجود ہوں تو کیا ان کرداروں کی عکاسی ادبی تخلیقات میں کی جانی چاہیئے یا نہیں؟۔

دوسرا سوال، جو پہلے سوال سے منسلک تھا سوشلسٹ حقیقت پسندی اور اس کے عملی اطلاق کے بارے میں تھا ادیبوں کی اس کانفرنس میں چند عظیم انقلابی اور پرانے پختہ کار رہنما بھی موجود تھے۔ شولوخوف، ایلیا اہرن برگ، سومنوف اور کچھ دوسرے سوویت ادیبوں کے علاوہ کچھ دوسرے ملکوں کے نامور ادیب اور شاعر بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے مثلاً

پابلو نرودا، نوتی اراگاں اور ناظم حکمت۔ اس موقع پر کانفرنس میں شریک ادیبوں کے درمیان ایلیا اہرن برگ کا ناول THAW (برف پگھلتی ہے) جو ایک شدید متنازعہ تصنیف تھی، زبردست بحث کا موضوع بنی ہوئی تھی۔ مصنف نے اس ناول میں سوویت معاشرے کے بعض منفی پہلوؤں کی عکاسی اور معاشرے کے چند منفی رجحانات کی نشاندہی بھی کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایلیا اہرن برگ جب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو ادیبوں نے کھڑے ہوکر پُرجوش تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ "آفیشل لائن" (سرکاری موقف) کے برعکس ان ادیبوں کے دلوں میں کس قدر احترام پایا جاتا تھا۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے سردار جعفری نے کہا "آپ نے جو سوال پوچھا، اس کا جواب ایک طویل اور وضاحتی بیان کا تقاضا کرتا ہے۔ تاہم اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے گذشتہ برسوں کے واقعات کا سرسری حوالہ دوں گا۔ سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرس سے خطاب کرتے ہوئے ایلیا اہرن برگ نے کہا "سوویٹ سوشلیسٹ معاشرے میں ایک طرح کا تضاد آپ اسے ایک واضح تفریق بھی کہہ سکتے ہیں، پایا جاتا ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کچھ اس طرح کروں گا کہ۔ ایک اچھا شہری ایک بُرا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس نے جنگ میں بڑی بے جگری کا مظاہرہ کیا، اس نے بہت سے تمغے اور انعامات بھی حاصل کیے اور اب وہ پیداوار کے محاذ پر شاندار خدمات انجام دے رہا ہے اور وہ شخص سوویت قوانین کی پاسداری کے لیے سینہ سپر رہتا ہے، لیکن وہی شخص نجی زندگی میں ایک بُرا آدمی ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ نہایت آسانی سے اپنے دوستوں کو فریب دیتا ہے، بیوی سے دھوکا کرتا ہے اور بچوں کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتا ہے۔

تقریر جاری رکھتے ہوئے ایلیا اہرن برگ نے کہا۔ دوسری طرف ایک سوویت شہری بُرا آدمی ہوتے ہوتے بھی ایک اچھا انسان ہو سکتا ہے۔ اپنے ذاتی طرزِ عمل میں اور معاشرتی تعلقات کی بنا پر ایک خلیق اور پیارا انسان۔ اب جو یہ تضاد پیدا ہوتا ہے اس کی صراحت کے لئے اور جو مسائل اس تضاد سے رونما ہوتے ہیں ان کو پوری طرح بے نقاب کرنے کے لئے صرف ایک ادیب کا قلم موثر طور پر کام آسکتا ہے۔ سردار جعفری نے کہا جہاں تک مجھے یاد آتا ہے ایلیا اہرن برگ کا موقف یہ تھا کہ ادیب کو معاشرے کے منفی کرداروں کی عکاسی بھی ضرور کرنی چاہیئے۔ شولوخوف نے اس موقف کی شدید مخالفت کی۔

اب رہا آپ کا دوسرا سوال سوشلسٹ حقیقت پسندی کے بارے میں جو پہلے سوال سے جڑا ہوا تھا۔ اور جس کے تحت یہ تقاضہ کیا جاتا رہا کہ سماجی حقائق کو اُن کی ہر آن بدلتی ہوئی شکل میں بیان کرنا چاہیے، چنانچہ ادیبوں سے کہا گیا کہ معاشرے کے صرف روشن پہلوؤں کی عکاسی کریں، اسی طرح ادیبوں سے کہا گیا کہ ان کی تحریروں کے ذریعے ادب میں یاسیت نہیں آنی چاہیے۔

سوویت ارباب اختیار نے جس نوع کی حقیقت پسندی کی صراحت کی تھی ادیبوں نے اُسے قبول نہیں کیا اور ان میں بہت سے سوویت ادیب بھی شامل تھے، لیکن "آفیشل لائن (سرکاری موقف)" کی بالادستی برقرار رہی۔ چنانچہ اس کے بعد ہی سے بہت سے ادیبوں اور فنکاروں نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔ مشہور مصوّر پابلو پکاسو کو جو فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے رکن بھی تھے۔ پارٹی سے الگ ہونا پڑا۔ تاہم اسٹالین دور کے خاتمے کے بعد اختلاف کرنے والے

ادیبوں اور فنکاروں کے نقطۂ نظر کو تسلیم کیا جانے لگا۔

اب جہاں تک سرمایہ داری کے خلاف اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کا تعلق ہے، یہ ایک ایسا موثر اور زبردست انقلاب تھا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور اس حقیقت سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ البتہ لینن کی وفات کے بعد سوشلسٹ نظام پر افسر شاہی نے اپنا تسلط قائم کر لیا اور جوں جوں وقت گذرتا گیا افسر شاہی کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ یہ نظام دو طرح سے متشددانہ تھا کہ ایک طرف تو کمیونسٹ پارٹی کا اقتدار قائم تھا، دوسری طرف ہمہ گیر ریاستی اقتدار اپنی افسر شاہی کے ساتھ ریاستی اداروں پر مسلط تھا۔ اس نظام کی بدولت اسٹالین کو ریاست کے معاملات پر مکمل اختیارات حاصل ہو گئے، چنانچہ آج آپ جس انقلاب کو روبہ عمل آتے ہوئے دیکھ رہے ہیں وہ دراصل سوشلسٹ افسر شاہی کے خلاف سوویٹ عوام کا انقلاب ہے۔"

سردار جعفری ۱۹۵۴ء سے زمانۂ حال تک سوویت یونین جاتے رہے ہیں اور وہ افسر شاہی کے تسلّط کے خلاف وہاں کے عوام کی مدافعانہ جدوجہد کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہوں نے کہا "سوویت عوام سرکاری حکمت عملی کو نظر انداز کرتے ہوئے برابر اپنے حق پسند ورد یتے رہے ہیں۔" انہوں نے اس سلسلے میں ایک اور مثال پیش کی۔ کہنے لگے "۱۹۵۴ء میں ماسکو فلم فیسٹیول میں دو ہندوستانی فلموں کی نمائش کی گئی۔ ایک بلراج ساہنی کی "دو بیگھہ زمین" اور دوسری راج کپور کی فلم "آوارہ" تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ بلراج کی فلم جس میں ہندوستان کے کسانوں کی جدوجہد کو پیش کیا گیا تھا سوویت عوام کو بے حد پسند آئے گی، لیکن یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس کے برعکس راج کپور کی فلم "آوارہ" کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ حالانکہ اس کی کہانی ہلکی پھلکی محبت کے موضوع پر مبنی تھی اور اس میں چلتے ہوئے سے گانے تھے۔ "آوارہ" عام تماشائیوں میں تو خیر پسند کی ہی گئی، لیکن کمیونسٹ لیڈروں ماؤزے تنگ اور فیدل کاسترو نے بھی اسے بہت سراہا۔ جب فلم "آوارہ" پر فیدوف سے تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کہا "یہ فرار پر مبنی ایک فلم ہے، لیکن یہ ایک سرکاری رائے ہے۔ کسی نقاد کا تبصرہ نہیں۔ فیدوف سوویٹ رائٹرز ایسوسی ایشن کے سکریٹری تھے۔ ان کے بعد ناظم حکمت نے جو ترکی سے آئے تھے کہا کہ "آوارہ" نرگس اور راج کپور کے حسین اور وجیہہ جوڑے کی وجہ سے مقبول ہوئی۔ سوویت یونین کے فلم بین اپنی لحیم شحیم عورتوں کو بھاری بھرکم مشین چلاتے دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئے تھے اور ادھر ایک عرصے سے عشق و محبت کی کہانی کے منتظر تھے۔ "آوارہ" نے ان کی دیرینہ خواہش پوری کر دی۔" ناظم حکمت کی اس توجیہہ سے انکار ممکن نہ تھا۔

زندگی کی جانب ایک ادیب کے صحیح رویّے کی وضاحت ایک اور مثال سے ہوتی ہے۔ وہ مثال میں آپ کے علم میں لا رہا ہوں۔ کئی سال ہوئے ناظم حکمت نے ایک ڈرامہ لکھا، اس کا عنوان تھا "کیا آیون آئینو وچ کا کوئی وجود تھا" اس ڈرامے میں سوشلسٹ افسر شاہی پر بڑے تلخ اور تیکھے انداز میں نکتہ چینی کی گئی تھی۔ یہ کھیل اس قدر مقبول ہوا کہ پولینڈ میں مسلسل سو راتوں تک اس کی نمائش ہوتی رہی۔ اسے ماسکو میں بھی پسند کیا گیا۔

میں جو بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ سوویٹ انتظامیہ کی ادبی اور ثقافتی پالیسی کے خلاف ادیبوں اور دانشوروں میں احتجاج کا عنصر ہمیشہ موجود رہا اور اب ادیبوں کی نئی نسل بھی ان کے جذبات میں شریک ہے۔

جہاں تک مشرقی یورپ میں رونما ہونے والے واقعات کا تعلق ہے، وہ سوویت یونین میں ہونے والی تبدیلیوں سے مختلف ہیں۔ مشرقی یورپ میں سوشلزم فاشزم کی شکست اور محاذ جنگ پر سرخ فوجوں کی فتح اور اس کے ساتھ ہی سوویت یونین امداد کے نتیجے میں قائم ہوا، لیکن سوویت یونین میں یہ عوام کا لایا ہوا انقلاب تھا جسے لینن کی قیادت نے کامیابی سے ہمکنار کیا۔ کمیونسٹ پارٹی ہر جگہ مزدوروں کی پارٹی ہے، لیکن پولینڈ میں کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کے خلاف انقلاب خود مزدوروں نے برپا کیا۔ دراصل یہ انقلاب سوشلسٹ افسرشاہی کے خلاف تھا۔

مارکسزم کوئی کلیہ نہیں ہے۔ یہ ایک سائنس ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ مینی فیسٹو کی اشاعت کے بعد سے اب تک حالات میں زبردست تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ ہمیں مارکسزم کے اصولوں کی تفسیر انہی بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں کرنی ہوگی۔

میں نے پوچھا۔ "آپ اس کا اطلاق ادب میں کس طرح کریں گے؟"

انہوں نے جواب دیا "ہمیں عوام کے ساتھ انہی کی زبان میں انہی کے محاورے اور لب و لہجے میں کلام کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنے عوام کی طویل اور دیرینہ جمہوری روایات کے ساتھ اور اس کے علاوہ انسانیت کی نجات کے لئے اپنے رشیوں اور صوفیوں کی تحریکوں کے ہمراہ رشتہ جوڑنا ہوگا۔ مارکسزم کے وہ الفاظ و اصطلاحات جنہیں ہم یورپ سے مستعار لیتے آئے ہیں، اب کام نہیں آئیں گی اور ہمارے عوام کے لیے بدستور ناقابلِ فہم رہیں گی۔ اس تفہیم کا احساس، موجودہ ہندوستانی ادب میں بخوبی نظر آتا ہے جس میں نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔"

"آمریت، دنیا میں چاہے جہاں بھی اپنی گرفت قائم کر لے، لیکن ادب میں آمریت نہیں چلتی۔ جلد یا بدیر اسے بہرطور ختم کرنا ہوگا۔ ان دنوں ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں میں اور یہاں کی انقلابی پارٹیاں بھی ان میں شامل ہیں۔ پارلیمانی جمہوریت اور ہندوستان کے آئین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔"

"معاشرے میں جب تک نابرابری اور بے انصافی موجود رہے گی، سوشلزم کا خواب ایک زندہ حقیقت کے طور پر باقی رہے گا اور ادب اس خواب کی تعبیر کے لئے اپنی مدد فراہم کرتا رہے گا۔"

میں نے سوال کیا۔ "ترقی پسند تحریک، برصغیر پاک و ہند میں نصف صدی پرانی ہے اور ادیبوں و مفکروں میں ترقی پسندانہ افکار بہت مقبول ہیں۔ ایسے میں کیا ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کی ضرورت باقی رہتی ہے۔؟"

جعفری صاحب نے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ ایسی کسی انجمن کی موجودگی کی ضرورت بہرحال رہتی ہے۔ ادیبوں کو مسائل پر غور و بحث کرنے کے لئے اور تبادلۂ افکار کے لئے ملتے رہنا چاہیے۔"

اب ایک اور سوال۔ "کیا یہ درست ہے کہ ہندوستان میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں۔ کیونکہ معیشت کے شعبے میں اس کا کردار تقریباً کچھ نہیں اور اردو پڑھنے والے نوجوانوں کو اس زبان سے روزگار کی ضمانت نہیں ملتی۔"

"حالانکہ، اردو کسی بھی صوبے کی سرکاری زبان نہیں، لیکن یہ ہندوستان میں ہر جگہ موجود ہے۔ اب اس بات کی کوشش ہو رہی ہے کہ جہاں جہاں بھی صوبوں میں ہندی سرکاری زبان کے طور پر نافذ ہے وہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دلائی جائے۔ بہار اور یوپی میں یہ کوشش کامیاب رہی۔ جہاں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل

ہے، لیکن میں آپ کو ایک اور بات بتا تا چلوں کہ انگریزی کو برتری حاصل ہے کیونکہ انگریزی سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان ہے۔ انگریزی کو ہندوستان سے باہر نکال دینا ممکن نہیں۔"

میں نے درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔" لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ درس و تدریس میں اوّلیت مادری زبان کو ملنی چاہیئے۔" "یہ کوئی ضروری نہیں" جعفری صاحب نے برجستہ جواب دیا۔"ٹھیک ہے اگر کسی کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جا رہی ہے تو یہ بہت اچھا ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم کا نقصان کرنے مادری زبان کو استعمال میں لانا درست نہیں ہوگا۔ میں اس سلسلے میں اپنے زمانے کے چند اعلیٰ ترین دانشوروں اور عالموں کی مثالیں پیش کرنا گا جنھوں نے تعلیم اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ اجنبی زبانوں میں حاصل کی۔ ہندوستان میں اس کی مثال جواہر لال نہرو ہیں جنھوں نے انگریزی زبان کے ذریعے سے تعلیم حاصل کی۔ میں اور بہت سے لوگوں کے نام لے سکتا ہوں۔ علامہ اقبال کی ہی مثال ہے جو ایک بڑے شاعر اور مفکر تھے، لیکن ان کی ساری ذہنی نشو ونما اور روحانی تہذیب و تعلیم ان کی اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ فارسی، عربی اور بعدازاں انگریزی میں ہوئی۔

"آج ہندوستان میں بیوروکریسی کی زبان انگریزی ہے۔ وہاں کی قیادت انگریزی کے ذریعے افہام و تفہیم کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اعلیٰ ترسطح پر ہماری جنگ آزادی بھی انگریزی زبان کے ذریعے ہی لڑی گئی تھی۔

ملاقات طویل ہو چکی تھی، لہٰذا میں نے معذرت خواہی کے انداز میں ایک اور سوال کی اجازت چاہی اور اجازت ملنے پر پوچھا۔ "کیا درست ہے کہ برصغیر میں جدیدیت کی تحریک کو فروغ اس لیے حاصل ہوا کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے آپ کو دُہرانے لگے تھے؟"

"ہرگز نہیں۔ سردار جعفری نے زور دے کر کہا۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ تکرار، ایک تخلیقی ذہن کی خصوصیت ہے۔ اردو غزل کی ہی مثال موجود ہے جس میں کوئی دو صدیوں سے تشبیہات اور استعارے دُہرائے جاتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ علامہ اقبال سے زیادہ کسی اور شاعر نے اپنے آپ کو دہرایا ہوگا۔ علامہ اقبال نے فلسفہ خودی پر اس قدر زور دیا اور پھر اپنے اشعار میں فلسفہ خودی کو مختلف پیرایوں سے برابر پیش کرتے رہے۔ اس کے باوجود اقبال کی عظمت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔!

"جدیدیت کی تحریک کی جڑیں، ترقی پسندوں کی انتہا پسندی میں پیوست ہیں۔ ایک بات تو یہ ہوئی اور جدیدیت کے بروئے کار آنے کی دوسری وجہ..... آخر دوسرے درجے کے لکھنے والوں کو بھی تو کوئی راستہ ملنا چاہیے۔

راہی معصوم رضا۔ سردار جعفری

گفتگو بند نہ ہو

۱۸ اپریل ۱۹۹۰ء کا ایک روشن دن۔ صبح گیارہ بجے کا وقت۔ اور علی سردار جعفری کا "سیتا محل" والا ہاکستی فلیٹ جہاں مختصر سے ڈرائینگ روم میں ۔۔ دیوار سے منسلک کتابوں کا ایک بڑا سا شیلف ۔۔ صاحبِ خانہ کی علمیت اور مطالعے کا مظہر ۔۔ کمرے کے دائیں گوشے میں ایک چھوٹی سی میز ۔۔ جو دنیا کی قیمتی تحریروں کی جائے پیدائش ۔۔ ایک قلم ۔۔ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتا ہوا ۔۔ میز پہ چند چنندہ کتابیں ۔۔ ایک پیڈ ۔۔ ایک ٹیبل لیمپ ۔۔ جوش بیداری اور شب نویسی کا غماز ۔۔ میرے اُس طرف دیوار سے لگا ہوا ایک کوچ ۔۔ جس پر ڈاکٹر راہی معصوم رضا اپنی حق گوئی و بیباکی اور پورے طمطراق کے ساتھ جلوہ گر ۔۔ پاس ہی پان کی ایک ڈبیا ۔۔ دوسری دیوار سے لگے ہوئے کوچ پر رباب آپا اور ستارہ آپا ہمہ تن گوش ۔۔ چکر دار کرسی پہ ترقی پسند تحریک کا ہیرو، اپنے لفظوں کے ہتھیاروں سے لیس ۔ ادھر شیلف کے پاس بچھی ہوئی دو کرسیوں پر سلطانہ جعفری یعنی اردو شاعری کی وینس اور دوسری کرسی پر خاکسار ۔۔ یعنی رفیعہ شبنم عابدی بیچ میں ایک لمبی سی تپائی ۔۔ جس پہ ایک ٹیپ ریکارڈر بڑی دیر سے شرکائے گفتگو کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے ۔۔

میں نے کہا۔ "راہی صاحب! آپ گفتگو شروع کیجیے۔ میں ریکارڈ کرتی جاؤں گی۔"

راہی صاحب نے "مہابھارتی" شان و شکوہ کے ساتھ اپنی شیروانی کی "زنبیل" (میں اسے جیب نہیں "زنبیل" ہی کہوں گی) سے ایک پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر نکالا اور مسکرا کر مخاطب ہوئے۔

"دیکھو رفیعہ! ۔ یہ میرا ٹیپ ریکارڈر ہے ۔ مگر تمہارے لیے نہیں۔ اسے میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "منظور ۔۔ چلیے۔ مگر اعلان کے طور پر الفاظ کا شنکھ ہی تو بجا دیجیے۔"

اور پھر الفاظ کا شنکھ بج گیا۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے پہلو بدلا۔ پان کی ڈبیا میں سے ایک گلوری نکال کر منہ میں ڈالی اور پھر ۔۔

دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

گفتگو شروع ہوئی ۔۔

بات سے بات چلی۔ صبحِ ملاقات چلی
ہاتھ میں ہاتھ لیے، سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ دردِ دلے، پیار کی سوغات لیے

تیکھی نظریں ہوں، ترش ابرو ئے خم دار رہیں
بن پڑے جیسے بھی، سینوں میں بیدار رہیں

انھیں بیدار دلوں کا یہ ہدیہ قارئین کی نذر ہے۔ اس گفتگو کے دوران اکثر مقامات پر مجھے اختلافِ رائے ہوا۔ آپ کو بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یاد رہے ... گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔ یاد رہے یہ محض دو ذہین شاعروں اور ادیبوں کے مابین ایک گفتگو ہے۔ انٹرویو نہیں (رفیعہ شبنم عابدی)

ڈاکٹر راہی معصوم رضا: اچھا تو میں آپ کو پریشان کرنا شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو بھائی! مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج آپ سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس سے میں ذاتی طور پر یہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ میرے اپنے ذہن میں جو الجھنیں ہیں وہ صاف ہو جائیں کیونکہ آپ ہمارے ان بزرگ شاعروں، نقادوں اور مفکرین میں سے ہیں جنھوں نے ہماری رہنمائی کی ہے اور ہمارے سیاسی شعور کو بڑھنے اور صحیح یا غلط راستے پر چلنے میں مدد کی ہے۔

سردار جعفری: (ہلکے سے تبسم کے ساتھ) یہ 'غلط' لفظ بہت صحیح ہے۔ کیا خوب! صحیح یا غلط راستہ۔

راہی: میں گفتگو شروع یہاں سے کرنا چاہتا ہوں کہ ۱۹۳۶ء میں جب یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا جائے تو اس وقت جو بزرگ تھے جن میں آپ بھی ہیں۔ ایک طرف پریم چند، مولانا آزاد اور حسرت موہانی کا سلسلہ جاتا ہے۔ تو آپ لوگوں نے کچھ بنیادی سوال ادب کے لیے اٹھائے تھے۔ اس وقت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج ۱۹۹۰ء میں، یعنی ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کا جو ہمارا ذہنی سفر ہے۔ تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ ان سوالوں پر دوبارہ غور کیا جائے یا ان بنیادی سوالوں کی شکل میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں گے۔ کیا آپ یہ سوچنا چاہیں گے کہ وہ سوال اب IRRELEVANT ہو گئے ہیں اور اب نئے سرے سے کچھ نئے، کچھ دوسرے سوال اٹھانا چاہیے۔

جعفری صاحب: اس وقت آپ یہ واضح کر دیں کہ کون سے سوال ذہن میں ہیں؟ یعنی نوعیت سوالوں کی کیا ہے؟

راہی صاحب: ادب کے بارے میں آپ لوگوں نے جو ایک پورا رویہ بنایا تھا کہ ادب کو ایلیٹ کلاس میں نہیں جانا چاہیے اور عوام کی بہبود کے لیے ہے اور عوام کی لڑائی کے لیے ہے اور ادب کو وہ جو ویسٹیڈ انٹرسٹ والا کلاس ہے اُن کے خلاف لڑنا ہے عوام اور دنیا اور اپنے ملک کی بہبود کے لیے۔ اور اسی میں یہ بنیادی سوال اٹھا تھا کہ ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا۔ جمالیات کا یہ سوال اسی سے نکلا تھا کیوں کہ اب تک ہمارا ادب جو تھا وہ ایلیٹ میں پھنسا ہوا تھا اور لگ بھگ انھیں کے مسائل کے بارے میں سوچتا تھا اور انھیں کے نقطۂ نگاہ کے حساب سے سوچتا تھا۔ اور ہمارے شعرا بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے (جن میں مولانا حسرت موہانی الگ سے ایک کیس ہیں جنھوں نے اردو غزل کو سمجھیے کہ متوسط طبقے کے قریب لانے کی کوشش کی تھی) تو ۱۹۳۶ء میں جو سوال آپ لوگوں نے اٹھائے تھے کیا ان سوالوں پر دوبارہ غور کرنا آپ ضروری سمجھتے ہیں؟ یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سوال بعینہٖ ویسے کے ویسے ہیں یا کچھ نئے سوال اپنے آپ سے کرنے پر آپ تیار ہیں؟

جعفری صاحب: بہت اہم ہے یہ بات اور جواب دینا اس کا آسان نہیں ہے۔ اس لیے ....

راہی صاحب: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کو پریشان کروں گا۔

راہی معصوم رضا۔ سردار جعفری

گفتگو بند نہ ہو

۱۸ اپریل ۱۹۹۰ء کا ایک روشن دن۔ صبح گیارہ بجے کا وقت۔ اور علی سردار جعفری کا "سیتا محل" والا رہائشی فلیٹ جہاں مختصر سے ڈرائینگ روم میں ۔۔ دیوار سے منسلک کتابوں کا ایک بڑا سا شیلف ۔۔ صاحبِ خانہ کی علمیت اور مطالعے کا مظہر۔ کمرے کے دائیں گوشے میں ایک چھوٹی سی میز ۔۔ جو دنیا کی قیمتی تحریروں کی جائے پیدائش ۔ ایک قلم ۔۔ اپنی شہنشاہیت کا اعلان کرتا ہوا ۔۔ میز پر چند چنندہ کتابیں ۔۔ ایک پیڈ ۔ ایک ٹیبل لیمپ ۔۔ جوشِ بیداری اور شب نویسی کا غماز ۔۔ میز سے اُس طرف دیوار سے لگا ہوا ایک کوچ ۔۔ جس پر ڈاکٹر راہی معصوم رضا اپنی حق گوئی و بیباکی اور پورے طمطراق کے ساتھ جلوہ گر ۔۔ پاس ہی پان کی ایک ڈبیا ۔۔ دوسری دیوار سے لگے ہوئے کوچ پر رباب آپا اور ستارہ آپا ہمہ تن گوش ۔۔ چکر دار کرسی پر ترقی پسند تحریک کا ہیرو، اپنے لفظوں کے ہتھیاروں سے لیس ۔ ادھر شیلف کے پاس بچھی ہوئی دو کرسیوں پر سلطانہ جعفری یعنی اردو شاعری کی دیلیس اور دوسری کرسی پر خاکسار ۔۔ یعنی رفیعہ شبنم عابدی بیچ میں ایک لمبی سی تپائی ۔ جس پر ایک ٹیپ ریکارڈر بڑی دیر سے شرمائے گفتگو کی آوازوں پر کان لگائے ہوئے ۔ میں نے کہا۔ "راہی صاحب! آپ گفتگو شروع کیجیے۔ میں ریکارڈ کرتی جاؤں گی۔"

راہی صاحب نے "مہابھارتی" شان و شکوہ کے ساتھ اپنی شیروانی کی "زنبیل" (میں تعجب نہیں "زنبیل" ہی کہوں گی) سے ایک پاکٹ سائز ٹیپ ریکارڈر نکالا اور مسکرا کر مخاطب ہوئے۔

"دیکھو رفیعہ! ۔ یہ میرا ٹیپ ریکارڈر ہے۔ مگر تمہارے لیے نہیں۔ اسے میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "منظور ۔۔ چلیے۔ مگر اعلان کے طور پر الفاظ کا شکریہ ہی تو بجا دیجیے!"

اور پھر، الفاظ کا شکوہ بج گیا۔ ڈاکٹر راہی معصوم رضا نے پہلو بدلا۔ پان کی ڈبیا میں سے ایک گلوری نکال کر منہ میں ڈالی

اور پھر ۔۔

دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار

گفتگو شروع ہوئی ۔۔

بات سے بات چلی۔ صبح ملاقات چلی
ہاتھ میں ہاتھ لیے۔ سارا جہاں ساتھ لیے
تحفۂ درد لیے، پیار کی سوغات لیے

تیکھی نظریں ہوں ترش ابروئے خم دار رہیں
بن پڑے جیسے بھی دل سینوں میں بیدار رہیں

انھیں بیدار دلوں کا یہ بیانیہ قارئین کی نذر ہے۔ اس گفتگو کے دوران اکثر مقامات پر مجھے اختلاف رائے ہوا۔ آپ کو بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یاد رہے... گفتگو کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے۔ یاد رہے یہ محض دو اہم شاعروں اور ادیبوں کے مابین ایک گفتگو ہے انٹرویو نہیں (رفیعہ شبنم عابدی)

ڈاکٹر راہی معصوم رضا: اچھا تو میں آپ کو پریشان کرنا شروع کرتا ہوں۔ سب سے پہلے تو بھائی! مجھے بڑی خوشی ہے کہ آج آپ سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس سے میں ذاتی طور پر یہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں کہ میرے اپنے ذہن میں جو الجھنیں ہیں وہ صاف ہو جائیں کیونکہ آپ ہمارے ان بزرگ شاعروں، نقادوں اور مفکرین میں سے ہیں جنھوں نے ہماری رہنمائی کی ہے اور ہمارے سیاسی شعور کو بڑھنے اور صحیح یا غلط راستے پر چلنے میں مدد کی ہے۔

سردار جعفری: (ہلکے سے تبسم کے ساتھ) یہ غلط لفظ بہت صحیح ہے۔ کیا خوب! صحیح یا غلط راستہ۔

راہی: میں گفتگو شروع یہاں سے کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھیے ۱۹۳۶ء میں جب یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز کیا جائے تو اس وقت جو بزرگ تھے جن میں آپ بھی ہیں۔ ایک طرف پریم چند، مولانا آزاد اور حسرت موہانی کا سلسلہ جاتا ہے۔ تو آپ لوگوں نے کچھ بنیادی سوال ادب کے لیے اٹھائے تھے۔ اس وقت میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آج سنہ ۱۹۹۱ء میں، یعنی ۱۹۳۶ء سے لے کر سنہ ۱۹۹۱ء تک کا جو ہمارا ذہنی سفر ہے۔ تو کیا آپ یہ چاہیں گے کہ ان سوالوں پر دوبارہ غور کیا جائے یا ان بنیادی سوالوں کی شکل میں کوئی تبدیلی کرنا چاہیں گے۔ کیا آپ یہ سوچنا چاہیں گے کہ وہ سوال اب IRRELEVANT ہو گئے ہیں اور اب نئے سرے سے کچھ نئے، کچھ دوسرے سوال اٹھانا چاہیے۔

جعفری صاحب: اس وقت آپ یہ واضح کر دیں کہ کون سے سوال ذہن میں ہیں؟ یعنی نوعیت سوالوں کی کیا ہے؟

راہی صاحب: ادب کے بارے میں آپ لوگوں نے جو ایک پورا رویہ بنایا تھا کہ ادب کو ایلیٹ کلاس میں نہیں جانا چاہیے ادب عوام کی بہبود کے لیے ہے اور عوام کی لڑائی کے لیے ہے اور ادب کو جو ویسٹیڈ انٹرسٹ والا کلاس ہے اُن کے خلاف لڑنا ہے عوام اور دنیا اور اپنے ملک کی بہبود کے لیے۔ اور اسی میں یہ بنیادی سوال اٹھا تھا کہ ہمیں حسن کے معیار کو بدلنا ہوگا۔ جمالیات کا یہ سوال اسی سے نکلا تھا کیوں کہ اب تک ہمارا ادب جو تھا وہ ایلیٹ میں پھنسا ہوا تھا اور لگ بھگ انھیں کے مسائل کے بارے میں سوچتا تھا اور انھیں کے نقطۂ نگاہ کے حساب سے دیکھتا تھا۔ اور ہمارے شعرا بھی اسی انداز سے سوچ رہے تھے (جن میں مولانا حسرت موہانی الگ سے ایک سیکشن ہیں جنھوں نے اردو غزل کو سمجھیے کہ متوسط طبقے کے قریب لانے کی کوشش کی تھی) تو ۱۹۳۶ء میں جو سوال آپ لوگوں نے اٹھائے تھے کیا ان سوالوں پر دوبارہ غور کرنا آپ ضروری سمجھتے ہیں؟ یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سوال بعینہ ویسے کے ویسے ہیں یا کچھ نئے سوال اپنے آپ سے کرنے پر آپ تیار ہیں؟

جعفری صاحب: بہت اہم ہے یہ بات اور جواب دینا اس کا آسان نہیں ہے۔ اس لیے....

راہی صاحب: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ میں آپ کو پریشان کروں گا۔

بنے بھائی صاحب! ضرور کہیے۔ واقعی۔ جواب دینا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا۔ میں ذاتی تجربے کو ملا کر چلوں گا۔ تو یاد ہوگا۔ جس وقت یہ تحریک شروع ہوئی اس وقت تین چار گروپ نوعمر ادیبوں کے مختلف مقامات پر کچھ سوچ رہے تھے۔ چنانچہ ہم سے پہلے۔۔ سال دو سال پہلے کہنا چاہیے یا تین سال پہلے اختر حسین رائے پوری ناگپور میں گاندھی جی اور نہرو جی کے ساتھ مل کر سوچ رہے تھے۔ ان کے سوچنے کا ایک طریقہ تھا۔ پھر لندن میں سجاد ظہیر اور لوگ سوچ رہے تھے۔ ہم لوگ علی گڑھ میں سوچ رہے تھے۔ پہلے تو میں اس فضا اور اس ماحول کا ذکر کروں گا جس ماحول میں ہم سوچ رہے تھے۔ اس لیے کہ وقت اور مقام یہ دونوں بہت اہم ہوتے ہیں۔ اب میں سیاسی راہ پر آنے پر مجبور ہوں گا۔ اس وقت یورپ میں فاشزم کا عروج تھا اور ہندوستان میں ہم امپیریلزم کے خلاف لڑ رہے تھے اور ہمارے ادب میں جو ہماری روایت تھی اس کا براہ راست رشتہ ہمارے سماج سے جو طبقے بزرگ قائم کر چکے تھے۔ اسی وجہ سے سب کے ذہن میں یہ ایک سوال تھا کہ ہم اپنے اس ادب کا استعمال (استعمال کے لفظ پر ہمارے بعض لوگ جمالیاتی نقطہ نگاہ سے اعتراض کرتے ہیں کہ صاحب ادب کو آپ استعمال نہیں کر سکتے۔) لیکن ہمارے ذہن میں یہ چیز تھی کہ ہم اپنے ادب کو عوام کی بہبود کے لیے استعمال کریں گے اور اس کے لیے زبان کی تبدیلی ہمیں بہت ضروری محسوس ہوتی تھی۔ جب پریم چند نے کہا تھا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا تو اس کے پیچھے زبان کی تبدیلی بھی شامل تھی اور وہ کردار بھی شامل تھے، مثلاً وہ طبقے بھی شامل تھے جو نظر انداز ہوتے تھے۔ اب اس کو اگر میں حسرت کے رشتے سے چونکہ ان کا نام آیا اور غزل کے تعلق سے شروع کروں تو غالب کی غزل اور حسرت کی غزل میں جو بہت بڑا فرق نظر آئے گا۔ یہ وہ ہے کہ حسرت اردو غزل کی محبوبہ کو درمیانی طبقے میں تلاش کرنے میں کامیاب ہوتے اور ایسے کامیاب ہوئے کہ گویا تو ناگوار نہیں گزرا اور نہ محبوب کا ننگے پاؤں آنے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا اور پھر کوٹھے کے لفظ کا استعمال۔ کہ وہ

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

غالب کے ہاں آپ کو بام ملے گا۔ (اس سے ذرا آگے اگر چلیں) تو جوش ملیح آبادی نے ایک وسعت یہ دی کہ لالہ و گل جس میں ساری بہار سی آجاتی ہے اس کی توسیع بھی کر دی۔ انہوں نے بیلے کے پھولوں کا ذکر کیا۔ گیندے کے پھولوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے پتوں کے دونوں کا ذکر کیا۔ مالن والیوں کا ذکر کیا۔ مہترانی پر بھی انہوں نے نظم کہی جس کی وجہ سے ان پر بہت لعنت ملامت کی گئی۔ تو یہ ادب کی ایک جنبش عوام کی طرف تھی۔

میں اب بھی محسوس کرتا ہوں کہ ہمارا اردو غزل آشنا مزاج نثر میں بھی جس میں آرائشی حصہ بہت زیادہ ہے اور اس آرائشی حصے کی وجہ سے ہم بعض اوقات افکار کی بلندی اور وسعت تک نہیں پہنچ پاتے اور انہیں لفظوں میں سے ہم وسیع تر معنی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ہم انگریزی سے مثال لیں تو آج ۱۹۹۰ء میں انگلستان کا کوئی شاعر روایتی انداز سے کہہ رہا ہو یا غیر روایتی انداز سے) شیکسپیئر کی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ ملٹن کی زبان میں شاعری نہیں کرتا۔ حد یہ ہے کہ کیٹس اور شیلی کی زبان میں بھی شاعری نہیں کرتا، لیکن ہم آج بھی حافظ شیرازی کی زبان میں

شاعری کرتے ہیں اور ہماری تمام غزلوں میں الفاظ کا ایک سیٹ SET ہے۔ کوئی پانچ سو الفاظ کا۔ انھیں سے ہم شعر سے فضا پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ایک استعارہ بن گیا ہے۔ استعارہ بننے کی وجہ سے "میخانے" کا لفظ مختلف مقامات پر مختلف معانی اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے ابھی امام خمینی کی غزلیں پڑھی ہیں۔ نہ جانے آپ کی نظر سے گذریں یا نہیں۔

راہی صاحب:۔ جی نہیں۔

جعفری صاحب:۔ امام خمینی کی غزلیں جن میں اس طرح کے اشعار کہ "میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہو کر میخانے میں آگیا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کا دیوانہ ہو کر میں عاشق ہو گیا ہوں"۔ وغیرہ۔ اور اس پر عنوان یہ ہے کہ یہ امام خمینی کی روحانی شاعری ہے۔ جب کوئی ترقی پسند کہتا ہے کہ "میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہو کر میخانے میں آگیا ہوں" تو اسے انقلابی معانی دے دیے جاتے ہیں اور جب کوئی لکھنؤ کا روایتی شاعر کہتا ہے تو ہم کہتے ہیں یہ فرسودہ شاعری ہے۔

راہی صاحب:۔ اں تو بھائی (زبان میں قطع کلامی کی معافی چاہتا ہوں) آپ کے کہنے سے جو بات نکل رہی ہے وہ یہ کہ شعر کا مطلب قاری خود نکالتا ہے۔

جعفری صاحب:۔ وہ تو ہر طرح سے نکالے گا ہی!

راہی صاحب:۔ مثلاً یہ کہ جب ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شعر امام خمینی کا ہے تو ہم اس کا دوسرا مطلب نکال لیتے ہیں اور جب ہم کہا جاتا ہے کہ یہی شعر سردار جعفری کا ہے تو ہم اس کا دوسرا مطلب نکال لیتے ہیں۔ اور یہی شعر اگر اختر الایمان نے کہا ہو۔ (حالانکہ ایسا ہو نہیں سکتا) تو ہم اس کا تیسرا مطلب نکالیں گے۔ تو یہ تفہیم تو قاری کا حق ہے۔

جعفری صاحب:۔ میں تفہیم پر ذرا بعد میں آؤں گا۔ میں تو ARCHAIC زبان کی بات کر رہا ہوں۔ مثال کے طور پر "زمین کوئے جاناں" یہ ترکیب ہم جب بھی استعمال کریں گے داد مل جائے گی کسی جگہ بھی۔ ابھی میں نے (اس وقت پورے یورپ میں سوشلزم میں جو اسلہ چل رہا ہے۔ کچھ لوگ اسے "بحران" کہتے ہیں) اس پر چند اشعار کہے ہیں۔ وہ بوا سے کیے پورے روایتی زبان میں ہیں۔ اور شروع کا ایک شعر اس طرح ہے کہ ؎

عقیدے بجھ رہے ہیں، شمع جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

اب دیکھیے "شمعِ جاں"۔

راہی صاحب:۔ ہاں "عقیدے بجھ رہے ہیں" یہی نئی بات ہے۔ پھر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی...

جعفری صاحب:۔ خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے۔

اب دیکھیے یہ "زمین کوئے جاناں" اس میں۔

راہی صاحب:۔ مگر بھائی اگر ہمارے بزرگ شعراء نے یہ مصرع کہا ہوتا تو "ذوقِ جنوں" نہیں کہتے "شوقِ جنوں" کہتے۔ یہ جو ہے یہ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔

جعفری صاحب:۔ اب اسی میں یہ شعر آجاتا ہے۔ اس قسم کا۔ کہ ؎

پریشاں روزگار آشفتہ حالاں کا مقدر ہے
مگر اس زُلفِ پریشاں کی پریشانی نہیں جاتی

راہی صاحب:۔ پریشانی نہیں جاتی — واہ! —

جعفری صاحب:۔ خالص روایتی — لیکن اس کے بعد ایک شعر اور آتا ہے عکر
نئے خوابوں کے دل میں شعلۂ خورشیدِ محشر ہے

راہی صاحب:۔ نیا — جدید — عکر　نئے خوابوں کے دل میں شعلۂ خورشیدِ محشر ہے

جعفری صاحب:۔ جی ہاں — بالکل — اور آگے —
مگر حضرتِ انساں کی سلطانی نہیں جاتی

تو یہ جو DEMOCRATIC MOVEMENT ہے اس کی طرف اشارہ ہے۔ ہاں تو میں ARCHAIC زبان کی بات کر رہا تھا۔ تشبیہیں، جاڑوں کے زمانوں میں جنوں میں بن وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی گیا تو دیکھا بہت تیز دھوپ میں لڑکے لڑکیاں گھاس پر بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نے جگن ناتھ آزاد سے کہا کبھی میری ایک نظم میں ایک شعر ہے کہ —

راستے روڈ کے اسکولوں سے مل جاتے ہیں
بچے پھولوں کی طرح گھاس پہ کھل جاتے ہیں

مگر یہ شعر غزل آشنا مزاج کو خوش نہیں کرتا۔ ہم آپ اس شعر سے خوش ہو سکتے ہیں۔ دنیا کی کسی شاعری میں جب یہ خیال آئے گا، اس کی داد ملے گی۔ یا میں نے "نئی دنیا کو سلام" میں — اس قسم کے مصرعے بھی کہے ہیں۔

چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں گاؤں کی لڑکیاں
چوڑیاں گنگناتی نہیں۔

غزل آشنا مزاج سے باہر — وہ اس سے خوش نہیں ہوتا، لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں وسعت کی سخت ضرورت ہے۔ خاص طور پر زبان میں — روایت اپنی جگہ قائم ہے۔ زبان کی وسعت بھی نئے مفاہیم کے ساتھ نئے انداز کے ساتھ یہ چیز کرنی چاہیے۔

راہی صاحب:۔ بھائی یہاں ایک سوال میں کھوجتا چلوں۔ یہ جو ARCHAIC زبان آپ کہہ رہے ہیں اس زبان سے ہماری جان پہچان تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔

جعفری صاحب:۔ جی نہیں صاحب — تقریباً ایک ہزار سال پرانی ہے — فارسی سے۔

راہی صاحب:۔ جی میں تو اپنے یہاں کی بات کر رہا ہوں۔

جعفری صاحب:۔ ہاں اپنے یہاں بھی تقریباً تین سو سال پرانی۔

راہی صاحب:۔ ہاں تو یہ ڈیڑھ دو سو سال سال پرانی جان پہچان ہے اور ہم اس میں رچے بسے ہیں اور اس میں بھی کہ زبان میں ہر استعارے کو ہمارے بزرگوں نے کیسے استعمال کیا تھا اور ان کے قارئین نے انھیں کیسے سمجھا تھا۔ وہ تو ہماری ایک

رشتہ داری ہے ان لفظوں سے ___ وہ جو حالی نے ایک بات کہی تھی کہ بھائی نئی بات کہو اور فارم کو مت بدلو۔

…صاحب: اقبال نے بھی یہی کہا تھا۔

…صاحب: ہاں تو ___ ایک نہ ایک سہارا تو آپ اپنے قاری کو دیں گے نا؟ کہ جس کی انگلی پکڑ کر وہ ہمارے شعروں کی گلیوں میں جائے۔ ہم خیال بھی ایسا دے رہے ہیں جو اس کے لیے اجنبی ہے اور زبان بھی ایسی دے رہے ہیں جو اس کے لیے اجنبی ہے تو اس میں اس کا اندیشہ ہے کہ اس کا دل اُچاٹ ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ ARCHAIC زبان جس کو ترقی پسندوں نے استعمال کیا اور جسے آپ ARCHAIC کہہ رہے ہیں وہ سب سے بڑا کارنامہ ہے ترقی پسند ادیبوں کا کہ انہوں نے اس زبان کو، اس زبان سے ہم واقف تھے، اسی VOCABULARY کا استعمال کیا لیکن زمانے کے مطالب میں یکسر بڑی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔

…صاحب: اس کے ذریعے سے ہم نئے خیال میں کامیاب ہوتے۔

…صاحب: بالکل صحیح۔ اگر اس کے بدلے آپ نے کوئی نئی زبان گڑھی ہوتی تو جہاں تک آپ پہنچے میرے خیال میں وہاں تک پہنچنے میں آپ لوگوں کو دقت ہوتی۔

…صاحب: نہیں ___ یہ تو صحیح ہے کہ جو زبان ہم نے استعمال کی، پرانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے اس کو وسعت دی۔ اور جب تک کہ زبان میں ایسی وسعت نہیں آئے گی، اس وقت تک ہم زیادہ بڑے طبقے تک نہیں پہنچ سکتے۔

…صاحب: بالکل صحیح ___ جیسا کہ آپ نے کہا ___ چوڑیاں گنگناتی نہیں ___ یہ تو حسرت کی روایت ہے۔

…صاحب: جی ہاں ___ حسرت کی روایت ہے، جوش کی روایت ہے۔

…صاحب: جو آپ کو اُن سے ورثے میں ملی اور ہم کو آپ سے ورثے میں ملی اور ہمارے بعد ہم سے دوسروں کو ورثے میں ملے گی۔ تو زبان ترقی کرے گی ہی۔

…صاحب: لیکن زبان کے علاوہ بھی ایک اور چیز ہے۔ وہ یہ کہ ایک مقام پر ہم نے پسپائی قبول کی ہے گذشتہ پچاس سال میں ___ ہم کامیاب ہوئے مجموعی حیثیت سے، انفرادی حیثیت سے کوئی شاعر کم تر ہے، کوئی بلند تر ___ یہ ایک الگ بات ہے ___ اور اس کامیابی میں جو سب سے بڑا FACTOR تھا، عنصر تھا وہ یہ کہ ہم نے عام زندگی، عام انسانی مسائل اور نظریات ___ ان کو لیا، ان سے ہم نے مُنہ نہیں موڑا اور ان سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ اسی وجہ سے ہمیں کامیابی ملی۔ لیکن ہمارے کچھ مخالفین بھی تھے۔ وہ شروع سے اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان نئے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ جب سیاسی، سماجی اور تاریخی حالات کی وجہ سے قدروں کی شکست و ریخت شروع ہوئی جو آج اس منزل پر پہنچی ہے تو ہم میں سے کچھ لوگوں نے (ہم ان میں نہیں ہوں) اس کو قبول کر لیا کہ ہاں صاحب! ہم غلطی کر رہے تھے۔ ہم کو بہت ہی عمومی اور عوامی انداز میں کہنا

چاہیے تھا۔ کچھ اس طرح سے کہنا چاہیے تھا کہ داد مل جائے، لیکن اچھے شاعر یا اچھے ادیب کا کام داد حاصل کرنا نہیں ہے۔ اس کا کام ہے راستے بنانا۔ اس لیے وہ سوالات اپنی جگہ پر بالکل باقی ہیں جو سوالات ۳۶ء میں ہم نے اٹھائے تھے اور جن سے ہم مکمل طور پر نہیں کسی حد تک عہدہ برآ ہو سکے تھے۔ آج وہ زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔ یہی تو رشید احمد صدیقی صاحب نے ترقی پسند تحریک کو اس بات کی داد دی تھی۔ (حالانکہ وہ اس تحریک کے بہت بڑے مخالف تھے۔) کہ ترقی پسند تحریک نے فرقہ پرستی کے خلاف جو کارنامہ کیا ہے وہ اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اور شکرگزاری کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ آج اس سے زیادہ شدید حالات ہیں۔ اور اس لیے ہمارے ہاں بعض لوگوں میں یہ سنی سزم CYNISM پیدا ہو گئی ہے کہ ہم انسان کی مکمل شکست کو اپنا موضوع بنائیں۔ اور انسان کی جدوجہد کو اپنا موضوع بنائیں۔ اس رویّے کی بنیادی تبدیلی ہے۔ اور اس طرح رویّے میں بڑی بھاری تبدیلی آئی ہے۔ اس تبدیلی کے زیرِ اثر وقتی طور پر ہمارے کئی ترقی پسند ہیں جنھوں نے پسپائی قبول کی۔

راہی صاحب:۔ ایک آدھ شعر ان کا سنائیں گے۔

جعفری صاحب:۔ اس طرح کے اشعار۔ نہیں جی بڑا مشکل ہے۔ اس طرح کے اشعار اس لیے بھی نہیں سنانا چاہیے کہ مایوسی بھی شاعر اور ادیب کا حق ہے۔ اسے حق ہے کہ وہ کسی وقت بالکل مایوس ہو جائے اور نکل آئے لیکن میں تو پسپائی کا ذکر کر رہا ہوں۔

راہی صاحب:۔ جہاں انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

جعفری صاحب:۔ ہتھیار ڈال دیے اور یہ کہہ کے کہ ہاں صاحب آپ صحیح کہہ رہے تھے کہ ہم غلطی پر تھے۔ تو صاحب ایک چیز یہ ہے دوسری چیز اسی کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ ہمارے یہاں انتہا پسندی اور تنگ نظری رہی جس سے تحریک کو نقصان پہنچا اور اس میں ہم نے کسی کو نہیں بخشا اور اس کا ردِّعمل بھی ہوا، لیکن اب ایک توازن پھر قائم ہوا ہے۔ کیوں کہ ان رویوں پر نظرِ ثانی بھی کی گئی۔ اور کی جانی چاہیے تھی۔ ادب کی تقویت کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے، لیکن ان رویوں کے اعتبار سے جو بڑی شاعری ہوتی یا جو بزرگوں کے ساتھ زیادتی ہوئی اس کا بھی میرے پاس ایک جواز ہے (یہ صحیح نہیں ہے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص اس کو تسلیم کرے) وہ یہ ہے کہ جب کوئی بڑی تحریک یا کوئی اہم ادیب یا شاعر آتا ہے اور وہ اپنے لیے زمین تیار کرنا شروع کرتا ہے تو وہ اپنے بزرگوں کے بعض رویوں سے اختلاف کرتا ہے۔ بقول غالب کہ۔ ع

آنکس کہ شد صاحب نظر، پیرِ مغاں را خوش نہ کرد

میں یہاں سے۔ اُدھر کو چلوں کہ صاحب ہم نے اقبال پر حملہ کیا۔ اقبال نے حافظ شیرازی پر حملہ کیا۔ اقبال اپنا راستہ نہیں بنا سکتے تھے کیوں کہ ان کا جو آہنگ ہے، ان کا جو فلسفۂ خودی ہے اور جو وہ ملت کو بیداری کا سبق دے رہے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جو حضرت موسیٰؑ نے TEN COMMANDMENTS دیے تھے کوہِ طور سے۔ تو اقبال کوہِ طور سے بولتے ہیں اور اسی پہ حافظ جو کوہِ طور سے نہیں بولتا بلکہ محبوب

کی گلی میں سے بولتا ہے اور میخانے کے دروازے سے بولتا ہے تو وہ حافظ ان کو ناگوار تھا، لیکن حافظ نے بڑا سخت انتقام لیا اقبال سے اور وہ یہ کہ اقبال کی ساری فارسی غزل ــــ

راہی صاحب:۔ حافظ کے رنگ میں نہائی ہوئی ہے۔

جعفری صاحب:۔ ہاں جی ــــ پیام مشرق ــــ سارا حافظ کا دیوان ہے۔ میں نے اس کو اس طرح سے کہا ہے کہ شیراز کے بلبل نے لاہور کے شاہین کو پیچھے کر دیا۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہم اپنا توازن برقرار رکھیں۔ اقبال نے نظر ثانی کی اپنے رویّے پر حافظ کے سلسلے میں۔ ہم نے اقبال کے سلسلے میں نظر ثانی کی اور ہمارے آج کل کے نوجوان ــــ وہ جب ہم پر حملہ کرتے ہیں تو ہم نے دیکھا ہے (ایک اور چیز بھی دیکھی ہے۔ اس پر میں بحث نہیں کروں گا) وہ یہ کہ ــــ تھوڑی دیر کے بعد معذرت کا انداز اختیار کرتے ہیں کہ "نہیں صاحب ہم نے یوں نہیں کہا تھا۔ ہم نے تو یوں کہا تھا۔" تو میں ان سے کہتا ہوں کہ بھئی کھل کر کہو۔ اس لیے کہ تم اپنا . . .

راہی صاحب:۔ بھائی اس میں کیا ہے کہ پہلے نظر ہو تو تب نظر ثانی ہو نا؟

(قہقہہ)

بنیادی سوال تو وہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ نظر ہے کہ نہیں۔ کیونکہ جب ہم کسی سوال پر سوچیں گے تو ہم آگے چل کے پھر اپنے کو REVISE کریں گے کہ نہیں بھئی ہم نے یہ غلط کیا ہے۔ ہم نے یہ صحیح کیا۔ یا ہم کو یہ نہیں کرنا چاہیے تھا یا ہم کو شدت کے ساتھ کرنا چاہیے تھا، لیکن ہم نے تو سوچنے کا کام لگ بھگ بند کر رکھا ہے اس لیے کہ . . . .

جعفری صاحب:۔ آج کل تو اور بند ہو گیا ہے۔

راہی صاحب:۔ جی ہاں ــــ اس لیے . . . . . .

جعفری صاحب:۔ لیکن اس تحریک نے جو بہت بڑا کام کیا ہے وہ یہ کہ میں اسی بات پر جا رہا ہوں کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" اس نے الفاظ کے معانی بدل کے نئے تصوّرات ڈھال دیے۔ جیسے کہ اقبال نے "خودی" کے لفظ کے معنی بدل دیے مجاز نے آوارہ کے معنی بدل دیے۔ مجاز کی نظم "آوارہ" کو میں اس عہد کی نہیں بلکہ پوری ترقی پسند تحریک کی بڑی نمائندہ نظم سمجھتا ہوں۔ اور یہ بڑی نظم ہے۔ اس کا شمار بڑی شاعری میں ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجاز نے ایک بڑی نظم کہہ دی تو وہ بڑے شاعر ہو گئے۔ عظیم ان معنوں میں نہیں ہو سکتے میں بڑی شاعری کے لیے تین چار چیزیں استعمال کرتا ہوں۔ ایک تو سہولتِ اظہار (فارسی کے اعتبار سے یہ ترکیب غلط ہے لیکن میں استعمال کرنا چاہتا ہوں) جو ہمارے اساتذہ کی دین ہے کہ شعر

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

راہی صاحب:۔ سہلِ ممتنع جسے کہتے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ جی ہاں۔ سہلِ ممتنع ـ تو میں اظہار کے لفظ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اس کے ساتھ ندرتِ اظہار کہ جو تخیل کی کار فرمائی ہے، اور اس کے بعد "عظمتِ اظہار" جو فکر کی کار فرمائی ہے۔ اس کی وجہ سے اس میں تاثیر پیدا

ہوتی ہے۔ مجاز کے ہاں سہولتِ اظہار کے ساتھ ساتھ ندرتِ اظہار بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اور ان میں فکر کی ایک نئی نہج ہے۔ اور اس نئی نہج میں ۔۔ میں نے اس پر غور کیا کہ ہمارے اساتذہ کے ہاں شاید نہیں ملے گی یہ چیز۔۔ لیکن میں یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ جوش کے ہاں موجود ہے اور مجاز کے ہاں موجود ہے کہ تشبیہہ اور استعارہ درست ہم نے سماجی تنقید سا کام لیا۔ میں پہلے جوش کا ایک شعر سناؤں پھر مجاز کی "آوارہ" کا ایک بند سناؤں۔ جوش کی "شہری اور دیہاتی بازار" بہت اچھی نظم ہے..... یہ نظمیں پبلو نرودا کے ہاں بھی ملتی ہیں بالکل اسی طرح کی نظمیں۔ بازار اور وہی بازار ۔ کیونکہ لاطینی امریکہ اور ہندوستان دونوں بہت ملتے ہیں اس میں ایک شعر ہے کہ ۔

ماؤں کے کاندھوں پہ بچے گردنیں ڈالے ہوئے

مجھے شعر اچھی طرح یاد نہیں ۔

تیز کرنیں یوں کہ جیسے روح پہ عکسِ گناہ

راہی صاحب:۔ خوب۔

جعفری صاحب:۔ نہیں نہیں ۔۔۔ غالباً شعر یوں ہے ۔۔۔

تیز کرنیں جیسے بوڑھے سود خوروں کی نگاہ
دھوپ کی تیزی کہ جیسے روح پر عکسِ گناہ

اب یہ جو ہے کہ " جیسے روح پر عکس گناہ " اور " بوڑھے سود خوروں کی نگاہ اس میں پوری سماجی تنقید ہے اور پورا ہمارا اس وقت کا سماج زندہ ہے۔ آج بھی یہی ہے۔

اسی طرح مجاز کی " آوارہ " میں ۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

اس میں بھی، ان تشبیہوں میں پورا سماجی شعور جلوہ گر ہے۔ اور محل اور اس کا جو پورا رشتہ ہے بنیے کے ساتھ بیوہ کے ساتھ اور مفلس کے ساتھ ۔۔۔

راہی صاحب:۔ غالب نے نہیں کہا تھا کہ ۔۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یا میر نے کہا تھا ۔۔

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

یا ــہ　　دل کی بربادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر نکلا

تو بھی۔ بڑی شاعری تو سماج سے ناتا توڑ کے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

جعفری صاحب:۔ میرے خیال میں اس سے تو اختلاف ممکن نہیں ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اور ادیبوں نے اور شاعروں نے ایک نئی جمالیاتی فضا پیدا کی جو ہماری قدیم جمالیاتی فضا سے مختلف ہے۔

راہی صاحب:۔ مگر میں پھر پہلے سوال کی طرف لوٹتا ہوں کہ کیا کوئی نیا سوال آپ کرنا چاہیں گے یا ۳۶ء کے سوال ہی کافی ہیں؟

جعفری صاحب:۔ نہیں کافی تو کبھی نہیں ہوتے۔ کیونکہ نئے زمانے میں نئے سوال۔ . . .

راہی صاحب:۔ تو کیا نئے سوال وہی ہیں۔؟

جعفری صاحب:۔ نئے سوال تو وہی ہیں جو میں نے کہے ہیں کہ "زمین کوتے جاناں"۔

راہی صاحب:۔ اس کے بارے میں تو الگ سے سوال کروں گا۔ اچھا دوسرا سوال۔ چونکہ ادھر ہم لوگ زبان ہی کی بات کر رہے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ ہاں ایک چیز اور ہے۔ اچھا۔ کہ ہم نے اپنے ادب کو سیاست سے ضرورت سے زیادہ وابستہ کیا ہے۔ اس میں کمی کی بڑی ضرورت ہے اور پریم چند نے ہم کو جو بات بتائی تھی اس پہ ہم نے عمل نہیں کیا، ہم نے اس پہ تو عمل کیا کہ حسن کا معیار بدلنا ہوگا مگر. . . .

راہی صاحب:۔ حسن کو چھوڑ دیا۔

جعفری صاحب:۔ نہیں حسن کو چھوڑا تو نہیں ہے صرف معیار بدلنا ہے، لیکن پریم چند نے یہ بھی کہا تھا کہ ادب سیاست کے پیچھے چلنے والی شئے نہیں ہے۔ یہ مشعل ہے جو سیاست کے آگے آگے چلتی ہے۔

راہی صاحب:۔ جو نہیں ہوا۔

جعفری صاحب:۔ جو نہیں ہوا۔

راہی صاحب:۔ اس پہ آپ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جو ادب سیاست کے پیچھے چلنے لگا ہے۔ یہ جو ہماری قومی تحریک تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی اور اس کے جو رہنما تھے چاہے وہ داہنے ہاتھ والے ہوں، چاہے وہ بائیں ہاتھ والے۔ چاہے بیچ والے سب کو ادب کی سیاسی اہمیت کا اتنا احساس نہیں تھا جتنا انھیں ہونا چاہیئے تھا۔ انہوں نے شاعری کو مجمع لگانے کے لیئے استعمال کیا۔ انہوں نے شاعروں کو کسی لیڈر کی تقریر سنانے کے لیئے پہلے اسٹیج پر استعمال کیا۔ انہوں نے الیکشن میں شاعروں کو پوسٹر کی طرح استعمال کیا، لیکن ہماری سب سے بڑی پولیٹیکل پارٹی جیسے کانگریس۔ اس نے کبھی ادیب کے مسائل یا ادیب کے مسائل یا ادب کی کیا طاقت ہے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اب چونکہ لڑائی آزادی کے لیئے چل رہی تھی اور جو بھی تھا وہ یہی کہہ رہا تھا کہ پنڈت نہرو کے پیچھے چلو۔ مہاتما گاندھی کے پیچھے چلو فلانے کے پیچھے چلو تو ادیب بھی ان کے پیچھے چلنے لگا۔ اس طرح کیا ہماری سیاسی تحریک پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ اس نے. . . . .

جعفری صاحب:۔ بے شک سیاسی تحریک پر الزام عائد ہوتا ہے۔ اور صرف کانگریس پر ہی نہیں بلکہ ہر سیاسی پارٹی پر۔

راہی صاحب:۔ میں سبھی پارٹیوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں لیکن ALMOST کانگریس پر جس نے ترقی پسند تحریک کی رہنمائی قبول کی اس پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ اس کو ادب کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔

جعفری صاحب:۔ ادب کی جمالیات کا کوئی اندازہ نہیں۔ ادب کی اہمیت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں ایک چیز ہے۔ وہ یہ کہ میں ادب کو دو حصوں میں بانٹتا ہوں ایک ادب ہمیں چاہیے نچی سطح کا اور ایک ہم کو چاہیے اعلیٰ سطح کا۔ نچی سطح سے مراد وہ ادب ہے جو ہما۔ ی تحریکوں میں سب سے پہلے استعمال ہو سکے۔ یہ کام ہم سے بہت پہلے ہوا مثلاً بنگال کی تقسیم کے بعد ٹیگور نے گیت لکھے اور تقسیم کے خلاف جلوسوں میں پڑھے۔ اور ٹیگور نے جو اعلیٰ درجے کی شاعری کی...

راہی صاحب:۔ نہیں بھئی ـــ وہ شاعری جو ہم کریں جلوس میں پڑھنے کے لیے۔ اور ایک وہ شاعری جو ہم کرتے ہیں ادب کے لیے جو ہماری ادبی شاعری ہے تو وہ شاعری جلوس کے لیے لکھی جا رہی ہے وہ تو لکھی ہی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ وہ تو ہمارا سیاسی عقیدہ ہے۔ جس سیاسی جماعت سے ہم منسلک ہیں اس سیاسی جماعت کو ضرورت ہے اس قسم کی نظم کی اس کو تو شاعری ماننا مشکل ہے۔

جعفری صاحب:۔ اس کو جماعتی کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ میر کا شعر ہے کہ "چور اُچکّے ... یا وہ والا شعر

سُنا ہے میں نے لے گھیتے ترے خلوت نشینوں سے
کہ تو دار و پیا ہے رات کو مل کر کمینوں سے

راہی صاحب:۔ کیا اب اس کو ہم میر کا نمائندہ شعر کہیں گے! میرا مطلب ہے کہ ہم جب میر کا مقام متعین کریں گے تو کیا ادب میں اس شعر پر غور کریں گے۔

جعفری صاحب:۔ نہیں نہیں ـــ عرض یہ کرنا تھا کہ یہ اشعار جو تحریک کے لیے استعمال ہوئے....

راہی صاحب:۔ نہیں اس کو شاعری میں مت ملائیے۔

جعفری صاحب:۔ شاعری میں کیوں نہ لائیں؟

راہی صاحب:۔ نہیں بھئی ـــ یہ شاعری میں کیسے آئے گا کہ ـــ

یہ جو ہے ہٹلر کا چیلا، مارے ساتھی جانے نہ پائے

یہ کوئی شاعری ہے۔

جعفری صاحب:۔ یہ ضرورت والی شاعری ہے۔

راہی صاحب:۔ ضرورت تھی اس لیے تک بندی کی گئی، مگر اس کو شاعری کا درجہ دینا تو مشکل ہے۔ کم از کم آپ سے مجھ کو اس بات کی اُمید نہیں تھی۔ میں صاف کہہ دوں۔

جعفری صاحب:۔ دو سطح کی شاعری ـــ بھئی دیکھیے تو سب کے ہاں ملے گی۔

راہی صاحب:۔ نہیں نہیں ـــ ملنے کا سوال نہیں ـــ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ جب آپ میر کے طالب علم ہیں۔ اور جب آپ میر پر مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں۔ میر کی شاعری پر تو..... رتبے کے تعین میں آپ اس پر تو نہیں جائیں گے نا... چور اُچکّے..... فلانا ڈھمکا..... یہ سب....

جعفری صاحب:۔ رتبے کا تعین تو ہم کرتے ہیں اعلیٰ درجے کی شاعری سے۔

راہی صاحب۔ تو شاعری تو وہی ہے نا؟ جسے آپ اعلیٰ درجے کی کہہ رہے ہیں۔؟

جعفری صاحب:۔ اور ضرورت والی شاعری جو ہے۔

راہی صاحب۔ ضرورت والی شاعری نہیں ــ تک بندی ہے۔

جعفری صاحب:۔ (مسکرا کر) اچھا آپ تک بندی کہہ لیجیے۔

راہی صاحب۔ وہ تک بندی ہے۔ ضرورتاً کی گئی۔ سیاسی ضرورت میں چمچہ گیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی دشمنیاں ہوتی ہیں۔

جعفری صاحب:۔ (یہاں سامعین میں سلطانہ جعفری کچھ پہلو بدلتی ہیں اور نظیر کی شاعری کو درمیان میں لے آتی ہیں کہ وہ بھی تو ضرورت کی شاعری تھی، لیکن اسے "نیچرل شاعری" کہہ کے بات مکمل ہو جاتی ہے۔ معصوم رضا اسے ضرورت کی شاعری قرار نہیں دیتے) البتہ پھر آگے بڑھتی ہے۔

جعفری صاحب:۔ بھئی دیکھیے ایک شاعری کا عوامی دھارا ہے اور ایک شاعری کا......

راہی صاحب:۔ میرا مطلب ہے شاعری ایک دھارا ہے۔ ایک دریا ہے جو بہتا چلا جا رہا ہے۔ کہیں کنارے بدل جاتے ہیں۔ کہیں کشتیاں بدل جاتی ہیں۔ کہیں ویرانہ آ جاتا ہے۔ کہیں محل آ جاتا ہے۔ پر دریا تو بہتا چلا جاتا ہے۔ تو اس دریا کو اس کنارے کی وجہ سے کہ یہ عوامی دریا ہو گیا یہ خواص کا دریا ہو گیا اور یہ متوسط طبقے کا دریا ہو گیا۔ اس طرح سے تو......

جعفری صاحب:۔ نہیں اس طرح مناسب نہیں ہے۔ ہے یہ وہی دریا مگر اس دریا میں کہیں تنکے بھی بہہ رہے ہیں اور کہیں گلاب بھی

راہی صاحب:۔ ہاں وہ تو صحیح ہے، لیکن اس طرح کہنا کہ یہ عوامی سطح کی شاعری ہے اور یہ اعلیٰ درجے کی شاعری ہے تو اس تقسیم کو حلق سے اتارنے میں بھائی ذرا پریشانی ہے۔

جعفری صاحب:۔ بھئی اس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ ہر شاعر جو ہے دو طرح کی شاعری....

راہی صاحب:۔ آپ اپنے شعر سنائیے۔ جو عوامی کہے ہوں ــ سنائیے۔

جعفری صاحب:۔ (سوچ کر) ہم نے کہا ہے کہ ؎

آج ٹکراتے ہیں ایوانِ حکومت سے عوام

ساتھیو لال سلام

راہی صاحب:۔ اچھا تو گیا اس کو آپ اپنی شاعری ــ یعنی یہ کہ ــ جب کبھی آپ اپنی شاعری کا جائزہ لینے بیٹھیں گے تو اس شعر کا ذکر آئے گا کہ علی سردار جعفری شاعر کیسے تھے تو.....

جعفری صاحب:۔ اس کا ذکر یوں آئے گا کہ یہ ادنیٰ درجے کی شاعری تھی۔

راہی صاحب:۔ جب آپ نے خود ہی اس کو کاٹ دیا کہ یہ ادنیٰ درجے کی شاعری ہے تو جب ہم ادنیٰ درجے کی شاعری خود ہی مان رہے ہیں، پھر ہم اس کو شاعری کا رتبہ کیوں دیں؟ شاعری کا ذخیرہ کیوں دیں؟ بھئی ہماری ضرورت یہ ہے

کہ چاہے بھنڈی خرید کر لے آئیں۔ کیونکہ بھئی آج ہم مرغی نہیں کھا سکتے یا بیڑ نہیں کھا سکتے۔ تو ٹھیک ہے بھنڈی کھائیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بھنڈی بیڑ سے اچھی ہے۔

(خاکسار نصیبیاں یہ کہہ کے مداخلت کرنے کی جسارت کی کہ بھنڈی کا بھی تو اپنا مزا ہے اور کبھی کبھی مرغی سے زیادہ لذیذ لگتا ہے، لیکن راہی صاحب اسے مرغی کا درجہ دینے سے منکر رہے) اور اس اٹل انکار کو دیکھ کر جعفری صاحب نے گفتگو کو مہیز لگائی۔

جعفری صاحب:۔ اچھا صاحب آگے چلیں۔

راہی صاحب:۔ اب بھائی میں جو اگلا سوال کرنا چاہ رہا ہوں۔ وہ زبان کے متعلق ہے۔ ابھی زبان کی بات ہو رہی تھی کہ.....

جعفری صاحب:۔ آپ اس سے متفق ہیں کہ اردو شاعری کی زبان کو وسعت کی ضرورت ہے۔

راہی صاحب:۔ جی ہاں ــ بالکل ــ میرا اپنا سوچنے کا طریقہ بھائی یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جو ادبی زبان ایجاد کی گئی تھی۔ خاص طور پر شاعری کی ــ اس میں ہم نے یہ کیا کہ یہ جو ہمارے پرانے استعارے تھے ان کے مطالب میں توسیع کی اور کہیں کہیں ان کا مطلب بالکل بدل دیا۔

جعفری صاحب:۔ صرف استعاروں کا ہی مطلب نہیں بدلا بلکہ کئی ایسے شعر بھی کہے جن کا شمار میں بڑی شاعری میں کرتا ہوں۔ میری نظر میں ہندوستان کی پندرہ سولہ زبانوں کی شاعری ہے، کیونکہ میں نے اس پر کام کیا ہے ایک زمانے میں۔ میں جذبی کا ایک شعر سناتا ہوں ؎

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں، جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرّہ ہیرا ہے، اس وقت یہ شبنم موتی ہے

گجراتی کے ایک شاعر ہیں۔ ان کے ہاں بھی یہ خیال ہے اور اس کا شمار گجراتی زبان میں اچھی اور بڑی شاعری میں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ ہو رہا ہے کہ جذبی کے اس شعر کو کاٹ دیں گے اور اس شعر کو لیں گے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی۔ ساحل کی تمنّا تھی کس کو
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنّا کون کرے

اسی طرح سے سری سری کی ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ "مہا پرستھانم" ایک زبردست یلغار۔ ہمارے ہاں دو شاعروں نے اسی طرح کی نظمیں کہی ہیں۔ ایک بہار کے جمیل مظہری نے "برادران نوجوان، بڑھے چلو، بڑھے چلو" اور پھر جوش نے اس قسم کی تحریکی نظمیں کہیں، لیکن ہمارے جو CTHIEST ہیں وہ ان نظموں کو الگ کر دیتے ہیں۔

راہی صاحب:۔ نہیں یہ تو ہمارے اُن کے درمیان اختلاف شاعری کی تعریف میں ہے۔ میں جو کہہ رہا تھا کہ ہندوستان میں موضوع بھی بدلا۔ استعارے بھی بدلے۔ اس کے مفاہیم میں توسیع کی تو ظاہر ہے کہ سارے ہندوستان میں تحریک آزادی چل رہی تھی۔ کچھ خیالات تھے جو سارے ملک میں تیر رہے تھے اور ہر زبان کے شاعر نے ان خیالات کو لیا اور اپنی زبان کے اعتبار سے اس میں اظہار کیا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اب تک جو زبان تھی ہماری ۱۹۳۶ء کی وہ ۱۴ اگست ۴۷ء تک تو ساتھ آئی۔ ۱۴ اگست کو ہمارے ملک میں ایک زبردست تبدیلی ہوئی۔ وہ آدھی ادھوری تبدیلی ہی سہی،

مگر تبدیلی ہوئی اور وہ یہ کہ ہم غلام تھے، آزاد ہو گئے۔ تو جو شاعری کے لیے ہم نے غلام ہندوستان میں بنائی تھی وہ بعینہ آزاد ہندوستان کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتی تھی اور اس کے لیے ہمیں شاعری میں ایک نئی زبان کی ضرورت تھی اور میرا خیال ہے کہ اقبال چل رہے ہیں اور ابھی تک ہمارے شعرا زبان بنانے، گڑھنے یا اسے کوئی نئی شکل دینے میں کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے دس، بیس برس میں کوئی زبان بن جائے۔ لیکن یہ بات صحیح ہے کہ ہمیں ہماری شاعری کے نئے تقاضوں کو اور نئی ادبی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک زبان کی ضرورت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اس کو آپ دیکھیں اور ہندوستان میں جو اردو شاعری ہو رہی ہے اس میں ـــ میں دیکھ رہا ہوں، کیا معلوم صحیح ہے یا غلط، کہ پاکستان میں لہجے، زبان یا استعارے کی بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ وہ انھیں استعاروں کو جو شروع سے چلے آ رہے ہیں۔ اور لگ بھگ اسی زبان کو جو شروع سے چلی آ رہی تھی استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں، مگر ہماری شاعری میں بہت بڑی تبدیلی ہوئی ہے۔ اچھی یا بری وہ الگ بات ہے، مگر ہمارے شاعر نئے طریقے کی زبان بنانے کی کوشش میں نئے استعارے تلاش کرنے کی کوشش اور نئے موضوعات کو چھونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہ کوششیں ہمارے یہاں جاری ہیں۔ یہ جو فرق ہے ہندوستان اور پاکستان کے اسلوب اور لہجے میں یہ فرق کیوں آیا ہے؟

جعفری صاحب: میرا خیال یہ ہے کہ فیض کو الگ کر دیجیے کیونکہ وہ ایک طرز ہی الگ ہے، لیکن ان کے بعد کے جو شعرا ہیں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں ـــ پاکستان کے ـــ ان کے لہجے میں ایک غم کی لہر ہے۔ ہمارے یہاں ایک نشاط کی لہر ہے جو اب بھی باقی ہے۔ مثلاً یہ کہ وحید اختر نے میر کی زمین میں ایک شعر کہا۔ میں یہ شعر اکثر QUOTE کرتا ہوں۔ اور غزل میں تو یہ بات اکثر کہی جاتی تھی کہ صاحب، دیکھیے فلاں استاد نے یوں استعمال کیا ہے۔ اور میں نے یوں استعمال کیا ہے۔" تو وحید اختر فخر کے ساتھ سر اٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ "صاحب میں نے لشکر کا قافیہ میر کے بعد اس طرح استعمال کیا ہے۔" میر کا مشہور شعر ہے کہ ؎

دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ
جانا جاتا ہے کہ اس شہر سے لشکر نکلا

اس نے کہا ؎

کل جہاں ظلم نے کاٹی تھیں سروں کی فصلیں
نم ہوئی ہے تو اسی شاخ سے لشکر نکلا

راہی صاحب: واہ ـــ نیا نکلا ہے۔

جعفری صاحب: بالکل نیا صاحب ـــ اور اس پر اس کو اعتماد ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ؎

ہر پیمبر سے صحیفے کا تقاضہ نہ ہوا
حق کا یہ قرض بھی نکلا تو ہمیں پر نکلا

راہی صاحب: واہ ـــ واہ

جعفری صاحب:۔ یہ چیز جو ہے وہ پاکستان کی شاعری میں مفقود ہے۔

راہی صاحب:۔ اس کی وجہ کیا ہے۔؟

جعفری صاحب:۔ اس کی وجہ وہاں کے حالات ہیں۔ آزادی سے پہلے تو روایت ایک ہی تھی۔ آزادی کے بعد ہمارے ہاں باوجود تمام باتوں کے جمہوری مزاج ہے جو پاکستان کے ہاں نہیں مل سکا۔ اس لیے ان کے ہاں غم اور احتجاج ہے یہ ابھی تک شامل ہو رہا ہے اور ایک اور چیز پاکستان کی شاعری میں در آئی ہے۔ وہ ہے ہجرت۔ اور وہ اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب جو لوگ اپنے پیٹ کی خاطر امریکہ اور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو مہاجر کہلاتے ہیں۔ تو اس پر سب سے بڑا طنز افتخار عارف نے کیا ہے۔ اور خوب کیا ہے کہ ؎

شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر

سگِ زمانہ ہیں، ہم کیا، ہماری ہجرت کیا

اور اب تو ان کے ہاں یہ تین چیزیں ہیں۔ غم کا لہجہ، احتجاج اور ہجرت کا تصور۔ ہمارے ہاں، احتجاج بہت ہے۔ لیکن غم کے لہجے کے ساتھ نہیں، اور ہجرت کبھی نہیں ہے۔

راہی صاحب:۔ ہم اپنے گھروں بیٹھے ہیں نا۔ لیکن یہ شعرا ہندوستان اور پاکستان کے نڑکے جو اس وقت امریکہ، اور کینیڈا میں جاکے بس گئے ہیں اور جو شاعری کر رہے ہیں اور صاحب دیوان شاعر بھی ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری اگر آپ پڑھیے تو وہ پاکستان کی شاعری کی زبان سے آزاد نہیں ہوتے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ ظاہر ہے کیونکہ وہ پاکستانی ہیں اور ان کا مسئلہ پاکستان ہی ہے۔ آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔ تو وہ اس سے آزاد ہو بھی نہیں سکتے۔ البتہ اب ان کے ہاں کچھ تازہ کاری بھی آئی ہے۔ ایک اچھی شاعرہ ہے عرفانہ عزیز۔ آپ نے اس کو پڑھا ہے۔؟

راہی صاحب:۔ نہیں۔

جعفری صاحب:۔ میں آپ کو عرفانہ کی ایک اچھی نظم سناتا ہوں۔ ایک تو وہ فیض سے متاثر ہے، ترقی پسند شعرا سے متاثر ہے۔ اس کے پاس اپنی ایک آواز ہے۔ لہجہ ہے اور دانشوری ہے۔

راہی صاحب۔ بہت بڑی بات ہے۔

جعفری صاحب:۔ اور یہ جو دانشوری ہے۔ یہ نہ تو ہندوستان ابھی قبول کر رہا ہے شاعری میں اور نہ پاکستان۔ مثلاً میں اس کا ایک شعر سناتا ہوں۔ غزل کا شعر ؎

کتنے نغموں کو جنم دیتی ہے
ایک غنچے کے چٹکنے کی صدا

راہی صاحب:۔ واہ۔

جعفری صاحب:۔ تو اس وقت پاکستان کی شاعری ذاتی کوائف میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ہندوستان میں بھی ان کیفیات کے ساتھ کہیے تو قبول کرتے ہیں اور جہاں دانشوری آئی اور ذاتی سطح سے جہاں ذرا بلند ہوئے، اس کو وہ ناقبول کرتے ہیں

ایک دو تحریری شاعرہ ہیں پاکستان کی — عشرت آفریں۔ پڑھا ہوگا اس کو۔

راہی صاحب:۔ جی ہاں۔

جعفری صاحب:۔ اس کے ہاں بھی صاحب بڑی اچھی چیزیں ہیں۔ اس کا بیک گراؤنڈ یہ ہے کہ باپ کے، ماں کے سائے سے محروم ہوگئی مفلسی میں STRUGGLE کر کے اس نے پورے خاندان کو پالا۔ بڑی بہن — اس نے بعد میں تو بھائی — وہ ہے اترولے کی رہنے والی — گونڈے کی — اچھا یہ جتنی ہیں، سب ہندوستان کی رہنے والی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی سنا دوں۔ ہماری ایک بھانجی ہے۔ سلطانہ کی بہن کی بیٹی۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے — وہ پوری طرح وفادار ہیں پاکستان کی۔ اور بڑی اچھی بات ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ جب آتی ہیں تو یہی کہتی ہیں کہ "خالو! آپ کے ہاں کیا رکھا ہے۔ بمبئی میں درخت پہ درخت، پتھر پہ پتھر، اینٹ پہ اینٹ۔ ہمارے پنجاب میں تو لوں ہے۔" ایک دن میں عاجز آ گیا۔ میں نے کہا۔ دیکھو بی بی! دنیا کی بہترین چیزیں صرف ہندوستان میں ہوتی ہیں۔ یہیں ملتی ہیں۔ کہنے لگیں "ایک کا نام بتا دیجیے۔" میں نے کہا۔ "پاکستان"۔ تو یہ بات میں نے جمیل الدین عالی کے لیے بھی کہی کہ یہ بھی ہمارے ہندوستان کا ہے۔ مہدی حسن بھی ہمارے ہندوستان کا ہے۔ پروین شاکر بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔ عشرت آفریں بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔ زہرا نگاہ بھی ہمارے ہندوستان کی ہے۔ سب یہیں کا مال ہے۔ میڈ ان انڈیا۔ عشرت آفریں کی غزل ہے جس کے چند شعر مجھے یاد ہیں —

سنو کے عرفان سے بے خبر ہوں   میں لالۂ دشتِ بے شجر ہوں

راہی صاحب:۔ واہ واہ۔ یہ "دشتِ بے شجر" کا جواب نہیں۔

جعفری صاحب:۔ اس میں دانشوری بھی ہے اور غزل کی پوری روایت کا احترام بھی ہے۔ اب آگے دو شعر سنیے —

مجھے اٹھانے کا حق ہے کس کو
میں اپنی تربت پہ نوحہ گر ہوں

راہی صاحب:۔ بھئی واہ

جعفری صاحب:۔ پھر اس نے آخری شعر کہا ہے —

وہ کج کلاہوں کی بستیاں ہیں
مجھے نہ لے چل، میں ننگے سر ہوں

(دوسرے وقفے کے ساتھ)

راہی صاحب:۔ واہ واہ — یہ شیعہ ہے کیا؟

جعفری صاحب:۔ (مسکراہٹ) ہاں شیعہ ہے۔

راہی صاحب:۔ جبھی "ننگے سر ہوں" کا استعمال ہے۔ (مزید مسکراہٹ)

جعفری صاحب:۔ تو یہ بڑی اچھی آوازیں ہیں۔ اس وقت میں عرفانہ عزیز کی بات کر رہا تھا۔ وہ ان دنوں ایک کتاب لکھ رہی ہے منظوم۔ اس نے مجھے خط میں لکھا ہے کہ "دس بارہ نظمیں کہی ہیں اور کہہ رہی ہوں۔ اور یہ دو نظمیں

آپ کو بھجوا رہی ہوں۔" اس نے ایک نظم خاص طور پر مجھے بھیجی ہے۔ نظم بڑی خوبصورت ہے۔ اس کا عنوان ہے "نیا گوتم"، وہ آزاد شاعری بھی کرتی ہیں اور پابند بھی۔ اس نظم کا ایک ٹکڑا آپ کو سناتا ہوں۔ دیکھیے کتنی خوبصورتی سے وہ "نیا گوتم" کا امیج لے کر چل رہی ہیں۔

(اور پھر جعفری صاحب نے اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ عرفانہ عزیز کی نظم سنائی ؎

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں تیرا

نظم واقعی خوبصورت تھی ہم سب ہمہ تن گوش بنے سنتے رہے پھر راہی صاحب نے سکوت توڑا)

راہی صاحب:۔ مگر اس میں بھائی فیض کا اثر تو نہیں ہے۔ اس میں تو آپ کا اثر زیادہ لگتا ہے۔ بلکہ آپ ہی کا اثر لگ رہا ہے گستاخی معاف۔ یہ آپ کچھ انکسار میں کہہ رہے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ نہیں نہیں۔۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ فیض۔۔

راہی صاحب:۔ فیض کی تو پرچھائیں نہیں ہے کہیں۔

جعفری صاحب:۔ میں نے اس نظم کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے تو مجموعی طور پر.....

راہی صاحب:۔ ہمارے سامنے جو مثال آئے گی ہم تو اسی پر کہیں گے نا۔۔۔ اچھا میں ایک بڑا بے ہودہ سوال کرنا چاہتا ہوں۔

جعفری صاحب:۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔

راہی صاحب:۔ ہاں تو سوال یہ ہے کہ یہ جو سوشلسٹ سماج میں چین سے لے کر پولینڈ تک جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اچھی یا بُری۔ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن کیا ان سوشلسٹ ممالک کے ادیبوں نے اس تبدیلی کی آہٹ سنی تھی؟

جعفری صاحب:۔ میں اتفاق سے ان دنوں کچھ مضامین لکھ رہا ہوں اور جو میری ۶۵ء کی کتاب کا نام ہے "ایک خواب اور" وہی نام میں نے اسے دیا ہے۔ "ایک خواب اور" ادیبوں نے اس کی آہٹ سُنی تھی۔ سوویت یونین کے ادیبوں کے ذکر سے میں شروع کروں گا اور اس میں پیبلو نرودا اور ناظم حکمت کو بھی شامل کروں گا۔

راہی صاحب:۔ نہیں ان کو آپ شامل مت کیجیے۔ ان پر بعد میں بات کروں گا۔ کیونکہ ناظم حکمت ماسکو میں تو تھے، مگر وہ ماسکو کے تو نہیں تھے۔ میں صرف یہ چاہ رہا ہوں کہ وہ شعرا جو سوشلسٹ سوسائٹی کے تھے۔

جعفری صاحب:۔ میں صرف ایک کا ذکر کروں گا۔ جو ادیب بھی ہے، شاعر بھی ہے، جرنلسٹ بھی ہے اور بہت زیادہ مشہور ہے ایلیا اہرن برگ۔ میں جب ۱۹۵۴ء میں سوویت یونین گیا تو وہ تھی سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرنس، ان کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی۔ جہاں سے سوشلسٹ ریلزم کا نعرہ بلند ہوا۔ اور ۱۹۵۴ء یعنی بیس سال تک ادیبوں کی کوئی کانفرنس نہیں ہوئی۔ وہ پورا اسٹالینی دور رہا۔ اس دور میں یہ چیز وہاں پر مان لی گئی تھی کہ سوویت یونین میں اور سوشلسٹ سماج میں منفی کردار نہیں ہے۔ اور اگر ہیں تو وہ باقیات ہیں پرانی سرمایہ داری اور جاگیرداری ہے۔ تو یہ منفی واقعات اور کرداروں کو ادب میں پیش نہیں کیا جانا چاہیے۔ اور سوشلسٹ ریلزم میں یہ اصول بھی شامل تھا کہ ہمیشہ رجائیت سے بھرا ادب ہونا چاہیے جو مستقبل کی نشاندہی کرے۔ اس وقت جب میں پہنچا خواجہ احمد عباس اور بلونت گارگی میرے ساتھ تھے! ہ

برگ کے ایک ناول پر بڑا زبردست حملہ ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ تھا HOG جو برف کے پگھلنے کو کہتے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ ہوگا "جب برف پگھلتی ہے" موسم بہار۔ جب آتا ہے تو برف پگھلنا شروع ہوتی ہے۔ اس ناول میں اس نے منفی کردار دکھاتے ہیں۔ اہرن برگ نے کانفرنس میں جو اپنی مدافعت میں تقریر کی اور جو کچھ اس نے کہا وہ میرے لیے بڑا اہم تھا۔ اس سے میں نے بہت روشنی حاصل کی پھر مجھے بعد میں بہت سے تجربے ہوئے اس میں اس نے کہا کہ سوویت سماج میں ایک تضاد ہے اور وہ تضاد یہ ہے کہ ایک اچھا شہری برا انسان ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک بہت بہادر آدمی ہے (اس زمانے میں تو ساری باتیں جنگ کے حوالے ہوتی تھیں نا) جنگ کے زمانے میں اس نے بڑا کام کیا۔ اسے تمغے ملے۔ اعزازات ملے، لیکن وہ بیوی بچوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔ دوستوں کے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے تو وہ انسان برا ہے، لیکن شہری اچھا ہے اور لوگ اس شہری کی تعریف کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایک ایسا شخص ہے جو انسان اچھا ہے مگر شہری برا ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ بزدل ہے۔ میدان جنگ سے بھاگ آیا ہے وغیرہ۔ یہ مقام وہ ہے جہاں پارٹی کچھ نہیں کرسکتی۔ یہ ادیبوں کا مقام ہے ان مسائل سے عہدہ برآ ہونا۔ ان کا فرض ہے۔ بہت بڑی بات کہی اس نے ــــ اسٹالین کو مرے ہوئے سال سوا سال ہوا تھا۔ دسمبر ۵۴ء میں۔ تو اس کو داد بھی ملی۔ اس کو داد دینے والوں میں سوویت یونین سے زیادہ باہر کے انقلابی تھے اور اس کا سب سے بڑا طرفدار تھا لوئی آراگاں۔ تو وہاں کے جو ادیب تھے انہوں نے اس کا احساس کرلیا تھا کہ انہوں نے کتنی غلطیاں کی ہیں۔ . . . تو یہ ساری چیزیں وہاں کے ادیبوں کے سامنے تھیں اور وہ ادیب جو ۲۹ء سے لے کر اسٹالین کی موت تک لڑتے رہے، ان میں سے بہت سے ہیں جو قتل کردیئے گئے اور ان کی چیزیں BAN کردی گئیں، اب وہ چیزیں نکل رہی ہیں اور سامنے آرہی ہیں۔ اور ان کا سکریٹری فدییف جو خود بہت اچھا ادیب تھا "ینگ گارڈ" اس کا ناول ہے۔ بہت اچھا ناول۔ اس نے خودکشی کی خسروچیف کے دفتر میں۔ اس لیے کہ جتنے ادیبوں کو سزا دی جاتی تھی، ان پر دستخط اسی سے کرواتے تھے۔ وہ نشے کا عادی ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کا ضمیر بیدار تھا اور جو چیزیں پڑھنے کو ملیں ان میں یہ تھا کہ اسٹالین کی نظر روسی ادب پر بہت اچھی تھی۔ کلاسیکی ادب کا عاشق تھا اور جانتا بھی تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سوویت یونین میں یعنی روس میں ادیب کا اثر اس کے پڑھنے والوں پر پڑتا ہے۔ دستوووسکی کا خود عاشق تھا۔ پڑھتا تھا لیکن عوام کے لیے نہیں۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے صرف ایک شخص تھا جو اسٹالین کو کسی حد تک باہر کرسکے۔ وہ تھا گورکی جو اس کے برابر بیٹھتا تھا اور میں نے یہ پڑھا ہے کہ جب غصّے سے اسٹالین کا سانس پھولنے لگتا تھا تو وہ کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا۔ چنانچہ ایک ادیب کا واقعہ یہ ہے کہ اسٹالین جو سارے MANUSCRIPT خود پڑھتا تھا اس نے ایک MANUSCRIPT پڑھا اور ناشتے پر اس ادیب کو بلایا وہ کانپتے ہوئے گیا۔ اسٹالین میز کے پیچھے بیٹھتا تھا۔ گردن گھما کے نہیں دیکھتا تھا صرف نظروں سے کام لیتا تھا۔ گورکی اس کے برابر ہوتا تھا اس سے اسٹالین نے سوال جواب شروع کیے تو ایک موقع پر گورکی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا ــ اس ادیب نے سوویت ادب اور ادیبوں کے بارے میں گفتگو کرنے کا حق حاصل کرلیا ہے۔" تو یہ STRUGGLE اُن کی چل رہی تھی،

ایسا نہیں کہ ادیب بے بس تھے وہاں کے۔ اسٹالین کا اقتدار اتنا بڑھا ہوا تھا کہ ۔ ایک واقعے کو پابلو نرودا نے لکھا ہے کہ ۔ اہرن برگ نے کوئی کتاب لکھی تھی۔ اس کی کتاب پر تنقید ہو رہی تھی۔ اہرن برگ پر ہمیشہ تنقید ہوتی تھی کیونکہ وہ فرانس میں رہتا تھا۔ اور FRENCH LITERATURE کا بڑا عاشق تھا اور ۔۔۔ AESTHETICS سے بڑا شغف تھا۔ سوویت یونین اسے پسند نہیں تھا۔ ایک روز صبح کے وقت اس کو ٹیلی فون آیا۔ اس کی بیوی نے اٹھایا۔ اور گھبرا کر ٹیلی فون رکھ دیا۔ اور اس سے کہا کہ کوئی آدمی بات کر رہا ہے وہ کہتا ہے کہ میں اسٹالین ہوں۔" اسے یقین نہ آیا اس نے ٹیلی فون اٹھایا۔ واقعی اسٹالین تھا۔ اس نے کہا" میں نے تمہاری کتاب رات کو پڑھی اور واقعی بڑی اچھی کتاب ہے" مبارک باد دی۔ ساری تنقید بند ہو گئی۔ سوویت یونین میں اس کتاب پر اس کی ایک تعریف سے تو ان ادیبوں کے لیے لڑنا بھی بڑا کام تھا۔

راہی صاحب:۔ اچھا ایک سوال بس میرا رہ گیا ہے کہ آپ جو ہیں شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، تو وہ جو علی سردار جعفری نقاد ہے، وہ علی سردار جعفری جو شاعر ہے اُن کی شاعری اور ان کی شاعری میں خاص طور پر اُن کے لہجے، اُن کے اسلوب اور ان کی نظموں کی جو بناوٹ ہے اس کے بارے میں اس نقاد کی کیا رائے ہے؟

جعفری صاحب:۔ بہت مشکل سوال ہے، لیکن میں ایک بات بتا دوں کہ میں ہمیشہ، بار بار یہ لکھتا رہا ہوں، کہتا رہا ہوں پھر کہہ رہا ہوں کہ میں نقاد نہیں ہوں۔ اس لیے کہ نقاد کی جو تربیت ہوتی ہے اور خاص طور سے یورپ کی تنقیدی کتابیں پڑھ پڑھ کر۔ وہ میری تربیت ہی نہیں ہے۔ میں نے پرانے شعراء کا جائزہ لیا۔ اس میں غالب اور میر کے علاوہ کبیر بھی ہیں۔ میرا بائی بھی ہے۔ رومی بھی ہیں، حافظ شیرازی بھی ہیں۔ میں نے بار بار لکھا کہ میں ان کا جائزہ اس نظر سے لیتا ہوں کہ میں اپنی شاعری کے لیے معیار بنا سکوں۔ تلاش کر سکوں اپنی شاعری کی تربیت کے لیے۔

(میں نے دل میں سوچا کہ، اقبال شناسی، کو آپ کس زمرے میں رکھیں گے؟ کیا محض جائزہ؟ اور اگر جائزہ تو کیا تنقیدی جائزہ نہیں؟ مگر اس وقت خاموشی شرط تھی اور دو دانشوروں کی گفتگو میں مداخلت بدتمیزی کی دلیل بھی۔ گفتگو جاری رہی (رشید)

تو اس میں یہ ہے کہ میں اپنی شاعری کے بارے میں صحیح رائے تو نہیں دے سکتا۔

راہی صاحب:۔ یعنی آپ یہ سمجھیے کہ یہ شاعری میں نے کی ہے۔

جعفری صاحب:۔ اس کے بعد بھی یہ بات بڑی ذاتی ہو جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ میری شاعری کے کچھ حصے جو خراب ہیں اور میں جو آپ، اس وقت اپنی ایک کتاب EDIT کر رہا ہوں کلیات کی شکل میں، اس میں سے میں ان کو کاٹ رہا ہوں، ممکن ہے کہ بعض غلط چیزیں کٹ جائیں اور کچھ ایسے ہیں جو اتنے نئے ہیں جنھیں ہمارے لوگوں کو قبول کرنے میں دشواری ہے، لیکن اس کی داد مجھے ایسے بعض حلقوں سے ملی کہ مجھے اپنی شاعری پر یقین آ گیا۔ بلکہ یقین محکم ہو گیا مثلاً یہ کہ جعفر علی خان اثر اگر میری کتاب "نئی دنیا کو سلام" کی داد دیتے ہیں تو پھر میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ کون اس کی برائی کر رہا ہے۔ اسی طرح میری نظم "پتھر کی دیوار"، جب آئی ۱۹۵۳ء میں تو اس پر کسی نے تبصرہ

نہیں کہا۔ صرف ایک تبصرہ آیا اور وہ مسعود حسین خان کا تھا جس میں انہوں نے یہ کہا ریڈیو پر، کہ یہ شاعری نہیں ہے۔ اس میں صرف ایک نظم ہے جو قابلِ برداشت ہے۔ لیکن مجھے جو تجربہ ہوا وہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ میں ۱۹۵۱ء میں دلی میں جامع مسجد کے اردو بازار میں ایک دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ مولوی سمیع اللہ بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے مجھ سے کہا کہ "اینگلو عربک کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے آپ بھی چلیے۔ میں نے کہا "میرا بلانا کالج سے میرے پاس دعوت تو نہیں ہے، چلو چلتے ہیں۔ وہاں جو گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کی صدارت خواجہ غلام السیدین کر رہے ہیں اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ سامعین میں ہیں۔ معلوم یہ بھی ہوا کہ انہوں نے چند مخصوص شعراء کو دعوت دی ہے۔ اور ان سے یہ بھی کہا ہے کہ "آپ اپنے کلام کے بارے میں کچھ کہیے اور اپنی بہترین نظم سنائیے۔ چنانچہ میں نے وہاں "پتھر کی دیوار" سنائی بہت مقبول ہوئی اور ڈاکٹر عابد حسین نے یہ کہا کہ ترقی پسند شاعری جوان ہو گئی ہے۔ اس واقعے کے بعد میری یہ نظم جامعہ علی گڑھ کے لیے بھی قابل قبول ہو گئی لیکن نقادوں کے حلقوں میں نہیں۔ اس کے بعد اسی کالج میں دس بارہ دن کے بعد ایک اور مشاعرہ ہوا۔ اس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی اور مخدوم محی الدین بھی تھے۔ وہاں میں نے یہ نظم پھر سنائی۔ مولانا آزاد کا ذوق بڑا کلاسیکی تھا انہوں نے مشاعرے کے بعد مجھ سے اور مخدوم سے کہا کہ آپ مجھ سے ملنے آئیے۔ وقت مقرر ہوا۔ ہم ان کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ بہت دیر باتیں کرتے رہے۔ شاعری پر انہوں نے کوئی بات نہیں کی لیکن انہوں نے بلایا تو شعر ہی کے لیے ہی تھا۔ پھر انہوں نے کہا کہ "میرے بھائی! میں بھی کمیونسٹ تھا اور اب بھی ہوں، لیکن تشدد کے دائرے سے باہر۔" میں نے اس کو بھی اپنی شاعری کے لیے داد سمجھا۔ "پتھر کی دیوار" کے ضمن میں اس کے بعد ۱۹۸۱ء میں کراچی میں ایک واقعہ ہوا۔ میں جس کتاب کا نیا ایڈیشن نکال رہا ہوں اس میں یہ دیباچہ ہے کہ عشرت آفریں نے مجھے ایک لڑکی سے ملایا تو اس نے مجھ سے کہا کہ "آپ میرے یہاں کل کھانا کھانے آیئے۔" میں خاموش ہو گیا میں نے سبطِ حسن سے پوچھا کہ "بھئی تم جانتے ہو کون ہے؟" اس نے کہا نہیں "ٹھیک ہے چلو" وہاں جو گیا تو اس کے والد وہ لڑکی (ان کی تصویریں بھی میرے پاس ہیں) اور جتنے لوگ وہاں جمع تھے۔ ان میں اکثریت اینگلو عربک کالج کے طلبہ کی تھی۔

راہی صاحب:۔ اچھا۔

جعفری صاحب:۔ اور وہاں صرف میں شعر سنانے والا۔ وہ شعر سنتے رہے پھر فرمائش ہوئی کہ "پتھر کی دیوار" سنائیے۔ میں نے کہا مجھے پوری یاد نہیں۔ اگر میں کہیں رک جاؤں، بھول جاؤں تو مجھے معاف کیجیے۔ ان میں سے ایک صاحب نے جیب میں سے ایک کتاب نکالی "پتھر کی دیوار" میں نے کہا یہ آپ کو کہاں سے ملی۔ کہنے لگے "یہ زیروکس کاپی ہے اور یہ مجھے تقریری مقابلے میں انعام کے طور پر ملی تھی۔"

اس کے بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ لاہور میں فیض کا جشن تھا۔ یہاں سے ہم مجروح اور کیفی گئے تھے۔ سب سے آخر میں میری باری آئی۔ جیسے ہی میں کھڑا ہوا آوازیں آئیں "پتھر کی دیوار" "پتھر کی دیوار" میں نے وہاں بھی یہ کہا کہ "میں بھول رہا ہوں معاف کیجیے۔ کہنے لگے "معاف نہیں کریں گے۔ آپ سنائیے تو"

راہی صاحب:۔ ہم بتلائیں گے۔

جعفری صاحب:۔ جی ہاں۔ یہی ہوا۔ صاحب میں جہاں رکتا تھا وہ مصرعے دیتے تھے۔
راہی صاحب:۔ تو اصلی قبولیت اسی کو تو کہتے ہیں۔ جب میں نے نقاد کہا تھا تو پیشہ ور نقاد کی بات نہیں کر رہا تھا۔ در اصل ہر شاعر میں ایک نقاد تو ہوتا ہی ہے۔
جعفری صاحب:۔ تو میری بھی ان چیزوں پر نظر ہے۔ ایک چیز اور ہے۔ اب جو یہ "اودھ کی خاک حسیں" ہے۔ اس نظم کی تعریف ایک ایسے شخص نے کی جس کو میں نہیں جانتا۔ جس نے میری ساری شاعری یہ کہہ کے رد کر دی کہ "اس میں کمیونزم کے متعلق کچھ ہے تو وہ بے کار ہے، لیکن یہ نظم جو ہے والٹ وٹ مین اور کالی داس کی یاد دلاتی ہے۔" یہ محمد صادق ہے۔ HISTORY OF URDU LITERATURE کے مصنف۔ اب اس میں جو بحر میں نے استعمال کی ہے وہ بحر آج کی آزاد شاعری کی سب سے مترنم بحر ہے۔
راہی صاحب:۔ جو "پتھر کی دیوار" میں ہے۔
جعفری صاحب:۔ نہیں "پتھر کی دیوار" کی بحر ذرا سی اجنبی ہے "ایشیا جاگ اٹھا" میں یہی بحر ہے اور دیکھیے "ایشیا جاگ اٹھا" کو کہاں سے انعام ملا؟ ملیالم زبان سے۔ کمار آشن سوسائٹی نے مجھے اس پر ایوارڈ دیا اور اس کا ترجمہ بھی ملیالم زبان میں کیا۔ ابھی پچھلے سال نہرو صدی کے سلسلے میں ساہتیہ اکادمی نے ہر زبان کے ایک ایک شاعر کو بلایا، تو میں نے اپنی دو نظمیں پڑھیں "میرا سفر" اور "ہاتھوں کا ترانہ"۔ "ہاتھوں کا ترانہ" کے لیے مجھے بنارس یونیورسٹی کے ہندی کے پروفیسر نے کہا کہ میں اس کا ترجمہ کروں گا اس میں VEDIC THOUGHT کا REFLECTON ہے۔ میں نے کہا "یہ ہمارا HERITAGE ہے۔ کیسے آیا مجھے خبر نہیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ بات یہ ہے کہ جو DOWN THE EARTH چیزیں ہیں جو اس میں آگئی ہیں۔ کامیابی کے ساتھ، یہ ہمارا حصہ ہے اور میں اس سے مطمئن ہوں کہ ہماری شاعری کا سارا مزاج غزل آشنا مزاج ہے۔ اور جو شاعر یہ کہتا ہے کہ میری شاعری میں نہ جام و مینا ہے نہ ساقی ہے اور اس کے بعد یہ کہتا ہو کہ۔

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں

تو اس کی داد محمد صادق سے ملتی ہے۔
راہی صاحب:۔ اب جو یہ غزل آشنائی کی بات نکلی وہ بڑی اچھی ہے۔ میں دوسری طرف چل رہا ہوں کہ اقبال کا فارسی کلام تو میں نے اتنا جی لگا کے نہیں پڑھا ہے لیکن اردو کلام جو ان کا پڑھا تو مجھ کو جہاں تک نظموں کے ڈھانچے کا سوال ہے اور جس طرح سے وہ نظموں کو DEVELOP کرتے ہیں، STRUCTURE وہ مجھکو بہت ناقص لگتا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کی جو آواز ہے اور ان کی آواز کی جو مٹھاس ہے، رچاؤ ہے اور عظمت ہے وہ پکڑ لیتی ہے۔ تو مجھ کو لگتا ہے ان کا اسلوب غزل کا ہے جس کو انہوں نے نظموں میں استعمال کیا۔
جعفری صاحب:۔ جہاں غزلوں میں انہوں نے اس اسلوب کو چھوڑا ہے اس کو لوگ قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ غزل کے لیے ایک نیا راستہ

تھا مثلاً "شمع اور شاعر" کے یہ اشعار ۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح تک کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

اس میں STRUCTURE کے بارے میں ایک چیز ہوں تو مجھے نہیں معلوم کہ یہ چیز تمہارے ذہن میں ہے یا نہیں وہ یہ کہ ۔ جوش کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے اور جوش پر یہ اعتراض بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔ یہی بات اقبال کے بارے بھی کہی جاتی ہے کہ خیال کا ارتقاء نہیں ہے اور ایک ہی بات جس استعاروں میں کہے چلے جاتے ہیں ۔ اقبال کی "شمع اور شاعر" کے کئی بند ہیں جس میں چار۔ پانچ شعر ایک ہی خیال کو مختلف استعاروں میں بیان کر رہے ہیں۔ کہ ۔

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح تک کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا
بزم سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

راہی صاحب :۔ ہاں تو ــــ یہ کیوں ہے ؟

جعفری صاحب :۔ یہ استادی کا اصل رنگ ہے ۔ اور یہ اس زمانے میں بڑا مقبول تھا ۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کلاسیکی استاد ہوتا ہے ناکہ ایک بول کو لے کے تین تین گھنٹے گاتا رہا ہے لیکن کچھ لوگ ہیں جو اسے قابل گرفت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ چیز قابل گرفت نہیں ہے۔ یہاں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا میں نام لے لوں مثلاً اختر الایمان کہ "صاحب اس نظم کا ارتقاء نہیں ہے۔" میری نظر میں ارتقائے خیال ہے ۔

راہی صاحب :۔ ارتقاء تو ہے مگر نظم نہیں ہے ۔

جعفری صاحب :۔ نظم نہیں ــــ وہاں غزل کا رنگ ہے ۔

راہی صاحب :۔ نہیں میں اقبال کی نہیں اختر الایمان کی بات کر رہا ہوں۔ کہ ارتقا تو ہے مگر نظم نہیں ہے۔

جعفری صاحب :۔ میں اسے دوسری طرح ذرا نرم الفاظ میں کہوں گا کہ اقبال کی آواز کا اثر ان کی آواز سے زیادہ ہے۔ بہت زیادہ ہے۔ اب یہ دیکھیے جوش نے کیا عمدہ نظم کہی ہے ۔ کہ

مٹھیوں میں بھر کے انشاں چل چکا ہے انقلاب

اس میں جو آخری شعر ہے ــــ

جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا وہ مرد نامسلماں ہے تو کیا

اس میں صاحب جو ایک یلغار ہے تشبیہوں کی، استعاروں کی ــــ حد ہے ؟

راہی صاحب :۔ وہ تو ان کا اسٹائل ہے اور اس پر کوئی اعتراض کرے تو ــــ یہ تو بے وقوفی کی بات ہے ۔

چل چکی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج اگر راون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا
بن چکا ہے صرصرِ سیلابِ خونِ ہاشمی
آج ابوسفیان کے گھر میں چراغاں ہے تو کیا

کہاں سیتا اور کہاں ابوسفیان ـــ یہ سب آگئے۔

راہی صاحب:۔ اچھا ایک آخری سوال ـــ کہ یہ جو ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک جو بھی اردو میں ادب ـــ اچھا یا بُرا ـــ پیدا ہوا، اُس کے بارے میں مجموعی طور پر آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ مطمئن ہیں۔؟

جعفری صاحب:۔ مجموعی طور پر تو ہم مطمئن ہیں۔ اصلی جائزہ تو پچاس برس کے بعد لیا جائے گا۔

راہی صاحب:۔ آپ سے میں نے یہ سوال اس لیے کیا کہ آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر تو بغیر پڑھے لکھے لوگ...

جعفری صاحب:۔ راہی اس زمانے میں میں نے ایک کام ایسا کیا کہ ڈاکومنٹری فلم بنائی۔ انگریزی میں THE LITERARY ROLE OF LITERATURE IN FREEDOM STRUGGLE کے نام سے ـــ اس میں پندرہ زبان کا STORM شامل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ہم نے شروع کیا ۱۹۴۷ء تک۔ اس میں غالب بھی ہیں۔ حالی بھی شامل ہیں، شبلی بھی ہیں، اقبال بھی ہیں حسرت، جوش، آزاد، ولاچول او رٹیگور بھی ہیں۔ تو صاحب ہمیں تو ایسا لگا کہ ہماری شاعری کو ہمارے اپنے نقاد زیادہ کم تر کہہ رہے ہیں جب کہ ـــ

راہی صاحب:۔ ہماری شاعری بڑی اچھی ہے۔

جعفری صاحب:۔ بڑی اچھی ہے اور بہت بلند ہے۔ میں اس کی داد بھی دوں گا۔ تو بھی ہم تو اپنے ادب سے مطمئن ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اصناف جو ہیں۔ کسی زبان میں ایک صنف ترقی کرتی ہے۔ کسی میں دوسری۔ کیونکہ کلچر کی جو فضا ہوتی ہے وہ اس کے لیے ہموار نہیں ہوتی۔ شاعری میں انگلستان کو جو درجہ حاصل ہے وہ یورپ کی کسی زبان کو حاصل نہیں جو درجہ ناول میں روس کو حاصل ہے وہ کسی کو حاصل نہیں۔ موسیقی میں جو درجہ جرمنی کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں اسی طرح جو مقام اردو شاعری کو حاصل ہے وہ کسی زبان کی شاعری کو حاصل نہیں۔ ناول میں ہم ان سے پیچھے ہیں افسانے میں ہم بہت ترقی کر گئے تھے مگر اب جو یہ زوال آیا ہے۔ تو یہ آیا نہیں، لایا گیا ہے۔

راہی صاحب:۔ کبھی کبھی مجھ کو یہ سوال پریشان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی اردو شاعری فارسی سے بہت متاثر رہی۔ فارسی سے اردو کو ملی رباعی، قصیدہ، مثنوی اور غزل۔ یہ چار بڑی اصناف ہم کو فارسی سے ملیں اور ہندوستان میں بہت اچھی مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ اردو میں دکنی میں بہت عمدہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ اچھے قصیدے بھی لکھے گئے لیکن غزل کی مقبولیت کا کیا راز ہے۔؟

جعفری صاحب:۔ یہ بتانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ جڑا ہوا سوال یہ ہے کہ جس سرزمین سے یہ آئی ہے وہاں مقبول نہیں ہے۔ ایران میں۔

راہی صاحب:۔ مجھ کو ذاتی طور پر یہ لگتا ہے کہ غزل جو ہے فارسی میں۔ جب شروع ہوئی تو وہ مسلسل نظم تھی۔ کیونکہ

قصیدے کی تشبیب کو جب انہوں نے قصیدے سے الگ کیا تو غزل میں تسلسل INHERENT ہونا چاہیے

جعفری صاحب:۔ حافظ کی ساری غزلوں میں نہیں ہے۔

راہی صاحب:۔ میں یہی کہہ رہا تھا۔ حافظ کے زمانے میں دارالتراجم کھل گئے تھے۔ ہندوستان سے بڑے پیمانے پر لین دین اور تجارت ہو رہی تھی۔ ہندوستان میں ایک ایسی صنف شعر ہے جو خیال کی پابند نہیں ہے جو صرف ایک فارم ہے جس کو ہم "دوہا" کہتے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ یہ بات میرے ذہن میں تھی۔ میں خود یہ کہنے والا تھا کہ بھئی ہماری ہندوستان کی روایت جو ہے وہ DOHA ہے اور "دوہا" جو ہے وہ مصرعوں میں ایک پورا خیال دے دیتا ہے۔

راہی صاحب۔ اور کسی خیال کا پابند نہیں ہے اس میں آپ کوئی خیال بھی باندھ دیجیے۔ جب یہ "دوہا" ایران میں پہنچا تو ایرانی شاعروں نے کہا کہ بھائی یہ تو بڑے کمال کی چیز ہے۔ اور مجھ کو لگتا ہے اس کے بعد فارسی غزل کا جو ارتقا ہوا تو اس کے اندر یہ تبدیلی آئی کہ اب الگ الگ شعر ہونے لگے۔ غزل، غزل نہیں رہ گئی بلکہ الگ الگ شعروں والی ایک صنف۔ کہیں زندگی کا شعر ہے کہیں موت کا ہے۔ کہیں بہار کا شعر ہے، کہیں خزاں کا۔ اس طرح ہمارے ہاں دو طرح کی چیزیں آئیں۔ ایک تو غزل تھی اور دوسری وہ جس کو ہم لوگوں نے ریختہ کہا۔ ریختہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ بہت گھپلے کیے ہیں ہمارے بزرگوں نے۔ لیکن غالب نے یہ کہا کہ "ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب" تو ریختہ سے مطلب زبان نہیں لگتا کیونکہ کیا ہے کہ قائم چاند پوری کا جو شعر ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اِک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

تو اس کے معنی کیا ہیں؟ کہ غزل ہی کی طرح ریختہ ایک صنفِ سخن ہے۔ ریختہ زبان نہیں ہے اور جب غالب یہ کہہ رہا ہے کہ ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو..... تو وہ صنفِ سخن کی بات کر رہا ہے۔ غزل تو میرے خیال میں ایک صنف ہے جو مسلسل ہوتی ہے۔ ریختہ ایک صنف ہے جو مسلسل نہیں ہے؟ آپ استادوں کی غزل پڑھیے تو لگتا ہے کہ وہاں سے یہاں تک تسلسل آرہا ہے۔ ارتقائے خیال ہے اور باقی اشعار بے تکے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ بھئی ہم ریختہ پر بات کرنے کی بجائے اس بنیادی سوال پر بات کریں کیونکہ میرے لیے یہ خیال نیا ہے کہ فارسی میں غزل مسلسل تھی اور جب "دوہا" ایران پہنچا تو بے تکے اشعار کی شکل ہونے لگی۔ یہ تحقیق کا مسئلہ ہے میری نظر میں نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ غزل جو ہے میں اس کے اسباب بیان نہیں کرسکتا کہ ایران میں اس کا زوال کیوں ہوا اور ہندوستان میں اس کا عروج کیوں ہوا۔ البتہ اس کا میرے پاس ایک EXPLANATION ہے سوشل اور پولیٹیکل۔ غزل سب سے زیادہ نیچرل فارم ہے شاعری کا۔ مثلاً ہم یہاں گھر میں بیٹھے ہیں، کتابیں ہیں، پنکھا چل رہا ہے۔ آپ لوگ باتیں کر رہے ہیں، باہر نکلے منظر بدل گیا وہاں ہمیں ایک لفٹ مین ملا۔ نیچے اترے تو پھر منظر بدل گیا۔ آگے چلے تو ایک جنازہ مل گیا اور آگے چلے ایک برات مل گئی۔ جب گھر پہنچے تو یہ نہیں محسوس ہوتا کہ گھر سے گھر تک ان منظروں میں جھٹکوں میں ہم نے کیا کیا دیکھ لیا۔ یہی بات غزل

ین ہے، لیکن اچھے شاعر کے ہاں دو چیزیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک تو اس کا مجموعی تاثر اور ایک آہنگ۔ یہ دونوں برابر رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ متفرق شعر کے ساتھ آہنگ بدل گیا یا اس کا تاثر بدل گیا۔

راہی صاحب:۔ بھائی میں ایسا کروں کہ غالب کی دس بارہ غزلوں کو لے کر اور ان کو ARRANGE کرکے بتا دوں کہ یہ دیکھیے ایک ہی خیال چلا جا رہا ہے۔

جعفری صاحب:۔ ہیں ایسی غزلیں۔۔۔۔۔

راہی صاحب:۔ میں نے زیادہ تر غزلوں میں یہی دیکھا ہے کہ ایک خیال چلا جا رہا ہے۔ اگر آپ ان غزلوں کو نئے سرے سے ترتیب دیجیے (ضروری نہیں کہ وہ پہلا شعر ہو، مقطع بھی ہو سکتا ہے۔) لگتا ہے یہ خیال کا ارتقا ہے جو چل رہا ہے۔ آخر میں آکے دو شعر بچ جاتے ہیں۔ اس میں وہ خیال نہیں آتا۔

جعفری صاحب:۔ جیسے غالب کی ایک غزل ہے کہ ؎ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے"۔ آخر میں بالکل الگ شعر ہے۔ ؎ "بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کیے ہوئے"۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ میرے لیے خیال کا ایک حصہ ہے۔ کیونکہ یہ موضوع ہے ہجر کا، لیکن اس نے بیان کیا ہے اسے وصال کی نشاط کے ساتھ۔

راہی صاحب:۔ تو اس طرح سے اگر ہم لوگ اپنی غزل کو از سر نو پڑھنا شروع کریں تو ایسا نہیں لگتا آپ کو۔۔ کہ ہمیں ایک نئی چیز ملے گی؟

جعفری صاحب:۔ ضرور ملے گی۔

راہی صاحب:۔ نیا دروازہ کھلے گا۔ کچھ نئی ہوا شاید آئے۔

جعفری صاحب:۔ دراصل ہمارے یہاں غزل کو جو نئی زندگی ملی ہے۔ وہ ہمارے یہاں کے سیاسی حالات کے ساتھ ہوا میرا خیال یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے غزل کی مقبولیت نہیں تھی۔ خود فیض جن کی غزلیں سب سے زیادہ مقبول ہوئیں اور جن کے ذریعے سے پھر اور غزلیں بھی آئیں۔ ان کی بڑی اچھی غزلیں موجود تھیں جو اب گائی جا رہی ہیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان میں یہ ہوا کہ یہ جو پکی موسیقی ہے، کلاسیکی۔ چونکہ اس کا مزاج یہ ہے، وہ غیر مقبول قرار پائی ؎ "موری بہنیاں نہ مروڑ کرشن مراری"۔ تو ہماری کلاسیکی موسیقی تو کرشن اور رادھا کی روایت سے ملی ہوئی ہے۔ تو یوں کلاسیکی موسیقی نامقبول ہوئی۔ حالانکہ وہاں جانتے ہیں لوگ اور سیکھے ہوئے بھی ہیں۔ تصوف کی روایت موجود تھی۔ اس لیے وہاں کے خوش گلو گائیکوں نے غزل کی گائیکی شروع کی۔ ہندوستان میں اردو پہ بپتا پڑی۔ اس لیے جو اُردو والا تھا وہ یہاں خوش نہیں تھا اور پنجاب سے ہندو اور سکھ آیا تو ان کا یہ NOSTALGIA تھا۔ انہوں نے اس کو اٹھا لیا اور جو چیزیں سامنے آئیں تو صاحب اس کا ایک پوشیدہ حُسن تھا جو کسی وجہ سے زمانے کی خاک میں دبا ہوا تھا، آج وہ ظاہر ہو رہا ہے؛ لیکن اس سے خرابی جو پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا بہت بڑا حصہ تفریح کا سامان بن گیا ہے اور نئے نئے گانے والے شاعروں کو ملازم رکھ رہے ہیں۔ دس الفاظ دے دیے کہ صاحب "جام" کا لفظ آ جائے۔ شراب کا لفظ آ جائے اور زلف کا لفظ آ جائے تو یہ جو ہے اس سے نقصان پہنچا، لیکن ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ یہ اس کا

دوسرا پہلو ہے مقبولیت اپنی جگہ ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ بغیر کسی COMMENT کے — ضمیر جعفری کا ایک شعر سنا دوں —

دریدہ دامنوں، خستہ گریبانوں کی باتیں ہیں
غزل میں جتنی باتیں ہیں، مسلمانوں کی باتیں ہیں

اتنا تھا — اور اسی کے ساتھ یہ دلکش محفل برخاست ہو گئی۔ راہی صاحب نے اپنے پان سمیٹے اور جعفری صاحب نے اپنی عینک اُتاری۔ سلطانہ بھابی کھانے کا انتظام کرنے پہنچیں۔ راہی صاحب نے کہا کہ کرعذرت چاہی کہ گھر پر بھائی صاحب (مونس رضا) تشریف فرما ہیں۔ رباب آپا، ستارہ آپا اور سلطانہ بھابی نے اجیر کو روک لیا۔ کھانے کی میز پر پھر ہنسی اور جعفری صاحب تو گفتگو تھے۔

سچ ہی تو ہے — گفتگو بند نہ ہو — بات سے بات چلے۔

(بہ شکریہ ”کتاب نما“)

محمد علی صدیقی۔ حسن عابد۔ مسلم شمیم۔ شاہد نقوی۔ مظہر جمیل

ہم عصری ادبی مسائل

مظہر جمیل:۔ جعفری صاحب آپ کی موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم لوگ دراصل ان تبدیلیوں کو سمجھنا چاہتے ہیں جو گذشتہ نصف صدی کے دوران ہندوستانی ادبیات میں بالعموم اور اردو ادب میں بالخصوص رونما ہوئی ہیں خصوصاً ترقی پسند ادب کی تحریک کے تناظر میں، تو آپ اس سلسلے میں کچھ فرمایئے۔؟

جعفری صاحب:۔ اس میں کچھ باتیں تو بدیہی ہیں اور ایسی ہیں جو بار بار دُہرائی گئی ہیں اور شاید ان میں کوئی نیا پن محسوس نہ ہو، لیکن ادبی جائزہ لینے کے لیے ان باتوں کا دہرایا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمارے ہاں جدید ادب ایک واضح رجحان کے طور پر ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے اور یہ صورت حال صرف ہمارے اردو ادب میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی کم و بیش تمام بڑی زبانوں میں ایسا ہی ہوا ہے، ممکن ہے یہ خبر آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ میں ان دنوں ایک ڈاکومنٹری فلم پر کام کر رہا ہوں جس کا نام ہے "دی لٹریری اسٹورم" (THE LITERARY STORM) اور اس کا موضوع ہے ہندوستان کی بڑی زبانوں میں پیدا ہونے والے جدید ادب کا ارتقائی تجزیہ اور خصوصاً ان زبانوں کے ادب نے تحریک آزادی میں جو کردار ادا کیے ہیں اور جو رشتے قائم رکھے ہیں ان کو سمجھنا، یہ موضوع آپ جانتے ہیں بجائے خود خاصا وسیع و ہمہ گیر ہے اور ایک نشست میں ہندوستان کی تمام اہم زبانوں کے ادب کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا لہٰذا ہم اپنی گفتگو اردو ادب تک ہی محدود رکھیں گے۔ تو جناب آپ یہ دیکھیے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو پہلا اہم واقعہ رونما ہوتا ہے وہ ہے ادبی تنقید کا ایک باقاعدہ نظام کے طور پر رواج پانا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اردو ادب تنقیدی عناصر سے خالی تھا، نہیں ایسا نہیں ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ ہر تخلیقی عمل میں تنقیدی شعور کارفرما رہتا ہے۔ شاعر کے لیے تنقید نظر کا حامل ہونا لازمی ہے، لیکن آپ اسے نقاد نہیں کہتے اسی لیے قدیم تذکروں میں تنقیدی تبصرے بھی نظر آ جاتے ہیں۔ غالب کے خطوط میں خاصا تنقیدی مواد موجود ہے، پھر بعض لسانی، عروضی اور فنی نکات پر تنقیدی بحثیں بھی آپ کو کتابچوں کی صورت میں دستیاب ہو جائیں گی، لیکن ان سب کو ملا کر بھی کوئی ایسا باقاعدہ اور منضبط نظام تشکیل نہیں پاتا جسے آپ تنقیدی نظام کا نام دے سکیں اور یہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے سالوں میں ہی ممکن ہو سکا۔ جب آپ تنقید اور شاعری کو دو علیحدہ خانوں میں رکھ سکیں۔

ان ابتدائی ناقدین میں حالی اور شبلی دو اہم نام آتے ہیں ان میں آزاد کا نام بھی آئے گا، بلکہ پہلے آنا چاہیے، لیکن اپنی اثر پذیری کے مطابق ترتیب میں جو بلند مقام ہوگا وہ حالی اور شبلی ہی کو ملے گا۔ دوسری تبدیلی جو ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ ہمارے ہاں محسوس ہوتی ہے وہ ہے غزل کے تعلق سے۔ اب آپ دیکھیے کہ غزل اپنے تمام تر کلاسیکل امکانات غالب کی شکل میں پورے کر چکی تھی اور جب میں یہ بات کہتا ہوں تو میری مراد یہ ہوتی ہے کہ غالب اپنی پیش رو غزل کی روایت کو سمیٹتے ہوئے ایک ایسا منفرد لہجہ اور صرف لہجہ ہی نہیں بلکہ انداز نظر دیتے ہیں جو اردو ادب میں قطعی نیا تھا اور جسے میں جدید ادب کے لیے ایک نقطۂ آغاز خیال کرتا ہوں۔ آپ غالب کے ہاں سے ایک ایسا انتخاب بآسانی کر سکتے ہیں جو آج کے تمام ادبی موضوعات کا احاطہ کر سکے۔ اگر آپ جدید چاہتے ہیں تو آپ کو یہ شعر ملے گا ؎

خفقانی ہوں تو یہ بارِ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

چونکہ وہ شاعری اپنے عہد کی پوری بصیرت کے لیے ہوتی تھی اور اس میں ماضی و حال کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے لہٰذا آپ دیکھیے وہ آج بھی زندہ ہے۔

غالب ہی کے ہاں دار و رسن کا استعارہ پہلی بار نئے معنوں اور نئی امیج کے ساتھ آتا ہے۔ میر تک تو یہ استعارہ یعنی دار و رسن کا استعارہ صوفیانہ انداز میں آتا ہے۔ حافظ شیرازی کا شعر ہے ؎

گفت آں یار کزو گشت سرِ دار بلند
جرمش ایں بود کہ اسرار ہویدا می کرد

اب یہ شعر حلاج کے بارے میں ہے اور بات یہ کہی گئی ہے کہ اس نے راز کو ظاہر کر دیا تو اسے دار پر کھینچ دیا گیا حالانکہ تاریخی طور پر تو حلاج کو قتل کیا گیا تھا، لیکن بطور استعارہ یہاں دار کا استعمال ہوا۔ میر کا شعر ہے ؎

فصل آئی تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

یہ بھی صوفیانہ انداز ہے، لیکن اب آپ دیکھیے کہ غالب کے ہاں کس انداز میں جدید عہد جھلکتا ہے ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یہ صرف ۱۸۵۷ء کے قتل و غارت گری ہی کا نوحہ نہیں بلکہ پوری انیسویں صدی کے قتل و غارت گری کا اشارہ ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ اور بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ قد و گیسو میں تو قیس و کوہکن کی آزمائش ہو رہی ہے، لیکن جہاں دار و رسن کا معاملہ ہے وہاں مجاہد و شہید کی آزمائش در پیش نہیں ہے بلکہ خود دار و رسن آزمائش سے دوچار ہیں۔ یہ غالب کی بلاغت کی مثال ہے۔

حسن عابد۔ واہ واہ کیا بات پیدا کی ہے، سبحان اللہ۔

جعفری صاحب۔ ہاں تو یہ دار و رسن کا استعارہ غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آتا ہے۔ ان سے پہلے حالی شبلی اور حسرت کے ہاں یہ استعارہ ان معنوں میں نہیں آیا بلکہ اقبال کے ہاں بھی محض روا روی اور ایک محدود مضمون میں آتا ہے یعنی شعر

نقشہ دار و رسن بازی طفلانہ دل

وغیرہ لیکن جدید معنوں میں دار و رسن کا استعارہ غالب کے ہاں سے ترقی پسندوں کے ہاں آیا ہے ارتقائی شکل میں جو غالب نے کہا ہے۔

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

تو اس شعر میں جو دوئی ہے وہ ترقی پسندوں کے ہاں باقی نہیں رہتی۔ مجروح نے کہا ہے مصرعہ

قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

فیض کا شعر ہے۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یا مخدوم کا مصرعہ ہے۔ مصرعہ　　اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

تو یہاں دیکھیے دوئی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ امیج (IMAGF) ہر ترقی پسند شاعر کے ہاں اس کے اپنے انداز میں موجود ہے۔ فیض کے ہاں، مخدوم کے ہاں، مجروح کے ہاں اور میکش کے ہاں

حکایت دل کی کیا دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

سب کے ہاں آپ کو یہ بات ملے گی لیکن الگ الگ انداز میں اب آپ غالب کے اور اشعار لیجیے، دیکھیے سب نہیں ہے شعر ہیں لیکن ان میں آپ سے آنے والے عہد کی چاپ سن سکتے ہیں

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

اور دیکھیے

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

تو اس طرح کے سیکڑوں شعر ہیں جنھیں آپ آج کے عہد کے ساتھ رکھ کر دیکھ سکتے ہیں اور وہ بھی عالمی تناظر میں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اشعار ہندوستان کے لیے ہیں، پاکستان کے لیے ہیں، ترکی کے لیے ہیں یا فلسطین کے لیے ہیں۔ جہاں جہاں صورت حال ظلم و تشدد سے دوچار ہے وہاں وہاں یہ اشعار اپنی پوری معنی آفرینی

کے ساتھ جلوہ ساماں ہوتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ شاعر کے کلام کا پرتو مستقبل پر بھی پڑ رہا ہے، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ غزل اپنے تمام تر امکانات غالب کے ہاں ختم کر چکی تھی اور اسی لیے آنے والے شعراء کو جن میں آزاد، حالی، اور شبلی شامل تھے نظم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ان حضرات تک آتے آتے غزل انحطاط اور ابتذال کی انتہائی صورت اختیار کر چکی تھی اور اب یہ محض طوائف کے کوٹھے پر پہنچ گئی تھی۔ گو اسی عہد میں غزل کو داغ جیسا شاعر ملا تھا جس کے ہاں زبان اور محاورے کی صفائی ہوتی ہے، لیکن اب آپ دیکھیے حالی نے غزل پر کیسا تند و تیز حملہ کیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ غزل ایک موقر اور معتبر صنف سخن کی حیثیت سے اپنا اعتبار کھو چکی ہے اور یہاں سے نظم کی ابتدا ہوتی ہے۔ اردو نظم کی تعمیر جو حالی مکمل نہ کر سکے اس پر اقبال نے ایک ایسی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دی کہ اس کے سامنے غزل پنپ نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ ان کے عہد میں غزل کہی جا رہی تھی لیکن اس کا معیار کیا تھا اس سے سب واقف تھے۔ دراصل اس عہد میں حسرت موہانی نے غزل کو ایک بار پھر زندہ کرنے کی کوشش کی اور پھر جگر تھے، اصغر تھے، شاد تھے، فانی تھے اور دوسرے شعرا تھے لکھنؤ کے جن میں عزیز، ثاقب، اور یگانہ چنگیزی جیسے لوگ شامل تھے، یہ سب حضرات غزل کہہ رہے تھے، لیکن سچ بات یہ ہے کہ ان سب کی مشترکہ کوشش بھی غزل کو اس مقام تک نہیں لا سکی ہے جہاں اقبال کی نظم کھڑی نظر آتی ہے اور غالباً اسی وجہ سے ان حضرات کا رویہ اقبال کی طرف کچھ زیادہ گرمجوشی کا نہیں رہا۔ بلکہ یگانہ چنگیزی نے تو کچھ نازیبا کلمات بھی کہے تھے۔ اقبال کے سلسلے میں فانی تو سرے سے اقبال کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے لوگ بھی طوعاً و کرہاً انھیں واجبی سا شاعر تو مان لیتے تھے لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ "ٹھیک ہے صاحب یہ کلام ہے شاعری نہیں ہے۔ یہ ترقی پسند تھے جنہوں نے اقبال کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی اور اقبال کو ایک اہم ادبی ورثے کے طور پر قبول کیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اقبال طبقاتی ناہموار سماج کا بہت بڑا شاعر ہے، جیسے جوش اور دوسرے شعراء ہیں۔ لیکن ان کے ہاں شاعری کا کینوس بہت وسیع ہو گیا ہے اور اس میں ہر طرح کے حیاتیات آ گئے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں ایک اقبال کی بجائے دو تین اقبال وجود پا گئے ہیں، ایک اقبال وہ ہے جو ہندوستان کے قوم پرستوں اور نیشنلسٹوں کا اقبال ہے یعنی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" ایک اقبال پاکستان کے مذہب پرستوں کا اقبال ہے یعنی "خودی کا سر نہاں لا الٰہ الا اللہ" ایک اقبال وہ ہے جو ترقی پسندوں کو عزیز ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی　　اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ایک وہ اقبال ہے جو پروفیسروں کا اقبال ہے جو FUNDAMLNTAL ONTOLOGY کی بات کرتے ہیں، صرف مسجد قرطبہ کی بات کرتے ہیں، اب مسجد قرطبہ ایک ایسی نظم ہے کہ اگر ہم ابھی سڑک پر نکل جائیں تو پڑھے لکھے لوگوں کے اس بڑے شہر میں بھی شاید ہی کوئی انسان مل سکے جو اس نظم کو سمجھنے کا مدعی ہو سکے لیکن کالج کے پروفیسروں کے لیے اس نظم میں ایک خاص معنویت اور جاذبیت پنہاں ہے

تو اس طرح اقبال کے چار پانچ رنگ اُبھر کر آتے ہیں اور ہر رنگ اپنی جگہ خوب ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے یعنی ترقی پسندوں نے اقبال سے کیا لیا ہے۔ تو جناب ہم نے اقبال سے تصور انسانیت لیا ہے اور انسانی خلاقی، انسان کی تخلیقی قوت اور انسانی ہاتھوں کی عظمت کا تصور لیا ہے۔ "دستِ دولت آفریں" اقبال ہی کے ہاں آیا، اس سے پہلے کہاں تھا پھر ہم نے اقبال کے ہاں سے نظریہ کائنات لیا ہے کہ "آرہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون" یعنی تخلیق کا عمل ایک جاری و ساری عمل ہے، ہر دم ایک نئی دنیا تخلیق پا رہی ہے جس میں لمحۂ گذشتہ کا عکس بھی شامل ہوتا ہے تو اس طرح اب کی تخلیق کا عمل بھی ایک مسلسل جاری و ساری عمل ہے اور کلاسیکیت کی تخلیق بھی ایک مسلسل عمل ہے۔ ہر دور اپنی قدریں ساتھ لاتا ہے اور اس طرح روایت کی تخلیق کا عمل بھی جاری رہتا ہے جس طرح انسانی جسم میں نئے CELLS بنتے رہتے ہیں اور پرانے خارج ہوتے رہتے ہیں اسی طرح میری نظر میں روایت کی تخلیق کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، تو اس طرح آپ دیکھیے کہ ترقی پسند ادب یا ترقی پسند ادیب کوئی آسمان سے نہیں اُتر آیا، بلکہ اس کے پیچھے روایت کا ایک عظیم سلسلہ ہے اور اب خود ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہماری ادبی روایت کا ایک زندہ اور فعال حصہ بن چکا ہے۔

محمد علی صدیقی۔ جعفری صاحب یہ روایت کے بارے میں ترقی پسندوں کا نظریہ ٹی ، ایس ، ایلیٹ کی روایت کے تخلیقی ارتقاء کے (CREATIVEEVOLUTION TRADITION) کے تصور سے کس حد تک مختلف ہے، ٹی ، ایس ایلیٹ کے اِس روایت کا CONCEPT تو یہ ہے کہ خزاں جب آتی ہے تو خشک پتے ہوا میں اڑ جاتے ہیں اور نئے پتے شاخوں پر نکل آتے ہیں، یہ تصور بڑا جاذب نظر آتا ہے لیکن جزیات میں کچھ پہلو قابلِ بحث نکل آتے ہیں تو آپ یہ فرمایئے کہ ترقی پسندانہ تصورِ روایت کیا ہے اور آپ بالخصوص کس طرح سمجھتے ہیں۔

جعفری صاحب۔ ہاں بھئی یہ سوال بہت اہم ہے لیکن اگر ہم پہلے اس بات کو ختم کر لیں تو پھر اس سوال پر بھی آجائیں گے اور جب اس پہلو پر گفتگو کریں گے تو آپ کے اس نکتے کو سامنے رکھ کے بات کریں گے لیکن سرسری طور پر یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میں روایت کو ایک جاری و ساری عمل سمجھتا ہوں، آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ کل روایت کا حصہ بن جائے گا، بشرطیکہ اس میں زندہ رہنے کی قوت ہوئی ورنہ اپنا وقتی کردار ادا کر کے ختم ہو جائے گا۔ خیر اس پر تفصیلی گفتگو آگے چل کر کریں گے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ترقی پسند ادب نے اقبال سے کیا کچھ لیا ہے تو بھائی ہم نے اقبال سے آہنگ بھی لیا ہے اور آپ دیکھیے کہ اقبال کے آہنگ سے کوئی باشعور شاعر بچا ہی نہیں۔ وہ بھی جو مخالفین تھے وہ بھی نہیں بچے، کیونکہ میں اقبال کے آہنگ کو بیسویں صدی کا آہنگ سمجھتا ہوں اور بیسویں صدی دراصل اقبال کی صدی ہے اگر ہم محض اردو ادب کے پیمانے سے ناپنے بیٹھ جائیں تو پھر ہم ادب میں ہونے والی تبدیلیوں تک شاید پہنچ ہی پائیں لیکن اگر آپ عالمی ادب کے تناظر میں دیکھیں تو آپ کو فلسطینی شاعر کا انقلابی آہنگ ملے گا۔ عرب انقلابی شاعر کی بلند لے سنائی دے گی۔ LATIN AMERICA جنوبی امریکہ کے انقلابی شاعر پابلو نرودا کا آہنگ سنائی دے گا ان سب کے اِن بالکل جداگانہ آہنگ ہے جو ان کے اپنے کلاسیکل آہنگ کے ساتھ مل کر بنا ہے

اب آپ اسے اردو کی خوش نصیبی کہیے یا بدنصیبی کہ ہماری زبان اس طرح عوامی زبان نہیں رہی جس طرح دوسری زبانیں عوام سے قریب رہی ہیں، ہمارے ہاں شاعری کی زبان کسانوں کی بول چال کی زبان سے مختلف رہی ہے اس پر شرفا کی زبان اور کلچر کے اثرات کچھ زیادہ ہی غالب رہے ہیں، لہٰذا شرفا کا تہذیبی انجماد اور روحانی انجماد ہماری کلاسیکل شاعری میں اتر آیا ہے اور اس میں اس روایت کے اثرات بھی آگئے ہیں جنہیں وقت کے ساتھ ختم ہو جانا تھا، تو بھائی ہمارے ہاں یہ سب مسائل رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ اب اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ ہے نئی شاعری کی بوطیقا کا مسئلہ۔ نئی شاعری کی لغت اور ڈکشن DICTION کا مسئلہ اس سلسلے میں خود ترقی پسندوں کے ہاں واضح اختلاف رہا ہے اور آج بھی ہے ایک گروہ وہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ قدیم استعارہ کافی نہیں ہے اور ہمیں اظہار کے لیے اپنے آس پاس سے جدید استعارہ تراشنا ہوگا اس گروہ میں میں خود کو بھی شامل سمجھتا ہوں۔ ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ نہیں قدیم استعارہ، قدیم زبان اور کلاسیکل طرزِ اظہار کافی ہے اور ہمیں اس پر بڑی حد تک انحصار جاری رکھنا چاہیے کہ یہ زیادہ قابلِ اعتماد اور موثر ہے اور روایت سے گندھا ہوا ہونے کے سبب بھی اور آزمودہ بھی۔ اس گروہ میں فیض شامل ہیں، مجروح اور دوسرے احباب شامل ہیں، مخدوم کے ہاں دونوں طرح کے رویے آتے ہیں خود میرے ہاں بھی ایسا ہوتا ہے، لیکن آس پاس سے نیا استعارہ تراشنے کا رجحان ہمارے ہاں غالب رہا ہے۔ اس میں آپ اختر الایمان کو بھی شامل کر لیجیے کہ وہ بھی اس ذہنی رویے میں شریک ہیں۔ مثال کے طور پر آپ میری نظم "پتھر کی دیوار" کو دیکھیے میں نے اپنے شعری مجموعے کا نام ہی "پتھر کی دیوار" رکھا ہے اس میں جو استعارہ ہے وہ کلاسیکل شاعری سے جداگانہ چیز ہے۔ ہمارے ہاں پہلے تو دیوار کے لیے سنگ و خشت کے الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ اس میں ہی کچھ فارسی کی آمیزش سے نئی ترکیب تراش لی جاتی تھیں اور اس طرح حسن پیدا کر لیا جاتا تھا۔ اب جو یہ نظم آئی تو نئے استعارے لے کر آئی اس نظم میں اس قسم کے ٹکڑے آتے ہیں۔

ٹہنیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت پر گر کر دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی سیکڑوں خراشیں ہیں

یہ ساری فضا دراصل گرد و پیش سے لی گئی ہے۔ اچھا اب دیکھیے یہ دین کس کی ہے، یہ دین دراصل جوش کی ہے ہم نے جوش پر کام نہیں کیا ہے، جوش کو نظر انداز کیا گیا ہے اور مجھے کہنے دیجیے کہ بعض سیاسی اسباب

کی بنا پر جوش کو دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے یہاں بھی اور ہندوستان میں بھی، پنڈت جواہر لال نہرو نے اب سے بہت ایک بات کہی تھی، جب اقبال کو ہندوستان میں نظر انداز کیا جا رہا تھا پنڈت جی نے کہا تھا کہ "کسی قوم کا تہذیبی معیار دراصل اس قوم کے فلسفی، شاعر اور ادیب قائم کرتے ہیں، آتے جاتے سیاست داں نہیں۔"

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اقبال اور جوش کو ناپا بھی ہے تو محض سیاسی پیمانوں سے جمالیاتی پیمانوں سے نہیں، حالانکہ شاعری کی اصل تو جمالیاتی ہوتی ہے اور جب ہم جمالیات کو محض سیاسی پیمانوں سے ناپیں تو یہ یقیناً درست رویہ نہیں ہوگا۔ ہم نے ماضی میں غلطیاں بہت کی ہیں اور وہ غلطیاں آج بھی ہو رہی ہیں جن کا ادراک اور درستگی انتہائی ضروری ہے، تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جوش کی دین بہت بڑی ہے انہوں نے جمالیاتی اعتبار سے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ انہوں نے گری پڑی چیزوں کو بھی اس طرح شاعری میں جگہ دی ہے کہ حُسن پیدا ہوگیا ہے اور یہ ان کا فنکارانہ اعجاز ہے۔ دیکھیے ان کے ہاں کیسے کیسے لفظ آتے ہیں، کیسے استعارے اور علامتیں ہیں جن کا حوالہ خالص مقامی، ہندوستانی ہوتا ہے اور یہاں پاکستانی بھی کہہ لیجیے ان کے ہاں "دونے کے پتّوں" "جامن" اور "جوہی" کی کلیوں کا ذکر ملے گا ورنہ ان سے پہلے تو گل ولالہ ہی سے کام چل رہا تھا اور یہ سے الفاظ، استعارے اور علامتیں جو آئی ہیں وہ جوش کے واسطے سے آئی ہیں اور انھیں جوش ہی کی دین سمجھنا چاہیے۔ ہم ترقی پسندوں نے شعوری طور پر جوش سے اکتساب کیا ہے اور اس کا اعتراف ضروری ہے۔

حسن عابد۔ جعفری صاحب یہ اکتساب تو جدیدیوں نے بھی جوش سے کیا ہے، لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتے، غالباً اس سے انھیں اپنے چھوٹے ہو جانے کا خدشہ لاحق رہتا ہوگا۔

جعفری صاحب۔ یہ سراسر زیادتی ہے، جوش سراج سے پہلے تھے، اختر الایمان سے پہلے تھے اور ان کے ہاں جوش کے اثرات موجود ہیں جس کا اعتراف نہیں ہوتا، اختر الایمان نے تو شاید کہیں لکھا بھی ہے کہ یہ کارنامہ ان کا ہے، میں نے اختر الایمان سے کہا بھی تھا کہ تمہارا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے، یہ اصل میں جوش کی دین ہے، تم اور ہم تو ہم عصر ہیں اور ہم نے اور تم نے دونوں نے جوش سے بے شمار چیزیں لی ہیں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، ہم پھر اپنی گفتگو کا سرا وہیں سے جوڑتے ہیں، تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نظم جدید کی جو عظیم الشان عمارت اقبال اور جوش نے تعمیر کردی تھی وہ ترقی پسندوں تک پہنچتی ہے اور ترقی پسند شعرا نے اس کو نہ صرف استحکام دیا ہے بلکہ مقدور بھر اسے آگے بڑھانے کا فریضہ بھی ادا کیا ہے۔ دوسری طرف غزل تھی، غزل کو عصر حاضر میں لانے کا کام فیض اور مجروح نے انجام دیا، ہم اس سلسلے میں مجروح سلطان پوری کا نام اکثر و بیشتر بھول جاتے ہیں حالانکہ ان کا CONTRI-BUTION کسی طور کم نہیں رہا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس صورت حال کی ذمّے داری خود مجروح پر بھی عائد ہوتی ہے، میں نے یہ بات مجروح سے بار بار کہی ہے، بات یوں ہے کہ جب ایک شعر فلمی دنیا سے نکل کر آتا ہے تو اس کا اثر یقیناً مختلف ہوتا ہے اس شعر سے جو جیل کی کوٹھری سے نکل کر عوام تک پہنچتا ہے، مجروح نے دراصل خود کو فلمی دنیا میں بند کر رکھا ہے جس کا اثر ان کی شاعری، اس کی مقبولیت اور خود اس خود اعتمادی پر ہوا ہے جس کا احساس انھیں جتنی جلدی ہو جائے بہتر ہے۔ خیر اس کے باوجود غزل کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں

فیض کے ساتھ مجروح کا بھی بڑا CONTRIBUTION ہے اس میں مجاز اور جذبی بھی شامل ہیں، گو ان کا حصہ فیض اور مجروح سے کم ہے۔ اب دیکھیے ایک بات جو ہم ترقی پسندوں کو غیر ترقی پسندوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ ہم فن، حُسن، اور افادیت تینوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں، ہمارے ہاں یہ تینوں قدریں کسی کامیاب فن پارے کے ضروری اجزا رہی ہیں، جبکہ ان کے ہاں فن اور حُسن کاری پر اصرار تو ہے، لیکن افادیت کی آمیزش کو نہ صرف غیر ضروری جانتے ہیں بلکہ اسے مہلک تک کہتے رہے ہیں اور یہی ہمارا اور ان کا بنیادی اختلاف رہا ہے جسے ہر گفتگو میں یقیناً سامنے رکھا جانا چاہیے۔

مظہر جمیل:۔ جعفری صاحب میں یہاں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں گا کہ ترقی پسندوں پر تحریک کے ابتدائی دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب کچھ لوگ جو صفِ اوّل میں تھے ۔

جعفری صاحب:۔ (بات کاٹتے ہوئے) نہیں صاحب، یہ غلط ہے آپ کو جو کہنا ہے نام لے کر کہیے جو اعتراض کرنا ہے نام بہ نام کیجیے ورنہ اس سے بڑا گھپلا ہو جاتا ہے، میں خود نام لے کر واشگاف انداز میں بات کرتا ہوں۔ ہاں اگر کسی کی برائی مقصود ہو تو بے شک نام نہ لیجیے، لیکن اگر واقعی کسی بات کو سمجھنا ہو تو صاف صاف کہیے تاکہ گفتگو نتیجہ خیز ہو سکے

مظہر جمیل:۔ جی ہاں، جی ہاں، جعفری صاحب میں دراصل یہ کہہ رہا تھا کہ تحریک کے ابتدائی دور میں ترقی پسندوں پر افادیت کا غلبہ کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا اور جمالیاتی عنصر پر توجہ کم تھی۔ لہٰذا ترقی پسند ادیب پر پروپیگنڈے کا الزام بھی لگے، تو آپ اس اعتراض کے سلسلے میں کیا فرماتے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ ہاں یہ بات بالکل صحیح ہے، ایسا بے شک ہوا ہے اور بعض حلقوں نے بجا طور پر اس طرف نشاندہی کی تھی، خصوصاً حلقۂ اربابِ ذوق والوں نے، اس پر بھی گفتگو کیے لیتے ہیں، میں دراصل یہ کہہ رہا تھا کہ اگر کسی اہم شاعر کو کسی دور میں ترقی پسندوں نے نظر انداز کیا ہو تو آپ اس کا نام لے لیں، اس سے ہماری غلطی کی اصلاح اور اس شاعر کی بازیافت میں آسانی رہے گی جہاں تک میرا خیال ہے کوئی بڑا اہم اور اچھا شاعر ہمارے ہاں نظر انداز نہیں ہوا۔

محمد علی صدیقی:۔ جعفری صاحب اچھے شاعر سے آپ کی کیا مراد ہے۔؟

جعفری صاحب:۔ یہ تو آپ خود مجھ سے بہتر جانتے ہیں، آپ دیکھیے ترقی پسندوں کا رشتہ عوام سے بہت قریب رہا ہے اور ہم نے کبھی عام آدمی سے صرفِ نظر کرنے کی جسارت نہیں کی، یوں بھی ہمارے ہاں شعر کتابوں کے ذریعے کم پہنچتا ہے اُس زمانے میں تو خصوصاً ایسا ہوتا تھا لہٰذا ہمارا شعر مشاعرے کے ذریعے لوگوں تک پہنچتا تھا۔ ترقی پسندوں میں ایسا کونسا شاعر تھا جو مشاعروں میں نہیں گیا۔ دیکھیے میں یہ بات بالکل نہیں کہہ رہا ہوں کہ مشاعرے شعر کا معیار ہوتے ہیں، نہیں ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی تو مشاعرے گمراہ کن بھی ہوتے ہیں۔ مقصد صرف یہ کہنا تھا کہ مشاعرے کے ذریعے شعر زیادہ موثر طور پر عوام تک پہنچ جاتا ہے۔ آج کیفی نے نظم مشاعرے میں پڑھی نہیں اور کل وہ سب میں عام ہو گئی۔ یہی کیفیت مجاز کی تھی، مجروح کی تھی، جاں نثار اختر کی تھی گویا سب کی یہی کیفیت تھی اور ہمارے لیے مشاعرہ اپنی نظم، اپنی شاعری کو عوام تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا انھیں اچھے شعر کا معیار نہیں سمجھا جاتا بلکہ ترسیل کا ایک اہم ذریعہ، یوں محمد علی صدیقی صاحب سے معذرت

کے ساتھ میں عرض کروں کہ میں اچھا شعر اس کو نہیں سمجھتا جس کو نقاد بڑا شعر مان لے یا جو محض دانشوروں کے حلقے سے سند پالے بلکہ میں تو بڑا شعر اس کو سمجھتا ہوں جو نقاد سے بھی داد پائے اور عوام میں بھی پسندیدہ قرار پائے۔ شاعری سے حاصل ہونے والی فوری مقبولیت ایک بات ہے اور کتاب میں خشک حروف کی صورت میں زمانے کی نشیب و فراز سے گزر کر باقی بچ رہنا ایک دوسری بات ہے اور یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ اچھے شعر اور اچھے شاعر کا معاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں کہ اسے آپ کسی تعریف کی گرفت میں لا سکیں۔

محمد علی صدیقی:۔ جعفری صاحب آپ نے اپنی گفتگو میں جو ترقی پسند استعارے کی توجیہہ فرمائی ہے مخصوصاً "یار" اور "دار" کے حوالے، ترقی پسندوں نے اپنے گرد و پیش سے استعارے ڈھالنے کا کام شروع کیا تو اس سے نئی زبان کی تشکیل کا معاملہ بھی تو پیش آیا ہوگا اور نئی امیجری کے اظہار کے لیے نئی لسانی تشکیلات بھی کرنی پڑی ہوں گی تو یہ فرمایئے کہ لفظیات کے باب میں ترقی پسندوں نے کیا بنیادی تبدیلیاں اور اضافے کیے۔

جعفری صاحب۔ جی ہاں اس ذیل میں بھی ترقی پسندوں نے خاصا کام کیا ہے اگر آپ صرف ترقی پسند شاعری کو لے لیں تو آپ دیکھیں گے کہ نئی امیجری کے ساتھ ترقی پسندوں نے لفظیات کی تشکیل میں کیا کیا کام سرانجام دیے ہیں، اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات کہوں گا کہ ابھی دوران گفتگو اس اعتراض کا تذکرہ ہوا تھا کہ ترقی پسندوں کے ہاں جمالیاتی اظہار کو پس پشت ڈال کر افادیت اور پروپیگنڈے کی راہ اختیار کی گئی تھی، معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کونسی شاعری تھی آپ نے نام تو لیا نہیں تھا، لیکن میں .....

منظور جمیل:۔ (بات کاٹتے ہوئے) جیسے نیاز حیدر کی شاعری

جعفری صاحب۔ چلیے میں خود آپ کی مشکل حل کیے دیتا ہوں، آپ نیاز حیدر ہی کا نام کیوں لیتے ہیں آپ میرا نام بھی لے سکتے ہیں، مخدوم کا نام بھی لے سکتے ہیں، مجروح کا نام بھی لے سکتے ہیں۔ ہم سب پر کم و بیش یہ اعتراض اگر یہ کوئی اعتراض کی بات ہے تو لگایا جا سکتا ہے۔

حسن عابد:۔ جعفری صاحب وہ جو ترقی پسندوں پر پروپیگنڈے کا الزام لگایا تھا تو میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسندوں کا کوئی اہم روشن نام مثلاً جوش، فراق، فیض، مجاز، مجروح، مخدوم یا خود آپ یعنی سردار جعفری ان میں سے کسی کی بھی شاعری کلیتہً پروپیگنڈے کی ذیل میں شمار نہیں کی جا سکتی۔ اور تو اور خود معترضین نے بھی واشگاف طور پر یہ نہیں بتایا کہ فلاں فلاں شاعر کی فلاں فلاں نظمیں جمالیات سے عاری ہیں، ہمیں تو ان الزامات کی پشت پر کوئی مضبوط دلیل یا ثبوت نہیں ملتا۔

محمد علی صدیقی۔ غالباً معترضین کا اصل ہدف ملامت ترقی پسندوں کی فکر رہی ہے اور وہ فلسفہ حیات جو ترقی پسندوں کو عزیز رہا تھا ناپسندیدگی کا باعث بنتا رہا ہے۔

حسن عابد۔ دیکھیے خود آپ کی نظم "نئی دنیا کو سلام" پہ اثر لکھنوی صاحب نے توصیفی تبصرہ لکھا تھا اور اس میں آپ کی نظم کی تعریف کی تھی انہوں نے بھی جمالیاتی طور پر اس نظم میں کسی کمزوری کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔

جعفری صاحب۔ ہاں غالباً ۱۹۴۸ء میں اثر صاحب نے میری شاعری خصوصاً "نئی دنیا کو سلام" پر حوصلہ افزا تبصرہ لکھا تھا۔

"نئی دنیا کو سلام" پر تو آج تک اس قسم کا کوئی الزام نہیں لگایا جا سکا ہے اور نہ وہ اس قبیل کی چیز ہے۔

حسن عابد: اور پھر مخدوم کی شاعری ہے اس میں بھی کبھی کسی نے جمالیاتی حسن کی کمی کی نشاندہی نہیں کی۔ فیض اور مجروح بھی اس الزام سے بری رہے ہیں تو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ معترضین آخر کس شاعری کو سامنے رکھ کر تمام ترقی پسند شاعری کو معیارِ حسن پر کم تر ٹھہرا سکتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں ادبی دیانت کے بجائے کچھ اور سخن گسترانہ باتیں شامل نظر آتی ہیں۔

جوہر صاحب: دراصل میں خود اس بات کو واضح کرنا چاہ رہا تھا اور یہ کہہ رہا تھا کہ ترقی پسند ادب تحریک آزادی سے واضح وابستگی رکھتا تھا اور یہ تحریک آزادی محض ہندوستان کی تحریک آزادی نہیں تھی بلکہ ایک عالمگیر جد و جہد کا حصہ تھا، سامراجی استحصال کے خلاف، اس میں جغرافیائی، نسلی اور قومی قیود کوئی معنی نہیں رکھتے تھے بلکہ ہماری ہمدردیاں دنیا بھر میں برپا ہونے والے ہر اس جہاد کے ساتھ تھیں جن میں سامراجی شکنجے میں گرفتار سبھی مظلوم قومیں آزادی کا پرچم اٹھائے ہوتی تھیں، ایک طرف ملکی اور مقامی سطح پر ہندوستان میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی غافل نہیں رہا جا سکتا تھا اور دوسری طرف کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں سے اغماض ممکن نہ تھا۔ یہ تھا پس منظر جس میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا تھا اس میں دو عالمی جنگوں اور قحط بنگال کی ہولناکیاں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اس صورتِ حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے ثبوت فراہم کئے ہیں۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس شاعری کی بھی ضرورت ہے جو ایک وقتی لمحے کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو اور اس شاعری کی بھی جو لمحاتی اور وقتی سطح سے بلند ہو کر دائمی قدر کی حیثیت بھی حاصل کر سکے میں اب بھی یہ بات کہتا ہوں کہ فوری ردِ عمل کے طور پر جو شاعری پیدا ہوتی ہے وہ بالکل ہی بے معنی نہیں ہوتی، یہ بات شاید آج کی صورتِ حال میں زیادہ بہتر طور پر نہ سمجھی جا سکے لیکن اگر اس کو اس وقت کے تناظر میں دیکھیں تو پوری بات سمجھنا آسان ہو جائے گا، جیسا کہ عرض کیا اس وقت ہم ایک ہیجانی صورتِ حال سے دوچار تھے، ایک طرف ہندوستان کی آزادی کی جنگ تھی، بنگال کے قحط کی ہولناکیاں تھیں، بحریہ کی ہڑتال تھی، کسانوں، مزدوروں اور نچلے طبقوں کی جد و جہد تھی، غرض حوادث و واقعات کا ایک سیل تھا جو ہمارے چاروں طرف امڈا ہوا تھا۔ کیا ترقی پسند ادیب کے لیے جو اپنا رشتہ عوام سے استوار رکھتا ہو اور جو تخلیقِ ادب کو ایک سماجی ذمے داری بھی جانتا ہو ان بدلتے ہوئے حالات سے چشم پوشی ممکن ہو سکتی تھی، ظاہر ہے نہیں۔ لہٰذا انہوں نے وقتی تقاضوں کے تحت بھی شاعری کی ہے اور اردگرد ہونے والے واقعات پر بے شمار نظمیں بھی لکھی ہیں، میں نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں بیشتر مثالیں مجروح کی شاعری سے پیش کی تھیں، لیکن ابھی حال ہی میں شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر نعیم چودھری صاحب کا ایک مضمون اردو انٹرنیشنل (کینیڈا) میں شائع ہوا ہے، مجروح کی شاعری پر، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ مجروح نے بعد میں مرتب ہونے والے کلام سے اس قسم کی شاعری کو خارج کر کے دراصل دشمنوں کے سامنے اعترافِ شکست کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ مجروح نے وقتی طور پر کہے ہوئے اشعار کو خارج کر کے دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا ہے کہ ان اشعار کی ایک تاریخی اہمیت تو بہرحال

بنتی ہی ہے، یاد رکھیے یہ بات شکاگو میں بیٹھ کر لکھی گئی ہے، ماسکو سے نہیں آئی ہے اگر کوئی نظم ہزاروں مزدوروں کے سامنے پڑھی جاتے اور وہ ان کے خون میں شامل ہو کر ان کی جدوجہد میں تعاون کرے تو اس میں قباحت کیا ہے کہ ترقی پسندوں کو مطعون کیا جاتے۔ آپ دیکھیے ٹیگور کو جن کی عظمت سے شاید ہی کسی صحیح الدماغ شخص کو انکار ہو کیا انہوں نے پارٹیشن آف بنگال کے سلسلے میں چلنے والی تحریک اور جلوس میں شامل ہو کر نظمیں نہیں پڑھیں اور جناب کیا پابلو نرودا نے ہنگامی نوعیت کی نظمیں نہیں لکھیں اور بڑے بڑے مجمعوں کے سامنے نہیں پڑھی ہیں اور کیا ایسا کرنے سے ان حضرات کا اثاثۂ شعری قابلِ دریا برد ٹھہرے گا؟ بات دراصل یہ ہے کہ مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، سردار جعفری، وامق جونپوری، نیاز حیدر، جذبی اور اس قسم کے دوسرے مجرموں نے ایجی ٹیشنل AGITATIONAL احتجاجی شاعری دانستہ اور شعوری طور پہ کی تھی کیونکہ ہم اس قسم کی شاعری کی ضرورت اور اہمیت کا احساس رکھتے تھے اور آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ شاعری بے اثر تھی اور اس نے کوئی کام سرانجام نہیں دیا۔ تو جناب ہم نے احتجاجی شاعری ضرور کی ہے، لیکن ہم نے ساتھ ہی دائمی قدروں کی شاعری جسے آپ اچھی شاعری کہتے ہیں کی ہے۔ اب آپ کہتے یہ ہیں کہ ہماری اچھی شاعری کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور پکڑ لیتے ہیں اس شاعری کو جو خود ہم نے ہنگامی ضرورتوں کے تحت کی تھی یہ تو کوئی ادبی دیانت نہیں ہوتی۔ خیر اس کو چھوڑیے میں تو یہ بھی کہتا ہوں کہ جناب ہماری وہ ہنگامی نوعیت کی شاعری آپ کی اس مہمل شاعری سے بہتر تھی جس کا کوئی قصد، کوئی ہدف، کوئی رخ اور مافی الضمیر نہیں ہوتا۔ اب رہا اچھی اور بری شاعری کا معاملہ تو کیا جناب دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے پاس کوئی کمزور اور برا شعر نہیں ہوتا، آخر آپ میر کے اس شعر کو کہ ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ● اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اور غالب کے اس شعر کو کہ ؎

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا ● ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

کیا ان اشعار کو، اسی قسم کے سیکڑوں اشعار کو جو کلاسیکل شاعری میں بھرے پڑے ہیں آپ اچھی شاعری کے ذیل میں رکھیں گے۔ تو جناب بات جو ہونی چاہیے وہ دیانت داری سے ہونی چاہیے۔ اگر آپ مخدوم کے ہاں، میرے ہاں یا ہمارے کسی مجرم ساتھی کے ہاں سے کچھ اچھے اشعار کی داد بھی دے ڈالتے تب تو شاید آپ کے اعتراض میں کوئی وزن ہوتا۔

مسلم شمیم:۔ ظاہر ہے اس رویے میں تو معترضین کی ادبی دیانت ہی مشکوک ٹھہرتی ہے۔

جعفری صاحب:۔ اب اس مسئلے کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھیے بات دراصل یہ ہے کہ جن لوگوں نے شروع میں احتجاجی شاعری کی تھی انہوں نے بعد میں لطیف تر شاعری بھی کی ہے اور جن لوگوں نے شروع میں زیر لب بات کی تھی انہوں نے آخر آخر میں احتجاجی شاعری بھی کی ہے۔ یہاں میں فیض کا نام لوں گا فیض شروع ہی سے لطیف لے کے شاعر سمجھے گئے اور مدت کے ساتھ ساتھ ان کے لطیف لہجے میں مزید شائستگی، مزید لطافت اور حسن

پیدا ہوتی گئی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے انتساب جیسی نظم بھی کہی۔ کلرکوں، پوسٹمینوں اور گاڑی بانوں جیسے الفاظ ہیں۔

اور پھر فیض کی آخری دور کی نظمیں جو انہوں نے فلسطینی نعرے پر لکھی ہیں کہ "حقّا کہ ہم جیتیں گے" یہ لہجہ پہلے فیض کے ہاں پہلے نہیں تھا، لیکن آخر آخر میں ان کے ہاں بھی یہ بلند بانگ احتجاجی لہجہ آیا۔ فیض کی ایک غزل نما نظم ہے کہ ؎ "جب مزدور، کسان جاگ گئے تو اک لینا نہیں، اک دلیس نہیں ہم ساری دنیا مانگیں گے

ہم ہر پرچم پر اک لال ستارا مانگیں گے"

بات دراصل یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں دونوں چیزیں شامل ہیں اگر کوئی اس بات کو بہانہ بنا کر فیض کی پوری شاعری پر معترض ہو تو کیا آپ اسے ادبی دیانت کہیں گے۔

مسلم شمیم:- جعفری صاحب آپ کی گفتگو سے یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہے کہ ترقی پسندوں نے جو احتجاجی شاعری کی تھی وہ اچھی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی ہے۔

شاہد نقوی:- صاحب یہ تو معذرت خواہانہ طریقہ ہوا آخر اچھی شاعری کے معیار کیا ہیں۔؟

جعفری صاحب:- دیکھیے میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ اچھی شاعری نہیں تھی بلکہ صرف یہ عرض کیا تھا کہ وہ لمحاتی اور وقتی شاعری تھی اور اس قسم کی شاعری کی افادیت سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا جہاں تک اچھی شاعری کے فنی معیار کے تعین کا تعلق ہے تو جناب یہ انتہائی مشکل سوال بلکہ بڑی کھیر والی بات ہے فنی معیار بڑی عجیب و غریب چیز ہے اور بعض اوقات آپ کو ایسے اشعار ضرب الامثال کی صورت سنائی دیں گے جن میں کوئی حسن نہیں ہوتا اور جو کسی فنی معیار پر پورے نہیں اترتے "اوروں کی تجھ کو کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو کچھ تخلیق کیا جا رہا ہے اس میں سے کل کیا باقی رہ جائے گا اور پھر یہ فن کار کا مسئلہ ہوتا بھی نہیں اگر یہ کہا جائے کہ ؎

دلی اس گوہر کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی　　مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آوے

تو اچھی شاعری کی مثال ہے، اور ؎

مفلسی سب بہار کھوتی ہے　　مرد کا اعتبار کھوتی ہے

بُری شاعری ہے تو یہ تو تنقید کا کوئی معیار نہیں ہوا۔ یہ دونوں شعر ولی کے ہیں، اب آپ کسی ایک شعر کو بنیاد بنا کر شاعر کے مقام اور اہلیت کے بارے میں کوئی فتویٰ صادر نہیں کر سکتے جیسا کہ ہمارے غیر معتبر اور بزعم خود علامہ ناقدین ہمارے بارے میں کرتے رہتے ہیں اچھا اس سلسلے میں ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ لمحاتی اور وقتی شاعری میں بھی اکثر ایسی لافانی چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں جو شاید شاید ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ میں آپ کو اقبال کی طلوعِ اسلام میں سے مثال دیے دیتا ہوں، شعر ہے ؎

"اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے"

دیکھیے یہ مصرع ایک وقتی ضرورت کے تحت لکھا گیا تھا، لیکن اس کے ساتھ جو دوسرا مصرع آیا ہے وہ اپنے

اور قوت کے اعتبار سے ذاتی چیز ہو گیا ہے یعنی ؎

"کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا"

اب دوسری مثال اقبال کے مقابلے میں نسبتاً کم مشہور شاعر مظفر شاہجہاں پوری کے ہاں سے دیکھیے پہلا مصرع ہے

اس طرف روس ادھر چین ملایا برما

اب اجالے مری دیوار تک آ پہنچے ہیں

محمد علی صدیقی۔ جعفری صاحب ابھی گفتگو کے دوران آپ نے خاصی وضاحت سے بتایا ہے کہ فیض صاحب کے ہاں کس طرح آہنگ کی تبدیلی رونما ہوئی اور جب فیض کے ہاں رجائیت بلکہ سرفروشانہ جذبے اور جرأت کا اظہار ہوا تو بعض معترضین نے یہ بات کہی کہ شاید فیض صاحب اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں وہ یہ بھی نہ سمجھے کہ فیض کا جو لطیف ترجمہ جس پر وہ بہت نازاں و فرحاں رہتے ہیں فیض کی بلند آہنگی کے ساتھ مل کر مزید لطیف تر ہوا ہے۔

جعفری صاحب۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ فیض کا جو لطیف تر لہجہ تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ بہتر سے بہتر ہوتا گیا ہے فیض تو آخر وقت تک ارتقاء پذیر رہے ہیں اور ان کا خلاقانہ ذہن آخر وقت تک کچھ نہ کچھ دیتا ہی رہا ہے۔ ان کی تغزلی جو رومانی نظموں میں تھی وہ بعد کی رجزیہ نظموں میں زیادہ اعلیٰ سطح پر نظر آتی ہے۔ لہٰذا شاعری کو لطیف لہجے اور بلند آہنگ میں تقسیم کر دینا ہی مغالطات ہے۔ لہجہ اور آہنگ تو موضوع سے بنتا ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے معترضین کے لیے وجہ شکایت ہماری شاعری نہیں بلکہ ہمارا فلسفۂ زیست رہا ہے، خواہ مجروح ہوں فیض ہوں، مخدوم ہوں کہ سردار جعفری ان سب کو اشتراکی فکر عزیز رہا ہے اور یاروں نے اس فکر کو ملعون کرنے کے لیے ایسے بہتان تراشے ہیں، جن کی نہ کوئی علمی بنیاد تھی اور نہ ادبی دیانت اور آپ دیکھیے ان اعتراضات کا حشر ہوا کیا، ہمیں اپنی بلند آہنگی کا نہ صرف اعتراف ہے بلکہ اس پر ناز بھی ہے لیکن ذرا ہمارے معترضین کا بھی تو جائزہ لیجیے تو آپ کو اگر بہت نہیں تو کم از کم دو چار مثالیں تو ایسی مل ہی جائیں گی جن پر خود یہی الزام وارد ہوتا ہے۔

محمد علی صدیقی:۔ بات تو صاحب وہی ہے، جو لوگ فیض کی فکر اور نظریے سے خوش نہ تھے بھلا انھیں فیض کی شاعری کیوں کر پسند آتی۔ ان کے ہاں جو CLARITY ہے جو کمٹ منٹ ہے اور جو رجز کی کیفیت ہے اس پر تو ایسے لوگ خوش ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

جعفری صاحب:۔ نہیں بھئی، بعض لوگ تو فیض کی جمالیاتی کیفیت سے بھی خوش نہیں رہے ہیں مثلاً ن، م راشد نے جو خود اچھے شاعر تھے "لا = انسان" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "فیض کے ہاں بے انتہا آرائش ہے اور مجھے خوف ہے کہ کہیں بعد کو یہ نرگس کے کاغذی پھول ہی ثابت نہ ہوں"؛ تو مجھے تو اس جملے میں معاصرانہ چشمک کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ فیض کے خلاف کل تک ایک اچھا خاصا محاذ آپ کے ہاں رہا ہے اور آج بھی کسی نہ کسی پہلو سے مخالفانہ سرگرمیاں جاری ہی ہیں لیکن دیکھیے یہ فیض کی آواز کی سچائی اور فن کا طلسم تھا کہ انہوں نے ایک عالم سے داد وصول کر کے چھوڑی۔

مظہر جمیل:۔ جعفری بھائی وہ جو ابتداء میں محمد علی صدیقی صاحب نے روایت کا مسئلہ اٹھایا تو کیا مناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلے

میں بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔

جعفری صاحب:۔ ہاں بھئی اب اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ آپ سوال دہرائیں۔

محمد علی صدیقی:۔ روایت کے بارے میں ہمارے ہاں اپنا ایک نظریہ تھا پھر ٹی ایس ایلیٹ کے نظریۂ روایت پر عسکری صاحب اور جمیل جالبی صاحب نے بھی کام کیا اور CREATIVE EVOLUTION OF TRADITION کی بات آئی، بعد میں عسکری صاحب نے روایت کے سلسلے میں ایک جداگانہ موقف اختیار کر لیا، دوسری طرف وہ نظریۂ روایت بھی ہے جس کی طرف ابھی آپ نے اشارہ فرمایا تھا۔ میری خواہش ہے کہ مختلف نظریہ ہائے روایت کے حوالے سے آپ کچھ روشنی فرمائیں۔

جعفری صاحب:۔ دیکھیے اس سلسلے میں جو کچھ کہوں گا وہ میری ذاتی بات ہوگی اور ضروری نہیں ہے کہ ہر ترقی پسند میری ان گزارشات سے متفق ہو کیونکہ ترقی پسندوں کے ہاں بھی اس سلسلے میں مختلف رنگ رہے ہیں ایک رنگ تو وہ ہے جسے آپ گہرا سرخ رنگ کہتے ہیں۔ آپ اسے سجاد ظہیر کا رنگ کہہ لیجیے ایک رنگ گیروا رنگ ہے اسے آپ منشی پریم چند سے منسوب کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان بہت سے ہلکے گہرے شیڈ SHADS کی ایک دھنک ہے میں تو خیر مارکسی ہوں اور مارکسزم میری سوچ بلکہ ضمیر کا حصہ بن چکا ہے اس نقطۂ نظر سے میں روایت کو طبقاتی سماج کے عمل سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھ سکتا یہ کوئی قائم بالذات چیز نہیں ہے اور جب سماجی ماحول بدلتا ہے تو وہ سماجی رشتے تبدیل ہوتے ہیں تو روایت میں بھی ٹوٹ پھوٹ واقع ہوتی ہے اور اس طرح روایت کا حصہ زندہ ورثے کے طور پر نسل نئے سپرد ہو جاتا ہے، جب کہ ایک حصہ جو معاشرتی ابتری کے سبب مردہ ہو چکا ہوتا ہے تاریخ کے سرد خانے میں جا پڑتا ہے، اس بات کو ہم اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ہاں تو باقی رہنے والے ورثے کے طور پر آگے چلتی ہے اور تراش خراش کے ساتھ تو باقی رہتی ہے یعنی اس کی ریڑھ کی ہڈی جسے ڈھانچہ کہتے ہیں باقی رہتا ہے یہ نہیں ہوتا کہ سامنتی سماج میں زبان جو تھی وہ سرمایہ دارانہ سماج میں یکسر بدل جائے یا کمیونسٹ سماج میں بالکل ہی ختم ہو جائے یہ نہیں ہوتا بلکہ زبان میں ترقی اور نمو پذیری کا عمل جاری رہتا ہے، بنیاد نہیں بدلتی لیکن اقدار بدل جاتی ہیں، اقدار کے ساتھ رویے بدل جاتے ہیں، رویے کے ساتھ الفاظ بدلتے ہیں، محاورہ بدلتا ہے، غرض روایت کا توانا حصہ تو سماجی تبدیلی کے ساتھ گھل مل کر آگے چلتا ہے لیکن مردہ حصہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ یہ روایت کا جدلیاتی عمل ہے، اب دیکھیے روایت میں فکر کا عنصر بھی شامل ہوتا رہتا ہے جو معروضی حالات میں پیدا ہوتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فکر بہت ضدی واقع ہوتی ہے، ہوتا یوں ہے کہ ہر دور میں ماضی کی فکر کا کچھ نہ کچھ حصہ باقی بچ رہتا ہے اور اس طرح مختلف النوع خیالات اور عقائد وغیرہ بھی روایت میں چلتے رہتے ہیں اور اسی لئے ایک طرح کی DICHOTOMY کا احساس بعض لوگوں کے ہاں ملتا ہے۔
اور معلوم یوں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص اپنی فکر میں تو بے حد ترقی پسند نظر آئے گا لیکن اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ آپ کو ترقی پسندانہ معلوم ہوگا، اس کے برعکس ایسے لوگ بھی آپ کو ملیں گے جو مزاجاً تو ترقی پسند دکھائی دیتے ہیں لیکن فکر میں فرسودگی کا عنصر غالب یہ تضاد جمالیات میں آکر عجب گل کھلاتا ہے۔ جمالیات تو ہمارے ذوق کا

حصہ ہے اور ہم اسے کلیجے سے لگائے رہتے ہیں اس سلسلے میں سبط حسن نے ایک بار بہت خوبصورت مثال دی تھی انہوں نے کہا تھا کہ جس طرح بندریا اپنے مردہ بچے کو سینے سے چمٹائے پھرتی ہے اسی طرح ہم کبھی کبھی اپنی ان بعض اقدار کو سینے سے چمٹائے رکھتے ہیں جو معاشرتی طور پر مرچکی ہوتی ہیں۔ فیض نے اس بات کو نیا لباس اس طرح کہا تھا کہ ؎

دل کے ایوانوں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار — نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصور کی طرح — اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

تو گل شدہ شمعوں کو جب سینوں سے لپٹا لیا جاتا ہے تو اس کے حصار سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس معاملے میں بھی غالب، مومن کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی پسند تھا کہ اس کے ہاں ماضی پرستی نہیں، ہاں ٹوٹتی پھوٹی قدروں کا غم ضرور ہے خود ماضی کے مٹ جانے کا غم نہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی موت پر غالب نے ایک مصرع نہیں کہا لیکن اقدار کی موت پر وہ ضرور تڑپا، کیا ان کی شاعری اور کیا خطوط سب جگہ آپ اس کی اس تڑپ کو دیکھ سکتے ہیں، غالب کی نظر مستقبل پر رہی ہے۔ یہاں میں آپ کو غالب کی ایک فارسی غزل سناتا ہوں۔ غالب خود کو شاہانِ ایران کی اولاد سمجھا کرتے تھے اور اس پر کچھ فخر بھی تھا، لیکن اس نے شاہی کو خود اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا، اس نے انگریزوں کی لائی ہوئی ایجادوں کو دیکھا سائنس اور نئے علوم کا جو ایک شہرہ اور غلغلہ بلند ہوا تھا اسے غور سے نہ صرف سنا بلکہ سرسید کی توجہ بھی اس طرف مبذول کروائی، "آئینِ اکبری" پر اس نے جو تقریظ لکھی ہے وہ غالب کی اس طرزِ فکر کی غمازی کرتی ہے۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن اس نے ان تبدیلیوں کو اپنی شاعری اور وہ بھی غزل میں جگہ دی اور غزل کی روایت سے ہٹ کر آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ہماری کلاسیکل شاعری میں رات کا استعارہ عیش و نشاط کا استعارہ رہا ہے، غالب پہلا شاعر ہے جو رات کو عیش و نشاط کے سمبل SYMBOL سے الگ کر کے استعمال کرتا ہے، اب آپ غزل سنیے ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند — شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند
گہر از رایتِ شاہانِ عجم بر چیدند — بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

یعنی خوش ہو کہ تیرہ شبوں کے لیے صبح ہو گئی ہے اور شمعوں کے گل ہونے کے ساتھ ہی خورشید عالمتاب نکلا چاہتا ہے اور شاہانِ عجم کے پرچموں سے جواہر نوچ لیے گئے ہیں اور ان کے بدلے مجھے اظہار کے جواہر سے مالا مال کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ مزید یہ کہا کہ میرے بزرگوں کے ٹوٹے ہوئے تیر میرے ہاتھوں میں قلم بن گئے ہیں، تو جناب یہ نیا استعارہ تھا، نیا لہجہ تھا جو روایت کے زندہ ورثے کے طور پر ترقی پسندوں کو تفویض ہوا۔

مظہر جمیل:۔ جعفری بھائی آپ نے روایت پر خاصا کام کیا ہے اور دیکھا جائے تو ترقی پسند معاصرین میں آپ تنہا نظر آتے ہیں جنہوں نے ایک تسلسل کے ساتھ کلاسیکل شعراء پر تحقیقی نوعیت کا کام کیا ہے خصوصاً کبیر، میر اور غالب پر آپ نے بہت وقیع کام کیا ہے اور اقبال شناسی بھی آپ کا موضوع رہا ہے تو یہ سارا کام زندہ روایت کے سلسلے ہی کو منسلک کرنے کا کام تھا یا کچھ اور بھی مقاصد آپ کے پیشِ نظر رہے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ دیکھیے بعض اوقات اہم کام بے ارادہ، رواروی اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے بھی ہو جاتے ہیں۔ میں نے جب

کبیر، میر، غالب یا اقبال پر کام شروع کیا تھا تو میں دراصل ان شعراء کی بازیافت نہیں کر رہا تھا بلکہ میری خواہش تھی کہ اپنے کلاسیکل ورثے سے خود آگاہی حاصل کر سکوں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ادب کا صحیح ذوق رکھتا ہو اور اسے اپنے ادب میں دلچسپی ہے تو اسے دوسروں کی کہی ہوئی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر لینا چاہیے بلکہ اپنے طور پر جس حد تک ممکن ہو اس ورثے تک خود پہنچنے اور سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو پھر ہم میر کو محض آہ کا شاعر، اور سودا کو واہ کا شاعر جیسا کہ ہمیں آزاد اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بتایا تھا سمجھنے رہ جائیں گے لیکن جب آپ خود میر کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ صاحب وہ تو اپنے عہد کا بڑا ریڈیکل شاعر تھا جس نے اپنے عہد کو سمجھا اور برتا تھا اور جس کی شاعری میں اس کا عہد جھلکتا ہے۔ میر کے ہاں جو ملال یا تلخی تھی تو وہ اس کے عہد کی تلخی تھی وہ صرف عطار کے لونڈے سے دوا نہیں لیتا تھا بلکہ یوں بھی کہتا تھا ؎

کاش تجھ کو ملے کوئی تجھ سا   مدعا ہم کو انتقام سے ہے

ہاتھ دامن میں تیرے مارتے جھلا کے نہ ہم   اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

اچھا اب غالب کا وہ جو شعر ہے نا کہ ؎

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ   چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

تو دیکھیے یہ مضمون میر کے ہاں کس طرح آیا ہے ؎

پی کے شراب شگفتہ ہوا ہے اس گل تر کا چہرہ آج ● شوق کی اپنے نگاہ جہاں تک جاوے بوس و کنار ہے آج

تو جناب یوں میں نے میر اور کبیر پہ کام کیا، اس وقت ایک اور مقصد پیش نظر تھا اور وہ تھا تصوف اور بھگتی کے باغیانہ کردار کو سمجھنا، آج تصوف خصوصاً وہ تصوف جو مردنی کی طرف لے جاتا ہے ہم تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن ماضی میں تصوف نے جو کردار انجام دیا ہے اس سے منکر بھی نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تصوف نے ایک ادارے کی حیثیت سے مذہبی اور ریاستی بیوروکریسی کے خلاف اہم اور فعال کردار انجام دیا ہے، قرونِ وسطیٰ میں مذہبی اور ریاستی بیوروکریسی تقریباً ایک ہی تھی مثلاً ملاّ، قاضی، محتسب سب ایک زنجیر کی کڑیاں تھیں، چنانچہ ایسے وقت صوفیوں کا یہ کہنا کہ "خدا ہمارے اندر ہے اور خدا اور انسان کا براہِ راست تعلق ہے" تو یہ بظاہر معصوم سا فقرہ دراصل ہر قسم کی بیوروکریسی کی بنیاد کاٹ کر پھینک دینے کے مترادف تھا بلکہ آپ اسے پورے معاشرتی جبر کے خلاف بھرپور ردّعمل قرار دے سکتے ہیں۔ ابھی کچھ دن قبل لاہور میں میں نے تقریر کرتے ہوئے مولانا جلال الدین رومی کی غزل کے کچھ شعر سنائے آپ بھی سنیئے اس سے صوفی مزاج بلکہ باغیانہ صوفی مزاج کو سمجھا جا سکتا ہے ؎

چوں من خراب و مست را در خانۂ خود رہ دہی   پس می دانی ایں قدر ایں بشکنم آں بشکنم

خوانِ کرم گستردۂ مہمانِ خویشم کردۂ   گوشم چرا مالی اگر من گوشۂ ناں بشکنم

(اگر روٹی کا لقمہ یا ٹکڑا میں نے توڑ لیا ہے تو میرے کان کیوں کھینچتا ہے) یہ ترک دنیا کے خلاف اور رہبانیت کے خلاف ردعمل تھا اور یہی دراصل تصوف کا صحت مند رویہ تھا جو رومی کے ہاں نظر آتا ہے یا ہندوستان میں بھگتی اور تصوف کی تحریکوں میں ملتا ہے۔ ؎

گر دیو بد فعال [illegible] نترسد از علی — من گردن آں دیو را پیش سلیماں بشکنم
گر [illegible] تا [illegible] کو بد مرا — [illegible] و پایش را زنم تا فرق و دنداں بشکنم
گو [illegible] همو آہستہ رو — گو بہ کہ من دیوانہ ام ایں بشکنم آں بشکنم

[illegible] اور فیصلہ کیجیے کہ [illegible] ترقی پسندوں پر اعتراض ہے بلند آہنگی کا تو کیا یہ اعتراض [illegible] اور کیا آپ رومی کے اس آہنگ کو سرگوشیانہ آہنگ قرار دے دیں گے۔ [illegible] تو تصوف [illegible] موت کا فلسفہ نہیں [illegible] اور یہ بات صرف ہمارے ہاں ہی نہیں بلکہ دوسرے معاشروں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود [illegible] ہے۔ مارکس اور اینگلز [illegible] اینگلز کو اگر بغور پڑھا جائے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے [illegible] عوامی تحریکوں کے مرکز تھے محدود پیمانے پر رہی ہیں۔ اینگلز کی ایک کتاب ہے (PEASANT WARIN GERMANY) اس میں MYSTICISIM پر خاصا تفصیلی اور تجزیاتی مواد موجود ہے [illegible] کو ایک تجربہ بات بتاؤں، میں نے ایک مرتبہ [illegible] سلواکیہ میں سے ایک شعر دیکھا جو اپنے [illegible] اس شعر کا مطلب کچھ یوں تھا کہ موت عطا تھے شاہی کو اور کسان [illegible] میر کے ہاں اس مفہوم کا یہ شعر ہے ؎

[illegible] تھکے کہ اس مرتبے پہ کیا سر فقوریا

[illegible] اس زمانے [illegible] تصور دیا [illegible] جو آج موجود ہے یعنی جدید علوم و تصورات کے [illegible] تو اس [illegible] پاس ایک ایسا [illegible] تھا جس سے وہ ڈراتے تھے ظالموں کو اور جابروں کو ان کو ظاہر [illegible] ظالم اور ظلم کو موت کی نوید دیتے تھے کہ بس وقت آئی کہ ساری مشکلات انجام کو پہنچ [illegible] ایک ایسا مقام تھا جہاں ادنیٰ و اعلیٰ، غلام و آقا سب ایک ہی انجام کے سزاوار ہوتے تھے۔ اس طرح وہ [illegible] انسانوں کو مساواتی زنجیر میں پروئے رکھنا چاہتے تھے۔

[illegible]: جعفری صاحب [illegible] موت کا آ ہی گیا تو یہ فرمایئے کہ ترقی پسندوں کے ہاں موت کا تصور کس طرح آیا ہے خصوصاً ان کی شاعری [illegible]

جعفری: [illegible] صاحب [illegible] ہاں تو موت کا تصور انتہائی شگفتہ رہا ہے اب آپ شگفتگی اور موت کی یکجائی پر چونکیے مت بلکہ یہ دیکھیے کہ ہم موت کو بھی زندگی کا ایک نیا سلسلہ سمجھتے ہیں وہ جو میر نے کہا ہے نا کہ ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

تو یہ تصور ہمارے بعض ترقی پسندوں کے ہاں کچھ اور طرح سے آیا ہے، اور اس طرح کہ خزاں تجدید بہار ہے اور موت تجدید حیات ہے۔ فیض کی خوبصورت نظم جس کا موضوع ہی موت ہے، آپ کے ذہن میں تازہ ہو گی، دیکھیے کیسی دلکش اور بھرپور نظم ہے اور اس سے کیا کیا تاثر نکل کر آتے ہیں۔ موت آئے گی تو کس طرح آئے گی وصل محبوب کی شکل میں یا [illegible] کی صورت موت کیسے بھی آئے جب ہم ختم ہوں گے تو کہیں گے "شکر للحمد بیاد لب شیریں دہناں" دیکھیے کس قدر شگفتہ تصور ہے۔ اب آپ جاں نثار اختر کے ہاں دیکھیے اس نے اپنی بیٹی عنبرہ کے نام ایک نظم لکھی

بس میں اس نے کہا کہ بیٹی تم میری زندگی میں اس وقت آئی ہو جب میں یہ کتاب جا رہا ہوں تمہارے لیے ورثے میں کچھ نہیں چھوڑ رہا ہوں سوائے مسائل کے لیے [illegible] کہ اس انتقال کے جو میں نے اس پیشارے کو حل کرنے میں حاصل کی اور اب جو تمہاری میراث ہے تو موت اس طرح ایک تازہ زندگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

حسن عابد۔ آپ کی بھی تو نظم تھی موت کے موضوع پر

جعفری صاحب۔ ہاں خوب یاد دلایا "میرا سفر" کے عنوان سے میں نے نظم لکھی تھی جس کے چند مصرعے کچھ اس طرح تھے ۔

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا　　بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا　　جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے　　مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی　　اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر　　شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا آہنگِ غزل　　اندازِ سخن بن جاؤں گا

جب بھی قتل غزل میں آتا ہے تو یہ شعر ذہن میں دھار لیتا ہے ۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے　　فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

اچھا اب دیکھیے کہ ترقی پسندوں کے ہاں موت کا یہ رجحان کہاں سے آیا [illegible] یہ تصور اس فکر سے پیدا ہوتا ہے جو ہمیں زندگی اور عام معاشرتی زندگی کی تمام [illegible] انسان کے دکھ درد، ہمارے دکھ درد ہوتے ہیں اور ہم جہدِ حیات میں برابر کے شریک، ظلم کے خلاف، جبر کے خلاف، چیرہ دستیوں کے خلاف، استحصال کے خلاف اور ہر اس کام کے خلاف جو انسان کو شرفِ انسانیت سے گرائے اور شامل ہیں ہم ہر اس معرکے میں جو زندگی کے فروغ، علم کے فروغ، انسانیت کے فروغ، شرافت کے فروغ اور مساوات کے فروغ کے سلسلے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں جاری ہو لہٰذا ہمارے لوگ پھانسی پر گانے کی جسارت رکھتے ہیں اور اسی صورت حال میں اس قسم کے شعر ہو سکتے ہیں کہ

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے

یا مجروح کا یہ شعر کہ

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ　　جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

تو یہ تصور دراصل زندگی سے مکمل ہم آہنگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ زندگی سے گریز کر کے یہ تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔

محمد علی صدیقی۔ تو گویا زندگی سے ہم آہنگی ترقی پسندوں کی سب سے بڑی دین ہوئی۔ غالباً [illegible] الگ الگ خانوں میں بٹے رہے ہیں کیونکہ (ESTABLISHENT) نے انھیں کبھی ایک جا ہونے کا موقع نہ دیا تو گویا اب ترقی پسندوں نے زندگی اور فنون کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا [illegible]

اس سلسلے میں خود آپ کا بڑا CONTRIBUTION ہے کیونکہ گذشتہ نصف صدی کے دوران ترقی پسند تحریک کے رہنما بلکہ THEORETICIAN کی حیثیت سے آپ یہ فرمائیں کہ آپ نے جب یہ سفر شروع کیا تھا تو آپ کے مقابل روایتی لوگوں کے ساتھ لبرل لوگ بھی تو شامل ہو گئے تھے اب لبرل ازم تو یہ کہتا ہے کہ KNOWLEDGE برائے KNOWLEDGE ہونی چاہیے اور کلیسا یا اسٹبلشمنٹ کا کوئی اجارہ علم پر نہیں ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے کہ مغرب میں لبرل ازم کے خلاف ترقی پسند مخالفانہ رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں لبرل ازم بجائے خود ایک ترقی پسندانہ رویہ ٹھہرتا ہے تو آپ ہی ایک ترقی پسند SCHOLAR کی حیثیت سے یہ بتائیے کہ آج ہم لبرل ازم کو کس CONTEXT میں دیکھیں، خاص طور پر آج کے معروضی حالات میں۔

جعفری صاحب:- یعنی یہ تو مختلف معاشرے اور مختلف وقت کے معروضی حالات کا معاملہ ہوتا ہے ویسے تو آپ کے سوال کا جواب خود اس کے بین السطور میں موجود ہے، لیکن اگر کسی خاص لبرل ازم کی طرف اشارہ ہے تو دوسری بات ہے ورنہ تو ہر جگہ کے معروضی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ردِ عمل سے وہاں کے رویے متعین ہوتے ہیں کسی جگہ لبرل ازم ترقی پسند ہوگی اور کسی جگہ ترقی پسند کو بگاڑنے کا ذریعہ اور اس سلسلے میں کوئی بات حتمی طور پر کہی نہیں جا سکتی لیکن پھر بھی اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کٹڑپن کے مقابل لبرل ازم بہرحال ایک مستحسن رویہ قرار پائے گا۔

محمد علی صدیقی:- جعفری صاحب ایک سوال آپ کے ہم عصروں کے بارے میں، یوں تو بہت سے احباب آپ کے ہم سفر رہے ہیں ان میں سے بعض اپنی اپنی اننگ کھیل کر لبِ شگفتہ موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں تو آپ کو سب سے زیادہ کس ہم عصر نے متاثر کیا ہے۔

جعفری صاحب:- بھائی اب سلسلے میں کیا کہا جائے کس کس کا نام لیا جائے سیدھی سی بات یہ ہے کہ سب ہی نے متاثر کیا ہے۔

مظہر جمیل:- جعفری صاحب، دراصل محمد علی صدیقی بھائی کے سوال کے دو حصے ہیں، پہلا سوال تو آپ کے ہم عصروں کے بارے میں جو فکری طور پر بھی آپ کے ہم سفر رہے ہیں جیسے جوش، فراق، مجاز، مخدوم، فیض، جذبی، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کیفی، مجروح، سردار وغیرہم اور دوسرا حصہ سوال کا ہے ان ہم عصروں کے بابت جو ترقی پسند تحریک کے باہر تھے اور جن میں سے اکثر کا تعلق حلقۂ اربابِ ذوق سے تھا مثلاً میراجی، تاثیر، ن م۔ راشد وغیرہ تو آپ ذرا وضاحت سے اس سلسلے میں فرمائیے۔

جعفری صاحب:- دیکھیے میں آپ کے دوسرے سوال کا جواب پہلے دیتا ہوں جس میں غالباً آپ زیادہ INTERESTED معلوم ہوتے ہیں (قہقہہ) بات یوں ہے کہ جب ترقی پسند ادبی تحریک شروع ہوتی ہے تو اس وقت اس میں ہر چھوٹا بڑا شامل تھا۔ بس اتنا تصور تھا کہ ہم کو نئی جہت نکالنی ہے نئے راستے تلاش کرنے ہیں اور ماضی کی بہت سی چیزوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اظہار و بیان کے نئے پیمانے بھی بنانے ہیں تو یہ مشترکہ احساس تھا کہ اس وقت کے سب نئے لکھنے والوں کا بس فرق صرف ڈگری اور مقدار کا تھا اختلاف تھا۔ لیکن انتہا پسندی کی وہ صورت نہ تھی جو بعد میں ظہور پذیر ہوئی۔ فیض کے پہلے مجموعۂ کلام "نقشِ فریادی" کا دیباچہ

ن۔م۔ راشد نے لکھا اور خود ن۔م۔ راشد کے مجموعے پر دیباچہ لکھا کرشن چندر نے۔ خود میراجی جو ایک بہت پڑھے لکھے آدمی تھے اور خلاقانہ ذہن رکھتے تھے اس وقت ترقی پسندوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور اسی طرح حلقے کے اجلاس میں شرکت سے ترقی پسندوں کو کوئی عار نہ تھا۔ میراجی کا ایک بہت بڑا CONTRIBUTION اس عہد میں جو تھا وہ یہ تھا انہوں نے مغربی ادب خصوصاً مغربی شاعری سے بہت خوبصورت ترجمے اردو میں کیے۔ ان ترجموں کی صورت میں اردو میں نئی قلم آئی، نئی روشنی، نئی ہوا آئی۔ اسی طرح کے ترجمے دوسرے لوگوں نے بھی کیے تھے، لیکن یہ کام زیادہ تر حفیظ اور ن۔م۔ راشد کے یہاں بہت بہتر طور پر ہوا۔ بہرحال وہ ایک بڑا اور اہم کام تھا جس نے ہندوستان میں مغربی ادب کو اسلوبیاتی زاویے کا آفاق دیا۔ اسی طرح انہوں نے ہندی ادب کے کام کو اردو میں منتقل کرنے کا کام کیا۔ میراجی ذرا الگ ذہن، پڑھے لکھے اور خلاق آدمی تھے۔ میرے ان سے بہت دوستانہ مراسم رہے ہیں اور میں ہمیشہ ان کی ذہانت کا معترف رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میراجی کا ایک دوسرا کارنامہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ میراجی نے شعر کا رشتہ شعور سے کاٹنے کی کوشش کی اور شاعری کو خود اور ادب کو جبلت کے اظہار کی طرف لے جانا چاہا۔ جبلت تو زندگی کا حصہ ہے، اور زندگی سے ماورا تو نہیں ہمارے نزدیک جبلت کا راستہ شعور سے ہو کر گزرتا ہے، جبلت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے اس کے لیے بھی ایک ادراک کی ضرورت پڑتی ہے۔ میراجی شعور اور ادراک کو ادب کے لیے غیر ضروری عنصر جانتے تھے۔ انہوں نے شعر کا تعلق شعور سے کاٹا اور یہی ہمارے اور ان کے درمیان بنیادی اختلاف رہا ہے، شعر کو شعور سے کاٹنے کی کوشش میں میراجی نے انتہائی گنجلک، مبہم اور بے مقصد شاعری کو فروغ دیا۔ جس کا اثر حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ بہت سے لوگوں پر پڑا۔ لیکن اسی سے میں اور لوگ بھی تھے جن کے ہاں ابہام اور گنجلک فضا تو نسبتاً کم ہے لیکن مقصدیت پھر بھی مفقود ہی کیونکہ وہ لوگ ادب میں مقصدیت کے بھی قائل نہیں ہوتے تھے لیکن ان سب اعتراضات کے باوجود ہمیں اس بات کا اقرار ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے ساتھیوں نے اردو نظم کو ہیئتی اعتبار سے بہت کچھ دیا ہے۔ ہیئت اور فارم کے تجربے جو ان لوگوں نے کیے ہیں، ترقی پسندوں نے کم کیے ہیں۔ نئی لفظیات کے سلسلے میں بھی ان احباب کا کام زیادہ وقیع اور قابل تحسین رہا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں نام سامنے آیا ہے وہ ن۔م۔ راشد ہیں جن کی شاعری مختلف مراحل سے گزرتی رہی ہے۔ یہاں موقع نہیں ہے ورنہ میں راشد کی شاعری کے ارتقاء پر بھی گفتگو کرتا۔ خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اردو نظم میں ہیئتی تجربوں کا کام حلقہ ارباب ذوق کے لوگوں نے خاصا کیا ہے۔ ترقی پسندوں کے مقابلے میں۔ اب رہا معاملہ ایک دوسرے سے اثر پذیر ہونے کا تو جناب یہ معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے اور ہم عصر ایک دوسرے پر غیر محسوس طور پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں یہ اثرات عموماً غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ اب دیکھیے لفظیات ایک دوسرے کے یہاں چل کر کس طرح در آتے ہیں اس کی ایک مثال میں آپ کو بتاتا ہوں صفی لکھنوی کا ایک بڑا مشہور شعر ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ٭ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جذبی نے جب نظم "موت" لکھی تو اس میں ایک شعر آیا ؎

میرا ٹوٹا ہوا وہ ساز کہاں سے لانا میری کھوئی ہوئی آواز کہاں سے لانا

دیکھیے صفی کا شعر کس طرح چولا بدل کر جذبی کے ہاں آیا، لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جذبی کے شعر میں نیا آہنگ قائم ہوا جو صفی کے شعر کے آہنگ سے مختلف ہے۔ اب آپ اسی آہنگ کو ایک نئی صورت میں مخدوم کے ہاں دیکھیے جب وہ یہ کہتے ہیں اپنی مشہور نظم انتساب میں کہ ؎

برق پا وہ مرا رہوار کہاں سے لانا تشنۂ خوں مری تلوار کہاں سے لانا

دیکھیے بظاہر ایک ہی لفظیات مشترک ہوتے ہوئے بھی مختلف ہم عصروں کے ہاں تین نئے آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہیں اور تینوں شعر الگ الگ جمالیاتی خوبی رکھتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ آگے چل کر فیض کے ہاں ایک بالکل نئی صورت پیدا ہوتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ ؎

طپش کی آتش جرار کہاں سے لاؤ

تو دیکھیے کس طرح ایک ہی عہد میں لکھنے والے غیر شعوری طور پر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اب آپ ان میں سے کسی پر نقل کرنے کی بد ذوقی کا الزام تو نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عصری اثرات ہیں جو ہوا میں شامل ہو کر زندہ احساس رکھنے والے فنکاروں کے ہاں اظہار پا جاتے ہیں۔ فیض کے بہت سے الفاظ آپ کو دوسرے ترقی پسند شعراء کے ہاں بلکہ غیر ترقی پسند شعراء کے ہاں بھی مل جائیں گے، شاید ان کی امیجری بھی آپ کو دوسروں کے ہاں جھلکتی مل جاتی، بالکل اسی طرح جس طرح خود فیض کے ہاں بعض دوسرے لوگوں کی امیجری کی جھلک نظر آ جاتی ہے گی۔ تو جناب کہنا صرف یہ ہے کہ ایک ہی عہد میں لکھنے والے ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں۔ بالکل غیر شعوری طور پر اس سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے لکھنے والوں نے فکری اعتبار سے نہ سہی تو اسلوبی اعتبار سے ترقی پسندوں نے اثرات یقیناً قبول کیے ہیں اور ترقی پسندوں کے اثرات بھی ان کے ہاں موجود ہیں جن کا اعتراف ہر دو جانب سے کھلے طور پر ہو چکا ہے۔ اب اس سلسلے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ آزاد شاعری کا جو نمونہ راشد اور میرا جی نے قائم کیا تھا، وہ آگے چلا نہیں، ان کے مقابلے میں ترقی پسندوں نے بھی آزاد شاعری کی جو آج بھی چل رہی ہے۔ فیض نے یا دوسرے ترقی پسند شعراء نے آزاد شاعری میں جو آہنگ اختیار کیا ہے وہ جدید لکھنے والوں کے ہاں تک پہنچتا ہے، لیکن راشد اور میرا جی کی شاعری اپنی شناخت کھو چکی ہے، بات یوں ہے کہ فارم بغیر فکر کے اچھی اور زندہ رہنے والی شاعری پیدا نہیں کر سکتی اور وقت نے اس کلیے کو ثابت کر دیا ہے یہ بات صرف میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اکثر جدید ناقدین نے اس مسئلے کو اٹھایا ہے، ابھی حال ہی میں اردو انٹرنیشنل (کینیڈا) میں ڈاکٹر وحید اختر کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے نام بنام بتایا ہے کہ کس کس کے ہاں میرے آہنگ کی جھلک موجود ہے، یہ بات خود میرے لیے تو باعث افتخار ہے ہی لیکن اس کو اس طرح بیان کرنے کے بجائے یوں سمجھنا چاہیے کہ دراصل ایک عصری آہنگ کا توسیعی عمل ہے۔ ایک ہی وقت میں بہت سے لوگ نئے نئے انداز سے لہجے کی شاعری کرتے ہیں لیکن اس بوقلمونی کے باوجود ہر عہد کا ایک ٹوٹل یعنی مجموعی آہنگ نکل کر آتا ہے جو ایک دوسرے کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں کبھی دبے پاؤں اور کبھی واشگاف انداز میں در آتا ہے۔

سلیم شمیم: اب جب بات تکنیک پر چل پڑی ہے تو نثری نظم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ میں صاحب نے تو نثری نظم کے وجود ہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا آپ فرمائیے کہ اس صنف کے کیا امکانات ہیں؟

جعفری صاحب: اس سلسلے میں صرف ایک جملے میں یہ بات کہوں گا کہ نثری نظم کے امکان ہو سکتے ہیں بشرطیکہ لکھنے والا اتنا ہی بڑا شاعر ہو جتنا WALT WHITMAN تھا کیونکہ اس میں دراصل نثر کا RYTHM ہوتا ہے محض نارمل نثر کے ذریعے نثری نظم کا حقیقی ردم (RYTHM) پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے نئی زبان اور استعارے کی تخلیق بھی ضروری ہوگی۔ ایک مرتبہ ناظم حکمت نے فیض سے گفتگو کرتے ہوئے جو شاید کہیں شائع بھی ہو چکی ہے کہا تھا کہ "بڑی شاعری زبان کے مروجہ ردم کو توڑ کر پیدا ہوتی ہے۔ آپ عربی زبان کے اوزان کیوں استعمال کرتے ہیں عربی اوزان تو عربی مزاج کو پیش کرتے ہیں۔ ہماری اپنی زبان کا ایک ردم ہے جس میں ہم اکثر و بیشتر توڑنے کی کوشش کی ہے" اب یہ کوشش آپ کو فیض کے آخری زمانے کی بعض نظموں میں بھی ملے گی۔

محمد علی صدیقی: جعفری صاحب میں آپ کی توجہ فیض صاحب کے ایک انٹرویو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو کہ شاید فنون لاہور نے ان سے لیا تھا اس میں جب فیض صاحب سے دریافت کیا گیا کہ آج کل بیشتر شعراء آپ کے آہنگ میں شاعری کر رہے ہیں اور اس ذیل میں کچھ نام بھی لیے گئے تھے جن میں آپ کا نام بھی شامل تھا گویا آپ بھی فیض صاحب کے رنگ میں شاعری کر رہے ہیں حالانکہ میں ایسا نہیں سمجھتا کیونکہ آپ کے ہاں آہنگ کا انفرادی DEVELOPMENT دار ارتقاء ملتا ہے۔ اس سوال پر فیض نے جواب دیا تھا کہ "بھائی اب ہمارا آہنگ ہمارے عہد کا آہنگ ہو گیا ہے" تو اس پر کیا آپ تبصرہ کرنا چاہیں گے۔

جعفری صاحب: دیکھیے یہ بات یوں نہیں تھی بلکہ فیض نے جو گفتگو بہت سنبھال کر کرنے کے عادی رہے ہیں محض یہ کہا تھا کہ ہر عہد کا ایک محاورہ ہوتا ہے انہوں نے آہنگ کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ محاورے کی بات کی تھی۔ اب اس محاورے کو ایک آدمی پہلے استعمال کر لیتا ہے اور دوسرا آدمی بعد میں اور اس طرح سے ہمارا مقبول محاورہ ہمارا محاورہ نہیں ہے بلکہ اس عہد کا محاورہ ہے۔ اب اس بات کی وضاحت میں گھپلا اور کنفیوژن پیدا ہونے کے بڑے امکانات ہوتے ہیں اگر پورے مسئلے کو ذرا احتیاط سے نہ دیکھا جائے تو میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو مثال دی تھی اس میں مخدوم کا مصرع تھا۔ ؏

برق پا وہ سرا رہوار کہاں ہے لانا

اور فیض کا مصرع ہے کہ ؏

طپش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ

تو اس مثال کو سامنے رکھ کر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فیض نے مخدوم کا مصرع لے لیا ہے۔ یہ غلط بات ہے ہمارے ہاں ہوا یہ ہے کہ بعض ان ناقدین کرام نے جو بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک کے مخالف ہیں فیض کا استحصال کرنے کی کوشش کی ہے اور فیض کی غزل کے لہجے کو لے کر ترقی پسند شاعری پر حملہ کیا ہے چنانچہ وہ فیض کے اس لہجے کو جو بعد میں ان کے ہاں DEVELOP ہوا کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اب انہوں نے کسی کے ہاں

دوسرے اس نظم کو پڑھ لیجیے وہ جو ٹ نتوی صادر کر دیا کہ " دیکھیے صاحب یہ فیض ہیں " یہ بات میں یونہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ خود ہی ہو رہا ہوں ہے، اس سلسلے میں بھی اپنی ہی نشان دیتا ہوں میری کتاب " ایک خواب اور " پر جب شمس الرحمان فاروقی نے تبصرہ کیا تو اس میں ایک نظم پر انہوں نے فرمایا کہ " یہ نظم فیض کے رنگ میں لکھی گئی ہے " دراصل اس نظم میں ایک دو استعمال ہوا تھا نسیم کا اور دو لفظ " قبا " کا اسے بنیاد بنا کر شمس الرحمان فاروقی نے پوری نظم کو فیض کا فیضان قرار دے دیا۔ میں نے انھیں خط لکھا اور کہا کہ " آپ نے جو تبصرہ کیا ہے اس کا آپ کو پورا حق ہے، لیکن مجھے گماں ہو تا ہے کہ شاید آپ میری نظم کو سمجھ نہیں سکے ہیں اور بس دو ایک لفظوں میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں " وہ نظم صرف چار مصرعوں پر مشتمل ہے آپ بھی سن لیجیے:

نسیم تیری قبا دستے گل ہے پیراہن　　حیا کا رنگ رداۓ بہار اڑھاتا ہے
سحر کا دامن ایسے جگمگاتا ہے　　کہ جیسے سیل سحر جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے

میں نے عرض کیا جناب یہ تو ڈیپنٹنگ ہے نسیم تیری قبا۔ نسیم کیا قبا پہنے گی، بوئے گل پیراہن، تو جناب بوئے گل کا پیرہن پہنا کیا ہوگا، حیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے، اس طرح پوری نظم ایک پرہنہ جسم کو پینٹ کرتی ہے اس تک شمس الرحمان فاروقی کی رسائی ہو ہی نہیں سکی وجہ یہ تھی کہ وہ چند لفظوں میں اُلجھ کر رہ گئے اور یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ مجرد الفاظ بھی میرے ہاں اس طرح استعمال ہی نہیں ہوئے ہیں جن معنوں میں فیض کے ہاں آئے ہیں ' ایک خواب اور ' کے دیباچہ میں ملے گا جو بات کہی تھی کہ " خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے اور نیا خواب دیکھنا انسان کا حق ہوتا ہے جسے کوئی چھین نہیں سکتا۔ میں نے اس کتاب میں تین پیٹرن رکھے ہیں خواب، شکستِ خواب اور نیا خواب جو دراصل پیاس، آسودگی اور نئی پیاس، وصال، ہجر اور پھر وصال کی خواہش کی تثلیث ہے اور یہ تثلیث انسانی جبلت کا مقدر ٹھہری ہے۔ اس مجموعے میں اکثر نظمیں اسی احساس کو پیش کرتی ہیں۔ تشنگی، آسودگی اور پھر تشنگی بلکہ شدید تشنگی کہ یہی ہمارے بیشتر تجربوں کا ماحاصل رہا ہے، لیکن کسی نقاد نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے اور اپنی ہم عصر شاعری کو اس کے اصل تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں شعری مجموعوں کو پڑھنے کا جو طریقہ ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے ہوتا یہ ہے کہ ہم کتاب اٹھاتے ہیں کہیں سے کسی نظم کو پڑھ لیا، کسی غزل پر داد دے لی اور بس، تن آسان ناقدوں کا بھی یہی احوال ہے، حالانکہ شعری مجموعوں کو بھی مکمل اکائی کی طرح پڑھا جانا چاہیے اور شعراء کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے مجموعۂ کلام کو اس طرح ترتیب دیں جس سے ان کے فکری ارتقاء اور اکائی کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔

مظہر جمیل: گویا ناول اور افسانے کی طرح۔

جعفری صاحب: جی ہاں ناول اور افسانے کی طرح۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میری کتاب " ایک خواب اور " میں بعض مضامین ایک ہی نظم میں مکمل ہو گئے ہیں، لیکن بعض اوقات فکری سلسلہ دو تین نظموں میں غیر محسوس طور پر چلا آ رہا ہے مثلاً ایک نظم کا ٹکڑا ہے ؎

تو مجھے اتنے پیار سے مت دیکھ

یہاں سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد حصہ آتا ہے کہ ؎

تمہارے نرم حسیں دل نواز ہاتھوں میں
مہک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ
لرز رہی ہیں ہتھیلی میں انگلیوں کی لویں
تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات
پگھل رہی ہے رُخ آتشیں پہ ہجر کی شام
نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات

اس کے بعد وہ حصہ آتا ہے کہ ؏

نسیم تیری قبا بوئے گُل ہے پیراہن

اب آپ دیکھیں تو ایک فکری اور اسلوبیاتی تسلسل بنتا ہے حالانکہ علیحدہ علیحدہ نظمیں ہیں یہ "خواب" اور "شکستِ خواب کی نظمیں ہیں اور علیحدہ ہونے کے باوجود ایک فکری زنجیر کی تشکیل کرتی ہیں۔ اب اگر آپ اس کو اس طرح نہیں دیکھیں گے تو نتیجہ ظاہر ہے وہی ہوگا جو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے تبصرے میں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ کئی لوگوں نے فیض کی نقل کی ہے اور ان کے اثرات واضح طور پر قبول کیے ہیں۔ کیونکہ فیض دلکش لہجے کے مالک ہیں یہ اثرات کہیں غیر شعوری طور پر ہیں اور کہیں شعوری طور پر خود میں نے فیض کے ہاں سے شعوری طور پر "سنگِ دشنام" کی ترکیب لی لیکن "بارشِ سنگ" کی ترکیب فیض کی نہیں ہے، "بارشِ سنگ" اقبال کی ترکیب ہے۔ "بارشِ سنگ حوادث کا تماشائی نہ بن" اقبال کا مصرع ہے میرے ہاں بارشِ سنگ کی ترکیب آئی ہے ؎

سفید شیشۂ نور اور سیاہ بارشِ سنگ
زمیں سے تا بہ فلک ہے بلند رات کا نام

تو یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں بلکہ تخلیق کا قدرتی عمل ہے ماضی کا پورا ورثہ ہمارا ورثہ ہے اور وہ ہمارے شعور کا حصہ بنتا جاتا ہے اور عصری آوازیں اور لہجے بھی ہمارے کان میں پڑتے جاتے ہیں اور یہ سب مل کر تخلیقی عمل میں ظہور بھی پاتے جاتے ہیں اب یہ مضمون کا قطرہ اگر دریا نہیں بنے گا تو زمین اسے پی لے گی یہ بات فکر کی صورت میں بار بار ہمارے شعراء کے ہاں آئی ہے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ یہ مضمون نیا تو نہیں ہے لیکن نئے شعراء نے اظہار کے نئے انداز سے اس کو نیا پن دے دیا ہے۔ خیر میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں دو لہجے ملتے ہیں ایک لہجے کو آپ غنائی یا بزمیہ اور دوسرے کو رزمیہ یعنی رزم کا لہجہ، ترقی پسند شاعری میں دونوں لہجے ساتھ ساتھ سفر کرتے ملیں گے۔ فیض کے ہاں غنائی لہجہ ہے جو نہایت خوبصورت اور مؤثر ہے اور اس کا بڑا اثر اپنے عہد کی شاعری پر پڑ رہا ہے میرے ہاں بھی اس کا اثر ہے مخدوم کے ہاں بھی ہے لیکن

اس کے ساتھ ہی ہمارے ہاں جو رزمیہ لہجہ ہے اس کا اثر بھی فیض کے ہاں موجود ہے مجاز کے مصرعے ہیں ۔

ہاں ہم نے کمندیں پھینکی ہیں
ہاں ہم نے شب خوں مارے ہیں
ہاں ہم نے قبائیں نوچی ہیں
ہاں ہم نے تاج اتارے ہیں

یہ لہجہ رزمیہ لہجہ ہے اور فیض کے ہاں آیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ ۔

جب تاج اچھالے جائیں گے	جب تخت گرائے جائیں گے
یہ دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی

تو دیکھیے اس طرح ہم عصر شعراء ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہی رہتے ہیں۔

محمد علی صدیقی۔ ظاہر ہے یہ تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی لیکن بعض حضرات نے تو فیض کا نام لے کر دراصل اکثر ہم عصر شعراء کو گھسیٹنے کی کوشش کی ہے۔

جعفری صاحب۔ وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ لوگوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے فیض کا استحصال کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ نہیں۔

مظہر جمیل۔ فیض نے تو کہا ہے کہ میں نے اپنے جونیئر ہم عصروں سے بھی اثرات لیے ہیں تو لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔

جعفری صاحب۔ ہاں صاحب فیض نے تو اس معاملے میں ہمیشہ ہی بڑی فیاضی اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے، ابھی ابھی میں کہیں پڑھ رہا تھا کہ فیض نے وضاحت کے ساتھ نام لے لے کر بتایا کہ میں نے اس سے اثر لیا، اس سے اثر لیا اور جب میں لکھنؤ گیا تو مجاز، سردار، جاں نثار اختر سے اثر لیا تو اس معاملے میں فیض نسبتاً بہت فیاض اور کشادہ دل انسان تھے اور ہمیں یعنی ترقی پسند شعراء کو تو کشادہ دل ہونا ہی چاہیے۔ میں نے خود ابھی یہ بات کہی ہے کہ میں نے فیض سے اثر قبول کیا فیض کا ایک شعر ہے ۔

اک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن	میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

آہا کیسا خوبصورت شعر ہے اور مجھے تو بہت ہی اچھا لگا ہے۔ اس حد تک کہ میں نے کہا کہ یہ شعر فیض کے ہاں کیوں آیا اسے تو میرا شعر ہونا چاہیے تھا تو میں نے فیض کے ہاں سے اٹھا لیا اور اسے اپنی ایک نظم میں اس طرح استعمال کیا کہ ۔

اک اک کر کے پلٹ آئے گریزاں لمحے	اک اک کر کے ہوئے سارے ستارے روشن

میرے لیے یہ عمل بہت فطری تھا میری شاعری میں لمحات کا حسن نئے نئے انداز اختیار کرتا ہے مثلاً ۔

"ہوائیں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
گذرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اڑ رہے ہیں
لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں"

حسن عابد:۔ آپ نے تو بدل ہی دیا اس شعر کو آپ کے ہاں تو یہ نئے انداز سے آیا ہے جو فیض سے مختلف ہے۔

جعفری صاحب:۔ لیکن بنیادی طور پر ہے تو فیض ہی کا اور میں نے اسے وہیں سے لیا ہے اور شعوری طور پر لیا ہے جس کا مجھے اعتراف ہے فیض یقیناً اس عہد کے بہت بڑے شاعر تھے اور ان کے لہجے اور آہنگ سے گریز ممکن ہی نہیں خواہ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے۔

مسلم شمیم:۔ یہ جو ابھی آپ نے فرمایا کہ فیض کا سفر بزم سے رزم کی طرف اور آپ کا رزم سے بزم کی طرف رہا ہے تو کہیں یہ دو تقاضوں اور دو مختلف سیاسی کلچر کے فرق کی وجہ سے تو نہیں ہوا۔

جعفری صاحب:۔ نہیں میں ایسا نہیں سمجھتا۔ دیکھیے اس میں شاعر کے مزاج کا بڑا دخل ہوتا ہے، فیض شروع ہی سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے کے آدمی تھے یہ دھیما پن ان کا مزاج تھا، رعایت ان کی شخصیت میں شامل تھی میرا یہ مزاج بالکل الگ رہا ہے لہٰذا لہجوں کا فرق مزاج اور افتادِ طبع کے فرق سے ظہور میں آیا ہے ہو، کم از کم ایسا ہی سمجھتا ہوں اب آپ اس کی کوئی اور توضیح فرمانا چاہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔

شاہد نقوی:۔ جعفری صاحب ترقی پسند شاعری کا نمائندہ لہجہ تو رزمیہ ہی رہا ہے بلند آہنگی اور جتنے اہم نامور ترقی پسند شاعر ہوئے ہیں ان کے ہاں رزمیہ لہجہ غالب رہا ہے آپ نے بزمیہ لہجے کو بھی ترقی پسند شاعری کا لہجہ قرار دیا تو کہیں اس سے تضاد تو پیدا نہیں ہو رہا ہے۔

جعفری صاحب:۔ نہیں بھائی کوئی تضاد نہیں ہمارا مقبول ترین اور نمائندہ شاعر تو فیض ہے نا اس سے زیادہ مقبولیت تو اس عہد میں کسی اور شاعر کو ملی ہی نہیں ہم سب فیض کے ہم عصر ہیں لیکن فیض کی مقبولیت کو خود اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے ہیں اور ان کی مقبولیت کو اپنی مقبولیت جانتے ہیں کہ وہ ہمارے ہی قبیلے کے آدمی تھے اور انھیں جو مقبولیت ملی ہے میں تو ایسا سمجھتا ہوں گویا وہ مقبولیت خود مجھے ملی ہے اور یہی ایک امتیازی فرق ترقی پسندوں اور غیر ترقی پسندوں میں ہے۔ اب آپ خود فیض کو معیار بنا کر دیکھ لیجیے کہ فیض کے ہاں رزمیہ لہجہ کس بلند آہنگی کے ساتھ آیا ہے بلکہ آخر آخر میں تو انقلابی نعرہ کی گونج ان کے ہاں سنائی دیتی ہے تو کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری کو کسی ایک آہنگ یا لہجے سے مخصوص کر دینا یقیناً درست نہ ہوگا۔

مظہر جمیل:۔ جعفری صاحب آخر میں صرف ایک بات اور۔ اور وہ یہ کہ ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک مشہور ترقی پسند ناقد اصغر علی انجینیر صاحب نے بیدی پر لکھتے ہوئے ادب میں وابستگی کے مسئلے کو سمجھاتے ہوئے ہندوستان میں NEW PROGRESIVISM یعنی جدید ترقی پسندیت کی ضرورت پر زور دیا ہے تو میں پوچھنا چاہوں گا کہ کیا واقعی ہندوستان میں جدید ترقی پسندیت کی کوئی تحریک ہے اور ہے تو اس کی کیا صورت ہے۔؟

جعفری صاحب:۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے وہ مضمون جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے دیکھا ہی نہیں لہٰذا میں اس پر تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، ویسے اصغر علی انجینیر صاحب کو میں جانتا ہوں وہ بڑے بالغ نظر اور پڑھے لکھے نقاد ہیں مارکسی نظریات کے حامل ہیں قطعِ نظر اس سے کہ انہوں نے کیا بات لکھی ہے یہ بات کس حد تک صحیح ہو سکتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے کے جو حالات تھے وہ آج کے حالات سے مختلف تھے اور

آج کے نئے معروضی حالات میں تخلیقی رویے مختلف ہونے ہی چاہییں اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔

حسن عابد۔ جعفری صاحب ترقی پسند تحریک نے جو منشور دیا تھا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج کے مختلف حالات میں وہ کافی ہے یا ہمیں کسی نئے منشور کی ضرورت ہوگی خصوصاً ہمارے ملک عزیز پاکستان کے حوالے سے۔

جعفری صاحب۔ دیکھیے برنارڈ شا نے ایک مرتبہ بڑی دلچسپ بات کہی تھی کہ "میرا درزی ہر سال آکے میرا ناپ لے جاتا ہے" تو یہ بات حالات اور ہمارے باہمی رشتے پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ یہ بات تو یقیناً غیر متنازعہ ہے کہ ہمیں یعنی لکھنے والوں کو اپنے معروضی حالات کو جانچتے پرکھتے رہنا چاہیے کہ یہی عصری شعور کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اب جہاں تک ۱۹۳۶ء کے منشور کا حوالہ ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر اس منشور میں جو باتیں کہی گئی تھیں وہ بڑی حد تک اب بھی باقی ہیں لیکن جزیات میں نئے رویے ہمارے متعین ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں اس بات کو محسوس کر لیا گیا ہے اگر حالات سے بے بہرہ اور لاتعلق رہ کر کوئی ادب تخلیق کیا گیا تو وہ یقیناً نہ صرف اپنی طاقت سے محروم ہوگا بلکہ اپنی بنیاد سے بھی۔ اب جو عالمی صورت حال ہے اور دنیا کا دائرہ جس تیزی سے تنگ ہوتا جا رہا ہے اور فاصلے جس سرعت سے اپنی طنابیں کھینچے جاتے ہیں تو یہ صورت حال بھی ہمارے لیے معروضی حالات کا حصہ بن جاتی ہے اور ان سب کا اپنے اپنے طور پر جائزہ لیا جاتا رہنا چاہیے، جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو میں اس سلسلے میں کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں کہ یہ یہاں کے لکھنے والوں کا مسئلہ ہے ہاں اصولی طور پر اپنی اس بات کو دہراؤں گا کہ اپنے ماحول اور اپنے عصری حالات سے لاتعلق ہو کر کوئی زندہ اور متحرک ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔

اشفاق حسین

تحریکِ نسواں کا ایک باب

رشید احمد صدیقی اپنی کتاب "نقش ہائے رنگ رنگ" میں فراق گورکھپوری پر مضمون لکھتے ہوئے عورت اور جنس کا ذکر بھی فراق کے حوالے سے یوں کرتے ہیں۔ "فراق کے یہاں ہم جس چیز کو برہنگی اور فحاشی قرار دیتے ہیں وہ دراصل ان کے تحت الشعور میں مذہبی تقدس کا رنگ رکھتی ہے یہ اور بات کہ وہ کہیں کہیں اس راستے سے بھٹک گئے ہیں۔ جہاں عورت کا بیچ ہو وہاں بھٹکنا تعجب کی بات نہیں"

"عورت کا بیچ" اور "بھٹکنا" یہ رشید احمد صدیقی کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں علی سردار جعفری نے عورت کے حوالے سے رشید احمد صدیقی کے جمالیاتی ذوق کی تنبیت میں اقبال کے اس شعر کو بھی رکھا ہے ؎

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

"ترقی پسند تحریک کی نصف صدی" میں جعفری صاحب آگے چل کر وضاحت کرتے ہیں۔

"یہ شعر اقبال نے اس وقت کہا تھا کہ جب اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی گوشت پوست کی زندہ عورت کو اردو شاعری میں جگہ دے رہے تھے۔ اس سے پہلے اردو شاعری کی مثنویوں میں عورت پری تھی اور پہلی مرتبہ "زہر عشق" میں سوداگر کی بیٹی بن کر نمودار ہوئی تھی اردو ناول اور افسانے میں عورت دو حیثیتوں سے آ رہی تھی۔ ایک امراؤ جان ادا اور دوسری جدید عہد کی عورت۔ پریم چند کے یہاں زیادہ تر کسان اور نچلے درمیانی طبقے کی نمائندہ اور سجاد حیدر یلدرم اور دوسرے مصلحین کے یہاں اوپر کے درمیانی طبقے کی عورت۔ آزادیٔ نسواں کا پرچم بلند کر رہی تھی اور تعلیم و تربیت کا مطالبہ کر رہی تھی جس کا سمبل علی گڑھ کا لڑکیوں کا وہ ابتدائی اسکول تھا جیسے ڈاکٹر رشید جہاں کے والد شیخ عبداللہ اور ان کی بیگم صاحبہ نے بڑی دشواریوں سے شروع کیا تھا۔ آج وہ کالج ہے۔ اس دور کی یادگار مجاز کی وہ نظم ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

بتاؤں کیا تجھے اے ہم نشیں کس سے محبت ہے
میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہ اس دنیا کی عورت ہے
سراپا رنگ و بو ہے پیکرِ حسن و لطافت ہے
بہشتِ گوش ہوتی ہیں گہر افشانیاں اس کی

اس وقت تک ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں درمیانی طبقے کی عورتوں کے علاوہ کسان اور مزدور عورتیں بھی آگئی تھیں جن کے متعلق ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں میں یہ خیال عام تھا ــــ

بن کے قوت ایک دن ابھرے گی صدیوں کی تھکن

دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

عورتوں کے بارے میں علی سردار جعفری جن نئے تصورات کا ذکر کر رہے ہیں وہ بے انتہا قابلِ غور ہیں۔ اردو شعر و ادب اور اس کے سماجی ماحول میں عورت کیا تھی؟ کیا ہے؟ اور اسے کیا ہونا چاہیئے؟ یہ سوالات بہت سے اطمینان بخش جوابات چاہتے ہیں۔

میں سوچتا تھا کبھی جعفری صاحب سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہونی چاہیے۔ تفصیلی گفتگو نہ سہی مگر ایک بار یہ موقع ملا ضرور ہے۔

۱۹۸۵ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کانفرنس تھی۔ سردار جعفری بھی آئے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے خاتمے کے بعد لوگ ادھر ادھر کی مصروفیات میں لگ گئے۔ ایک دن میں اور خالد سہیل یوں ہی بی بی سی کی طرف چلا، پڑے جب اور دوسرے بے کار لوگوں کی طرح ہم لوگ ٹیوب اسٹیشن سے باہر نکلے تو دیکھا کہ جعفری صاحب بھی کسی کے ہمراہ چلے آرہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ بھی بی بی سی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم سب ساتھ ہو لیے جعفری صاحب جن سے ملنے گئے تھے وہ وہاں موجود نہیں تھے چنانچہ طے یہ پایا گیا کہ تھوڑی دیر کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر گپ شپ کی جائے۔ ادھر میں نے موقع غنیمت جان کر علی سردار جعفری صاحب سے عورت کے موضوع پر گفتگو شروع کردی اور ادھر خالد سہیل نے اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ یہ ایک مکمل انٹرویو تو نہیں ہے لیکن ایک خاص لمحے میں ایک ایسی گفتگو ضرور ہے جس کی روشنی میں علی سردار جعفری کی فکر کے کئی گوشے نمایاں ہوتے ہیں۔

ایک بے تکلف گفتگو۔

اشفاق:۔ میں اور خالد سہیل کل آپ کی شاعری کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ نے اپنی شاعری میں بیوی کا ذکر جس خوبصورتی سے کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ آپ کا یہ مصرع کہ "ہر عاشق ہے سردار یہاں، ہر معشوقہ سلطانہ ہے" اس کی نشاندہی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر آپ کی شاعری اور زندگی میں عورت کا احترام نظر آتا ہے۔ چنانچہ ہم نے سوچا تھا کہ اب آپ سے جب بھی ملاقات ہوگی ہم عورتوں کے بارے میں آپ کے خیالات وضاحت سے سنیں گے۔ ہر چند کہ بی بی سی کے اس کیفے ٹیریا میں، وہ بھی لنچ آور کے دوران، اتنی بھیڑ بھاڑ میں اس موضوع پر گفتگو مناسب تو نہیں ہے لیکن کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے؟

جعفری صاحب:۔ ہاں بھئی کیوں نہیں؟ لیکن اپنے خیالات اور اردو شاعری میں عورت کے مقام پر گفتگو کرنے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ واقعہ سناؤں۔ کل کانفرنس ختم ہونے کے بعد میں ایک طرف سے گذر رہا تھا تو وہاں چند خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کا تعلق ڈرامے اور فلم سے ہے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔ "آئیں ہمارے پاس

۱؎ ترقی پسند گولڈن جوبلی کانفرنس لندن۔ اگست ۱۹۸۵ء

بیٹھ جائیں" میں نے کہا "تم اتنی ساری ہو میرے لیے مصیبت بن جائے گی" پھر میں نے انہیں ایک لطیفہ سنایا سوویت یونین میں ایک PUPPET THEATRE ہوا کرتا تھا۔ وہاں میں نے ایک شو دیکھا تھا جس میں ایک کردار شیطان کا ہوتا ہے۔ جو دو عورتوں پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس شو کے دوران شیطان کہتا ہے "A WOMAN CAN DEAL WITH TWO DEVILS BUT EVEN A DEVIL CANNOT DEAL WITH TWO WOMEN" وہاں بیٹھی ہوئی خواتین میرے مزاح کو نہ سمجھ پائیں اور کہنے لگیں "WE NEVER THOUGHT YOU WERE A SEXIST MAN"

بہرحال یہ واقعہ درمیان میں تذکرہ تھا لیکن اگر ہم واقعی اردو شاعری پہ نگاہ ڈالیں تو ہمیں سوائے میر انیس کے جنہوں نے ماں اور بہن کے رشتے کا بھی ذکر کیا ہے باقی ساری اردو شاعری میں عورت صرف معشوق کے طور پہ نظر آتی ہے۔

جب ہم علی گڑھ میں پڑھا کرتے تھے تو کہیں عورت کی صورت تک نظر نہ آتی تھی عورتوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہمیں ریلوے اسٹیشن جانا پڑتا تھا جہاں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں انگریز عورتیں نظر آتی تھیں

جن دنوں ہم علی گڑھ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ان دنوں صرف چار خاندان ایسے تھے جو آزاد خیال سمجھے جاتے تھے۔ آزاد خیال اور جدید فکر کے حامل ایک خاندان شیخ عبداللہ کا تھا ڈاکٹر رشید جہاں ان کی بیٹی تھیں۔ دوسرا خاندان سلطانہ کا تھا۔ ان کے والد متحدہ پنجاب کے چیف اریگیشن آفیسر تھے۔ تیسرا خاندان عبداللہ بٹ کا تھا جن کی بیٹی بیگم ملک کراچی میں رہتی ہیں۔ فیض اکثر ان کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ عبداللہ بٹ کی بیٹیاں "بٹ یاں" کہلاتی تھیں۔ چوتھا خاندان پروفیسر ایم ایم شریف۔ فلسفی کا تھا جن کی بیٹی گلشن کی شادی پروفیسر خواجہ منظور حسین سے ہوئی جو ہمارے انگریزی کے پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر ایم ایم شریف کی بیٹیاں "شریف زادیاں" کہلاتی تھیں۔ اس دور میں مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور ابھرا جو آزادی کا تصور تھا ۔۔۔

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

میرے یہاں بھی عورت کا تصور لبریشن کا تصور ہے۔ میری طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" میں عورت کے حمل اور بچہ پیدا ہونے کا ذکر ان الفاظ میں ہے۔۔۔

لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

اور پھر میں نے اسی میں ایک جگہ لکھا کہ ۔۔۔

تصور مرا گھٹنیوں چل رہا ہے

لیکن اس دور میں ایسے خیالات اردو شاعری کے لیے اتنی نئی چیز تھے کہ ہمیں لوگوں کی توجہ اس طرف

ہینڈ ول کرانی پڑتی تھی۔ میری شاعری میں ماں کا تصور بھی ہے، محبوبہ کا بھی اور بیوی کا بھی۔

اشفاق:۔ تو پھر بیوی کے حوالے سے جو تصور آپ کی شاعری میں ابھرتا ہے اس پر ذرا روشنی ڈالیے۔

جعفری صاحب:۔ دیکھیے سلطانہ سے میرا تعلق ایک خصوصی نوعیت کا ہے۔ اس رشتے کی بنیاد بھی سیاست پر تھی۔ یونیورسٹی کے دوران وہ پولٹیکل سائنس اور میں انگریزی ادب میں ایم اے کر رہا تھا۔ ہم دونوں ایک گروپ ایک اسٹوڈنٹ موومنٹ کا حصہ تھے جو آزادی کے لیے کام کر رہا تھا۔

سلطانہ سے میری ملاقات علی جواد زیدی نے کرائی تھی۔ ایک دن کہنے لگے میں تمہیں منہاج سسٹرز سے ملواتا ہوں۔ وہ تین بہنیں تھیں۔ آمنہ منہاج، خدیجہ منہاج اور سلطانہ منہاج۔ وہ اس دور میں لکھنؤ یونیورسٹی کی سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں سمجھی جاتی تھیں۔ میں جب اُن سے ملا تو میں نے سلطانہ سے کہا تم وینس ڈی میلو (VENUS DI MELO) لگتی ہو۔ خدیجہ کہنے لگیں "تو میں کیا لگتی ہوں؟ میں نے کہا "مونا لیزا" اس ملاقات کے چند ہفتوں کے بعد سلطانہ نے مجھے وینس ڈی میلو کا مجسمہ پیش کیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں"

شادی کے بعد بھی میں کمیونسٹ پارٹی میں چالیس روپے مہینے پر کام کیا کرتا تھا۔ ان دنوں سلطانہ سوشل ایجوکیشن کمیٹی میں کام کرتی تھیں۔ اُنہیں دو سو روپے مہینہ ملا کرتا تھا۔ پھر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ میرے ہاں جب بیٹا پیدا ہوا تو میں جیل میں تھا۔ ان دنوں سلطانہ کماتی بھی تھیں، بچے کا بھی خیال رکھتی تھیں اور پھر آٹھ گھنٹے کا سفر طے کر کے مجھ سے ملنے جیل بھی آتی تھیں۔ مجھے جیل میں مہینے میں ایک بار ایک گھنٹے کی ملاقات کی اجازت ملتی تھی۔ اس طرح میرے اور سلطانہ کے درمیان رفاقت کا جذبہ ارتقا پذیر ہوا اور ہمارا رشتہ میاں بیوی کے رشتے سے زیادہ رفاقت کا رشتہ ہے۔

میں نے ایک نظم لکھی تھی جو کہیں کھو گئی، اس میں میں نے زندگی کے مختلف ادوار کا ذکر کیا تھا۔ اس نظم میں سلطانہ کے بارے میں ایک جگہ لکھا تھا کہ "تُو بن کے آئی کبھی افلاس میں فاقوں کا غرور"

اشفاق:۔ یہ جو آپ نے رفاقت کے رشتے کی بات کی ہے تو غالباً اسی حوالے سے آپ کی شاعری میں عورت سے برابری کا تصور ملتا ہے۔

جعفری صاحب:۔ جی ہاں! میں نے عورت کو کبھی کھلونا نہیں سمجھا۔

اشفاق:۔ آپ کی طویل نظم "نومبر میرا گہوارہ" میں بھی ماں کے بارے میں خوبصورت اشعار ہیں۔

جعفری صاحب:۔ ہاں۔ میں نے لکھا ہے

میری ماں

اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی
ننھے سے کھلونے کو

میری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں
پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا
وہ چہرہ کیا تھا
سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا
کہ اس چہرے سے بڑھ کر خوبصورت
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا
جو اپنے دل کے خوابوں
پیار کی کرنوں سے روشن تھا

میں نے ایک محفل میں جب یہ نظم پڑھی تو چار پانچ عورتیں رونے لگیں، لیکن عورت کا یہ احترام صرف میرے یہاں ہی نہیں بلکہ فیض کے ہاں بھی ہے۔ زہرا نگاہ نے میری برسی کی تقریب میں جو پیپر پڑھا تھا اس میں انہوں نے ترقی پسندوں کے عورت کے نظریے پر قلم اٹھایا تھا۔
فیض جیل میں تھے تو ایلس نے بچوں کا خیال رکھا۔ سجاد ظہیر جیل میں تھے تو رضیہ نے بچوں کو پالا۔

سہیل:۔ آپ کی شاعری میں عورت کا ایک حقیقت پسندانہ پہلو نظر آتا ہے۔

جعفری صاحب:۔ اردو شاعری کی عورت ایک تصوراتی عورت تھی۔ اختر شیرانی اور جوش نے اُسے گوشت پوست کی بنایا اور پھر ترقی پسند تحریک نے اسے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔

سہیل:۔ اردو ادب میں کن عورتوں نے آپ کو متاثر کیا۔؟

جعفری صاحب:۔ ایک تو رشید جہاں تھیں ہم انھیں رشیدہ آپا کہتے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت عورت تھیں ان کا چہرہ جگمگاتا تھا۔ ذہانت بے انتہا تھی، ڈاکٹر تھیں، لکھنؤ کے اسپتال میں ملازم تھیں اور آوٹ ڈور مریض دیکھا کرتی تھیں۔ وہ انھیں اسٹور کے قیمتی انجکشن لگا دیا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ اسپتال کے اسٹور کا سروے ہوا تو بہت سے قیمتی انجکشن غائب تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں سے پوچھا گیا تو وہ کہنے لگیں۔ "ہاں میں نے غریبوں کو لگوا دیے ہیں۔"
"لیکن وہ اُن کے لیے نہیں تھے" کسی نے اعتراض کیا۔ ڈاکٹر رشید جہاں نے کہا "میرا نظامِ اخلاق کو یہ گوارا نہیں کہ میرے مریض کو دوا کی ضرورت ہو اور وہ دوا اسپتال میں موجود ہو اور میں انکار کر دوں۔
وہ ایک ہمدرد عورت تھیں، فیض کی تربیت میں رشید جہاں کا بہت دخل تھا۔

جب انھیں کینسر ہو گیا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گئیں تو میں راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر آن سے ملنے گئے۔ ہماری صورت دیکھتے ہی ڈانٹا اور کہنے لگیں "کیا جنازے میں شریک ہونے آئے ہو؟ میں ڈاکٹر ہوں مجھے معلوم ہے کہ کیا تکلیف ہے۔ میرے پاس آتے ہو تو ہنستے ہوئے آؤ۔ مجھے تمہارے یہ لٹکے ہوئے چہرے اچھے نہیں لگتے۔ بیٹھو باتیں کرو"

سہیل:۔ ان کا انتقال کب ہوا تھا؟

فری صاحبہ:۔ [illegible]ء میں ماسکو میں۔ جب ہم انھیں ایرپورٹ پہ چھوڑنے گئے تھے تو وہ بہت بیمار تھیں۔ ماسکو سے [illegible] انہوں نے خط لکھوایا جس میں لکھا تھا کہ میں معافی مانگتی ہوں کہ تم ایرپورٹ پہ آئے، لیکن میں بات نہیں کر سکی کیونکہ میں سخت درد میں تھی اور بول نہیں سکتی تھی۔

سہیل:۔ نئی جنریشن میں آپ کن عورتوں سے متاثر ہیں؟

فری صاحبہ:۔ زہرا نگاہ ہیں، قرۃ العین حیدر ہیں، ساجدہ زیدی ہیں، زاہدہ زیدی ہیں، فہمیدہ ریاض ہیں۔ پروین شاکر ہیں۔ عشرت آفرین ہیں بلکہ میرا خیال ہے اس وقت اردو میں سب سے اچھا ادب خواتین ہی تخلیق کر رہی ہیں۔

(اگست ۱۹۸۵ء بی بی سی کیفے ٹیریا۔ لندن) ▼

رام لعل

سردار جعفری سے گفتگو

سردار جعفری کا یہ انٹرویو میں نے ۱۹۸۲ء میں خدا بخش نیشنل اورینٹل لائبریری پٹنہ کے لیے لیا تھا جسے منظور الامین نے وڈیو پہ ریکارڈ کیا تھا اور جو لائبریری کے آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ اس انٹرویو میں جعفری صاحب نے اپنے بارے میں اہم باتیں کہی ہیں

یہ انٹرویو نومبر ۱۹۸۸ء میں ماہنامہ "پاسبان" چندی گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان میں ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ (رام لعل)

رام لعل:۔ سردار بھائی، اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے سلسلے میں اگر تین چار بڑے نام لیے جائیں تو ان میں آپ جیسی قدآور شخصیت کا نام ناگزیر ہو جاتا ہے۔ آپ اردو کے ایک عہد ساز ادیب و شاعر ہیں اور آج سے بہت پہلے اور آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسے نام آتے ہیں جو آزادی سے پہلے اُبھرے اور آزادی کے بعد وہ غروب بھی ہو گئے مثلاً جوش و فراق۔ ان سے کچھ قبل سجاد ظہیر اور اس کے بعد مخدوم، مجاز اور فیض آتے۔ اس طرح کے بہت سے نام اور بھی آتے، لیکن آزادی کے بعد جو نام ہمیں عہد ساز معلوم ہوتا ہے۔ صحیح معنوں میں ترقی پسند ادب کی شعری تخلیقات ہیں، وہ علی سردار جعفری کا نام ہے۔

تو سردار بھائی پہلے آپ یہ بتائیے کہ آپ نے کہاں تعلیم پائی آپ کے آباد اجداد کہاں سے آئے تھے آپ کا اصلی وطن کونسا تھا۔ اور کہاں کہاں جا کر آپ بسے۔ سوال ذرا لمبا ہو گیا ہے۔ معافی چاہتا ہوں۔ یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ کے ہم عصر اور کون کون تھے۔ دو ایک کے نام تو میں نے لے ہی لیے ہیں۔

جعفری صاحب:۔ میں ابتدا ہم عصروں سے کروں گا کیونکہ آپ نے ایک فقرہ کہا جو آپنے بڑی محبت سے کہا۔ میں اس کی تردید نہیں کر رہا ہوں۔ اس طرح سے کہ میں آپ کی محبت کو ٹھکرا رہا ہوں، لیکن یہ کہ آپ نے جو تین چار نام لیے فیض، مخدوم مجاز، جذبی بھی اس میں شامل ہیں۔ احمد ندیم قاسمی بھی ہیں۔ یہ وہ شعراء ہیں جو سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان ترقی پسند تحریک کے ساتھ ابھرے۔ یہ تو دراصل عہد ساز تحریک ہے۔ اور اسی تحریک میں ہم سب شریک ہیں۔ تو ابھی تک کسی فرد کو الگ کر کے بات نہیں کر رہا ہوں۔

رام لعل :- یہ آپ نے اچھا کیا کہ جذبی اور احمد ندیم قاسمی کے نام شامل کر دیے ۔ شکریہ ۔ اس طرح شاعروں میں کچھ نام اور گنائے جا سکتے ہیں ۔ جنہیں آپ لوگوں جیسی شہرت حاصل نہ ہو سکی ۔ مگر لیکن سردار بھائی ، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو تحریک سے ہی ابھر کر آتے ہیں ۔

جعفری صاحب :- وہ بھی ٹھیک ہے ۔ ابھی تو گفتگو کی ابتداء ہو رہی ہے ۔ تو اب آپ نے جو میرے بارے میں پوچھا ہے تو میرا خاندان دراصل آگرے اور بہرسہ کا بھرت پور خاندان ہے ۔ وہاں بھرت پور سے قریب ایک گاؤں تھا بہرسہ ۔ ۱۹۴۷ء میں جیسے اور بڑی تباہیاں ہوئیں تو وہاں بھی تباہی ہوئی اور اس طرح سے وہ گاؤں بالکل خالی ہو گیا اور آگرے میں جو ہمارے خاندان کے لوگ تھے وہ آگرے سے بھی چلے گئے ۔ شاہ گنج کے محلے میں اور جناب اس میں سے کتنے خاندان ہیں جو کینیڈا میں بسے ہوتے ہیں اور وہ بچے جو باہر پیدا ہوتے ہیں ہندوستان سے جانے کے بعد جو اب جوان ہو گئے ہیں ، لیکن اب میرے والد اور میرے دادا اور پردادا ، ایک مقام ہے بلرام پور لکھنؤ کے قریب ریاست تھی ۔ تعلقداری ، وہاں منتقل ہو گئے تھے ۔ یہ لوگ وہاں کی انتظامیہ میں شریک تھے ، بڑے عہدیدار تھے ۔ میرے والد اسلحہ خانے کے ناظر تھے ۔ اس زمانے میں اردو زبان رائج تھی تو ناظر اسلحہ خانہ کہلاتے تھے ۔ اب ہم کہیں گے کہ صاحب ARMOURY OFFICER اب مجھے نہیں معلوم ہندی میں کیا لفظ استعمال ہونے لگا ہے ۔ تو کتابوں کا بھی ان کو شوق تھا ، تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے بچپن میں کتابوں اور بندوقوں سے کھیلا ہوں مجھے شکار کا شوق تھا اور کتابوں کا ۔ تو شکار کے سلسلے میں وہ جو ہمالیہ کی ترائی کے علاقے ہیں میں بڑا اچھا شکاری تھا ۔ اس زمانے میں تو وہاں جاتے ہوتے .....

رام لعل :- یہ کچہری کی طرف ہے ؟

جعفری صاحب :- نہیں ، بلرام پور جو ہے لکھیم پور کھیری جو ہے وہ اسی بیلٹ میں ہے اس میں نینی تال وغیرہ سب آجاتے ہیں جہاں پر کاربٹ پارک ہے ، ترائی کا علاقہ ہے پورے کا پورا ، تو وہاں میں نے سب سے پہلے افلاس کے نمونے دیکھے ، کہ بدترین افلاس کس کو کہتے ہیں ۔ اس سے پہلے میرے ذہن میں افلاس کا کوئی بھی تصور نہیں تھا ۔ اس لیے کہ ہمارے گھر میں جو نوکر چاکر تھے ، وہ اس مفلسی کا شکار نہیں تھے ۔ جو مفلسی میں نے گاؤں میں دیکھی ۔ اور چونکہ شیعہ گھرانے میں پیدا ہوا ۔ اس لیے محرم کی مجلسوں میں کربلا کے واقعات سنتا تھا اور امام حسین کی شہادت کے بعد جو خیمے لوٹے گئے تو ان کے لٹنے کا اور لٹنے کے بعد عورتوں کے کھلے ننگے سر قافلوں کا جانا اور ننگے سر بازار میں کا ۔ تو یہ ساری چیزیں تھیں جن کا میرے دل پر بہت اثر تھا ، لیکن میں نے کبھی اس کو آسمانی چیز نہیں سمجھا بلکہ اسے زمینی چیز ہی سمجھا ، بلکہ بعض مولویوں سے میں اس طرح کی گفتگو بھی کرتا رہا ہوں کہ صاحب قرآن آسمانی کتاب سہی لیکن نازل تو زمین پر ہوتی ہے انسان کے لیے ہے ۔

رام لعل :- لیکن سردار بھائی ترقی پسند ادیب کے طور پر کیا کبھی ایسا مقام آیا کہ آپ نے مذہبی اثرات کو SHAKE OFF کرنے کی کوشش کی ۔ ؟

جعفری صاحب :- میں ابھی جو بات کر رہا ہوں اس میں وہ چیز آجاتی ہے گی ۔ میں نے SHAKE OFF نہیں کیا ہے اس لیے کہ

SHAKE OFF کرنے کی جو چیزیں یعنی جھٹک دینے کی، پھینک دینے کی وہ توہمات ہیں، لیکن جیسا کہ ابھی میں نے کہا کہ ان سے میں نے دنیا کی چیز سمجھا، تو کربلا کی جو جنگ ہے، کربلا میری شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ میری ایک پوری نظم جس کا عنوان کربلا ہے اور مختلف مقامات پر کربلا کے استعارے میری شاعری میں آتے ہیں۔ اچھا اس کی ابتدا دراصل میں نے کی ہے وہ جوش ملیح آبادی ہیں ویسے اقبال کی شاعری میں فارسی میں کربلا ہے وغیرہ وغیرہ۔

رام لعل:۔ اردو میں تو یہ اب بہت عام ہے۔

جعفری صاحب:۔ اب تو بہت عام ہے لیکن یہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ آئی ہے۔ اس سلسلے میں میں آپ کو ایک بڑی دلچسپ بات بتاؤں کہ فیض بمبئی آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی تھیں۔ ایلس تو حسن کمال کے گھر جو اردو بلٹز کے ایڈیٹر ہیں۔ ہم کھانا کھانے گئے تھے تو ایلس دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ حسن کمال کی بیوی جو ہیں وہ کرسچن ہیں تو حضرت عیسٰی کا صلیب پر مجسمہ بھی موجود ہے اور لینن کی تصویر بھی تو اس وقت ہم نے اور فیض نے ان کو بتایا کہ ہم نے حضرت عیسٰی، اسلام اور ساتھ ساتھ ہندو MYTHOLOGY سے وہ تمام چیزیں لی ہیں جو آج ہمارے کام آسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی کی ایک نظم، اس نظم میں جو تشبیہیں اور استعارے ہیں وہ مسلسل چلتے رہیں کہ ہندو استعارہ آجاتا ہے، ایک مسلم استعارہ آجاتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہ اس میں کوئی تبدیلی ہو رہی ہے، مثلاً ان کی بڑی مشہور نظم جس میں انہوں نے کہا ہے کہ ؎

جوش کے افکار کو مانے گی مستقبل کی روح
آج اگر رسوا یہ مردِ نامسلماں ہے تو کیا

اس میں انہوں نے کہا ہے ؎

جا رہی ہے آگ لنکا کی طرف بڑھتی ہوئی
آج اگر راون کا گھر سیتا کا زنداں ہے تو کیا

اس کے بعد ہی یہ شعر آتا ہے ؎

بن رہا ہے صرصرِ و سیلاب خونِ ہاشمی
آج ابو سفیان کے گھر میں چراغاں ہے تو کیا

تو اسی طرح سے حضرت عیسٰی اور اسی طرح سے کربلا، تو یہ حق کی آواز بلکہ یہ چیز تو پوری ترقی پسند شاعری میں پھیلی ہوئی ہے۔

رام لعل:۔ قاسمی صاحب کے یہاں، فراق صاحب کے یہاں، مہابھارت، راماین کے بارے میں بہت ساری چیزیں مل جائیں گی۔

جعفری صاحب:۔ تو اسے SHAKE OFF نہیں کیا ہم نے۔ اس کو اس طریقے سے توہمات کو کیا۔ تو یہ میرے بچپن کا ———

INSPIRATION تھا تو وہ شعراء جن کی آواز سب سے پہلے میرے کانوں میں پڑی، وہ انیس تھے۔ انیس سے زیادہ فصیح و بلیغ شاعر تو اردو نے پیدا ہی نہیں کیا۔ اور پھر غالب، اقبال اور پھر فارسی کے شعراء کیونکہ بچپن میں میری تعلیم فارسی کی بھی ہوئی ہے تو میں نے حافظ کو بھی پڑھا، سعدی کو بھی، فردوسی، خسرو اور نظامی کو بھی پڑھا تو فارسی شعراء کے اثرات۔ اور پھر انگریزی تعلیم کے اثرات تو میں شیلی، کیٹس اور بائرن تک محدود نہیں رہا بلکہ اس سے میں باہر نکلا، چنانچہ میں نے ملٹن کو پڑھا اور شیکسپیئر کو تو سبھی پڑھتے تھے۔ پھر جرمن مطالعے میں گوئٹے میرے لیے بڑا بھاری INSPIRATION بن گیا۔ VIRGIL پہلے پڑھا میں نے اور فاؤسٹ بعد میں اور آسکر وائلڈ کے بڑے اثرات تھے مجھ پر۔

رام لعل:۔ اور جیسے انڈین MYTHOLOGY اور TRADITIONS کے سلسلے میں

جعفری صاحب:۔ اچھا یہ جو ہیں وہ تو ہم بچپن میں نوٹنکیوں میں دیکھا کرتے تھے۔ نوٹنکی تو FOLK FORM ہے اور بڑے ہونے کے بعد میں نے باقاعدہ ہندو ادب کا مطالعہ کیا ہے چنانچہ اُپنشد اور ویدانت کا کسی حد تک انگریزی کے ذریعے۔ ظاہر ہے ویدوں کے کچھ حصے بھی میں نے پڑھے اور راماین بھی۔ اور راماین تو بچپن سے کانوں میں پڑتی تھی۔

رام لعل:۔ جی ہاں وہ تو اردو میں تھی ہی۔

جعفری صاحب: تلسی داس کی راماین روز گائی جاتی تھی۔ تو یہ سارے اثرات میری شاعری میں موجود ہیں اور اس میں روسی انقلاب، ان کے شاعر مایکاوسکی، گورکی۔ حالانکہ وہ شاعر نہیں تھا، لیکن شاعروں سے بڑا شاعر تھا۔ اور امریکن شاعر والٹ وہٹ مین اس کے خاصے اثرات میری نظم "پتھر کی دیوار" میں۔ "اودھ کی خاک حسین" جب میں نے وہ لکھی ہے تو میرے ذہن میں تو یہ کہیں نہیں تھا کہ اس پہ اثر ہے والٹ وہٹ مین کا، لیکن ابھی محمد صادق صاحب نے ہسٹری آف اردو لٹریچر جو کتاب لکھی ہے اس کے دوسرے ایڈیشن میں انہوں نے لکھا ہے کہ یہ نظم کالی داس اور والٹ وہٹ مین کی یاد دلاتی ہے۔ کالی داس بھی میرا محبوب شاعر ہے۔

رام لعل:۔ بہت خوب سردار بھائی قطع کلام ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں HUMANISM کی ایک تحریک چلی تھی جس میں ٹیگور بھی پیش پیش تھے اور مغرب میں بھی کئی جگہ ایسا تھا۔ اس کے بھی کچھ اثرات آپ نے محسوس کیے؟

جعفری صاحب:۔ نہیں۔ وہ تو میں نے بہت بعد میں محسوس کیے ۱۹۳۶ء کے بعد کیونکہ پہلی جنگ کے بعد ہی یہ تحریکیں شروع ہو گئی تھیں اس میں آئن اسٹائن بھی شامل تھا۔ برنارڈ شا، ایچ جی ویلس بھی۔

رام لعل:۔ آپ پشکن کو بھی شامل کرتے ہیں ان میں۔؟

جعفری صاحب:۔ نہیں۔ پشکن تو انیسویں صدی کا شاعر تھا۔ یہ لوگ تو یورپ میں جنگ کے خلاف اور امن کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اور تہذیب بچانے کے لیے۔

اِم لعل:۔ یہ بات تو ہو گئی۔ اب آپ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں کیا نقطۂ نظر ہے۔ کیا آپ وضاحت فرمائیں گے؟

جعفری صاحب:۔ بھئی میں تو شروع سے ایک چیز پہ یقین رکھتا ہوں، معلوم نہیں دوسرے بھی یقین رکھتے ہیں یا نہیں کہ ایک ماحول جس میں ہم پیدا ہوتے ہیں اس میں بہت سی بے ساختہ چیزیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور ان بے ساختہ لمحوں میں بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کو بالکل بدل دیتے ہیں۔ ہم یہاں اس وقت بیٹھے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، لیکن ہمیں یہ نہیں معلوم کہ جب ہم اسٹوڈیو سے باہر نکلیں گے تو کس سے ملاقات ہوگی اور وہ ہماری زندگی پر کس طرح اثر ڈالے گا۔ تو اس اعتبار سے میں شروع سے ہندوستان کی تحریک آزادی کے حق میں رہا۔ پنڈت جواہر لال کو میں نے اپنے بچپن میں تقریر کرتے دیکھا۔ مہاتما گاندھی کو میں نے اپنے بچپن میں دیکھا۔

اِم لعل:۔ اور سروجنی نائیڈو کو بھی؟

جعفری صاحب:۔ سروجنی نائیڈو سے تو میں بہت قریب تھا، بڑی شفقت کرتی تھیں۔ آن کا میں ایک واقعہ بھی بتادوں کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے الیکشن کے زمانے میں سروجنی نائیڈو کے نام سے ایک خط لکھ کر دوستوں نے بانٹ دیا تھا کہ سردار جعفری کو ووٹ ملنے چاہئیں۔ یونیورسٹی کے الیکشن اسی سطح پر ہوتے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں بہت پریشان ہوا اور میں نے مسز نائیڈو کو بہت ہی معذرت کا خط لکھا کہ صاحب ایسا حادثہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے جواب میں کچھ نہیں کہا صرف پوسٹ کارڈ پر وہی عبارت جو انگریزی میں لکھی تھی لکھ کر نیچے اپنے دستخط کر دیئے اور مجھے بھجوا دی۔ مجھے دکھ ہے کہ پولیس والے سب کاغذات اٹھا کر لے گئے۔ اس کے ساتھ وہ بھی چلا گیا۔

اِم لعل:۔ اب میں جو پوچھ رہا تھا۔

جعفری صاحب:۔ ہاں آپ پوچھ رہے تھے زندگی اور شاعری کا رویہ تو اس میں میں تحریکِ آزادی کے بالکل ساتھ رہا اس لیے میرے پاس ایک قسم کا OPTIMISM ہے۔ رجائیت جو میری شاعری میں بھی ملتی ہے اور اس کی ایک فلسفیانہ سطح بھی بن گئی ہے۔ سب چیزیں یعنی مارکسزم، اُپنشد، ویدانت پڑھ کر۔ جب میں اُپنشد اور ویدانت کا نام لیتا ہوں تو اس سے ماورائیت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس میں پہلی بار یہ کہا گیا ہے کہ خدا کو یا بھگوان کو اپنے وجود میں تلاش کرو تو یہ بھگوان کی تلاش نہیں انسان کی تلاش ہے۔ یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

اِم لعل:۔ سردار جعفری صاحب آپ کو کبھی FRUSTRATION نہیں محسوس ہوتی۔

جعفری صاحب:۔ نہیں مجھے ذاتی FRUSTRATION کبھی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ انتخاب میرا بڑا شعوری تھا۔ میری شاعری کا جو اصل محور ہے وہ ہے وجود اور عدم کی کشمکش۔ اور وجود و عدم کی کشمکش فلسفیانہ سطح پر اور زندگی کی سطح پر بھی جو ہمیشہ وجود کی سطح پر ختم ہوتی ہے۔ ہم ہمیشہ کہتے ہیں کہ موت کی حکمرانی ہے دنیا پر، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے کیونکہ اگر موت کی حکمرانی ہوتی تو یہ دنیا قبرستان ہوتی۔ آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس لیے زندگی موت پر حاوی ہے تو وجود اور عدم کی کشمکش ہے یہ میری شاعری میں مختلف استعاروں کی شکل میں آتی ہے اور اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی دو نظمیں سناؤں جو غیر رومانٹک ہیں بالکل، لیکن شاعری ہے اس کے باوجود بھی۔

اِم لعل:۔ عنایت فرمائیں۔

جعفری صاحب:۔ آبلہ پا، میری گذشتہ پانچ سات سال کی نظم ہے اس پر غالب کا شعر ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

۔۔، آبلہ پا ،۔۔

سائے میں درختوں کے
بیٹھے ہوئے انسانو
اے وقت کے مہمانو
کس دیس سے آئے ہو
کس دیس کو جانا ہے
اے سوختہ سامانو
یہ وسعت میداں ہے
یا درد کا صحرا ہے
اک دھوپ کا جنگل ہے یا پیاس کا دریا ہے

اس میں ریگستان عدم کی علامت ہے اور انسان وجود کی۔

رام لعل:۔ بہت خوب۔ بہت اچھا ہے

جعفری صاحب:۔

دریا کے پرے کیا ہے
پتھر ہے کہ چشمہ ہے۔
نغمہ ہے کہ نالہ ہے
شبنم ہے کہ شعلہ ہے
شاید کوئی ساحر ہے
جو ڈوبتے سورج کے دروازے پر بیٹھا ہے۔
افسون تماشا ہے
ہے رات کی راہوں میں تاروں کا سفر جاری
اور باد بیابانی
سرمست و غزلخواں ہے
ہر ذرّے کے سینے میں اک شمع فروزاں ہے۔
ہر خار کے نیزے پر خوابوں کا گلستاں ہے۔
اے عشق جنوں پیشہ

اس سمت ہی چلنا ہے
ڈوبا ہے جہاں سورج
نکلا ہے جہاں سورج
واں ریت کے ٹیلے پر
یا ناقۂ لیلیٰ ہے یا محملِ سلمیٰ ہے
صد قافلہ پنہاں ہے
صد قافلہ پیدا ہے
آوازِ جرس لیکن اس دشت میں تنہا ہے
صدیوں سے اسی صورت
ہے حکمِ سفر جاری
فرمانِ ستم جاری
اعلانِ کرم جاری
پھولوں کے کٹوروں میں
شبنم کی گلابی ہے۔
اور بادِ سحر گاہی
بدمست شرابی ہے
کل صبح کے دامن میں تم ہوگے نہ ہم ہوں گے
بس ریت کے سینے پر کچھ نقشِ قدم ہوں گے
سائے ہیں درختوں کے
پھر لوگ بہم ہوں گے
کس دیس سے آئے ہو کس دیس کو جانا ہے
اے وقت کے مہمانو
اے سوختہ سامانو
اے شمعِ تمنا پر جلتے ہوئے پروانو

رام لعل:۔ واہ واہ

جعفری صاحب:۔ اور یہ دوسری نظم ہے۔ اس میں میں نے عدم کو "برہنہ فقیر" کہا ہے۔ نظم کا عنوان ہی ہے "برہنہ فقیر" یہ میرے آخری مجموعے میں ہے جو چھپا ہے۔ "لہو پکارتا ہے"۔ یہاں سے شروع ہوتی ہے نظم۔ بالکل فلسفیانہ نظم ہے۔ میں اسے COSMIC POEMS میں شمار کرتا ہوں۔ اپنی COSMIC CONCIOUSNESS-

کی نظم ۔

۔: برہنہ فقیر :۔

میری زندگی تیری زندگی
یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے
ہے کشیدہ اس پہ ہزار گل
کوئی اشک ہے کوئی آہ ہے
کوئی خوف اور گناہ ہے
کوئی اِک تبسم زیر لب
کوئی حرف نیم نگاہ ہے
کوئی کم یہاں نہ زیادہ ہے
میری زندگی تیری زندگی
یہ جو ایک کہنہ لبادہ ہے
عدم ایک برہنہ فقیر ہے
کہ لباس جس کا ہوائیں ہیں
کہ لباس جس کا دِشائیں ہیں
کبھی چاند کو وہ پہنتا ہے
کبھی ڈھانکتا ہے بدن کو وہ
نئے آفتاب کے نور سے
کبھی رنگ گل کے حریر سے
کبھی بوئے گل کے کتان سے
مگر اس کے بعد بھی وہ فقیر ہے
یونہی گھومتا ہے برہنہ تن
کہ لباس ذو التباس ہیں
کبھی چھپ سکا نہ وہ بے بدن
میری زندگی تیری زندگی
اسے دیتی ہے کیا پیرہن
یہ وجود حکمت سادہ ہے
جو برہنگی عدم کو روز
نیا لباس پہناتا ہے ۔

رام لعل:۔ واہ واہ

جعفری صاحب:۔ میں آپ کو ایک تیسری نظم سنا رہا ہوں

رام لعل:۔ اچھا۔ غرض میری یہ ہے کہ تیسری نظم سے پہلے میرے ریکارڈ کو ذرا آپ CORRECT کریں۔

جعفری صاحب:۔ یہ اسی کا تسلسل ہے۔ کشمکش عدم و وجود کی اور وہ موت اور زندگی کے پیرائے میں ہے اور اس کا عنوان ہے "میرا سفر" اس کے بعد میں ایک سیاسی نظم سناؤں گا۔ کیونکہ یہ بڑی سیاسی کشمکش ہے۔ اس میں بھی جو فاسدانہ طاقتیں ہیں وہ عدم کی طاقتیں ہیں اور جو عدل کی طاقتیں ہیں وہ وجود کی طاقتیں ہیں اور اس میں بھی جو شکست و فتح ہے وہ اسی کی شکل میں ہے۔

رام لعل:۔ جی ارشاد فرمائیے۔

جعفری صاحب:۔ یہ نظم ہے "میرا سفر" اور یہ میری محبوب نظم ہے۔

"میرا سفر"

پھر اک دن ایسا آئے گا

آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے

ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے

اور برگِ زباں سے نطق و صدا کی ہر تتلی

اُڑ جائے گی۔

اک کالے سمندر کی تہ میں

کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی

پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی

ساری شکلیں کھو جائیں گی

خوں کی گردش دل کی دھڑکن، سب

راگنیاں سو جائیں گی

اور نیلی فضا کی مخمل پر

ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی

یہ میری جنت، یہ میری زمیں

اس کی صبحیں اس کی شامیں

بے جانے ہوئے بے سمجھے ہوئے

اک مشتِ غبارِ انساں پر

شبنم کی طرح رو جائیں گی، سب راگنیاں

سو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے خزینے بٹ جانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں
لیکن مَیں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
ہنستا پتّی پتّی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
مَیں رنگِ حنا، آہنگِ غزل، اندازِ سخن
بن جاؤں گا
رُخسارِ عروسِ نَو کی طرح ہر آنچل سے چھن
جاؤں گا۔
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں جب فصلِ خزاں
کو لائیں گی۔
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سُنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مِری بھر جائیں گی

اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصّہ میرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے!!

رام لعل:- واہ واہ ۔ یہ تو کچھ AUTOBIOGRAPHICAL بھی ہے۔

جعفری صاحب:-
میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

رام لعل:- واہ واہ کیا کہنے ہیں۔

جعفری صاحب:- اور یہاں میں نے مولانا جلال الدین رومیؒ کا مصرع لکھ دیا ہے کہ

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم

میں گھاس کی طرح بار بار آتا ہوں اور یہ جو ہے MATERIALISTIC PHILOSPHY اور مولانا جلال الدین رومیؒ کا خیال، یہ سب جو ہیں یا ایک HIGHER WAVE LENGTH MARXISM پر جاتے ہیں۔

رام لعل:- جی بہت خوب۔ ہاں جو میں اپنا ریکارڈ CORRECT کرنا چاہتا تھا ان کی مدد سے کہ یہ جو آپ کی تخلیقات ہیں اس میں آپ میری معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ یعنی یہ جو آپ کی شعری تصانیف ہیں۔ "پتھر کی دیوار"۔ "خون کی لکیر"۔ "نئی دنیا کو سلام"۔ "ایک خواب اور"۔ "پیراہن شرر"۔ "لہو پکارتا ہے"۔ ان کے علاوہ اور تو کوئی نہیں۔

جعفری صاحب:- ان کے علاوہ "ایشیا جاگ اٹھا" ایک طویل نظم ہے۔ "امن کا ستارہ"

رام لعل:- اچھا۔ آپ نے افسانہ نگاری بھی تو کی تھی۔

جعفری صاحب:- ہاں، میں اپنا شمار ناکام افسانہ نگاروں میں کرتا ہوں۔

رام لعل:- بہر کیف یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔

جعفری صاحب:۔ پہلا مجموعہ جو تھا افسانوں کا "منزل" بعد میں میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں افسانہ نگار نہیں ہوں، لیکن میں نے REPORTAGES لکھے ہیں۔

رام لعل:۔ REPORTAGES تو آپ کا ایک "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ہے۔ اچھا آپ کی تنقیدی تصانیف میں ایک تو "ترقی پسند ادب" شامل ہے اور ایک "اقبال شناسی" شامل ہے۔

جعفری صاحب:۔ اس کے علاوہ میر، غالب، میرا اور کبیر پر کام ہے۔

رام لعل:۔ اچھا غالب، میرا اور کبیر جو ہیں ان کے مؤلف آپ ہیں۔

جعفری صاحب:۔ جی ہاں۔ میں نے ان کے دیباچے بھی لکھے ہیں۔

رام لعل:۔ بہت خوب۔ اچھا جعفری صاحب اب آپ ہمیں اپنی شاعری کی نئی لفظیات کے بارے میں جو اس سے قبل نہیں تھیں کچھ بتائیے۔

جعفری صاحب:۔ ابھی جو نظمیں آپ نے سنیں۔

رام لعل:۔ جی ہاں، وہ مجھے بہت پسند آئیں۔

جعفری صاحب:۔ ان میں جو لفظیات ہیں وہ غزل کی لفظیات سے مختلف ہیں۔ میں نے خاص طور سے جو کوشش کی ہے اور یہ بھی جوش ملیح آبادی نادر شئے ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی اس کی ابتدا کی ہے۔ وہ یہ کہ موضوع کے گرد و پیش سے استعارے حاصل کرنا اور جب اس کے ساتھ ہی ہم کلاسیکی استعارہ ملا دیتے ہیں تو ایک بڑی خوبصورت چیز بنتی ہے۔ ہماری جو کتاب ہے "پتھر کی دیوار" ان نظموں میں یہ چیز سب سے زیادہ کھل کر آئی ہے مثلاً یہ نظم خود ہی "پتھر کی دیوار"۔ شاید اس سے پہلے کسی نے پتھر کی دیوار کتاب کا نام نہیں رکھا تھا۔ یہ جیل کی نظمیں ہیں

رام لعل:۔ اچھا۔ یہ انگریزی کی کتاب ANTHOLOGY میں بھی شامل ہے۔

جعفری صاحب:۔ نہیں، وہ دوسری نظم ہے "تمہاری آنکھیں" جو میں آپ کو سناؤں گا۔ تو یہ پتھر کی دیوار جو ہے۔ یہاں سے شروع ہوتی ہے ؎

کیا کہوں بھیانک ہے یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری کچھ پتہ نہیں چلتا
پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں پر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر تیرگی کے ماتھے کی
سیکڑوں خراشیں ہیں۔

یہ لفظیات جو ہیں میرے اپنے ہیں

رام لعل:۔ جی ہاں، یہ بہت ہی قریب ہیں عام آدمی کے لیے بھی اور فکر و نظر رکھنے والوں کے لیے بھی۔

جذبی صاحب:۔ تو اسی میں ایک نظم ہے جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں۔ اس کا عنوان ہے "تمہاری آنکھیں"

رام لعل:۔ ضرور عنایت فرمائیے۔

جذبی صاحب:۔ جیل میں کہی تھی یہ نظم میں نے یہ ایک ڈیڑھ منٹ میں ختم ہو جائے گی۔

رام لعل:۔ کونسی کتاب میں ہے یہ

جذبی صاحب:۔ ترجمہ ہے ابھی نیا آیا ہے۔ ANTHOLOGY ہے ماڈرن اردو POETS کی۔ فیض اور مخدوم، میں اور جاں نثار اختر۔ یہ آزاد نظم ہے

"تمہاری آنکھیں"

حسین شفاف مسکراتی جوان آنکھیں
لرزتی پلکوں کی چلمنوں میں
شہابی چہرے پہ ابروؤں کی کماں کے نیچے
تمہاری آنکھیں
وہ جن کی نظروں کے ٹھنڈے سائے
میں میری الفت، مری جوانی کی رات پروان
چڑھ رہی تھی
تمہاری آنکھیں
اندھیری راتوں میں جو ستاروں کی روشنی سے
فضائے زنداں میں جھانکتی ہیں
میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں
سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
میں پڑھ رہا ہوں
ہر اک سطر کی جھنوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں
تمہاری آنکھیں
تمہاری پلکیں
کہانیاں سی سنا رہی ہیں

میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
مسرتوں کے گلاب ہر سمت کھل رہے ہیں
تمہاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں
مجھے گرفتار کر کے جب جیل لا رہے تھے پولیس والے
تم اپنے بستر سے اپنے دل کے ادھورے خوابوں کو
لے کے بیدار ہو گئی تھیں
تمہاری پلکوں سے نیند اب بھی ٹپک رہی تھی
مگر نگاہوں میں نفرتوں کے عظیم شعلے بھڑک اٹھے تھے
تمہاری آنکھیں
حقارتوں کے جہنموں کو جگا رہی تھیں
نظامِ ظلم و ستم پہ بجلی گرا رہی تھیں
مری محبت نے اپنی جنت کا حسن دیکھا
تمہاری آنکھوں پہ میری نظروں کے پیار برسے
مری امیدوں مری تمناؤں نے صدا دی
کہ نفرتوں کی عظیم مشعل جلائے رکھنا
کہ یہ محبت کے دل کا شعلہ ہے
جس کی رنگین روشنی میں
ہمارے خوابوں کے راستے
جگمگا رہے ہیں
تمہاری آنکھیں
یہ میرے سینے میں تیرتی ہیں
کنول کی کلیاں جو میرے دل میں کھلی ہوئی ہیں
انہیں سے دو اور آنکھیں بیدار ہو گئی ہیں
وہ ننھے ننھے چمکتے ہیروں کی ننھی کلیاں
جو میری آنکھوں کا نور لے کر
تمہارے آنچل سے جھانکتی ہیں
پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں
پھر اور آنکھیں، پھر اور آنکھیں

محسن بھوپالی

سردار جعفری کا انٹرویو

سوال:۔ جعفری صاحب اس سے پہلے کہ بھارت میں اردو زبان اور اردو ادب کی موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کی جائے۔ میں چند ذاتی باتیں پوچھنا چاہوں گا تاکہ قارئین کو آپ کی زندگی اور تخلیقی و ادبی سرگرمیوں کا علم ہو سکے۔ کیا آپ تاریخ پیدائش، تعلیمی کیریر اور تخلیقی کاموں کے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟

جواب:۔ میں ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ، الہ آباد اور علی گڑھ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ جامعات بدلنے کی وجہ میری ادبی سرگرمیاں تھیں۔ یہی سبب ہے کہ بی اے کرنے کے بعد ایم اے فائنل تک تعلیم حاصل کر سکا ایم اے پاس کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اب تک نثر میں میری کتابیں "ترقی پسند ادب"، "لکھنؤ کی پانچ راتیں" جو میری یادوں پر مشتمل ہے۔ شعری مجموعے "خون کی لکیر" اور "نئی دنیا کو سلام" آزادی سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد "ایشیا جاگ اٹھا"، "امن کا ستارہ"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر" اور گزشتہ سال "لہو پکارتا رہا" شائع ہو چکے ہیں۔ "ایک خواب اور" پاکستان میں بھی حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ شاعری کی ایک اور کتاب زیر ترتیب ہے جو "کربلا" کے نام سے شائع ہو گی۔ "ترقی پسند ادب" کا نیا ایڈیشن حواشی کے ساتھ شائع ہونے والا ہے

سوال:۔ ہندوستان میں اردو کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ ہندوستان میں اردو کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہندوستان کی صورتِ حال کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ وہاں کی آبادی تقریباً ۷۰ کروڑ ہے۔ ملکی انتظام کے تحت بھارت زبانوں کی بنیاد پر ریاستوں میں تقسیم ہے۔ چنانچہ میں مہاراشٹر میں رہتا ہوں جہاں کی ریاستی زبان مراٹھی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بنگال میں بنگالی، پنجاب میں پنجابی اور گجرات میں گجراتی ریاستی زبانیں ہیں۔ میں بات کی آسانی کے لیے مہاراشٹر کی مثال دوں گا۔ وہاں مراٹھی کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے پھر گجراتی اور دیگر زبانوں کا۔ اس طرح اس صوبے میں ایک اردو بولنے والے کے لیے ضروری ہے کہ کم از کم چار زبانیں جانے۔ اردو اس لیے کہ مادری زبان ہے۔ مراٹھی اس لیے کہ ریاست کی زبان ہے۔ ہندی اس لیے کہ پورے ملک کی رابطے کی زبان ہے اور انگریزی اس لیے کہ دماغ کی کھڑکیاں کھلیں۔ اردو کا اصل مسئلہ جو ہے ان ریاستوں کا مسئلہ ہے جنہیں ہم ہندی ریاستیں کہتے ہیں۔ ہر چند کہ ہندی اور اردو کا رشتہ بہت قریب کا رشتہ ہے۔ اس کی گرامر ایک ہے لیکن مزاج اور تاریخ بالکل الگ ہے۔ اس طرح یہ دونوں زبانیں قریب ہوتے بھی دو الگ زبانیں ہیں۔ اردو کم و بیش سبھی شہروں میں بولی جاتی ہے اور بھارت کے سبھی شہروں میں سمجھی جاتی ہے

اس وقت جو مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ ہندی کی جو ریاستیں ہیں وہاں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کو دوسری زبان کا درجہ ملنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ رسم الخط کا مسئلہ آجاتا ہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہے جو زیادہ تر ہندی کے ادیب پیش پیش ہیں کہ اردو کا رسم الخط آپ دیوناگری کر دیجیے لیکن اردو والے اس کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں اپنی زبان کے تحفظ کے لیے اپنے رسم الخط کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ اردو اپنے موجودہ رسم الخط کے ساتھ بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کا ہر طبقے میں گزر ہے اور اس اعتبار سے اردو بھارت میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی زبان ہے۔ اس لحاظ سے میں اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔

سوال: بات رسم الخط کی نکلی ہے تو ایک ضمنی سوال کرتا چلوں۔ گزشتہ دنوں نقاد اور ماہر لسانیات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے "مقتدرہ قومی زبان" کے استقبالیے میں گفتگو کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بھارت کے مارکسی ادیب اردو کو دیوناگری میں لکھنے کے حق میں ہیں۔

جواب:۔ میں اگر اس سے اپنا جواب شروع کروں گا۔ اس لیے کہ ان کا بیان میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اگر گوپی چند نارنگ نے یہ بات کہی ہے تو وہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ہمارے یہاں بعض لوگ ہیں مثلاً راہی معصوم رضا وہ عام طور پر لکھتے رہتے ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان ہیں۔ اردو کوئی الگ زبان نہیں ہے۔ وہ قطعی مارکسی ادیب نہیں ہیں۔ وہ اردو زبان کو اردو رسم الخط کے ساتھ برقرار رکھنے کے حق میں ہیں۔ ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی بھی کبھی کبھی بیان دیتی ہیں۔ وہ بھی مارکسی ادیب نہیں ہیں لیکن وہ بھی، جب ان سے اس موضوع پر گفتگو کیجیے تو، کہتی ہیں کہ ان کا مطلب اور موقف یہ ہے کہ اردو کو دیوناگری رسم الخط میں بھی چھپنا چاہیے تاکہ اردو کی تخلیقات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

اگر کوئی ادیب یہ بات کرتا ہے کہ اردو دیوناگری رسم الخط میں بھی چھپے تو اس کو آپ قابلِ گرفت قرار نہیں دے سکتے لیکن یہ کہنا کہ مارکسی ادیب اردو رسم الخط کو ختم کر کے دیوناگری رسم الخط میں لانا چاہتے ہیں تو سو فیصدی غلط ہے۔

سوال:۔ بھارت میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے موجود مختلف اداروں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ سب سے بڑا ادارہ "ترقی اردو بورڈ" ہے جو حکومتِ ہند نے قائم کیا ہے۔ اس ادارے کے تحت ادب فلسفہ، سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ کتابیں شائع کی جارہی ہیں۔ ایک بڑی لغت زیرِ تالیف ہے۔ اس کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہے جسے مرکزی حکومت گرانٹ دیتی ہیں۔ تقریباً آٹھ دس ریاستوں میں اردو اکیڈمی بھی قائم کی گئی ہیں جنہیں صوبائی حکومتیں گرانٹ دیتی ہیں۔ ان اداروں کے تحت نئے لکھنے والوں کے شعری اور نثری مجموعے آئے دن شائع ہوتے رہتے ہیں اور ریاستی سطح پر ادبی انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ میں نے تجویز دی ہے کہ ان اداروں کے لیے رابطہ کمیٹی بھی قائم کی جائے تاکہ مربوط طریقے سے اشاعتی کام ہوسکے۔

سوال:۔ کیا آپ بھارت میں اردو ادب کے موجودہ معیار اور ادبی صورتِ حال کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

جواب:۔ میں اس صورتِ حال کو ایک وسیع تناظر میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں۔ تاریخ میں کچھ دور آتے ہیں جو دیوزادوں کے دور ہوتے ہیں۔ کچھ دور آتے ہیں جو بونوں کے دور ہوتے ہیں اور کچھ دور بنجر دور کہلاتے ہیں۔ آپ دیکھیے ہیں کہ سولہویں صدی میں بھارت میں اکبر، برطانیہ میں الزبتھ، ترکی میں سلیمان عالیشان اور روس

میں شیر اعظم جیسے معارف پرور حکمراں تھے اور یہ وہی دور ہے جس میں شیکسپیئر بھی ہے، عرفی بھی ہے اور نظیری بھی اور اس عہد میں ملک محمد جائسی، تلسی داس، کبیر اور رحیم جیسے جلیل القدر شاعر بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح اگر آپ ۵۰ سال پہلے والے دور پر نظر ڈالیں تو روس میں لینن، بھارت میں گاندھی، نہرو اور پاکستان کے حوالے سے قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور ادب کے رشتے سے ٹیگور اور اقبالؒ سب دیوزاد ہیں۔ اس کے علاوہ آزادی کے بعد کا دور آتا ہے جس میں آپ ادیبوں کے بھی قد و قامت ناپ سکتے ہیں اور سیاست دانوں کے بھی لیکن میں اس کو مایوس کن دور نہیں کہتا۔ مایوس کن اس لیے نہیں کہ جب بہت بڑے بڑے درخت اگ آتے ہیں تو ان کے نیچے جو پودے اگتے ہیں انہیں بڑے ہونے میں وقت لگتا ہے۔ کسی نے نہیں سوچا ہوگا کہ جب غالب کی حکمرانی تھی تو ایک اقبالؒ بھی پیدا ہوگا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ اور ٹیگور کے بعد ان شاعروں میں سے جو آج کل بھارت اور پاکستان میں شاعری کر رہے ہیں کوئی قد آور شاعر نکلے۔ پریم چند، بیدی، منٹو اور عصمت کے بعد ممکن ہے کوئی اتنا بڑا یا اس سے بھی بڑا افسانہ نگار پیدا ہو جائے۔ ویسے پاکستان اور بھارت میں دونوں طرح کا ادب لکھا جا رہا ہے۔ ایک وہ ادب جس کا موضوع تہذیب اور انسان کا زوال ہے اور ایک وہ ادب ہے جس نے انسان اور تہذیب کی نشاۃ الثانیہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احتجاجی ادب بھی پیدا ہو رہا ہے۔ پاکستان میں بھی، بھارت میں بھی اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ہمارے نوجوان اور نو عمر لکھنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں۔ ان میں بہت اچھے لکھنے والے بھی ہیں، میں نام اس لیے نہیں لے رہا کہ ان کی تعداد کافی ہے اور اگر کوئی نام چھوٹ گیا تو ناانصافی ہوگی۔

سوال:۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں بھارت سے بہتر غزل کہی جا رہی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب:۔ ضروری نہیں کہ لوگ میرے جواب سے اتفاق کریں۔ اگر سماجی تجزیہ کیا جائے تو ہم ایک بڑے نتیجے پر پہنچیں گے۔ وہ یہ ہے کہ پاکستان میں گزشتہ ۲۰ برسوں سے جسے ہم کلاسیکی موسیقی کہتے ہیں۔ تقریباً ختم ہو چکی ہے یا اس سطح پر نہیں ہے جس پر بڑے غلام علی کے عہد میں تھی۔ ہندوستان میں کلاسیکی موسیقی اب بھی بڑی جاندار ہے اور اب بھی وہاں بڑے کلاسیکی موسیقار اور ساز نواز ہیں۔ پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کے زوال کے ساتھ ہی بڑے گلوکار غزل کی طرف چلے گئے اور انہوں نے غزل کی گائیکی کو نیا رنگ اور نیا انگ دیا اور غزل بھارت میں بھی بہت مقبول ہوئی، اور بہتر غزل کی گائیکی کے لیے غزل بھی لکھی جانے لگی۔ احمد فراز، ناصر کاظمی اور دوسروں کی اعلیٰ درجے کی غزلیں گائیکی کے ذریعے ہی ہمارے یہاں پہنچیں۔ اس غزل کا اثر بھارت میں بھی پڑا۔ وہاں کی غزل نے بھی پاکستان کی غزل کے زیر اثر ترقی کرنا شروع کی۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ پاکستان میں بہتر غزل کہی جا رہی ہے۔ یہ تقابل قبل از وقت ہے۔ ہمارے یہاں شاذ تمکنت اور وحید اختر اچھی غزل کہہ رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے اس رجحان کی ایک وجہ آزادیٔ اظہار کا مسئلہ بھی ہے۔ میں اسے نہیں مانتا اس لیے کہ بہتے ہوئے دریا پر بند نہیں باندھا جا سکتا اور باندھ دیا جائے تو دریا اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے۔

سردار جعفری نے ادب میں ہیئت اور مواد کے تجربوں کے بارے میں بتایا کہ پاک و ہند جس دور سے گزر رہے ہیں وہ دور ہے ترقی کا اور نشاۃ الثانیہ کا۔ یورپ جس دور سے گزر رہا ہے وہ انحطاط کا دور ہے۔ اس لیے کہ وہاں سامراجی نظام مر رہا ہے اور یہاں انسانی اور جمہوری نظام ابھر رہا ہے تو ہمارا ادب کے بارے میں رویہ ہے وہ یورپ کے رویے سے مختلف ہوگا۔ ٹیکنیک سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں اور سیکھنا چاہیے۔ تجربوں کے نام پر جو لکھا جا رہا ہے اس میں بہت کچھ رطب و یابس کی ذیل میں آتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں سے یقیناً بہتر اور مثالی ادب بھی نکل کر آئے گا۔ •

عظمیٰ ناز

سردار جعفری سے ایک ملاقات

دنیا کی ہر قوم اور تمام عالم کے ہر ملک میں اور ہر زمانے میں شاعری کسی نہ کسی شکل میں ظہور میں آتی رہی ہے تھوڑی سی ردوبدل کے بعد اسے تمام عالم نے اختیار کیا ہوا ہے۔

فی زمانہ اردو شاعری عجیب قسم کے متضاد دور سے گذر رہی ہے ایک جانب شکست وریخت سے دوچار اور نام نہاد تجربوں میں گرفتار ہے تو دوسری جانب بدلتے ہوئے زمانے کی زندہ قدروں کے ساتھ برسرپیکار، ایک طرف نت نئے اسلوب، مہمل بے اثر اور مردہ خیالات تو دوسری طرف صحت مند فکر انگیز خیالات کے ساتھ تر و تازہ شگفتہ اور زندہ۔

انہیں زندہ لوگوں میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ بھی آتا ہے جو ممتاز ہستیوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے جو زندگی سے پیار کرتا ہے حقیقت آشنا ہے، ذات اور کائنات کے الجھے ہوئے بے پناہ مسائل پر سوچتا اور دکھ اٹھاتا ہے اور پھر انہیں جذبوں کو شاعری کی جیتی جاگتی شکل میں پیش کرتا ہے۔ ایسی ہی متاثر کن ہمہ گیر اور متحیر شخصیت کے مالک علی سردار جعفری ہیں جو ہر بڑے شاعر کی طرح حیات و کائنات کا ایک وجدان رکھتے ہیں۔ لوگ ان سے واقف بھی ہیں اور لوگ ان کو تسلیم بھی کرتے ہیں۔

ادب اور شاعری کے بارے میں اکثر یہ کہا گیا ہے کہ وہ ایک مخصوص قسم کی سچائی، بصیرت اور دانائی کا حامل کرتی ہے۔ یہ بڑی حد تک درست ہے۔ ہر بڑے شاعر کے ہاں ہمیں ایک فکری میلان جستجو اور ایک ماورائی امنگ اور بصیرت کے نقوش ملتے ہیں جو اس کے شاعرانہ تجربے میں مخلوط ہوتے ہیں۔ یہی تاثر ہمارے اندر علی سردار جعفری کی شاعری پڑھنے کے دوران ہوتا ہے ان سے میرا پہلا سوال ظاہر ہے شاعری کے بارے میں ہی تھا۔

س ــ اچھی شاعری کے لیے کن باتوں کا خیال رکھا جانا چاہیئے؟ یعنی سچے شعر کو کس طرح سامنے لایا جائے اور قاری کے دل میں سچے شعر کی لگن کس طرح پیدا کی جائے؟۔

ج ــ اچھی شاعری کا کوئی ایسا فارمولا نہیں ہے جو بیان کر دیا جائے کیوں کہ شاعری نہ محض ایک بیان ہے نہ محض نقالی اور نقش گری اور نہ ہی ایک طرح کا ڈیزائن ہے۔ شعر کی اپنی ایک منطق ہوتی ہے اپنا ایک مخصوص اور منفرد محاورہ ہوتا ہے اپنی ایک الگ کائنات ہوتی ہے۔

شاعر کے مزاج کو سمجھنا اور زبان کا مزاج پہچاننا ایک دن کا کام نہیں ہے جتنا مطالعہ وسیع ہوتا جائے گا اس کی شاعری نکھرتی

عظمیٰ ناز

تسے گی۔ اس کے دو تجربے ہوتے ہیں۔ ایک پہلا زندگی کا براہِ راست تجربہ، دوسرا تجربہ شعر و ادب کو پڑھنے، سمجھنے اور سننے کے بعد حاصل ہوتا ہے جو کتابوں کے ذریعے ہوتے ہیں۔ یہ مزاج دانی بہت ضروری ہے۔

شاعری ایک جمالیاتی حقیقت بھی ہے اور بعض انسانی اقدار اور تجربے کے نت نئے پہلوؤں کا انعکاس بھی پیش کرتی ہے۔

اچھی شاعری کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر اپنے عہد کے مسائل سے بخوبی واقفیت رکھتا ہو کیوں کہ ان سے بے نیاز ہو کر کوئی شاعری نہیں کی جا سکتی۔ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عہد کے انسانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سن سکے محسوس کر سکے اور ان سے بات ان کی زبان میں کر سکے۔ وہی زبان جو عوام بولتے ہیں۔ شاعر جب ان کے مسائل کو تخلیقی شکل دیتا ہے تو اس تخلیقی کیفیت کے سہارے ان کے شعری پیکر بن جاتے ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے آجاتے ہیں۔ یہ جتنے سلیس اور عام فہم ہو سکتے ہیں اتنے ہی زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ شعر کی سچائی خود بخود سامنے آجاتی ہے۔ شاعر کائنات کے سمندر کا ایک قطرہ ہے جو اپنے اندر اس سمندر کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ سب چیزیں جن سے مل کر اچھی شاعری بنتی ہے۔ یہ سارا مواد ہے اور اس کو تخلیقی پیکر شاعر جو پیدا کرتا ہے اور اس میں اپنی ذات کا اضافہ کر دیتا ہے اور ذات کا یہ اضافہ ہی شاعری کو بہتر اور کمتر بناتا ہے اور شاعری کو خوب صورت بناتا ہے۔ کمزور تخلیق کے شاعر کا شعر کمتر ہو جائے گا اور بہتر شاعر کا شعر بہتر اور خوب صورت ہوگا اور جو بنیادی جذبات ہیں وہ گنے ہوئے نو جذبات ہیں۔ اس کو ہندوستان میں "نو رس" کہا جاتا ہے۔

نفرت، محبت، غصہ، شجاعت، رحم وغیرہ اور ساری شاعری انہیں جذبات میں ہوتی ہے۔ جیسے چھبیس (۲۶) حروف آتے ہیں۔ اس میں اوڈی یا بائبل لکھی ہوئی ہے یعنی انہیں چھبیس حروف پر مشتمل ہے۔ شاعری بھی انہیں نو جذبات کے پس منظر اور پیش منظر سے بنتی ہے۔ کبھی اور لکھی جاتی ہے۔

سچے شعر کی لگن قاری کے دل میں کیسے پیدا کی جائے۔ اس سوال کا جواب یہی ہے کہ شاید وقت نے اپنا روپ اور مزاج بدل لیا ہے۔ ورنہ وہی بات جو حافظ نے کہی ہے، غالب اور اقبال نے کہی ہے اور وہی بات آج کا شاعر بھی کہتا ہے لیکن وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔

س:۔ "نئی زندگی میں شاعر اور سماج کے رشتے کی کیا نوعیت ہوتی ہے؟

ج:۔ شاعر دراصل معاشرے کا ضمیر ہوتا ہے اور ان ساری کیفیات کو جو سارا معاشرہ دیکھتا ہے ان کو لفظوں کے پیکر دے کر ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے جیسے غالب نے کہا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دوسری چیز یہ کہ شاعر احساسِ جمال کو عام کرتا ہے اور اس طرح اپنے معاشرے کو زبان بنانے میں مدد دیتا ہے وہ معاشرے کے لئے سف خیر کی حیثیت رکھتا ہے پھر اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کار دنیا سے، زندگی کی سخت جدوجہد سے، محنت و مشقت سے تھک جانے کے بعد روحانی سکون اور بالیدگی کے لئے شاعری ضروری ہے اور اس عمل میں شاعر نیکی اور بدی میں تمیز کرتا ہے، خواہ وہ ذاتی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا غیر سیاسی، اور اسی طرح انسانوں کو جینے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ معاشرے سے الگ ہو کر اور بے نیاز ہو کر وہ شاعری نہیں کر سکتا۔ وہ ایک حد تک معاشرے کا مقروض ہوتا ہے۔ زبان کا خالق نہیں ہوتا وہ اسے معاشرے سے ملتی ہے لیکن وہ زبان کا معمار ہوتا ہے۔

غالب نے کہا

ایک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

غالب کا ہی دوسرا شعر ہے۔

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

ان سب میں ایک بہت ہی لطیف جمالیاتی کیفیت ہے۔ دوسرا پہلو بھی دیکھئے۔

جلے ہیں غیر کیا کیا جب میرے پہلو سے وہ اٹھے
پریشاں باندھ کر جوڑا دوپٹہ اوڑھ کر الٹا

ایک اور پہلو فکری اور فلسفیانہ ہے اور وہ ہے ہمارے صوفیا اکرام کی شاعری۔ اس میں خدا حسن ہے اور انسان عشق وہاں حسن اور عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ شاعری میں وہ جنسی زندگی کی معاملہ بندی سے بالکل الگ اعلیٰ تر سطح پر ہوتا ہے۔ اس کا بہترین اظہار حافظ شیرازی کے یہاں ملے گا اور غالب کے یہاں ملے گا اور اقبال کے یہاں ملے گا۔

فارسی شاعری میں فردوسی کا شاہنامہ، مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی، سعدی کی شاعری، امیر خسرو کی شاعری، اقبال کی بے شمار غزلوں کے اشعار جو کہ انسانی مسائل کو بیان کرتے ہیں، غالب کے بے شمار اشعار انسانی مزاج کو سمجھتے ہیں، ان کو جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔

لیکن ان سب کے باوجود حسن اور عشق کی شاعری میں دل آویزی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس کی اپیل فوری اور بہت تیز ہوتی ہے اس لئے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ہماری شاعری میں صرف حسن اور عشق ہے اور کچھ بھی نہیں۔ لیکن اس سے حقیقت بہت مختلف ہے۔ اصل میں کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ شاعرانہ حسن و عشق کا جو لوور ہے اور انسانی زندگی کے حسن و عشق کا جو لوور ہے یہ مل جاتے ہیں اور اس سے ایک نئی کیفیت یہ پیدا ہوتی ہے کہ دنیا پوری مادی دنیا "حسن" بن جاتی ہے اور انسان عشق بن جاتا ہے اور اس میں ایک پیگانزم شامل ہو جاتی ہے جس میں بڑی افراط ہے۔ غالب کے یہاں اور اس پیگانزم سے غم اور نشاط دونوں کو محسوس کرنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ہمارے یہاں ایک ہزار برس سے فارسی اور اردو شاعری کا بنیادی حصہ بنا ہوا ہے جو یورپ کی شاعری کا بنیادی حصہ نہیں ہے حالاں کہ وہاں بھی حسن اور عشق کے بغیر شاعری گداز اور خوب صورت نہیں ہے۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس محاورے کی زبان، افراط اور بہتات شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ ہمارا معاشرہ صدیوں سے ٹھہرا ہوا معاشرہ ہے۔ جو تغیر اور حالات زمانہ سے اس طرح نہیں گزرا جس طرح سے یورپ کا معاشرہ گزرا ہے ہمارے یہاں غزلوں میں حسن اور عشق بہت ہے۔ لیکن زندگی کے حقائق اس سے الگ ہی بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ اقبال کی غزلوں کے بے شمار اشعار ہیں، جو کہ انسانی، سماجی مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ یہ غزلیں زیادہ تر بال جبریل میں ملیں گی اس کے علاوہ بھی ہمارے یہاں بڑی شاعری ملتی ہے جیسے انیس کے مرثیے، نظیر اکبر آبادی کی نظمیں، غالب کی فارسی مثنویات مثلاً "ابر" "گہربار"

اقبال کی بے شمار نظمیں مثلاً "شمع اور شاعر"، "خضر راہ"، "طلوعِ اسلام" "ساقی نامہ" "مسجد قرطبہ" وغیرہ۔

س :۔ "آزاد شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟"

ج :۔ ہمارے یہاں پابند شاعری زیادہ تر غزل کی نہج پر ہے۔ پورا پورا خیال دو مصرعوں میں ادا ہو جاتا ہے اور اس میں قافیے اور ردیف کی جھنکار بہت مدد دیتی ہے۔ مقبولیت کے لئے بھی اور اثر آفرینی کے لئے بھی۔ آزاد شاعری میں مصرعوں کی تعمیر ایک پورے بند کی تعمیر ہوتی ہے اور خیال پورے چار چار، پانچ پانچ مصرعوں میں مکمل ہوتا ہے اس طرح مسلسل فکر اور خیال کا ارتقاء ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

آزاد شاعری کے اندر ایک اندرونی آہنگ کی ضرورت پڑتی ہے اور شعری تشبیہیں اور پیکر تراشی کی اہمیت بڑھ جاتی ہے مثلاً میری ایک نظم ہے "نیند" جو میں نے جیل میں کہی تھی اس میں رات کا سراپا ہے وہ اس طرح کہ

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی
شب کی شوخ دوشیزہ
خار دار تاروں کو
آہنی حصاروں کو،
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے دامن میں
جنگلوں کی خوشبو اور
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے
نیل گوں جواں سینہ
نیل گوں جواں بانہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیاہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں

اور زمین کے ہونٹوں پہ

نرم شبنمی بوسے

موتیے کے دانتوں سے

کھلکھلا کے ہنستے ہیں

غزل کے شعر یا مصرعوں کے شعر کہنے کا جو طریقہ ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے اس میں خاص طور سے اختر الایمان کی نظمیں ن۔م۔ راشد اور فیض کی آخر زمانے کی آزاد نظمیں قابلِ ذکر ہیں ان سب میں ہر ایک شاعر کی اپنی انفرادی حیثیت میں تخلیقی صلاحیت ہے اور ہر ایک الگ الگ پہچانا جاتا ہے

اس میں بڑی خوب صورت نظم فیض کی ہے ،

"انتظار"

یہ رات اس درد کا شجر ہے

جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں میں

لاکھوں مشعل بکیف ستاروں کے

کارواں تھک کے سو گئے ہیں

ہزار مہتاب اس کے سائے میں

اپنا سب نور رہ گئے ہیں

اس میں غزل کی تعبیر سے کتنا مختلف رنگ ہے اس اعتبار سے آزاد نظم کہنا زیادہ مشکل کام ہے ، کیوں کہ ہماری ادبی تاریخ میں اس کی کوئی روایت نہیں ہے ۔ آج کے شعراء اس نئی روایت کی تخلیق کر رہے ہیں جو مستقبل کی امانت ہے ۔

س ۔ نظم یا غزل کہتے وقت کوئی خاص منصوبہ تو نہیں بنانا پڑتا ۔ ؟

ج :۔ منصوبہ تو نہیں بنانا پڑتا ہاں ایک خیال سا آتا ہے ۔ نظم اپنا پر تو خود بناتی ہے ۔ خود تلاش کرتی ہے ملاں کہ اندر ہی اندر خود بنتی رہتی ہے ۔ یہ بات آئن اسٹائن نے کہی ہے کہ الہام پیغمبر کو بھی ہوتا ہے ، شاعر اور سائنسداں کو بھی ہوتا ہے ۔ لیکن ہر الہام کی شدت مختلف ہوتی ہے ۔ پیغمبر کا الہام شدید تر ہوتا ہے ۔ شاعرانہ خیال یا الہام جتنا شدید ہوگا استعارہ اور علامت کا حسن اتنا ہی زیادہ ہوگا ۔ اس کو غالب نے نوائے سروش کہا ہے

یہ علم اب تک کسی کو بھی نہیں ، بڑے بڑے شاعر اور ماہر نفسیات کو بھی نہیں کہ تخلیق شعر کا کارخانہ اندرون ذات کس طرح کام کرتا ہے ۔ شعور اور احساس میں وہ کیفیاتی تبدیلی کس طرح ہوتی ہے جس کو شاعرانہ الہام کہتے ہیں ۔ کوئی شاعر تخلیقِ شعر کے آخری لمحے تک اس سے واقف نہیں ہوتا کہ کس طرح کا مصرعہ کن الفاظ اور کن استعاروں کے پیرہن میں نازل ہو رہا ہے ، اور جب وہ ذہن سے ، دل سے ، زبان اور کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرتناک مسرت کے ساتھ اس کو بار بار پڑھنے کو

جی چاہتا ہے، کسی عظیم تخلیق کے دوران شدید لمحے اور کرب ایک کے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔ طویل نظموں میں یہ زیادہ ہوتا ہے

س :۔ استعارے اور علامت کا ظہور تخلیق شعر میں کس طرح ہوتا ہے کیا اس میں شعوری کوشش کا دخل ہوتا ہے یا غیر شعوری طور پر ایسا ہوتا ہے؟

ج :۔ تمام تشبیہیں، استعارے اور علامتیں حسنِ معنی سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے لفظ اور مفہوم، صورت اور معنی ایک ہو جاتے ہیں میں اس کی مثال خود اپنے استعارے سے دے رہا ہوں معذرت کے ساتھ کیونکہ میں کسی دوسرے شاعر کے شعری عمل کے بارے میں اس یقین اور وثوق سے بات نہیں کر سکتا ہوں۔

میری ایک نظم ہے "میرا سفر"

جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

اپنے اشعار میں میں نے ندیوں کو "سنہری" کہا ہے۔ میرے کچھ پڑھنے والوں کا اعتراض یہ تھا کہ ندیوں کا رنگ سفید ہوتا ہے شعر فہمی کے لئے فطری ذہانت کافی نہیں ہوتی، زبان کا علم بھی کافی نہیں ہوتا، یہ راز صرف شعری تربیت سے کھلتا ہے کہ لفظ علامت کی شکل کیسے اختیار کرتا ہے "سنہری" رنگ دراصل زندگی، روشنی اور ابدیت کی علامت ہے، جو صدیوں سے مختلف زبانوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ میں نے اپنی نظم "میرا سفر" میں بھی یہ لفظ علامتی طور پر استعمال کیا ہے۔ میری نظم کا موضوع بظاہر "موت" ہے لیکن اصل موضوع "زندگی" ہے۔ ندی وقت اور زندگی دونوں کی علامت ہے اس نظم کے سیاق و سباق میں خزاں کے زرد پتے جو آنے والی نسلوں کے جواں قدموں کے نیچے ہیں رہے ہیں۔ تجدیدِ بہار کی علامت ہیں اور آکاش کی جھیلوں کا نیلا رنگ روحانیت اور ابدیت کی علامت ہے ان دونوں کی مناسبت نے سفید پانی کو سنہری بنا دیا ہے۔ زرد پتوں نے رنگ کی مناسبت سے اور آکاش کی نیلی جھیلوں نے اپنی معصومیت کے اعتبار سے، اس طرح سلطانہ کے لفظ کے شاہانہ کردار نے بھی اثر ڈالا ہے۔ سنہری رنگ کا انتخاب شعوری

عظمیٰ : ـ طور سے نہیں کر گیا۔ شعر کے تخلیقی عمل کی طلسماتی کیفیات کے زیر اثر الفاظ خود بخود آتے ہیں اور لغوی معنیٰ سے گذر کر علامتی معنوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ عمل میری ذاتی خصوصیت نہیں ہے ہر شاعر اسی قسم کے تخلیقی، طلسماتی اور پراسرار روحانی عمل سے گذرتا ہے۔ اقبال کی شاعری میں لالے کے پھول کو علامت کے طور پر بار بار استعمال کیا گیا ہے، سرو صنوبر کے ساتھ قمری ہے گلاب کے ساتھ بلبل ہے۔ لیکن لالے کا پھول تنہا ہے اگر کوئی اس کے ساتھ رہے تو انسان لالہ کی طرح تنہا اور لالے کی طرح جذبہ یکتائی سے سرشار ہو۔ دلوں کو اقبال نے شعلہ سینہ کہا ہے۔ شعر کی آرائش باہر سے نہیں کی جا سکتی۔ تمام تشبیہیں، استعارے، علامتیں حسن معنی سے پیدا ہوتی ہیں۔

س : ـ "غزل میں یکسانیت کیوں پائی جاتی ہے ــــ؟"

ج : ـ غزل ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق عاشقانہ ماحول سے مدتوں رہا ہے جس کی وجہ سے اس کے مزاج کو ڈھانچہ تبدیل کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔

س : ـ "آپ اپنے معاصرین میں کن کن کو پسند کرتے ہیں ــ؟"

ج : ـ ہم عصر شعرا سب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں ایسا ہمیشہ، ہر زبان میں، ہر ملک میں، ہر قوم میں ہوتا آیا ہے۔

س : ـ آج کے انسان پر یہ الزام ہے کہ وہ کئی چہرے اپنے پاس رکھتا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ بات درست ہے؟

ج : ـ یہ آج کی بات نہیں ہے ایسا تو ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے اس زمانے میں اس کا چرچا زیادہ کیا گیا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ جدیدیت کے بنیادی موضوع میں یہ بات کہہ دی گئی ہے۔

انسان کی ماہیت میں اتنی تہہ داریاں ہیں جس کا پتہ غالب کے ایک شعر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

کوئی آگاہ نہیں باطن یک دیگر سے
ہے ہر ایک شخص جہاں میں ورق ناخواندہ

غالب نے جو بات کہی ہے وہ انسان کی بے انتہا وسعت کی بات ہے۔ انسان میں کتنی گہرائیاں ہیں۔ انسان کا ذہن محدود ہے اور کائنات لامحدود ہے اور وہ اسے حدود میں نہیں لا سکتا۔ لیکن انسان کے ذہن کو آپ ایک حصہ غور کریں تو وہ لامحدود ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ "ہر شخص جہاں میں ورق ناخواندہ" تو وہ اجتماعی، انفرادی بات کر رہا ہے اور آج جو ایک بات پھیلا دی گئی ہے اس کا مطلب ہے کہ انسان بنیادی طور پر انجان ہے وہ اپنے آپ کو چھپاتا ہے جب کہ غالب یہ کہہ کر اپنے آپ کو نہیں چھپاتا۔ اب اسی کے ساتھ اس کو محسوس کیجئے انسان کی شخصیت کی تعمیر جو ہوتی ہے اس میں کتنے عناصر کام کرتے ہیں اس کا خاندان، اس کا معاشرہ، اس کی تعلیم یہ سب زندگی میں مسلسل آتے جاتے ہیں اس کی تعمیر ہوتی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں بیس سال پہلے یہ آدمی ایسا تھا اب بدل گیا ہے۔ بچوں کو کہا جاتا ہے کہ بڑا شریر تھا اب بڑا ہو کر اچھا بن گیا۔ بعض لوگ جوانی میں تیز طرار ہوتے ہیں پھر سنجیدگی اور بردباری جگہ لے لیتی ہے۔ وہ چہرہ نہیں بدلتا اصل میں تعمیر کے عمل سے گذرتا ہے۔

جس سے وہ زبان کو نئی نئی شکلیں اور نئے نئے حسن سے آگاہ کرتا ہے اور اس سے ایک نئی جمالیاتی تسکین عطا کرتا ہے اسی طرح حسن اس کے دل کے اندر سے نہیں پیدا ہوتا وہ اسے پھولوں کی طرح چنتا ہے اور بکھرے گلدستے بنا دیتا ہے۔

س:۔ پرانے شعراء پر زیادہ ذمہ داریاں تھیں یا آج کے شعراء پر؟

ج:۔ پرانے شعراء محدود معاشرے میں رہتے تھے جن کا صرف اپنا محدود شدہ تھا اس لئے کہ نشر و اشاعت اور آمد و رفت اتنے ترقی یافتہ نہیں تھے جتنے آج ہیں اس لئے آج کے شاعر پر صرف اپنے معاشرے کی نہیں بلکہ پوری عالم انسانیت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جس کی وجہ سے ان کا فریضہ زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ مسائل زیادہ پیدا ہو گئے ہیں، تخلیق ادب اور شعر زیادہ دشوار ہو گئے ہیں۔

س:۔ "ہماری شاعری میں روز اول سے صرف حسن اور عشق کو موضوع کیوں بنایا گیا ہے۔" انسانی زندگی صرف حسن، عشق تک تو محدود نہیں، حیات و کائنات کے مسائل بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے جیسا کہ فیض نے کہا ہے۔

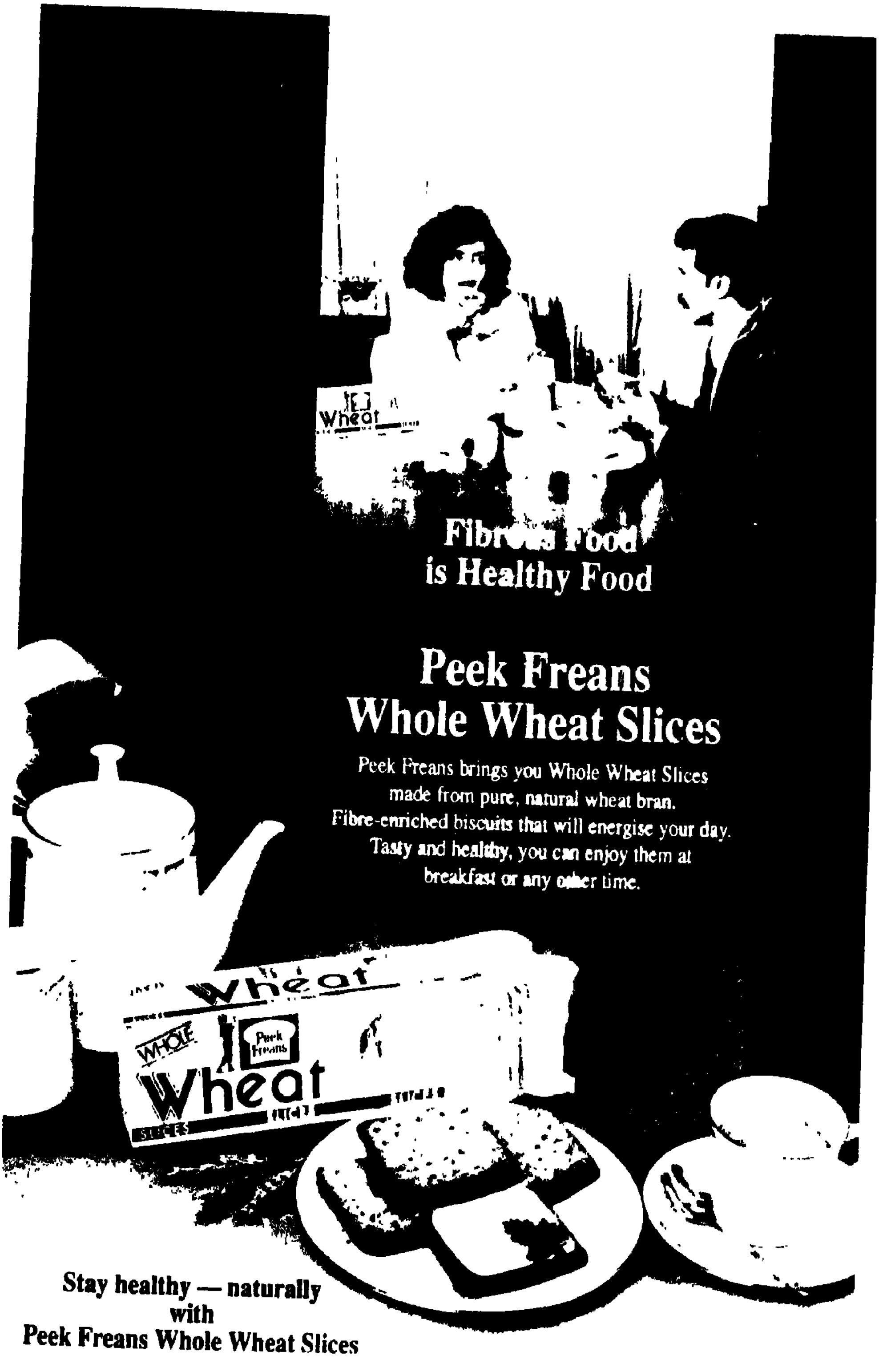
"اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

ج:۔ آپ درست کہتی ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حسن اور عشق انسانی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس میں زندگی کی بقا بھی وابستہ ہے اور اس میں انسان کا ذوق اور اس کی انسانیت بھی وابستہ ہے۔ جانوروں کے پاس جمالیات کا وہ ذوق نہیں جو انسان کے پاس ہے حالاں کہ وہ بھی خوب صورتی اور بدصورتی میں تمیز کرتا ہے مگر اس میں لطافت اور تہہ داریاں نہیں ہوتیں۔ یہ ایک بنیادی انسانی حقیقت ہے۔

حسن اور عشق اور کئی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ شاعری کی ایرانی روایت میں "گلاب" کا پھول حسن ہے اور بلبل عشق، محبوب باغ کی صفات سے آراستہ ہے اور عاشق بلبل کے دل کی بے تابی اور اس کے نغمہ و فریاد کا پیکر، پھول میں جو حسن ہے۔ مکمل ایک شانِ بے نیازی اور مکمل سکوت! اور بلبل میں انداز نیاز مندی ہے اور مسلسل ترنم، یہاں لذت وصل خواب و خیال ہے اور لذت فراق حقیقت، فراق جو طلب اور آرزو کو زندہ رکھتا ہے۔ نغمہ کو سوز عطا کرتا ہے، عشق کو یکتائی بخشتا ہے۔ صوفیہ کے یہاں گلاب کا پھول خدا کے حسن کامل کا مظہر ہے، خدا حسن ہے اور انسان عشق ہے!

کسی کا حسن زیادہ لطیف ہوتا ہے اور کسی کا احساس عشق بھی زیادہ لطیف ہوتا ہے اور کسی کا احساس عشق فحش حد تک کو چھو لیتا ہے اور احساس حسن بھی کند ہو جاتا ہے۔ یہ سب ہماری شاعری میں مل جائے گا۔ یہ ایک بنیادی انسانی حقیقت ہے جس طرح بائبل میں کہا گیا ہے کہ انسان صرف روٹی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح حسن اور عشق پر بھی زندہ نہیں رہا جا سکتا۔ حتیٰ کہ انسان اس کے بغیر "مہذب" زندگی بھی نہیں گزار سکتا اس حیثیت اور اس کو تہذیبی سطح دینے میں ایک اخلاقی توازن بڑا ضروری ہے۔ اب اس میں اچھی اور کمزور مثالیں بڑے اور چھوٹے شعراء کے یہاں ملتی ہیں، مثلاً میر کا شعر لیجئے۔

تازگی اس کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے


Wheat
is Healthy Food
Peek Freans
Whole Wheat Slices
Peek Freans brings you Whole Wheat Slices
made from pure, natural wheat bran.
Fibre-enriched biscuits that will energise your day.
Tasty and healthy, you can enjoy them at
breakfast or any other time.
Wheat
WHOLE
Peek Freans
Wheat
SLICES
Stay healthy — naturally
with
Peek Freans Whole Wheat Slices

MNJ

شخصیت کے خد و خال

سبط حسن

سردار جعفری چند یادیں

ادیب، خطیب، شاعر، افسانہ نویس، ڈرامانگار، نقاد، فلم ساز اور بہر ہمارے دوست علی سردار جعفری سلامت رہیں۔ اُن کے فن پر تبصرہ کرنے کی صلاحیت تو مجھ میں نہیں ہے البتہ جو شب و روز ہم نے کبھی سردار کی سنگت میں گزارے تھے اُن کی یادوں کے چراغ ذہن کے اُفق پر کہکشاں کی مانند ہنوز روشن ہیں۔ یادش بخیر وہ بھی کیا دن تھے اور کتنے خوش قسمت ہیں ہم لوگ جنہوں نے اُس تاریخ ساز دَور کے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے، اُس دَور کی سرگرمیوں میں شریک ہوئے اور اُن سے کسب فیض کیا۔ اُن دنوں یوں محسوس ہوتا تھا گویا نئی دنیا اور نیا آدم بنانے کی اُمنگ نئے سرے سے جوان ہوئی ہے۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ کا یہ زمانہ ہر چند کہ بہت مختصر تھا لیکن اُس نے ہم کو ایک نیا ذہن، ایک نیا آہنگ فکر و نظر، ایک نیا جمالیاتی ذوق اور تجربات اور احساسات کو فنی سانچوں میں ڈھالنے کا نیا سلیقہ عطا کیا۔ وہ ایک ایسا موڑ تھا جہاں سے ہمارے ادب نے، رقص و موسیقی نے، گیت گانوں، فلموں اور تصویروں نے نئے سفر کا آغاز کیا۔

سردار جعفری اُسی مردم خیز عہد کی پیداوار ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بانیوں ہی میں نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے اپنی ریاضتوں سے ترقی پسند ادب کے معیار کو بلند کیا ہے۔ اُس میں نئے معنی اور نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔

سردار جعفری سے ہماری خط و کتابت اُس وقت سے ہے جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی سے نکالے جانے کے بعد اینگلو عربک کالج دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ یہ درس گاہ ابتدا میں روائتی طرز کا ایک مدرسہ تھی جس کو ۱۷۹۲ء میں نظام الملک آصف جاہ کے بیٹے نواب غازی الدین حیدر نے قائم کیا تھا۔ دہلی میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ہوا تو ۱۸۲۵ء میں مدرسے کو کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ وہی تاریخی کالج ہے جس میں اب سے ڈیڑھ سو سال پیشتر طلبا کو مغربی علوم پہلی بار اُردو زبان میں پڑھانے کی طرح ڈالی گئی۔ اس کالج سے اُردو کے بڑے بڑے نامور ادیب وابستہ رہ چکے ہیں۔

ے کراچی پریس کلب میں سردار جعفری کی سترویں سالگرہ کے موقع پر راقم الحروف نے "سردار جعفری نمبر" کا اعلان کیا تھا۔ اس اعلان کے کچھ عرصے بعد سبطے بھائی نے اپنے دیرینہ رفیق پر مضمون لکھ کر مجھے عطا کیا .. افسوس کہ جب یہ نمبر شائع ہو رہا ہے سبطے بھائی ہم میں نہیں لیکن ان کی محبت کے نقوش ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔
صہبا

شیخ امام بخش صہبائی، ماسٹر رام چندر، غالب کے دوست ماسٹر پیارے لال، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد، اور میر ناصر علی اڈیٹر صلائے عام سب نے اس دارالعلوم سے فیض حاصل کیا ہے۔ موجودہ دور میں اس کے سپوت فرزند علی سردار جعفری اور معین احسن جذبی ہیں۔

سردار جعفری سے ہماری پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ میں دکن سے وطن جاتے وقت لکھنؤ میں رکا اور اپنے پرانے دوست اسرار الحق مجاز سے ملنے گیا تو وہ کسی مشاعرے میں شرکت کی غرض سے الہ آباد جا رہے تھے۔ کہنے لگے تم بھی کیوں نہیں چلتے۔ بنے بھائی (سجاد ظہیر) اور ڈاکٹر اشرف تم کو اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔ الہ آباد میں اُن دنوں پنڈت جواہر لال نہرو کی وجہ سے بائیں بازو کے سبھی چوٹی کے دانشوروں کا جمگھٹا تھا۔ ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر زیڈ۔ اے احمد، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، اور سجاد ظہیر سب وہیں براجمان تھے۔ مجاز نے بتایا کہ سردار جعفری بھی مشاعرے کے لیے الہ آباد گئے ہوئے ہیں۔ اُن کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ سردار جعفری لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مجاز کے ساتھ مل کر کتابیں شائع کر رہے ہیں۔ چنانچہ مجاز کا مجموعہ "آہنگ"، سردار جعفری کی کہانیوں کا مجموعہ "منزل" اور حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ "انوکھی مصیبت" چھاپ چکے ہیں۔ میں نے سردار کی چند نظمیں تو پڑھی تھیں لیکن اُس وقت تک یہ خبر نہ تھی کہ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔

الہ آباد میں ہم ڈاکٹر اشرف کے ساتھ ٹھہرے۔ رات کے وقت تو خیر ڈاکٹر اشرف سے باتیں ہوتی رہیں البتہ صبح نو بجے کے قریب مجاز اور میں سردار جعفری کی تلاش میں نکلے۔ مجاز کو بس اتنا پتہ تھا کہ سردار مسلم بورڈنگ ہاؤس میں اپنے کسی دوست کے ساتھ مقیم ہیں۔ اُن صاحب سے مل کر سردار کے بارے میں پوچھا تو اُنہوں نے برآمدے میں بچھی ہوئی ایک چارپائی کی طرف اشارہ کر دیا جس پر کوئی شخص سبز رنگ کی شالی چادر تانے سو رہا تھا۔ حالانکہ اُس وقت دن کے دس بجے تھے۔ مجاز نے سرہانے کھڑے ہو کر کئی بار پکارا تب چادر میں جنبش ہوئی اور سردار نے سر باہر نکالا ـــ یہ تھی سردار جعفری سے ہماری پہلی مڈبھیڑ۔

اُنہوں نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا نکالی، ہم لوگوں کی طرف بڑھائی، اپنی سگریٹ جلائی اور کش پر کش لینے لگے۔ اِدھر میں حیران کہ یہ کس قماش کا انسان ہے جو منہ ہاتھ دھوئے بغیر خالی پیٹ سگریٹ پی رہا ہے سردار بولتے جا رہے تھے اور میں اُن کی صورت دیکھتا ہاں، نہیں میں جواب دے رہا تھا۔ دراصل اُن کی انوکھی شخصیت نے مجھ کو مبہوت کر دیا تھا۔ گندمی رنگ بھرا بھرا کتابی چہرہ، سر پر ریشم کے سے ملائم بالوں کا ڈھیر، انگلیوں کا رنگ تمباکو نوشی کی کثرت سے سیاہی مائل زرد، آنکھیں منگولوں کی سی غلافی مگر بڑی بڑی اور اُن میں چمک ایسی گویا دیے روشن ہوں اور پھر اُن کی گرج دار آواز جس میں بلا کی خود اعتمادی تھی ـــ مجاز جتنے کم سخن بلکہ شرمیلے تھے۔ سردار جعفری اتنے ہی تیز طرار اور جلد بے تکلف ہو جانے والے۔ وہ بولتے تو یوں محسوس ہوتا گویا جلسۂ عام میں تقریر کر رہے ہوں۔

رات کے وقت یونیورسٹی میں مشاعرہ تھا۔ وہاں سردار جعفری نے اپنی نظم بغاوت بڑے گھن گرج سے پڑھی اُن دنوں وہ شعر ترنم سے پڑھتے تھے، ترنم کیا لٹھ گھماتے تھے۔ مگر اُن کی پاٹ دار آواز سے ہال کے در و دیوار لرز رہے

تھے۔ نظم طلبا کی ذہنی کیفیت کے عین مطابق تھی لہٰذا شاعر کو ہر شعر پر بھرپور داد مل رہی تھی۔

سردار نے مجھ کو دو ہی دن میں لکھنؤ کی سیاسی اور ادبی زندگی کے تمام خشک و رنگیں پہلوؤں سے آگاہ کر دیا۔ کون وزیر کتنا با اثر ہے۔ کس لیڈر کے خیالات ترقی پسندانہ ہیں۔ کون جماعت کتنی سرگرم عمل ہے۔ ادبی ماحول کیا ہے، ادیبوں کا کیا حال ہے۔ دانشور کیا سوچ رہے ہیں۔ طلبا کی تحریک کس سمت جا رہی ہے۔ لالہ رخانِ لکھنؤ کی بزمِ جمال کہاں کہاں آراستہ ہوتی ہے اور اُن میں کن کن احباب کو باریابی کا شرف حاصل ہے اور یہ ساری داستان سنانے کے بعد سردار نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ لکھنؤ کیوں نہیں آ جاتے بلکہ کہا تو یہ کہ تم لکھنؤ کب منتقل ہو رہے ہو۔ گویا انہوں نے اپنی جگہ طے کر لیا تھا کہ مجھ کو لکھنؤ بہر صورت آنا ہی ہے۔

دوسری جنگِ عظیم سر پر کھڑی تھی جس وقت مجاز، سردار جعفری اور میں نے مل کر ماہنامہ "نیا ادب" اور ہفت روزہ "پرچم" لکھنؤ سے جاری کیا۔ اسپین میں جمہوریت کا پرچم سرنگوں ہو چکا تھا۔ جنرل فرانکو نے ہٹلر اور مسولینی کی فوجی مدد سے اپنی فاشسٹ حکومت قایم کر لی تھی۔ برطانیہ اور فرانس کی فاشسٹ نواز حکومتوں نے چیکوسلواکیہ کو ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا اور ہم مغربی طاقتوں کی کوشش تھی کہ نازی لیڈروں کا رُخ کسی صورت سوویت یونین کی جانب پھیر دیا جائے۔ انھیں دنوں کسی رسالے میں ایک جمہوریت پسند مجاہد خاتون کی تصویر چھپی —— شانوں پر بکھرے ہوئے بال، جسم پر فوجی وردی، ہاتھ میں رائفل، چہرے پر عزم و جلال کی چھوٹیں اور تیور ایسے کہ شیر افگنوں کے دل دہل جائیں۔ سردار جعفری کو یہ تصویر اتنی اچھی لگی کہ انہوں نے بڑی سائز پر اس کا فوٹو بنوایا اور فریم کروا کر "نیا ادب" کے دفتر میں لگا دیا۔ جو آتا تصویر کی تعریف کرتا البتہ ایک دن قبلہ رندانِ جہاں جوشؔ صاحب تشریف لائے تو انہوں نے تصویر کو اپنے ہاتھ سے اُلٹ دیا۔ اور فرمایا صاحبو! عورت کی یہ سپاہیانہ سج دھج مجھ کو ہرگز گوارا نہیں —— وہ تو پیار و محبت کا سرچشمہ ہے وردی پہن کر تلوار بندوق چلانا اُس کا منصب نہیں، سردار نے جوشؔ صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر بے سود —— یہ تصویر ممبئی میں بھی سردار کے پاس تھی۔ معلوم نہیں اب اُن کے کمرے کی زینت ہے یا نہیں —

نیا ادب انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان تھا۔ اس مختصر سے رسالے نے جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، مجنوںؔ گورکھپوری، منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، احتشام حسین، خواجہ احمد عباس غرضیکہ سبھی ترقی پسند ادیبوں نے اس پرچے کو اپنی تحریروں سے نوازا۔ منشی پریم چند کا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا خطبۂ صدارت، اُن کی مشہور کہانی "کفن" اور سجاد ظہیر کے نام اُن کے خطوط پہلی بار "نیا ادب" ہی میں چھپے۔ منٹو کی کہانی "نیا قانون" بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی — ایک روز الہ آباد سے ایک کہانی موصول ہوئی جس کا عنوان تھا "پھسلن" —— موضوع ہم جنس تجربے تھے اور مصنف تھے محمد حسن عسکری۔ ہم لوگ کئی ہفتے اس شش و پنج میں رہے کہ کہانی کو چھاپیں یا نہ چھاپیں۔ بات یہ تھی کہ اُن دنوں قدامت پرست ادیب اور انگریزی سرکار کے گماشتے دونوں پنجے جھاڑ کر ترقی پسند ادیبوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور اُن پر فحش نگاری اور عریاں نویسی کی تہمتیں دھر رہے

تھے۔ لہٰذا ہم لوگ ہچکچا رہے تھے کہ مبادا دشمنوں کو نیا حربہ ہاتھ آجائے۔ مگر ایک دن سردار جعفری نے مشہور انگریز ناولسٹ ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا ایک مضمون دکھایا جس میں لارنس نے فحاشی پر سیر حاصل تبصرہ کیا تھا۔ لارنس کا کہنا تھا کہ جنسی تجربوں کا تذکرہ یا جنسی واردات سے لذت یابی کا اظہار ہرگز فحاشی نہیں ہے بشرطیکہ اس تذکرے سے جنس (عورت) کی تضحیک اور توہین مقصود نہ ہو یا مرد کی فتح و کامرانی کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ یہ سند ملی تو کہانی شائع کر دی گئی مگر کسی جانب سے احتجاج یا اعتراض کی آواز نہ اٹھی۔

محمد حسن عسکری نے اس کہانی کے بعد اپنی ادبی زندگی میں کئی روپ بدلے کبھی ترقی پسندوں کی حمایت کی اور کبھی شدت سے مخالفت، کبھی روشن خیال بنے اور کبھی روشن خیالی کا جانی دشمن اور آخر عمر میں تو یہاں تک بہک گئے تھے کہ مغرب نے علوم و فنون میں ارسطو سے لے کر آج تک جتنی ترقی کی ہے سب کو ہمارے لیے زہر ہلاہل اور گمراہ کن تصور کرنے لگے اور مولوی اشرف علی تھانوی مصنف "بہشتی زیور" کے مرید ہو گئے۔

حضرت جوش ملیح آبادی کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" "نیا ادب" ہی میں شائع ہوئی تھی۔ وہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا اور انگریزی فوجیں ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں یہ نظم چھپی تو ایوانِ اقتدار میں تہلکہ مچ گیا۔ "نیا ادب" کے دفتر کی تلاشی ہوئی اور وہ شمارہ جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی بحکم سرکار ضبط کر لیا گیا۔ مگر بیشتر کاپیاں تو نکل چکی تھیں اور ہر طرف اس نظم کا چرچا تھا لہٰذا اس کی ضبطی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ——— ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی ملک گیر تحریک چلی تو یہ نظم ہزاروں کی تعداد میں غیر قانونی طور پر چھپی اور ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم ہوئی۔

"نیا ادب" کی مجلسِ ادارت میں یوں تو مجاز بھی تھے اور میرا نام بھی شامل تھا مگر پرچے کے روحِ رواں دراصل سردار جعفری تھے۔ انہیں کی لگن اور ان تھک محنت سے یہ پرچہ چلتا تھا۔ لکھائی چھپائی کا بندوبست، کاغذ کی فراہمی، ادیبوں سے خط و کتابت، آمدنی اور خرچ کا حساب سب کا بوجھ انہیں کے کندھوں پر تھا۔

ان کو بحث مباحثے کا بھی بڑا چسکا تھا ——— کالج کے زمانے میں طلبا کے مباحثوں میں انہوں نے بڑے بڑے معرکے سر کیے تھے اور انعام پائے تھے لیکن نہ مجاز اس میدان کے مرد تھے نہ میں۔ مگر شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے۔ ادب ہو یا سیاست یا کوئی اور موضوع ہو کوئی شخص ان سے بازی نہیں لے جا سکتا تھا۔ ایک بزرگ امین سلونوی تھے جو رہتے نظیر آباد میں تھے اور کام کرتے تھے منشی نول کشور کے اودھ اخبار میں۔ بدقسمتی سے ہمارا فلیٹ ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ چنانچہ وہ دفتر جاتے وقت روزانہ صبح صبح آن دھمکتے اور ہم کو اپنا اداریہ سناتے۔ سردار تو دیر تک سونے کے عادی تھے لہٰذا ان کو خبر نہ ہوتی البتہ مجاز اور میں امین سلونوی صاحب کی صحافتی نثر کا شکار ہوتے۔ آخر تنگ آ کر ہم نے سردار سے فریاد کی کہ یار اس موذی سے ہمارا پیچھا چھڑاؤ۔ سردار نے کہا اچھا کل جب وہ آئیں تو مجھ کو جگا دینا خیر صاحب امین سلونوی حسبِ معمول وارد ہوئے تو ہم لوگوں نے مولے کو شہباز کے سپرد کیا۔ سردار نے ان کے اداریے کے وہ بخیے ادھیڑے کہ امین سلونوی نے پھر کبھی ہمارے فلیٹ کا رخ نہیں کیا۔

ایک شام ہم تینوں فرنگی محل جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ ارادہ یہ تھا کہ امین آباد تک پیدل چلیں گے اور وہاں سے ایک ایک آنے میں یکہ کر لیں گے۔ امین آباد پہنچے تو صدیق بک ڈپو کے مالک محمد صدیق صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

صدیق صاحب بڑے مجلسی اور ادب نواز شخص تھے اور کیا مجال جو کوئی اہلِ قلم اُن سے ملے بغیر امین آباد سے گزر جائے۔ وہ ہم لوگوں کو لے کر دکان کے سامنے پارک میں جو بنچ پڑی تھی اُس پر بیٹھ گئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب گفتگو نے رفتہ رفتہ مناظرے کی شکل اختیار کر لی تو مجاز نے مجھ کو اشارہ کیا ہم دونوں چپکے سے اُٹھے، پارک سے نکل کر یکّے پر بیٹھے اور فرنگی محل چل دیے۔ وہاں فرحت اللہ انصاری مرحوم کی مہماں نوازیوں سے شکم سیر ہو کر جب ہم دس بجے رات کے قریب صدیق بُک ڈپو پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بحث بدستور جاری ہے۔ سردار نے بس اتنا پوچھا کہ تم لوگ کہاں چلے گئے تھے۔ مجاز نے بڑی معصومیت سے کہا کہیں نہیں، ذرا پان کھانے۔

سردار جعفری نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔ اُن کی مشقِ سخن بھی جاری رہتی اور سیاسی سرگرمیاں بھی ـــ وہ لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کر رہے تھے ـــ طلبا کی تحریک سے اُن کی آشنائی بہت پرانی تھی۔ اسی گناہِ بے گناہی کے کارن وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نکالے بھی گئے تھے۔ لہٰذا تجدیدِ وفا میں اُن کو دیر نہ لگی۔ انہوں نے اپنی لیاقت اور ذہانت سے یونیورسٹی میں جلد ہی اپنی دھاک بٹھا لی۔ اُن کی ہر دل عزیزی کے بیشتر بلکہ بائیں بازو کے طلبا نے اُن کو یونین کے الکشن میں سکریٹری شپ کے لیے نامزد کیا۔ وہ الکشن کیا جیتے کہ یونین اُن کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی ـــ البتہ نزلہ نیا ادب پر گرا۔ کیونکہ انتظامی صلاحیت نہ مجاز میں تھی نہ مجھ میں نتیجہ یہ ہوا کہ پرچہ ایک مہینے چھپتا تو دو مہینے ناغہ، مگر طلبا کی سرگرمیاں سردار کی شاعری کو بہت راس آئیں۔ وہ نئے جوش اور ولولے سے شعر کہنے لگے۔

اسی اثنا میں سامراجی جنگ کے خلاف شورش نے شدت اختیار کی۔ جلسوں جلوسوں کا موسم آیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ طلبا اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ سردار جعفری کب نچلے بیٹھنے والے تھے چنانچہ ایک تقریر کی پاداش میں گرفتار کر لیے گئے۔ اُس وقت تک امتناعی نظربندیوں کی ریت نہیں پڑی تھی بلکہ سیاسی قیدیوں پر بھی عدالت میں مقدمہ چلتا تھا اور معیّنہ مدت کے لیے سزا دی جاتی تھی۔ سردار کے خلاف فردِ جرم اتنی پھُسپھُسی تھی کہ وہ مقدمہ لڑتے تو یقیناً بری ہو جاتے مگر انہوں نے ملک کی دیرینہ سیاسی روایت کا احترام کرتے ہوئے بھری عدالت میں کہہ دیا کہ ہم نہ اس عدالت کو تسلیم کرتے ہیں نہ اس کے قانون کو لہٰذا صفائی پیش کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اُن کو چھ ماہ قیدِ سخت کی سزا ہو گئی۔ وہ کچھ دن لکھنؤ جیل میں رہے پھر بنارس بھیج دیے گئے۔ نیا ادب نے اپنے اداریے میں یہ کہہ کر دل کا غبار نکالا کہ ـــ

گر کیا ناصح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ شوق کہ انداز چھٹ جائیں گے
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں اسیرانِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا — غالب

سردار رہا ہو کر آئے تو لکھنؤ میں جو جلس انہوں نے جمائی اور جو محفل سجائی تھی وہ درہم برہم ہو چکی تھی۔ سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کی وجہ سے عالمی جنگ کی نوعیت بدل گئی تھی۔ جاپانی فوجیں ملایا، برما کو روندتی ہوئی آسام کی سرحد تک آ پہنچی تھیں بلکہ کلکتہ پر ہوائی بمباری بھی ہو چکی تھی۔ یہ وقت ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا نہ تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں جب گوریلا دستوں

ی مشق شروع ہوئی تو سردار بھی اُس میں شامل ہو گئے اور ریڈیو کے لیے فاشسٹ دشمن ڈرامے اور تقریریں لکھنے لگے۔ انہیں دنوں ریڈیو اسٹیشن میں وہ مشاعرہ ہوا جس کا ذکر سردار جعفری نے اپنی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں کیا ہے۔

فیض احمد فیض سے ہم لوگوں کی پہلی ملاقات اس مشاعرے کے دوران ڈاکٹر رشید جہاں کے مکان پر ہوئی تھی رشیدہ آپا ڈاکٹر ہونے کے علاوہ بڑی تند افسانہ نگار بھی تھیں۔ اُن کے والد شیخ عبداللہ وہ بہادر مصلح قوم تھے جنہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی مہم چلائی اور علی گڑھ میں گرلز کالج قائم کیا حالانکہ سرسید بھی اس کے حق میں نہ تھے۔ رشیدہ آپا کے افسانے "انگارے" میں شائع ہوئے تو تنگ نظر ملاؤں میں ہل چل مچ گئی۔ اُن کو اغوا اور قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں مگر وہ اُن گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والی خاتون نہ تھیں۔ یہ فتنہ مدت گزری فرو ہو چکا تھا۔ بلکہ اب مولوی حضرات اپنی پردہ دار خواتین کے علاج کے لیے اُن کے مطب میں آنے میں بھی کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے۔ اُن کی بیٹھک ترقی پسند ادیبوں اور سیاسی کارکنوں کی کھلی پناہ گاہ تھی۔ چنانچہ ادبی محفلیں بھی اکثر وہیں ہوتی تھیں۔ رشیدہ آپا ہی کی تحریک پر پیپلز تھیٹرز کے نام سے ایک چھوٹی سی ناٹک منڈلی بھی بن گئی تھی۔ اتفاق سے اُدے شنکر تھیٹرز کی مشہور فنکارہ زہرہ بیگم اُن دنوں لکھنؤ ہی میں مقیم تھیں لہٰذا ناٹک کھیلنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ اور منشی پریم چند کی کہانی "کفن" اور رشیدہ آپا کے شوہر صاحبزادہ محمود الظفر کا ڈرامہ "امیری کی بو" سٹیج ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ آپ کو یہ سُن کر شاید حیرت ہو کہ اِن کھیلوں کے ہدایت کار سردار جعفری تھے۔ مکالمے بھی انھیں نے لکھے تھے۔

پھر سردار جعفری کو بمبئی بلا لیا گیا اور وہ کمیونسٹ پارٹی کے کل وقتی کارکن بن کر ہفت روزہ قومی جنگ سے وابستہ ہو گئے۔ تقریباً چھ ماہ بعد میں جب بمبئی پہونچا تو سردار جعفری کی جولانیٔ طبع پورے شباب پر تھی۔ اُن کی بے قرار روح اور بے چین طبیعت کو پہلی بار اظہارِ ذات کے تمام مواقع حاصل ہوئے تھے۔ لہٰذا اُن کی تخلیقی صلاحتیں خوب چمکیں۔ وہ دن بھر پارٹی آفس میں کام کرتے اور رات میں اپنے فاسسٹ دشمن ڈرامے "یہ کس کا خون ہے" کی ریہرسل کرواتے۔ یہ ڈرامہ ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ باٹی کلہ کے ہال میں آٹھ نو روز کھیلا گیا اور بہت مقبول ہوا بالخصوص مزدوروں میں،

مگر پارٹی کی جفاکش زندگی کے باوصف سردار جعفری کی عادتوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بمبئی میں اپنے دوست شاکر علی کے ساتھ رہتے تھے۔ شاکر اُن دنوں جے جے اسکول آف آرٹس میں پڑھتے تھے۔ اُن کا فلیٹ بائی کلہ کی نہایت چلتی سڑک پر واقع تھا جہاں شور و غل سے کان پڑی آواز بھی مشکل سے سنائی دیتی تھی لیکن سردار جعفری پر اس شور و غل کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ لکھنؤ کی طرح یہاں بھی رات گئے تک جاگتے اور صبح دیر سے سو کر اُٹھتے۔ دقیانوسی ٹرامیں کھڑ کھڑ کرتی اُن کے سر کے پاس گزر جاتیں مگر سردار کی نیند میں مطلق خلل نہ پڑتا۔ پارٹی آفس میں کھانا ٹھیک نو بجے ملتا۔ مگر سردار جعفری کو گرم گرم دال روٹی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اُن کا کھانا الگ ڈھک کر رکھ دیا جاتا اور وہ دس ساڑھے دس بجے آکر ٹھنڈا کھانا مزے سے کھا لیتے۔ پچھلی بار کراچی میں دیر سویر اُٹھنے کی بات نکلی تو بڑی حسرت سے بولے یار اب تو آنکھ صبح چار بجے کھل جاتی ہے۔ دس بجے تک سونے کو ترس گئے۔ سحر خیزی کی یہ نئی عادت نہ جانے سلطانہ بیگم کی صحبت کا اثر ہے یا عمر کا تقاضہ۔

سردار جعفری کی ایک اور ہدایت کاری کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ جنوری کی ایک شام کو ہم لوگ بنّے بھائی کے فلیٹ میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں غالب کا ذکر آگیا جن کی وفات فروری میں ہوئی تھی۔ بنّے بھائی کہنے لگے یار و کیوں نہ یوم غالب منایا جائے۔ اس تجویز سے کسی کو کیا اختلاف ہوسکتا تھا۔ چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا۔ اور دوسرے دن سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ قاضی عبدالغفار مصنف لیلیٰ کے خطوط سے صدارت کی درخواست کی گئی جن کو انہوں نے بخوشی منظور کرلیا اور حیدرآباد سے معہ بیگم صاحبہ اپنے خرچ پر تشریف لائے۔ غالب جیبی سائز کا ایک مختصر سا انتخاب بھی شائع کیا گیا جو خوب بکا۔ مگر اس تقریب کا حاصل ۱۲۶۱ھ کا وہ یادگار مشاعرہ تھا جو لال قلعہ دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا اور جس میں غالب، مومن اور دوسرے ممتاز شعرا نے شرکت کی تھی۔ اس مشاعرے کو نہایت خوش اسلوبی سے اسٹیج کرنے کا سہرا سردار جعفری کے سر ہے۔ انہوں نے محبوب اسٹوڈیو سے مغلیہ پوشاکیں فراہم کیں اور اداکار جمع کیے جن میں بعض شاعر تھے اور بعض فلم سٹار لیکن سب سے کٹھن کام ان نازک مزاجوں کو پرانے زمانے کے مشاعرے کے آداب سکھانا اور پرانے شاعروں کی شعر خوانی کا انداز ذہن نشین کروانا تھا۔ اوروں کے نام تو اب ذہن سے نکل چکے ہیں البتہ اتنا یاد ہے جناب ساغر نظامی نے غالب کا کردار ادا کیا تھا اور سردار جعفری خود چوب دار بنے تھے کیونکہ شاعروں کا تعارف کروانا چوب دار کا فریضہ ہوتا تھا۔ اُس وقت تک وی سی آر کیمرے اور فلموں کا رواج نہیں ہوا تھا لہٰذا مشاعرے کی کوئی فلم نہ بن سکی ورنہ آپ لوگ اس مشاعرے کا منظر دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوتے۔

مولوی عبدالحق صاحب کہا کرتے تھے کہ اُس شخص سے بچو جس کی سب تعریف کرتے ہوں یا جو شخص سب کی ہاں میں ہاں ملاتا ہو۔ جب میں سردار جعفری کے بدخواہوں کی زبان سے سنتا ہوں کہ سردار بڑے گھمنڈی ہیں یا اُن میں لچک بالکل نہیں تو مجھ کو مولوی عبدالحق صاحب کی باتیں یاد آتی ہیں۔ سردار جعفری کی شخصیت بڑی نزاعی ہے اور ہونی بھی چاہیے کیونکہ انقلاب کے نغمہ خواں کا شیوہ ہر کس و ناکس کی خوشنودی حاصل کرنا نہیں بلکہ سچ بولنا ہے۔ سردار کی وفاداریاں وابستگیاں جن انسانی قدروں اور حیات بخش قوتوں سے ہیں وہ بعض حلقوں کو سخت ناپسند ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاعر کا نہ تو کوئی جیون آدرش ہونا چاہیے نہ اُس کے جذبات اور احساسات کو اُفتادگانِ خاک کے غموں اور خوشیوں، آرزوؤں اور اُمنگوں سے کوئی سروکار رکھنا چاہیے، مگر صدق و صفا کی یہی ریاضت، وجدان کا یہی خلوص اور ادراک و آگہی کی یہی بصیرت تو اُن کے فن کی جان ہے۔ وہ ظلمت پرستوں کی تسکین قلب کے لیے خودکشی تو کرنے سے رہے۔ اُن کا فن اُن کے مجاہدانہ فلسفۂ زیست کا پرتو اور اُن کے ضمیر کی آواز ہے۔ انھوں نے رضا جوئی کے بجائے سدا نبرد آزمائی کی ہے البتہ جو لوگ سردار جعفری سے ذاتی طور پر واقف ہیں وہ گواہی دیں گے کہ سردار اگر رزم گاہِ ہستی میں فولاد کی مانند سخت ہیں تو بزم گاہِ حُسن و محبت میں ریشم سے بھی زیادہ نرم ہیں۔

★ ★

علی جواد زیدی

رفیقِ زنداں سردار

پچاس ساٹھ برس ادھر کی بات ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں الیکشن ہوا جس میں علی سردار جعفری اور میں دونوں ہی امیدوار تھے۔ اس سے قطع نظر کہ ہم میں سے کون جیتا، کون ہارا، ایک نہ ایک کو تو جیتنا ہی تھا۔ الکشن کے بعد جنوبی ہند کے ایک ہونہار طالب علم نے مجھ سے خوش ہوکے کہا "جعفری صاحب! میں نے آپ ہی کو ووٹ دیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ تردیدی تشریح کرکے اس کا دل چھوٹا کیوں کرتا؟ اس واقعے کا اظہار صرف اس وضاحت کے لیے کر رہا ہوں ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنے قریب تھے، ہر تحریک میں اتنی گرم جوشی سے ساتھ ساتھ رہتے کہ یونیورسٹی کے نئے طالب کے لیے شناخت میں ایسی بھول چوک عین ممکن تھی، خاص کر اگر وہ جنوبی ہند کے اندرونی علاقے کا رہنے والا ہو؛ جہاں زیدی اور جعفری شاذ مثل معدوم ہیں۔ ہمارا یہ جہاں تو رفیق اگر غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا تو تعجب کیا ہے؟ یونیورسٹی میں جلسے ہوں تو ہم ساتھ ساتھ، تقریریں کریں، نظمیں سنائیں یا مشاعروں میں شریک ہوں تو ہر جگہ سامعین کے سامنے موجود، ہڑتالوں میں تو ہم آگے آگے گیا، اکثر ہڑتال کرانے والوں میں ہوتے بلکہ ہڑتالی قائدین میں شمار کیے جاتے تھے۔ ہمارے دوست بھی تقریباً مشترک تھے اور مخالف بھی۔ اس طرح ہم نے لکھنؤ یونیورسٹی میں سیاسی، ادبی اور ثقافتی ہم آہنگی اور تعاون کا آغاز کیا۔ اتفاق سے جیل بھی گئے تو ایک ہی زمانے میں۔ ایک ہی طرح کے جرم میں، اور زیادہ تر وقت ایک ہی جیل یعنی بنارس سنٹرل جیل میں گزارا اور واپس آئے تو پھر اسی لکھنؤ یونیورسٹی میں تکمیل تعلیم کے لیے۔

مجھے تو یاد نہیں لیکن سردار ہی نے یاد دلایا کہ ان کی رفیقۂ حیات سلطانہ سے ان کی ملاقات بھی میری ہی وساطت سے ہوئی۔ وہ اس وقت سلطانہ منہاج تھیں۔ ترقی پسند خیالات رکھتی تھیں اور طالب علموں کی سیاست سے دلچسپی بھی۔ میں لکھنؤ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر تھا۔ ان سے میری ملاقات طلبہ کی تحریکوں کے سلسلے میں ہوئی طلبہ کا کوئی جلسہ ہوتا یا ہڑتال ہوتی تو اس میں طالبات کا شمول بھی ضروری ہوتا۔ ایسے موقعوں پر سلطانہ سے تعاون کی درخواست کی جاتی۔ وہ خود اور ان کی چھوٹی بہنیں آمنہ اور خدیجہ شریک ہوتیں، لیکن تحریک میں عملی طور پر سلطانہ ہی زیادہ حصّہ لیتیں۔ ویسے تزئین حبیب اللہ بھی جو بعد میں تزئین فریدی ہوگئیں، اور یونین کی صدر بھی منتخب ہو چکی تھیں، لیکن ان کو وہ ذہنی اور فکری لگاؤ نہیں تھا جو سلطانہ کو تھا۔ سردار نے ایک اور جگہ کسی کو انٹرویو دیتے ہوئے حکایت

یوں بیان کیا ہے جیسے میں نے ان سے صرف سلطانہ کے حُسن کا ذکر کیا ہو۔ یہ پوری حقیقت نہیں ہے۔ یہ ذکر بھی ان کے ترقی پسندانہ خیالات کے ضمن میں آیا تھا۔ حسین تو وہ تھیں ہی اور ہیں، لیکن ان کی ترقی پسندی بھی ان کی اصل شناخت تھی۔ غرض سردار اور سلطانہ کی پہلی ملاقات میری وساطت سے ہوئی اور یہ واسطہ اتنا مبارک ثابت ہوا کہ ابدی رفاقت کا ذریعہ بنا۔ انھوں نے ایک جگہ خود اس واقعے کو جس طرح پیش کیا ہے اسے پڑھ کر مجھے بے اختیار غالب کا شعر یاد آ رہا ہے ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
ہو گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

بس فرق یہ ہے کہ سردار پہلے بھی رازداں اور بے حد قریبی دوست تھے اور آج بھی ہیں۔ رقابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ پہلا مصرعہ غضب کا چسپاں ہوا ہے۔

میں لکھنؤ میں پہلے سے تھا اور یہاں کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں اپنے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بنا چکا تھا۔ سردار لعبد میں ۱۹۳۷-۳۸ء میں آئے۔ وہ اسرار الحق مجاز اور قاضی جلیل عباسی تینوں ایک ساتھ علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنے ترقی پذیر خیالات کی بنا پر نکالے گئے تھے۔ ہم سب بہت جلد آپس میں گھل مل گئے۔ اس صدی کی تیسری دہائی میں لکھنؤ ترقی پسندی کا گہوارہ بن چکا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے اجلاس کانگریس میں جواہر لال نہرو نے اپنے خطبۂ صدارت میں اشتراکیت کی بات چلائی۔ اسی سال آل انڈیا اسٹوڈنٹس کانفرنس کا انعقاد ہوا جو آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اسی سال انجمن ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس بھی اسی لکھنؤ میں ہوا۔

اب تو در و دیوارِ شکستہ سے ان "صنادید" کے آثار بھی ظاہر نہیں ہوتے! بہرحال ترقی پسندی کے اس مرکزی شہر میں علی گڑھ کے یہ تینوں نکالے ہوئے مجاہد یہیں آئے اور داخل یونیورسٹی ہوئے۔ مجاز نے تعلیمی سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھا، لیکن سردار نے کچھ دن دلی میں گزارنے کے بعد یہیں سے ایم اے کیا اور قاضی جلیل عباسی نے ایل ایل بی۔ سبط حسن نے نئی صحافت کی طرح ڈالی اور سردار سے مل کر پہلے ہفتہ وار "پرچم" اور پھر ماہنامہ "نیا ادب" شائع کیا۔ ترقی پسندی کی روایت یہاں کا ہفتہ وار "ہندوستان" حیات اللہ انصاری کی ادارت میں پہلے ہی قائم کر چکا تھا اور ہم سب اس کے مضمون نگاروں اور نظم نگاروں میں شامل تھے۔ باستثنائے قاضی جلیل عباسی کے۔ وہ خالص سیاست کے آدمی تھے۔ ادبی ذوق ضرور رکھتے تھے۔ لیکن کبھی کچھ لکھتے نہیں تھے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی صحافت کے مردِ میدان تھے اور کچھ دنوں "زمیندار" لاہور کی ادارت کی خدمت بھی انجام دے چکے تھے۔

لکھنؤ میں ان اصحابِ اربعہ کو ہی نہیں بلکہ ہم سب کو بہت ہی خوشگوار ماحول ملا سبطے بھائی (سجاد ظہیر) کا تو یہ گھر ہی تھا۔ وہ سر وزیر حسن سابق چیف جج کے صاحبزادے تھے اور اپنی خوشنما اور وسیع کوٹھی "وزیر منزل" میں رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی حسن ظہیر یونیورسٹی کے شعبۂ کیمسٹری کے ریڈر تھے اور اپنے چھوٹے بھائی کے ہم خیال۔ اساتذہ میں ڈی۔ پی۔ مکرجی، (شعبۂ اقتصادیات کے پروفیسر) ترقی پسندوں کے نظریاتی سطح پر میر کارواں جیسے تھے۔ پھر ڈاکٹر علیم تھے جو شعبۂ عربی میں ریڈر تھے شعبۂ اردو میں احتشام حسین صاحب اور شعبۂ انگریزی میں احمد علی صاحب ریڈر اور لکچرر تھے — ڈاکٹر رشید جہاں افسانے لکھتیں اور پریکٹس کرتیں۔ محمود الظفر نے بھی کچھ افسانے لکھے تھے۔ "انگارے" جیسی تصنیف ایسے ہی اصحاب میں سے چند کی

مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی۔ فرنگی محل میں حیات اللہ انصاری، محمد قاسم کے ترقی پسند تھے لیکن ان کے عزیز مولوی محمد رضا انصاری زیادہ پُرجوش تھے۔ اس وقت تک مفتی نہیں ہوئے تھے۔ جلد ہی مفتی بھی ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سُنّی دینیات سے وابستہ بھی، مگر موت نے یہ جوہرِ قابل ہم سے بہت جلد چھین لیا۔ علوم اسلامیہ و عربیہ کا یہ عظیم مرکز اپنے دامن میں مولوی فرحت اللہ انصاری کو بھی لیے ہوئے تھا۔ وہ بے ریش، وسیع مطالعے کے مالک، آزاد خیال، شدت پسند قوم پرور۔ کچھ مارکسیت کی طرف جھکاؤ بھی تھا، لیکن نئے ترقی پسند قافلے سے علی گڑھی تعلقات اور دوستی کے باوصف کچھ الگ الگ سے تھے۔ کیوں کہ ایک تو ملازمِ سرکار تھے۔ پھر ذاتی رجحانات اور میلانات کی بھی بات ہوتی ہے۔ باہر کی نمایاں شخصیتوں میں نیاز فتح پوری اور علی عباس حسینی کلاسیکی ادب کے رسیا ہونے کے باوجود ترقی پسندی کا تاثر قبول کرنے پر آمادہ تھے۔ دوسری طرف مولوی اختر علی تلہری، کشن پرشاد کول، جعفر علی خاں اثر اور علامہ احمد فرنیت ترقی پسندی کے ناقدین میں اور حلقۂ اربابِ ذوق کی ادبی تجربہ کوششوں کے خلاف محاذ آرائیوں میں بھی پیش پیش تھے۔ ان مخالفتوں کے باوجود لکھنؤ کی مثالی رواداری کی وجہ سے ذاتی سطح پر کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی اور سردار اور مجاز کی شاعرانہ صلاحیتوں کا متوازن اعتراف بھی ہوتا رہتا تھا۔

اس بڑے مجمع میں علی سردار جعفری اور مجاز اجنبی نہیں تھے۔ جو انھیں قریب سے نہیں جانتے تھے انھیں بھی بہت جلد معلوم ہو گیا کہ شہر میں دو آب دار گوہر اور آ گئے ہیں۔ نسبتاً سبط حسن کو لوگوں نے ذرا دیر میں پہچانا۔ بنیادی سبب تو یہ تھا کہ ان کا حلقۂ کار بیشتر حیدرآباد رہا تھا اور روزنامے کی صحافت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ادبی حلقوں میں شناسائی شاعروں کی طرح وسیع نہیں تھی۔ ان کے جوہر آہستہ آہستہ کھلے اور پھر تو وہ کبھی کبھی سربراہانہ انداز میں سامنے آنے لگے۔ لکھنؤ میں ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ باہر کے جوہر کو بہت جلد اپنا لیتا ہے اور ان کی تعریف و توصیف ہی نہیں بلکہ انھیں آگے بڑھانے میں پوری سرگرمی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ چند ہی دنوں میں یہ سب 'پوربیے' گویا لکھنؤ والے بن گئے۔ مجاز کا تو لکھنؤ کے محلہ نیا حیدرآباد میں مکان بھی تھا اور اگرچہ ردولی بھی لکھنؤ کے پورب میں واقع ہے لیکن اس پر پوربیے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ سردار ریاست بلرام پور کے ساکن تھے۔ لکھنؤ کے علاوہ اس کا نظری صدر مقام کون ہو سکتا تھا؟ علی گڑھ تو بہرحال نہیں ہے، علیگ حضرات سے بے انتہا معذرت کے ساتھ! رہے علامہ سبط حسن، علامہ شبلی کے ہم وطن، ان کی شرقیت مسلّم، لیکن حیدرآبادیت اور مشرقیت کے امتزاج اور پھر لکھنؤ میں آمد نے ان کو لکھنوی بنا ہی لیا تھا۔ قسمت کے اس چکر کو کیا کہیے کہ آخری وطن کراچی قرار پایا اور دلّی میں، تمام اکابرِ ادب کی دلّی میں جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کی ٹھانی! ماضی قریب میں لکھنؤ میں اکابرِ ادب کا ایسا اجتماع پھر دیکھا نہ گیا۔ یہ لوگ صرف فن کار ہی نہیں رجحان ساز تھے۔ لکھنؤ تو اجڑ ہی گیا لیکن اس تاریخی مجمع میں اب سردار کے اور اپنے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ طرفہ یہ ہے کہ جواں سال سلام مچھلی شہری بھی چل بسا۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع صبح الزماں رہ گئے ہیں۔ انھوں نے افسانہ نویسی ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ جواں تر لوگوں میں عابد سہیل ہیں جن کی نصرت پبلشرز، اجڑے ہوئے امین الدولہ پارک کے روبرو اور پٹھان کی مسجد کی بغل میں شام کے رنگت بھولے بھٹکے ترقی پسندوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ باقاعدہ ترقی پسند رام لعل باہر سے آ کر بس گئے ہیں اور بہت فعال ہیں، لیکن خود سردار تو مستقل طور سے بمبئی والے ہو چکے ہیں اور اب مجھے بھی تقدیر کشاں کشاں یہیں لے آئی ہے۔

دنیا نے کتنی تیزی سے مسافت طے کرلی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۸۶ء میں طلائی جوبلی منائی لیکن ترقی پسندی خود بھی ایک پیچ و خم سے دوچار ہے۔ اس کی آفاقی حیثیت ہی اس کی سب سے بڑی پہچان تھی اور روس سے کبھی کبھی روشنی جھک جاتی تھی وہاں کئی برسوں سے ایک خاموش گڑبڑ، تجزیہ نظرثانی کا سلسلہ چل رہا تھا جو عام طور سے دیکھا نہیں جاتا تھا لیکن محسوس کیا جاسکتا تھا چین اور روس دونوں جگہ واضح اختلافات رونما ہونے سے ترقی پسندوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے لگے تھے۔ گلاسناسٹ اور پریسٹرائیکا کی تحریکیں تبدیلی ہی نہیں انقلاب کی حیثیت رکھتی تھیں اور مارکسیت سے وابستہ دانشوروں کے لیے، جن کے نمائندے سردار جعفری بھی، بڑی آزمائش کی گھڑی آگئی تھی۔ ترقی پسندی کے مخالفین اب کھل کھل کر وار کرنے لگے تھے اور مخالفت نظریوں سے ادبی رجحانات کی سطح پر آگئی تھی۔ جوشیلے اور ذہین ہوں یا سلجھے اور سردار کسی کو بخشا نہیں جا رہا تھا۔ مجھ سے سردار سے ۱۹۴۹ء میں نظریاتی سطح پر ایک اختلاف ہوا۔ یہ اختلاف عالمی جنگ کی نوعیت کے بارے میں تھا۔ مجھے بھیمڑی کانفرنس کے شدت پسند رویے سے بھی اختلاف تھا۔ اس وقت تو نہیں لیکن بعد میں بنے بھائی نے ایک نجی گفتگو میں اعتراف کیا کہ یہ متشددانہ رخ صحیح نہیں تھا۔ ایک اور رخ تنقیدی سطح پر نمودار ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ترقی پسندی کو منفی کے پہلو بہ پہلو ایک تعمیری رویہ موزوں اختیار کرنا چاہیے تاکہ مجموعی طور پر رجائی فضا بنی رہے لیکن یہ سب اختلافات نظری تھے۔ ادب کے جمالیاتی اور اجتماعی اقدار کے بارے میں ہمارا نقطۂ نگاہ تقریباً ایک تھا۔ ہم میں باہم کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا۔ اب روس میں جو انکشافات اور وہاں فکری و نظری آزادی پر پابندیوں کی جو داستان سامنے آئی انھوں نے ان سبھی کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا جو ترقی پسندی کے رجحان ساز تھے۔ آخر آخر رہا سہا بھرم بھی جاتا رہا۔ استالین کی مخالفت تو پہلے سے ہونے لگی تھی لیکن یہ کون سوچ سکتا تھا کہ لینن کا مجسمہ بھی لڑکھڑانے لگے گا۔ تاریخ کے اس کارواں کے ساتھ مشرق و مغرب کی تین چار نسلیں چلی ہیں۔ سردار بھی ان نظریوں کے اثر میں آئے لیکن ۱۹۵۶ء کے بعد انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کے کارڈ کی تجدید نہیں کرائی تھی، یعنی ان کے یہاں بھی ایک خاموش نظرثانی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے انقلاب کے بعد جو کچھ روس میں ہوا یا اس کی قیادت میں ہندوستان یا دوسرے ملکوں میں ہوا اس سے کے خطاوار سردار تو نہیں ہیں۔ وہ تیز ہوا تھی، طوفان کا جھونکا تھا جو اپنی رو میں بہت کچھ بہالے گیا تھا لیکن مارکسیت کوئی جامد عقیدہ نہیں تھا، غلطی ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اسے جامد بنانا چاہا۔

ان اختلافات کو تفصیل سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں یونیورسٹی میں، جیل میں، اخبارات و رسائل کے صفحات میں، مشاعروں اور سمیناروں میں اپنی کتابوں میں ہم نے متفرق طور پر بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ دانشوری کے کاروبار میں اس طرح کے اختلافات نہ ہوں تو خیالات اور تخلیق کاری کی دنیا میں بے رنگی اور جمود کے سوا کچھ نہ رہ جائے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی زندگیوں میں آزادہ روی، کھلے دل سے اختلاف کرنا اور اختلاف کے ساتھ ساتھ محبت کرتے رہنا بھی ہم نے یوں ہی سیکھا ہے اور اس پر ندامت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ندامت روس میں ہوسکتی ہے، جہاں منجمد یکسانیت طاری تھی۔ یہاں جمہوری طریق فکر میں وہ لمحہ آنے ہی نہیں پایا جب راہیں مسدود نظر آتیں۔

سردار شروع شروع میں حضرت گنج کے ایک کمرے میں سبط حسن کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے ساتھ کوئی اور بھی رہتا۔ زمین کے فرش میں یہی تو آسانی ہوتی ہے۔ کھانا کسی رستوراں میں جاکر کھالیتے یا کمرے ہی میں منگا لیتے۔ وہی دفتر تھا، وہیں شعر نازل ہوتے، نظریاتی مضامین لکھے جاتے، رسالے ترتیب پاتے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے منصوبے بنتے۔ دو چار ہم خیال جمع ہو جاتے تو چھوٹی موٹی

علی جواد زیدی

جس شعر بھی مرتب ہو جاتی۔ پھر یہ لوگ وہاں سے وسیع تر قیصر باغ ہی لین والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یونیورسٹی میں روزانہ ملاقات ہو ہی جاتی تھی پھر بھی کبھی کبھی کسی سلسلے سے ہم لوگ یونیورسٹی کے باہر بھی یکجا ہو جاتے تھے۔ یونیورسٹی میں یونین کا دفتر ہم سب کی مستقل نشست گاہ تھی۔ نہ جانے کتنے ہنگامے رکھتے تھے، کتنی تقریریں، کتنے قہقہے اور کتنے وہاں کی فضا نے جذب کیے ہیں اور ہماری دوستی کی یادوں میں محفوظ کر دیے ہیں۔

ترقی پسندی کے جلو میں اسٹڈی سرکلوں کا بھی رواج ہوا۔ جو اکثر یونیورسٹی کے ہوسٹلوں میں منعقد ہوتیں۔ پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے اہتمام سے ہمارے چھوٹے موٹے اجتماعات رشید جہاں اور ڈاکٹر علیم کے مکان پر یا احتشام حسین صاحب کے یہاں ہوتے رہتے تھے۔ نظمیں، افسانے سنائے جاتے، مقالے پڑھے جاتے اور پھر ان پر کھل کر تنقیدیں ہوتیں۔ اور ان میں کسی کو بھی بخشا نہ جاتا مجھے یاد نہیں، لیکن عین ممکن ہے کہ میں نے سردار یا سردار نے میری کسی نظم پر کبھی خیالات کا اظہار تنقیدی لہجے میں کیا ہو۔ ایک دوسرے کو حاجی کہنے کا رواج نہ تھا لیکن اگر کوئی شعر یا پوری نظم پسند آجاتی تو ہم خواہ مخواہ سکوت کا پیکر بنے بیٹھے بھی نہیں رہتے تھے۔

ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت ہم دونوں کی ۱۹۴۰ء میں گرفتاری بھی عجیب و غریب تھی۔ میں ایل ایل بی کے آخری سال کا طالب علم تھا۔ لا سوسائٹی کا افتتاح کرنے سر ماریس گائر چیف جج سپریم کورٹ آنے والے تھے۔ وہ باعتبار عہدہ دلی یونیورسٹی کے چانسلر بھی تھے اور یونیورسٹی نے دو طالب علموں کو سامراج دشمن سرگرمیوں کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکال دیا تھا۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ گائر کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ لا سوسائٹی کا معاملہ تھا اس لیے بھی اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے اہم رکن کی وجہ سے بھی میں ہی پیش پیش تھا۔ سردار یونین کے نمایاں لیڈر تھے۔ قاضی جلیل عباسی ہر ایسے موقع پر ہم لوگوں کے ہمراہ آجاتے تھے۔ سپریم کورٹ کا چیف جج اس زمانے میں وائسرائے اور کمانڈر ان چیف کے بعد برطانیہ کی سرکاری صفوں میں کافی اہم مانا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا کافی نوٹس لیا گیا اور ہم تینوں پر اس سلسلے میں نہیں بلکہ جنگ کے خلاف تقریریں کرنے کے جرم میں۔ جو ہم کیا کرتے تھے۔ مقدمہ چلایا گیا۔ سردار لکھنؤ ہی میں تھے اس لیے وہ پہلے گرفتار ہو گئے لیکن میں اس زمانے میں انڈر گراؤنڈ تھا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس لیے میں مہینے سوا مہینے کے بعد ناگپور کانفرنس میں شرکت کرتے وقت گرفتار ہوا اور پھر وہاں سے ایک ہفتے بعد لکھنؤ ڈسٹرکٹ جیل لایا گیا جہاں سردار اور عباسی کے مقدمات کا فیصلہ پہلے ہو چکا تھا اور انھیں بنارس سنٹرل جیل بھیجا جا چکا تھا۔ میں کوئی ڈیڑھ مہینے کے بعد لکھنؤ جیل سے سزایاب ہو کر ان سے بنارس سنٹرل جیل میں جا ملا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کتنی خوشی ہوئی، ان دونوں دیرینہ ہمدموں، بالخصوص سردار جعفری سے مل کر۔ یہ قرانِ السعدین دو سر پھروں کی، دو شاعروں اور ادیبوں کی، دو دوستوں کی یکجائی۔ دو دیوانے مل بیٹھے تو واقعتہً خوب گزری۔

بنارس سنٹرل جیل خاص سیاسی قیدیوں کا مرکز تھا۔ ایسے قیدی جنھیں برطانوی سرکار نے اے اور بی کلاس کے قابل سمجھا تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ حسرت موہانی کی طرح "چکی" کی مشقت کا ہمیں سامنا نہیں کرنا پڑا۔ رسی بٹنے کا کچھ کام ملتا وہ بھی سی کلاس کے قیدی کر دیا کرتے کیوں کہ وہ رسیاں ہم تک آنے ہی نہ دیتے۔ ہم ان کی نگاہوں میں سیاسی لیڈر تھے۔ لیڈری کے معاملے میں آج کی سی چھیچھا لیدر نہیں تھی۔ سیاسی کام بوالہوسوں کا نہیں تھا، ان کا تھا جو کچھ قربانی کر سکیں اور زندان و دار کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ ہمیں مشقت کا کام کرنا نہیں پڑتا تھا لیکن سب سے بڑی سزا یہ تھی کہ ہم اپنے عزیزوں، دوستوں اور سیاسی رفیقوں سے بالکل الگ ہو گئے تھے۔ اخبار ملتے تو اس طرح کہ ان میں سیاسی خبروں پر اچھی طرح نشانی انگوٹھا لگانے والی سیاہی جیلر صاحب کی نگرانی

علی جواد زیدی

میں کچھ بدلی ہوتی تھی۔ ۔ مرگھٹ بنتا گیا تھا۔ لیکن ہمارے بیرک میں یہ آسانی تھی کہ ہم لوگ آپس میں مل جل کر رہ سکتے تھے۔ کئی خیالات کے لوگ ایک جا تھے۔ سردار ارجن سنگھ کی طرح کے کمیونسٹ، موہن لال سکسینہ (جو بعد میں مرکزی منسٹر ہو گئے تھے) کی طرح کے گاندھیائی، سیٹھ دامودر سروپ، لال بہادر شاستری، موہن لال گوتم، اور راج نرائن کی طرح کے سوشلسٹ، اشفین لال سکسینہ کی طرح کے کسان لیڈر، کشمیری لال ترپاٹھی جیسے فارورڈ بلاک کے لیڈر، غرض سیاسی چھیڑ چھاڑ اور تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا۔ پنڈت لکشمی نرائن تیواری ہندی کے زبردست حامی تھے۔ انھوں نے ایک چھوٹا سا کتابچہ "ہندی بنام اردو" لکھا تھا اس پر دو چار روز گرما گرم بحثیں رہیں۔ دن میں شطرنج۔ شام کو والی بال میں کبھی کبھی ہم دونوں ساتھ ہو جاتے، لیکن ان باتوں پر قران السعدین کا اطلاق کہاں ہوتا ہے؟ وہ علم و ادب کے شائق اور دوست شریک جاتے تھے اور یہ یکجائی بے سود نہیں تھی، اچھی اچھی نظمیں وجود میں آئیں، کچھ مضامین لکھے۔ بہت سی کتابیں باہر سے منگا منگا کر پڑھیں اور شعر و ادب و مطالبات پر بہت سود مند تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ یہ ہے سعدین کا اجتماع۔ یہاں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ سردار انگریزی میں ایم اے کر رہے تھے۔ ان کے پاس اکثر شعری مجموعے رہا کرتے۔ خود میں آڈن اور اسپنڈر کے تازہ مجموعے اپنے ساتھ خرید لایا تھا۔ یہ اس زمانے میں ہم دونوں کے زیر مطالعہ تھے۔ ایک دن نئی تشبیہوں کی بات چل نکلی اور ہمارے ذہن میں بیک وقت یہ سوال اٹھا کہ ہم سائنسی اور ٹکنالوجیکل دور سے تشبیہیں کیوں نہیں لیتے؟ فطرت سے تشبیہیں لیتے تو صدیاں بیت چکیں۔ اس کے بعد ہم دونوں نے وہاں کئی نظموں پر تشبیہیں اور استعارے سائنسی اور ٹکنالوجیکل ماحول سے اخذ کر کے استعمال کیے اور برے نہیں لگے۔ مثلاً لیمپ، برقی رو، چمنی، تحت شعور، ریل، پالش، بینڈ، روشنی کے قمقمے، کارخانے، جمہور، اشتراکیت، سرمایہ گزاری، جنتا، رم، بیئر، فون، وہسکی، لال فیتہ، ریل کی زنجیر، تجربہ گاہ، انجن، ایٹم، ہائیڈروجن، گھڑی، قلم وغیرہ اور ان کے متعلقات۔ اکبر الٰہ آبادی ہوتے تو ان کو مزاحیہ شاعری میں صرف کرتے، اور ہم نے سنجیدگی سے استعمال کیا تاکہ شعر مضحکہ نہ رہے۔ اسی کے ساتھ روایتی علائم و تشبیہات سے بھی کام لیتے رہے۔ جیل میں کچھ مشترک موضوعات پر بھی نظمیں لکھی گئیں۔ یہ نظمیں ہم ایک دوسرے کو سناتے۔ اگرچہ فرصت بہت تھی لیکن ہم لوگوں کے پاس کہنے کو بھی بہت کچھ تھا۔ کہتے رہے۔ غبارِ خاطر دھلتا رہا۔ دل کی بات دوسروں تک پہنچتی رہی۔ اتنی نظمیں لکھ لیں کہ چھوٹا سا مجموعہ مرتب ہو سکے۔

جیل سے چھوٹنے کے بعد پھر وہی لیل و نہار، وہی جوش و خروش، بلکہ زیادہ ہی۔ اب ہم طلبہ کی توجہ کے زیادہ مستحق ہو گئے تھے۔ ان کا برتاؤ کچھ ایسا تھا جیسے انگریزوں کے بارے میں ہم یہ کہہ رہے ہوں کہ چلے چلو انھیں لندن تک کھدیڑتے ہوئے۔ جیل ہی میں میں نے ایک نظم یہ خبر سن کر لکھی کہ سردار کو نظر بندی کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اس کے چند شعر آپ بھی سنیں کہ اس سے بہتر سنانے کا موقع اور کیا ہوگا؟

کل ملا حکمِ نظربندی علی سردار کو — محملِ زنداں بنایا ہے دیارِ یار کو
ہم شہنشاہی کو یہ سمجھائیں کس عنوان سے — جو سمندر میں رہے ڈرتا نہیں طوفان سے
یہ وہ سینہ ہے جو تیروں کا نشانہ یوں بھی تھا — ہم سے آزادوں کو تو گھر قیدخانہ یوں بھی تھا
ہاں مگر پہلے جب اپنے گھر سے گھبراتے تھے ہم — لکھنؤ کے جشنِ طوفاں میں چلے آتے تھے ہم
یاں جنوں آسا عمل کی وادیوں میں کھیل کر — تازہ دم ہوتے تھے ہم تازہ مصائب جھیل کر
ہم نے جانا ہی نہیں کیا شے ہے دریا کا چڑھاؤ — ہم تھے، تو تھی ناؤ تھی اور تیز دھارے کا بہاؤ

محفلِ شعر و سخن سے بزمِ حسن و ناز تک　　　شورشِ راہِ جنوں سے غمزۂ غمّاز تک
انتخابی کشمکش سے انقلابی راہ تک　　　وسعتِ محنت کش سے لے کر لذّتِ شہنشاہ تک
ہم قدم ہو کر چلے ہم، ہم زباں ہو کر چلے　　　لوگ چھپتے تھے جہاں، واں ہم عیاں ہو کر چلے
زیست کی یکسانیت سے بچ نکلنے کے لیے　　　لڑ بھی لیتے تھے مزا منہ کا بدلنے کے لیے

(جون ۱۹۹۲ء)

خیر یہ نظربندی عارضی تھی اور وہ جلد لکھنؤ واپس آگئے اور آخر بار بمبئی چلے گئے، سجاد ظہیر کے ساتھ پارٹی کا کام کرنے کے لیے۔ میں اس زمانے میں (۱۹۴۶ء میں)، حکومت یوپی کی طرف سے آزادی کی تحریک پر ایک مختصر ڈاکومنٹری فلم بنانے کے لیے بمبئی گیا تھا۔ وہاں سردار سے ملاقات ہوئی اور دراوری میں سلطانہ سے بھی۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ سلطانہ اور سردار نے دائمی رفاقت کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن شادی بعد میں ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ اس کے بعد میں کشمیر چلا گیا۔ وہاں سردار سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور پھر دلی میں۔ ہماری دوستی میں ذرا فرق نہیں آیا بلکہ استوار تر ہی ہو گئی تھی۔ مسافت کی دوری سے کیا فرق پڑنے والا تھا؟

مجھ سے لوگوں نے کئی بار کہا کہ سردار نے ترقی پسند ادب میں میرا ذکر سرد مہری سے کیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارے تعلقات پر دراڑ ڈال دی جائے۔ میں نے ہمیشہ یہ جواب دیا کہ اختلافات کے باوجود انھوں نے میرا ذکر تو کیا اور برائی سے نہیں کیا، رفیقانِ سفر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اب اگر انھیں کہیں اختلاف ہے تو وہ اس کو خاموش رہ کر ظاہر کریں یا مناظرہ کر کے، کیا فرق پڑنے والا ہے۔ ہم دونوں بڑے اچھے اور صاحبِ ذوق دوست ہیں، ترقی پسند ہیں۔ اتنا کافی ہے۔ میں نے ان دوستوں کو بتایا اور غالباً اپنے پہلے شعری مجموعے "رگِ سنگ" میں لکھا بھی ہے کہ انھیں کی تحریک پر میں نے یہ مجموعہ حیدرآباد میں اشاعت گھر اشاعت کے لیے دیا تھا۔ یہ سن کر ہمارے کرم فرما محوِ حیرت رہ گئے۔

سردار واقعۃً بہت اچھے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کے دو واضح ادوار ہیں۔ ایک تو جب وہ راست اظہار کی طرف زیادہ مائل تھے۔ زبان پر اس وقت بھی انھیں بڑی قدرت تھی، ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا اور جدید تھا۔ اس کے لیے انھوں نے جدید لہجہ بھی اپنایا۔ لیکن اسلوبِ اظہار کے معاملے میں انھوں نے روایت سے قریب رہنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ یہ دراصل ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ ہے۔ مقصدی، افادی اور نظریاتی شاعری اگر اپنی پوری فن کارانہ قوت اور جذباتی شدت و حرارت سے سامع و قاری تک منتقل نہیں ہو سکتی تو شاعر کبھی اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوگا۔ ناقد اس پہلو سے نگاہ موڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لحاظ سے میں سردار کے دورِ اوّل کی شاعری کو بھی توانائی خلوص کی وجہ سے قابلِ توجہ سمجھتا ہوں۔ پھر موضوعات کے تنوع میں جو عوامی اور بین طبقاتی عنصر ہے جو عصری شعری ماحول کے لیے نئی چیز تھا اور جو ترقی پسندی کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ سند رہے کہ انھوں نے بھی اور میں نے بھی آزاد نظمیں لکھیں اور اس طرح سے اس روایت کی تجدید کی جو کبھی حالی، پہلے شرر وغیرہ نے اسی لکھنؤ میں قائم کی تھی لیکن نبھ نہ سکی تھی اور یہ کوششیں بھی سردار کی شاعری کے دورِ اوّل ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس تاثراتی مقالے میں تنقید نہ تو مقصود ہے نہ ممکن، لیکن اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں پانچویں دہائی کے خاتمے تک ایک ارادی تبدیلی آ چکی تھی۔ ان کے مجموعوں "پیراہنِ شرر" اور "ایک خواب اور" میں اس کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے اب ان کی جمالیاتی حس پر ہماری ادبی اور ثقافتی روایت کے تسلسل کے ساتھ جدید حسیت اور عصری میلانات کے انتخابی نشان

ملنے لگتے ہیں اور سب مل کر ایک سیل تازگی کا احساس پیدا کراتے ہیں۔ لفظیات و اسلوبیات کے معاملے میں انھوں نے انحرافی یا مقلدانہ تجربے نہیں کیے ہیں اور اگر کرتے بھی تو یہ تجربہ برائے تجربہ ہوتا کیوں کہ شاعری صرف پیرہن نہیں بلکہ پیراہن شعر و لباس شبنم ہے۔ حقیقت بھی ہے اور خواب بھی۔ بقول آنند نرائن ملا "پیراہن شرر" کو رفو کر چکا ہے ؎

نیموں کی شعلہ فشانی ہے شبنم افشانی
اسی میں صبح تمنا نہا کے نکھرے گی

سردار کی فکری زندگی میں ایک المناک موڑ آنا باقی رہ گیا تھا، وہ روس کے حالیہ واقعات کی شکل میں نمودار ہوا۔ روس میں کمیونسٹ تجربے کی شکست معمولی واقعہ نہیں ہے۔ مارکس اور لینن کے مجسموں کا سرنگوں ہونا اور سرخ پرچم کا وہاں کی فضا سے غائب ہو جانا صرف سیاسی واقعات نہیں ہیں۔ بلکہ سردار جعفری کی طرح کے جذباتی طور پر وابستہ مفکرین اور تخلیقی ادیبوں اور شاعروں کے لیے ایک کربناک تجربہ بھی ہے۔ چنانچہ اس سیلابی رو سے متاثر ہو کر سب سے پہلے انھوں نے "الوداع سرخ پرچم" کے عنوان سے ایک نظم لکھی اور شائع کرائی۔ اس میں رثائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے جو ان کے جذباتی تلاطم کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ اپنی مارکسیت کے باوجود اتنے جذباتی ہو سکتے ہیں شاید یہ پہلے سوچا نہیں جا سکتا تھا لیکن ان کے انقلابی تفکر میں بھی جو رومانی طرز اظہار ہے اسطور کی طرح نمایاں ہوتا رہتا ہے، یہ اس کا ایک مظاہرہ تھا۔ وہ ایک پرخلوص دوست ہیں، نیک، وضع دار اور دردمند۔ حالات کا جائزہ تو ٹھہراؤ کے ساتھ شاید وہ بعد میں لیں گے کیوں کہ یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ترقی پسند دانش ور پوری توجہ اور احساس ذمے داری کے ساتھ جذبات سے بلند ہو کر بے رحمانہ معروضیت کے ساتھ غور نہ کریں اور وہ بھی یقیناً کریں گے۔ روس میں ماضی کی کئی غلط روشوں کا ردعمل تو ہونا ہی تھا، جب ہی اس کا جائزہ وقت لے گا لیکن سردار تاریخ نہیں لکھ رہے تھے وہ وہی لکھ رہے تھے جو ان کے دل پر بیت رہی تھی۔

٭٭



خواجہ تصور علی حیدر

سردار جعفری کا زمانۂ طالب علمی

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی ایڈیٹ کی ہوئی "دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" کے مطابق جو ۱۹۳۷ء میں انجمن اردو پریس اورنگ آباد دکن میں چھپی تھی اور جسے انجمن ترقی اردو (انڈیا) نے بطور سیریز نمبر ۱۰۶ شائع کیا تھا، انگریزی لفظ (VERSATILE) کا اردو ترجمہ "ہمہ گیر، بہت سے کاموں کی صلاحیت رکھنے والا، بہت سے علوم و فنون با کمالات پر حاوی" دیا گیا ہے۔ شاید اردو زبان میں ورسٹائل کا اس سے بہتر ترجمہ نہ ہو سکتا ہو لیکن جو ہمہ گیری اور وسعت اس انگریزی لفظ میں ہے، میرے خیال میں وہ اردو کے ایک لفظ میں تو درکنار کئی الفاظ میں بھی ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔ بہرصورت، میں نے اپنی چھیاسٹھ سالہ زندگی میں اس لفظ کی صرف دو عمل تصویریں دیکھی ہیں۔ ایک سر شاہ محمد سلیمان مرحوم جو میرے اینگلو عربک کالج دلی میں زمانۂ طالب علمی کے دوران اینگلو عربک کالج اینڈ اسکولز گورننگ باڈی، دلی کے صدر تھے اور دوسرے سید علی سردار جعفری جن کے ساتھ میں اینگلو عربک کالج کے ہوسٹل میں ڈیڑھ دو سال ایک کمرے میں مقیم رہا ہوں۔ سر شاہ محمد سلیمان اس مضمون کا موضوع نہیں ہیں اس لیے ان کے متعلق تحریر میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ فیڈرل کورٹ آف انڈیا کے یہ سب سے کم عمر جج جو مشہور تو ایک قانون داں کی حیثیت سے ہوئے لیکن وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے جن جملہ اور باتوں کے وہ ایک سائنس داں، ریاضی داں، عالم دین، مورخ، ماہر تعلیم اور ادیب تھے۔ جہاں تک سید علی سردار جعفری کا تعلق ہے تو ان سے پاکستان کے پانچ معروف ادیبوں یعنی جناب صفدر میر، جناب عبداللہ ملک، جناب حمید اختر، ڈاکٹر آغا سہیل اور جناب حسن رضوی کے مکالمے کی جناب عقیل روبی کی رقم کردہ رپورٹ "بھارت کے نامور شاعر اور دانشور علی سردار جعفری" کے عنوان سے روزنامہ جنگ لاہور کے ۲۷ مارچ اور ۱۷ اپریل کے شماروں میں "جریدہ ادب و ثقافت" میں دو قسطوں میں شائع ہوئی ہے جس میں ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں بات چیت کا حال درج ہے اور جس کے پڑھنے سے ان کی ہمہ جہت شخصیت سے بہت اچھا تعارف ہو جاتا ہے۔ اس رپورٹ میں ان کے بچپن کا ذکر بھی ہے اور ان کی طالب علمی کے زمانے کا بھی۔ چونکہ اس وقت علی سردار جعفری دنیائے علم و ادب میں بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کی بعض تخلیقات کا دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اس لیے ان کے حالات زندگی سے پڑھے لکھے لوگوں کی دلچسپی کے پیش نظر اور جنگ میں شائع شدہ متذکرہ بالا رپورٹ کے پیش نظر بھی میں ان کے اینگلو عربک کالج میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک طالب علمی کے زمانے کے چند واقعات و حقائق رقم کرتا ہوں جن کا میں خود چشم دید گواہ ہوں اور جن سے یہ ثابت ہو جائے گا

۔علی سردار جعفری واقعی (VERSATILE) ہمہ جہت صاحبِ کمال شخصیت ہیں۔ اس سے قبل کہ میں کچھ اور کہوں میں سید علی سردار جعفری سے جنھیں میں نے کالج فیلو، کل ہند تقریری مقابلوں میں پارٹنر اور ہوسٹل میں روم میٹ ہونے کے ناتے سے صرف دوست نہیں سمجھا بلکہ ان کی سینیارٹی، علم و فضل اور مجھ سے حسنِ سلوک کی بنا پر بڑا بھائی سمجھا ہے اور ہمیشہ ان کا احترام کیا ہے، ایک اختلاف کرنا چاہتا ہوں یا دوسرے لفظوں میں ان کی تصحیح کی جسارت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ انھوں نے مکالمے میں کہا ہے کہ ان کا "ادبی، سیاسی شعور علی گڑھ میں پروان چڑھا"۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انھوں نے ایف اے تک تعلیم پائی ہے اور جب کہ وہ بی اے (پریویس) کے طالب علم تھے تو انھیں وہاں سے رسٹی کیٹ (کالج سے نام خارج) کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے علی گڑھ سے اپنے اخراج کا سن ۱۹۳۶ء تو صحیح بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس وقت وہ بی۔اے (فائنل) کے طالب علم تھے۔ وہ اس وقت بی۔اے (فائنل) کے نہیں بلکہ بی۔اے (پریویس) کے طالب علم تھے۔ مکالمے میں خود ان کے بیان سے ان کی تردید ہو جاتی ہے کیوں کہ انھوں نے خود ان کے مطابق ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ سے نکالے جانے پر اینگلو عربک کالج میں داخلہ لیا تھا اور وہاں سے بی اے کر کے وہ ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ پہنچے تھے۔ اگر وہ ۱۹۳۶ء میں بی اے (فائنل) میں ہوتے تو ۱۹۳۸ء میں نہیں بلکہ ۱۹۳۷ء میں بی۔اے کر لیتے یا اگر ۱۹۳۷ء میں بی۔اے کے امتحان میں فیل ہوتے تو اگلے سال ۱۹۳۸ء میں بی اے کرتے۔ یہ دونوں باتیں نہیں ہوئیں۔ اس لیے یہ بات ہی صحیح ہے کہ جب علی سردار جعفری ۱۹۳۶ء میں اینگلو عربک کالج میں داخل ہوئے تھے تو وہ بی۔اے (فائنل) کے نہیں بلکہ بی۔اے (پریویس) کے طالب علم تھے۔ اس طرح سے انھوں نے دو سال سے کچھ زیادہ طالب علمی کا زمانہ علی گڑھ میں اور دو سال سے کچھ کم دلی میں گزارا۔ اس لیے اگر وہ یہ کہتے کہ میرے ادبی و سیاسی شعور نے بلرام پور میں (جہاں ان کی میٹرک تک کی تعلیم کی تکمیل ہوئی تھی) جنم لیا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس کی نشو و نما ہوئی اور اینگلو عربک کالج دلی میں طالب علمی کے دوران وہ پروان چڑھا تو حقیقتِ حال کا صحیح اظہار ہوتا۔

۳۸-۱۹۳۶ء کے دوران جب کہ ہم دونوں ایک کمرے میں رہتے تھے، علی سردار جعفری نے ادب اور سوشلزم اور کمیونزم پر بہت سی کتابوں اور کتابچوں کا مطالعہ کیا وہ رات کو دیر تک پڑھتے رہتے تھے اور صبح کو دیر سے اٹھتے تھے جس کی وجہ سے ایک طرف تو ہوسٹل کا باورچی سبعلی مرحوم جو ان کے لیے ناشتہ لیے بیٹھا رہتا تھا حالانکہ مقررہ وقت کے بعد اس کی ناشتہ دینے کی ذمے داری ختم ہو جاتی تھی، مصیبت میں گرفتار رہتا تھا اور دوسری طرف وہ عام طور پر کالج کا پہلا پیریڈ مس کیا کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے والد بزرگوار ان کو جو رقم درسی کتابوں کی خرید کے لیے بھیجتے تھے، وہ اس سے کمیونسٹ لٹریچر خرید لیتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے انھوں نے کورس کی کوئی بھی کتاب نہیں خریدی تھی اور طالب علموں سے کتابیں مستعار لے کر گزارہ کر لیا کرتے تھے۔

ادبی و سیاسی شعور کی پختگی کے لیے وسیع مطالعے کے علاوہ ان میدانوں میں اہم اور قدآور شخصیتوں سے ملاقاتیں اور تعلقات بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ علی سردار جعفری کا اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں گزرا ہوا وہ زمانہ تھا جب کہ وہاں ان کے پاس قیام کے لیے جاں نثار اختر اور اسرار الحق مجاز کی قسم کے شعرا تو آتے ہی تھے، لیکن مجھے یاد ہے کہ کم از کم دو مرتبہ حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم بھی اینگلو عربک کالج ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں علی سردار جعفری کے مہمان ہوئے تھے۔ دراصل اس ہوسٹل کے کمرے ابتدا میں اس عالی شان اور خوش نما سنگِ سرخ کی تاریخی مسجد میں زیرِ تعلیم دینی و مذہبی طلبہ کے حجرے تھے جو ان

ان کے درمیان وسیع و عریض سبزہ زار میں واقع تھی۔ بعد میں ان حجروں میں سیمنٹ کر کے انھیں کمروں میں تبدیل کیا گیا اور ان میں سے کچھ کمرے کالج کے ہوسٹل کے لیے، کچھ کمرے کالج کے طلبہ کی ٹیوٹوریل کلاسز کے لیے اور زیادہ کمرے اینگلو عربک ہائی اسکول اجمیری گیٹ کے لیے استعمال ہونے لگے۔ جب یہ مہمان آتے تھے تو علی سردار جعفری اور میں اپنی دو عدد چارپائیاں، دو عدد میز اور دو عدد کرسیاں کمرے سے نکال کر گیلری میں رکھ دیتے تھے اور فرش پر بستر لگا دیا کرتے تھے۔ اس سے قارئین کرام اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس زمانے میں علی سردار جعفری کا شعور کس منزل پر تھا اور انھوں نے زندگی میں وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ جوش جیسا انقلابی قادر الکلام شاعر جو اس وقت ہندوستان میں انقلاب کی ایک علامت بنا ہوا تھا اور تمام بڑے شاعروں کی جان تھا۔ دلّی کے سب لوگوں کو چھوڑ کر علی سردار جعفری کا مہمان ہوتا تھا۔ علی سردار جعفری اور ان کے مہمانوں میں زیادہ تر ترقی پسند تحریک کے متعلق باتیں ہوتی تھیں۔

ان کے مطمح نظر سے ان کے دلی میں دوران قیام سیاسی شعور کے پروان چڑھنے کی بابت ایک واقعہ ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ اس واقعے کے بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ چالیس روپے ماہوار کی سرکاری ملازمت بھی بڑی مشکل سے ملتی تھی اور ہمارے کالج کے پرنسپل اور ہمارے مشفق استاد مسٹر سی۔ آئر ڈاکرا ایم۔ اے (آکسن)، ایم۔ بی۔ ای ہر سال کالج کے ایک دو تازہ گریجویٹس کو حکومت ہند کے دفتروں میں چالیس روپے ماہوار کی کلرکی دلا دیتے تھے اور دوسرے تیسرے سال اپنے کسی قابل اور پسندیدہ شاگرد کو نائب تحصیل دار کرا دیتے تھے تو دلی کے عمائدین اور سربرآوردہ مسلمان ان کے ممنون و مشکور ہوتے تھے، تو ایسے زمانے میں ۱۹۳۶ء میں جب کہ بی اے کا امتحان قریب تھا پوسٹ مین، علی سردار جعفری کے نام ایک نامانوس قسم کے لفافے میں رجسٹرڈ خط لایا۔ انھوں نے اسے کھول کر پڑھا اور پڑھنے کے بعد وہ اسے چاک کرنے والے تھے کہ میں نے تجسس کے باعث ان سے کہا اگر کوئی راز کی بات نہ ہو تو میں بھی یہ خط پڑھ لوں چنانچہ انھوں نے وہ خط مجھے دے دیا اور جب میں نے وہ خط پڑھا تو میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا کہ وہ علی سردار جعفری کے بطور تحصیل دار تقرری کا پروانہ تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا کہ جعفری بھائی یہ خط کیوں پھاڑ رہے ہو؟ کیا تمھیں اتنی اچھی ملازمت پسند نہیں ہے؟ اس پر وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے اور انھوں نے جو کچھ کہا اس کا ماحصل یہ تھا کہ تم اتنے عرصے سے میرے ساتھ رہ رہے ہو اور یہ نہ سمجھ سکے کہ میں زندگی میں کیا بننا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں تحصیل داری کے لیے بی اے ہونا شرط تھا لیکن غالباً اس مفروضے کے تحت کہ علی سردار جعفری بی۔ اے کا امتحان دینے والے ہیں جس میں وہ پاس ہو جائیں گے، انھیں تحصیل داری کا آفر دیا گیا تھا۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا تھا کہ ان کے والد ریاست بلرامپور میں کسی اہم عہدے پر مامور تھے اور وہاں کا مہاراجہ ان کی دیانت داری اور فرض شناسی کی وجہ سے ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور غالباً اس کی ہی سفارش پر یو۔ پی کے گورنر نے یہ اقدام کیا تھا۔

یہ تو تھا علی سردار جعفری کی ایک بات کے متعلق میرا اختلافی نوٹ۔ ایک اور بات جو بجائے اس کے کہ اس مؤقر روزنامے کے فاضل قارئین کے دماغوں پر بوجھ بنے، میں خود ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ اس مضمون میں میری کوشش کے باوجود میرا ذکر آنا ضروری ہے کیوں کہ اس کے بغیر کہانی مکمل نہ ہوگی۔ مجھے اپنے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہے لیکن میں احساس کمتری میں بھی مبتلا نہیں ہوں۔ یہ مضمون لکھنے کی نسبت سے میں یہ لکھ رہا ہوں کہ پچھلے پچاس سال سے میرے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے ہفت روزہ اور ماہانہ جرائد سے قطع نظر اس ملک کا انگریزی یا اردو کا کوئی بڑا روزنامہ نہیں ہے جس میں میرا مضمون شائع

نہ ہوا ہو۔ میرا پہلا مضمون ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا جب کہ میں حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں دسویں جماعت کا طالب علم
تھا۔ امیرالمومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ جو شخص کہ اپنی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے، وہ تباہ
ہو جاتا ہے۔ بہرصورت ۱۹۳۱ء میں علی سردار جعفری اور میں دونوں اینگلو عربک کالج میں داخل ہوئے تھے۔ چونکہ مقطع میں سخن
گسترانہ بات آپڑی، اس لیے اس مشہور درس گاہ کے متعلق جس کا سلسلہ ۱۸۲۵ء سے شروع ہوتا ہے، چند الفاظ کہہ دینا مناسب
معلوم ہوتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اس کالج کا نام دلی کالج ہوگیا جو اس درس گاہ کا قدیم نام تھا اور مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین
مرحوم کے انتقال کے بعد جو جمہوریہ ہند کے صدر اور اینگلو عربک کالج انٹر اسکولز گورننگ باڈی کے بھی صدر رہے تھے، حکومت ہند کے
حکم کے تحت اس کا نام ذاکر حسین کالج کر دیا گیا جو اس وقت اس کا نام ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لیے علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی اور وہاں کے طلبہ کی گراں قدر خدمات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں اسلامیہ کالج لاہور کے طلبہ نے بھی بہت
اچھا کام کیا ہے جس کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے لیکن اس سلسلے میں اینگلو عربک کالج کے طلبہ نے جو مہتم بالشان کام کیا ہے، اس کا ذکر مجھے
کہیں نظر نہیں آتا۔ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اینگلو عربک کالج سے جو ذاتی تعلق تھا ——————

میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ انھیں ویسا تعلق کسی اور درس گاہ سے نہ تھا۔ اگر کوئی صاحب میری تردید کرنا چاہیں تو
براہ کرم یہ ضرور بتائیں کہ قائداعظم متعلقہ درس گاہ میں کتنی مرتبہ آئے تھے۔ جہاں تک اینگلو عربک کالج کا تعلق ہے، وہ ہر سال تین
چار مرتبہ اور بعض اوقات اس سے بھی زیادہ، اس درس گاہ کی تقریبات مثلاً سالانہ ڈنر، سالانہ جلسہ تقسیم انعامات اور یونین کے
زیر اہتمام وقت کے مطابق اہم موضوعات پر لیکچر دینے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ میں کالج یونین کا سکریٹری رہا ہوں اور یہ بات میں
انتہائی فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ قائداعظم مجھے مسعود کے نام سے جانتے تھے اور اگر میں ٹیلی فون پر ان سے یا ان کے پرائیویٹ سکریٹری
سے کہتا کہ میں مسعود بول رہا ہوں تو وہ مجھے پہچان جاتے تھے۔ تین چار سال کا ذکر ہے کہ میرے ایک کالج فیلو جناب مظفر حسین کا ایک
انٹرویو یوم قائداعظم یا یوم پاکستان پر پاکستان ٹیلی وژن سے رات کے نو بجے نشر ہونے والے ملی نیوز بلیٹن میں نشر ہوا تھا (مظفر حسین
ایک عرصے تک خود ریڈیو پاکستان اور ٹی وی پر خبریں پڑھتے رہے ہیں) انھوں نے اس انٹرویو میں اینگلو عربک کالج سے قائداعظم
کے قریبی تعلق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس درس گاہ کے دو تین طلبہ قائداعظم کے بہت قریب تھے اور ان طلبہ میں انھوں
نے میرا نام بھی لیا تھا۔ بات تو یہ ٹھیک تھی لیکن مجھے اس پر حیرت ہوئی تھی کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب عام طور پر کوئی شخص دوسرے
کے حق میں اچھی بات کہنا گوارا نہیں کرتا لیکن مجھے زیادہ خوشی اس بات پر ہوئی تھی کہ آل انڈیا مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے سلسلے
میں میرے کالج کے طلبہ کی خدمات کا ذکر ہوا تھا۔ اینگلو عربک کالج نے نہ صرف ہندوستان کے دل دلی میں قائداعظم اور آل
انڈیا مسلم لیگ کو اسٹیج فراہم کی تھی بلکہ اس قومی و ملی تنظیم کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اکثر جلسے اس کالج میں منعقد ہوتے تھے۔ مجھے
ان جلسوں کو بطور والنٹیر دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ ان جلسوں میں قائداعظم بطور صدر مختلف ممبروں سے کیا سلوک کرتے تھے
اور بعض مشہور و معروف لوگ جن کو بابائے قوم جلسوں میں بولنے کا کم موقع دیتے تھے۔ باہر کے لوگوں مثلاً ہم طلبہ سے قائداعظم کے
متعلق کیا کہتے تھے۔ یہ ایک کیا کئی مضمونوں کا موضوع ہو سکتا ہے لیکن اس سلسلے میں معاملے کی نزاکت کے پیش نظر فی الحال کچھ نہ لکھنا ہی
مناسب ہوگا۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا انتہائی اہم سالانہ اجلاس اس درس گاہ کے سامنے واقع میدان میں منعقد ہوا
تھا اور باہر سے آئے ہوئے اکثر قائدین اس کالج کی عمارت میں قیام پذیر تھے اور کالج کے طلبہ اور اساتذہ ان کی خدمت میں ہمہ

نواب منصور علی حیدر

…کی اسی تاریخ کے سہرہ زاروں میں قائداعظم محمد علی جناح …یت معروف تھے۔ ۱۹۴۶ء میں مشہور زمانہ آل انڈیا مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن بھی اسی تاریخی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ میں نے ۱۹۴۳ء کے سالانہ اجلاس کی طرح یہ کنونشن بھی دیکھا ہے۔ اس موقع پر سب سے لما… ایک مرکزی یا صوبائی کے ممبر نے خطابت کے جوہر دکھائے تھے اور جیسی اعلیٰ معیار کی مدلل تقریریں میں نے اس اجتماع میں سنی تھیں۔ ویسی اس سے پہلے یا اس کے بعد کبھی نہیں سنیں۔ بعض مقرروں نے تو حقیقتاً فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے تھے۔ اس کنونشن میں جوش کا مظاہرہ بھی کیا گیا مگر ہوش کے ساتھ۔ جناب حسین شہید سہروردی مرحوم نے اس یادگار کنونشن میں ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلمانانِ ہند کے مطالبات پر مبنی وہ تاریخی ریزولیشن پیش کیا تھا جو مسلم لیگ کی تاریخ میں "دلی ریزولیوشن" کے نام سے مشہور ہے اور جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور کے تاریخی اجلاس میں پاس ہونے والے "لاہور ریزولیشن" یا "قرارداد پاکستان" کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ سہروردی صاحب نے ۴۵ منٹ تک انگریزی زبان میں نہایت فصیح و بلیغ اور پُراثر و مدلل تقریر کی تھی۔ ان کی تقریر سن کر مجمع مبہوت ہو گیا تھا۔ سحر کا سا عالم تھا۔ خیال تھا کہ ان کے بعد شاید کوئی اور تقریر نہ ہو سکے۔ ریزولیشن کی تائید رسمی طور پر جناب نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم نے کی تھی۔ جو ویسے بھی کم سخن تھے۔ قائداعظم حسب دستور صدارتی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو صرف میرا ہی نہیں اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ جلسے کی طوالت اور جناب سہروردی کی اعلیٰ درجے کی تقریر کے بعد وہ چند فقرے کہہ کر جلسے کے اختتام کا اعلان فرما دیں گے، لیکن قائداعظم نے تو اس دن کمال ہی کر دیا۔ سہروردی صاحب اعلیٰ مقرر (ORATOR) تھے اور انھوں نے اس میدان میں جو جوہر دکھائے تھے۔ قائداعظم ڈبیٹر (DEBATOR) تھے انھوں نے اس میدان میں کمال کا مظاہرہ کیا اور ایک نہایت مدلل، معقول اور فاضلانہ تقریر کی۔ خود ہی سوال کیے اور خود ہی ان کے جواب دیے۔ حاضرین کو یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ایک جادوگر کی گرفت سے چھوٹے تھے تو دوسرے ساحر نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ قائداعظم نے بھی ٹھیک ۴۵ منٹ ہی تقریر کی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ دونوں رہنماؤں کی تقریریں انتہائی مدلل، فکر انگیز اور دل میں اتر جانے والی تھیں۔

مجھے علی سردار جعفری کی جس صفت نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی حیثیت مقرر اعلیٰ صلاحیت ہے۔ چونکہ میں بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک پاس کر کے اینگلو عربک کالج دلی میں داخل ہوا تھا، اس لیے مجھے علی گڑھ میں ان کی تقاریر سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں سے مجھے وہ تقریریں یاد ہیں جو وہاں ۱۹۳۶ء کی طلبہ کی اسٹرائک کے دوران کی گئی تھیں اور جو ان کے یونیورسٹی سے رسٹیکیشن (RUSTICATION) کا باعث بنی تھیں۔ اس اسٹرائک کی فوری وجہ مڈرائٹ (MUDRIOT) کے دوران ایک پرووسٹ کے مہمان سے مبینہ بدسلوکی پر ایک طالب علم کے خلاف تادیبی کارروائی تھی لیکن حقیقتاً اس وقت کے وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کے خلاف ان جذبات کا اظہار تھا جو کافی دنوں سے طلبہ اور یونیورسٹی سے دیگر متعلقہ لوگوں کے دلوں میں پک رہے تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے بتا دوں کہ جب برسات کی پہلی بارش ہوتی تھی تو علی گڑھ کے طلبہ منچلے اور شرارتوں کے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے تھے۔ اس ضمن میں نووارد طلبہ خاص طور پر تختۂ مشق بنتے تھے۔ اس دھما چوکڑی کو مڈرائٹ کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کی بحیثیت ریاضی داں قابلیت مسلم، لیکن جہاں تک مسلم یونیورسٹی کا تعلق ہے، وہ ایک متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ ان دنوں علی گڑھ میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ سرکاری آدمی ہیں اور ان کا بحیثیت وائس چانسلر انتخاب حکومت ہند کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس عہدے کے لیے ان کے مدمقابل مشہور اور محترم سیاست داں نواب محمد اسمٰعیل

مارے مرحوم تھے، شاید سخت مقابلہ ہوا تھا اور ڈاکٹر صاحب صرف ایک ووٹ کی کثرت سے کامیاب ہوئے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ حکومت نے خاص طور پر نئی دلی سے ایک ہوائی جہاز حیدر آباد دکن بھیجا تھا کہ اس وقت وہاں کے وزیر اعظم سر اکبر حیدری مرحوم علی گڑھ آکر ڈاکٹر ضیاء الدین کے حق میں ووٹ دے سکیں اور ان کا یہ ووٹ فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔ نواب صاحب کے حق میں ووٹ دینے والوں اور کام کرنے والوں میں بڑے بڑے مسلمان سیاست داں اور ماہرین تعلیم شامل تھے جن میں سر فہرست مرحوم مولانا شوکت علی ہمارا ان میں سے بڑے بھائی مولانا شوکت علی مرحوم تھے جنھوں نے انتخابات کی گرما گرمی میں مخالف پارٹی کے کسی کام کو ایک دن طمانچہ بھی رسید کر دیا تھا۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی کے کورٹ میں میرے خاندان یعنی خواجگان پانی پت کی تین ووٹیں تھیں اور یہ سب نواب صاحب کو دی گئی تھیں۔ یہ تین ووٹیں شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین مرحوم بی اے علیگ، ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز صوبہ سرحد و مسلم یونیورسٹی کے پہلے گریجویٹ، یونین کے پہلے وائس پریذیڈنٹ اور کرکٹ ٹیم کے پہلے کیپٹن تھے، معروف مصنف اور آریوں کے خلاف مشہور مناظر مولانا غلام الحسنین فاضل مرحوم سابق پرنسپل اورینٹل کالج ممبئی اور علامہ اقبال مرحوم کے دوست اور اقبالیات پر اتھارٹی مشہور ماہر تعلیم اور اس وقت مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج کے پرنسپل خواجہ غلام السیدین مرحوم جو تقسیم ہند کے بعد بھارتی حکومت کے سکریٹری تعلیم ہوئے تھے، کی تھیں۔ اس طرح سے گو میں اس زمانے میں نواب محمد اسماعیل خاں اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین کی شخصیات اور خدمات سے واقف نہ تھا لیکن اپنے بزرگوں کو ٹھیک سمجھتے ہوئے، (اللہ مجھے معاف کرے ڈاکٹر ضیاء الدین سے ایک طرح کا تعصب ہو گیا تھا، اس لیے جب اسٹرائک کے دوران میں نے ان کے خلاف علی سردار جعفری کی دھواں دار تقریریں سنیں تو مجھے ان کی باتیں اچھی لگیں۔ میں ان کے انداز خطابت سے بھی بہت متاثر ہوا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مقرر یا تو اوریٹر (ORATOR) ہوتا ہے یا ڈبیٹر (DEBATOR) لیکن وہ اس اصول کا استثنا ہیں۔ وہ بیک وقت ایک خوش بیان اور فصیح و بلیغ خطیب بھی ہیں اور مباحث و مناظر بھی۔ اسٹرائک کے حق میں یونیورسٹی کی انتظامیہ کے خلاف انھوں نے بڑی مدلل جذباتی تقریریں کیں جن کے باعث طلبہ مشتعل ہو گئے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ساری یونیورسٹی میں مکمل اسٹرائک ہونے میں ان کی تقریروں نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں۔ اسٹرائک کے دوران پوری یونیورسٹی میں طلبہ کی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا تھا جس کا ذکر ان دنوں کے اخبارات میں بھی ہوا تھا مگر حقیقت حال یہ تھی کہ گو طلبہ ہوسٹلوں میں پکا ہوا کھانا نہیں کھا رہے تھے لیکن خاموشی سے کھانے کی مختلف چیزیں مثلاً بھنے ہوئے چنوں کی بوریاں سب ہوسٹلوں میں پہنچا دی گئی تھیں اور کوئی بھی لڑکا بھوکا نہیں رہتا تھا۔ نسبتاً خوش حال طلبہ علی گڑھ کی مشہور ستی میتا کے کباب، پراٹھے اور حلوا بھی کھاتے تھے جو وہ چوری چھپے پہنچا دیتے تھے۔

چونکہ میں بھی تھوڑی بہت تقریر کر لیتا تھا، اس لیے جب ہم دونوں علی گڑھ سے دلی منتقل ہوئے تو اینگلو عربک کالج ہوسٹل میں یہی قدر مشترک ہمارے ہم پیشہ ہونے کا باعث بنی۔ اس زمانے میں اینگلو عربک کالج میں اردو میں مقررین کی ایک بہت اچھی ٹیم بن گئی تھی جس میں ہم دونوں کے علاوہ بھارت کے ایک اور نامور شاعر اختر الایمان، آج کل کراچی کے معروف ایڈوکیٹ محمد ادریس قریشی اور عبدالمتین اور سندھ ہائی کورٹ کے جج اور پاکستان میں اسکاؤٹ تحریک کے سربراہ جسٹس ظہور الحق بھی شامل تھے۔ میں اس درس گاہ میں تعلیم کے چار برسوں میں سے پہلے تین برس دس کل ہند تقریری مقابلوں میں اپنے

پارٹنر کے ساتھ شامل ہوا تھا اور ہر جگہ ہمارے کالج کو ٹیم کی ٹرافی اور مجھے ذاتی انعام ملا تھا اور چونکہ میں سب جگہ سے انعام حاصل کر چکا تھا اس لیے پچھلے سال رضاکارانہ طور پر میں نے کسی تقریری مقابلے میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مجھے ہر جگہ سے اوّل ذاتی انعام ملا تھا سوائے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ہندو کالج دلّی میں منعقدہ تقریری مقابلوں کے جہاں علی سردار جعفری میرے پارٹنر تھے۔ وہاں انھیں اوّل اور مجھے دوم انعام ملا تھا۔ وہ مجھ سے بدرجہا بہتر مقرر تھے اور ان دونوں ڈیبیٹوں میں مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ مجھے اوّل انعام نہیں مل سکتا۔ علی گڑھ میں اوّل انعام یونیورسٹی کی خوبصورت مسجد کی چاندی کی شبیہ ہوتا تھا اور میرے دل میں اسے حاصل کرنے کی حسرت رہ گئی۔ یہ تو تھا علی سردار جعفری کے طالب علمی کے زمانے میں خطابت کا عالم۔ اس کے بعد مجھے ان کی تقریر سننے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں دوردرشن پر بعض مشاعروں اور دیگر علمی و ادبی تقریبوں میں ان کے صدارتی کلمات سنے ہیں جو ان کی بطور مقرر اعلیٰ ترین صلاحیت، دانشوری اور علم و فضل کے آئینہ دار تھے۔ حال ہی میں فیض فاؤنڈیشن نے انھیں لاہور میں اپنے مرحوم دوست فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا اور انھوں نے اس موقع پر ایسی گہری، بلیغ اور خوبصورت تقریر کی تھی کہ فاضل صدر جلسہ ڈاکٹر امداد حسین نے کہا کہ "ایسا عمدہ لیکچر میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ سنا ہے"۔

علی سردار جعفری ان غیر معمولی اور فاضل لوگوں میں شامل ہیں جن کو تقریر اور تحریر دونوں صنفوں پر یکساں عبور حاصل ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی وہ مضامین کے علاوہ افسانے اور ڈرامے لکھتے تھے۔ وہ اصل زندگی پر مبنی افسانے اور ڈرامے لکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ عام لوگوں کی حالت دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے لیے اور مقامات کے علاوہ سستے ہوٹلوں میں چائے پینے جاتے تھے جہاں میں بھی ان کے ساتھ گیا ہوں۔ وہ ادیب ہونے کے علاوہ صحافی بھی ہیں کیوں کہ بعد میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے اخبار "نیا ایج" (NEWAGE) کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ وہ ایک مستند تنقید نگار بھی ہیں۔

ان کی شہرت ان کی نثر کی وجہ سے بھی ہے اور نظم کے باعث بھی، لیکن زیادہ وجہ شہرت ان کی شاعری ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں بھی وہ ایک اچھے شاعر تھے۔ تب ان کی زیادہ تر شاعری احتجاجی اور انقلابی نوعیت کی تھی۔ وہ انگریزی حکومت کے خلاف نظمیں لکھا کرتے تھے جن میں وہ انقلابی اور باغیانہ خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ مثلاً اس زمانے کی ان کی ایک نظم کا پہلا مصرعہ یہ تھا "میں باغی ہوں بغاوت کا علم لے کر نکلتا ہوں"۔ شاعری کے میدان میں ان کا اب وہ مقام ہے کہ بھارت میں ٹی وی پر دکھائے جانے والے اکثر مشاعروں میں یا تو وہ صدر ہوتے ہیں یا مہمان خصوصی اور پاکستان میں سادات امروہہ کے زیر اہتمام کراچی میں ہونے والے اس ملک کے سب سے بڑے مشاعرے میں وہ مشاعرہ لوٹنے والے شاعر ثابت ہوتے ہیں

وہ ایک ذہین اور قابل طالب علم بھی تھے۔ اس کے باوجود کہ وہ اپنا کافی وقت علمی و ادبی کاموں اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں صرف کرتے تھے اور جہاں تک کورس کی کتابوں کا تعلق ہے وہ کلاس روم میں لیکچر سننے کے علاوہ امتحان کے دنوں میں ہی ان کی طرف کما حقہ توجہ دیتے تھے۔ امتحانات میں ان کے ہمیشہ اچھے نمبر آتے تھے۔ ان کا حافظہ بہت اچھا ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ ایک دفعہ سن لیتے یا پڑھ لیتے تھے وہ انھیں یاد ہو جاتا تھا۔ دلّی یونیورسٹی جہاں سے انھوں نے بی اے کا امتحان پاس کیا، غیر منقسم ہندوستان کی واحد یونیورسٹی تھی جہاں فرسٹ ڈویژن چھیاسٹھ فیصدی یا اس سے زیادہ نمبروں پر آتا تھا۔ باقی سب یونیورسٹیوں میں فرسٹ ڈویژن ساٹھ فیصد نمبروں پر مل جاتا تھا۔ بی۔اے میں ان کا سیکنڈ ڈویژن تھا

آیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے ان کے ساتھ نشست نہیں رہا۔ وہ ممبر ہوسٹل تھے یعنی اور یونیورسٹیوں کے سیار سے ان کا فرسٹ ائیر پوزیشن ہوتا۔

کالج میں کھیلوں کے سالانہ مقابلے ہونے لگے تو مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ انھوں نے ٹینس سنگلز ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیے اپنا نام دے دیا ہے۔ وہ کالج ٹینس کلب کے ممبر نہیں تھے اور میں نے انھیں کبھی ٹینس کھیلتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کے پاس ٹینس کی کٹ بھی نہیں تھی۔ اپنے پہلے میچ میں وہ بغیر کسی پریکٹس کے کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس میدان میں اترے اور دو چار راکٹ تھنڈ شوٹ مارے۔ بعد وہ آہستہ آہستہ فارم میں آنے لگے اور وہ میچ انھوں نے جیت لیا پھر کچھ پریکٹس کی۔ قصہ مختصر وہ کالج کے سنگلز چیمپین ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ علی گڑھ میں ٹینس کھیلتے رہے تھے۔ یہ بھی ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک پہلو ہے۔ اس ضمن میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے جس علم یا فن میں دلچسپی لی، اس میں کمال کا درجہ حاصل کیا۔

وہ ایک ہنس مکھ، عالی ظرف، وضع دار اور حقیقت شناس انسان ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں سالانہ امتحانات سے کچھ پہلے کالج کی مختلف سوسائٹیوں کے انتخابات ہوئے۔ اس زمانے میں اینگلو عربک کالج میں صرف بی۔ اے تک کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ ایم اے کی کلاسیں بعد میں شروع ہوئیں۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ مختلف سوسائٹیوں کی سکریٹری شپ کے امیدوار فرسٹ ائیر کلاس سے اور وائس پریزیڈنٹ شپ کے امیدوار تھرڈ ائیر کلاس سے ہوتے تھے تاکہ وہ فائنل ائیر کا امتحان دینے والے عہدے داروں سے بروقت چارج سنبھال سکیں۔ میں اس وقت فرسٹ ائیر میں تھا اور کالج کے سب سے اہم ادارے یعنی یونین کی سکریٹری شپ کے لیے امیدوار کھڑا ہوا تھا۔ تھرڈ ائیر کے طالب علم میر مشتاق احمد وائس پریزیڈنٹ کے عہدے کے لیے امیدوار تھے وہ اس سے قبل یونین کے سکریٹری رہ چکے تھے اور تقسیم ہند کے بعد دلی کی نشست سے انڈین پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے اور دلی میٹروپولیٹن کونسل کے چیف بھی رہے۔ ہم دونوں نے الیکشن میں ایک دوسرے کو سپورٹ کرنے کا سمجھوتہ کیا ہوا تھا۔ آخری وقت پر میر مشتاق احمد کے چند مخالفین نے ایک طرح سے زبردستی علی سردار جعفری کو اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ میر صاحب سے بہتر مقرر تھے لیکن میر صاحب کالج کے پرانے طالب علم تھے اور پھر میرا ان سے باہمی امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا اس لیے میں عجیب پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔

کیوں کہ کالج ہوسٹل میں میں جعفری بھائی کا پارٹنر تھا جن سے میرے انتہائی مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے اور الیکشن میں ان کے مدمقابل کا طرف دار تھا۔ میرے مدمقابل سکریٹری شپ کے امیدوار نے اس صورت حال کو ایکسپلائٹ (EXPLOIT) کر کے علی سردار جعفری کو میرے خلاف برگشتہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں اس سلسلے میں ان سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ ہوتی تھی اور اس طرح سخت تناؤ میں دو تین دن گزر گئے۔ آخر کار انھوں نے میری پریشانی کا اندازہ لگا کر خود مجھ سے بات کی اور کہا کہ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمھاری پوزیشن خوب سمجھتا ہوں اور میر مشتاق احمد کا بدستور ساتھ دیتے رہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس الیکشن میں سیریس نہیں ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ یہ حب علیؑ کا نہیں بغض معاویہؓ کا معاملہ ہے کیوں کہ میر صاحب کے مخالفین نے میری قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ میر صاحب کی مخالفت کی وجہ سے مجھے امیدوار بننے پر مجبور کیا ہے مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ میں کامیاب نہیں ہوں گا۔ اس سے میرے سر سے ایک بوجھ ہلکا ہو گیا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی انھوں نے پیشین گوئی کی تھی اور میر مشتاق احمد وائس پریزیڈنٹ منتخب ہو گئے۔ میں بھی سکریٹری ہو گیا بعد میں جعفری ہسٹاریکل سوسائٹی کے بلا مقابلہ وائس پریزیڈنٹ منتخب ہو گئے۔

یونین کے الیکشن میں ناکامی کے باوجود علی سردار جعفری یونین کی کیبنٹ سے بالعموم اور مجھ سے بالخصوص پورا تعاون کرتے رہے۔ اس وقت اینگلو عربک کالج مسلم لیگ کا گڑھ تھا اور اس درس گاہ نے ہندوستان کے دل دلی میں قائد اعظم محمد علی جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ کو اسٹیج فراہم کی تھی۔ کالج میں مسلم لیگی رہنماؤں کی تقریریں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن علمی سطح پر ہم دوسری طرف کا نقطہ نظر سننے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ ہم اعلیٰ اور قابل ترین کانگریسی رہنماؤں مثلاً سنٹرل اسمبلی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور ڈپٹی لیڈر مسٹر ستیہ مورتی۔ دیوان چمن لال اور مسٹر آصف علی، جوم وغیرہ کو بھی تقریر کرنے اور مباحثوں میں حصہ لینے کے لیے مدعو کرتے رہتے تھے۔ میری سکریٹری شپ کے دوران اب میں اس وقت آل انڈیا کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کی دلی آمد کی خبر ملی تو ہمیں انھیں کالج یونین میں تقریر کرنے کے لیے بلانے کا خیال آیا لیکن اس سلسلے میں ان سے خط و کتابت کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ اگلے دن دلی آنے والے تھے۔ اس پر علی سردار جعفری نے تجویز کیا کہ متعلقہ ریلوے لائن پر دلی سے پہلے اسٹیشن غازی آباد پہنچیں وہاں پنڈت نہرو کے رکتے ہیں۔ انہی سے وہاں ان سے تقریر کرنے کو کہیں گے۔ مجھے یہ مشورہ مضحکہ خیز سا لگا۔ ادھر لیکن جعفری بھائی کے احترام کی وجہ سے میں نے اس تجویز کے خلاف کچھ نہیں کہا اور ہم دونوں شام کو غازی آباد چلے گئے۔ رات کو وہاں ریلوے پلیٹ فارم پر رہے۔ دو ایک بنچوں پر سوئے۔ صبح کو انھیں علی سردار جعفری نے کہا کہ پنڈت جی سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں۔

اس لیے ہمیں دلی تک سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لے لینے چاہئیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب گاڑی آئی تو پلیٹ فارم پہ ان کے استقبال کرنے والوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ والنٹیرز کانگریس کے بڑے لیڈروں کے علاوہ کسی اور کو ان کے ڈبے میں داخل ہونے نہ دیتے تھے لیکن ہم کسی نہ کسی طرح ڈبے میں گھس گئے۔ بہت ممکن ہے ہمارا لباس ہمارے کالج کی یونیفارم یعنی شیروانی علی گڑھ کٹ کے پاجامے اور ترکش کیپ میں ملبوس ہونے کا بھی کچھ دخل ہو۔ وہاں ہم نے عجیب منظر دیکھا۔ میرٹھ ڈسٹرکٹ کانگریس کے صدر نے اپنا تعارف کرانے کے بعد پنڈت نہرو سے کہا کہ میرٹھ میں کانگریس کے خلاف کچھ بدگمانیاں ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لیے ہم وہاں ایک بڑا جلسہ عام کرنا چاہتے ہیں اور اس میں شرکت اور تقریر کرنے کے لیے آپ سے درخواست کرنے کے واسطے یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ یہ سنتے ہی پنڈت جی کا چہرہ غصے کے مارے لال ہو گیا اور انھوں نے بہت ناراضگی کے عالم میں میرٹھ کانگریس کے صدر کو جھڑکتے ہوئے کہا آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ میں آل انڈیا کانگریس کا صدر ہوں۔ کیا میرا یہ کام ہے کہ مختلف مقامات پر کانگریس کے جلسوں میں مقامی معاملات کے متعلق تقریر کروں۔ اور پالیسی اور اہم ملکی معاملات پر وقت صرف نہ کروں۔ کیا آپ اس قابل بھی نہیں کہ مقامی جلسوں میں تقریر کر سکیں۔ غصے کا ایک طوفان تھا جو رکنے میں نہیں آتا تھا اور اس کے تحت میرٹھ کانگریس کے رہنماؤں کی حالت قابل رحم تھی۔ پنڈت نہرو کو اس عالم غیظ و غضب میں دیکھ کر میں تو ہمت ہار بیٹھا لیکن علی سردار جعفری جو اس وقت بھی دانشور تھے کہاں چوکنے والے تھے۔ ہم پنڈت نہرو کے بالکل سامنے بیٹھے تھے اور ان کی ہم پر ایک دو مرتبہ نظر پڑ چکی تھی اور ہمارے لباس سے وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم مسلم طلبہ ہیں۔ وہاں سے بیٹھے بیٹھے ہی علی سردار جعفری نے پنڈت نہرو سے کہا کہ ہم دونوں دلی کے اینگلو عربک کالج میں پڑھتے ہیں اور وہاں کے طلبہ کی یونین کی طرف سے آپ کو تقریر کرنے کی دعوت دینے آئے ہیں۔ جواب میں اگر وہ یہ کہتے کہ اس سلسلے میں آپ کو کچھ قبل از وقت خط لکھنا چاہیے تھا تو ہمیں کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن انھوں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی بلکہ کانگریسی لیڈروں سے جس

سخت اور ترش لہجے میں جو بات کر رہے تھے وہ ایک دم انھوں نے بدل دیا اور شفقت آمیز لہجے میں ہم سے کہا کہ دلّی میں مجھے اپنا پورا پروگرام معلوم نہیں ہے۔ آپ میرے میزبان ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری (مرحوم) کے گھر فلاں وقت مجھ سے ملیں تو میں بتا سکوں گا کہ میں آپ کے کالج میں آ سکتا ہوں یا نہیں۔ قصہ مختصر وہ ہمارے کالج میں آئے اور اپنی بیٹھی ہوئی آواز اور ہانپتے یہ کہنے کے باوجود کہ وہ صرف ہمارے ساتھ چائے پئیں گے، تقریر نہیں کریں گے، انھوں نے وہاں تقریر بھی کی۔ اس واقعے کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مؤثر روزنامے کے قارئین کرام پر یہ ظاہر کیا جا سکے کہ طالب علمی کے اس دور میں بھی علی سردار جعفری کیسے فہم و فراست کے مالک تھے۔

انھوں نے پانچ پاکستانی ادیبوں سے مکالمے میں کہا تھا کہ "ہمارا خاندان مذہبی خاندان تھا۔ ہر شخص کی تشکیل سیرت میں اس کا گھریلو ماحول اہم کردار ادا کرتا ہے۔" یہ غالباً ان کے گھریلو ماحول کا اثر تھا کہ اینگلو عربک کالج میں تعلیم کے زمانے تک ان کے ذاتی کردار میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض بات نہ تھی جس پر کوئی انگشت نمائی کر سکتا۔ اگر ہوتی تو ایک کمرے میں ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھ سے نہ چھپتی۔ ہاں وہ اس دور کے اور بہت سے نوجوانوں کی طرح پابند صوم و صلوٰۃ نہ تھے، لیکن اسلامی اقدار ان کی سیرت میں رچی بسی ہوئی تھیں۔ اس سلسلے میں مجھے یاد ہے کہ میں ایک روز صبح کی نماز پڑھنے نہیں اٹھا اور خلافِ معمول ان کی آنکھ کھل گئی تو انھوں نے مجھے آواز دے کر کہا "نصیر! اٹھو نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔" ۱۹۳۸ء میں بی اے کر کے جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو دلّی میں ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں سنی جانے لگیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ مجتبیٰ حسین صاحب (مرحوم) کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں لکھنؤ میں قیام کے ضمن میں خود انھوں نے مکالمے میں کہا ہے "وہ احتشام ہمارے حلقے میں ضرور تھے لیکن وہ تھے بڑے ثقہ آدمی۔ ہمارے حلقے میں سبطِ حسن، مجاز اور سلام مچھلی شہری تھے۔ چنانچہ جو آوارگی ہم میں تھی، وہ احتشام کے پاس نہ تھی۔"

علی سردار جعفری کے مذہبی خاندان کا ذکر ہوا تو مجھے ان کا سنایا ہوا ایک لطیفہ یاد آیا جو ایک طرح سے ان کے خاندان کے مذہبی ہونے کا آئینہ دار ہے۔ ان کے مرحوم والد بزرگوار اور چچاؤں کے نام جعفر طیار، حیدر کرار اور احمد مختار تھے۔ جب یہ تینوں بھائی پیدا ہو چکے اور ان کے یہ نام رکھے جا چکے تو ان کے دادا مرحوم کے کسی زندہ دل بے تکلف دوست نے کہا کہ اب تمہارے کوئی اور بیٹا پیدا ہی نہ ہو تو بہتر ہے کیونکہ آگے قافیہ تنگ ہے اور اسی وزن کا ممکنہ صرف ایک نام پاک پروردگار باقی ہے۔
(بہ شکریہ "جنگ")۔

رباب جعفری

میرے بھائی

سر جبر کے آگے نہ کبھی تو نے جھکایا — معذوروں کی خدمت سے کبھی جی نہ چرایا
گرتے ہوئے انسانوں کو سینے سے لگایا — ناداروں کو عزت سے قریب اپنے بٹھایا

دنیا کی نگاہوں میں سردار بھائی کا شمار ایک ترقی پسند شاعر، مفکر، دانشور، پیام بر، ہند و پاک کے صف اول کے شاعر اور ادیبوں میں ہے لیکن میری نگاہ میں ان اوصاف کے علاوہ ایک محبت کرنے والے شوہر، بچوں کے شفیق باپ، بہنوں کے رفیق بھائی، بھائیوں کے قوت بازو، عزیزوں کے غمگسار، پڑوسیوں کے خیر خواہ، دنیا کے تمام انسانوں کے دوست کا نام سردار جعفری ہے۔

والدین کی موت کے بعد سردار بھائی نے مجھے اور چھوٹی بہن ستارہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ ہم جس ماحول کو چھوڑ کر آئے تھے اس سے یہاں کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ سردار بھائی نے ہمیں یہاں کے نشیب و فراز سمجھائے اور کہا۔ اگر تم دونوں اس زندگی کو اپنا لوگی تو تمہیں یہاں رہنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی ہمارے دل میں خود کام کرنے کا جذبہ تھا جب ہم نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر تم اپنا وقت گزارنے کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہو تو ضرور کرو۔ کام کرنا بہت اچھی بات ہے اس سے انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اس کے بعد ہم نے جو کام کیا کسی نے مخالفت نہیں کی اور ہم زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ سردار بھائی نے ہم بہنوں کی ہر قدم پر رہنمائی کی۔ ہمیں سیاسی اور انقلابی شعور بخشا۔ فرسودہ روایت جو زندگی میں موت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے بغاوت کا حوصلہ دیا۔ زمانے کے نئے طور طریقوں سے ہم آہنگ کیا ان کے ساتھ رہ کر ہمارا ادب اور زندگی کا شعور پختہ ہوا۔

سردار بھائی اور بھابی میں آپس میں بہت محبت ہے۔ زندگی کے ہر قدم پر ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی پسند اور جذبات کا خیال کرتے ہیں۔ سردار بھائی نے کبھی سلطانہ بھابی کو کسی بات کے لیے منع نہیں کیا اور نہ کوئی کام کرانے کے لیے ان پر جبر کیا۔ وہ اپنا ہر کام اپنی مرضی اور خوشی سے کر سکتی ہیں۔ سردار بھائی کہتے ہیں۔

عطا ہوئی میرے دل کی سلطنت مجھ کو
حریم دل میں اتر شمع دلبری لے کر

ان دونوں میں کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا۔ اسی سبب سے دوستی کی فضا قائم ہے اور گھر کا ماحول پرسکون ہے۔
یہ اپنے بچوں سے بھی بے انتہا محبت کرتے ہیں یوں تو دنیا کے سب والدین اپنے بچوں کو پیار کرتے ہیں لیکن ان کی چاہت کا رنگ دوسرا ہے سردار بھائی کا ایک بیٹا بچپن میں بے حد شریر تھا اس کی شرارت کی وجہ سے گھر کی بے شمار چیزیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ کبھی کبھی کھڑکیوں میں لگے ہوئے

رباب جعفری

شیشے اور کھانے کی میز کا شیشہ بھی ٹوٹ جاتا تھا۔ اس وقت اگر یہ گھر میں ہوتے تھے تو فوراً اس جگہ جاتے تھے۔ ٹوٹی ہوئی چیز دیکھنے کے بجائے اپنے بچے کے ہاتھ پاؤں دیکھتے تھے کہ کہیں خراش تو نہیں آگئی۔ قیمتی سے قیمتی چیز خراب ہو جانے پر بچوں کو کبھی نہیں مارا۔ بس ہر وقت بچوں کے آرام کا خیال پیش نظر تھا۔ گرمی اور سردی کی راتوں میں اٹھ کر دیکھتے تھے کہ ان کے کمرے کا پنکھا چل رہا ہے۔ کھڑکیاں کھلی تو نہیں رہ گئیں۔ اپنے بیٹوں کی ہر خواہش کو پورا کیا لیکن اس طرح کہ یہ ادب اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ دی۔ علی ناظم اور علی حکمت ماشاءاللہ برابر کے ہیں۔ لیکن دونوں بھائی باپ کا بے حد ادب کرتے ہیں۔

سردار بھائی کے بڑے بیٹے ناظم کی جب پہلی سالگرہ ہوئی تو اس زمانے میں وہ ناسک جیل میں تھے۔ سردار بھائی کے دل میں اس دن کے دیکھنے کی کتنی آرزو ہوگی۔ اپنے بیٹے کی پہلی خوشی میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے اس روز ان کے دلی جذبات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے پھر جیل کی چار دیواری میں قید ہو کر بیٹے کو کیا تحفہ دے سکتے تھے بچے سے دوری کی تڑپ میں انہوں نے ایک بہت پیاری سی نظم "نیند" لکھ کر بیٹے کی پہلی سالگرہ کا تحفہ بھیجا۔ ناظم کو اس نظم پر بہت فخر ہے وہ اس کو سب سے قیمتی تحفہ سمجھتے ہیں۔

نیند (نظم کا نام ہے)　　　نظم کا آخری حصہ

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی
دو زرات گولیوں ہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے۔
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
نرم نرم گالوں کو
گرم گرم آنکھوں کو
جھک کے پیار کرتی ہے
ایک حسین پری بن کر

رباب جعفری

لوریاں سناتی ہے

پالنا ہلاتی ہے

ناظم جعفری کی شادی سردار بھائی نے بڑی سادگی سے کی ان کی صرف یہ خواہش تھی کہ بہو خوب صورت خوش مزاجی اور تعلیم یافتہ ہو امیر لڑکی تلاش نہیں کی ناظم کی شادی حیدرآباد کے معزز خاندان میں ہوئی ہے وہاں برسوں سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے گھوڑے جوڑے کے نام سے بہت زیادہ روپیہ مانگتے ہیں۔ جب ان کی شادی کی تاریخیں طے ہوگئیں تو دلہن کے چچا نے سردار بھائی کو لکھا "آپ یہاں آکر لین دین کے بارے میں بات چیت کر لیجئے۔ انہوں نے جواب دیا "مجھے یا میرے بیٹے کو گھوڑے جوڑے کے نام پر روپیہ یا کسی سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی بہو سے بیٹیوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں

ہماری ایک بھابی اور بھتیجی بلرام پور میں رہتی تھیں جب ان دونوں نے میٹرک پاس کر لیا تو کالج میں داخلے کا سوال پیدا ہوا ہمارے خاندان کی ایک بزرگ خاتون لڑکیوں کو آگے تعلیم دلانے کے خلاف تھیں۔ لیکن لڑکیاں بضد تھیں کہ ہم اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے۔ انہوں نے گھبرا کر سردار بھائی کو خط لکھا کہ یہاں ایسے حالات ہیں اب صرف آپ ہی انہیں کالج میں داخلہ دلا سکتے ہیں۔ سردار بھائی یہ خط پاتے ہی اپنا سب کام چھوڑ کر بلرام پور چلے گئے اور وہاں جاکر پہلے ان بزرگ خاتون کو سمجھایا کہ آج وقت کا تقاضا ہے کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر تعلیم دیں پھر آنے والے زمانے کی مشکلات کے بارے میں بتا کر ان سے اجازت حاصل کر لی اور دونوں لڑکیوں کو کالج میں داخل کر دیا۔ اس واقعہ کے ایک سال کے بعد ان محترم خاتون نے اپنی بیٹی کو بھی اسی کالج میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا اب کہتی ہیں کہ سردار نے میری آنکھیں کھول دیں۔

حسن جعفری ہمارے بڑے بھائی ظفر عباس جعفری کے بیٹے ہیں۔ چونکہ ہمارے والد کے تین بھائی تھے ان تینوں کے درمیان یہ پہلا پوتا تھا اسی سبب سے پورے خاندان کی آنکھوں کا تارا تھے۔ سردار بھائی بھی بھتیجے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جب انجینئرنگ پاس کر کے یہ گورنمنٹ کی ملازمت کرنے لگے تو ان کو حسن مہدی کی شادی کی فکر ہوئی ہم سے کہا کہ دلہن ہمارے بھتیجے کی طرح حسین اور تعلیم یافتہ ہو ہم نے ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے بھابی جان اور بھائی جان سے شادی کی اجازت مانگی چونکہ وہ دونوں ہم سے محبت کرتے تھے اس لیے بخوشی اجازت دے دی۔ سردار بھائی نے شروع سے اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لی تھی۔ شادی بھی بہت شوق اور خوشی خوشی اپنے گھر سے کی۔ حسن مہدی بھی اپنے چچا کو اپنے والد کے برابر عزت دیتے ہیں۔

حسن مہدی کی شادی بمبئی کے مشہور مسلم لیڈر سید ابو محمد صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی ہے۔ جب شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تو اسی زمانے میں سردار صاحب کو دل کی تکلیف ہو گئی۔ ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کے لیے ہسپتال لے جانا چاہا لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میری دلی تمنا ہے کہ میں حسن مہدی کو دولہا بنا دیکھوں۔ ڈاکٹر یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے۔ جب حسن مہدی کی بارات جانے لگی تو یہ خود بھی بارات میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے فرمایا بھتیجے کی شادی کی خوشی میں یہ اس وقت اپنی بیماری بھول گئے ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ خوشی مرض پر غالب آجائے۔ سردار بھائی کے معالج ہندوستان کے مشہور ماہر قلب ڈاکٹر موتی الدین صاحب تھے خدا کے فضل سے ابھی حیات ہیں۔

ریسپشن سے واپس آکر انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ ہم سب کو بتایا کہ جب حسن مہدی کے چہرے سے نقاب اور سہرا اٹھایا گیا تو بے ساختہ لوگ کہنے لگے کہ ہم نے ایسا خوب صورت دولہا نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگ اس حسن کو دیکھ کر صلوٰۃ بھیجنے لگے۔ دوسرے بھتیجے حسنین جعفری کی شادی بھی ان کی خوشی کے مطابق ابو محمد صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوئی ہے دونوں بھتیجے خوش گوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رباب جعفری

بچپن سے سردار بھائی کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور عزیزوں سے بے پناہ محبت ملی ہے۔ اور اب ان کے ایسے محبت آمیز برتاؤ سے سب کے دلوں میں ان کا وقار اور بڑھ گیا ہے۔ یہ خاندان والوں کے لیے ایک مضبوط سہارا ہیں ایک بڑی طاقت ہیں اور ہمیشہ سے سب کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔

اپنے گھر میں آنے والوں کے ساتھ بھی سردار بھائی کا بہت شائستہ برتاؤ ہے ان کو بہت عزت دیتے ہیں اس بلند اخلاق کی وجہ سے سردار بھائی کے بارے میں ان لوگوں کے بڑے اچھے خیالات ہیں جس کمرے میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں اسی میں ہم دونوں بہنیں رہتی ہیں۔ کمرے کی دیواروں میں الماریاں لگی ہیں اور ان میں کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ میزوں اور زمین پر بھی کتابیں رکھی ہیں۔ غرض یہ کہ جس طرف نگاہ جاتی ہے کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔ میری ایک دوست جو بہت امیر اور اعلیٰ تعلیم کی مالک ہیں ایک روز وہ حسب معمول میرے پاس آئی ہوئی تھیں تھوڑی دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں۔ پھر کہنے لگیں "رباب تم بہت خوش نصیب ہو"۔ میں نے پوچھا "کیسے؟" اس پر انہوں نے جواب دیا۔ تمہارے پاس علم و ادب کا سرمایہ ہے۔ یہ بہترین کتابیں تمہاری ہر وقت کی ساتھی ہیں۔ پھر خدا نے تمہیں ایسا عالم بھائی دیا ہے کہ علم و ادب کے پرسکون ماحول میں رہتی ہو۔ جب میں اس کمرے میں تمہارے پاس آکر بیٹھتی ہوں تو میرے دل کو بڑی قوت ملتی ہے اس کے علاوہ اس جگہ آنے کے بعد مجھے ایک قسم کے رعب کا احساس ہوتا ہے جو در حقیقت ایک طاقت ہے اور یہ طاقت تمہاری زندگی کا حصار کئے ہوئے ہے۔ اردو کی مشہور ادیبہ عصمت چغتائی صاحبہ جن کو پیار سے ہم عصمت آپا کہتے ہیں نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا "تمہاری ماں نے تمہیں ایک ایسا بے بہا ہیرا دیا ہے جس کا کسی سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تمہارا بھائی سردار جعفری ہے۔ سیتا محل میں رہنے والے کہتے ہیں کہ ہماری بلڈنگ میں سردار جعفری کے رعب میں ایک دلنوازی رہتا ہے۔ بمبئی کے بڑے بڑے ڈاکٹر سردار بھائی سے فیس نہیں لیتے اور علاج بڑی توجہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر بہت مصروف رہتے ہیں لیکن ان کے بلانے پر چاہے دن ہو یا رات کبھی انکار نہیں کرتے۔ ایک ڈاکٹر نے فیس لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جعفری صاحب آپ اپنے ادب کے ذریعے ہمیں پہلے ہی فیس دے چکے ہیں۔

سردار بھائی کے اپنے دوستوں سے بھی بہت اچھے مراسم ہیں۔ ان لوگوں میں آپس میں کسی قسم کی غیریت نہیں ہے اپنے دوستوں سے بھائیوں جیسا برتاؤ ہے۔ ان کی فکر و پریشانی میں برابر کے شریک ہیں۔ دوستوں کی خوشی خود ان کی خوشی ہے۔ سردار بھائی کے دوستوں کے دلوں میں بھی ان کے لیے بڑی گنجائش ہے وہ لوگ ان کی بہت قدر و منزلت کرتے ہیں۔

سردار بھائی میں اپنے دوستوں کی مدد کرنے کا جذبہ طالب علمی کے زمانے سے ہے۔ جب یہ دہلی عربک کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی دوران کالج میں تقریر کرنے کے صلے میں ان کو ایک خوب صورت چاندی کی بنی ہوئی مسجد انعام میں ملی تھی اس کے ملنے کے کچھ دن کے بعد سردار بھائی کے ایک دوست کے پاس ۸ ۔ ۵ کی فیس دینے کے لیے روپیہ نہیں تھا۔ جب یہ بات ان کو معلوم ہوئی تو انہوں نے اپنی چاندی کی مسجد فروخت کر کے اپنے دوست کی فیس ادا کر دی۔ اسی طرح سے سونے کے کئی تمغے اپنے دوسرے دوستوں کی مدد کے واسطے بیچ دئیے۔

چند سال پہلے اردو کے مشہور شاعر کیفی اعظمی صاحب پر رات میں کسی وقت فالج کا حملہ ہوا تھا۔ سردار بھائی کو یہ خبر دوسرے دن گیارہ بجے دوپہر میں ملی۔ یہ سنتے ہی ایک دم سے گھبرا گئے اٹھ کر یہاں کے کئی اسپتالوں میں فون کیا اور ایک گھنٹے کے اندر بمبئی کے بہت اچھے نرسنگ ہوم بریچ کینڈی میں داخل کر دیا۔ ان کی بیوی شوکت کیفی کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میرا گھر نرسنگ ہوم سے قریب ہے یہاں رہنے میں تم روز جوہو جانے کی تکلیف سے بچ جاؤ گی اور کیفی سے بھی قریب رہو گی۔ شبانہ اور بابا کی بھی دلجوئی کرتے تھے۔ کیفی صاحب کے پروڈیوسر دوست کے پاس ان کا روپیہ باقی تھا وہ منگوا کر شوکت کیفی کو دے دیا اور یہ تسلی دی کہ کیفی کا علاج کرانا میری ذمے داری ہے تم گھبرانا نہیں۔

سباب جعفری

جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس صاحب، کرشن چندر کی بیماری میں بھی سردار بھائی بے چین اور بے قرار تھے۔ ہر وقت ان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ ان کے ہم عصر ادیبوں کے علاج میں کسی قسم کی کمی نہ رہ جائے۔ کرشن چندر اور مظفر شاہ جہاں پوری کے علاج کے لیے گورنمنٹ سے روپیہ دلوایا، کیونکہ دل کی بیماری میں روپے کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ایک دو شعراء کو چھوڑ کر کسی ادیب یا شاعر کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا علاج خود کرا سکے۔

بمبئی سے باہر کے ایسے بہت سے لوگ آتے ہیں جن کے پاس یہاں کے اسپتالوں کے اخراجات برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ جب سردار بھائی کو ان لوگوں کی یہ حالت معلوم ہوتی ہے تو یہ ان کی مدد کرنے کے لیے خود روپیہ دیتے ہیں اپنے عزیزوں اور دوستوں سے دلواتے ہیں بمبئی میں ایسے بہت سے ادارے موجود ہیں جو ضرورت مند مریضوں کو روپیہ یا مرض کی ضرورت کے اعتبار سے اشیاء کی صورت میں امداد دیتے ہیں۔ سردار بھائی ان اداروں سے رابطہ قائم کر کے ان کی ضرورت پوری کرا دیتے ہیں۔

بمبئی کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں اور چھوٹے چھوٹے گاؤں کے لوگ مفلسی سے مجبور ہو کر ان سے مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔ سردار بھائی ان سے ایک دوست ایک عزیز کی طرح ملتے ہیں اور ان کی ضرورت کے لیے روپیہ دیتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ کس کو کیا دیا! دست سوال پھیلانے والے کی مجبوری اور لاچاری کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے اس طریقے سے پیسے دیتے ہیں کہ اس کی خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔

محبت، ہمدردی کسی کے برے وقت میں کام آنے کا جذبہ خدا نے سردار بھائی میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اپنے نرم دل کے باعث کسی کو تکلیف میں مبتلا نہیں دیکھ سکتے۔ ایک سال بمبئی میں شدید بارش ہوئی تھی۔ سامنے کی بلڈنگ کے سائے میں بارش سے پناہ لینے کے لیے فٹ پاتھ کے بچے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ معصوم بچوں کے جسم پر صرف پھٹے ہوئے جانگیے تھے۔ تیز ٹھنڈی ہوا اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بچے تھر تھر کانپ رہے تھے سردار بھائی نے جب یہ دلخراش منظر دیکھا تو فوراً گھر میں سے چھوٹے چھوٹے کپڑے نکال کر اور روٹیوں میں سالن رکھ کر دونوں چیزیں غریب بچوں کو دے دیں۔ بچے کھانا اور کپڑے لے کر بہت خوش ہوئے۔

سردار بھائی گھر سے باہر جاتے ہیں تو کبھی کبھی مزدوروں اور فقیروں کے بچے دوڑ کر ان کے پاس آ جاتے ہیں اور پیسے مانگتے ہیں۔ یہ پیسے دینے کے بجائے بچوں کو اپنے گھر کے نیچے بنے ہوئے چھوٹے سے ہوٹل میں لے جا کر چائے، پیسٹری یا کھانا کھلا دیتے ہیں تاکہ بچوں میں بھیک مانگنے کی عادت نہ پڑے۔ چند سال پیشتر گجرات میں ہولناک قحط پڑا تھا۔ ہزاروں لوگ بے گھر بے دیار ہو گئے تھے۔ ان میں سے بہت سارے لوگ بمبئی میں روزگار کی تلاش میں آ گئے تھے۔ ایک روز سردار بھائی نے دیکھا کہ ان کی بالکنی کے نیچے چند مرد، عورت کھڑے ہوئے سردی سے کانپ رہے ہیں۔ وہ مسکینوں کی کیفیت دیکھ کر شاید ان کا دل ہل گیا۔ اس وقت یہ گرم جاکٹ پہنے ہوئے تھے انہوں نے اس کو اتار دیا اور بکس میں سے دوسرے سویٹر جاکٹ نکال کر ان لوگوں کو دے دیے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سلام کیا اور اپنی زبان میں دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ بالکنی کے نیچے قحط کے مارے ہوئے انسانوں کا مجمع کھڑا ہوا ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے جن چار پانچ آدمیوں کو کپڑے دیے تھے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو جا کر بتایا کہ ایک رحم دل انسان غریبوں کو گرم کپڑے بانٹ رہا ہے ان سے یہ بات سن کر بہت سارے آدمی آئے تھے۔ بڑا دردناک منظر تھا اس وقت گھر میں جتنے گرم کپڑے اور چھوٹی چھوٹی گرم شالیں تھیں وہ گھر والوں کے واسطے ایک ایک چھوڑ کر سردار بھائی نے سب کپڑے غریبوں کو دے دیے جب یہ آدمی چلے گئے تو ان کی جگہ دوسرے ننگے بھوکوں نے لے لی جن میں بچے بھی شامل تھے ان کی خستہ حالی دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ گھر کے سب گرم کپڑے ختم ہو گئے تھے۔ سردار بھائی نے گرانٹ روڈ بازار بھیج کر چھوٹے بڑے کپڑے منگائے اور وہ بھی تقسیم کر دیے۔ پھر سلطانہ بھابھی نے سمجھایا کہ تم نے غریبوں کو کپڑے دے کر ان کو سردی سے بچایا لیکن تم ہزاروں آدمیوں کا تن نہیں ڈھک سکتے۔

سردار بھائی کی زندگی ایسے سیکڑوں واقعات سے روشن ہے۔ اگر سب لکھے جائیں تو ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک ٹی۔وی پکچر کی شوٹنگ ان کے کام کرنے کے کمرے میں ہو رہی تھی۔ جو لوگ کام کرنے کے لیے آئے تھے ان کو دوپہر کا کھانا کھلایا تھا۔ کھانے کے وقت پر کھانا میز پر لگا دیا گیا اور سب کو بلایا۔ سب لوگ میز کے قریب آ گئے لیکن وہ تین آدمی جو کیمرا وغیرہ اٹھانے کا کام کر رہے تھے وہ کھانا آتے ہوئے دیکھ کر گھر سے باہر چلے گئے تھے۔ سردار بھائی نے جب ان تینوں آدمیوں کو کھانے میں شریک نہیں دیکھا تو ان کو بلانے کے لیے خود گئے اور اپنے ساتھ لے کر واپس آئے۔ جب ان سے کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تو بے چاروں نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ سردار بھائی نے ان سے کہا کہ "میرے گھر میں سب برابر ہیں۔" آپ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھر ان کو اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر دیا۔ وہ اپنی عزت افزائی سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

ایک مرتبہ ہمارے گھر کے قریب کی کچھ بلڈنگوں میں کسی وجہ سے پانی بہت کم آتا تھا جس سے وہاں کے رہنے والوں کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی ہماری بلڈنگ میں ۲۴ گھنٹے پانی دستیاب تھا۔ وہاں کے بہت سے لوگ ہمارے فلیٹ سے پینے اور نہانے کے لیے پانی لے جاتے تھے۔ سردار بھائی کے ایک دوست کی لڑکی پینگ گیسٹ کی حیثیت سے برابر کے فلیٹ میں رہتی تھی لیکن کھانا کھانے کے لیے ہمارے گھر میں آتی تھی۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایک نیا نوکر کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ ایک روز اس نے سردار بھائی سے کہا "صاحب! ہم آپ کے گھر میں کام نہیں کریں گے۔" انھوں نے پوچھا "کیوں؟" لڑکے نے برجستہ جواب دیا "آپ کا گھر، گھر نہیں ہے۔ ہوٹل ہے کوئی آدمی کھانا کھانے کے لیے آتا ہے تو کوئی ناشتہ کر کے چلا جاتا ہے اور کچھ لوگ یہاں سے پانی بھر بھر کے لے جاتے ہیں۔ مجھے یہ طریقہ بالکل پسند نہیں ہے۔" سردار بھائی نے یہ سن کر خاموشی سے اس کی تنخواہ نکال کر دے دی اور اس سے کہا کہ "میں تمہاری وجہ سے اپنے دوستوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔"

دوسرے نوکر نے ہم سب کی غیر موجودگی میں الماری میں سے سونے کے بندے نکال لیے۔ جب اس سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ ان کے پیروں پر گر پڑا اور رو رو کر کہنے لگا کہ "مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں نے اپنی بیوی کے کہنے پر بندے نکالے ہیں اور وہ دلہن بیگم دے دیے صاحب مجھے معاف کر دیجیے ورنہ میری بیوی مجھے چھوڑ کر بھاگ جائے گی اور میرا گھر اجڑ جائے گا۔" واقعی سردار بھائی نے اس کا قصور معاف کر دیا۔ دوسرے دن وہ اپنے گاؤں چلا گیا۔ گھر میں ایک دو مرتبہ اور بھی چوریاں ہوئیں لیکن انھوں نے کسی نوکر کو پولیس کے حوالے نہیں کیا۔ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ "مفلسی انسان سے سب کچھ کراتی ہے۔" اپنے گھر میں کام کرنے والے آدمیوں سے بہت شائستہ برتاؤ کرتے ہیں۔ بڑی عمر کے آدمیوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ لڑکوں سے بیٹا کہتے ہیں۔ ان کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ گھر میں سب پر یہ تاکید ہے کہ نوکر کو نوکر نہ کہا جائے۔ یہ محنت کش لوگ ہیں ان سے اخلاق سے پیش آنا چاہیے۔

سردار بھائی کا ایک بیٹا شاید چار پانچ برس کا ہوگا اس نے کسی بات پر خفا ہو کر اپنے گھر کے باورچی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ یہ سامنے بیٹھے تھے جب بات ختم ہو گئی تو بیٹے کو پاس بلا کر کہا کہ جاؤ منہ ہاتھ دھو ڈالو۔ پھر میرے پاس آنا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کو سمجھایا کہ ابھی تم نے جس آدمی کو مارا ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑا ہے۔ یہ تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ تم ابھی اس کے پاس جاؤ اور اس سے معافی مانگو۔ اگر تم میرا کہنا نہیں مانو گے تو میں نہ تم سے بات کروں گا اور نہ پیار کروں گا۔ بچے نے اپنے باپ سے یہ بات سن کر باورچی کے پاس جا کر معافی مانگ لی۔ اس واقعہ کے بعد کبھی کسی بچے نے نوکر سے بدتمیزی نہیں کی۔

چونکہ بمبئی ایک صنعتی شہر ہے۔ تمام ہندوستان کے لوگ کچھ کرنے آتے ہیں۔ یوپی اور بہار وغیرہ کے بہت سے نوجوان لڑکے روزگار کی تلاش میں آتے ہیں۔ جن کی زندگیاں عسرت اور فاقوں میں گذرتی ہیں۔ دو تین لڑکے ایسے آئے جن کے بارے میں چند ماہ کام کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ٹی بی کے مریض ہیں۔ سردار بھائی نے ان بیمار لڑکوں کو گھر سے نہیں نکالا بلکہ ان کو اسپتال میں داخل کرا کے علاج کرایا۔ دواؤں اور کھانے کے اخراجات خود

برداشت کیے۔ جب اچھے ہوگئے تو ان کو آفس میں چپراسی کی جگہ دلا دی۔ اس طرح وہ مزدوری کی جفاکشی سے بچ گئے اب اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ عید، دیوالی کے تہواروں پر اپنے بچوں کو لے کر یہاں آتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں۔ دوسرے ادیب شاعروں کے پاس کام کرنے کے علیحدہ کمرے ہیں۔ جب وہ کام کرتے ہیں تو گھر میں خاموشی رہتی ہے۔ لیکن سردار بھائی کو مشکل سے چند گھنٹے ایسے ملتے ہیں جن میں وہ تنہائی میں کام کر لیں۔ ہم دونوں بہنوں کے علاوہ آنے والے مہمان اسی کمرے میں آکر بیٹھتے ہیں۔ اکثر بچے بھی یہاں آکر کھیلتے ہیں۔ کبھی بچوں کو شور کرنے پر نہیں منع کرتے اگر کوئی دوسرا روکتا ہے تو کہتے ہیں کہ بچوں کو کھیلنے دو۔

ننھا اقبال خوب صورت اور ذہین بچہ ہے۔ وہ کمرے میں آتے ہی میز پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے کبھی قلم لینا چاہتا ہے۔ کبھی کاغذ کھینچتا ہے۔ سردار بھائی کو ٹائپ کرتا ہوا دیکھ کر اس کو مانگتا ہے اس وقت یہ کتنا ہی ضروری کام کر رہے ہوں اس کو چھوڑ کر پوتے کی خوشی پر ٹائپ رائٹر اس کو کھیلنے کے لیے دے دیتے ہیں۔ اپنے پوتے ننھا اقبال جعفری کو دونوں بیٹوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔

گھر کے دوسرے افراد کی ضروریات ہر وقت پیش نظر رہتی ہے۔ سب کے آرام کو اپنے آرام پر ترجیح دیتے ہیں۔ سردار بھائی کے دوست عزیز اکثر بمبئی آیا کرتے ہیں کبھی کبھی ایک وقت میں بہت سے مہمان آجاتے ہیں تو سونے کے لیے جگہ کم ہو جاتی ہے۔ اس وقت یہ اپنے سونے کا کمرہ ان لوگوں کے واسطے خالی کر دیتے ہیں اور خود زمین پر بستر بچھا کر سو جاتے ہیں۔ بارہا ہم لوگوں نے کہا کہ آپ پلنگ پر سو جائیے ہم نیچے سو جائیں گے۔ لیکن کسی کو زمین پر نہیں سونے دیتے اور اپنے گھر میں آنے والوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیتے کہ اس کی وجہ سے میزبانوں کو تکلیف ہے بلکہ وہ ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرتا ہے۔

سردار بھائی کے اسسٹنٹ شمیم صاحب ہال میں بیٹھ کر ٹائپ کرتے ہیں۔ جس کی آواز برابر کمرے میں آیا کرتی ہے اس آواز کے شور کے باوجود اپنی میز پر بیٹھے ہوئے کام کرتے رہتے ہیں سردار بھائی کی قوت برداشت اور اعلیٰ دماغی کی داد دینی چاہیے کہ ان حالات میں انہوں نے عظیم ادب تخلیق کیا۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود انہوں نے بڑی تیز اور تند طبیعت پائی ہے اگر ان کو کوئی بات ناگوار گذرتی ہے تو فوراً غصہ آجاتا ہے۔ چونکہ خدا نے قوت برداشت حد سے زیادہ عطا کی ہے اس وجہ سے اظہار نہیں کرتے۔ خاموشی سے ٹال دیتے ہیں۔

ان کے سامنے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے بارے میں ہتک آمیز باتیں کرتا ہے تو یہ اس گفتگو کو بالکل برداشت نہیں کرتے اس کو اسی جگہ رد کرتے ہیں۔ چونکہ خود انصاف پسند، فراخ دل، خوش اخلاق، خوش گفتار اور شائستہ کلام انسان ہیں۔ غیبت، انتقام، کسی کو نقصان پہنچانے جیسے گندے جذبے سے ان کا دل پاک ہے۔ اسی سبب سے بے جا باتوں پر اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو بھی معاف نہیں کرتے اپنے اصولوں پر سختی سے پابند ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کو جھکا نہیں سکتی۔ کسی جگہ موم کی طرح نرم ہیں تو کسی جگہ فولاد کی مانند سخت ہیں۔ ان کی نڈر طبیعت کا روشن ثبوت جنگ آزادی کی جدوجہد ہے۔ سنہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ عام بیداری پھیل گئی تھی پھر بھی انگریز حاکموں کے رعب کا یہ عالم تھا کہ بڑی تعداد میں لوگ ان کے خلاف بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پر سردار بھائی کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ مجاز، ظہیر اور ڈاکٹر اشرف کے ساتھ تحریک آزادی میں بے جھجک حصہ لیا۔ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں انگریزی حکومت کے خلاف تقریریں کرتے تھے اہل وطن کے دل میں وطن کی محبت اپنی ذات پر اعتماد اور آزادی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے بہترین ادب تخلیق کیا۔ اس زمانے کے حالات لکھنے کے لیے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ غرض یہ کہ جیلوں کی صعوبت برداشت کی، لیکن جابر حکومت کے آگے سر نہیں جھکایا۔

سردار بھائی کی شاعری میں اپنے وطن کی عظمت، محبت، اس کا وقار، انسان کا احترام، عوام کا درد، ظلم و استبداد سے نفرت، تابناک مستقبل کی بشارت ہے۔ عام عالم انسانیت کے بلا تفریق مذہب و ملت عزت نفس کا پیغام ہے۔ شاعری کے اس حسن کی وجہ سے ان کو بے پناہ مقبولیت

حاصل ہے۔ ہندوستانی عوام دل و جان سے چاہتے ہیں ان کے دل میں اپنے مایۂ ناز شاعر کے لیے بڑی عقیدت ہے۔ بمبئی کے علاوہ چھوٹے چھوٹے مقامات میں بھی مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ اردو کانفرنس وغیرہ ہوتی ہے جہاں ان کو بڑے اصرار کے ساتھ بلاتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک میں بھی ان کے پرستار موجود ہیں۔ وہاں کے لوگ مشاعروں کے ذریعے اپنے پسندیدہ شاعر کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ سردار بھائی کی بلند پایہ شاعری کی عظمت سننے والوں کے دلوں میں بسی ہوئی ہے کینیڈا، جرمنی، نیویارک، پاکستان اور عراق وغیرہ میں ان کو مشاعرے اور امن کانفرنس کی نمائندگی کے لیے بلایا گیا ہے۔

حکومت ہند بھی سردار بھائی کی بڑی قدر و منزلت کرتی ہے۔ ان کی ادبی کاوشوں کے صلے میں ان کو کئی ادبی ایوارڈ ملے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ہمارے ملک کی ہر دل عزیز وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی صاحبہ نے اپنے دست مبارک سے سوویت لینڈ ایوارڈ عطا کیا تھا۔ ۱۹۷۸ء میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اردو ادب میں انکو غیر معمولی پچاس سالہ تخلیقی خدمت کے صلے میں ان کو کل ہند میر تقی میر اعزاز پیش کیا ہے اس اکادمی کی طرف سے سردار بھائی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

"جناب سید علی کا شمار ہند و پاک کے صف اول کے شاعروں اور ادیبوں میں ہے۔ اردو ادب اور ادبی رجحانات کا پورا ایک دور آپ کی شخصیت اور کارناموں سے وابستہ ہے۔ اردو شاعری کے ترقی پسند اور انقلابی کردار کو ایک نئی جہت سے آشنا کرنے والوں میں آپ ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ آپ کی شاعری عوامی، فکر و فلسفہ اور انسان دوستی کے بلند آدرشوں کی نہایت واضح، پر جوش اور فنکارانہ ترجمانی سے پہچانی جاتی ہے آپ کے جہاں آفرین شعری اسلوب میں ندرت و تازگی کے ساتھ ساتھ جاندار کلاسیکی روایات کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔"

۲۹ نومبر ۱۹۸۳ء میں سردار بھائی ستر سال کے ہو گئے۔ ان کی سالگرہ کے جشن بلرام پور (یو۔پی)، گونڈہ، مرزاپور (یو۔پی) اور دہلی میں منائے جا رہے ہیں۔ بمبئی میں ہاؤس آف سوویت کلچر کی طرف سے سردار بھائی کی سالگرہ کا جشن بڑے شاندار طریقے سے منایا گیا جشن کے اختتام پر سوویت یونین کی طرف سے ان کو امن کا تحفہ دیا گیا۔ یہ ہندوستان میں چند لوگوں کو ملا ہے۔

ہندوستانی عوام خدا کرے اپنے محبوب شاعر کی ایسی بہت سی سالگرہ منائیں۔ میری بہترین دعائیں شاعر اور اس کے چاہنے والوں کی پاسبان ہیں۔

ستارہ جعفری

سردار بھائی

سردار بھائی پانچ بہنوں اور ایک بھائی کے بعد بقرعید ۲۶ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلرام پور میں پیدا ہوئے[1] والدین سے سنا ہے پیدائش کے وقت بہت گورے اور تندرست تھے۔

ہمارے خاندان کا دستور تھا بچے کو نہلانے دھلانے کے بعد اس کے ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں اقامت سنائی جاتی تھی۔ یہ کام مولوی یا کوئی بے حد عبادت گزار شخص کرتا تھا اور سب لوگ اس تقریب میں شریک ہوتے تھے۔ جب سب جمع ہو گئے تو ہمارے کوٹھی میں رہنے والے ایک مستقل مہمان نے نومولود کے نام کا سہرا کہا ۔ بجائے اذان و سلام ہونے علی سردار ہمارے ابا جان کے ایک بے حد قریبی شناسا دوست فرخ حسن تھے جو فرخے بھیا کہلاتے تھے انھوں نے تاریخ پیدائش نکالی۔

دیا حق نے جعفر کو ثانی پسر
ہر اک دیکھ کر جس کو شیدا ہوا
کہی دل نے تاریخ اسدم سے
مبارک خوش اقبال پیدا ہوا

اور ابا جان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا

”یہ بچہ بلند اقبال ہوگا اور دنیا میں نام روشن کرے گا۔“ آج میرے والدین اور ان کے دوست تو اس دنیا میں نہیں ہیں منوں مٹی کے نیچے محو خواب ہیں لیکن ان کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ پرستاروں اور شیدائیوں کا تو کوئی اندازہ نہیں نام کتنا روشن ہے اس بات کا اندازہ پڑھنے والوں کو خود ہوگا۔ میں چھوٹی بہن ہوں اپنی زبان سے کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہاں اپنے ہونہار بھائی پر ناز ضرور ہے

---

[1] میں نے بزرگوں سے یہی تاریخ پیدائش سنی تھی جو اوپر لکھی ہے اماں سالگرہ بھی ۲۶ بقرعید کو کرتی تھیں لیکن سردار بھائی کو ۲۹ نومبر یاد ہے۔ اوپر تاریخ پیدائش کا قطعہ موجود ہے جو حضرات اس سے تاریخ نکالنا جانتے ہوں وہ معلوم کر سکتے ہیں۔

شاید لوگوں کو یقین نہ آئے لیکن ہمارے بزرگ بتاتے تھے۔ کہ انھوں نے شاعری کی ابتدا دو سال کی عمر سے کر دی تھی سردار بھائی کی پیدائش کے دو سال بعد ایک بہن اور پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پیدا ہونے کے بعد سردار بھائی سے ماں کی گود چھوٹ گئی یہ سب سے بڑی بہن آپا زبیدہ کے سپرد کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی آپا کے ساتھ سوتے تھے۔ سردار بھائی کو اپنی ماں سے علیحدگی بہت ناگوار ہوئی۔ ہر وقت کہتے رہتے تھے ؂

اُوپر سے گری ٹھیکری بادام چھوارا
اس منی نے بھابھی کی گودی سے نکالا

{ یہ مصرعہ نامعلوم کس کا ہے
نیچے سردار بھائی کا خیال }

بھابی اماں سے کہتے تھے۔ اس منی نے بڑی جلدی اپنے بھائی کے لیے ماں کی شفقت بھری گود خالی کر دی۔ کچھ سالوں کے بعد ہم دو چھوٹی بہنوں نے پھر ماں کی گود پر قبضہ کر لیا۔ میں چونکہ سب سے چھوٹی ہوں اس لیے آخر وقت تک قبضہ رہا۔

ہمارا خاندان آگرہ کا ہے۔ لیکن کوئی بزرگ ملازمت کے سلسلے میں ریاست بلرام پور آ گئے تھے۔ بلرام پور کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے۔ وہاں کے جنگلات اور ندیاں بہت خوبصورت ہیں۔ جب برسات کے موسم میں گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں تو بارش کے بعد ہمالیہ کی برف پوش چوٹیاں بادلوں کے کناروں پر ستاروں کی طرح جھلملاتی ہیں۔

اُس وقت جو وہاں کے جاگیردار تھے ان کو ہمارے بزرگ نے مہاراجہ بلرام پور کا خطاب دلوایا تھا۔ پہلے زمانے میں تو چھوٹی سی بات کا بھی بہت بڑا احسان مانا جاتا تھا۔ لہٰذا مہاراجہ نے ان کو اپنی ریاست کا منیجر بنا دیا اور رہنے کے لیے ایک بڑی سی کوٹھی دی۔ جس کو خاندانی حیثیت مل گئی درمیان میں بڑا سا ہال ہے اور اس کے گرد کئی کمرے اور غسل خانے وغیرہ ہیں۔ ان کے چاروں طرف نہایت کشادہ برآمدے ہیں۔ اُس وقت ایک برآمدے کے سامنے بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب پانی کا ایک کنواں اور دو حوض تھے۔ قریب ہی پپیتے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ چبوترے کی دیواروں پر گلاب اور چمبیلی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چاروں کونوں میں شمشاد کے درخت لگے ہوئے تھے ان کے درمیان میں گلاب موگرے اور دوسرے خوشبودار پھولوں کی روشیں بنی ہوئی تھیں اور درمیان میں ہری ہری دوب لگی ہوئی تھی۔ جو دیکھنے میں سبز مخمل کا فرش معلوم ہوتی تھی باقی کے چاروں برآمدے پھولوں کے گملوں سے سجے رہتے تھے۔ جس برآمدے سے باہر جانے کا راستہ تھا اُس کے سامنے بہت بڑا آنگن تھا۔ آنگن کے درمیان میں نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ اس کے گرد اینٹوں کا گول دائرہ بنا کر پھولوں کے گملوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ نیم کا درخت اتنا اونچا اور گھنا ہے کہ پورے آنگن اور کوٹھی کی چھت تک چھایا ہوا ہے یہ اب تک موجود ہے۔ اس کی وجہ سے گرمیوں میں بڑی ٹھنڈک رہتی تھی اس کے بعد کوٹھی میں داخل ہونے کا پھاٹک تھا جو اتنا بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گزر سکتا ہے۔ پھر بہت بڑا لان تھا۔ اس کے چاروں طرف سرخ اینٹوں کی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس میں لوہے کے دو پھاٹک لگے ہوئے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک سے لان کے پھاٹک تک سرخ رنگ کی بجری کی سڑک بنی ہوئی تھی۔ اس سڑک اور لان کو مہندی کی باڑ لگا کر تقسیم کیا گیا تھا۔ لان میں ٹینس کورٹ بنا ہوا تھا۔ لان کے پھاٹک کے دونوں جانب گل مہر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ باقی حصّہ موسمی پھولوں کی کیاریوں سے سجا رہتا تھا۔ اس کی نگہداشت کے لیے ریاست کی طرف سے دو مالی تھے اور موسم کے پھول لگوانے کا کام میرے چھوٹے چچا کے سپرد تھا۔ کوٹھی کے اطراف میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ ہمارا گھر ذاتی ہے ان مکانات میں میرے دونوں چچا اور چند قریبی عزیز رہتے تھے چونکہ ہمارے خاندان میں پردہ کا رواج تھا۔ نو سال کی عمر ہونے کے

کے بعد لڑکی پردہ کرنے لگتی تھی پھر باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اس لیے عورتیں اور لڑکیاں گھروں کے اندر رہتی تھی اور کوٹھی مردوں کے استعمال میں رہتی تھی یا جو کوئی مہمان آتا تھا وہ ٹھہرتا تھا

ہمارے دادا کو ریاست کی طرف سے چار گاؤں ملے تھے۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز پیدا ہوتی تھی اور باغات تھے ان میں آم، لیچی اور دوسرے پھل بکثرت پیدا ہوتے تھے۔ سال تمام ہونے کے بعد کچھ رقم ریاست کے خزانے میں داخل کر دی جاتی تھی۔ دادا کے انتقال کے بعد میرے والد ریاست بلرام پور کے اسلحہ خانہ (جہاں ہتھیار رکھے جاتے ہیں) اور توشہ خانہ کے آفیسر ہو گئے۔ (توشہ خانہ جہاں مہاراجہ کے خاندان کے زیورات و جواہرات اور کپڑے رکھے جاتے تھے) بچھلے چچا اسٹیٹ بینک اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اس کے علاوہ گرلس ہائی اسکول کے لائف پریسیڈنٹ تھے۔ ابا جان اسکول کی ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر تھے۔ چھوٹے چچا اس وقت کے بہترین فوٹو گرافر اور مہاراجہ بلرام پور کے ولی عہد کے اتالیق تھے۔

گاؤں کی نگہداشت کے لیے دو منشی رہتے تھے جن کا نام رضا علی اور امام علی تھا۔ کوٹھی کی صفائی اور فرنیچر وغیرہ کی حفاظت کے لیے ایک خان رہتا تھا جس کو سب مکان دار کہتے تھے۔ اس کے علاوہ سات آٹھ مرد ملازم اور تھے۔ گھروں میں کھانا پکانے کے لیے ملازمہ رہتی تھیں۔ ہر گھر میں ایک نوعمر لڑکا رہتا تھا جو اوپر کا کام کرنے کے علاوہ گھر کی ضروریات کی چیزیں لانے کے لیے باہر کے مرد ملازم سے جاکر کہتا تھا کیونکہ خواتین اور لڑکیوں کی آواز تک کا پردہ تھا۔

ہمارا خاندان بے حد مذہبی اور ایماندار تھا۔ کسی نے رشوت کا ایک پیسہ نہیں لیا لہذا مہاراجہ سے لے کر پورے بلرام پور کے لوگ عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کبھی دوسرے خاندانوں میں جائیداد پر جھگڑا ہوتا تھا تو میرے والد اور چچا بلائے جاتے تھے۔ اور ان کے فیصلے کو سب مان لیتے تھے۔

شام کے سات بجے گارد آجاتی تھی۔ ان میں خاکی وردی پہنے ہوئے چھ سپاہی اور ایک حولدار ہوتا تھا۔ سپاہی خاکی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوتے تھے اور حولدار کے سر پر پگڑی بندھی ہوتی تھی جس میں مور کے پر لگے رہتے تھے نیم کے نیچے سپاہیوں کے رہنے کے لیے تین دروازوں کا ایک دالان بنا ہوا تھا۔ بھری ہوئی بندوقوں سے وہ تمام رات پہرا دیتے تھے۔ دس بجے شب کو کوٹھی کے پھاٹک میں تالا ڈال دیا جاتا تھا اس کی کنجی حولدار کے پاس رہتی تھی پھر بغیر اجازت کے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔ صبح چھ بجے گارد واپس چلی جاتی تھی۔

ابا جان اور چچا کے آفس جانے کے لیے بگھی تھی۔ جس میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ کوچوان کے علاوہ دو آدمی بگھی کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے تب وہ روانہ ہوتی تھی۔ تانگہ، ٹمٹم اور ہاتھی بھی تھا۔ ہاتھی تو ہم بچوں کے استعمال میں رہتا تھا دیوالی پر تین دن تک پوری کوٹھی پر چراغاں ہوتا تھا۔ یہ تمام لوازمات ریاست کی جانب سے تھے۔ موٹر چچا جان نے شوقیہ خرید لی تھی۔

سردار بھائی نے اس ماحول میں پرورش پائی۔ اس وقت ہماری کوٹھی میں بڑے اور بچے ملاکر ۱۰۰ آدمی رہتے تھے۔ کبھی کبھی خاندان کی عورتوں میں جھگڑا بھی ہو جاتا تھا لیکن جلدی صلح ہو جاتی تھی نفرت یا کینہ کسی کے دل میں نہیں رہتا تھا۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے ایک استانی صاحبہ آتی تھیں جو قرآن شریف، دینیات اور اردو پڑھاتی تھیں۔ آپا زبیدہ کو تو باقاعدہ فارسی کی تعلیم ملی تھی لڑکے اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان کو قرآن شریف اور دینیات پڑھانے ایک صاحب آتے تھے جن کو سب میاں جی کہتے تھے

ستارہ جعفری

جو حساب اور انگلش پڑھاتے تھے وہ ہندو منشی جی کہلاتے تھے۔ لڑکے میٹرک پاس کرنے کے بعد علیگڑھ بھیج دیے جاتے تھے۔
میرے چچا زاد بھائی علی مزار جعفری نے لندن سے بی۔ ایس۔ سی ایگریکلچر کالج سے پاس کیا اور میرے ایک چچا نے لندن سے
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔

اماں اور بڑی بہنوں سے سنا ہے سردار بھائی کی عادتیں بچپن سے بھائی جان اور اپنے ہم عمر لڑکوں سے الگ تھیں کوٹھی
کے پیچھے کے حصے میں جو برآمدہ تھا۔ اسی کے قریب ایک امرود کا درخت لگا ہوا تھا۔ جب منشی جی پڑھانے آتے تھے تو سب لڑکے
ان کے قریب بیٹھ کر پڑھتے تھے اور یہ امرود کے پیڑ کی کسی شاخ پر بیٹھ کر اپنا کام کرتے۔ بیچارے ہندو منشی جی چلاتے "او
ارے تم ہمرے کپار پر کاہے چڑھتے ہو۔ نیچے اترو" یہ وہیں سے جواب دیتے "دو جناب! تازی ہوا میں حساب کے سوال جلد حل
ہو جاتے ہیں" حاضر جوابی اور سرکشی بچپن سے مزاج میں تھی لیکن بات چیت نہایت تمیز سے کرتے تھے۔

شام کو جب ابا جان چاچا آفس سے واپس آتے تھے تب نماز اور ناشتے کے بعد گرمیوں میں اس چبوترے پر جو
چاروں طرف سے پھولوں سے گھرا رہتا تھا اور ملکہ شب کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیلی رہتی تھی۔ اس کے درمیان میں سبز گھاس
پر ایک میز اور اس کے گرد کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ ابا جان۔ چاچا اور خاندان کے بزرگ وہاں بیٹھتے تھے اور سب دوست احباب
ملنے کو آتے تھے پھر مغرب کی نماز کے وقت یہ محفل برخاست ہو جاتی تھی۔ موسم سرما میں آتش دان کے سامنے ڈرائنگ روم
میں یہ محفل جمتی تھی۔

ایک روز سردار بھائی اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے۔ اس وقت ایک صاحب جو عربی اور فارسی زبان
کے عالم سمجھے جاتے تھے اور ابا جان اور چچا کے خاص دوستوں میں شمار ہوتا تھا تشریف لائے۔ ہمارے خاندان کے یہ آداب
تھے کہ بزرگوں کو آتا دیکھ کر بچے کھیل بند کر دیتے تھے لہذا سب بچوں نے کھیل بند کر دیا اور ان کے قریب جا کر سلام کیا انھوں
نے جواب میں بچوں کو دعائیں دیں۔ سردار بھائی نے اپنی جگہ سے کہا "آداب عرض ہے جناب!"
مولانا نے فرمایا "تم نے پاس آکر سلام کیوں نہیں کیا" انھوں نے برجستہ جواب دیا ؎

محرم میں نہیں ہوں سلام حضور سے
پاس ادب یہی ہے کہ مجرا ہو دور سے

مولانا یہ جواب سن کر خاموشی سے اندر چلے گئے اور ابا جان سے کہا۔ ماشاءاللہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا حاضر جواب ہے
کہ میں لاجواب ہو گیا پھر پورا واقعہ سنایا۔ ابا جان بتایا کرتے تھے۔ چھ۔ سات سال کی عمر میں ان کو پانچ سو اشعار زبانی یاد تھے
اماموں کی شان میں لکھی ہوئی رباعیاں اور قصیدے بھی ازبر تھے۔ کوئی شخص کسی قسم کا سوال کرتا تو اس کا جواب زیادہ تر شعر میں
دیتے تھے۔ حاضر جوابی اعلیٰ دماغی اور کسی سے مرعوب نہ ہونا ان کو ورثہ میں ملا تھا۔ چونکہ اپنے ہم عمروں میں یہ غیر معمولی صلاحیت
رکھتے تھے اس لئے ان کو سب ہی پیار کرتے تھے۔ ہماری کوٹھی کے قریب گرلس اسکول ہے اس وقت اس کی ہیڈ مسٹریس ایک
کرسچین خاتون مس برنج تھیں وہ ان کو بہت پیار کرتی تھیں۔ ان کی صحبت میں رہ کر یہ پڑھنے سے پہلے انگریزی بولنا سیکھ

ڈ پوری زبان میں کپار سر کو کہتے ہیں

ستارہ جعفری

گئے تھے۔

ریاست بلرام پور میں ہر سال دسہرہ اور دیوالی سے قبل نئے کپڑوں اور زیورات وغیرہ کی خریداری ہوتی تھی۔ ہندوستانی تاجر تو اس موقعہ پر طرح طرح کا سامان لیکر آجاتے تھے مگر انگریز تاجر نہیں آتے تھے۔ لہٰذا اس سامان کو خریدنے کے لیے ابا جان کو مختلف شہروں میں جانا پڑتا تھا اور جس شہر کی جو چیز عمدہ اور خوبصورت ہوتی تھی اُس کے لیے آڈر دیدیا جاتا تھا۔ مجھے یاد نہیں اس زمانے میں دربھنگہ کی کیا خاص چیز تھی جس کے لینے کے لیے ابا جان وہاں گئے تھے۔ سردار بھائی کی بے پناہ تیزی کو دیکھتے ہوئے ابّا جان زیادہ سے زیادہ وقت ان کو اپنے پاس رکھتے تھے۔ لہٰذا دربھنگہ اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں جس دکان سے سامان خریدنا تھا اس کا مالک انگریز تھا۔ ایک ہفتہ گزر گیا اور معاملہ طے نہیں ہو رہا تھا۔ ایک روز وہ انگریز ابّا جان کے پاس آیا۔ تو سردار بھائی نے پوچھا "یہ کون صاحب ہیں۔؟" ابّا جان نے جواب دیا "انھیں سے سامان خریدنا ہے"۔ سردار بھائی فوراً انگریزی میں اس سے مخاطب ہوئے "مجھے اپنی ماں بہت یاد آرہی ہیں۔ جلدی معاملہ طے کیجیے"۔ اس زمانے میں اتنے چھوٹے بچے کا انگریزی بولنا تعجب خیز بات تھی۔ انگریز نے ابا جان سے دریافت کیا "یہ آپ کا کون ہے؟" ابّا جان نے جواب دیا "یہ میرا بیٹا ہے۔ اب ان کو اپنی ماں اور گھر بہت یاد آرہا ہے۔ اُس انگریز نے دو۔ چار سوال ان سے اور کیے ان کا جواب بھی انہوں نے انگلش میں دیا۔ وہ ان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ابا جان سے کہا۔ بہت ذہین اور ہوشیار بچہ ہے۔ فوراً معاملہ طے کر دیا۔ سردار بھائی سے کہا اب تم اپنی ماں کے پاس جا سکتے ہو۔ ابا جان پہلی ٹرین سے بلرام پور واپس آگئے۔

سردار بھائی کی ذہانت اور تیزی کو دیکھتے ہوئے بزرگوں نے یہ طے کیا کہ ان کو سند اجتہاد حاصل کرنے کے لیے مذہبی تعلیم دی جائے۔ غالباً سات۔ آٹھ سال کی عمر میں لکھنؤ سلطان المدارس میں داخل کر دیا گیا۔ وہاں عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر کچھ سالوں کے بعد عراق بھیج دیا جاتا تھا وہاں سے باقاعدہ سند حاصل کرکے مجتہد بن جاتے تھے کیونکہ خیال تھا اگر خاندان کا ایک شخص مجتہد بن جائے تو پورے خاندان کی عاقبت سنور جاتی ہے۔ لیکن ان کے سرکش مزاج نے اس ماحول کو قبول نہیں کیا۔ یہ دو مرتبہ اکیلے بلرام پور واپس آگئے۔ دونوں مرتبہ سمجھا بجھا کر کسی کے ساتھ لکھنؤ واپس بھیج دیا جاتا تھا۔ جب تیسری مرتبہ یہ لکھنؤ سے واپس آگئے تو ابّا جان ان پر کوئی سختی نہیں کی بلکہ بڑے پیار سے پوچھا "تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "جناب! میں انگریزی پڑھوں گا"، وہاں میرا دل نہیں لگتا"۔ ان کی رائے سن کر ابّا جان نے اُسی دن سے بلرام پور میں انگریزی پڑھنے کے لیے ایک اُستاد کے سپرد کر دیا۔ اُن کا نام ماسٹر بشیر تھا۔ اُن کا ایک جنرل اسٹور تھا۔ یہ شام کو وہاں پڑھنے جاتے تھے۔ اس وقت یہ طریقہ تھا کہ جب تیسری کلاس تک کا حساب اور انگریزی جب تک بچے کو نہ آجائے اسکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا ماسٹر بشیر ان کو بڑی محبت سے پڑھاتے تھے اور ابّا جان سے اُن کی ذہانت کی تعریف کرتے تھے کہ بڑی جلدی سبق یاد کر لیتا ہے۔ لیکن ہمارے مجتہد صاحب بات بات پر نہایت ادب کے ساتھ بحث کرتے ہیں (لکھنؤ سے واپسی کے بعد سب لوگ ---- انھیں صاحب کہنے لگے تھے۔ وہاں کچھ وقت گزرنے کی وجہ سے تعلیم میں اپنے ہم عمروں سے پیچھے رہ گئے تھے۔)

جس وقت میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت بھائی جان کان پور کے ایگری کلچر کالج سے بی۔ ایس۔ سی۔ کر رہے تھے

سردار بھائی

جعفری نمبر

ستارہ جعفری

وہ گرمیوں اور دسمبر کی تعطیل میں گھر آتے تھے تو ہم بہنوں اور بھائی کے لیے طرح طرح کے تحفے لاتے تھے۔ سردار بھائی باہر رام پور اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

سردار بھائی کو اسکول سے بعد جو فرصت کا وقت ملتا تھا اس میں گھوڑا دوڑانا، درختوں پر چڑھنا اور شکار کھیلنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا کئی بار چوٹیں بھی کھائیں اور ہاتھ پیر میں موچ بھی آئی اماں کو ہر وقت فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں ہاتھ پاؤں کی ہڈی نہ ٹوٹ جائے مگر یہ تو ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ سردار بھائی نے اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے ایک الگ کمرہ لے لیا تھا۔ مجھے یاد ہے یہ بہت خوش ذوق، نفاست پسند اور خوبصورت چیزوں کے دلدادہ تھے اپنی کوئی چیز بے ترتیب نہیں دیکھ سکتے تھے ان کے کمرے کی دیواروں کا رنگ ہلکا فیروزی تھا اس کی دیواروں پہ سرخ رنگ کی پنسل سے چاروں طرف اقبال اور ان کے پسندیدہ شاعروں کی نظمیں اور غزلیں لکھی ہوئی تھیں کمرے کی دیواروں میں جیسے پہلے زمانے میں الماری بنائی جاتی تھیں ایسی دو الماریاں تھیں ان کے تختوں پر یہ اپنی ادبی کتابیں رکھا کرتے تھے اور ان کے کناروں پر اس زمانے میں باہر کی بنی ہوئی ریشمی چوڑی چوڑی بیلیں آتی تھیں جو اماں اور بڑی بہنیں اپنے ڈوپٹوں کے آنچل میں لگاتی تھیں اور سبز و زرد رنگ کی بیل کی جھالر بنوا کر الماری کے تختوں کے کناروں پر لگاتے تھے کھڑکی کے قریب ان کے لکھنے پڑھنے کی میز اور کرسی رکھی رہتی تھی۔ کھڑکی پر سفید جالی کا پردہ پڑا رہتا تھا اسکول جاتے وقت اپنے کمرے کے دروازے میں تالا ڈال جایا کرتے تھے تاکہ کوئی ان کے کمرے کی چیزوں کو خراب نہ کرے۔

کھانے میں بھی ان کے بڑے نخرے تھے۔ گوشت کے علاوہ صرف گنی چنی سبزیاں کھاتے تھے۔ شلغم اور مولی کی بھوجیا پکتی تھی تو یہ پہلے ہی کہہ دیتے تھے کہ اس کا چمچہ الگ رکھا جائے اگر رکابی میں گوشت کی بوٹی ٹوٹ جائے تو فوراً اپنے سامنے سے ہٹا دیتے تھے۔ کباب، کوفتے اور مسلم کے بے حد شوقین تھے ہمارے یہاں تخت پر دسترخوان بچھا کر کھانا کھانے کا طریقہ تھا اگر دسترخوان پر دھبا پڑ جائے تو پھر یہ اس کو استعمال نہیں کرتے تھے۔

کپڑے بھی قیمتی اور خوبصورت پہنتے تھے۔ اس وقت باہر کی بنی ہوئی سلک آتی تھی جو بوسکی کہلاتی تھی اور روپیہ گز ملتی تھی جب بوسکی بہت قیمتی کپڑا سمجھا جاتا تھا سردیوں کے موسم میں بوسکی کی قمیض سوٹ اور ٹائی استعمال کرتے تھے گرمیوں میں نہایت باریک ململ کے ہاتھ کے سلے ہوئے کرتے پاجامہ اور اچکن پہنتے تھے۔ اماں اور بڑی بہنیں یہ ناز برداریاں بڑی خوشی سے کرتی تھیں جو یہ کہتے تھے وہی کام ہوتا تھا یہی صفائی اور نفاست پسندی ہمارے والدین میں تھی۔ وہ تو مرحوم میں استعمال کرنے کا عطر بھی رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ رات کو بستر میں بھی عطر لگایا جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ رمضان کے مہینے میں گھر میں سب لوگ بڑی پابندی سے روزے رکھتے تھے۔ صرف بچوں کے لیے کھانا پکتا تھا۔ سب کے ساتھ یہ بھی روزے رکھتے تھے۔ سحری کھانے کے بعد اماں وغیرہ تو دعا سحر یا دوسری دعائیں اور نمازیں پڑھتی تھیں۔ ان کی نیند اچاٹ ہو جاتی تھی تو اپنے بستر میں لیٹ کر بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیتے ؎

نازاں تو ایک جام پہ ہے اپنے ساقیا
چودہ پلانے والے ہیں پروا مجھے ہے کیا
بتلائے دیتا ہوں تجھے سے خانوں کا پتا

بطحا و کاظمین اور خراسان و سامرہ
برجِ شرف مرادر یکتا صدف میں ہے
اک کربلا میں ایک مرا ساقی نجف میں ہے

"اماں جلّا تیں آہستہ پڑھو۔ ساری دعائیں بھولی جا رہی ہوں۔ تمہاری شعر و شاعری تو پھر بھی شروع ہو جاتی ہے۔"

"ارے بھابھی! ہم تو پنجتن پاک کے نام یاد کر رہے ہیں۔ سن لیجئے

مشہور شش جہت میں شرف پنجتن کا ہے
پہلے تو نام پاک رسولِ زمن کا ہے
پھر اس کے بعد خسروِ خیبر شکن کا ہے
اور اسم بھی بتول امیرِ محن کا ہے
چوتھے جواں جو ہیں حسن ان کا نام ہیں
اور پانچویں حسین علیہ السلام ہیں

ان دونوں کی آواز سے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ سچ پوچھئے تو سردار بھائی کی زبانی سنتے سنتے ایسے ازبر ہوئے کہ آج تک یادداشت میں محفوظ ہیں۔

ابّا جان کے پاس مذہبی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور میرے منجھلے چچا کے پاس جن کو ہم سب چچا کہتے تھے۔ ادبی کتابیں تھیں۔ لہٰذا ہم سب بھائی بہنوں کے دل میں بچپن سے ادبی رجحان پیدا ہو گیا۔ آپا کے نام تہذیبِ نسواں اور عصمت آتا تھا۔ یہ اس زمانے میں عورتوں کے رسالے تھے۔ اس کے علاوہ ہم بھائی بہنوں کو جو جیب خرچ ملتا تھا اس سے کتابیں منگوائی جاتی تھیں۔ مثلاً اختر النساء، گرٹری، ردشنک بیگم، صفیہ بیگم، راشد الخیری اور شرلاک ہومز وغیرہ کی کتابیں بھی آتی تھیں مجھے بچپن سے راشد الخیری کی کتابیں پسند نہیں تھیں۔ ان کی ہیروئین نہایت کمزور اور انتہائی بزدل نظر آتی تھی۔ ہاں۔ گوڈر کے لال کی ثریا مجھے بہت پسند تھی۔ میں سوچتی تھی میں بھی ثریا جیسی بنوں گی

اسی زمانے میں سردار بھائی نے افسانے لکھنے کی ابتدا کی۔ اسکول سے واپس آکر افسانے لکھتے تھے۔ ایک روز افسانہ نامکمل چھوڑ کر یہ گھر میں جانے پینے آگئے۔ میں اس تلاش میں کہ شاید اسکول کی لائبریری سے کوئی نئی کتاب لائے ہوں۔ ان کے کمرے میں گئی تو دیکھا انھیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک افسانہ "آتشین قمیض" میز پر رکھا ہوا ہے۔ جلدی جلدی الٹ پلٹ کر دیکھا تو جو کتابیں ہم لوگوں کے پاس تھیں ان سے بالکل الگ تھا۔ میں اس وقت چھپی ہوئی کتابیں تو آسانی سے پڑھ لیتی تھی۔ لیکن ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ میں فوراً بھاگ کر سردار بھائی کے پاس آئی اور کہا "ہمیں "آتشین قمیض" پڑھنے کو دے دیجے؟"

انھوں نے گھبرا کر پوچھا "تم نے کہاں دیکھا؟"

"آپ کی میز پر رکھا ہوا ہے" انھوں نے بڑے رعب سے جواب دیا۔ "وہ تمہارے پڑھنے کی چیز نہیں ہے" پھر بہت خوشامد کرنے اور ڈھیر ساری چیزوں کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ لے کر دوسرے دن پڑھنے کو دیدیا۔ لیکن اس

تاکید کے ساتھ کہ ابا جان اماں کو معلوم نہ ہو۔ میں اس کو لے کر اپنی چچازاد بہن قدسیہ باجی کے پاس گئی وہ عمر میں تو ہم سے بڑی تھیں لیکن برتاؤ ہم عمروں کا سا تھا۔ قدسیہ باجی نے پڑھ کر سنایا۔ میں نے اور میری بڑی بہن رباب جعفری نے بڑے غور سے سنا اب تو ہمیں سردار بھائی کی لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھنے کا چسکا لگ گیا۔ دوسرے۔ تیسرے دن ان کی میز کی تلاشی لیتے۔ ایک روز دوسرا افسانہ ملا اس کا نام تھا ''لالہ صحرائی'' اس کا کچھ حصہ میرے حافظہ میں ابھی تک محفوظ ہے۔ کہانی یہ تھی۔ جاوید ایک شہری لڑکا ہے وہ شکار کھیلنے جنگل میں جاتا ہے وہاں ایک بہت خوبصورت دیہاتی لڑکی کو دیکھتا ہے۔ اور اس کا نام لالہ صحرائی رکھ دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگتے ہیں لیکن سماجی بندشیں درمیان میں حائل ہو جاتی ہیں مگر یہ ان کو توڑ دیتے ہیں یہ افسانہ ہمارے لیے ایک نیا تجربہ تھا ابھی تک تو راشد الخیری کی روتی بسورتی عورتیں دیکھی تھیں یا اختر النساء جیسی لڑکی جس کو سن کر سارا گھر روتا تھا اور اس کی مظلومیت کی داد دی جاتی تھی۔ لالہ صحرائی کو ہم بہنوں نے کئی مرتبہ پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف آیا۔ تیسرا افسانہ ''ہجوم و تنہائی'' تھا۔ اس میں بھی عورت کی جرات اور ہمت دکھائی تھی افسانوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ ایک کا کچھ حصہ یاد ہے ؎

نکال دوں تمہیں اس طرح دل کے گوشے سے
کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ دے کوئی
میری حسین ثریا یہ ہو نہیں سکتا

انھیں گرمیوں میں بھائی جان۔ اگریکلچر کالج کانپور سے۔ بی۔ ایس۔ سی۔ پاس کر کے آ گئے۔ بھائی جان نے ایک ہفتہ وار اخبار ''ہم صفیر'' کے نام سے نکالنا شروع کر دیا۔ ایڈیٹر خود بھائی جان تھے اب بھائی جان کے نام ''نیرنگ خیال'' اور ''ساقی'' جیسے رسالے بھی آنے لگے تھے۔ سردار بھائی پابندی سے ہم صفیر کے لیے افسانے۔ نظمیں اور مضامین لکھتے۔ سب سے پہلا افسانہ ''یہ تھی پاؤ گندھا آٹا'' چھپا تھا جو بے حد پسند کیا گیا۔

ابا جان کے ایک دوست التجا حسین تھے جو بے حد مذہبی اور قابل شخص تھے وہ ہم صفیر اخبار کا مطالعہ بڑی پابندی سے کرتے تھے ایک روز انہوں نے ابا جان سے کہا ''آپ نے غور کیا ہے۔؟ سردار کے مضامین سے موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت کی بو آتی ہے۔ ابھی کم عمر ہے ان کے خیالات ادھر سے ہٹا کر مذہبی راستے پر لانا چاہیے خدانخواستہ کوئی بات ہو گئی تو خاندان کی بدنامی ہوگی''۔ اس وقت چچا برٹش گورنمنٹ کی اسمبلی کے ممبر تھے اور کئی طلائی تمغے وغیرہ حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ ابا جان، چچا اور چند قریبی دوست مل کر بیٹھے اور بیٹھے کیا گیا ہمارے یہاں محرم، تیرہ رجب، پندرہ شعبان، چودہ رمضان، انیس سے اکیس رمضان اور عید غدیر بڑے شاندار طریقے سے منائی جاتی تھی ان میں ہندوستان بھر کے بہترین ذاکر مدعو کیے جاتے تھے۔ جو مرثیے حدیث اور اماموں کی شان میں قصیدے پڑھتے تھے۔ چودہ معصومین کی ولادت اور وفات کے دن میلاد اور مجلس منعقد ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر شب جمعہ مجلس ہوتی تھی جس میں مقامی ذاکر پڑھتے تھے۔ لہٰذا ان سب نے مل کر یہ سوچا کہ سردار بھائی کو یہ مشورہ دیا جائے کہ تم شب جمعہ والی مجلس میں حدیث پڑھو۔ یہ حدیث پڑھنے کو تیار ہو گئے۔ انہوں نے پہلی مجالس کی حدیث بڑے جوش و خروش کے ساتھ جوش صاحب کے ان بندوں سے شروع کی ۔۔

جو جواں بیٹے کی میت پہ نہ رویا وہ حسین　　جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

ان کی حدیث خوانی کو سب نے بے حد پسند کیا پھر شب جمعہ کی ہر مجلس سردار بھائی پڑھنے لگے۔ خاندان کے بزرگ بھی کامیابی پر بہت نازاں تھے۔ پہلے التجا حسین صاحب ذاکری فرماتے تھے وہ اس فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اس ملی نیرہ رجب کا جشن منانے کے لیے باہر سے شعراء بلائے گئے۔ اس زمانے میں ایک مشہور شاعر تاباں بدایونی تھے جو مدح اہلبیتؑ میں قصیدے بھی لکھتے تھے وہ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے مدعو کئے گئے تھے۔ سب سے پہلے سردار بھائی کو ممبر پر بٹھایا گیا۔ انہوں نے صرف ایک رباعی پڑھی ؎

کعبہ کی رات کتنی نشاط آفریں ہے آج
نعمیٰ حرم نمونۂ خلد بریں ہے آج
ملتا نہیں دماغ دعائے خلیل کا
رونق فروز اپنے مکاں میں مکیں ہے آج

یہ رباعی پڑھ کر جیسے ہی ممبر سے اترے تاباں صاحب نے فوراً گلے سے لگا لیا۔ اور فرمایا۔ ابھی تک میں سمجھتا تھا میرا فن میرے ساتھ دفن ہو جائے گا لیکن آج مجھے ایسا قابل لڑکا ملا ہے۔ جس کے سینے میں اپنا سارا علم بھر دوں گا۔ میرے بعد یہ اس کو زندہ رکھے گا (تاباں صاحب مرحوم اپنا کلام چھپواتے نہیں تھے) تیرا رجب گزرنے کے بعد دو۔ تین۔ دن اور تاباں صاحب نے قیام کیا۔ سردار بھائی کو اسکول سے واپس آنے کے بعد اپنے سامنے بٹھلا کر اپنا کلام سناتے تھے جو سردار بھائی کو زبانی یاد ہو جاتا تھا۔ پھر وہ ہم سیز میں شائع کرا دیتے تھے۔

سردار بھائی نے حدیث پڑھتے پڑھتے مرثیہ اور قصیدے کہنے بھی شروع کر دیے۔ محرم کی مجلس میں انہوں نے اپنا پہلا مرثیہ پڑھا (اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے سردار بھائی لکھ چکے ہیں) آیا جان۔ چاچا اور ان کے دوستوں نے بہت داد دی۔ خصوصاً التجا حسین صاحب نے تو بے حد ہمت افزائی کی۔ مجلس ختم ہونے کے بعد چاچا اماں کے پاس گھر میں آئے اور کہا۔

ہمارا سردار تو مانا اللہ انیسؔ اور دبیرؔ کے مقابلے کے مرثیے لکھے گا۔ چاچا یہ بند بار بار پڑھ کر روتے تھے۔ ؎

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی
پیارے بہنوں کے ہیں ماؤں کے دلارے یہ ہیں
گو زمیں پر ہیں مگر عرش کے تارے یہ ہیں

بلرام پور میں کچھ افراد ایسے بھی تھے جو یہ کہتے تھے۔ اتنے کم عمر لڑکے کے مرثیوں میں یہ فصاحت اور بلاغت کیسے آ سکتی ہے۔؟ انیسؔ کے مرثیوں میں رد و بدل کر کے اپنے نام سے پڑھ دیتے ہیں۔ یہ بات ان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ انھوں نے دو چار مرثیے اور کہہ کر مجالس میں پڑھے لیکن افسوس کے اختتام تک نہیں پہنچے وہ ابھی تک موجود ہیں۔

انھیں افراد کے یہاں ایک صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے وہ بھی اپنے وقت کے عالم و فاضل سمجھے جاتے تھے۔ سردار بھائی نے اپنا نیا مرثیہ ان کے سامنے بھی پڑھا۔ جب مجلس ختم ہوئی تو اُن صاحب نے سردار بھائی سے دریافت کیا "میاں صاحب زادے! آپ کا اسم گرامی" یہ سن کر سردار بھائی اٹھ کر منبر پر بیٹھے اور جواب دیا ؎

نورِ نظرِ احمد مختار ہوں میں
لختِ جگرِ حیدرِ کرار ہوں میں
ہے فتح و ظفر قوتِ بازو سردار
یعنی پسرِ جعفرِ طیار ہوں میں

احمد مختار چھوٹے چچا کا نام ہے۔ حیدر کرار منجھلے چچا کا نام، ظفر عباس بھائی جان کا نام اور جعفر طیار آبا جان کا نام آبا جان کے ایک دوست اقبال حسن صاحب تھے جو بلرام پور کے بڑے شاعر مانے جاتے تھے۔ انہوں نے ممبر سے اٹھا کر گلے سے لگایا اور آبا جان سے کہا "بھائی جان! آج سے ہم سردار کو بڑا شاعر مان گئے واللہ کیا جواب دیا کہ سب کو لاجواب کر دیا" مجلس میں شرکت کرنے والے سب دنگ رہ گئے۔ واہ واہ کا ایسا شور بلند ہوا کہ ہال گونج اٹھا۔

اس کے بعد عید غدیر آئی۔ اس کا جشن دو روز تک منایا جاتا تھا۔ اس میں پڑھنے کے لیے سردار بھائی نے نیا قصیدہ لکھا تھا عین وقت پر سردار بھائی غائب تھے۔ ہر طرف نوکر دوڑائے گئے آخر کار ایک نوکر نے آکر خبر سنائی۔ سردار بھیا تو جواہر لال نہرو کے جلسے میں بیٹھے ہیں اور کہتے ہیں انگریز سفید ہاتھی ہے ان کا نکال دو۔ ہمارے گھر کے پیچھے ایک مندر ہے۔ اس کا آنگن اتنا بڑا ہے۔ جس میں تین۔ چار سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں وہاں پنڈت نہرو کی تقریر تھی۔ اس میں یہ بھی شریک ہو گئے۔ میلاد کا جشن ختم ہو گیا تب گھر واپس آئے۔ نوکروں سے یہ بات سب عزیزوں میں پھیل گئی۔ کئی بزرگ بہت خفا ہوئے۔ اور آبا جان سے کہا۔ ابھی سے نہیں روکا تو لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آبا جان ہمیشہ ان کی شکایت سن کر مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی معاملے میں ان پر سختی یا جبر نہیں کیا۔ ہاں جو بات ناگوار گذرتی تھی سردار بھائی کی غیر موجودگی میں اماں اور ہم بہنوں کے سامنے کہہ دیتے تھے۔

لکھنؤ سے ایک شیعہ اخبار سرفراز شائع ہوتا تھا اور دوسرا شیعہ اخبار الناصر آگرہ سے نکلتا تھا مجھے ٹھیک یاد نہیں ہے ان دونوں میں سے کسی ایک اخبار میں آگرہ کے مولوی مبارک علی صاحب نے عقد بیوگان کے خلاف ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ اس کو پڑھ کر بھڑک گئے اور فوراً اس کے خلاف مضمون لکھا۔ یہ بحث بہت روز تک چلتی رہی۔ آخر کو مولوی مبارک علی صاحب نے ان سے ملاقات کرنی چاہی اور پتہ دریافت کیا انہوں نے اپنے گھر کا پتہ بھیج دیا۔ ایک دن اچانک وہ تشریف لے آئے۔ آبا جان چچا سے مولانا کی واقفیت تھی کیونکہ مولوی صاحب آگرہ میں پیش امام تھے۔ آبا جان نے سمجھا شاید کسی چندے وغیرہ کے سلسلے میں تشریف لائے ہیں۔ لیکن بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ سردار بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ آبا جان نے سردار بھائی کو بلا کر ان سے تعارف کرایا۔ مولوی صاحب تعجب سے دیکھنے لگے۔ پھر آبا جان سے فرمایا "میں اس لڑکے سے نہیں بلکہ حضرت علی سردار جعفری سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے آیا ہوں" آبا جان نے جواب دیا۔ یہی میرا بیٹا علی سردار جعفری ہے" مولانا نے فرمایا میں تو ان کو سن رسیدہ شخص سمجھتا تھا؟ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں۔ "چچا نے جواب دیا۔ جناب مولوی صاحب! ہم آپ سے مذاق کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں" یہی سردار جعفری ہے جو اخبار میں آپ سے بحث کرتا تھا" ان کو یہ سن کر بے حد حیرت ہوئی فرمایا اتنی کمسنی میں عقد بیوگان پر ایسی بحث کہ میں ملاقات کے لیے مجبور ہو گیا۔ سوچا اتنی قابل اور بزرگ ہستی سے مل کر زبانی بات چیت کرنی چاہیے کمال ہے صاحب! کیا دماغ پایا ہے خدا نظر بد سے بچائے اپنے وقت پر تو خدا جانے کیا ہوگا یہ بات سن کر تو اور بھی خوشی ہوئی کہ یہ آپ کے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔

ستارہ جعفری

سردار بھائی کے مزاج میں تبدیلی آ چکی تھی لیکن خاندان والوں پر ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ بلرام پور میں ایک شوگر مل ہے۔ اُس میں ہمارے گاؤں سے بھی گنا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی پر سے گنا اتارنے والے مزدوروں نے اپنی اجرت بڑھانے کو کہا۔ چھوٹے چچا جان پر تیار نہیں ہوئے۔ مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ ہڑتال کو توڑنے کے لیے پولیس بلائی گئی۔ یہ بات سردار جعفری کو معلوم ہوئی۔ شام کو گھر پہنچ کر بتائے بغیر شکر مل چلے گئے۔ وہاں تقریر کی اور مزدوروں سے کہا۔ جب تک تمہارا حق نہ ملے ہرگز گنا مت اتارنا اور نہ پولیس سے ڈرنا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ایک مزدور بولا۔ اب بتاؤ نا ہم کا کری؟ چچا آوت ہیں تو کہت ہیں ایک ڈیلی بھی نا بڑھاب اور بھتیجہ کہت ہیں جب تک پیسہ نہ بڑھے گنا نہ اتارو۔ آخر کار مزدوروں کی فتح ہوئی اور چھوٹے چچا کو اجرت بڑھانی پڑی۔

برسات شروع ہونے پر کھیتوں میں چاول کی بوائی کا کام شروع ہوتا ہے اس وقت کوئی گھر کا آدمی ہی تمام دن وہاں رہتا ہے حالانکہ منشی امام علی وہاں دیکھ بھال کرنے کے لیے دن رات رہتے تھے۔ (منشی امام علی آج تک گاؤں کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں) ایک سال ابا جان نے سردار بھائی سے کہا "تم وہاں جا کر سب کام اپنے سامنے کرا دو" یہ چلے تو گئے لیکن وہاں جا کر سب کھیت مزدوروں کی تنخواہ بڑھا دی۔ اور پرانے قرضے معاف کر کے گھر واپس آ گئے۔ منشی جی نے ابا جان کو خط لکھا۔ چھوٹے بھیا تو گاؤں کا خرچ بہت بڑھا گئے۔ اور سب باتیں تفصیل سے لکھیں۔

گرمیوں کی تعطیل میں بہت مزا آتا تھا۔ ہمارے پھوپھی اور ماموں زاد بھائی بہن اور جو عزیز علیگڑھ کالج میں پڑھتے تھے اور کام کرتے تھے سب آ جاتے تھے پھر روز نئے نئے پروگرام بنتے۔ چھوٹے چاچا شکار کے بہت شوقین تھے اور ان سب کو بھی شوق تھا لہٰذا چھوٹے چاچا کی نگرانی میں سب لوگ شکار کھیلنے جاتے بلرام پور کے جنگلات میں ہرن، نیل گائے، شیر اور ہاتھی تک پائے جاتے تھے۔ جس روز ہرن کا شکار لاتے اس دن خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا تھا۔ کباب مسلم اور طرح طرح کے کھانے پکتے۔ چاندنی راتوں میں آئس کریم جمائی جاتی اور پورا خاندان اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دوپہر میں شعر و شاعری کا دور چلتا۔ ہمارے سب سے بڑے پھوپھی زاد بھائی جن کا نام آل مرتضیٰ ہے۔ ہم سب ان کو بڑے بھائی جان کہتے ہیں۔ وہ ان کی ذہانت اور تیزی سے بہت متاثر تھے۔ بڑے بھائی۔ سردار بھائی سے ڈاکٹر اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ سنانے کی فرمائش کرتے۔ اس وقت ترنم سے پڑھتے تھے۔ بس فوراً جوش آ جاتا۔ شیروانی پہن کر لہک لہک کر زبانی سنانے۔ سب لوگ تعریف کرتے ان کو اقبال کی "بانگ درا" زبانی حفظ تھی۔ بڑے بھائی جان کو ان کی زبانی اقبال کی یہ نظم سننے میں بہت لطف آتا تھا۔

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

بڑے بھائی جان۔ بار بار اصرار کر کے یہ پڑھواتے۔ غرضیکہ پوری دوپہر اس شغل میں گزر جاتی تھی۔ بڑے بھائی جان اور دوسرے بھائی بہن آج بھی کراچی میں مقیم ہیں۔ اللہ! کیا خوبصورت زمانہ تھا جس کی یاد آج بھی دل میں تازگی پیدا کر دیتی ہے۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن یادوں کے نقوش اور بھی گہرے ہو جاتے ہیں۔

خدا کے فضل و کرم سے آل مرتضیٰ بھائی جان اور چھوٹے چاچا کا سایہ ہمارے سروں پر اب تک قائم ہے۔ آل مرتضیٰ بھائی جان کراچی میں مقیم ہیں اور چھوٹے چاچا بلرام پور ہی رہتے ہیں۔

جون ۱۹۳۱ء میں سردار بھائی نے میٹرک پاس کر لیا۔ پھر علیگڑھ کالج میں پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ابا جان کی دلی خواہش تھی کہ یہ ڈاکٹر یا بیرسٹر بنیں۔ ساڑھے تین سال علیگڑھ میں پڑھنے کے بعد ایک روز اچانک یہ بلرام پور واپس آ گئے۔ ابا جان کو تشویش ہوئی انہوں نے اماں سے کہا۔ "یقیناً یہ کالج میں کچھ گڑبڑ کر کے آئے ہیں!" اس وقت علیگڑھ کالج کے وائس چانسلر ضیاء الدین صاحب تھے جو چاچا کے کلاس فیلو دوست بھی تھے۔ دوسرے روز چاچا کے نام اُن کا خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ سردار نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں رات کو بارہ بجے پندرہ منٹ کی تقریر میں ہمارے کئی ہزار لڑکوں کے خیالات بدل دیئے ہیں لہٰذا اس جرم میں ان کو تین سال کے لئے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ حالانکہ اتنے ذہین اور قابل لڑکے کو نکالتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوئی ہے۔

علیگڑھ سے واپس آنے کے بعد ابا جان نے ان کو ٹربک کالج دہلی میں داخل کرا دیا لیکن وہاں بھی ان کو تقریر کرنے کا شوق باقی رہا۔ کالج کے تقریری مقابلوں میں کئی مرتبہ فرسٹ آئے۔ سونے کے کئی میڈل اور گنگا جمنی بنی ہوئی چھوٹی سی دہلی کی مسجد انعام میں حاصل کی۔ یہ سب چیزیں لے کر جب بلرام پور آئے تو والدین اور سب عزیز بے حد خوش ہوئے۔ لیکن کچھ روز بعد اپنے ایک دوست کی مالی امداد کرنے کے سلسلے میں وہ تمغے اور گنگا جمنی مسجد فروخت کر دی۔ دہلی سے بی۔ اے۔ کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ ابا جان کی خواہش تھی کہ لکھنؤ یونیورسٹی سے یہ ایل۔ ایل۔ بی کر لیں۔ ایک سال قانون پڑھنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میرا دل اس مضمون میں نہیں لگتا اور ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔

جس زمانے میں یہ لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کی تحریک بھی شباب پر تھی اسی زمانے میں ترقی پسند ادب کی بنیاد پڑی۔ اس گروپ میں قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم، احمد ملیح آبادی مرحوم، سجاد ظہیر، مجاز، جاں نثار اختر، سبط حسن، مخدوم، علی جواد زیدی، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ۔ وغیرہ ترقی پسند مصنفین میں شامل تھے اور ادب برائے زندگی پر بڑے جوش و خروش سے نظمیں اور افسانے لکھے جا رہے تھے۔ سردار بھائی۔ سبط حسن اور مجاز (سبطے حسن جن کو سبطے بھائی کہتی ہوں۔)

ان لوگوں نے مل کر ایک رسالہ "نیا ادب" اور ایک اخبار "پرچم" کے نام سے نکالنا شروع کیا۔ یہ دونوں لکھنؤ سے ان لوگوں کی سرپرستی میں شائع ہوتے تھے۔ میرے نام باقاعدہ نیا ادب اور پرچم آتا تھا۔ ابا جان بھی ان کو پڑھتے تھے اور اپنے لاڈلے بیٹے کے خیالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ اس وقت سردار بھائی کا طریقہ یہ تھا ہر سنیچر کی شام کو بلرام پور آ جاتے تھے اور اتوار کا دن گزار کر رات کی ٹرین سے واپس چلے جاتے تھے۔ علیگڑھ اور دہلی کے دوران تعلیم۔ جب یہ چھٹیوں میں گھر آتے تھے تو مختلف قسم کے تحفے ہم سب کے لیے لاتے تھے۔ لیکن لکھنؤ سے ہر ہفتہ یہ ہم بہنوں کے لیے نئی نئی کتابیں لاتے تھے۔ مثلاً گاندھی جی اور جواہر لال کی سوانح عمری اور بھگت سنگھ کی پھانسی کے ساتھے۔ وغیرہ۔ ہم سب کو بھی ان کتابوں سے زیادہ خوشی ہوتی تھی۔ کچھ کتابیں ایسی ہوتی تھیں جن کو پڑھنے کے بعد یہ واپس لے جاتے تھے۔ ابا جان یہ بھی دیکھتے لیکن اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ جب یہ واپس چلے جاتے تب مجھ سے کہتے تمہارا بھائی جس راستے پر جا رہا ہے۔ وہ میں ..... سمجھ گیا ہوں۔ اب تمہیں بھی اُسی راستے پر چلانا چاہتا ہے۔ سردار بھائی۔ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے بڑے چہیتے تھے اور جواب میں یہ بھی ویسی محبت ہم سب سے کرتے تھے۔ میں سمجھتی ہوں اُسی محبت نے ابا جان کو ہمیشہ خاموش رکھا۔

اتوار کی شب خواہ گرمی ہو یا سردی ہم لوگ آدھی سے زیادہ رات جاگ کر گزارتے تھے۔ اماں اور ابا جان اُوپر کے حصے میں سوتے تھے۔ نیچے ہم بھائی، بہنوں اور بھابھی جان کی محفل جمتی تھی۔ سردار بھائی ہفتہ بھر کی رپورٹ ہم سبکو سناتے تھے کہ کس طرح ہم لوگ آزادی حاصل کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اب جلدی ہندوستان کے گلے سے غلامی کا طوق اتر جائے گا۔ ہمارے درمیان کسی قسم کا تکلّف یا رکاوٹ نہیں تھی۔ ایک دوسرے پر بے حد بھروسہ تھا۔ یہ سب باتیں سن کر مجھے بلرام پور کے ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی ہمارے درمیان میں تو پردہ حائل تھا۔

ان کو بہترین کپڑے پہننے کی عادت تھی۔ ایک مرتبہ لکھنؤ سے آئے تو اپنے ساتھ ہاتھ کا بنا ہوا کھدر لائے جو بے حد موٹا اور کھردرا تھا۔ مجھ سے کہا۔ تم اس کے پاجامے سی دو۔ کرتے تو ہم نے لکھنؤ میں سلوا لئے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ اس کو کون پہنے گا؟"

"ہم پہنیں گے مگر بھابھی کو مت بتانا۔"

مجھے جب تک پاجامے کاٹنے نہیں آتے تھے۔ بھابھی جان نے اس کپڑے کے پاجامے کاٹے۔ میں نے اور میری بہن رباب جعفری نے مل کر مشین سے سیئے۔ واقعی اتنا سخت کپڑا تھا کہ کاٹنے اور سینے میں ہم لوگوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اماں کی نظر اس کپڑے پر پڑی تو بھابھی جان سے پوچھا

"دولہن! کیا بچوں کے لیے کھدر کی بچھونیا بنائی ہیں۔؟"

بھابھی جان خاموش رہیں۔ پھر ہم سے پوچھا۔ یہ آیا کہاں سے؟ کیونکہ ہمارے گھر بھر تو بزاز۔ کپڑے دیے جاتے تھے۔ ہم نے جواب دیا۔

"سردار بھائی لکھنؤ سے لائے ہیں۔ اپنے کسی دوست کے لیے سلوا رہے ہیں۔"

اماں نے کہا۔ ارے رے۔ جو پہنے گا اُس کا بدن چھل جائے گا۔"

اماں کو کیا خبر تھی کہ یہ اتنا موٹا اور سخت کھدر انھیں کا پیارا بیٹا پہنے گا۔

نیا ادب اور پرچم کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ سبطے بھائی نے مجھے خط لکھا۔ تمہارا خاندان ماشاءاللہ بہت بڑا ہے۔ اگر ایک ایک روپیہ بھی چندہ جمع کر دگی تو ہمارے لئے کافی سرمایا ہو جائے گا۔ میں نے جب خاندان والوں سے چندہ مانگا تو کسی نے خاموشی سے اور کسی نے خوشی کے ساتھ دیدیا اور کسی نے کہا۔ "ہم جن انگریزوں کا نمک کھا رہے ہیں اُن کے ساتھ نمک حرامی نہیں کریں گے۔"

مجھے یہ بات بہت ناگوار گذری بے ساختہ میری زبان سے نکل گیا "انگریز تو ہمارا نمک کھا رہے ہیں۔ اور ہمارا حق چھین رہے ہیں۔

اس جواب پر بہت ڈانٹ پڑی۔ اماں۔ ابا جان سے میری شکایت کی گئی۔ شکایت سننے کے بعد ابا جان نے مجھے بلایا اور صرف اتنا کہا۔ سردار جو کتابیں تمہارے لیے لاتا ہے ان سب کو علیحدہ الماری میں رکھ کر تالہ ڈال دو۔ اور نیا ادب اور پرچم بھی وہیں رکھا کرو بہرحال کچھ دن کی کوشش کے بعد تھوڑی رقم جمع ہو گئی اور میں نے بذریعہ منی آڈر سبطے بھائی کو بھیج دی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ جواب میں لکھا۔ جیسی تم سردار کی بہن ہو ویسی میری بہن ہو۔ اب ہم لوگوں نے ایک الگ گھر لے لیا ہے۔ تم اور رباب یہاں آ کر رہا کرو۔ اور کام کرو۔ یہاں تمہارا سیاسی اور ادبی شعور پختہ ہو جائے گا۔ مجھے خود بہت شوق تھا سردار بھائی کے ساتھ رہنے اور وہاں جاکر کام کرنے کا۔ میرے اختیار میں ہوتا تو ضرور چلی جاتی لیکن ہمارے یہاں لڑکیوں کو یہ آزادی میسر نہیں تھی۔ میں نے وہ خط ابا جان کو دکھایا۔ پڑھ کر

ہنسنے لگے اور مجھ سے کہا تم ان کو لکھ دو پہلے آپ لوگ اپنی تعلیم مکمل کر لیجئے پھر میں آپ کے پاس آؤں گی۔ انھیں دنوں میں ایک کتاب "آزادی کی نظمیں" چھپی حسب معمول جب سنیچر کی رات کو سردار بھائی آئے تو وہ کتاب ہمیں دے گئے۔ اس میں جوش صاحب کی نظم "ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام" سردار بھائی کی نظم "فوجی بھرتی" اور دوسرے شعرا کا کلام تھا۔ فوجی بھرتی کے کچھ شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ جو اس جگہ پیش کر رہی ہوں۔

سڑک کے اس کنارے ایک سیہ لکڑی کے تختے پر
جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے
پکارا جا رہا ہے ہند کے بھوکے کسانوں کو
بجھا سا آج اخلاق شہنشاہی کا تیور ہے
حکومت ہو تمہاری اور ہم توپوں کا ایندھن ہوں
یہ دیوانے کا اک خواب جنوں اب بندہ پرور ہے
ہمارے خون سے شہزادیوں کا روپ نکھرا ہے
ہماری ہڈیوں کے ہار سے ملکہ کا زیور ہے
ستارے کی طرح سے ٹوٹ کر گرنے ہی والا ہے
وہ ہیرا جس کی ضو سے تاج انگلستان منور ہے

ہم بہنوں اور بھابھی جان کو وہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ سب نے دو۔ دو۔ تین۔ تین نظمیں زبانی یاد کریں۔ اس وقت بھابھی جان کا کوئی بچہ چھوٹا سا تھا۔ اس کو ہم سوتے وقت یہ لوری سنا کر سلاتے تھے جو آزادی کی نظموں میں تھی۔ اب تو کچھ شعر یاد رہ گئے ہیں ورنہ اس وقت تو پوری ازبر تھی۔

کبھی تو رحم پہ آمادہ بے رحم آسماں ہوگا
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہوگا
کبھی تو سر پہ ابر رحمت حق گلفشاں ہوگا
مسرت کا سماں ہوگا میرا ننھا جواں ہوگا
میرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اٹھائے گا
سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہ رزم جائے گا
وطن سے دشمنوں کی خون کی ندی بہائے گا
اور آخر کامراں ہوگا میرا ننھا جواں ہوگا

جس سن میں آزادی کی نظمیں شائع ہوئیں اسی زمانے میں سردار بھائی کے افسانوں کا مجموعہ "منزل" شائع ہوا۔ "آزادی کی نظمیں" کی اشاعت کے چند دنوں کے بعد اخبار سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب برٹش حکومت نے ضبط کر لی اور جتنی کاپیاں ملیں وہ جلا دی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ قابل اعتراض نظم جوش صاحب کی ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے

ستارہ جعفری

نا ۔ اور سردار بھائی کی نظم فوجی جبرتی تھی۔
اسی روز بلرام پور کے انسپکٹر پولیس ہماری کوٹھی پر آئے۔ ان کی ملاقات ہمارے رشتہ کے دادا سے ہوئی۔ انسپکٹر نے
دریافت کیا: "یہاں ستارہ جعفری نام کی لڑکی کس گھر میں رہتی ہے۔؟" ہمارے دادا کو سن کر بہت غصہ آیا۔ انھوں نے جواب دیا
جناب! آپ ہمارے خاندان کی توہین کر رہے ہیں۔ آپ کو شرم آنی چاہیئے۔ ہمارے خاندان کی عورتوں اور لڑکیوں کے نام لکھنا
بے پردہ ہے۔ اُن کے خطوط پر والدہ اور ہمشیرہ کر کے لکھا جاتا ہے۔ یہ نیا نام آپ کو کس نے بتایا؟" میرے دادا کو اس قدر برہم
دیکھ کر بیچارہ انسپکٹر پولیس جو تحقیقات کرنے آیا تھا معافی مانگ کر چلا گیا۔
دراصل سردار بھائی نے ان فرسودہ روایات کو توڑ دیا تھا۔ وہ میرے نام کے لفافہ پر ستارہ جعفری لکھا کرتے تھے۔ جب
یہ واقعہ چاچا کو معلوم ہوا تو مجھے آکر سنایا اور کہا "تم نے آج کا اخبار بھی پڑھا ہے۔ گورنمنٹ کتنی سختی کر رہی ہے۔ مجھے معلوم ہوا
ہے کہ تمہارے پاس ایسی بہت سی غیر قانونی کتابیں ہیں۔ اب کسی بھی وقت پولیس تلاشی کے لیے آسکتی ہے۔ تم ابھی میرے سامنے
وہ سب کتابیں لاکر جلا دو ورنہ پولیس کے ہاتھ لگ گئیں تو ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی اور تمہیں جیل میں ڈال دیں
گے۔ میرا دل کتابیں جلانے کو بالکل نہیں چاہا۔ میں نے فوراً سوچا اور چاچا سے کہا۔ ابھی لا رہی ہوں۔ چاچا دالان میں تخت پر بیٹھ گئے اور میں
اندر اسباب کے کمرے میں گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آکر کہا۔ چاچا! اس وقت الماری کی کنجی نہیں مل رہی ہے۔ میں تلاش کروں گی
جیسے ہی ملی سب کتابیں جلا دوں گی۔ چاچا مطمئن ہو کر چلے گئے۔
میں نے سوچا اگر تلاشی ہوگی تو صرف ہمارے گھر کی ہوگی۔ لہٰذا سب کتابیں اور اخبار ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر چاچا
کے گھر چلی گئی۔ چاچا کی منجھلی لڑکی شکیلہ میری ہم عمر ہے۔ ہم دونوں میں دوستی بھی بہت تھی۔ میں نے اس کو سب قصہ سنایا اور کہا
تم ان کتابوں کو جس صندوق میں مہمانوں کے لیے لحاف گدے رکھے ہوئے ہیں اس میں سب سے نیچے چھپا دو کسی کو خبر نہیں پڑے گی۔
شکیلہ نے میرے کہنے کے مطابق سب کتابیں رکھ کر صندوق میں تالا ڈال دیا پھر میں فوراً گھر واپس آئی۔ کچھ ردی اخبار اور ردی کے ٹکڑے
جمع کر کے ان کو آنگن کے ایک کونے میں نذرِ آتش کر دیا جب بالکل جل گئے تب پیروں سے مسل کر ان پر پانی ڈال دیا۔
شام کو چچا دوبارہ آئے۔ پوچھا "کنجی مل گئی؟"
"جی ہاں۔ مل گئی اور سب کتابیں اور اخبار جلا دیے۔"
"کتابیں کہاں جلائیں؟ ہمیں دکھاؤ؟"
میں نے جاکر وہ جگہ دکھائی اور کہا "ابھی اس کو باہر کوڑے میں پھینک دوں گی۔"
چاچا نے بڑے غور سے جلے ہوئے کاغذ دیکھے پھر مجھ سے کہا۔
"اپنی الماری دکھاؤ؟"
میں نے الماری دکھادی جو خالی پڑی تھی۔ الماری دیکھ کر چاچا کو اطمینان ہوگیا۔
میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "شاباش سمجھدار لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"
میں نے کہا۔ "چاچا! کتابیں تو جلا دیں۔ میں اپنے دماغ کو کیسے جلا دوں؟"
"کیا مطلب تمہارا؟" چاچا نے حیرت سے پوچھا۔

ستارہ جعفری

"مجھے یہ سب نظمیں زبانی یاد ہیں۔"

"اچھا سناؤ؟"

میں نے جوش صاحب کی نظم ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام۔ اور سردار بھائی کی نظم فوجی بھرتی۔ پوری سنا دیں۔ سن کر مسکرائے اور چلے گئے۔ تب مجھے اپنے چاچا پر بہت پیار آیا۔ ہمارے بزرگ بھی بچوں کی طرح معصوم ہو جاتے ہیں۔ ان کو کیا خبر سب کتابیں انھیں کے گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ کیونکہ یہ راز میرے اور شکیلہ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

اس واقعہ کو ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ شروع دسمبر ۱۹۴۰ء کی ایک صبح پائنیر اخبار میں سردار بھائی کی گرفتاری کی خبر آگئی۔ ہمارے گھر میں ایک کانگریسی اخبار بھی آتا تھا جس کے پہلے صفحے پر سردار بھائی اور ان کے دوست کی تصویر چھپی تھی اس کے نیچے یہ مصرعہ لکھا ہوا تھا ؎

خاک پہ بیٹھے جیل میں جاکر آج ہمارے عزت والے

ابا جان نے نہایت ضبط اور صبر کے ساتھ یہ خبر اماں کو سنائی ہماری اماں بڑی خوبصورت تھیں اور رنگ بے حد گورا تھا اس خبر کو سنتے ہی پہلے تو ان کا چہرہ سرخ ہو گیا پھر بلک بلک کر رونے لگیں بائی تمام گھر تصویرِ حیرت تھا۔

اسی وقت کی ڈاک سے مجھے سبطے بھائی کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ کل یونیورسٹی سے پولیس سردار کو گرفتار کر کے لے گئی اپنے اور تمہارے خاندان کی پرانی روایت سے میں بخوبی واقف ہوں۔ دیکھو ستارہ! سردار بڑا اچھا، پیارا اور قابلِ فخر بھائی ہے اس کی گرفتاری کی خبر سے والدین پریشان اور خاندان کے لوگ خفا ہوں گے لیکن تم اپنے پیارے بھائی کی گرفتاری سے شرمسار نہیں ہونا بلکہ والدین کو تسلی دینا اور دوسروں کے حملوں سے بچانا۔ ہاں ایک مشورہ اور دے رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے تم مع والدین کے اس سے ملنے کے لیے لکھنؤ آجاؤ۔ اس سے سردار کے دل کو سکون ملے گا۔

سبطے بھائی کا یہ پیار بھرا خط میں نے ابا جان کو دکھایا۔ وہ پہلی ٹرین سے لکھنؤ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ابا جان، چاچا اور دادا کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ سردار بھائی کی رہائی کے لیے گورنمنٹ سے معافی نہیں منگوائیں گے۔ خاندان کے باقی افراد کہہ رہے تھے کہ معافی نامہ پیش کر کے جیل سے چھڑا لو۔ اگر کالے پانی بھیج دیا تو کیا ہوگا! یہ چار دن کے لونڈے بھلا ہندوستان آزاد کرا سکتے ہیں غرض کہ مختلف لوگوں کی مختلف رائے تھی لیکن ابا جان اپنے فیصلے پر اٹل تھے۔ انھوں نے اُس دن کی اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ آج کے اخبارات اور سبطے حسن کے خط سے معلوم ہوا کہ سردار جیل چلا گیا لیکن میں اس سے معافی منگوا کر اس کی بے عزتی نہیں کراؤں گا نیچے ایک شعر درج تھا ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

سردیوں کا موسم تھا۔ سردار بھائی انڈے کا حلوہ بہت شوق سے کھاتے تھے بھابھی جان اور رباب جعفری نے جلدی جلدی حلوہ تیار کیا۔ اماں نے ان کے استعمال کے لیے گرم کپڑے اور گرم بستر ساتھ لیا پھر گیارہ بجے دن کی ٹرین سے ابا جان۔ اماں۔ چاچا ہمارے دادا اور میں لکھنؤ روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں ہمارے ایک عزیز وزیر حسن روڈ پر قیام پذیر تھے۔ ان کے گھر جاکر ہم لوگ ٹھہرے اتفاق سے

اس وقت لکھنؤ سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ چاچا کے کلاس فیلو دوست کرنل جعفری تھے۔ ہم لوگ شام کو لکھنؤ پہنچے اسی رات چاچا کرنل جعفری سے ملنے گئے۔ دوسرے دن اتوار تھا لیکن چاچا کرنل جعفری سے جیلر کے نام ملاقات کا اجازت نامہ لے آئے۔ صبح ہم لوگ جب ملاقات کے لیے جانے کو تیار ہوئے تو کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ معافی نامہ لکھوا لینا چاہیے۔ کل جیل سے چھوٹ جائے گا پھر آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں بیٹھال دینا زندگی سنور جائے گی۔ وہ باتیں کہاکر مگر مجھ سے بیر نہیں کرنا چاہیے۔ ابا جان خاموش رہے چاچا نے جواب دیا۔ ہم معافی منگوا کر سردار کی زندگی خراب نہیں کریں گے۔ اب تو جو بھی ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

ہم لوگ گیارہ بجے سنٹرل جیل پہنچ گئے۔ جیلر صاحب نے سختی سے کہا۔ آج اتوار کے دن آپ سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ چاچا نے کرنل جعفری کا اجازت نامہ دکھایا۔ دیکھتے ہی جیلر صاحب ریشۂ خطمی ہو گئے۔ فوراً ملاقات کا انتظام کر دیا۔ پہلے ابا جان۔ چاچا اور میرے دادا گئے جب یہ لوگ واپس آ گئے تب مجھے اور اماں کو اندر جانے دیا۔ جیل کے بڑے آہنی پھاٹک میں اتنا ہی بڑا تالا پڑا ہوا تھا۔

ایک کھڑکی پھاٹک میں تھی اسی سے اندر آتے جاتے تھے اندر داخل ہونے پر دیکھا کچھ فاصلے پر دوسرا پھاٹک تھا اور اس میں بھی تالا پڑا ہوا تھا دونوں پھاٹک کے درمیان داہیں بایں چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک کوٹھری کی طرف اندر جانے کا جیلر نے اشارہ کیا۔ اماں اور میرے ہاتھ میں حلوہ اور دوسرا سامان تھا اور ہم دونوں برقع پہنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی بڑے پھاٹک سے داخل ہوئے جیلر نے ہمارے ہاتھ سے سامان کی باسکٹ لے لی۔ میں نے کہا۔ ہم خود دیں گے آپ باہر سب چیزیں دیکھ چکے ہیں لیکن ان کی تو نیت خراب تھی کہا۔ ہمارے یہاں ملزم کو اس کے عزیز سامان دیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں سب چیزیں دیدوں گا۔ سگریٹ کے پیکٹ میں نے برقع میں چھپا لیے تھے وہ بچ گئے۔ ہمیں لے جاکر ایک کوٹھری میں بیٹھا دیا جس میں کرسیاں تک ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ہمارا خیال تھا سردار بھائی موجود ہوں گے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا تھوڑی دیر بعد اندر کی طرف کا بڑا پھاٹک کھلا اور ہم نے سردار بھائی کو آتے دیکھا۔ اماں نے اس جگہ بڑی ہمت اور برداشت کا ثبوت دیا۔ مجھ سے کہا دیکھو رونا نہیں ورنہ سردار کا دل چھوٹا ہوگا۔ حالانکہ خود اُن کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا سردار بھائی جب قریب آئے تو ان کا چہرہ بھی تمتمایا ہوا تھا۔ اماں نے بڑھ کر گلے سے لگا لیا پھر سردار بھائی نے مجھے گلے سے لگایا۔ بظاہر ہم تینوں ہنس رہے تھے لیکن دلوں پر جو گزر رہی تھی وہ خدا جانتا ہے۔ ہم دونوں کے چہروں پر نقابیں پڑی ہوئی تھیں۔ شاید اس لیے جیلر ہمارے پیچھے جاکر بیٹھ گیا پھر ہم دونوں نقاب الٹ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔ جیلر صاحب نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ ہم لوگوں کو ملاقات کے لیے آدھا گھنٹہ دیدیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا تب جیلر نے کہا۔ اب ملاقات کا ٹائم ختم ہو گیا۔ یہ الفاظ مجھے اس وقت بڑے تکلیف دہ معلوم ہوئے اللہ کی شان آج ہم بہن بھائی کی بھی ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ ہم تینوں پھر گلے ملے اور اسی دوران میں سگریٹ کے پیکٹ سردار بھائی کو دیدیے جیلر کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں پڑی۔

جب ہم باہر آئے تو دیکھا ایک سیاہ گھونگھر والے بالوں اور سرخ سفید رنگت کا لڑکا کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے اس پر نہرو کٹ گرم جیکٹ اور ہلکی رضائی اوڑھے ابا جان اور چاچا سے باتوں میں مصروف ہے۔ راستے میں ابا جان نے بتایا۔ یہی سبطے[1] حسن ہیں جن کے خط تمہارے پاس آتے ہیں۔ ان لڑکوں کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ اچھے اچھے

---

[1] سبطے بھائی اور ان کی بیگم سے میری ملاقات [illegible] میں کراچی میں ہوئی۔ میری نگاہوں میں تو ان کی ۱۹۴۰ء والی شکل تھی جب میرے بھانجے مسعود نے ملایا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ستارہ جعفری

خاندان کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے یہ حالت بنائی ہے۔ معلوم ہوا سبطے بھائی کو بخار چڑھا ہوا تھا اور اسی حالت میں ملنے آئے تھے

کرنل جعفری کی وجہ سے ہم لوگوں کو بڑی سہولت تھی تیسرے دن ملاقات کی اجازت مل جاتی تھی ایک روز اماں اور میں جیل سے باہر آئے تو دیکھا موٹر کے قریب ایک سن رسیدہ نہایت شاندار خاتون کھڑی ہوئی ہیں اور ابا جان۔ چاچا سے باتیں کر رہی ہیں۔ ابا جان نے اُن سے ہمارا تعارف کرایا اور بتایا یہ لیڈی وزیر حسن ہیں۔ وزیر حسن اور اُن کے بڑے بھائی جج اصغر حسن صاحب سے ابا جان۔ چاچا کی بہت دوستی تھی۔ ابا جان چاچا سے باتیں کرتے وقت تو ان کے چہرے پر کچھ جھنجھلاہٹ سی تھی لیکن ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگیں آگے بڑھ کر اماں سے گلے ملیں پھر مجھے گلے لگا کر دعائیں دینے لگیں۔ ابا جان سے کہا آپ جیسے چاہیں گھر جائیے، یہ دونوں ہمارے ساتھ جائیں گی پھر ہم دونوں کو اپنے پاس موٹر میں بٹھا لیا۔ ان کے ہمراہ دو تین آدمی اور تھے۔ راستے میں اماں سے کہا "آپ بہت قسمت والی ہیں جو ایسا پوت ملا ہے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے"۔ "ارے ہمارا کلیجہ دیکھو دو دو پوت اسی جیل میں بیٹھے ہیں۔ ایک بیٹے اور دوسرے ان کے بڑے بھتیجا"۔ غرضکہ راستے بھر اماں کو تسلی دیتی رہیں کہ آپ کا کلیجہ دیکھ کر ہمارا دل بھی بڑا ہو گیا۔ پھر اکثر ملاقات ہوتی رہی۔

اب ہم لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مقدمہ ضرور چلے گا اور گورنمنٹ غیر قانونی کام کرنے کے سلسلے میں جو بھی سزا چاہے دے سکتی ہے۔ عجیب افراتفری کا وقت تھا۔ گورستان اور جیلیں آباد ہو رہی تھیں۔ ابا جان اور چاچا اس کوشش میں تھے کہ قید کی مدت کم ہو اور سزا میں نرمی برتی جائے۔ ساتھ میں یہ کوشش بھی جاری تھی کہ اے یا بی کلاس دیا جائے۔ والدین اور ابا جان نے ہزاروں دعائیں اور نمازیں ان کے لیے پڑھ ڈالیں۔ ہم لوگ ایک ماہ لکھنؤ میں رہے آخرکار سردار بھائی کے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا چھ ماہ کی سزا کا حکم سنا کر بنارس جیل بھیجا تھا اور بی کلاس دیا تھا۔ بنارس روانہ ہونے سے ایک روز قبل ہم ملنے گئے۔ آگرہ سے میرے بھائی ارشد آ گئے تھے اور کچھ سردار بھائی کے دوست تھے۔ اُس دن ملاقات کرنے والے آٹھ دس آدمی جمع ہو گئے۔ جیلر نے پانچ پانچ منٹ کا وقت سب کو دیا۔ اماں اور مجھے ایک گھنٹے کا وقت دیا۔ ہم اس روز پھر انڈے کا حلوہ اور ضرورت کی چیزیں لے گئے تھے لیکن سب برقع کے اندر رکھیں۔ جیلر صاحب اُس روز ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے مگر اس دن ہمارے پاس باتیں کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں اس دوران میں ہر پانچ منٹ کے بعد ایک آدمی آتا تھا اور ملاقات کر کے واپس چلا جاتا تھا وقت ختم ہونے پر اماں نے ان کے بازو پر امام ضامن باندھا۔ سر اور بازو پر ہاتھ رکھ کر کچھ دعائیں دم کیں اور گلے لگا کر اپنے آنسو چھپانے کے لیے جلدی سے نقاب ڈال لی۔ جب سردار بھائی نے مجھے گلے لگایا تو کچھ کاغذات برقع کے اندر میرے ہاتھ میں دے دیے۔ میرے بے ساختہ آنسو بہنے لگے۔ سردار بھائی کا چہرہ سرخ تھا مگر میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم میری بہت بہادر بہن ہو۔ دیکھو اماں اور ابا جان کو سمجھاتی رہنا۔ میں خط پابندی سے لکھا کروں گا"

(بقیہ حاشیہ) "یہ سبطے ماموں ہیں"، تو میں حیرت زدہ رہ گئی۔ میں نے کہا سبطے بھائی اگر گھر کے علاوہ آپ سے کہیں اور ملاقات ہوتی تو ہرگز نہیں پہچان سکتی تھی۔ آپ تو بالکل بدل گئے۔ میری بات پر ہنس پڑے اور کہا جیا تغیرات زمانہ انسان کی شکل بھی بدل دیتا ہے۔ سوچو ۱۹۴۲ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اور کیا کیا برداشت کیا ہے پھر دونوں نے سگی بہن کی طرح میری خاطر کی۔

ستارہ جعفری

جانے جیلر کو کیا شک ہوا - آکر ہمارے قریب کھڑا ہو گیا اور بار بار کہہ رہا تھا ملاقات کا ٹائم ختم ہو گیا - ہم تینوں مرے سے ساتھ نکلے - سردار بھائی نے کہا ذرا ایک مرتبہ تم اور اماں چہرے پر سے نقاب ہٹا دو - ہم نے نقاب الٹ دی لیکن آنسو ضبط نہ کر سکے - ایک دوسرے کو مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے - جیلر نے پہلے سردار بھائی کو دوسرے پھاٹک سے اندر بھیج کر تالا ڈال دیا پھر اُس کھڑکی کے راستے ہم دونوں باہر نکلے - ابا جان - چاچا - دادا اور میرے بھائی ارشد خاموش کھڑے ہوئے تھے ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی سب ہی اپنے دلی جذبات پر قابو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے - اُس روز پہلی بار میں نے چاچا کی زبان سے برٹش گورنمنٹ کی برائی سنی - راستے میں کہنے لگے اس بدمعاش حکومت کے قول و فعل کا کچھ بھروسہ نہیں ہے - کہتی کچھ اور ہے اور کرتی کچھ ہے - ابھی دو تین روز قبل مجھ سے کہا تھا کہ سردار کو لکھنؤ جیل میں رکھیں گے اور اسے کلاس دیں گے خدا جانے اپنی زندگی میں اب ہم سردار کو دوبارہ دیکھ بھی سکیں گے یا نہیں ! اماں نے گھبرا کر کہا - جس وقت کی گاڑی سے پولیس سردار کو بنارس لے جاتے اس وقت اسٹیشن چلو - چاچا نے جواب دیا - لیکن وہ بدمعاش کہاں ہمیں وقت بتائیں گے

سردار بھائی کے بنارس جانے کے دوسرے دن ہم سب بلرام پور واپس آ گئے - سبطے بھائی نے وہ سامان جو سردار بھائی یونیورسٹی چھوڑ گئے تھے ہمارے پاس بھجوا دیا - گھر آکر میں نے وہ غلاف کھولا تو چند دوستوں کے نام خط اور ان کا پتہ تھا - میں نے سب خطوط سپرد ڈاک کر دیے -

سردار بھائی پر بنارس جیل میں حکومت نے یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ مہینے میں اگر دو بار ملاقات کریں گے تو خط نہیں لکھ سکتے اور اگر خط لکھیں گے تو ملاقات کی اجازت نہیں ہوگی - اس پابندی کے باوجود ہمارے پاس مہینے میں ایک دو خط آجاتے تھے - ہر ماہ کے پہلے ہفتے میں ہماری بڑی بہنیں - آپا منجو - صادقہ باجی - مجو باجی - رباب جعفری - بھائی جان اور بھابھی جان - دو دو افراد کر کے مل آتے تھے - اس کے علاوہ ہم لوگ پابندی سے خط بھی لکھتے تھے جو زیادہ تر غائب ہو جاتے تھے -

ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے - میری بہن صادقہ باجی اور ان کے شوہر منجو جان بھائی ملنے کو گئے تو اپنے ساتھ مسلم پکا کر لے گئے - ویسے تو سب ہی بہن بھائی تحفے لے کر جاتے تھے لیکن صادقہ باجی کے ساتھ ان کا ڈیڑھ سال کا بیٹا افضال تھا - جیلر نے مسلم لے لیا اور کہا - یہ بچہ بھی اندر نہیں جا سکتا - افضال بے حد غصہ ور تھا وہ جیلر سے لپٹ گیا - خوب نوچا اور کاٹا پھر کہا - آپ نے مسلم بھی لے لیا اور ہمیں بھی روک رہے ہیں - جیلر ساری شیخی بھول گئے - گھبرا کر میری بہن سے کہا - آپ دونوں کو اندر لے جائیے -

سردار بھائی - کے ایک دوست بنارس میں رہتے تھے وہ بڑی پابندی سے خیریت کا خط بھیجا کرتے تھے جس سے ایک حد تک تسکین ہو جاتی تھی - بنارس جیل کے ایک خط کی نقل یہاں کر رہی ہوں -

بنارس سنٹرل جیل

۲/مارچ ۱۹۴۱ء

پیاری بہن ستارہ خوش رہو -

گزشتہ ہفتہ تمہیں بھائی جان اور بھابی جان سے میری خیریت معلوم ہو گئی ہوگی - یہاں میرے پاس کھانے، سونے، کتابیں پڑھنے اور باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے انھیں چاروں چیزوں میں دن کٹ جاتا ہے آج پورے تین ماہ

مجھے یہاں گزر گئے ۔ اب تین ساڑھے تین مہینے اور باقی ہیں وہ بھی اتنی ہی جلدی گزر جائیں گے پچھے مہینے ختم ہونے کے بعد جب ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا دن کتنی جلدی گذر گئے مگر اس کا کب یقین ہے کہ ایسے دن پھر لوٹ کر نہیں آئیں گے جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا جیل خانے آباد رہیں گے ۔

پھر تمہارا خیال آیا اور میں بڑی دیر تک سوچتا رہا کہ میری جیل کی زندگی اور تمہاری گھر کی زندگی میں کیا فرق ہے جتنی پابندیاں مجھ پر ہیں اس سے کچھ کم پابندیاں تم پر ہیں مگر تمہیں بچپن سے اس کی عادت ڈال دی گئی ہے کہ گھر کی چار دیواری میں بند رہو ۔ تمہارے لیے ایک نظم شروع کی تھی جو ابھی تک پوری نہیں کر سکا ہوں ۔ اس میں اس خیال کو نظم کرنا چاہتا ہوں ۔

دُور تم سب کی نگاہوں سے بہت دُور ہوں میں
دُور ہو میری نگاہوں سے بہت دُور ہو تم
تم بھی ہو یہاں جیل میں مجبور ہوتے ہیں
میں سمجھتا ہوں کہ میری طرح مجبور ہو تم
ہاں یہاں قید ہے آلام میں زنجیریں ہیں
اور وہاں جسم پہ جذبات پہ تعزیریں ہیں

افسوس کہ اس خط کا دوسرا حصہ گم ہوگیا ۔ مارچ میں جب بھائی جان اور بھابھی جان ملنے گئے تھے تو انھوں نے آکر بتایا تھا کہ بنارس میں گرمی شروع ہو گئی ہے اور سردار کو ابھی تک باہر سونے کی اجازت نہیں ملی ہے ۔ اسی دن سے اماں ۔ ابا جان نے دوپہر کو پنکھے کے نیچے لیٹنا چھوڑ دیا تھا کہتے تھے ۔ ہمارا بیٹا جس کو ہم نے نازوں سے پالا وہ گرمی کی شدت برداشت کرے اور ہم دوپہر کو پنکھے کے نیچے آرام کریں ۔ سردار بھائی نے ایک خط میں لکھ دیا تھا کہ ہمیں کھانے میں سبزی اور دال ملتی ہے لہذا اماں نے اُس دن سے گوشت کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ سبزی بالکل نہیں کھاتی تھیں جب یہ جیل سے چھوٹ کر آئے تب گوشت کھانا شروع کیا ۔

جون ۱۹۴۲ء میں ایک دن ان کا تار آیا جس میں لکھا گیا تھا ۔ میں کل دوپہر کی ٹرین سے بلرام پور پہنچوں گا ۔ اس خبر سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ اماں نے فوراً مٹھائی منگوا کر نیاز دلوائی ہم سب کو تو وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا ۔ والدین کا چہرہ خوشی سے کھل گیا تھا ۔ دونوں نے نماز شکرانہ ادا کی ۔ خدا خدا کر کے وہ رات گزری ۔ دوسرے دن خاندان کے افراد کار لیکر اسٹیشن لینے کو گئے وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ تین ۔ چار سو آدمی جمع ہیں اور ایک یکہ کیلے کے پتوں اور گیندے کے پھولوں سے سجا ہوا کھڑا ہے ۔ جیسے ہی ٹرین آئی مجمع نے زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے ۔ پورا اسٹیشن علی سردار زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا ۔ ہمارے گھر والوں کو جلوس والوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ موٹر میں نہیں ہم یکہ میں بٹھا کر سردار جعفری کا جلوس نکالیں گے ۔ اس وقت بدیسی چیزوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا تھا لہذا موٹر انگریزوں کی چیز سمجھی جاتی تھی ۔ ہمارے گھر کے لوگ جلدی واپس آگئے اماں نے گھبرا کر پوچھا " سردار کہاں ہے ؟ " معلوم ہوا جلوس کے ساتھ آئیں گے ۔ ہمارا گھر ریلوے اسٹیشن سے کئی میل دور ہے ۔ جون کی اس چلچلاتی گرم دوپہر میں جلوس والوں نے یکہ سے گھوڑا نکال دیا تھا اور خود گھسیٹ کر لائے تھے ۔

اس روز اماں نے سب کھانے ان کی پسند کے پکوائے تھے اور جس نفاست سے یہ کھانا کھاتے تھے ویسا ہی

انتظام کیا تھا۔

سردار بھائی کی آمد اور ان کے گرم جوش استقبال کی خبر ساری ریاست میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی۔ اس زمانے میں ریاست کا منیجر انگریز تھا وہ بہت گھبرایا۔ شام کو چاچا کو فون کیا کہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چاچا نے جواب دیا ضرور تشریف لائیے وہ آیا اور کہا آج کی پوری رپورٹ مجھے مل گئی ہے اور گورنمنٹ آف انڈیا کا آرڈر بھی میرے پاس آگیا ہے۔ سردار جعفری ایک سال تک بلرام پور سے باہر نہیں جا سکتے یہ پابندی اس شرط پر ختم ہو سکتی ہے کہ میں سردار کو گورنمنٹ کے خرچ پر پڑھنے کے لیے لندن بھیج دوں یا وہ منظور کریں تو بلرام پور میں بڑی بڑی ملازمت دے سکتا ہوں۔

چاچا نے جواب دیا "میں اس بارے میں سوچ کر آپ کو جواب دوں گا" نیا منیجر کو رخصت کر کے چاچا گھر میں آئے اور اماں سے کہا۔ یہ روپیہ کا لالچ دے کر ہمارے بیٹے کو خریدنا چاہتا ہے مجھے تو منظور نہیں ہے آپ سب کی کیا رائے ہے؟ والدین اور سردار بھائی نے بھی اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ دوبارہ اس نے سردار بھائی کو اپنی کوٹھی پر بلایا اور یہی بات کہی۔ انھوں نے جواب دیا "پہلے آپ اپنی فوجیں واپس بھیج دیجیے۔"

ابا جان اور چاچا نے کوشش کر کے نظر بندی کی مدت چھ ماہ کرا دی تاکہ یہ ایم۔ اے کا امتحان دے دیں۔ سردار بھائی پھر لکھنؤ چلے گئے۔ چند ماہ بعد ایک روز بلرام پور آئے اور اماں ابا جان سے کہا۔ میں بنے بھائی کے ساتھ بمبئی جا رہا ہوں وہاں ہم لوگ کام کریں گے لیکن رات کو جب والدین اوپر سونے کو چلے گئے تب ہم بہنوں اور بھابھی کو بتایا کہ ہم لوگ کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے کے اور اس سلسلے میں ہمارا گروپ بمبئی جا رہا ہے۔ یہ ہم سب سے اپنی کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھتے تھے اور ہم بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ کچھ دن رہنے کے بعد سردار بھائی بمبئی چلے گئے۔

والدین اس خیال سے مطمئن تھے کہ بنے بھائی کی شادی ہو چکی تھی لہذا اُن پر اور رضیہ آپا پر بڑا اعتماد تھا۔ بمبئی سے جب کبھی ان کے خط میں دیر ہوتی تھی تو اماں بنے بھائی کو تار دیتی تھیں وہ مرحوم تار سے جواب دے کر تسلی بخش خط لکھ دیا کرتے تھے۔ بمبئی سے یہ سال بھر کے بعد بلرام پور آیا کرتے تھے اور ہم سب کے لیے نئی نئی کتابیں لاتے تھے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "پرواز" کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مجاز کی آہنگ اور دوسرے شعرا کی کتابیں بھی منظر عام پر آ چکی تھیں۔ کرشن چندر کی کتابیں بھی میں نے اسی زمانے میں پڑھی تھیں۔

ایک سال سردار بھائی بلرام پور آئے تو کہا۔ میں کشمیر جا رہا ہوں وہاں میرے ساتھ ستارہ اور رباب کو بھی بھیج دیجیے کشمیر سے واپسی کے بعد کچھ دن بمبئی میں رضیہ آپا کے ساتھ رہیں گی۔

ابا جان نے اجازت دیدی لیکن میری بدقسمتی سے دوسرے روز پورے ہندوستان میں ریلوے ہڑتال ہو گئی۔ اس سلسلے میں جگہ جگہ ہنگامے ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں شدت پیدا ہو گئی لہذا کشمیر جانا ملتوی ہو گیا۔ کچھ روز بعد سردار بھائی بمبئی چلے گئے۔ آئندہ سال جب آئے تو اپنے ساتھ اپنی نئی کتاب "نئی دنیا کو سلام" لائے۔ دوپہر کو پوری کتاب ہم سب کو پڑھ کر سنائی۔ اس میں ایک مصرعہ تھا

ستاروں سے آنچل سجائیں گے ہم

میں نے پوچھا "کیا واقعی ایسا ہوگا؟ انھوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔ ہاں۔ آزادی مل جانے دو پھر

تم دیکھنا۔ لیکن میں سوچتی ہوں آزادی کے جو سہرے خواب ہم نے دیکھے تھے وہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہیں۔

اس کے چند سال بعد چاچا کا انتقال ہو گیا۔ اس صدمہ کا اثر ابا جان کی صحت پر بہت برا پڑا اگست ۱۹۴۷ء میں آزادی مل تو گئی لیکن خون کی ہولی کھیلنے کے بعد اس میں ہمارے ایک ماموں قتل کر دیئے گئے۔

آپا زہیدہ بلرام پور میں رہتی تھیں۔ ایک روز ابا جان نے آپا کو بلا کر کہا۔ ہم دونوں کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے اور ہماری اب آخری عمر ہے اس خوشی کو تو دیکھ لیں۔ تم اپنے بھائی سے دریافت کرو وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ آپا نے سردار بھائی کو خط لکھا۔ اُس وقت خاندان کے بہت سے لوگ اپنی لڑکیوں کے ساتھ شادی کرنے کے خواہش مند تھے۔ آپا نے ان سب کے نام لکھے اور ان کی پسند دریافت کی۔ اس خط کے جواب میں سردار بھائی نے لکھا یہاں ایک لڑکی سلطانہ بیگم ہیں میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ایک بات یہ ہے کہ وہ سنی ہیں کیا والدین ان سے شادی کی اجازت دیں گے؟ آپا نے وہ خط ابا جان کو سنایا۔ خط سن کر ابا جان نے کہا۔ تم لکھ دو ہماری طرف سے اجازت ہے کیونکہ زندگی تمہیں اس کے ساتھ گزارنی ہے۔ جب خاندان والوں کو علم ہوا تو سب نے اس شادی کی مخالفت کی لیکن ابا جان اور اماں نے سب کو ایک ہی جواب دیا کہ ہمیں اپنے بیٹے کی خوشی منظور ہے پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ شادی کہاں سے ہوگی؟ سردار بھائی نے لکھا ہم بہت سادہ طریقہ سے بمبئی میں شادی کرنا چاہتے ہیں شادی کے بعد میں سلطانہ کو لے کر بلرام پور آؤں گا۔

والدین نے اس رائے کو بھی قبول کر لیا ۱۹۴۸ء میں ابا جان اور آپا بہت سخت بیمار ہو گئے۔ ابا جان کے مثانہ میں پتھری پڑ گئی تھی جس کے لیے ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ بغیر آپریشن کے نہیں نکالی جا سکتی۔ ابا جان بے حد مذہبی خیالات کے تھے ہم لوگوں کی کوششوں کے باوجود آپریشن پر تیار نہیں ہوئے۔ کہتے تھے ڈاکٹر برانڈی استعمال کریں گے۔ اب آخری عمر میں یہ گناہ نہیں کروں گا۔ ہاں۔ سردار کو لکھو وہ شادی جلدی کریں۔

۱۳ر جنوری ۱۹۴۹ء شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ جب شادی کی خبر عام ہوئی تو سلطانہ بھابھی کے ایک چچا بلرام پور میں رہتے تھے وہ تشریف لائے اور ابا جان سے کہا "یہ شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔ ہمارا خاندان قریشی ہے اور آپ لوگ جعفری ہیں۔" ابا جان نے جواب دیا "میں تو بستر علالت پر ہوں۔ لڑکے کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ سلطانہ کے چچا ہیں۔ اپنی لڑکی کو روک لیجئے۔" اس جواب کو سن کر وہ ناراض ہو گئے اور ایسے گئے کہ پھر ہمارے گھر نہیں آئے۔

شادی سے ایک ماہ قبل سردار بھائی بلرام پور آئے اس وقت اپنے خاندان کے رواج کے مطابق اماں نے کچھ زیور اور کپڑے بنا کر دیئے لیکن انہوں نے لے جانے سے انکار کر دیا ان کا کہنا ہے کہ سلطانہ بڑی سادہ زندگی گزارتی ہیں ان کو اچھے کپڑے اور زیور کا شوق نہیں ہے۔ اماں نے کہا "میرے دل کو وہم آتا ہے تم ایک سرخ رنگ کا دولہن کا جوڑا لیتے جاؤ۔ سب کے کہنے سے وہ لے گئے۔

سردار بھائی نے شادی کی اطلاع ہم لوگوں کو تار سے دیدی، پھر خط میں لکھا میں چند ماہ کے بعد سلطانہ کے ساتھ بلرام پور آؤں گا۔ والدین کو نئی بہو کے دیکھنے کا بہت شوق تھا اور ہم بہنیں بھی دوسری بھابھی کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھے سردار بھائی جون میں بھابھی کو لے کر آئے۔ ابا جان نے اپنے ہاتھ سے بھابھی کے گلے میں سونے کا نیکلس پہنایا۔ بڑی بہنوں اور بھابھی نے رونمائی میں سونے کا زیور اور روپیہ دیا۔ رباب جعفری اور میں نے باہر کا بنا ہوا کٹ ورک کا نیلے رنگ کا گلدان دیا۔ اماں نے جو کپڑے بنائے تھے

وہ بھابھی نے پسند نہیں کیے کیونکہ اس وقت یہ شوخ رنگ نہیں پہنتی تھیں۔ دولہن والا جوڑا بھی واپس کر دیا صرف ایک جوڑا سبز رنگ کی سلک کا لیا۔ چھوٹے چچا اور میرے چچا زاد بھائی مسلم علی جرار جعفری نے شادی کی دعوت کی۔ صرف تین دن رہ کر یہ دونوں واپس چلے گئے۔

بلرام پور سے واپسی کے چند ماہ بعد پھر سردار بھائی کی گرفتاری کی خبر آگئی لیکن پندرہ روز بعد رہا کر دیا گیا۔ پھر کچھ ماہ گذرے ہوں گے کہ گورنمنٹ نے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا اور سردار بھائی کو گرفتار کر کے ناسک جیل بھیج دیا اور باقی انڈر گراؤنڈ ہو گئے۔ بنے بھائی اور بھائی پاکستان چلے گئے تھے۔ ناسک جیل سے سردار بھائی بڑی پابندی سے خط لکھتے تھے اور بمبئی سے بھابھی لکھا کرتی تھیں۔

ایک خط میں سردار بھائی نے لکھا کہ سلطانہ کے یہاں بچہ ہونے والا ہے اس خبر سے ہم سب کو بہت خوشی ہوئی۔ اماں نے دستور کے مطابق بچے کے کپڑے دوسری ضروریات کی دوسری چیزیں تیار کر کے بھابھی کے میکے علی گڑھ بھیج دیں۔ ہم سب نے سارا سامان بڑے شوق سے تیار کیا تھا حالانکہ گرمیوں کا زمانہ تھا لیکن جاڑوں تک کا سامان تیار کیا تھا۔ اس میں سویٹر اور رضائی تھیں۔

بھابھی کا تار ملا کہ ۲ مئی ۱۹۴۹ء کو لڑکا پیدا ہوا ہے اس وقت ہمارے گھر میں میلاد ہو رہا تھا۔ اس خبر سے سب کو بے حد خوشی ہوئی۔ اماں نے پاؤ پاؤ بھر کے لڈو بنوا کر تقسیم کئے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد بھابھی نے بچے کی تصویر بھیجی وہ بائیس دن کی عمر کی تھی۔ بھابھی نے لکھا تھا کہ ہم سب ان کو پپو کہتے ہیں (اصل نام علی ناظم ہے) تصویر میں بے حد تندرست اور بالکل سردار بھائی کی صورت معلوم ہوتا تھا جس وقت پپو کی تصویر ملی ہے اس وقت ہماری سب سے بڑی بہن آپا زبیدہ کا آخری وقت تھا۔ پوچھا "کس کی تصویر ہے؟" اماں نے بتایا سردار کے بیٹے کی ہے۔ آپا نے بڑی پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کو چوما اور اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔ ابا جان تو پپو کی تصویر اپنے سرہانے رکھتے تھے اور تکیے کے نیچے سے دن میں ایک دو بار نکال کر دیکھتے تھے پھر کہتے تھے سردار کے بیٹے کا ہمیں بڑا ارمان تھا آج خدا نے میری وہ خواہش پوری کر دی۔ پروردگار سردار کو جیل سے جلد رہائی دے تاکہ ہم بچے کو دیکھ سکیں۔ جب سردار بھائی کو پپو کی پیدائش کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے لکھا تم ابا جان اور اماں کو تسلی دینا۔ میں جیل سے رہا ہوتے ہی سلطانہ اور پپو کو لے کر بلرام پور آؤں گا۔ سلطانہ بھابھی اپنی علالت کی وجہ سے علی گڑھ سے سیدھی بمبئی چلی گئی تھیں۔ سردار بھائی نے جب جیل میں اپنے بیٹے کو پہلی بار دیکھا اور رہا ہوئے اس وقت تک کی پپو کی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑی تفصیل سے لکھا کرتے تھے (وہ سب خطوط آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں) جب پپو سوا سال کے ہوئے تب سردار بھائی جیل سے رہا ہوئے اور فوراً بھابھی اور پپو کو لے کر بلرام پور آئے اس وقت پپو ایک گڈا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارا پورا گھر ان کو دیکھ کر نہال ہو گیا۔ تین چار روز رہنے کے بعد بھابھی واپس چلی گئیں۔

پورے دو سال بعد سردار بھائی کے دوسرا بیٹا پیدا ہوا جن کو پیار میں سب چنم کہتے ہیں اصل نام علی حکمت جعفری ہے۔ اس عرصہ میں ابا جان کا مرض بہت بڑھ گیا تھا اب تو وہ بالکل مجبور ہو گئے تھے لیکن چنم کو دیکھنے کی بے حد خواہش تھی۔ باقی بڑی بہنیں اپنی سسرال والوں کے ساتھ پاکستان جا چکی تھیں۔ گھر میں صرف میں اور میری بڑی بہن رباب جعفری تھیں۔ ابا جان کی نازک حالت کو دیکھتے ہوئے بھابھی جلد اب گھر سے ہمارے پاس آگئی تھیں۔

بھائی اور جوان بیٹیوں کی موت، پھر سردار بھائی کے بار بار جیل جانے کا دکھ اس نے اماں کو بھی بالکل بیکار اور کمزور کر دیا تھا لیکن دونوں کو چنم کے دیکھنے کا شوق تھا ابا جان مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے "تم سردار کے دوسرے بیٹے کو بھی دیکھ لو گی اور اپنے بھائی کا عروج

سردار بھائی

ستارہ جعفری

دیکھو گی مگر ہم نہیں ہوں گے ۔ ابا جان کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی آج میں سردار بھائی کا عروج بھی دیکھ رہی ہوں ۔ ان کے بیٹے توکیا پوتے نبیرے اقبال کو بھی دیکھ لیا ۔ اب جب سردار بھائی کو کوئی ایوارڈ ملتا ہے اور ان کی مقبولیت کا چرچا ہوتا ہے تو میرے کانوں میں ابا جان کے الفاظ گونج جاتے ہیں ۔ وہ بہت پہلے یہ پیشین گوئی کر چکے تھے ۔ مخدوم ایوارڈ ملنے پر بھی مجھے ابا جان بہت یاد آئے ۔

سات سال بیمار رہنے کے بعد فروری ۱۹۵۳ء میں ابا جان کو ڈاکٹروں نے جواب دیدیا ۔ بھائی جان نے فوراً سردار بھائی کو تار دیا جواب میں انہوں نے بھی تار دیا کہ میں آرہا ہوں ۔ جس وقت سردار بھائی کی آمد کا تار ملا ہے ۔ ابا جان کا آخری وقت تھا ۔ ربو باجی پانی پلا رہی تھیں اور میں سر دبا رہی تھی ۔ ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا اور پوچھا ۔ "کیا سردار آگیا ؟" کسی نے کہا " ہاں آگیا " بس آنکھیں بند کرلیں ۔ میرے چچا قریب کھڑے ہوئے تھے انہوں نے جھک کر دیکھا پھر ہم دونوں سے کہا " بی بی ! اب تمہاری خدمت کا وقت ختم ہوگیا " اور لحاف سے منہ ڈھک دیا ۔ ابا جان کی خالہ نے بلند آواز سے سورہ یٰسین پڑھنی شروع کردی ۔ تب میری سمجھ میں آیا ۔ ابا جان ہمیشہ کے لئے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے ۔ سردار بھائی دوسرے دن کی ٹرین سے پہنچے تب تک ابا جان سپرد خاک کردیئے گئے تھے ۔ ابا جان کے چہلم کے دن اماں بھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں ۔

ان دونوں کے انتقال کے بعد سردار بھائی نے ہم بہنوں سے کہا " رباب سات سال کی بیماری سے بہت تھک گئی ہو ۔ یہاں رہوگی تو یہی خیال آتا رہے گا لہٰذا تم دونوں میرے پاس بمبئی چل کر رہو " نومبر ۱۹۵۳ء میں ہم دونوں بہنیں بمبئی آگئیں اور اب تک سردار بھائی کے ساتھ ہیں وہ ادبی شعور جو بلرام پور میں ابھرا تھا ۔ سردار بھائی کے سائے میں رہ کر نکھر گیا ۔

سردار بھائی کی بلند اخلاقی ، کسی بھی مصیبت کے وقت میں ہمت نہ ہارنا ، سب کے برے وقت میں کام آنا ۔ چاہے اپنے پاس پیسہ نہ ہو لیکن ضرورت مندوں کی مدد کرنا یہ خاص صفات ہیں ۔ پڑوسی تو کہتے ہیں اس بلڈنگ میں ایک دیوتا رہتا ہے ۔ بھگوان کی طرح کسی کے ساتھ کیا بھلائی کرتا ہے اور کیا دیتا ہے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا ورنہ لوگ تو ایک پیسہ کسی کو دیتے ہیں تو بتاتے ہیں ۔ مزاج میں قناعت پسندی اور بھی زیادہ آگئی ہے ۔ شاید اسی لئے حوصلہ زیادہ بلند ہے ۔

لیکن اب میں نظر ڈالتی ہوں تو یہاں کے سردار بھائی اور بلرام پور کے سردار بھائی میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے وہ جو کوئی بات اپنے مزاج کے خلاف برداشت نہیں کرسکتے تھے آج ان کی قوت برداشت ہمالیہ پہاڑ کی طرح پائیدار ہے جو صدیوں کے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ اٹل ہے ۔ حالات زمانہ اور وقت انسان کو کتنا تبدیل کردیتے ہیں ۔

بھائی جان بلرام پور میں ہیں ۔ وہ بھی ایسے صابر و شاکر ہیں ۔ دولت کی ہوس سے بے نیاز خدا کی ذات پر بھروسہ ہے ۔ پروردگار میرے بھائیوں اور بہنوں کے کردار کو ایسا ہی بلند رکھے (آمین)

گلزار والدین کے یہ گل کھلے رہیں

شوکت کیفی

سردار جعفری

میرے ہمدم میرے دوست

۱۹۴۷ء میں میرے بہنوئی اختر حسین صاحب نے میرا تعارف حیدرآباد کے کل ہند مشاعرے میں شرکت کرنے والے شاعروں سے کرایا۔ "یہ کیفی اعظمی ہیں، یہ مجروح سلطانپوری اور یہ سردار جعفری" میں نے غور سے سردار جعفری کو دیکھا۔ ایک انتہائی ATTRACTIVE، خوب رو نوجوان جس کی آنکھیں مانند ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔ لمبے لمبے بال جنھیں وہ نہایت دلچسپ ادا سے بار بار پیچھے کی طرف کر لیتے اور ایک بہت ہی دلکش سی مسکراہٹ۔ میں نے انھیں آداب کیا اور اندر بھاگ گئی۔ یہ تینوں نوجوان اختر بھائی اور چھوٹی آپا جان کے ہاں ہی ٹھہرے ہوئے تھے اور میں بھی ان دنوں ان ہی کے ہاں مہمان تھی۔

مشاعرے کے بعد ایک شام ایک چھوٹی سی بیٹھک میں سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" نظم کے کچھ حصے سنائے یہ نظم ان دنوں زیر طبع تھی): ؎

یہ آدمی کی گذرگاہ شاہراہ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتب تقدیر کی جلی تحریر
گلے سے سینکڑوں نقش قدم لگائے ہوئے . . . .

آخری بند تھا ؎

اٹھو اور اٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

اپنی کم عمری کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ یہ صاحب کچھ بہت ہی عالم قسم کے آدمی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فلاسفر بھی لگ رہے ہیں اور THINKER بھی اور دلچسپ بھی لگتے ہیں۔ انھیں میں نے پڑھا نہیں تھا۔ میں اس وقت زندگی کے اس دور سے گزر رہی تھی جس میں صرف رومانس ہی رومانس رہتا ہے۔ خوش رنگ دوپٹے رنگنا، چننا اور اوڑھنا۔ اسکول کے انٹرول میں سہیلیوں کے ساتھ باغ کے چکر لگانا اور خوش گپیوں میں مصروف رہنا ہی ہمارا محبوب مشغلہ تھا۔ ہم تمام لڑکیوں کے محبوب مصنف شفیق الرحمٰن تھے۔ میری ایک سہیلی شمیم تو انھیں خط بھی لکھتی تھی۔ جب شمیم کے پاس شفیق صاحب کا جواب آتا جو بہت دلچسپ ہوتا تھا ہم سب کی عید ہو جاتی۔

ایسے دور میں مجھے سردار جعفری کچھ الگ سے لگے۔ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت نے مجھے بے حد مرعوب کیا اور میرا جی چاہنے لگا کہ میں ان سے باتیں کروں۔ ان کے فلسفۂ حیات کے بارے میں جانوں اور پھر مجھے آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ ان کی دنیا کچھ اور ہی ہے جو ہماری دنیا سے الگ ہے۔ یہ بھوکے ننگے لوگوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ہندوستان سے غریبی، بیکاری اور بے روزگاری ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ظلم اور جبر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں اور اپنی ساری زندگی اس کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ بہت زیادہ نہ سمجھتے ہوئے بھی ان کی یہ باتیں مجھے متاثر کرنے لگیں اور ان کی شخصیت میں میری دلچسپی بڑھ گئی۔

سردار بھائی (جن کو میں آج تک سردار بھائی کہتی ہوں)، کے ساتھ سلطانہ آپا بھی آئی ہوئی تھیں جن سے ان کا عشق روز بروز پروان چڑھ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کیفی اعظمی کو بڑے بھائی کی طرح پیار کرتے ہیں اور ان کی شادی کے لیے ہمرو کی شیروانی اورنگ آباد سے خریدنے والے ہیں (خاتون کا نام نہیں بتاؤں گی)، مجھے بہت غصہ آیا کیوں کہ کیفی اعظمی سے میرا عہد و پیماں آنکھوں ہی آنکھوں میں شروع ہو چکا تھا۔

سردار بھائی شاید مجھے چھیڑنے کے لیے کیفی کی شادی کا ذکر کرتے اور میری طرف مسکرا کے دیکھتے۔ پھر انھیں پتہ چلا کہ ہم دونوں بہت سیریس ہیں تو مذاق بند کر دیا۔

حیدرآباد کے مشاعرے کے بعد ہم اورنگ آباد گئے جہاں میرے والد ایکسائز سپرنٹنڈنٹ تھے۔ سب ہمارے ہی گھر ٹھہرے۔ اورنگ آباد کے مشاعرے کے بعد یہ لوگ بمبئی لوٹ آئے۔

بمبئی پہنچ کر کیفی نے ایک نظم لکھی "جلال و جمال" اور ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں (جو سجاد ظہیر کے گھر ہوا کرتی تھی) سنائی۔ اس نظم پر کافی بحث و مباحثہ ہوا لیکن سردار بھائی نے کیفی کو الگ بلا کر کہا "اگر شوکت سے تمہاری شادی ہو جائے تو تمہاری شاعری ودنکھر جائے گی۔"

آخر ہمارا عشق کامیاب ہوا اور میرے ابا مجھے بمبئی لے گئے اور سجاد ظہیر صاحب کے گھر میں (جنھیں ہم سب بنے بھائی کہتے تھے)، تمام ترقی پسند شعرا اور ادیبوں کی موجودگی میں میرا نکاح کیفی اعظمی کے ساتھ پڑھا دیا۔

ان دنوں کیفی اعظمی کی نظموں کا مجموعہ "آخرِ شب" چھپ رہا تھا، ابھی پوری طرح چھپا نہیں تھا۔ شادی کے بعد [illegible] سردار بھائی کا تھا۔ پتہ نہیں اتنی جلدی انھوں نے اس کی جلد کیسے بنوائی۔ نہایت خوبصورت [illegible] جلد [illegible] لکھا تھا [illegible]

(میرا گھر میرا نام) ۵

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اُڑنے کھلنے میں ہے نکہت خمِ گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے

یہ کیفی کی نظم "عورت" کا ایک بند ہے۔ اس بند نے میرے شعور میں، نسائیت کیا اور سردار بھائی کی بیوی سے مجھے بہت ہی اپنائیت سی ہوگئی۔ پارٹی کمیون میں آنے کے بعد سردار بھائی، سلطانہ آپا، مہدی، سبھی میرے سب جو آج بھی کیفی کے پیارے دوست ہیں، سے مل کر میں اپنے بہن بھائیوں کو بھول گئی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو سردار بھائی کی شادی سلطانہ آپا سے ہوئی۔ شادی کی تقریب بہت ہی سادگی سے ریڈ فلیگ ہال میں کامریڈوں کے ساتھ منائی جا رہی تھی۔ سردار بھائی تقریر کر چکے تھے۔ سلطانہ آپا شرما شرما کر تقریر کر رہی تھیں کہ دوسرے ایک کامریڈ نے آ کر اطلاع دی کہ مہاتما گاندھی قتل کر دیے گئے ہیں۔ پھر جو بھگدڑ مچی ہے کہ اللہ دے بندہ۔ اس وقت میں اور کیفی اندھیری کے کمیون میں رہتے تھے۔ ہم دونوں باہر نکل کر بھاگے۔ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم، کسی کو کسی کی پروا نہیں۔ سب اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں۔ یہ خبر تھی کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے۔ فساد ہو جانے کا خوف سب کے دلوں پر طاری تھا۔ بھیڑ بہت تھی میں تو ریل میں چڑھ گئی، لیکن کیفی اسٹیشن پر رہ گئے۔ اندھیری اسٹیشن پر میں اتری تو دیکھا کہ کیفی نہیں ہیں۔ میں رونے لگی۔ اتنے میں ایک کامریڈ مل گئے۔ انھوں نے مجھے گھر پہنچایا۔ تھوڑی دیر میں کیفی بھی آ گئے۔ پتہ نہیں بیچارے دولہا دلہن کی رات کہاں اور کیسے گزری ہوگی۔ شاید عصمت آپا کے گھر رہے ہوں گے کیوں کہ عصمت آپا صبح سے ان کے ساتھ تھیں۔

اندھیری کمیون میں ہمارا اور سردار بھائی کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا۔ وہاں مجھے سردار بھائی کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انتہائی سادہ مزاج، رحم دل، زیادہ تر وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتے۔ جب کوئی نظم کہنا شروع کرتے تو ٹہل ٹہل کر گنگنانے لگتے اور نظم کہتے جاتے۔ مشاعروں میں سب سے زیادہ داد سردار بھائی اور کیفی کو ملتی اور بنّے بھائی اپنی سگریٹ ہونٹوں میں دبائے پیار اور غرور سے ان لوگوں کو دیکھتے رہتے اور خوش ہوتے کہ کام گار میدان اور مدن پورہ کے ہزاروں مزدور اور مسحور ہو کر ان کی باتیں سنتے اور شعور کی ایک روشنی لے کے اپنے گھر لوٹتے۔

پھر میں کیفی کے ساتھ لکھنؤ چلی گئی۔ وہاں میرا بڑا بیٹا پیدا ہوا۔ ایک سال وہاں رہنے کے بعد جب واپس بمبئی پہنچی تو وہاں ایک انقلاب آ چکا تھا۔ اندھیری کمیون ٹوٹ چکا تھا اور پارٹی پر پابندی لگ گئی تھی۔ سجاد ظہیر پاکستان چلے گئے تھے اور رضیہ آپا (سجاد ظہیر کی بیوی) لکھنؤ شفٹ ہو چکی تھیں۔ بنّے بھائی کا گھر "سیکری بھون"، جو مالکیشور روڈ پر تھا وہ سردار بھائی نے لے لیا تھا "سیکری بھون" سردار بھائی اور سلطانہ آپا کے آ جانے سے ایک چھوٹا سا کمیون بن گیا تھا جس میں مہدی، زہرا (مہدی کی بیوی)، ممتاز حسین اور ان کی بیوی رہنے لگے تھے۔ میرے اور کیفی کے لیے جگہ نہیں تھی اس لیے میں اپنے ماں باپ کے پاس حیدرآباد چلی گئی، جہاں میرا بیٹا بیمار ہو گیا اور پھر وہ مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلا گیا۔

میں نے سنا سلطانہ آپا کے بچہ ہونے والا ہے۔ پھر ایک دن صبح صبح جب کہ سردار بھائی سو کر بھی نہیں اٹھے تھے پولیس آئی

اور سردار بھائی کو سلطانہ آپا کی آنکھوں کے سامنے پکڑ کر لے گئی۔ سلطانہ آپا کے دل پر اس وقت کیا بیتی ہوگی؟ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب میں حیدرآباد سے واپس آئی تو سلطانہ آپا کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔ اس وقت تک ان کا بڑا بیٹا پیدا ہو چکا تھا۔ "سیکری بھون" لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ سلطانہ آپا نوکری کرتی تھیں۔ اپنے بچے کو پالتی تھیں اور کمیون چلاتی تھیں جس میں کہتے کہ تو ہر کامریڈ کو ہر مہینے اپنے کھانے کے پچاس روپے دینے پڑتے تھے، لیکن یہ بھوکر ڈونگ کئی کئی مہینے پیسے نہیں دے سکتے تھے۔ ان کو کھانا وہی کھلاتی تھیں اور ان میں میں بھی ایک تھی۔ کیفی انڈرگراؤنڈ چلے گئے تھے اور میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

پھر سردار بھائی کی ایک نظم میں نے پڑھی "نیند" جو انھوں نے اپنے بیٹے کے پیدا ہونے پر ناسک جیل سے سلطانہ آپا کو لکھ کر بھیجی تھی (یہ نظم انتخاب میں شامل ہے)

اس نظم کو پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے لگا سردار بھائی کے اندر کا انسان کتنا کومل، کتنا نازک، کتنا لطیف اور حساس ہے۔ پھر میں نے سنا سردار بھائی اور دوسرے کامریڈس نے بھوک ہڑتال کر دی۔

پارٹی نے کال دے دی۔ ایک لاکھ آدمیوں نے قیدیوں کی ہمدردی میں بھوک ہڑتال کی اور جلوس نکالا جس میں میں بھی تھی۔ آرتھر روڈ کے سامنے سے بھی جلوس گزرا نعرے لگاتا ہوا۔ اس وقت مرارجی ڈیسائی مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ تھے ایک نعرہ تو مجھے اب بھی یاد ہے۔

مرارجی بھائی کرسی چھوڑ دو

جلدی چھوڑ دو جلدی چھوڑ دو"

لال باغ جو مزدوروں کا علاقہ ہے وہاں پولیس نے گولی چلا دی ان کی گولی سے "اپٹا" (انڈین پیپلس تھیٹر) کا ایک لڑکا ہلاک ہو گیا۔ دینا گاندھی[1] اور بلراج ساہنی وغیرہ پکڑے گئے اور جیل گئے۔ میں بھاگ کر ایک مزدور کی جھونپڑی میں گھس گئی جہاں اس نے مجھے پانی پلایا اور گھر تک پہنچایا۔

اس کے بعد پھر مجھے حیدرآباد جانا پڑا۔ ان دنوں شبانہ پیدا ہونے والی تھی۔ پارٹی پر سے پابندی اٹھ چکی تھی سردار بھائی جیل سے رہا کر دیے گئے تھے۔ سلطانہ آپا سے سیکری بھون بھی چھن چکا تھا۔ کسی سندھی نے پولیس بلا کر ان کے گھر پر کھڑے کھڑے قبضہ کر لیا تھا کیوں کہ سجاد ظہیر جو اس گھر کے اصلی کرائے دار تھے پاکستان میں انڈرگراؤنڈ تھے۔

یہ لوگ ریڈ فلیگ ہال کے ایک کمرے میں منتقل ہو گئے جو پارٹی کے قبضے میں تھا۔ کیفی کو گھر کی تلاش تھی جو مل نہیں رہا تھا کیوں کہ میری ضد تھی کہ جس کمرے میں رہوں گی اس میں کھانا نہیں پکاؤں گی۔ کچن کے ساتھ کمرہ لینے کی کیفی کی حیثیت نہیں تھی۔ پھر ڈوم ٹکر روڈ پر چوتھی منزل پر ایک نہایت گندا سا کمرہ مل گیا جس میں بجلی کٹ چکی تھی۔ باتھ روم مشترک تھا لیکن کچن الگ تھا۔ یہ کمرہ مسعود صاحب اور ان کے بھائی گلشن جعفری[2] کی مہربانی سے ملا تھا۔

لیکن کچھ مہینوں بعد وہ کمرہ بھی چھن گیا۔ اس وقت تک میں نے پرتھوی تھیٹر میں نوکری کر لی تھی اور کیفی بھی ریڈ فلیگ ہال میں منتقل ہو گئے تھے کیوں کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا کمیون تھا۔ وہاں آٹھ سال ہم نے گزارے اور وہیں مجھے

---

[1] اب ان کا نام دینا پاٹھک ہے اور اسٹیج اور فلم کی مشہور اسٹار ہیں۔

[2] انقلاب کے سابق ایڈیٹر اب اردو ٹائمز میں کام کرتے ہیں۔

ت نہی
دار بھائی کو اور بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی انسان دوستی، ہمدردی، سادگی نے میرے دل میں گھر
یا تھا۔

ریڈنگ ہال میں بھی جب کمرہ ہم کو پہلے پہل ملا اس میں کوئی بالکونی نہیں تھی کہ میں اپنا کچن الگ کر سکوں اور
سے مدر کھانا پکانے کے تصور سے میرا دم گھٹنے لگتا تھا اور مجھے رونا آجاتا تھا۔ سردار بھائی کو اس کا احساس ہوا۔ انھوں
بڑے پیارے کہا۔ تم اپنا کھانا میرے کمرے کے پچھلے حصے میں پکا لو۔ یہ ایک گلی سی تھی جس میں سے لوگ آتے جاتے تھے آپ
دازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے کتنی خوشی ہوتی تھی۔ شکر کے جذبے سے بھری آنکھوں میں آنسو آگئے اور ایک بار پھر مجھے محسوس ہوا
اس دنیا میں ایسا انسان بھی ہے جو لوگوں کی تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے اور انھیں اپنی حد تک۔ دور کرنے کی پوری کوشش
رتا ہے۔

پھر بہت جلد ہم کو اسی ریڈنگ ہال میں منیش رکھنی کے جگری دوست۔ انے اپنا کمرہ دے دیا اور خود سامنے والے
کمرے میں منتقل ہوگئے، اس کمرے میں سامنے بالکنی تھی۔ اس میں میں نے اپنا کچن بنا لیا اور میری زندگی کے آدھے مسائل حل ہوگئے۔

ایک دن سلطانہ آپا کا سونے کا ——— منگل سوتر چوری ہو گیا۔ اس وقت ہمارے پاس ایک بہت ہی چھوٹ
قد کا آدمی، جس کا نام انتون تھا نوکر تھا۔ میرا اور سلطانہ آپا کا خیال تھا کہ منگل سوتر اسی نے چرایا ہے۔ چنانچہ اسے پولیس
کے حوالے کر دیا گیا۔ وہاں پولیس نے اسے ٹارچر کیا، لیکن اس نے کہا کہ اس نے نہیں چرایا ہے (شاید نہ ہی چرایا ہو)
پولیس اسے سردار بھائی کے پاس لے کر آئی۔ اس نے رو کر کہا، "صاحب میں نے نہیں چرایا۔ مجھے چھوڑ دیجیے" اور اس نے
اپنے بال دکھائے کہ پولیس کس طرح بیدردی سے اس کے بال نوچتی اور مارتی رہی ہے۔ بس سردار بھائی کانپ گئے۔ اس وقت
دو اسے کسی طرح بھیج دیا، لیکن کام نہیں کر سکے۔ رات بھر ٹہلتے رہے۔ پھر سلطانہ آپا سے گھبرا کر کہا "سلطانہ خدا کے لیے اُسے
چھڑوا دو۔ میں لکھ نہیں سکتا۔ جیسے ہی قلم اٹھاتا ہوں انتون اپنے بال لیے میرے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے"
سلطانہ آپا نے دوسرے ہی دن جا کر اسے چھڑوا دیا۔ سادہ مزاج اس قدر ہیں کہ ایک بار پدم پد سنگھانیہ کے ہاں
دعوت تھی تمام ترقی پسند شاعر اور ادیب مدعو تھے۔ سجاد ظہیر، سردار جعفری، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، عصمت چغتائی، خواجہ
احمد عباس۔ سردار بھائی شیروانی پہنے ہوئے تھے، اندر کرتا پرانا تھا۔ عصمت آپا کی نظر آستین پر پڑی جو پھٹی ہوئی تھی۔ عصمت آپا
ایک شرارتی، انھوں نے شرارت سے کرتے کی آستین کھینچی سے زور سے کی۔ پوری آستین عصمت آپا کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ ہنسنے لگیں،
لیکن سردار بھائی بالکل نارمل رہے۔ میں نے پوچھا "اتنی نارمل پارٹی میں آپ پھٹا ہوا کرتا پہن کر کیوں آئے؟"
سردار بھائی بغیر شرمندہ ہوئے نہایت اطمینان سے بولے "ان لوگوں نے مجھے میری شاعری سننے کے لیے بلایا ہے نہ کہ میرے
کپڑے دیکھنے کے لیے۔"

سردار بھائی بچوں سے بے حد پیار کرتے ہیں۔ کیسا ہی مرکھنا بچہ کیوں نہ ہو وہ اسے دو منٹ میں اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں
پہلے اسے اپنی پیشانی کا مسّہ دکھائیں گے۔ پھر اچھالیں گے۔ پھر اس کی زبان میں دلچسپ باتیں کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان کا دوست
بن جائے گا۔ آج ان کا پوتا اقبال ان کا سب سے گہرا دوست ہے۔

شبانہ پیدا ہو چکی تھی اور مجھے اس کے نام کی تلاش تھی۔ میں، سردار بھائی اور کیفی ایک بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا

انتظار کر رہے تھے۔ میں نے سردار بھائی سے کہا۔ میری بچی کے لیے کوئی نام بتلایئے۔ سردار بھائی نے کھڑے کھڑے ڈیڑھ درجن نام گنوا دیے۔ جب انھوں نے شبانہ کہا تو میں نے انھیں فوراً روک دیا۔ "ٹھہر جایئے، یہ نام خوب صورت ہے۔ میں اپنی بچی کا یہی نام رکھوں گی۔" چنانچہ اس کا نام شبانہ رکھا گیا جو سردار بھائی کا دیا ہوا ہے۔

سردار بھائی انتہائی دلچسپ آدمی ہیں۔ ان کی صحبت میں آپ ایک منٹ کے لیے بھی بور نہیں ہو سکتے۔ ریڈنگ ہال میں ایک کامریڈ شیل جی رہا کرتے تھے جو ہندی کے شاعر اور ادیب ہیں۔ پرتھوی تھیٹر کا آخری ڈراما "کسان" بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے، لیکن بے چارے بہت ہی بھولے آدمی ہیں۔ سوالات بہت پوچھتے ہیں۔

ریڈنگ ہال میں ایک بار سردار بھائی صبح صبح باتھ روم سے آ رہے تھے (جو مشترک تھا) شیل جی باتھ روم جا رہے تھے۔ شیل جی نے مسکرا کر پوچھا "ٹٹی کرنے گئے تھے؟"

سردار بھائی نے شرارت سے کہا "نہیں۔ ناشتہ کرنے گیا تھا!"

ایک بار سلطانہ آپا، سردار بھائی، کیفی اور شیل جی ساتھ پکچر دیکھنے گئے۔ سلطانہ آپا نے سردار بھائی کے کان میں کچھ آہستہ سے کہا۔ فوراً شیل جی نے سوال کیا "کیا کہہ رہی تھیں؟" سردار بھائی نے کہا "پیار مانگ رہی تھیں" بیچارے شیل جی شرما گئے۔

سردار بھائی کی سب سے بڑی خوبی ہے رحم دلی، انسانیت دوستی، بچوں اور انسانوں سے پیار کرنا۔ اگر کیفی اس وقت زندہ ہیں تو اس میں اُن کا اور سلطانہ آپا کا ہی ہاتھ ہے۔

۹ فروری ۱۹۷۳ء کو کیفی کو رات کے تین بجے کوئی دورہ پڑا اور دماغ کی رگ پھٹ گئی۔ کچھ ہی دنوں پہلے سردار بھائی کو ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا۔ میں نے ڈر کے مارے ان کو فون نہیں کیا۔ یہ سوچ کر کہ ان کے دل پر برا اثر پڑے گا، لیکن میں پریشان بہت تھی، رو رو کر میری آواز بھاری ہو چکی تھی۔ صبح نو بجے سردار بھائی کی بہن ربّو باجی کا فون آیا۔ "بہت دنوں سے تمہارا فون نہیں آیا تم ٹھیک تو ہو نا؟"

میں نے کہا "رات کیفی کو فالج ہو گیا!" وہ گھبرا گئیں اور انھوں نے فوراً سردار بھائی کو بتا دیا۔ پھر کیا تھا۔ سردار بھائی نے سیکڑوں فون ڈاکٹروں کو کر ڈالے اور بریچ کینڈی ہسپتال میں کمرہ بک کر لیا اور مجھے فون کیا کہ میں فوراً کیفی کو لے کر بریچ کینڈی ہسپتال پہنچوں۔

اس وقت میرے پاس صرف سو روپے تھے۔ بریچ کینڈی ہسپتال کا خرچ اٹھانا میرے بس کا روگ نہیں تھا۔ میں ہچکچانے لگی سلطانہ آپا نے کہا "موتی تم پیسوں کی فکر بالکل مت کرو، خدا کے لیے دیر نہ کرو۔ اگر تم ایمبولنس لے کر نہیں آئیں تو میں یہاں سے آ جاؤں گی، لیکن اس میں اور دیر ہو جائے گی۔ اس لیے جلدی آؤ۔" میں بارہ بجے تک ہسپتال پہنچی تو سردار بھائی اور سلطانہ آپا دو بہت بڑے برین اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کو لے کر ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ پھر سردار بھائی نے کہا تم ہمارے گھر آ جاؤ۔ جوہو سے تمہیں آنے جانے میں تکلیف ہوگی۔

ڈاکٹروں نے کیفی کو ۷۲ گھنٹے دیے کہ اگر اس میں یہ بچ گئے تو بچ جائیں گے، ورنہ جینے کی امید نہیں ہے۔ یہ بات مجھ سے دونوں نے چھپا لی۔

میں سردار بھائی کے گھر آ گئی، لیکن پورا دل ہسپتال ہی میں رہتا۔ ذرا ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی اور میرے پیر کانپنے لگتے اور

ہیں یہ مشکل بھاگ کر ٹیلیفون پہ پہنچی کہ پتہ نہیں کیا خبر آئی ہے۔ سردار بھائی نے یہ دیکھ لیا۔ کہنے لگے "تم ٹیلیفون ریسیو مت کرو۔ یہ کام میں کروں گا۔" حالانکہ کھانے کے بعد انھیں تھوڑی دیر سونے کی عادت ہے، لیکن وہ اپنا سونا بھول چکے تھے۔ گھنٹی بجتے ہی دوڑ کر جاتے اور فون اٹھاتے۔

سلطانہ آپا مجھ سے کہنے لگیں "اگر تمہارے رونے یا پریشان ہونے سے کیفی کی صحت میں ایک فی صد کا بھی اضافہ ہوتا تو میں تم سے فرمائش کرتی کہ مزید روؤ، لیکن اگر کوئی فائدہ نہیں ہے تو کیوں اپنی صحت تباہ کر رہی ہو۔ ہمت سے کام لو۔ ان کی تیمارداری کے لیے تمہارا تندرست ہونا بہت ضروری ہے۔" ان باتوں سے مجھ میں اتنی ہمت آگئی کہ میں سب کچھ جھیل گئی۔

اسی طرح جب جاں نثار اختر صاحب کا جسلوک ہسپتال میں انتقال ہوا تھا ان کی بیوی خدیجہ نے سب سے پہلا فون انھی دونوں کو کیا۔ ہسپتال میں سب سے پہلے پہنچنے والوں میں یہی دونوں تھے۔ معلوم ہوا کہ ہسپتال کا بل پانچ سو روپے باقی ہے۔ اس کے بغیر لاش نہیں لے جا سکتے۔ دونوں میاں بیوی دوڑے ہوئے گھر آئے۔ سردار بھائی نے اپنے بٹوے سے تین سو روپے نکالے جو کل ان کی پونجی تھی اور کہنے لگے "سلطانہ تمہارے پاس کتنے روپے ہیں۔ دو سو ہیں تو دے دو۔" پھر ہسپتال گئے اور یہ پیسے جمع کروا دیے۔

یہ بات ان دونوں میں سے کسی نے نہیں بتائی بلکہ خدیجہ نے بعد میں مجھے بتایا۔

سجاد ظہیر کی بیوی رضیہ آپا کی موت کے بعد جب کیفی نے کنڈولنس میٹنگ بلائی تو سردار بھائی، رضیہ آپا کے بارے میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کرتے کرتے وہ رونے لگے۔ ان کی آواز بھرّا گئی اور بول نہیں سکے۔ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ ان کا دل گلاب کی پنکھڑی کی طرح نازک ہے جو ذرا سی تکلیف سے مرجھا جاتا ہے۔

کیفی کو کمیونسٹ پارٹی میں لانے والوں میں سردار بھائی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ ریڈ فلیگ ہال کے کمرے میں جب کیفی نہیں ہوتے تھے تو سردار بھائی کمرے میں آتے اور مجھ سے پوچھتے "کیفی نے کوئی نئی نظم کہی ہے؟" اگر میرے علم میں نہیں ہوتا تو خود ان کی میز پر کسی کاغذ پر یا سگریٹ کی ڈبیہ پر جو بھی انھیں لکھا ہوا ملتا لے جاتے اور چھپوا دیتے۔

حسد نام کا کوئی جذبہ ان کے دل میں نہیں ہے۔ کیفی کی کسی اچھی نظم پر اسی طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح وہ اپنی نظم پر خوش ہو سکتے ہیں۔ جب کیفی کو لوٹس ایوارڈ (LOTUS AWARD) ملا تو دلّی کے مشاعرے میں جو ٹی وی پہ ہو رہا تھا، سب سے پہلے کیفی کے ایوارڈ کو سردار بھائی نے اناؤنس کیا۔

پچھلے دنوں کیفی نے سردار بھائی پر ایک بہت ہی خوب صورت نظم کہی ہے۔ سردار بھائی بے حد حسن پرست ہیں اور عاشق مزاج بھی، لیکن اپنی بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں چاہتے۔

بیماری کے بعد ان میں قوتِ برداشت کی کمی ضرور ہو گئی ہے، لیکن پھر بھی کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ ۱۹۵۴ء میں والد کے انتقال کے بعد اپنی دو بہنوں کو اپنے پاس بلا لیا جو آج تک ان کے ساتھ ہیں۔ انھیں خود کفیل بنانے میں سردار بھائی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

رنجیت کپور (اسٹیج کا ایک بڑا ڈائرکٹر) کا کہنا تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے اندر ایک ترقی پسند تحریک ہیں اور یہ بات بہت حد تک صحیح ہے۔

سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست

جعفری نمبر

شوکت اعظمی

۱۹۴۳ء میں جب بنگال میں بری طرح قحط پھیلا ہوا تھا اور انگریزوں کے خلاف آزادی کی لڑائی زوروں پر تھی تو اسی حساس آدمی نے لوگوں کی تکلیفوں کو شدت سے محسوس کیا اور ایک طویل ڈرامیٹک نظم لکھی جو اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی نظم ہے "نئی دنیا کو سلام" اس میں تین کردار بہت اہم ہیں۔ ایک جاوید جو انقلابی ہے اور اس کی بیوی مریم جس کے بچہ ہونے والا ہے جو نئی دنیا کی علامت ہے۔ جب جاوید اپنی بیوی کو سرمایہ داری کی بھیانک تصویر دکھاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زبان پر قابو۔ اپنے موضوع سے بے پناہ خلوص کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ سننے والے کو سرمایہ داری سے نفرت ہونے لگتی ہے ؎

آج وہ سرمایہ داری
بوڑھی قحبہ ہے دلالی پیشہ ہے اس کا
اب وہ ایک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے سڑ رہی ہے
قبر پہ پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچے جنے ہیں
بھوک، بیکاری، افلاس، قحط، وبا جہل وہم آتشک
زہریلی گیس اور ایٹم کے بم اس کی گود کے پالے
ہوئے ہیں
اب یہ بچے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کے لیے ایک بلا ہو گئے ہیں

ممکن ہے ادیبوں کو یہ گالی سخت لگے، لیکن اس سے اچھا لفظ اس جذبے کے لیے نہیں مل سکتا۔ اس نظم میں بے پناہ ڈراما ہے۔ اگر اس نظم کو اسٹیج کیا جائے اور کوئی اچھا آرٹسٹ جس کی زبان اچھی ہو تو وہ لوگوں کے رونگٹے کھڑے کر سکتا ہے۔

اور پھر جب ۱۹۶۵ء میں ہندوستان پاکستان میں پہلی جنگ ہوئی تو اسی حساس شاعر نے "صبح فردا" نظم کہی ؎

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد خون کی اشکوں کی آہوں کی شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اگائی تھیں

سردار جعفری میرے ہمدم میرے دوست

جعفری نمبر

وکٹ کیملی

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن، بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

رادھا اور رشا۔ ان کی بہت اچھی نظمیں ہیں۔ ابھی ایک طویل نظم
پتھر کی دیوار، میرا سفر، ہاتھوں کا ترانہ، نوالا۔
جو بہت ہی خوبصورت ہے۔
شروع کی ہے "تو نہیں ہے میرا گھوارہ"
نے بہت خوبصورت زبان میں ترجمہ کی ہیں۔
سنسکرت کے شاعر ودیاپتی کی نظمیں بھی انھوں
کہ میں لکھنے بیٹھوں تو ایک کتاب بن جائے۔ پھر بھی ان کے
سردار بھائی کے ادبی کارناموں کی اتنی لمبی فہرست ہے
پدم شری ہیں۔ کئی انعامات پا چکے ہیں کئی
شعری مجموعے تقریباً دس ہیں۔ "گفتگو" نام کا رسالہ کئی سال تک نکالتے رہے۔
قابل ذکر ہیں۔ "علامہ اقبال" کی ڈاکومینٹری کی
ڈاکومینٹری فلمیں بنا چکے ہیں جن میں "ہندوستان ہمارا" اور "علامہ اقبال"
اس ڈاکومینٹری فلم کی دو کاپیاں حکومت
شوٹنگ ہندوستان اور پاکستان میں ہوئی تھی۔ جسے خواجہ احمد عباس نے ڈائرکٹ کیا تھا۔
ہند نے حکومت پاکستان کو تحفے میں دی تھیں۔
دیوانِ غالب، دیوانِ میر، کبیر، میرا بائی کو دو زبانوں میں ایک ساتھ چھپوانا ایک طرف اردو
یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔
غالب کو پڑھ سکیں۔
میں اور دوسری طرف ہندی میں تاکہ ہندی جاننے والے بھی میر،
ہندوستان میں جتنے "دیکھو میرا آواز اور روشنی"
اس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سردار جعفری کا نام سرفہرست ہے۔
کشمیر کے شالیمار باغ پر جس میں آواز مینا کماری نے دی تھی۔ پنڈت
کا ڈرامہ) بنے ہیں یعنی لال قلعہ پر، سابرمتی آشرم پر،
نہرو پر۔ سب سردار بھائی کے لکھے ہوئے ہیں۔
ان کی کتاب "اقبال شناسی" بہت مشہور ہے۔ کشمیر جموں
اقبال پر مہارت رکھتے ہیں۔
جسٹس آف پیس رہ چکے ہیں۔
ان کی کتاب "نئی دنیا کو سلام" بارہ زبانوں
بہت اچھے تنقید نگار بھی ہیں۔
یونیورسٹی میں اقبال پر لکچر بھی دیتے رہے ہیں۔
میں چھپ چکی ہے۔ اتنی شہرت کے باوجود ذرا بھی غرور نہیں کرتے ہیں۔
انھیں زندگی سے اتنا ہی پیار ہے۔ انھیں اپنے آپ
مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ جتنے بڑے ترقی پسند شاعر اور ادیب ہیں
بہت ہی شدت سے محسوس کرتے ہیں جیسے سجاد ظہیر
سے پیار نہیں ہوتا بلکہ پورے عالم سے پیار ہوتا ہے اسی لیے دوسروں کے دکھ کو
سردار جعفری، کیفی اعظمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس
پی سی جوشی، کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری راجیشور راؤ،

یہ لوگ کسی دوسرے کی تکلیف کو اتنی شدت سے محسوس کرتے ہیں، تب ہی تو سوشلزم لانا چاہتے ہیں اور اتنے اچھے شاعر ہیں۔

یہی حال سردار بھائی کا ہے۔ کچھ پھل خرید کر لا رہے ہیں۔ نیچے پھٹے پرانے کپڑے پہنے غریب بچے للچائی ہوئی نظروں سے پھلوں کو دیکھ رہے ہیں۔ تقریباً سارے پھل بانٹ دیں گے۔ ایک دو پھل لائیں گے اپنے لیے یا اپنے گھر کے لیے۔ کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگیں گے، لیکن جب کسی دوسرے کو ضرورت ہوگی تو سب دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اور اپنی طرف سے بھی جتنا بن پڑے گا مدد کریں گے۔

سردار بھائی کو تو ان کی ادبی خدمات کی بنا پر کم سے کم لکھپتی ہونا چاہیے تھا، لیکن اس عمر میں بھی جب کہ وہ ستر سال کے ہو چکے ہیں وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے ہیں جس میں صرف دو بیڈ روم ہیں اور ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں آٹھ لوگ رہتے ہیں۔ دو بہنیں، دو بیٹے، بڑے بیٹے کی بیوی، ایک تین سال کا پوتا اور ایک نوکر۔

ان کے لکھنے کے کمرے میں لوگ رہتے ہیں۔ لوگ ملنے آتے ہیں اور وہیں بیٹھتے ہیں کیوں کہ کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے اور اسی کمرے میں یہ تخلیقی کام بھی کرتے ہیں۔ اب کیوں کر اتنے بڑے کنبے کو پالنا ہے اس لیے سلطانہ آپا اپنی کمر کی تکلیف کے باوجود نوکری کرتی ہیں۔ حساس اتنے ہیں کہ آج تک مجھ سے یا کیفی سے کبھی اپنی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا۔ مدد مانگنا تو دور کی بات ہے۔

ابھی دو مہینے پہلے جب کیفی بیمار ہو کر پاکستان سے لوٹے تو سب سے پہلا فون میں نے سردار بھائی کو کیا اور انھوں نے اسی خلوص سے میرا ساتھ دیا اور کیفی اچھے ہو گئے۔

ان کا دیا ہوا ڈاکٹر آج تک ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ سردار بھائی کی کتابوں اور کارناموں کی فہرست پڑھی تو میں ڈر گئی۔ ان کے بارے میں لکھنے کے لیے تو آدمی کو عالم ہونا چاہیے۔ میں تو عالم نہیں ہوں۔ میرے تو وہ صرف سردار بھائی ہیں۔ میں جب چاہوں انھیں بور کر سکتی ہوں۔ عیدی مانگ سکتی ہوں۔ بے وقت انھیں جگا سکتی ہوں، چائے پی سکتی ہوں۔ کھانا کھا سکتی ہوں۔ جب جی چاہے ان سے فرمائش کرکے نظم سن سکتی ہوں۔

میرے لیے تو وہ دونوں ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں جن کی صحت اور لمبی عمر کی دعائیں میں ہر وقت مانگتی رہتی ہوں۔

عرفانہ عزیز

نیلا فرشتہ

دیوتاؤں، پیغمبروں اور عظیم انسانوں کے تشخص ان آسمانوں کی غیر مبہم جھلک ہے۔ جبکہ ان کی نظمیں بہت کی طرح پھیلتے ہیں اور بے کراں وسعتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ روشنی کے یہ پیکر نسل و رنگ اور جغرافیائی حدود سے بالا ہوتے ہیں۔ روح عصر ان کا نام سنہری حروف میں رقم کرتی ہے اور آسمانوں پر بھی۔ ان ہی میں سے ایک شخصیت علی سردار جعفری کی ہے۔

ایک بہتے دریا کی طرح وہ تمدن کے زخموں کو پہچانتے ہیں اور ہر زخم کو انہوں نے گویائی عطا کی ہے۔ ان کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف ہے اور یہ آئینہ افق تا بہ افق پرافشاں ہے جس کا جوہر زمین ہے اور عکس آسمان۔ میرے لیے ان کی ذات کی رفعتوں اور وسعتوں کی پیمائش ایسی آساں بھی نہیں۔ میں تو ان کے لیے یہی کہہ سکتی ہوں۔

FOR ME YOU ARE A TREASURE MORE
LADEN
WITH IMMENSITY THAN THE SEA AND
ITS BRANCHES
AND YOU ARE WHITE AND BLUE
AND SPACIOUS LIKE
THE EARTH AT VINTAGE TIME

علی سردار جعفری کی ذات بڑی پہنائیوں کی حامل ہے۔ اُن کی آنکھیں جب فلک پیمائی سے تھک جاتی ہیں تو زمین کو بوسہ دیتی ہیں گندم کی سنہری بالیوں سے معصوم بچوں کی ہنستی آنکھوں تک ان کا پیار پھیلا ہوا ہے۔ ہر دھرتی سے اُن کا رشتہ بڑا استوار ہے۔ وہ سچ کی جدوجہد میں جب آگے بڑھتے ہیں تو ان کے ساتھ دریا، پہاڑ اور سمندر بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور انسان کی عالمگیر برادری کی فلاح کے لیے ان کی آواز چہار دانگ گونج اٹھتی ہے اور ہر سچے فنکار کی سوچ سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اس موقع پر پابلو نرودا کی ایک نظم کا حوالہ دینا پسند کروں گی۔

IN MY COUNTRY THERE IS A MOUNTAIN
IN MY COUNTRY THERE IS A RIVER

یہ لوگ کسی دوسرے کی تکلیف کو اتنی شدت سے محسوس کرتے ہیں، تب ہی تو سوشلزم لانا چاہتے ہیں اور اتنے اچھے شاعر ہیں۔

یہی حال سردار بھائی کا ہے۔ کچھ پھل خرید کر لا رہے ہیں۔ نیچے پھٹے پرانے کپڑے پہنے غریب بچے للچائی ہوئی نظروں سے پھلوں کو دیکھ رہے ہیں۔ تقریباً سارے پھل بانٹ دیں گے۔ ایک دو پھل لائیں گے اپنے لیے یا اپنے گھر کے لیے۔ کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں مانگیں گے، لیکن جب کسی دوسرے کو ضرورت ہوگی تو سب دوستوں کے دروازے کھٹکھٹائیں گے اور اپنی طرف سے بھی جتنا بن پڑے گا مدد کریں گے۔

سردار بھائی کو صرف ان کی ادبی خدمات کی بنا پر کم سے کم لکھپتی ہونا چاہیے تھا، لیکن اس عمر میں بھی جب کہ وہ ستر سال کے ہو چکے ہیں وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتے ہیں جس میں صرف دو بیڈ روم ہیں اور ایک چھوٹا سا ہال ہے جس میں آٹھ لوگ رہتے ہیں۔ دو بہنیں، دو بیٹے، بڑے بیٹے کی بیوی، ایک تین سال کا پوتا اور ایک نوکر۔

ان کے لکھنے کے کمرے میں لوگ رہتے ہیں۔ لوگ ملنے آتے ہیں اور وہیں بیٹھتے ہیں کیوں کہ کوئی ڈرائنگ روم نہیں ہے اور اسی کمرے میں یہ تخلیقی کام بھی کرتے ہیں۔ اب کیوں کہ اتنے بڑے کنبے کو پالنا ہے اس لیے سلطانہ آپا اپنی کمر کی تکلیف کے باوجود نوکری کر رہی ہیں۔ حساس اتنے ہیں کہ آج تک مجھ سے یا کیفی سے کبھی اپنی تکلیف کا اظہار تک نہیں کیا۔ مدد مانگنا تو دور کی بات ہے

ابھی دو مہینے پہلے جب کیفی بیمار ہو کر پاکستان سے لوٹے تو سب سے پہلا فون میں نے سردار بھائی کو کیا اور انھوں نے اسی خلوص سے میرا ساتھ دیا اور کیفی اچھے ہو گئے۔

ان کا دیا ہوا ڈاکٹر آج تک ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ سردار بھائی کی کتابوں اور کارناموں کی فہرست پڑھی تو میں ڈر گئی۔ ان کے بارے میں لکھنے کے لیے تو آدمی کو عالم ہونا چاہیے۔ میں تو عالم نہیں ہوں۔ میرے تو وہ صرف سردار بھائی ہیں۔ میں جب چاہوں انھیں بور کر سکتی ہوں۔ عیدی مانگ سکتی ہوں۔ بے وقت انھیں جگا سکتی ہوں، چائے پی سکتی ہوں۔ کھانا کھا سکتی ہوں۔ جب میرا جی چاہے ان سے فرمائش کر کے نظم سن سکتی ہوں۔

میرے لیے تو وہ دونوں ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں جن کی صحت اور لمبی عمر کی دعائیں میں ہر وقت مانگتی رہتی ہوں۔

جعفری

عرفانہ عزیز

نیلا فرشتہ

دیوتاؤں، پیغمبروں اور عظیم انسانوں کے تشخص پر آسمانوں کی نیلاہٹ جھلکتی ہے۔ اجالے ان کی سمت ہے۔ بہت کی طرح پھیلتے ہیں اور بے کراں وسعتوں میں پھیل جاتے ہیں۔ روشنی کے یہ پیغمبر نسل و رنگ اور جغرافیائی حدود سے بالا ہوتے ہیں۔ وقت بعد ان کا نام سمندر فہم کرتی ہے اور سمندروں پر بھی۔ ان ہی ہستیوں میں سے ایک شخصیت علی سردار جعفری کی ہے۔

ایک بہتے دریا کی طرح وہ تمدن کے رشتوں کو پہچانتے ہیں اور ہر قسم کو گویائی عطا کی ہے۔ ان کی شخصیت آئینے کی طرح شفاف ہے اور یہ آئینہ افق تا بہ افق پرافشاں ہے جس کا جوہر زمین ہے اور عکس آسمان۔ میرے لیے ان کی ذات کی رفعتوں اور وسعتوں کی پیمائش ایسی آسان بھی نہیں۔ میں تو ان کے لیے یہی کہہ سکتی ہوں۔

FOR ME YOU ARE A TREASURE MORE
LADEN
WITH IMMENSITY THAN THE SEA AND
ITS BRANCHES
AND YOU ARE WHITE AND BLUE
AND SPACIOUS LIKE
THE EARTH AT VINTAGE TIME

علی سردار جعفری کی ذات بڑی پہنائیوں کی حامل ہے۔ اُن کی آنکھیں جب فلک پیمائی سے تھک جاتی ہیں تو زمین کو بوسہ دیتی ہیں۔ گندم کی سنہری بالیوں سے معصوم بچوں کی ہنستی آنکھوں تک ان کا پیار پھیلا ہوا ہے۔ دھرتی سے اُن کا رشتہ بڑا استوار ہے۔ وہ سچ کی جدوجہد میں جب آگے بڑھتے ہیں تو ان کے ساتھ دریا، پہاڑ اور سمندر بھی آگے قدم بڑھاتے ہیں اور انسان کی عالمگیر برادری کی فلاح کے لیے ان کی آواز چہار دانگ گونج اٹھتی ہے اور ہر سچے فنکار کی سوچ سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اس موقع پر پابلو نرودا کی ایک نظم کا حوالہ دینا پسند کروں گی۔

IN MY COUNTRY THERE IS A MOUNTAIN
IN MY COUNTRY THERE IS A RIVER

COME WITH ME
NIGHT CLIMBS UP TO THE MOUNTAIN
HUNGER GOES DOWN TO THE RIVER
COME WITH ME,
WHO ARE THOSE WHO SUFFER ?
I DO NOT KNOW, BUT THEY ARE MY PEOPLE
COME WITH ME,
I DO NOT KNOW, BUT THEY CALL TO ME
AND THEY SAY TO ME : "WE SUFFER"
COME WITH ME.
AND THEY SAY TO ME: "YOUR PEOPLE
YOUR LUCKLESS PEOPLE,
BETWEEN MOUNTAIN AND THE RIVER.
WITH HUNGER AND GRIEF,
THEY DO NOT WANT TO STRUGGLE ALONE,
THEY ARE WAITING FOR YOU MY FRIEND."

محنت کاروں اور کسانوں سے محبت کرنے والا، آزادی اور امن کے گیت گانے والا اور انسانی ہاتھوں کی عظمت سے آشنا یہ نیلا فرشتہ جس کا نام علی سردار جعفری ہے میرے لیے ہمیشہ ایک دیومالائی کردار رہا ہے۔

اجنتا کے غاروں سے ٹیکسلا تک، اور ٹیکسلا سے ایتھنز، روم، زیورخ اور پیرس تک جہاں بھی میں نے فنِ تعمیر اور ثقافت کا حُسن دیکھا انسانی ہاتھوں کی عظمت پر یقین آیا اور علی سردار جعفری کی نظم پر بھی۔ دراصل آدمی کی واحد میراث آدمی کے ہاتھ ہیں جو لعل و گہر کو پہاڑ سے علیحدہ کرتے ہیں اور اناج کو مٹی سے۔

علی سردار جعفری کی شاعری نے معاشرے اور فرد کو کیا کچھ دیا ہے۔ اس کا اعتراف وقت کا منصف بہت پہلے کر چکا ہے لیکن مجھے اس سے دلچسپی ہے کہ ان کی شخصیت بحیثیت ایک مستعلیق انسان کے اپنے دائرۂ احباب پر کیا نقوش مرتب کرتی ہے۔ یہ دائرہ جو بلرام پور کے کسان سے لے کر ہیملٹن کے کان کن تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی انسان دوستی کی گواہی دیتا ہے۔ وہ جب شمالی امریکہ آتے ہیں تو کیا طوفان برپا نہیں ہوتا۔ لوگ ان کی جانب گویا ریشم کی ڈوری سے بندھے چلے آتے ہیں۔ صف بہ صف کینیڈا کے مختلف صوبوں سے، دور دراز بستیوں اور آبادیوں سے جن میں ٹرانٹو، نیاگرا سٹی اور ہیملٹن قابلِ ذکر ہیں۔ وہ اونٹاریو کے محنت کاروں میں بہت مقبول ہیں اور ان کے درمیان وہ علی سردار جعفری نہیں سردار بھائی ہوتے ہیں۔ طبیعت کی ہمواری، ذہنی بلوغت، جذباتی شائستگی، مزاج کا تحمل اور میانہ روی ان کی شخصیت کو وہ دل آویزی عطا کرتے ہیں جو ایک عام سادہ لوح انسان کے لیے بھی اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے۔ وہ عوام کی

رسائی میں رہتے ہیں۔ عوام جس ملک کے بھی ہوں انہیں چاہتے ہیں۔ ان کے دوست ہر زمین پر ہیں اور دوستوں کے لیے ان کی زندگی شعاعِ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی کی تاریکیوں میں ان کے دوستوں نے اکثر محسوس کیا ہوگا کہ ایک سایا سا دریچے سے جھانکتا ہے، دروازے پر دستک دیتا ہے اور دبے پاؤں روح میں یوں در آتا ہے کہ ہر سو روشنی سی بکھر جاتی ہے۔ ان کی زندگی کے ہر گوشے میں، ہر طاقچے میں ایک کسوٹی تلے شمع جلتی ہے۔ یہ شمع آدمیت کا جوہر ہے جو انسان کو انسان اور دوست کو دوست بناتا ہے۔

دشتِ غربت کی وسیع و بعض تنہائیوں میں دل پر جب بھی اداسیوں کی یلغار ہوئی مجھے دور بہت دور نکھرا آلود فضاؤں میں ایک نرم رو دریا بل کھاتا نظر آیا۔ اس دریا نے میری روح پر ہجرتوں کے زخموں کو دھویا ہے۔ میری زندگی کا پیراہن گدلا یا نہیں ... دریا کی ہریالی مٹی سے بالا رہتی ہیں اور میرے نزدیک یہ کیفیت نروان کی سی ہے۔ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ نہ جانے کے اس گوتم ... وہ جگہ جہاں شہزادہ سدھارتھ میں کبھی مہاتما گوتم بدھ نے زندگی کے طویل ماہ و سال گزارے تھے۔ میں نے ہمیشہ سوچا ہے کہ زندگی بہت قابلِ تعظیم ہے اور اس میں جب بھی میری راہوں میں دھوپ پھیلی ہے ایک سایا سا مجھے پھر اسی قدیم برگد کی چھاؤں میں لے آیا ہے۔ جہاں بے کل روحوں کو نروان ملتا ہے یہ سایا سردار بھائی کا ہے۔

چند برس پہلے جب ان برف زاروں میں میری آنکھیں، گھر کے دریچوں سے آنسو چنتی رہتی تھیں۔ جب چاند کے شیشے میں خزاں رسیدہ پتے جھکتے نظر آتے تھے اور گھر کے آتش دان کی آخری چنگاری بھی میرے آنسوؤں میں سلگ کر بجھ جاتی تھی۔ تب مجھے دور دراز سے آتی ہوئی نیلی روشنیوں کے تحفے کی سوغات آتی۔ ان روشنیوں کی سطریں میری زندگی کے سادہ ورق پر یوں پھیل جاتی تھیں کہ آسمان پر ایک قوسِ قزح سا کھینچ جاتا۔ دور سرمئی سی لکیر میں نیلی غرفے کھل جاتے اور وہ کوچے ابھر آتے جہاں زندگی تھی، تاروں بھرا آسمان تھا جس کے تلے انسان بستے تھے۔ جہاں کیسری شاموں کے آنچل میں موتیے کی مہک تھی اور شگفتہ صبحوں کی مسکراہٹ میں گلاب کی نکہت۔ سردار بھائی کا خط موصول ہونے پر مجھے ہر شے میں اجالا سا نظر آتا۔ ہجرتوں کی زنجیر ٹوٹ جاتی تھی اور زندگی کا ملن جھنک اٹھتا تھا میں انہیں لکھتی:

"اس سرمئی کاسنی سی وادی میں جہاں میں رہتی ہوں، اس کی ڈھلوانوں پر چیری کے پھول کھلتے ہیں اور ہرنوں کی آواز پر رقص کرتی ہے۔ یہ گیت گاتے گنگناتے جھومتے اس نیلگوں جھیل میں ڈوب جاتے ہیں جو میرے گھر کے بالکل سامنے ہے۔ یہ بہاروں کا روپ ہے۔ موسمِ سرما میں میرا سایا اسی جھیل پر ایک زخمی کونج کی طرح منجمد نظر آتا ہے۔

اس وقت میں آتش دان کے پاس بیٹھی آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ پرکولیٹر میں کافی ابل رہی ہے جس کا خوبصورت ایروما ہر سو پھیل رہا ہے۔ چھت پر برف کے پھول گر رہے ہیں۔"

میرے مکتوب کے ساتھ ڈھیر ساری نظموں کا تحفہ ہوتا تھا۔ جو میں نیلے فرشتے کو بڑی چاہ سے بھیجتی۔

جواب آتا "تمہاری نثر بے حد خوب صورت ہے۔ اور تمہاری نظموں پر پابلو نرودا کا اثر ہے۔"

میری ذات کی گہرائیوں سے اجالا پھوٹتا اور میں مسکرا دیتی۔ کبھی سردار بھائی خط کے جواب میں تاخیر بھی کر دیتے۔ "کہ میں تاشقند کانفرنس میں شریک تھا۔ دمشق سے آ رہا ہوں۔ فلاں تاریخ لندن، کینیڈا یا امریکہ پہنچ رہا ہوں۔ موسمِ سرما بمبئی میں گزاروں گا۔ مجھے بمبئی کی بارشیں اچھی لگتی ہیں۔"

عرفانہ عزیز

میں انہیں یہ احساس کرانے کے لیے لکھتی، "اگر مجھے اس خط کا جواب بھی دیر میں موصول ہوا تو میں سلویا پلیتھ کی طرح خودکشی کر لوں گی"

کبھی کبھی میں اپنی تمناؤں کے تشدد سے خوفزدہ ہو جاتی تھی۔

فوراً جواب آتا۔ "ایک خط کا جواب نہ ملنے پر اتنی مایوسی؟ —— چہ چہ تم مجھے حیران کر دیتی ہو!"

مجھے یک گونہ ندامت ہوتی — پھر میں اپنے رویوں کا تجزیہ کرتی — شدید حالات نے مجھے تنہا کر دیا تھا۔ ادبی دھارے سے میرا تعلق کم و بیش ٹوٹ چکا تھا۔ فیض صاحب اور احمد ندیم قاسمی سے مراسلت کا سلسلہ منقطع تھا۔ اہل خاندان بکھر گئے تھے۔ اور دھوپ نہائے گھر کے جن دریچوں میں کبھی میں بیلے کے پھول سجایا کرتی تھی وہ دریچے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے تھے۔ اب میرے لیے پسِ دیوار زنداں کے نغمے رہ گئے تھے۔

حسنِ اتفاق سے دو برس پہلے ٹرانٹو میں وزارتِ ثقافت اور ٹرانٹو یونیورسٹی کے تعاون سے اردو کانفرنس کی تیاریاں ہونے لگیں — ایک روز صبح سویرے حفظ الکبیر قریشی کا فون آیا کہ سردار بھائی آ رہے ہیں اور کانفرنس میں ترقی پسند تحریک پر اپنا مقالہ پڑھیں گے فیض صاحب بھی آ رہے تھے۔ انہیں اردو کانفرنس کی پہلی نشست کی صدارت کرنا تھی۔ امریکہ کینیڈا کے بیشتر ممتاز دانشور اس کانفرنس میں مدعو کیے گئے تھے۔ دراصل اسی کانفرنس کے موقع پر مجھے سردار بھائی کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے کا موقع ملا۔

بحیثیت ایک دانشور کے ہر چند وہ فرانسیسی ادب اور فلسفے سے متاثر ہیں لیکن میں انہیں اپنے طور پر گورکی کا ہمسر سمجھتی ہوں۔ ستونسکی، برگساں اور ہیگل سے وہ یقینی طور پر متاثر ہوئے۔ جہاں تک ان کی سخنوری کا تعلق ہے ان کے یہاں میر جیسی نزاکتِ سخن بھی ہے اور غالب جیسی فکری نہج بھی — وہ بہت اعلیٰ پائے کے مقرر بھی ہیں۔ ان کے مقالوں میں بلا کی فصاحت اور بلاغت ہوتی ہے۔

۲۵ ستمبر کی صبح اردو کانفرنس تھی۔ جس کی پہلی نشست میں فیض صاحب کو صدارت کرنا تھی اور دوسری نشست میں سردار بھائی کو مقالہ پڑھنا تھا۔ اسی شام کو ایک عظیم مشاعرے کا اہتمام تھا۔

میں ۲۴ کی صبح دلی پیک سے ٹرانٹو پہنچی تھی چند لمحوں بعد قریشی صاحب کا فون آیا کہ سردار بھائی پہنچ چکے ہیں اور بیدار بخت کے یہاں قیام پذیر ہیں۔ شام کھانے پر ان سے ملاقات ہوگی — احمد فراز بھی لندن سے پہنچ گئے تھے۔ افتخار صاحب شام کو پہنچ رہے تھے — کانفرنس کے آثار بتا رہے تھے کہ بے حد منظم اور تاریخی کارروائی بطریقِ احسن انجام کو پہنچے گی۔

۲۴ کی شام ایک مقامی ریسٹوران میں شرکائے کانفرنس عشائیے کے لیے مدعو تھے۔ برصغیر کی چیدہ شخصیتیں موجود تھیں۔ ایک مقامی اخبار کا ہفتہ وار مدیر صبیح الدین منصور کو استقبالیہ تقریر کرنا تھی اور مجھے شعرا کی جانب سے اردو انجمن کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ ٹی وی کے کارندے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ فوٹوگرافر اپنے اپنے کیمرے سنبھالے کارروائی کے آغاز کے منتظر تھے — لیکن سردار بھائی ابھی تک پہنچ نہ پائے تھے۔ وہ اپنے میزبان کے ہاں ایک بند کمرے میں بیٹھے اپنے مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ اردو کانفرنس میں اس مقالے کی اہمیت ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے بارے میں میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ مکمل ذہنی دیانتداری اور ذہنی یکسوئی سے مکمل کاوش کے ساتھ موضوع کو نبھاتے ہیں اور قارئین کو کبھی مایوس نہیں کرتے۔

سردار بھائی کے طویل انتظار کے بعد کارروائی کا آغاز ہوا — جب تقریریں ختم ہو چکیں — فیض صاحب کے شیشے میں درد تہِ جام رہ گیا تو گہرے سوٹ پہنے ایک جامہ زیب دراز قامت دبلا پتلا لکھک ہال میں داخل ہوا — میری کیفیت وہی تھی جو کبھی زیورخ اور پراگ

سا نام ہے یہ لقب کہنے کے منہ سے تو دیکھ کر ہوئی تھی۔

یہ شخص تو بہت مانوس لگتا ہے۔ میں نے کہا

"یہ سردار بھائی ہیں"۔ قریشی صاحب بولے

سردار بھائی میرے برابر کی نشست پر آن بیٹھے۔ ابھی ان سے میرا تعارف نہ ہوا تھا۔ ان کی توجہ تعارف آمیز تھی جیسے وہ کوئی موضوع گفتگو تلاش کر رہے ہوں۔ اُس روز وہ تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ یا سے یہ خیال محض رہی ہو۔ گفتگو ہوتی۔

یہ پستہ کی شام سیدہ رفعت کے ہاں عشائیہ تھا۔ جب میں پہنچی تو سردار صاحب سادہ کپڑے اور نفیس انداز میں دو شناسا اور ایک مقامی اسٹیلیکول خاتون سے مصروف گفتگو تھے۔ میں ادا جعفری کے ساتھ آن بیٹھی۔ وہ انگلش سے نابلد تھیں۔ دلچسپ ہوتی رہی۔ فیض صاحب ہوتے تو ہم کہتے کہ اس گفتگو میں شریک ہو جاتے۔ وہ لاہور سے ہو آنے تھے اور ان کا خاندان سے مل کر آ رہے وہ نظر آ رہے تھے۔

ادا میرے پاس سے اٹھ کر گئیں تو وہی اسٹیلیکول خاتون میرے پاس آ بیٹھیں اور سردار بھائی نے پاس میں بیٹھ کر رائے دی کہ میری تائید چاہی۔

سردار بھائی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ آئے۔

"کیا میں دو خوبصورت خواتین کے درمیان بیٹھ سکتا ہوں؟" جس پر ایک نوجوان قہقہہ بلند ہوا قلقل مینا کی طرح۔

"چہرہ خوبال سے چلے جاتے اسد" والی بات سردار بھائی پر بھی ہے لیکن ایک یا دو زمینیں جانتی ہیں۔ کھانے کی میز پر وہی خاتون مجھ سے کہنے لگیں:

"یہ شخص ہر عورت کا آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر عمر میں یہ ذرا کم ہوتا تو یقیناً میری حالت مختلف ہوتی۔"

اب جبکہ سردار بھائی زندگی کے ستر برس مکمل کر چکے ہیں۔ اس اجنبی خاتون کا رویہ کیا ہو گا؟ میرے نزدیک عمر و سال تو محض فریب ہوتے ہیں اور زندگی گویا وہ سفینہ ہے جو سراب پہ رواں ہو۔

"آپ تو شادی میں بھلے لگتے ہیں"۔ میں نے سردار بھائی سے کہا۔ بالکل مہاتما گوتم بدھ لگ رہے تھے۔

"ایسی ویسے اچھا نہیں لگتا"۔

اتنے میں وہ کھروسی دبلی پتلی خاتون پھر آگئیں اور سردار بھائی سے گفتگو کا طویل سلسلہ چل نکلا۔ عورت کی مظلومیت اور میلی خاوند کی باتیں ہوتی رہیں۔

"یہی دیکھ لیجیے یہ بھی ابھی تک کسی مرد نے پرپوز نہیں کیا کیوں کہ وہ میری اسناد سے خوفزدہ ہیں"۔ وہ خاتون کہنے لگیں۔

یہ گفتگو بڑی دلچسپ تھی۔ جس کے دوران میں نے محسوس کیا کہ سردار بھائی عورت کی عزت کرتے ہیں۔ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے اور نسوانیت کی جانب ان کا رویہ تحفظ آمیز احترام کا سا ہوتا ہے۔ سردار بھائی میں قدیم اور جدید کا بہت خوب صورت امتزاج ہے۔ انہیں رسم آذری بھی محبوب ہے اور بت شکنی بھی۔ اطراف کی صنم گری میں اگر کوئی واحد بت ہے۔ جس سے ان کی عبادت کا رشتہ استوار ہے تو وہ سلطانہ بھابی ہیں۔

"وہ ہر عورت کے نام کے ساتھ سلطانہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں"۔ الماس افراز نے کہا تھا۔

اور ادھر میں وہ نیر جہاں کو بڑے خلوص سے مشورہ دے رہے تھے کہ "تم اپنا نام نیر جہاں سلطانہ کیوں نہیں رکھ لیتیں"۔

میں سمجھتی ہوں کہ زندگی کے ارتقائی پس منظر میں سردار بھائی کو اپنی تہذیب اور ثقافتی قدروں کا تحفظ بہت عزیز ہے۔ ان کے رویوں میں ایک جچی تلی میانہ روی ہے جو اپنی تہذیب کی تنسیخ کرنے کی بجائے معاشرے کو ارتقا کی طرف لے جاتی ہے۔

۲۵ ستمبر کی صبح اردو کانفرنس میں سردار بھائی کا مقالہ جو ترقی پسند تحریک سے متعلق تھا۔ بے حد پسند کیا گیا اور شام کے مشاعرے میں ان کی نظمیں یہاں کے سامعین کو بہت پسند آئیں۔

مجھے سننے کا اتفاق سردار بھائی کو پہلی بار ہوا تھا۔ اب میرے طرفداروں میں فیض اور ندیم کے علاوہ ایک اور سخن فہم کا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ تھے سردار بھائی! ۔ مشاعرے کے اختتام پر وہ کہنے لگے "آپ سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی فرصت ملے تو اطمینان سے بات چیت ہو۔" تو گویا اب وہ مجھے پہچان گئے تھے اور بہت مسرور نظر آتے تھے۔ شاید میرے فن سے ان کی جو توقعات وابستہ تھیں میں ان پر پوری اتری تھی۔ اس سے پہلے اپنے ایک مراسلے میں میری مشقِ سخن کے سلسلے میں انہوں نے لکھا تھا۔ "مجھے حیرت ہے کہ برصغیر میں اب تک یہ آواز کیوں نہیں پہچانی گئی۔" یہ بات نہیں کہ اہلِ وطن نے مجھ سے تغافل برتا تھا۔ میرا پہلا مجموعہ کلام "برگ ریزہ" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ جس میں فیض صاحب اور احمد ندیم قاسمی کے تاثرات شامل تھے لیکن اب یہاں ایک جلاوطن کی سی زندگی گزر رہی ہے اور میرے فن کا میرے وطن میں بری طرح استحصال بھی ہوا۔ میں نے سردار بھائی کو لکھا کہ "مجھے زندہ گاڑ دیا گیا ہے۔" انہوں نے مشورہ دیا کہ RESURRECTION کے لیے اپنا تازہ مجموعہ جامعہ ملیہ دہلی سے چھپواؤ۔ اس ادارے نے زہرہ نگاہ اور فیض صاحب کے دیوان بھی شائع کیے ہیں"۔

ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو جو مجھ پر اجاگر ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کا وجدان سچ کو تسلیم کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ مجھے اپنے فن پر ہمیشہ سے اعتماد تھا لیکن ذرائع ابلاغ رفتہ رفتہ مجھ سے دور ہوتے جا رہے تھے اور اصولوں کے معاملے میں میں نے کبھی مفاہمت نہیں کی۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ اپنی اعلیٰ ظرفی کے باوجود بھی ایک بڑا شاعر دوسرے بڑے شاعر کی نفی کرتا ہے لیکن سردار بھائی کا رویہ اس معاملے میں بھی بڑا سلجھا ہوا ہے۔ ۲۶ ستمبر کی شام ٹورانٹو کے ایک ثقافتی مرکز میں جوش پر مذاکرہ تھا۔ گوپی چند نارنگ کے مقالے کے بعد ایک محشر سا بپا ہو گیا۔ "اردو ادب میں جوش کا کوئی کونٹری بیوشن نہیں" فراز کہنے لگے۔ پھر سردار بھائی مائیک پر آئے اور حسبِ معمول اپنی ہموار جچی تلی آواز میں کہا کہ "جوش نئی نسل کی آواز میں زندہ ہے کچھ لوگ اگر جوش کی عظمت سے انکار کرتے ہیں تو دوسرے اقبال کو نہیں مانتے ۔ حالاں کہ اپنے اپنے مقام پر دونوں شاعر عظیم ہیں"۔

۲۹ ستمبر ہم سب اوشاوہ کے مشاعرے میں مدعو تھے۔ ہماری فوکس ویگن دوپہر کو ٹورانٹو سے اوشاوہ کے لیے روانہ ہوئی۔ سردار میر کارواں تھے ۔ کرشنا ہسکر کی گاڑی میں فراز اور عارف افتخار ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ سردار بھائی کی خوش گفتاری نے راستے کو اور خوب صورت بنا دیا تھا۔ میپل اور برچ کی دو رویہ قطاریں دور تک چلی گئی تھیں۔ پتے سُرخ، زرد اور قرمزی ہو چکے تھے۔ شنگرفی شام کے سائے تیرتے چلے آرہے تھے اور دور تک بل کھاتا راستہ اب اوشاوہ کی جگمگاتی اسکائی لائن میں مدغم ہو چلا تھا۔

اوشاوہ میں سب لوگ بٹ گئے تھے۔ یہ بٹوارہ بھی کچھ ایسا بھلا نہ تھا۔ سردار بھائی اشرف صاحب کے ہاں مقیم تھے۔ اشرف صاحب بیگم شائستہ اکرام اللہ کے داماد ہوتے ہیں اور بزمِ ادب اوشاوہ کے کرتا دھرتا ۔ اوشاوہ کا مشاعرہ ہمیشہ کی طرح بہت نفیس تھا۔ دراصل یہ جیوروریسنس کی سی بستی اور شہر کا ایلیٹ طبقہ موجود تھا۔ یہ مشاعرہ سردار بھائی کی صدارت میں ہوا۔ جب میری باری آئی تو سردار بھائی اہلِ محفل سے کہنے لگے " یہ کینیڈا کے شمال سے آرہی ہیں ۔ جہاں برف کے پھول گرتے ہیں۔ اپنے ماحول کے

غا عزیز
دوران میں اپنی بیاض ڈھونڈ رہی تھی جو اس کو دیکھنے کی جانب چھپ گئی تھی۔ جس پر لکھی ہوئی ان کی نظمیں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ اس
خود نقوش میں سے زندگی کی حرارت اپنے نغموں سے پیدا کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں ... احمد فراز ... ایک ایسا نے
دوران میں اپنی بیاض ڈھونڈ رہی تھی جو اس کو دیکھنے کی جانب چھپ گئی تھی ... اچھا ہوتا سوچی اور سلسلہ تو یہ
تھے۔ مگر سردار بھائی کو محسوس ہوا کہ ان کی تقریر یقیناً ضروری طور پر طویل ہوتی جا رہی ہے ... تو میں ان کا تعارف
جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "ہاں ان کا کلام واقعی بہت عمدہ ہوتا ہے ... وہ فوراً اٹھ ... تب میں ان کا تعارف
یہ تو یہ فوراً بند کر دوں گا۔"
محفل پر شگفتگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سردار بھائی بھی یوں ہی نہیں کہتے۔
مشاعرے کے بعد اشرف صاحب کے یہاں پر تکلف عشائیے کا اہتمام تھا ... سے پہلے کرداتی کا اہتمام تھا
اشرف صاحب نے اپنے نفیس ڈرائنگ روم میں جب ادھوں کے ... سردار بھائی نے بے ساختہ کہا،
"اشرف صاحب اب آپ اشرف المخلوقات ہوئے ہیں۔"
محفل زعفران زار بن گئی۔ ممکن ہے یہ جملہ ان کی ... نشست سے آیا ہو جہاں احمد فراز بیٹھے تھے۔ بہر حال یہ کہ اسی سمت
سے تھا جہاں سردار بھائی اور اشرف صاحب کی بذلہ سنجی محفل میں رنگ بھر رہی تھی۔
سردار بھائی نے جام بھرتے ہوئے کہا۔ "عرفان چیئرز"
میں نے سافٹ ڈرنک کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سہم سی گئی
"تم ڈرنک نہیں کرتیں؟" سردار بھائی نے پوچھا۔
"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "البتہ میرے شوہر کبھی کبھی سوشل ڈرنک سے احتراز نہیں کرتے۔"
ریاضی انگریزی ادب کے پروفیسر ہیں۔ ایرن مور تمباکو پسند کرتے ہیں اور پائپ پیتے ہیں۔ زلورخ سے انہوں نے کبھی مجھے بے
شمار خوب صورت قلم خرید کر تحفتاً دیے تھے کہ میں رائن فال، سبز جھیلوں، راج ہنسوں اور سرسبز ڈھلوانوں پر ترچھی چھتوں اور
گول دریچوں پر نظمیں لکھوں اور سردار بھائی کو بھیجوں۔ وہ وسیع النظر ہیں۔ اگر سردار بھائی کے خط کو کبھی تاخیر ہو جائے تو وہ مسکرا کر
پوچھتے ہیں "کیوں بھئی تمہارے مستعلیق بھائی کا خط نہیں آیا؟"
مجھے سوچ میں ڈوبا پا کر ناز نے اپنے پاس بلا لیا۔ ناز بیگم، شائستہ اکرام اللہ کی منجھلی صاحب زادی ہیں اور اشرف صاحب کی
چہیتی بیگم۔ "تم اتنی اداس کیوں ہو؟" ناز نے پوچھا۔
"یوں ہی گھر یاد آ گیا تھا۔" میں نے کہا۔
جب محفل کی بساط سمٹنے لگی اور دریچوں سے تھکا ہوا چاند شیشوں میں در آیا تو لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ سردار
بھائی مجھے زینے تک خدا حافظ کہنے آئے۔ احمد فراز نے خدا جانے کیا کہا۔ سردار بھائی بولے: "یار جو چیز ہمیں پسند آتی ہے وہی تمہیں بھی
پسند آ جاتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟"
"میں آپ کا چھوٹا بھائی جو ہوا۔" فراز نے برجستہ کہا۔
دراصل سردار بھائی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی جبکہ فیض صاحب، احمد فراز، عارف افتخار اور میں پندرہ برس بعد کینیڈا میں محض
اتفاق سے اکٹھے ہوئے تھے۔ اور پندرہ برس پہلے میں ایک دھان پان سی لڑکی تھی۔ اور اب ایک فربہ اندام سنجیدہ خاتون۔ وقت کے

ساتھ رویے بدل جاتے ہیں اور خدوخال بھی۔

چاندنا۔ تیرتا ہوا کوہِ سرج کی قرمزی شاخساروں پہ آن ٹھہرا تھا۔

میں نے سردار بھائی کو خدا حافظ کہا اور اصرار کیا کہ وہ میرے خطوں کے جواب جلد دیا کریں۔

"خودکشی کی دھمکی تو نہیں دوگی؟" انہوں نے پوچھا۔

"میں ہنس دی تھی۔

"میں کہنا چاہتی ہوں کہ سردار بھائی آپ سے تعارف کے بعد میں زندگی سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

نیلگوں آفاق سے سرخ سویرا ابھر رہا تھا۔ ہوا میں مدہوش کُن خنکی آچلی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ہم سب جو کچھڑنے والے ہیں۔ اس مدہم روشنی میں افق سے کہیں دور نکل جائیں۔ لیکن یہ کتنی اچھی بات ہے کہ سوچ جذبے پہ غالب آجاتے۔ صبح مجھے ٹورانٹو سے یڈمنٹن جانا تھا۔ یہ مشاعرہ البرٹا گورنمنٹ کی وزارتِ ثقافت کے تعاون سے منعقد ہو رہا تھا۔ سردار بھائی احمد فراز اور عارف افتخار امریکہ جا رہے تھے۔

"تم انڈیا آنا۔" سردار بھائی نے کہا۔

"ضرور۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ زندگی پھر اشک گرفتہ کی صورت نظر آنے لگی۔

ان کا آخری خط مجھے گزشتہ مارچ میں ملا تھا جو شاید انہوں نے کسی بحری سفر کے دوران لکھا تھا" جامعہ ملیہ والے تمہاری کتاب چھاپیں گے۔ اس سلسلے میں وہ عنقریب تم سے رجوع کریں گے"۔

پرسوں ریاض آئے تو ان کے ساتھ خطوط کا ایک پلندہ تھا۔ "تمہاری دوسری میل کے ساتھ انڈیا سے تمہارے نام کوئی خط اور دعوت نامہ آیا ہے۔ دیکھو جامعہ سے تو نہیں؟"۔

میں نے لپک کر ان کے ہاتھ سے میل لے لی۔ یہ خط اور دعوت نامہ جگن ناتھ آزاد نے بھیجا تھا۔ نوید دی تھی کہ علی سردار جعفری نے زندگی کے ستر برس پورے کر لیے ہیں۔ بمبئی کلکتہ دہلی اور ان کے آبائی گاؤں بلرام پور میں عالی شان تقریبات منعقد ہو رہی ہیں۔ اپنی پہلی فرصت میں پیپر لکھ بھیجئے۔ بہتر ہوگا کہ آپ کا مضمون اس جنوری ۱۹۸۴ء سے پہلے پہنچ جائے"۔

۲ جنوری کا لکھا ہوا یہ خط مجھے پرسوں ملا۔ اور میں سوچ رہی ہوں کہ کیا ان چند لمحوں کا تجزیہ کافی ہوگا جو حُسنِ اتفاق سے سردار بھائی کے ساتھ گزرے اور بسیط سچائیوں پر چھا گئے؟ البتہ انہوں نے میرے ایک خط کا جواب ابھی تک نہیں دیا۔ اور میں نے انہیں خودکشی کی دھمکی نہیں دی۔ کیوں کہ میں اب زندگی کی تعظیم پہلے کی نسبت زیادہ کرتی ہوں۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ اس جشن کے موقع پر میں اپنی تازہ تصنیف ان کے نام سے معنون کرتی جس کا پیش لفظ بھی حُسنِ اتفاق سے خود سردار بھائی نے لکھا ہے۔ لیکن زندگی کی سب تمنائیں تو پوری نہیں ہو جاتیں۔ البتہ کینیڈا کے برف زاروں میں یہ جشنِ چراغاں ہم بھی منائیں گے۔ جب تک زندگی ساتھ دے گی سردار بھائی کے ساتھ سلسلۂ مراسلت جاری رہے گا۔ بعض اوقات ہمارے درمیان یہ طویل خاموشی منجمد جھیل کی طرح ٹوٹتی ہے اور میں پھر نیلی لہروں کو گننے لگتی ہوں۔ پھر گونجتے سمندروں کی طرح سردار بھائی کی آواز سنائی دیتی ہے اور میرے آنسو پونچھ دیتی ہے۔ پھر میں ایسے شخص کو نیلا فرشتہ کیوں نہ کہوں؟

(کینیڈا سے) ●

یوسف ناظم

متحرک علی سردار جعفری

وہ یقیناً کوئی قبولیت کی گھڑی تھی جب ان کا نام علی سردار جعفری رکھا گیا۔ سردار تو انھیں بننا ہی تھا۔ لیکن جس قبیلے کی سرداری اُن کی قسمت میں لکھی تھی اس میں صرف نظم و نثر کا رواج تھا۔ نظم و ضبط کا نہیں۔ دنیا میں کئی شعبۂ حیات ہیں اور ہر شعبے میں ایک سردار بہر حال درکار ہوتا ہے۔ بعض شعبوں میں سردار بننا آسان بھی ہے اور منفعت بخش فعل بھی مثلاً اہلِ سیاست کے گروہ کی سرداری اس لیے آسان ہے کہ اس میں ایک ہی نمونے کے لوگ ہوتے ہیں۔ یوں سمجھیے ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ تھیلی کا لفظ اہم ہے۔ اب تو یہ جادو کی تھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکوؤں کی سرداری بھی زیادہ آسان ہے کیونکہ اس قبیلے میں جو زبان استعمال ہوتی ہے اس کا نام بندوق ہے۔ اس کا بس ایک ہی کوڈ ورڈ ہے — ٹھائیں۔ یہ آخری آواز ہے جو وہ سنتے ہیں۔ اس لیے دیکھا گیا ہے کہ مستورات بھی ڈاکوؤں کی سردار بن جاتی ہیں عورتوں کا نشانہ یوں بھی کب خطا ہوتا ہے۔ سردار بن کر وہ اتنی کامیاب ہوتی ہیں کہ جب یہ اپنے کاروبار سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کرتی ہیں تو سرکاری سطح پر ایک شاندار تقریب ہوتی ہے اور انھیں باضابطہ ایک شال اوڑھائی جاتی ہے۔ ان مثالوں کے برعکس شاعروں اور ادیبوں کے سردار کو ہمیشہ سردار رہنا پڑتا ہے۔

میدان شعر و ادب میں جو بھی علم بردار ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کی وجہ اصل میں یہ ہوتی ہے کہ اس میدان میں معرکے ذرا زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ مانا کہ یہ گھمسان نہیں ہوتے۔ لیکن تعداد ان کی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ادب کا میدان کوئی پانی پت کا میدان تو ہے نہیں کہ جملہ تین لڑائیوں کے بعد اس پر داخلہ بند ہے کی تختی لگ جائے اور مورخین پریشان ہوں کہ اب کیا لکھا جائے۔

علی سردار جعفری پچھلے ۵۰ سال سے اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہیں۔ ان کا جی راہ کو پُر خار دیکھ کر بھی خوش ہوا ہوگا اور انھیں نخلستان بھی کچھ کم نہیں ملے ہوں گے (ہم خرما و ہم ثواب کے لیے نخلستان بہترین جگہ ہوتی ہے۔) علی سردار جعفری اپنی ۵۰ سالہ سیاحت کے باوجود آج بھی اتنے ہی فعال متحرک اور مستعد ہیں جتنے کہ وہ اُس وقت تھے جب وہ علی گڑھ یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انھیں ان یونیورسٹیوں سے خارج اور جیل میں داخل کیا گیا تھا۔ شمالی ہند کی گرمی نے نہیں انہیں کسی اور چیز نے سرگرم بنا دیا تھا۔

۱۹۴۴ء میں جب حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی تھی تو جعفری صاحب بھی حیدرآباد آئے تھے اور انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے لوگ اسی طرح جمع ہوئے تھے جس طرح سروجنی نائیڈو یا آصف علی کو سننے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ میرے بیان میں مبالغہ اس لیے نہیں کہ لوگ اس سے بھی زیادہ تعداد میں جمع ہوئے تھے۔ ترقی پسندی اُس وقت ایک نو دمیدہ شئے تھی اور حیدرآباد کے لیے ایک عجوبہ۔ اس کانفرنس کی کامیابی سے متاثر ہو کر کرشن چندر نے اپنا مشہور رپورتاژ "پودے" لکھا تھا۔۔۔ جعفری صاحب کو شاید یاد نہ ہو اس موقع پر ہم چند دوستوں نے وہاں ایک یوم نظیر اکبرآبادی بھی منایا تھا اور اُن سے اس جلسے میں تقریر کرنے کی فرمائش کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ "نظیر پر میرا مطالعہ نہیں ہے اس لیے میں جلسے میں تو ضرور آؤں گا لیکن تقریر نہیں کروں گا۔" گو اس وقت ہم نے ان کے انکار کا بُرا مانا تھا لیکن بعد میں جب بھی میں نے اُن کے عذر پر غور کیا تو محسوس ہوا جعفری صاحب شروع ہی سے محتاط اور ذمہ دار قسم کے شخص تھے حالانکہ ادب میں ایسی پابندی نہیں ہے۔ اسٹیج پر بڑھنے اور مائیکروفون کی طرف دوڑنے کا جعفری صاحب نے کبھی ہوس نہیں کی (اسے شاید انھوں نے بوالہوسی سمجھا) لیکن جب بھی اور جہاں بھی محسوس ہوا کہ یہ اُن کا حق ہے وہاں انھوں نے انکار یا انکسار کو راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ اُن کے اس متوازن مزاج کو میں نے ایک دن انصاف کے ترازو سے مقابلہ کیا تو دونوں ایک سے نظر آئے۔ افسوس اس کا ہے کہ خود جعفری صاحب کو اس قسم کے تقابلی مطالعوں کی فرصت نہیں ملی ورنہ اُن کی بھی وہی رائے ہوتی جو میری ہے۔ البتہ اُس وقت میں ضرور تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہوں جب کوئی پوچھتا ہے کہ جعفری صاحب بڑے نقاد ہیں یا بڑے شاعر یا بڑے مقرر ہیں۔ سوچتا ہوں کہ جعفری صاحب کی شخصیت کے حصے کرنے ہی کیوں جائیں وہ کوئی جرمنی کوریا یا فلسطین تو ہیں نہیں کہ کچھ ادھر بانٹ دیا اور کچھ اُدھر۔ شخصیت ایک اکائی ہوتی ہے اور اکائی کو توڑا جائے تو وہ دہائی دے گی بڑھائی نہیں۔ اسی لیے میں نے انھیں ہمیشہ شعری ڈائمنشن پکچر اور ملٹی پرپز انسٹی ٹیوٹ سمجھا اور آپ ہی بتائیے کیا غلط سمجھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اُن کی لائبریری میں دنیا بھر کی کتابیں موجود ہیں لیکن خود ان کی اپنی کتاب ان کے ہاں نہیں ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کوئی دس بارہ سال پہلے جعفری صاحب نے اپنی "پیغمبرانِ سخن" مجھے عنایت کی تھی لیکن پچھلے سال واپس طلب کر لی اور اس کے بعد مجھے اس کتاب کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ دستِ سوال میں نے اس لیے دراز نہیں کیا کہ اس معاملے میں لوگوں میں اختلافِ رائے ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کتاب پر مصنف کا حق ہمیشہ برقرار رہتا ہے اور مصنف جب چاہے اپنی کتاب اُس شخص سے حاصل کر سکتا ہے جسے اس نے غلطی سے یہ کتاب تحفے میں دی ہو۔ اس سلسلے میں مجھے یہ بھی کہنا ہے کہ جعفری صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ وہ دیوانِ غالب کا ایک نسخہ مجھے عنایت فرمائیں گے لیکن انھیں شاید کسی ذریعے سے یہ اطلاع مل گئی کہ مجھے فارسی آتی جاتی نہیں ہے تو انھوں نے اپنے الفاظ واپس لے لیے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اپنی کوئی چیز میرے پاس رہنے نہیں دینا چاہتے الفاظ بھی نہیں۔

جعفری صاحب نے اپنی کتابیں تو خیر پیدا کی ہی ہیں لیکن کبیر، میر اور غالب پر جو کام اُنھوں نے کیا ہے اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ

جو کام کیا اُن نے وہ رستم سے نہ ہوگا

اُن کا کام بدقسمتی سے کسی بھی اعلیٰ درجے کے محقق اور تنقید نگار کے کام سے کم نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے ہاں ایسے کاموں پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں نہیں دی جاتیں۔ یہ تینوں کتابیں جو اُردو اور ہندی کا مشترکہ ایڈیشن ہیں اب نایاب ہیں اور سنا ہے خود جعفری صاحب ان کی تلاش میں ہیں۔ مجھے چونکہ پڑھنے کا نہ سہی کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے اس لیے تینوں کتابیں میرے پاس موجود ہیں لیکن میں نے جعفری صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا ہے میرے لیے ایک کتاب کا صدمہ بہت کافی ہے۔

یوسف ناظم

جعفری صاحب کی تصنیف لکھنؤ کی پانچ راتیں، صرف اس لیے نہیں پڑھنی چاہیے کہ یہ بڑی کارآمد کتاب ہے بلکہ اس لیے بھی پڑھنی چاہیے کہ اس میں اُن کے بہت سے رنگین (اور دل خراش بھی) اعترافات ہیں۔ یہ روسو کی طرح کے کنفیشن تو نہیں ہیں کیونکہ ہمارے ہاں وہ لباس رائج ہے جس کا الٹا اور سیدھا ہوتا ہے۔ جعفری صاحب نے اپنے بھاگنے کی عادت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ "میرا بڑا ایمان دار مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا اس لیے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سدھر جائے گی۔ لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔" اچھا ہوا کہ جعفری صاحب اُس لڑکپن کے زمانے میں بھاگ کر بمبئی نہیں آ گئے۔ ورنہ ایک مرتبہ بمبئی آ جاتے تو انھیں تین بار بھاگنے کا موقع نہ ملتا۔ لیکن انھیں بہرطور بمبئی آنا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں ہر وہ شخص جو گھر سے ایک مرتبہ بھی بھاگ سکتا ہے۔ زندگی کے کسی مرحلے پر بمبئی آتا ہی ہے۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ مولوی نہیں بنے ورنہ آج وہ بھی رویت ہلال کے معاملے میں بھید کی پیدا کرتے پائے جاتے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے۔ اس مصرع کا مطلب اب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں ہماری ہنسی اُڑاتا ہے۔

اس کتاب میں ایک اور مضمون شامل ہے جس میں جعفری صاحب نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جب انھیں اُن کے غیابانہ خیالات کی روشنی میں گرفتار کیا گیا تو اُن کی جیب میں وہ خط بھی تھا جو ایک لڑکی نے انھیں لکھا تھا۔ جعفری صاحب اُس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے طالب علم تھے اور یہ عمر ظاہر ہے ایسے ہی خطوں کے وصول کرنے کی ہوتی ہے۔ ایسے خطوں پہ کیسے کیسے خطرات نہ ہو جاتے ہوں گے۔ میں نے "ایک خواب اور" میں کم سے کم تین نظمیں ایسی دیکھیں جو میرے حساب سے اُس پردہ نشین کے بارے میں ہیں جس کا خط ان کی گرفتاری کے بعد جیلر کے ہاتھ پڑ گیا تھا اور جسے بعد میں مجاز نے یہ نظمیں سنا کر واپس حاصل کیا تھا۔ کیا زمانہ تھا جیلر رشوت میں نظمیں سنا کرتے تھے۔ جعفری صاحب کی جیل میں بڑی آؤ بھگت بھی ہوئی اور صرف اس لیے کہ جیلر نے انھیں کسی کرنل جعفری کا داماد سمجھ لیا تھا اور بی کلاس سے فوراً اے کلاس میں منتقل کر دیا تھا۔ جعفری صاحب خوش قسمت تھے مجرد ہوتے ہوئے بھی وہ ان مراعات کے مستحق قرار پائے جو صرف دامادوں کے لیے ہوا کرتی ہیں۔ (پتہ نہیں یہ سلسلہ کب اور کہاں تک جاری رہا)

اسی کتاب کے ایک مضمون میں جعفری صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سبط حسن اور مجاز لکھنؤ کی سڑکوں پر گھنٹوں اس لیے پیدل چلتے رہے کہ ان تینوں کی جیبوں میں جملہ دو آنے تھے اور کوئی بھی تانگے والا دو آنے میں تین سواریاں قبول کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ ایک نے تو کہا بھی کہ میاں کیوں مذاق کرتے ہو۔ جعفری صاحب کی جیب میں ایک اکنی تھی لیکن کھوٹی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ نہیں چلی۔ جعفری صاحب نے زندگی میں کھرے سکے ہی چلائے۔ یہ کتاب یعنی لکھنؤ کی پانچ راتیں آپ کو مل جائے تو یقین ہے آپ اسے پانچ چھ بار پڑھیں گے۔ اس کے شروع کے جملے ہیں۔

"مجھے انسانی ہاتھ بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔" گو جیسا میں نے پہلی بار پڑھا تو ذہن میں انسانی ہاتھ کی بجائے نسوانی ہاتھ پڑھ گیا۔ "ان کی جنبش میں ترنم ہے اور شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔" انھیں جملوں کو جعفری صاحب نے بعد میں نظم کا روپ دیا اور یہ نظم دھنک کے رنگوں کا لباس پہن کر ایک ترانہ بن گئی۔ اپنی نظم میں ان ہاتھوں کی تعظیم کی ہے۔ ظاہر ہے شاعر نے جن ہاتھوں کی تعظیم کا مشورہ دیا ہے، وہ صرف دستِ شفا ہیں، دستِ قضا نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ اب شفا کے ہاتھ نہیں آتے۔ اس لیے شاعر شاہد شاعر کو کہنا پڑا "راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا"۔ ہاتھوں کی ایک اور قسم ہے جس کی طرف شاعر اشارہ کرتا ہے

وہ جو ہتھیار لیے آئے ہیں سب دشمن ہیں

جس نے ہتھیار دیے رکھے تو دشمن ہو گا
آج ہی کل میں مگر آنے کو ہے روزِ حساب
دستِ فریاد میں کس کس کا نہ دامن ہوگا

جعفری صاحب کی یہ کتاب یعنی لکھنؤ کی پانچ راتیں اُن کی اپنی اور ان کے دوستوں کی دیوانگی مستی اور خردمندی کی تاریخ ہے۔ "یادوں کی بارات" کی طرح ضخیم نہ ہوتے ہوئے بھی اس میں ڈھیروں سامان ہے۔ دوستوں کا ذکر تو وہ اس محبت سے کرتے ہیں جیسے کسی معشوق کے بارے میں شعر کہہ رہے ہوں۔ مخدوم محی الدین جن کا آج بھی بلا ذکر کرتے ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے۔ "اور یہ مخدوم محی الدین ہے۔ حیدرآباد کا انقلابی سنگِ اسود سے تراشا ہوا آبنوسی چہرہ بلند پیشانی مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد، ترنم بے پناہ ہے جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور رومان کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا۔

اور پھر اس کتاب میں وہ مضمون بھی شامل ہے — جو مجاز کی دردناک موت سے متعلق ہے۔ عنوان ہے "ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ" یہ مجاز مرحوم ہی کا مصرعہ ہے اور پورا شعر اُس کی قبر پر لکھا ہوا ہے۔

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

جعفری صاحب شاید یہ روداد نہ لکھ سکتے لیکن چونکہ انہوں نے اپنی شاعری کی ابتدا (انیس سے متاثر ہو کر) مرثیے لکھنے سے کی تھی اس لیے وہ مجاز کی یہ داستان لکھ سکے۔ اس لیے کا آخری پیراگراف دیکھیے۔

"وہ گھر واپس نہ پہنچا۔ مجاز کی برسوں یہ عادت تھی۔ اس کی ماں روز رات کو اس کے بستر کے سرہانے ایک میز پر کھانا، قینچی سگریٹ کی ایک ڈبیا اور اٹھنی رکھ دیتی تھیں تاکہ مجاز کسی عالم میں آئے اُسے تکلیف نہ ہو۔ رکشا والے بھی واقف تھے اور وہ اکثر مجاز کو گھر پہنچا کر بستر پر لٹا دیتے تھے اور سرہانے رکھی ہوئی اٹھنی اُٹھا لے جاتے تھے۔

آج جب ہم اس کی لاش لے کر اُس کے گھر پہنچے تو چارپائی پر بستر لگا ہوا تھا اور سرہانے میز پر کھانا نہیں تھا کھانے کے پاس قینچی سگریٹ کی ڈبیا اور اٹھنی بھی نہیں تھی۔ پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی بوڑھی ماں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ برسوں کا کھویا ہوا بیٹا گھر واپس آ گیا تھا ہمیشہ کے لیے۔"

یہ ۵ دسمبر ۱۹۵۵ کی رات کی داستان ہے اور اسے لکھنے کے لیے جعفری صاحب کو پورے ۹ سال تک صبر کرنا پڑا داستان رنج اور غم کی ہو یا دھکی اور رزم کی، جعفری صاحب کے قلم سے نکلی ہوئی تخلیق کی گنگا اپنی سبک رفتاری برقرار رکھتی ہے۔ ان کا قلم ہماری ریلوں کی طرح رُک رُک کر نہیں چلتا تھا۔ ثبوت میں یہ جملے حاضر ہیں۔

"اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا — زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی سریلی اور بے سری آوازیں سب مل گئیں ....
.... ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جام صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔"

حق پر رہنے کی ایک ترکیب یہ بھی ہے کہ دوستوں کا حق ادا کیا جائے اور کما حقہٗ ادا کیا جائے۔ حسابِ دوستاں در دل

یوسف ناظم

مرحوم کی دوستی کا حق جعفری صاحب نے کس طرح ادا کیا وہ میں جانتا ہوں۔ عالم خوندمیری کے لیے بھی وہ کافی پریشان تھے۔ دیگر احباب کے لیے بھی وہ سعی و کاوش کرتے ہی رہتے ہیں اسی لیے میں نے مضمون کے شروع ہی میں کہا تھا کہ وہ بے حد فعال اور متحرک قسم کے آدمی ہیں۔ لفظ متحرک کی صحیح کیفیت شاید آپ پر واضح نہ ہو سکی ہو۔ انھیں آپ جب بھی کسی محفل میں دیکھیں گے متحرک ہی پائیں گے۔ اس لیے تو وہ اپنے سے متشرع بالوں کو از سر نو منظم کرنے کے لیے کافی حد تک متحرک رہتے ہیں ——— انگلستان کے ایک سابق پارلیمینٹرین لارڈ فربرک کے متعلق مشہور ہے کہ وہ تقریر کرتے وقت ہمیشہ اپنے کوٹ کے بٹن سہلاتے رہتے تھے اور جیسے جیسے ان کی تقریر کی رفتار بڑھتی جاتی تھی اسی رفتار سے ان کی انگلیاں کوٹ کے بٹن سے اٹکھیلیاں کرتی رہتی تھیں اور ایک تقریر کے دوران جب ان کا یہ محبوب بٹن ان سے مفارقت دے گیا تو لارڈ فربرک آگے تقریر نہیں کر سکے ——— مصنوعی اور حقیر چیزوں پر اعتبار کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ جعفری صاحب نے اپنی مصروفیت کے لیے اچھی چیز کا انتخاب کیا ہے۔ اپنے بالوں میں جس انہماک اور جس محبت سے وہ انگلیاں پھیرتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے والی بات ہوگی ——— ورنہ ظاہر ہے صرف ہم ہی نہیں آپ بھی چاہیں گے کہ کوئی ان کا بال بیکا نہ کر سکے۔

پروفیسر ضیا (علیگ)

جعفری صاحب کینیڈا میں

"جناب آفاق حیدر صاحب۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مانٹریال کے ایک گوشے میں بھی ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد ہے"
یہ خط علی سردار سردار جعفری نے آفاق حیدر کے نام لکھا تھا جو امیٹھی کے رہنے والے ہیں اور اس ریاست کے وارثین میں سے ہیں اور اب کوئی بیس سال سے اہل و عیال کے ساتھ مانٹریال میں آباد ہیں۔ میاں بیوی دونوں کیوبیک صوبائی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ جعفری صاحب جب کبھی مانٹریال تشریف لے جاتے ہیں انھیں کے یہاں قیام کرتے ہیں۔ اور ان کو وہاں وہی آرام و سکون ملتا ہے جو امیٹھی ہاؤس لکھنؤ میں ملتا تھا جہاں وہ کبھی ٹھہرا کرتے تھے۔

سچ پوچھئے تو جعفری صاحب کے لیے کینیڈا کے ہر شہر میں ایک ننھا منا سا لکھنؤ آباد ہے اور اگر ایسا نہیں بھی ہوتا تو وہ اپنے طور طریقوں، قرینوں۔ اٹھنے بیٹھنے کے انداز سے اس کو لکھنؤ کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں اور میزبان چاہے وہ کہیں کا رہنے والا کیوں نہ ہو اس کو لکھنوی بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ بھی جعفری صاحب کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہے اور یہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ کس قدر بے تکلف قسم کے آدمی ہیں۔ اور بے جا تکلفات اور تصنع آمیز اخلاق سے گریز کرتے ہیں۔

کینیڈا میں اردو زبان اور ادب کا چرچا تو ایک عرصے سے تھا اور اعلیٰ سطح پر اس کی تعلیم کا انتظام میکگل یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات اور مشرق وسطیٰ کی تعلیمات کے مرکز سے متعلق تھا۔ اردو گرامر، اردو قاعدہ، اردو پڑھائی ابتدائی کتابیں لکھنے اور اس زبان میں درس و تدریس کی ذمے داری ایک عرصے تک ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر پر عائد رہی۔ کچھ عرصے سے یہ ذمے داری ڈاکٹر ساجدہ علوی نے سنبھال لی ہے جو اس مرکز سے متعلق ہیں۔ اور اردو کی چیر جو چند سال ہوئے میکگل میں قائم ہوئی تھی اس کے تحت ان کا تقرر ہوا ہے۔ میکگل یونیورسٹی مانٹریال کے علاوہ برٹش کولمبیا یونیورسٹی، وینکوور اور ٹورنٹو یونیورسٹی میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ہر چند کہ باقاعدگی سے نہیں۔ جب کوئی طالب علم اردو میں بی اے۔ آنرز یا ایم اے کرنا چاہتا ہے یا اردو کو ایک خصوصی زبان کی حیثیت سے سیکھنا چاہتا ہے تو برٹش کولمبیا یونیورسٹی میں مشرقی ایشیا کے سنٹر کی طرف سے اور ٹورنٹو میں ادارہ جنوبی ایشیا اسٹیڈیز کی طرف سے عارضی طور پر ان کی تعلیم کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔ جب تک پروفیسر عزیز احمد زندہ تھے اس وقت تک یہ کام وہ خود ہی انجام دیا کرتے تھے۔

کینڈا میں شروع شروع میں اُردو بولنے والوں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لہٰذا اس کا چرچا بھی عام نہ ہوا تھا پھر ٹورنٹو سے دو چار اُردو کے اخبارات چھپنے لگے ادبی محفلیں منعقد ہونی شروع ہو گئے تھے۔ حفظ الکبیر قریشی نے ایک رسالہ "صہبا" کے نام سے ۱۹۶۰ء میں ٹورنٹو سے نکالا تھا جو ایک طرح سے صہبا لکھنوی کی ادبی خدمات کا اعتراف تھا۔ اسی دوران جشن صہبا کا بھی انتظام ہوا۔ اور کچھ اور ادبی تقریبات بھی منائی گئیں۔ بقول معین اشرف جو کینڈا میں ایک عرصے سے مقیم ہیں ... پاکستان میں اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور جن کے افسانے اکثر لوگوں نے افکار میں پڑھے ہوں گے۔ ان کے ... افسانہ نگاری کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں مگر کاہلی کی بنا پر لکھنے سے گریز کرتے تھے۔ ... ادب کی دنیا میں داخل ... اور افسانہ لکھنے کی ترغیب دینے میں علی سردار جعفری کا ہی ہاتھ ہے۔ اس طرح گویا معین اشرف کو افسانہ نگار ... کا سہرا جعفری صاحب کے ہی سر جاتا ہے۔ ہاں تو بقول معین اشرف کے کینڈا میں اردو کا سب سے پہلا مشاعرہ پانچویں ... کے دوران پاکستانی سفارتخانے کے توسط سے سفیر پاکستان کی قیام گاہ پر منعقد ہوا مگر اس میں کتنے لوگ شریک تھے ... شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا اس کا کوئی باضابطہ سراغ نہیں ملتا۔ ... ۱۹۶۱ء میں پروفیسر عزیز احمد کی خواہش ... کرتے ہوئے اس ملک میں سب سے پہلے مشاعرے کا باقاعدہ اہتمام راقم الحروف نے ہی کیا تھا۔ یہ مشاعرہ سینٹ ... جارج سٹریٹ کی جس بلڈنگ میں عزیز احمد رہائش پذیر تھے اس کے بیس منٹ (BASEMENT) کے لاؤنج میں منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں چالیس سے زائد شعراء نے شرکت کی تھی اور اس وقت یہ تعداد ٹورنٹو کے لئے کافی بڑی سمجھی جاتی ... اس محفلِ مشاعرہ میں عزیز احمد بہ حیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی کوئی غزل نہیں سنائی تھی البتہ ... شعراء کا کلام بڑی توجہ سے سُنا اور حسب ضرورت داد بھی دی تھی۔ پروفیسر علی طیب جو اس وقت شعبۂ جغرافیہ ٹورنٹو یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ اور جن کا انتقال ہو چکا ہے انہوں نے صدارت فرمائی اور جو غزل پڑھی تھی اس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے

اندھیری رات میں مجھکو پولیس والی نے پکڑا ہے
چلو اچھا ہوا کام آگئی آوارگی اپنی

کینڈا میں اُردو سے ذوق و شوق رکھنے والوں کی تعداد میں گرانقدر اضافہ ۱۹۷۰ء اور اس کے بعد سے ہوا۔ ... کی سہولتیں اور معاشی وسائل کی فراوانی کی وجہ سے جنوبی ایشیا کے بہت سے لوگ ترک وطن کر کے یہاں آ بسے اور وہ جب آئے تو اپنے ساتھ اپنی تہذیب، ثقافت اور معاشرت کے بہت سے اجزاء ساتھ لائے یہی نہیں بلکہ اردو زبان کا چسکا اور اس سے محبت کا احساس بھی ساتھ لے کر آئے جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کے اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ریڈیو اور ٹی وی سے اردو کے پروگرام نشر اور ٹیلی کاسٹ ہونے لگے اور ادبی جلسے بھی دھوم دھام سے انعقاد پذیر ہونے ... اور جشن فیض کے علاوہ سرسید ڈے، اقبال ڈے، غالب ڈے بھی اہتمام سے منائے جانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے پہل ... امریکہ کے مشاہیر مثلاً ڈاکٹر داؤد رہبر، ڈاکٹر کارلو کپولا، ڈاکٹر این میری شمیل، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمد عمر میمن اور پروفیسر چودھری محمد نعیم وغیرہ مدعو کئے گئے مگر ۱۹۷۸ء میں ٹورنٹو کے معروف افسانہ نگار رحیم انجان کی کوششوں کی بنا پر فیض احمد فیض کینڈا تشریف لائے۔ ان کا یہاں آنا گویا دبستانِ اردو کھل گیا۔ ایک اردو سوسائٹی کی بنیاد پڑ گئی۔ رحیم انجان نے "ملاقات" نامی رسالے کا اجرا کیا "رسالہ "صہبا" اپنی چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا تھا۔ مگر دوسرے رسالے نکلنے شروع ہوئے اور

اب مذاکرے اور مشاعرے بھی، علمی پیمانے پر منعقد ہونے لگے۔

اردو سوسائٹی ٹورنٹو جس کے سربراہ اس وقت حفظ الکبیر قریشی تھے ان کی دعوت پر ۱۹۸۰ء میں پہلی بار علی سردار جعفری کینیڈا تشریف لائے اور اسی دوران میری ان کی باضابطہ ملاقات ہوئی۔ وہ دراصل امریکہ اپنے دوسرے رفقا اور احباب کے ساتھ تشریف لاتے ہوئے تھے۔ جہاں امریکہ کی کئی ادبی انجمنوں نے ان کو مدعو کیا تھا۔ انھیں میں سے ایک انجمن نے کبیر قریشی سے رابطہ قائم کیا اور اس طرح یہ سارا کارواں جس میں جعفری صاحب کے علاوہ اختر الایمان، کیفی اعظمی، بکل آنساہی، واجدہ تبسم، مینا قاضی، عزیز قیسی اور حسن کمال وغیرہ کے نام خاصے نمایاں ہیں۔ ٹورنٹو وارد ہوا۔ خوش قسمتی انھیں دنوں ایک دوسری انجمن کی دعوت پر فیض احمد فیض بھی یہاں تشریف لاتے ہوتے تھے۔

شام کو ایک بین الاقوامی مشاعرہ کا اہتمام ایک ہائی اسکول کے ہال میں کیا گیا جسے خوب سجایا گیا تھا۔ صدارت کے فرائض فیض صاحب نے انجام دیتے۔ جعفری صاحب کی غزلوں کے علاوہ "دیوار" اور "کربلا" نامی نظمیں بہت پسند کی گئیں۔ اور فرمائش کر کے اس کے کئی بند بار بار پڑھوائے گئے۔

جعفری صاحب ایک شگفتہ مزاج، بذلہ سنج، ہنس مکھ قسم کے آدمی ہیں وہ ہنسی ہنسی میں بہت سی دلچسپ باتیں کر جاتے ہیں۔ اور باتوں ہی باتوں میں بہت سی پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ ان کا باتیں کرنے کا انداز خوب ہے۔ باتیں کرتے وقت مسکراتے بھی رہتے ہیں اور ہاتھوں پر ہاتھ بھی پھیرتے جاتے ہیں۔ ان کا ایک خاص لب و لہجہ ہے جس میں دیانتداری اور دیانت کو بڑا دخل ہے۔ وہ صاف گو ہیں۔ اور صاف گوئی پسند کرتے ہیں۔ نہ لگی لپٹی رکھنے کے عادی ہیں نہ منھ کے وہ کسی کی مذمت میں انتہا پسندی کو دخیل ہونے نہیں دیتے۔ اور نہ مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ہی ملاتے ہیں۔ نہ وہ اپنے سامعین کو مخمصے میں ڈالتے ہیں کہ گھٹیا پن ان کے طریقے گفتگو میں شامل نہیں۔ نہ ان کو کسی کی دل شکنی پسند ہے نہ کسی کی تضحیک مقصود ہے۔ ہر ایک کی بات کو توجہ سے سنتے ہیں۔ کہنے والا بڑا ہو یا چھوٹا انھیں اس سے غرض نہیں۔ صرف اس سے مطلب ہوتا ہے کہ کیا کہا جا رہا ہے نہ یہ کہ کون کہہ رہا ہے!

جعفری صاحب سے ملنے کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان کے اندر ایک بڑا ہی پیارا انسان اور ایک عظیم دانشور چھپا ہوا ہے۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔ سنجیدہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے حس ظرافت ان میں نام کو نہیں۔ اور جب ہنستے ہیں تو محفل کو زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف اس دور کے ممتاز ترین شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور انشا پردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں بلکہ وہ کئی ڈاکومینٹری فلموں کے ہدایت کار اور پروڈیوسر بھی ہیں۔ کئی رسالوں کی ادارت کی ذمہ داری بھی انھوں نے بخوبی سنبھالی ہے۔ ادب شناسی، سنجیدہ تنقید، اعلیٰ معیار کی شاعری کی جو مثالیں انھوں نے قائم کی ہیں وہ اس دور کے کم ادبا کر پائے ہیں۔ علم و ابلاغ کی جو شمعیں انھوں نے روشن کی ہیں وہ ہمیشہ جلتی رہیں گی۔ اور اپنی روشنی سے آنے والی نسلوں کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کے ذہن کو جلا بخشتی رہیں گی۔ اردو ادب کی کلاسیکی شاعری سے ان کو خاص شغف ہے۔ ان کے مطالعے کی حدود لامحدود ہیں، ان کا فکری اُفق وسیع بھی ہے۔ متنوع بھی۔ انھوں نے انگریزی، فرانسیسی، روسی، جرمنی اور ہندی ادب اور فلسفہ کا مطالعہ بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ وہ ہمہ تن علم اور ہمہ صفت موصوف ہیں۔

ٹورنٹو میں جعفری صاحب زیادہ تر بیدار بخت کے یہاں ٹھہرتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ خود تو کہیں اور ٹھہرے

ہیں مگر ان کی بیگم سلطانہ اپنی علی گڑھ کی ساتھی اور دوست مسعودہ سعید کے پاس قیام پذیر ہوئی ہیں۔ مسعودہ میری بھابی ہیں اور میرے چچیرے بھائی سعید کو بیاہی ہیں۔ اس اعتبار سے مجھے جعفری صاحب اور ان کی بیگم کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

کینیڈا میں رہنے سہنے کا انداز ہندوستان اور پاکستان سے ذرا مختلف ہے۔ چونکہ معیار زندگی خاصا اونچا ہے اس لئے اکثر خاندان کے افراد معاشی حالات کے تحت اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ میاں اور بیوی دونوں ملازمت کریں۔ صبح دونوں اپنے اپنے دفاتر چلے جاتے ہیں۔ شام کو تھکے ہارے واپس آتے ہیں پھر کس کو ہوش ہے کہ کھانے پکانے۔ یا تو بازار ہی میں کھا لیا یا کچھ ساتھ خریدتے لاتے۔ چنانچہ جعفری صاحب کو ان حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کہ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں پیر کی صبح کو دونوں میاں بیوی کام پر چلے گئے اور خانہ خالی کو جعفری صاحب پر چھوڑ گئے۔ اب وہ مہمان بھی ہیں اور میزبان بھی۔ خود ہی چائے بنا رہے ہیں، خود ہی ناشتہ تیار کر رہے ہیں، آنے جانے والوں کی خاطر داری بھی کر رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر میزبان کے بچے اسکول نہیں گئے تو ان کی "بے بی سٹنگ" بھی کر رہے ہیں۔ مگر وہ یہ سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں۔ ماتھے پر بل نہیں ڈالتے کسی سے کسی بات کی شکایت نہیں کرتے۔ ان کی یہی محبوب ادا ہے کہ ہر کوئی ان کو اپنے یہاں ٹھہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ٹھہریں کہیں بھی مگر ملتے سب سے یکساں طور پر ہیں۔ اور کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ کس کے دوست زیادہ ہیں اور کس کے کم۔

فیض اور جعفری صاحب کے ایک ہی شہر میں موجود ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے رحیم انجان صاحب نے ان کے اعزاز میں ایک مخصوص ظہرانے کا اہتمام کیا جس میں میرے علاوہ حفظ الکبیر قریشی، کرنل انوار احمد، ان کی بیگم اور دو ایک حضرات اور مدعو تھے مجھے کبھی یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کینیڈا میں ایک دن ایسا بھی آئے گا جب مجھے دو دیو قامت دانشوروں کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں اٹھنے بیٹھنے کا اور ان کی ادیبانہ گفتگو سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملے گا۔

اس نجی محفل میں جعفری اور فیض صاحبان کی گفتگو سننے کے لائق تھی۔ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ علم کے دو دریا ہیں جو بڑی تیزی سے میرے سامنے بہہ رہے ہیں۔ یا پھر دو ستون میرے سامنے نصب ہیں جن پر صرف زریں اقوال لکھے ہوئے ہیں۔ فیض صاحب کا مطالعہ انگریزی اور عربی ادب کا کس قدر وسیع تھا اس کا اندازہ مجھے اس دن ہوا۔ ان کی باتیں کس قدر وزنی اور وقیع ہوتی ہیں یہ راز اسی دن سمجھ میں آیا۔ میں نے اپنا تعارفی کارڈ جعفری صاحب کو دیا جو انہوں نے شکریے کے ساتھ رکھ لیا اور ہندوستان واپس جا کر رسالہ "گفتگو" جس کی ادارت ان کے سپرد تھی اس کے کئی شمارے بھجوائے۔ یہ بات میرے لئے باعث عزت تھی۔

اس آمد کے دو سال بعد ۱۹۸۲ء میں اردو سوسائٹی کی دعوت پر جعفری صاحب دوبارہ کینیڈا تشریف لائے۔ اس بار وہ براہ راست یہاں آئے چونکہ وہ ایک اردو کانفرنس میں بحیثیت مقرر، شاعر اور ادیب کے مدعو تھے۔ یہ کانفرنس ۲۵ اور ۲۶ دسمبر ۱۹۸۲ء کو ٹورنٹو یونیورسٹی کے ہال میں منعقد ہوئی تھی شرکاء میں جعفری صاحب کے علاوہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر کارلو کپولا، احمد فراز، ادا جعفری، جمیل الدین عالی ان کے علاوہ ڈاکٹر این میری شمیل بھی مدعو تھیں۔ لیکن وہ آنہ سکیں۔

کانفرنس دو سیشن پر مشتمل تھی اور ایک محفل مشاعرہ کا بھی اہتمام تھا۔ پہلی نشست میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ایک مقالہ انگریزی میں "اردو شاعری میں نئے رجحانات" کے عنوانات سے پیش کیا۔ جو بہت پسند کیا گیا۔ ایک تو نارنگ جیسا جید اور متبحر قسم کا ادیب اور عالم اس پر انتہائی دلآویزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ لکھا ہوا مقالہ، تیسرے نارنگ صاحب کا انداز بیان جو جادو کا اثر رکھتا ہے۔ ان سب کو یکجا کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقالہ سنکر لوگ جھوم جھوم اٹھے اور نارنگ صاحب نے اپنی توقع سے زیادہ داد پائی۔ اس کے بعد دوسرا مقالہ جعفری صاحب کا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ "PROGRESSIVE MOVEMENT AND ITS INFLUENCE ON URDU POETRY."

یہ مضمون تحقیقی بھی تھا اور معلوماتی بھی۔ ذہن اور فکر کو سوچنے کی طرف بھی راغب کرتا تھا اور ترقی پسند تحریک نے ہماری زندگی، ہمارے ادب اور ہمارے رجحانات کو کس طرح متاثر کیا ہے۔ اس کا بھرپور جائزہ بھی لیا تھا۔ جعفری صاحب نے یہ مقالہ بڑی محنت جستجو اور ریسرچ کرنے کے بعد لکھا تھا۔ ہر چند کہ اس میں جو QUOTATIONS تھے وہ ذرا دور از کار تھے، مگر ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے میں جو ترقی پسندیت کو دخل ہے اس کا پرخلوص احاطہ بڑے بصیرت افروز انداز میں کیا گیا تھا۔ بلاشبہ یہ مضمون اس بات کی ضمانت تھا کہ جعفری صاحب کی ذہنی ترتیب بڑی حد تک ترقی پسند تحریک کے زیر اثر عمل میں آئی ہے۔ بعد میں یہی مضمون تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ رسالہ "URDU CANADA" میں جس کی ادارت ولی عالم شاہین کرتے ہیں اس کے پہلے شمارے میں شائع ہو کر خاصا مقبول ہوا۔

نثری نشستوں کے بعد شام کو رنگا رنگ محفل شعر و سخن ایک آراستہ و پیراستہ ہال میں سجائی گئی۔ جعفری صاحب کا خیر مقدم لوگوں نے کھڑے ہو کر کیا۔ ان کی آمد پر تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔ ان کی کتنی ہی نظموں کو بار بار سنا گیا۔ پھر ان سے غزلیں سنانے کی فرمائش ہوئی اور انھوں نے جی بھر کے شگفتگی سے بھرپور کئی غزلیں اپنے مخصوص لہجے میں سنائیں۔ شعر پڑھتے جاتے تھے اور حسب عادت بالوں پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ کبھی مسکرانے لگتے، کبھی سنجیدگی اختیار کر لیتے۔ غرضیکہ وہ شام جعفری، احمد فراز اور عالی کے ہاتھ رہی اور شاعرہ انھیں حضرات نے لوٹا۔

پھر یہ کارواں اوٹاوا پہنچا جہاں جعفری اور احمد فراز صاحبان کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور ان کی مہمان نوازی کی ساری ذمہ داری ہوٹل کے کارکنان پر چھوڑ دی گئی تاکہ صاحب خانہ کے کام پر چلے جانے کے بعد انھیں میزبانی کے فرائض نہ انجام دینا پڑیں۔ یہاں ہر شخص اُن سے بلا تکلف ملنے آ جا سکتا تھا۔ دن بھر شیدائیانِ جعفری کا تانتا بندھا رہا۔ شام کو اوٹاوا یونیورسٹی کے ایک ہال میں محفل شعر و سخن کا انعقاد ہوا۔ اُس شام بھی مشاعرہ خوب جما اور مہمان شعراء کا کلام سُننے کے لئے لوگوں کی بے چینی اور دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر مشاعرہ دوسرے دن تک جاری رہتا تو وہ لوگ اپنی جگہوں سے اُٹھ کر نہ جاتے۔

اوٹاوا کے بعد شاعروں اور ادیبوں کا یہ قافلہ مانٹریال ہوتا ہوا ونی پیگ پہونچا۔ یہ شہر عرفانہ عزیز جیسی مقتدر شاعرہ کی وجہ سے اردو ادب و زبان کی نشو نما میں کسی دوسرے شہر یا علاقے سے پیچھے نہیں۔ عرفانہ جعفری صاحب کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اور اُن سے وہی عقیدت رکھتی ہیں جو ایک ادیبہ ایک عظیم فنکار سے رکھتی ہے اور اُن سے ویسی ہی محبت کرتی ہیں جیسے چھوٹی بہنیں بڑے بھائیوں سے کرتی ہیں۔ ایک بار میں یونیورسٹی آف مانیٹوبا میں ہونے والے

ایک کانفرنس میں شرکت کرنے اور اپنا مقالہ ایک سیشن میں پیش کرنے کی غرض سے ونی پیگ گیا۔ شام کو ملنے عرفانہ کے گھر پہونچا ان کے ڈرائینگ روم میں جابجا جعفری صاحب کی تصویریں۔ کچھ انہیں کے ساتھ کھینچی ہوئی تھیں الگ قرینے سے سجی ہوئی تھیں میں نے تعریف کی۔ وہ کچھ دل گرفتہ ہوگئیں۔ میں نے پوچھا کہ خیر تو ہے کیا بات ہے کہنے لگیں کیلگری میں جو بین الاقوامی مشاعرہ ہو رہا ہے اس کا تو آپ کو علم ہوگا۔ میں نے جواب دیا بلا شبہ ہے اور میں مدعو بھی ہوں۔ کہنے لگیں بات یہ ہے کہ جعفری صاحب کا نام یہاں شعراء میں شامل ہے۔ اور کیلگری والوں نے رابطہ قائم کرنے کے لئے ونی پیگ کی اردو سوسائٹی والوں نے بھی (اس سال وہ اردو سوسائٹی کی صدر نہیں تھیں۔ ایک اور خاتون تھیں) ان کو یہاں مدعو کر لیا ہے۔ میں نے کہا تو یہ کون سی بری بات ہے اس طرح آپ کی ملاقات ایک بار پھر جعفری صاحب سے ہو جائے گی۔ کہنے لگیں یہ تو ٹھیک ہے بات نہیں ہے جعفری بھائی کو پتہ نہیں کہ یہاں کی ادبی فضا کیسی ہے اور مشاعرہ کرنے والے کس قسم کے افراد ہیں۔ مزید برآں نہ جعفری بھائی نے مجھے اپنے آنے کی اطلاع دی اور نہ یہاں کے بارے میں مشورہ ہی کیا کہ آیا جانا ہے کہ نہیں۔ میرا جواب سادہ تھا کہ اگر انہوں نے آپ سے کوئی رابطہ نہیں قائم کیا ہے تو وہ ہرگز یہاں تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ ایک بھائی اپنی بہن کا دل کیوں دکھائے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ جعفری صاحب ان دنوں ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کی گولڈن جوبلی جو لکھنؤ میں منائی گئی۔ اس کے انتظامات میں منہمک تھے۔ کیونکہ وہ خود انتظامیہ کمیٹی کے سربراہوں میں سے تھے لہذا ان کو اتنا ہوش بھی نہ تھا کہ وہ ملک سے باہر جانے کے بارے میں سوچیں البتہ ونی پیگ کی اردو سوسائٹی والوں کے لئے یہ کرائسس پیدا ہوا کہ انہوں نے جعفری صاحب کے نام سے تین سو ٹکٹ فروخت کر دیئے تھے اور اب ان کو یہ اندیشہ تھا کہ لوگ ٹکٹ کے دام واپس مانگیں گے۔ یا ہال میں ہلڑ مچائیں گے گھبرا کر ان لوگوں نے ٹورنٹو والوں سے مشورہ کیا انہوں نے ان کو ایک نسخہ کیمیا کہ ہر مرض کی دوا ہے "ترنم" بتا دیا کہ نیویارک سے کچھ گلے باز قسم کے شاعر بلوا دو۔ ادھم مچانے والوں کی آواز دب جائے گی۔ مجرب نسخہ تھا کام آیا۔ عرفانہ کے دل میں اس واقعہ کے بعد جعفری صاحب کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں اردو کی فضا کو ہموار کرنے میں ایک اہم کردار اشفاق حسین نے ادا کیا۔ انکو یہاں شادی کی زنجیروں میں جکڑ دینے کی غرض سے بلایا گیا اور اعجاز بزمی کی صاحبزادی نرجس ان سے منسوب ہوئیں۔ اشفاق کی شاعری کی ایک کتاب "اعتبار" کے نام سے پہلے ہی چھپ چکی تھی۔ اور ان کا ایم اے اردو کا THESIS "فیض کی شخصیت اور شاعری" کے عنوان سے بھی اشاعت پذیر ہو چکا تھا۔ اردو کی خدمت کرنے کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انہوں نے یہاں آکر ایک ادبی ادارے WRITER,s FORUM OF PAKISTANI CANAD,ANS کی بنیاد ڈالی اور اعجاز بزمی صاحب نے PAKISTAN AMITY FORUM کے نام سے ایک فورم کا سنگ بنیاد رکھا۔ اشفاق نے کچھ عرصے بعد "اردو انٹرنیشنل" کے نام سے رسالہ کا بھی اجراء کیا اور ٹورنٹو میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے وہ کر گزرے۔

۱۹۸۴ء میں فورم کی جانب سے علی سردار جعفری کو اس لئے مدعو کیا گیا کہ ان کا ستر سالہ جشن سالگرہ منایا جائے اور تقریبات میں ایک بین الاقوامی مشاعرے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں شرکت کرنے کے لئے جمیل الدین عالی۔ امجد اسلام امجد۔ پروین شاکر تسلیم الہی زلفی۔ افتخار عارف وغیرہم کو بھی مدعو کیا گیا۔

۳ر نومبر ۱۹۸۴ء کی شام کو ہالی ڈے ان ڈاؤن ٹاؤن کے ایک پر تکلف لاؤنج میں "شام جعفری" کے عنوان سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ شرکاء کی تعداد ہال کی مناسبت سے ۱۵۰ رکھی گئی مگر جیسے جیسے یہ خبر عام ہوئی لوگوں کا اشتیاق جعفری صاحب کے جشن سالگرہ میں شرکت کرنے کا بڑھتا گیا۔ پھر بھی ایک مخصوص تعداد کے بعد لوگوں سے معذرت کر لی گئی۔ اس طرح ایک بڑی تعداد "شام جعفری" میں شرکت سے محروم رہی۔ پروگرام میں گلپوشی، نذرانۂ عقیدت، منظومات، تقاریر، کیک کٹنے کی رسم اور پھر جعفری صاحب کا کلام سننا شامل تھا۔

جمیل الدین صاحب جو تشریف لا چکے تھے، وہ ایک انتہائی مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں۔ دوست پرور۔ دوست نواز، ان کی عادات میں ایک چیز یہ بھی شامل ہے کہ وہ ہر دوسرے تیسرے روز کراچی ٹیلیفون کر کے پاکستان کی خبریں ضرور معلوم کرتے ہیں۔ اس روز بھی ہالی ڈے ان جانے سے پہلے گھر ٹیلیفون کیا کہ معلوم کریں کیا حالات ہیں دوسری جانب سے اطلاع ملی کہ فیض احمد فیض کا انتقال ہو گیا۔ یہ سنتے ہی عالی گھبرائے ہوئے ہانپتے کانپتے ہالی ڈے ان پہونچے اور اس اندوہناک خبر کا انکشاف کیا۔

اس خبر کا سننا تھا کہ سارے ہال پر سناٹا چھا گیا۔ ہر ایک کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یہ کیا ہوا۔ "فیض صاحب کا انتقال ہو گیا" وہاں جو بھی موجود تھا اس کو یہی محسوس ہوا کہ جیسے اس کے قریبی عزیز کی موت واقع ہو گئی۔ جعفری صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور دوسروں کی طرح ان کا چہرہ بھی لٹک گیا۔ وہ فیض صاحب کے دیرینہ ساتھیوں میں سے تھے، ان کے پرانے رفیق تھے، ہم مسلک تھے، ہم مشرب تھے، ہمدم بھی تھے، دمساز بھی تھے۔ دونوں نہ جانے کتنی تحریکوں سے وابستہ رہے تھے، کتنے ہی ادارے ان دونوں کی جاں سوز کوششوں کی وجہ سے پروان چڑھے تھے۔ کتنی ہی انجمنیں ان دونوں کے باہمی تعاون کی وجہ سے برصغیر میں مقبول ہوئی تھیں۔ آن کا آبدیدہ ہونا قدرتی تھا۔ سچ پوچھیئے تو جس آنکھ کو دیکھیئے وہ نم تھی۔ جس چہرہ کو دیکھیئے وہ اترا ہوا تھا۔ جشن سالگرہ کی تقریب وقتی طور پر روک دی گئی۔ تعزیتی جلسے کا اعلان ہوا دو منٹ کی خاموشی فیض صاحب کے احترام میں اختیار کی گئی۔ ایک تعزیتی قرارداد متفقہ طور پر منظور کی گئی جس کی کاپیاں ایلس فیض کے علاوہ مختلف اخباروں اور ٹی وی اسٹیشنوں کو بھیجی گئیں۔ اس کے بعد سالگرہ کا آغاز ہوا مگر اب سارا ماحول اس مصرعے کے مصداق تھا۔

ع　جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتا ہے

یوں تو جعفری صاحب کی شان میں تہنیتی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ مبارکباد کے گیت بھی گائے گئے۔ مبارکباد بھی پیش کی گئی۔ مگر فضا اب اتنی بوجھل ہو چکی تھی کہ جو مسرت اور لذت اس قسم کے جلسوں میں شرکت کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے وہ نہ پائی۔

"شام جعفری" کے چند روز بعد ۸ر دسمبر ۱۹۸۴ء کی شام کو ONTARIO INSTITUTE OF STUDIES IN EDUCATION کے آڈیٹوریم میں بین الاقوامی مشاعرے کی بزم سجی جس کی صدارت جعفری صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض اشفاق حسین نے انجام دیئے۔

اس مشاعرے کے بعد اور بہت سی نجی محفلیں جعفری اور پروین شاکر اور عالی صاحبان کے اعزاز میں منعقد ہوتی رہیں۔ اور پھر یہ قافلہ اعجاز بزمی کی سالاری میں اوٹاوا کی جانب روانہ ہوا جہاں کی بزم اردو ادب نے جس کے سربراہ سعید اور حمیرا

صاری تھے ایک نفیس ہال میں مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ صدارت جعفری صاحب کے سپرد تھی۔ نظامت کی درخواست پروین شاکر سے کی گئی جو انہوں نے بخوشی منظور کر لی۔ جمیل الدین عالی نے پروین شاکر کا تعارف حاضرین جلسہ سے کرایا۔ مقامی شعرا میں ممتاز ترین ہستی ولی عالم شاہین کی تھی۔ انہوں نے سب کا خیر مقدم کیا۔ مشاعرے کا آغاز ایک مقامی شاعر سے ہوا جس نے اپنا کلام پیش کرنے سے پہلے یہ کلمات ارشاد فرمائے کہ جعفری صاحب چونکہ یہ آپ کی ستترویں سالگرہ کا موقع ہے لہٰذا میں نے ایک غزل ملے جلے رنگ میں آپ کی خاطر کہی ہے اور وہ آپ کی نذر ہے "ملے جلے رنگ کی غزل کا سننا تھا کہ جعفری صاحب کا چہرہ لال ہو گیا وہ ادب کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جیسے جیسے وہ شاعر اپنے شعر پڑھتا جاتا تھا ویسے ویسے جعفری صاحب کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا کہ سارے شعر مہمل اور غیر موزوں تھے۔ غزل سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ غزل ختم ہونے کے بعد جب اس نے وہ کاغذ جس پر غزل لکھی ہوئی تھی جعفری صاحب کو پیش کیا تو انہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کاغذ کو پرے ہٹا دیا۔ باقی محفل مشاعرہ نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اختتام کو پہنچی۔

اوٹاوا کے بعد شاعر حضرات کو مانٹریال جانا تھا جہاں جعفری صاحب اور پروین شاکر کا قیام آفاق حیدر کے یہاں تھا جن کے گھر کو جعفری صاحب لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے گوشے سے تعبیر کر چکے تھے۔ مشاعرہ گاہ تک آفاق حیدر کی بیٹی رومانہ اپنی اسپورٹس کار میں بٹھا کر اپنے چچا (جعفری صاحب) کو لے کر گئی۔ جعفری صاحب بڑے خوش خوش اور تر و تازہ نظر آ رہے تھے۔ مگر مشاعرہ گاہ پہنچے اور وہاں کا عالم دیکھا تو ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ہال کے اندر چار پائی (کوکا کولا) اور سموسوں کا اسٹال لگایا گیا تھا لوگ اس اسٹال کے ارد گرد زیادہ جمع تھے۔ شعر توجہ سے سننے کا کسی کو سلیقہ نہ تھا۔ مشاعرہ شروع ہوا تو ایک طرف تو شاعر اپنا کلام بلاغت نظام سنا رہا ہے دوسری طرف مجمع اسٹال کے ارد گرد کھڑا ہوا سٹر سٹر چائے پی رہا ہے۔ سموسے یا پکوڑے کھا رہا ہے۔ اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ سکریٹری بزم اردو ادب ناظم مشاعرہ کو پرے ہٹا کر بار بار کوئی نہ کوئی بے معنی اعلان کرنے مائیکروفون تک پہنچ جاتا ہے۔ جعفری صاحب کی فطرت کے یہ منافی ہے کہ وہ اردو زبان، ادب اور شعر کی اس طرح ناقدردانی دیکھیں اور خاموش رہیں۔ وہ یہ ہڑبونگ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مقامی رسم و رواج کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے برملا تو کچھ نہ کہا البتہ خاموش احتجاج کے طور پر مشاعرہ عالی صاحب کے سپرد کر کے بیٹی رومانہ سے کہا "مجھے گھر لے چلو کہ مجھ سے ادب کی یہ بے ادبی پڑھے لکھے انسانوں کے ہاتھوں نہیں دیکھی جا رہی ہے" اور وہ ہال سے اٹھ کر چلے آئے نہ ان کو اس سے غرض تھی کہ اس طرح ان کو کسی مالی خسارے کا شکار ہونا پڑے گا نہ اس سے واسطہ تھا کہ منتظمین ان کے اس طرح اچانک مشاعرہ گاہ سے چلے جانے کے بارے میں کیا سوچیں گے۔ جعفری صاحب کی یہی ادا ان کے کردار کی شان ہے کہ وہ ادب کی عظمت کا سودا نااہل اور ناپختہ شعور کے ہاتھوں نہیں کر سکتے۔ جس پودے کو انہوں نے اپنا لہو پلا پلا کر سینچا، اس کو پروان چڑھایا اس کو ایک ایسا سایہ دار درخت بنایا جس کے سائے میں بیٹھ کر کتنے ہی ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو سوچنے کا موقع ملا اور اپنی ذہانت اور فطانت کو تیز تر کرنے میں مدد ملی۔ وہ اس درخت کی شاخوں کو کسی کم علم اور کور ذوق کے ہاتھوں ڈالر کی لالچ میں کٹتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کا وہاں سے اٹھ کر چلے آنا ایسی غیر منظم محفل کے خلاف ایک پرزور اور پرجوش احتجاج تھا جس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ان کی طرح ادب کا مرتبہ جانتے ہیں اور شعر و شاعری کا دقار خاک میں ملتے نہیں دیکھ سکتے۔

جعفری صاحب آخری بار ۱۹۸۸ء میں رائٹرز فورم آف پاکستانی کینیڈین اور کینیڈین ایسوسی ایشن آف پاکستانی میڈیا

(کیمپ) کے اشتراک سے جو اس عہد کے عظیم مفکر، شاعر، فلسفی، حکیم الامت علامہ سر محمد اقبال کی پچاس سالہ برسی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی تقریبات میں شرکت کرنے کی غرض سے تشریف لائے۔ ان دو اداروں نے مل کر عارضی طور پر ایک یادگارِ اقبال کمیٹی قائم کی جس کے منتظم اعلیٰ اشفاق حسین چنے گئے اور انھیں کے ہاتھوں سارے انتظامات تکمیل تک پہنچے۔ یادگار کمیٹی کے اراکین میں سے صبیح الدین منصور، عابد جعفری (کیمپ کی جانب سے) خورشید عالم اور جمال زبیری (فورم کی طرف سے) پیش پیش تھے۔ یہ پروگرام دو ہفتوں پر مشتمل تھا۔ آغاز استقبالیہ سے تھا جس کا انتظام ۸ جولائی کو پاکستانی ریستوران، شیزان میں کیا گیا اور اختتام اردو کانفرنس پر تھا۔ یہ تقریب اتوار، ۱۷ جولائی کو رائل پارک ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ اس میں ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ کے متعدد نامور ادیب اور شاعر مدعو تھے۔ استاد امیر خان، معروف موسیقار پاکستان "شامِ غزل" کے ہیرو تھے۔ مشہور فنکار اور آرٹسٹ دلاور مرزا کی تصاویر اور اسکیچز کی نمائش بھی تقریب میں شامل تھی۔ علامہ اقبال کی شاعری اور شخصیت سے متعلق جو فلم حکومت ہند نے تیار کرائی تھی اور جس کی پروڈکشن میں علی سردار جعفری نے اہم کردار ادا کیا تھا وہ فلم بھی دکھائی گئی۔ کتابوں کی نمائش بھی منعقد ہوئی اور ۱۶ جولائی کی شام کو OISE کے ہال میں بین الاقوامی مشاعرہ بھی بڑے اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا۔ دوسرے دن مذاکرہ اور ادبی مقالوں کا سیشن تھا جو انتہائی کامیاب رہا۔ مجموعی طور پر رائٹرز فورم اور کیمپ کا اردو کی ترویج کے سلسلے میں یہ سب سے اہم کارنامہ تھا۔

جن ادبا اور شعراء نے شرکت کی ان میں علی سردار جعفری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی احمد فراز، شمالی امریکہ کے محبوب ترین شاعر، عشرت آفرین نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر وزیر آغا بعض مجبوریوں کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ برطانیہ سے افتخار عارف اور عاشور کاظمی اور ناروے سے سعید انجم آنے والے تھے مگر وہ بھی کسی وجہ سے نہ آسکے۔

شامِ استقبالیہ کے مہمان خصوصی علی سردار جعفری تھے انہوں نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا کہ اب تک اردو ادب کے چار اہم مرکز تھے۔ دہلی، لکھنو، حیدرآباد دکن اور لاہور اور اب مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے اور فخر بھی کہ ٹورنٹو پانچواں اہم مرکز بنتا جارہا ہے۔ جس عنوان سے اس شہر کے اردو نواز حضرات نے اردو کا نام روشن کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے

شرکاء کے تعارف اور تقاریر کے بعد ایک مختصر محفلِ مشاعرہ بھی جس کی صدارت کے لئے جمال زبیری نے سلطانہ جعفری کا نام تجویز کیا۔ یہ کینیڈا میں پہلا اتفاق تھا کہ ایک غیر شاعر خاتون نے مشاعرے کی صدارت کی ہو۔ اشفاق حسین نے یہ شعر پڑھے ؎

جو شوق بھی ہے اس سے گریزاں نہیں ہونا
لیکن میری مانو تو نمایاں نہیں ہونا
ہر عہد کا اک اپنا نصابِ غمِ دل ہے
ہر عہد میں اب چاک گریباں نہیں ہونا

جعفری صاحب نے اشفاق کی ہمت افزائی فرماتے ہوئے برملا یہ کہا کہ "نصابِ غمِ دل" بڑی خوبصورت ترکیب ہے یہ بھی جعفری صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے کہ وہ ہمیشہ چھوٹوں کا دل بڑھاتے ہیں اور جو بات قابلِ تعریف ہو اس کی دل بھر کر تعریف کرتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کہنے والا کون ہے۔

استقبالیہ کے آخر میں حاضرین کی فرمائش پر علی سردار جعفری صاحب کو اپنا کلام سنانا پڑا۔ کہنے لگے آپ لوگ انکم ٹیکس تو دیتے ہوں گے۔ علی عباس حسنی بولے۔ انکم ٹیکس دیتے ہی نہیں بلکہ بہت دیتے ہیں۔ جعفری صاحب بولے تو پھر سنیئے میری نظم جس کا عنوان ہے "دولتِ دنیا کا حساب"۔

تم کہ ہو محتسبِ سیم و زر و لعل و گہر
ہم سے کیا مانگتے ہو دولتِ دنیا کا حساب
چند تصویرِ بتاں چند حسیناؤں کے خواب
چند ناکردہ گناہوں کے سلگتے ہوئے خواب
ہاں مگر اپنی فقیری میں غنی ہیں ہم لوگ

اس کے بعد دو چار نظمیں اور سنائیں اس کے بعد یہ محفل اختتام کو پہنچی۔ مشاعرے کی صدارت حسبِ دستور جعفری صاحب نے کی پہلے دور کے ختم ہونے سے پہلے زبیدہ برمانیہ جو ACADEMY OF URDU LITFRATURE سے متعلق ہیں انہوں نے اسٹیج پر آکر اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور پھر صوبائی وزارت MULTICULTURAL کے نمائندے اور پارلیمانی سکریٹری اور ممبر پارلیمنٹ Mr. TONI RUPERT کا تعارف کرایا۔ روپرٹ صاحب نے اپنی تقریر میں "اردو زبان نے کینیڈا میں مقبولیت حاصل کی" اس کو بے انتہا سراہا۔ اردو سے محبت کرنے والوں کو داد دی اور پھر ان کے ہاتھوں ایک ایوارڈ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو پیش کیا گیا۔ دراصل یہ ایوارڈ دو سال قبل اکیڈمی کی جانب سے ہالی ڈے اِن میں منعقد ہونے والی ایک محفل میں نارنگ صاحب کو پیش کیا جا چکا تھا اس مشاعرے میں روپرٹ صاحب کے ہاتھوں اس کی تجدید مقصود تھی۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء کا ایوارڈ علی سردار جعفری کو جس میں ایک ہزار ڈالر کی رقم، ایک PLAQUE اور ایک SUVENIR بھی شامل تھا دیا گیا جعفری صاحب جب وہ ایوارڈ لینے آگے بڑھے تو جذبات سے مغلوب ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ میرے ساتھیو میرے COMRADES مجھے زندگی میں بہت سے اعزازات، انعامات اور ایوارڈس ملے ہیں مگر اکیڈمی کی جانب سے اس ایوارڈ کی نوعیت ہی کچھ اور ہے کہ یہ مجھے ایسی سرزمین پر دیا جا رہا ہے جہاں کی زبان نہ اردو ہے نہ ہندوستانی بلکہ انگریزی اور فرانسیسی ہے اور جہاں اردو کی شمع کو جلے ہوئے مشکل سے بیس بائیس سال ہوتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز بھرا گئی اُن پر رقت طاری ہو گئی۔ جعفری صاحب تقریر کرتے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو پونچھتے تھے۔

اس کے بعد ٹونی روپرٹ نے وزیر اعلیٰ صوبہ اونٹاریو کا پیغام پڑھ کر سنایا اور جعفری صاحب کو A GRAND OLD MAN OF URDU RATHER A YOUNG MAN OF URDU کہہ کر خاطب کیا۔ ان کے بارے میں برملا یہ کہا کہ یہ A MAN OF LETTERS بھی ہیں اور A MAN OF ALL SEASONS بھی ہیں۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ A SEHOLAR PAR EXCELLENCE بھی ہیں جعفری صاحب کے تعارف کے بعد اردو کے بارے میں روپرٹ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ یہ زبان دور دراز کا سفر طے کرتے ہوئے کینیڈا ابھی دو تین عشرے ہوئے پہنچی ہے مگر اس نے اتنی مضبوطی سے اپنے قدم یہاں جمائے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وہ یہیں کی ایک ساختہ پرداختہ زبان ہے کینیڈا کی زبانوں کی FAMILY میں وہ اس طرح گھل مل گئی ہے جیسے اس کی پرورش اسی سرزمین پر ہوئی ہو[1]۔

[1] جعفری صاحب اور ٹونی روپرٹ کی تقریر کے متن وڈیو ٹیپ پر موجود ہیں اگر کسی کو ان کا متن درکار ہو تو WRITERS FORUM OF PAKISTANI CANADIANS سے حاصل کیا جا سکتا ہے

اس کے بعد وقفہ کا اعلان ہوا۔ دوسری نشست میں بیرونی ممالک سے آتے ہوئے شعرائے کرام نے اپنا کلام سنایا۔ عشرت آفرین کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کینیڈا کے اتنے عظیم مشاعرے میں شریک ہو رہی تھیں مگر لوگوں نے ان کو توجہ سے سُنا۔ مشاعرے میں سب سے زیادہ داد احمد فراز کو ملی۔ لوگوں کا اشتیاق ان کو سننے کے لئے اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر وہ رات بھر سناتے رہتے تو لوگ خاموشی سے رات بھر ان کا کلام سنتے رہتے۔ جب تھک کر وہ اپنی نشست پر جا بیٹھے تب بھی لوگوں نے تالیاں بجانا بند نہ کیا۔ جعفری صاحب کی فراخ دلی اور وسعتِ قلبی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ وہ احمد فراز کا ہاتھ پکڑ کر خود پوڈیم تک لے گئے اور اس سے خود فرمائش کی کہ کچھ اور سنائیں انہوں نے ایک غزل کے چند شعر ارشاد کئے ؎

گِلے فضول تھے عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چپ رہا ستم ناروا کے ہوتے ہوئے
وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے
نہ کر کسی پہ بھروسہ کہ کشتیاں ڈوبیں
خدا کے ہوتے ہوئے ناخدا کے ہوتے ہوئے
مگر یہ اہلِ ریا کس قدر برہنہ ہیں
گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے

اور اب باری تھی صاحبِ صدر کی۔ جعفری صاحب نے ابتدا کچھ اس طرح کی ؎

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

یہ اشعار سننا تھے کہ محفل کا رنگ بدلا۔ لوگوں کے موڈ بدلے۔ ساری فضا ہی بدل گئی اور پھر انہوں نے دوسری نظم سنائی ؎

آئے ہم غالب و اقبال کے نغمات کے بعد
مصحفِ عشق و جنوں، حُسن کی آیات کے بعد
اے وطن خاک وطن وہ بھی تجھے دیدیں گے
بچ گیا ہے جو لہو اب کے فسادات کے بعد
رام و گوتم کی زمیں حرمتِ انساں کی زمیں
بانجھ ہو جائے گی کیا خون کی برسات کے بعد

اور پھر انہوں نے وہ نظم جو استقبالیہ میں سنائی تھی "دولتِ دنیا کا حساب" سنائی اور پھر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ؎

جعفری صاحب کینیڈا میں

جعفری نمبر

پروفیسر ضیا ارملگ

یہ دو ورق ہیں زمین اور آسمان جن پر
صحیفۂ ملاقات تحریر ہو رہا ہے

اور یہ بھی کہا ہے

میرے خلاف اٹھایا قلم حریفوں نے — چراغ اور بڑھا اور سربلند ہوا
کہ اپنی ذات کو اتنی بلندیاں دے دو — کسی کا سنگِ ملامت وہاں تک آ نہ سکے
صدائے کوئے ملامت تلاش کرتی ہے — مگر نوائے بہار آشنا کو پا نہ سکے
چراغِ علم و ہنر کو کوئی بجھا نہ سکے

اور یہ کہ " تاجِ گل بنتا ہے جب ہاتھ قلم ہوتا ہے " یہ جعفری صاحب کا ایمان ہے۔ اور یہی ان کا عقیدہ اور یہی سبب ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ

گفتگو بند نہ ہو۔ بات سے بات چلے — صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے

جعفری صاحب سے دیر تک شعر سنے گئے اور وہ دیر تک پوری دلچسپی کے ساتھ شعر سناتے رہے اور پھر یہ محفلِ ادب اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن گویا ان تقریبات کے آخری دن ایک مذاکرہ اور مقالوں کا سیشن تھا۔ رائل پارک ہوٹل جو ایک زمانے تک ٹورنٹو کے سب سے عالیشان ہوٹلوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے ایک خوبصورت سے لاؤنج میں لنچ کے انتظام کے ساتھ یہ محفل منعقد ہوئی۔ پہلے اجلاس کی صدارت احمد فراز کے سپرد تھی اور مقررین میں ڈاکٹر شارب ردولوی اور ڈاکٹر قمر رئیس جیسی مقتدر ہستیوں کے نام شامل تھے۔ جعفری صاحب کی حیثیت مبصر کی تھی۔

دوسرے سیشن میں احمد فراز اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مضامین پیش کئے بعد میں جعفری صاحب نے فرمایا کہ اقبال کی شخصیت لکھنؤ کی غزل زدگی، لسانی عصبیت اور سیاسی تنگ نظری کا شکار ہوگئی۔ پھر بھی پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو نصف شب کو آزادی کی خوشی میں جو ترانہ بجایا گیا تھا وہ ڈاکٹر اقبال کی نظم " سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا " ہی تھی۔ انہوں نے یہ بھی بتلایا کہ اقبال کی قدر و منزلت اور ان کی عظمت ہندوستان میں پاکستان سے کچھ کم نہیں۔ بلکہ بعض لحاظ سے کچھ زیادہ ہی ہے یہ بات علیحدہ ہے کہ اقبال پاکستان میں ایک FATHER IMAGE کی شکل میں ابھرے جبکہ ہندوستان میں ان کی خلاقانہ صلاحیتوں، ان کے کلام کی شیرینی اور موضوعات کی لذت آفرینی کا جائزہ لیا گیا۔ پاکستان میں وہ شاعرِ اسلام کے مرتبے کو پہنچے تو ہندوستان میں انسان دوست کی حیثیت سے یاد کئے گئے کہ عظمتِ انسانی ان کے کلام کا بنیادی موضوع ہے اور اقبال نے جو اسلامی استعارہ استعمال کیا ہے اور جس سے تمام دنیا کے مکاتبِ فکر نے فائدہ اٹھایا ہے وہ بھی انسان شناسی کا علمبردار ہے وہ نہ مابعد الطبیعاتی طبقوں میں گم تھے اور نہ ہی فلسفۂ زندگی سے گریزاں۔ ان کے نزدیک قرآن تو انسانی روایات اور معتقدات کا سب سے بڑا ترجمان ہے۔ اقبال انسان کی تلاش میں سرگرداں رہے اور یہی ماحصل ہے ان کے احساسات نظریات اور اعتقادات کا۔

جعفری صاحب کی تقریر کے بعد کچھ ROUTINE باتیں انجام پائیں مثلاً شرکاء کا شکریہ۔ سامعین کا شکریہ اور پھر یہ دلچسپ اور فکر انگیز محفل اختتام کی منزلوں میں داخل ہوئی

اسی وقت فورم نے یہ فیصلہ کیا کہ جعفری صاحب کا کلام کلیات کی شکل میں کینیڈا سے شائع کیا جائے گا اور یہ کوشش اب اپنی آخری مراحل میں ہے۔

جعفری صاحب سے میری ملاقات گذشتہ دنوں لکھنؤ میں فراق سیمینار کے سلسلے میں ہوئی جو آخر فروری ۱۹۹۰ء کو منعقد ہوا۔ میں یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ ان کی آواز میں وہی کھنک تھی جو سن ۱۹۸۰ء میں تھی جب وہ پہلے پہل کینیڈا تشریف لائے تھے۔ ان کے چہرے پر وہی تروتازگی تھی جواب سے دس سال پہلے تھی۔ وہی بالوں پر ہاتھ پھیرنے کا انداز تھا۔ تقریر میں وہ زور بیان اور لہجہ میں وہی آہنگ تھا جو شاید شروع ہی سے ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔ سمینار کے پانچوں سیشن میں انہوں نے بحیثیت صدر۔ مقرر۔ مبصر۔ مفسر۔ اور شارح حصہ لیا۔ مشاعرے میں بحیثیت شاعر شرکت کی، مگر شعر نہیں پڑھے۔ ایک نجی محفل میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اور ان کو قریب سے دیکھنے کا پھر موقع ملا۔ یہ محفل جناب پرکاش چندر نے جو ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار اور اب تبصرے لکھتے ہیں۔ اپنے گھر رکھی تھی اور جس میں میرے اور جعفری صاحب کے علاوہ قتیل شفائی، حمایت علی شاعر، ندا فاضلی، زبیر فاروقی اور دو ایک اور حضرات شریک تھے جعفری صاحب وہاں ایسی بے تکلفی سے چہک رہے تھے جیسا کہ میں نے انھیں فیض صاحب کے ساتھ کینیڈا میں گرم گفتگو پایا تھا۔ وہی بے تکلفی وہی سج دھج۔ وہی ہنستا ہوا چہرہ، وہی لمبے لمبے شانوں پر بکھرے بال۔ بات چلی "دامن یوسف" کتاب کی۔ میں نے کہا وہ بڑی SCANDALOUS BOOK ہے جعفری صاحب بولے میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اور پھر اپنی بات منوانے کے لئے دلائل دینے لگے اور میں خاموشی سے ان کی باتیں جو وہ مدھر مدھر انداز میں کر رہے تھے سنتا رہا۔

(کینیڈا سے) ▼

انتخابِ کلام

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

(علی سردار جعفری)

: مرتبہ :

حمایت علی شاعر
اشفاق حسین

علی سردار جعفری کی شعری تصانیف

۱۔ پرواز۔ ۱۹۴۴ء
۲۔ جمہور۔ (ایک سیاسی مثنوی) ۱۹۴۶ء
۳۔ نئی دنیا کو سلام (ایک منظوم تمثیل ۔۔ اور مثنوی "جمہور") ۱۹۴۷ء
۴۔ خون کی لکیر۔ ۱۹۴۹ء
۵۔ امن کا ستارہ (تین طویل نظمیں ۔۔ سوویت یونین اور جنگ باز ۔۔ اسٹالن کتھا ۔۔ اور امن کا ستارہ (ایک شاعرانہ تقریبا) ۱۹۵۰ء
۶۔ ایشیا جاگ اٹھا (طویل منظوم تاریخی تجزیہ) ۱۹۵۰ء
۷۔ پتھر کی دیوار (جیل کی نظمیں) ۱۹۵۳ء
۸۔ ایک خواب اور۔ ۱۹۶۵ء
۹۔ پیراہن شرر۔ ۱۹۶۶ء
۱۰۔ لہو پکارتا ہے۔ ۱۹۷۸ء
۱۱۔ نومبر ۔۔ میرا گہوارہ (منظوم خودنوشت سوانح) زیر تصنیف

پرواز

(پہلا مجموعۂ کلام (۶۳) نظمیں اور غزلیں)

انتساب ——— پورن چند جوشی کے نام

پیش لفظ ——— سردار جعفری

مقدمہ ——— مجنوں گورکھپوری

اشاعتِ اوّل ——— ۱۹۴۴ء

ناشر ——— اشاعت گھر حیدرآباد دکن

کھل گیا در، پڑ گیا دیوارِ زنداں میں شگاف
اب قفس میں جنبشِ صد بال و پر ہونے کو ہے

سردار جعفری

(انتخاب)

۱۔ بغاوت
۲۔ ایک خط کا جواب
۳۔ فراموش کردند عشق
۴۔ مزدور لڑکیاں
۵۔ سرمایہ دار لڑکیاں
۶۔ خواب و خیال
۷۔ ایک سوال

بغاوت

بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر بغاوت ہے خدا میرا

بغاوت رسمِ چنگیزی سے تہذیبِ تتاری سے
بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت سرسوتی سے لکشمی سے بھیم و ارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے
بغاوت وہم کی پابندیوں سے قیدِ ملّت سے
بغاوت آدمی کو پیسنے والی مشیّت سے
بغاوت عزّت و پندار و نخوت کی اداؤں سے
بغاوت بوالہوس ابلیس سیرت پارساؤں سے
بغاوت زرگری کے مسخ مذہب کے ترانوں سے
بغاوت عہدِ پارینہ کی رنگیں داستانوں سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے
بغاوت عظمتِ رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے
بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے

بغاوت درد سہنے سے بغاوت دکھ اٹھانے سے
بغاوت ایک انساں کے سوا سارے زمانے سے

بغاوت حریت کے دیوتا کا آستانہ ہے
بغاوت عصرِ حاضر کے سپوتوں کا ترانہ ہے

فراموش کردند عشق

دزدیدہ نگاہوں میں محبت کی چمک ہے
قائل ہوں ہمیشہ سے ترے کیفِ نظر کا
سینے کے تلاطم سے اُبلتی ہے جوانی
در کھول دیا کس نے خمستانِ سحر کا
ہونٹوں پہ ہے بہکا ہوا ہلکا سا تبسم
اک پھول ہے شاعر کے گلستانِ ہنر کا
زلفوں کی گرہ رات کے آنچل کی شکن ہے
ماتھے پہ ہے ٹیکا کہ ستارہ ہے سحر کا
کیا مستیٔ رفتار ہے کیا لغزشِ پا ہے
رقصاں ہے ہر اک ذرّہ تری راہگذر کا
اس جنتِ نظارہ کو آباد کرے کون؟
غمگین ہو جب روح تو دل شاد کرے کون؟

ایک خط کا جواب

(جیل میں ایک دوست کا پہلا خط)

یہ ترا چھوٹا سا خط تیری محبت کا پیام
کر رہا ہے دل سے سرگوشی نگاہوں سے کلام

اس کی خاموشی میں ہے تیرے تکلم کی نمود
توڑ ڈالا اس نے آ کر قید خانے کا جمود
آرزوئیں ناچ اٹھی ہیں دلِ بے تاب میں
کتنی قندیلیں ہیں روشن وقت کی محراب میں
لوٹ آئے ہیں پرانی زندگی کے ماہ و سال
مسکراتی ہے تمنّا رقص کرتا ہے خیال
آج روحِ شادمانی کس قدر مخمور ہے
آج دل احساسِ ناکامی سے کوسوں دور ہے

جنوری ۱۹۴۱ء
بنارس سینٹرل جیل

دامن جھٹک کے منزلِ غم سے گزر گیا
اٹھ اٹھ کے دیکھتی رہی گردِ سفر مجھے

مزدور لڑکیاں

گردشِ افلاک نے گودی میں پالا ہے انھیں!
سختیٔ آلام نے سانچے میں ڈھالا ہے انھیں
گھورتی رہتی ہے گرمی میں نگاہِ آفتاب
آسماں کرتا ہے نازل ان پہ کرنوں کا عتاب
سر پہ ساون کی گھٹا جاتی ہے منڈلاتی ہوئی
سرد جاڑوں کی ہوا سینوں کو برماتی ہوئی
بیکسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب
ساز ان کا سوزِ حسرت خامشی ان کا رباب
سر سے پا تک داستانیں حسرتِ ناکام کی
نرم و نازک قہقہوں میں تلخیاں ایام کی

خشک لب، پھیکی نگاہیں، بے رونق چہرے، زرد گال
وہ دھنسی آنکھیں، فسردہ رنگ، گرد آلود بال
پپڑیاں ہونٹوں پہ زخموں کے اناروں کی طرح
گرم ہاتھوں پر عرقِ محنت ستاروں کی طرح
بوجھ کا مرہونِ منت اُن کے ابرو کا تناؤ
اُن کا حاکم ظلم اُن کا پاسباں بے جا دباؤ
ان کے ساتھی پھاوڑے، ان کی سہیلی ہے کدال
زندگی پر یہ وبال اور زندگی اُن پر وبال
لیکن ان کی پستیوں کو اپنی رفعت سے نہ دیکھ
ان کی غربت پر نہ جا ان کو حقارت سے نہ دیکھ

اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب
ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشمِ انقلاب
ٹھوکروں پر ان کی جھک سکتے ہیں ایوان و قصور
توڑ دیتی ہیں ہتھوڑوں سے چٹانوں کے غرور
ان کی چوٹوں پر نکلتے ہیں پہاڑوں سے شرار
یہ اگر چاہیں الٹ ڈالیں بساطِ روزگار

بن کے قوت ایک دن اُبھرے گی صدیوں کی تھکن
دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظامِ انجمن

سرمایہ دار لڑکیاں

شہر کے رنگیں شبستانوں کی تنویریں ہیں یہ!
نوجوانی کے حسیں خوابوں کی تعبیریں ہیں یہ

ہے انھیں کے دم سے مصنوعی تمدّن کی بہار
ہیں یہی تہذیب کے آزر کدے کی شاہکار
دیدنی ان کی بہشتِ کیف و فردوسِ نشاط
خوش رُخ و خوش پیرہن خوش پیکر و خوش اختلاط
محفلوں کی شادمانی رقص گاہوں کا سرور
دل کے کاشانوں کی آبادی طرب گاہوں کا نور
اک لطافت اک نزاکت نطق گوہر بار کی
اک شعاعِ نور شاعر کے تجلّی زار کی
اک مغنّی کے نفس کا نغمۂ کیف و بہار
اک مصوّر کے قلم کی جنبشِ بے اختیار
بزم آرائی کی خو ذوقِ کم آمیزی کے ساتھ
جنبشِ مژگاں بھی اک شانِ دلآویزی کے ساتھ
گردنوں کا خم، کمر کا لوچ سینوں کا اُبھار
صندلی ہاتھوں سے بُت خانوں کی صبحیں آشکار
قہقہے سوئے ہوئے جذبے جگانے کے لیے
گفتگو ہر سننے والے کو لُبھانے کے لیے
بے قرار آنکھیں دلوں کو دعوتیں دیتی ہوئی
نوجوانی بار بار انگڑائیاں لیتی ہوئی
ولولے ہر ہر نفس زیر و زبر ہوتے ہوئے
دم بہ دم جھونکے ہوا کے تیز تر ہوتے ہوئے
سامنے اک بار آ جانا ٹھٹکنے کے لیے
نوجوانوں سے اُلجھ پڑنا جھجکنے کے لیے
اہرمن تو اہرمن ہو جائے یزداں بھی شکار
ان کا ہر انداز تاجر
ہر ادا سرمایہ دار

عشق کے ذوقِ نظر نے نکھارا ہے انھیں
مرد کی صدیوں کی محنت نے سنوارا ہے انھیں

ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں
یہ انار دبوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

خواب و خیال

زمانۂ ماقبلِ تاریخ کے انسان کا ذہنی تجزیہ

وقت

مسکراتے ہیں مناظر رقص کرتے ہیں نجوم
گنگناتی ہیں چٹانیں گا رہے ہیں آبشار
چھپ رہا ہے ابر کے پردے سے نورِ آفتاب
اور فضا میں پڑ رہی ہے ہلکی ہلکی سی پھوار
وقت کے میلے بدن پر دھاریاں ہیں نور کی
تھرتھراتے ہیں ہوا میں سیکڑوں چاندی کے تار
عارضِ گلرنگ پر صبحِ تمدّن کی نمو
گود میں تہذیبِ انسانی کا طفلِ شیرخوار
آنکھ میں ماضی کا جادو، رخ پہ مستقبل کا نور
انکھڑیوں میں ارتقا کے جامِ رنگیں کا خمار
اپنے سینے میں لیے انسان کے سینے کا جوش
دوش پر اپنے اٹھائے فکرِ انسانی کا بار

فکرِ انسانی

ٹوٹتی ہے کیوں شعاعِ مہرِ تاباں کی کمند
شب اٹھا لیتی ہے کیوں ناہید و پرویں کا ستار

رات کے ڈھلتے ہی پڑجاتی ہے پھیکی چاندنی
صبح ہوتے کیوں بکھر جاتا ہے تاروں کا غبار
جھوم کر اٹھتی ہے کیوں اودی فضاؤں میں گھٹا
کوہ و صحرا پر برس جاتا ہے کیوں ابرِ بہار
کیوں پلٹ جاتا ہے موسم کیوں بدل جاتی ہے رُت
کھیلتی ہے کیوں خزاں کی گود میں فصلِ بہار
موت اُڑا لیتی ہے کیوں گل فام رخساروں سے رنگ
ہے اجل کی نیند کا کیوں چشمِ ہستی میں خمار
رات کو ہوتا ہے کیوں گزرے مناظر کا ہجوم!
خواب میں رہتی ہے کیوں پیشِ نظر تصویرِ یار
ذہن کی تاریکیوں میں نور پھیلاتا ہے کون
کس کے نغمے ہیں سرودِ زندگی پر بیقرار
زیرِ دامانِ افق سے پھول برساتا ہے کون
کون ہوتا ہے شفق کے رنگ میں آئینہ کار
کون سوتا ہے ردائے برف میں لپٹا ہوا
کوہ کی چوٹی ہے کس دوشیزہ سینے کا ابھار
آندھیوں سے اس طرح سرگوشیاں کرتا ہے کون
گونجتی ہے وادیٔ کہسار میں کس کی پکار
کس کی ہیبت ہے کہ گیتی کا دہل جاتا ہے دل
"کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئے بار"
آسماں پر ہے یہ کس کے تازیانوں کی صدا
آرہا ہے کون یہ بادل کے گھوڑے پر سوار
اُٹھ رہا ہے کیوں پہاڑی کے کلیجے سے دھواں
ناچتا ہے کون یہ پہنے ہوئے شعلوں کے ہار

الاماں اے عالمِ فطرت کی ارواحِ عظیم
ہے حدِ ادراک سے باہر تمہارا اقتدار
ہے عناصر میں تمہارے حُسن و ہیبت کی نمود
آتش و آب و ہوا پر ہے تمہارا اختیار
تم وہاں رہتی ہو انسانی تخیل سے پرے
جس جگہ جھک کر زمیں کو آسماں کرتا ہے پیار
نذر لائے ہیں تمہاری بارگاہِ ناز میں
خوف کے مارے ہوئے مجبور انسانوں کی بار
دیکھ کر انساں کی پستی وقت بھی گھبرا گیا
ارتقا کے نرم ماتھے پر پسینہ آگیا

ارتقا

آہ اے ناداں خیالی دیوتاؤں کو نہ پوج
ذہن میں بنتے ہیں جو ایسے خداؤں کو نہ پوج
جو برستے ہیں یہاں بھی اور وہاں بھی ہم نشیں
ایسے آوارہ طبیعت بے وفاؤں کو نہ پوج
ہاں مرادیں اپنی ان گونگی چٹانوں سے نہ مانگ
قدر کر اپنے ارادوں کی دعاؤں کو نہ پوج
پوجنا ہے پوج اپنی فطرتِ آزاد کو
مشرق و مغرب کی آوارہ ہواؤں کو نہ پوج
گود میں سمٹی ہوئی رعنائیوں کو چھوڑ کر
وادی و کہسار کے رنگیں اداؤں کو نہ پوج
بھول کر اپنے سرودِ لذتِ گفتار کو
آسماں میں گونجنے والی صداؤں کو نہ پوج

یہ خدا یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مرجائیں گے

ایک سوال

معلوم نہیں ذہن کی پرواز کی زد میں
سرسبز امیدوں کا چمن ہے کہ نہیں ہے
لیکن یہ بتا وقت کا بہتا ہوا دھارا
طوفان گر و کوہ شکن ہے کہ نہیں ہے
سرمایے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسّم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

○

نئی دُنیا کو سلام

(نئی دنیا کو سلام) کو سردار جعفری نے ۱۹۴۶ء میں لکھا تھا۔ یہ تقریباً ۴۰۰۰ مصرعوں پر محیط ہے۔
اس کے آخر میں ایک سیاسی مثنوی "جمہور" بھی شامل ہے جو پہلی بار مارچ ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔
اس کا منظوم "حرفِ اوّل" ۱۰۰ اشعار پر اور مثنوی ۱۶۷ اشعار پر مشتمل ہے۔

پیش لفظ .... سردار جعفری

اشاعتِ اوّل ۔ مئی ۱۹۴۷ء

ناشر ۔۔ کتب پبلشرز بمبئی

> گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
> کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست
>
> نظیری

(انتخاب)

("نئی دنیا کو سلام" اس نمبر میں شائع کی جا رہی ہے)

سردار جعفری

نئی دُنیا کو سلام

حرفِ اوّل

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مار سیاہ
سیاہ چمن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے
سیاہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہل رہی ہے زمین
سیہ عقاب سیہ آسماں پہ چھائے ہوئے
سیاہ سینوں کو تانے ہوئے سیاہ پہاڑ
سیاہ موت کی دیوار سی بنائے ہوئے
سیاہ وادیٔ صحرا، سیاہ دریا ہیں
سیاہ دشت ہیں، سیہ کھیت لہلہائے ہوئے
سیاہ فیکٹری کی سیاہ چمنی پر
سیہ دھوئیں کے سیہ ابر تھرائے ہوئے
سیہ چراغ، سیہ روشنی، سیاہ لویں
سیاہ گھر میں سیہ جال سا بچھائے ہوئے
سیاہ کیڑوں کے مانند رینگتی مخلوق
سیاہ بھوت اندھیرے میں بلبلائے ہوئے

سیہ دوپٹوں کے آنچل سیہ جبینوں پر
سیہ لباس سیہ جسم کو چھپائے ہوئے
نشاں سیاہ لبوں پر سیاہ بوسوں کے
سیہ نشاط کی بدمستیاں سرائے ہوئے
سیاہ دودھ ہے ماں کے سیاہ سینے میں
سیاہ بچوں کو آغوش میں سلائے ہوئے
سیہ فضا میں سیہ تیر سنسناتے ہیں
سیاہ تیر سیہ زہر میں بجھائے ہوئے
سیاہ دار، سیہ پھانسیاں، سیہ پھندے
سیاہ ہاتھ سیہ گردنیں دبائے ہوئے
سیہ نشان بدن پر سیاہ کوڑوں کے
سیاہ زخم سیہ درد کو جگائے ہوئے
سیاہ جبر، سیہ عصمتیں، سیہ چیخیں
سیاہ عدل، سیہ کلغیاں لگائے ہوئے
سیاہ رنگ کے ساحر سیہ لبادوں میں
سیہ حصار، سیہ تیوریاں چڑھائے ہوئے

ضمیرِ عہدِ غلامی
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی
ضمیرِ عہدِ غلامی کی تیرگی ہے یہ رات
جو چھا رہی ہے اجالے سے منہ چھپائے ہوئے
کہاں ہے روشنیٔ آفتابِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ عظمتِ انساں کا آفتاب کہاں؟

پہلی تصویر

محبت نے کاڑھا ہے ظلمت سے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
(میر)

[اندھیرے سے دو شکلیں ابھرتی ہیں
جاوید دولھا بنا ہوا اور مریم دلھن]

نہاں ابر میں چاند کب تک رہے گا
بھلا عشق سے حسن کب تک چھپے گا
تو شرمائی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گل کو نسیم سحر سے
تو کیا میری فطرت کی محرم نہیں ہے؟
تو کیا میرے بچپن کی مریم نہیں ہے؟
گزاریں جو راتیں تری آرزو میں
سمٹ آئی ہیں کاکلِ مشک بو میں
جو پلکیں حیا سے جھکی جا رہی ہیں
وہ کچھ اور دل میں چھپی جا رہی ہیں
ترے رخ پہ حسن و محبت کا ہالہ
یہی ہے مری زندگی کا اجالا
یہ شفاف آنکھیں، یہ آنکھوں کے ڈورے
چھلک جائیں جیسے گلابی کٹورے

ترے ہاتھوں کو رنگ حنا مل گیا ہے
ہتھیلی [illegible] کو کنول کھل گیا ہے
محبت کی راتوں کی قندیل تو ہے
جوانی کے خوابوں کی تکمیل تو ہے
[illegible] آج کی تیرگی [illegible]
ترے حسن سے روشنی میرے گھر [illegible]
[illegible] نغموں [illegible] دنیا جگا دے
تبسم [illegible] ہونٹوں کو [illegible]
[illegible] مسکراتی ہے؟

تری مسکراہٹ میں کیا دل کشی ہے
یہ پھولوں پہ سوئی ہوئی چاندنی ہے
مگر روح کی پیاس کیونکر بجھے گی؟
سمندر سے کیا برف شبنم کی ہوگی؟
محبت ہے، نغمہ ہے، [illegible]
مرے واسطے [illegible]
تری ناشکی [illegible]
تجاہل ہے تیرا بڑا عاشقانہ
ہمارے دلوں کی ہے حسرت پرانی
ہماری شراب محبت پرانی
وہ گزری ہوئی شام ہے یاد اب تک
وہ [illegible] میرے سینے میں آباد اب تک
زمیں آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
دھندلکے کی پرچھائیاں ناچتی تھیں
ہر اک سمت انگڑائیاں ناچتی تھیں
افق پہ کرن خواب سا بن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی

رخسار و رخ و دل پہ تھے بارش سے جھکائے
جھکی تھی مرے پاس گردن جھکائے
گھٹائیں اپنی برسا رہی تھی
ترے پیراہن سے مہک آ رہی تھی
ترے سر سے آنچل جو ڈھلکا ہوا تھا
مرے خون میں ساز سا بج رہا تھا
اسی رات کس طرح پلکیں جھکی تھیں
دھڑکتا تھا دل اور نبضیں رکی تھیں
کیا پیار سورج نے جھک کر زمیں کو
سجایا ستاروں سے شب نے جبیں کو
پھسل کر سیہ زلف شانوں پر آئی
ترے رخ پہ اک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اٹھا کر
کہا پھر اشاروں میں کچھ مسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے
محبت کا پہلا پیا جب جام ہم نے
اسی جام نے ہم کو سرشار رکھا
ہماری تمنا کو بیدار رکھا
جدائی میں بھی صبر کرنا سکھایا
ہمیں آگ پر سے گزرنا سکھایا
مرادوں کی مانگی ہوئی رات ہے یہ
کہ بچھڑے ہوؤں کی ملاقات ہے یہ

(مریم جاوید کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور پھر پلکیں جھکا لیتی ہے، اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے آنسو ٹپک پڑتے ہیں اور چمپئی رخساروں پر چاندی کی دو لکیریں سی کھنچ جاتی ہیں)

مریم

مری ساری دولت محبت کے آنسو

جاوید

محبت کے آنسو، مسرت کے آنسو
یہ آنسو ہیں ٹوٹے دلوں کے سہارے
یہ تقدیرِ آدم کے روشن ستارے
تری ساری ہستی تری چشمِ نم میں
مرے گھر کی برکت ہے تیرے قدم میں
ہر اک رنج و راحت کی ساتھی ہے عورت
جہنم کو جنت بناتی ہے عورت
جبیں پر تجلی کی انجم فشانی
نظر میں زلیخا کی ہنستی جوانی
وہ مطلوب بھی ہے طلبگار بھی ہے
وہ غمخوار بھی اور دلدار بھی ہے
وہ ہے ساز بھی، نغمہ بھی، نغمہ گر بھی
گلستاں بھی، گل بھی، نسیمِ سحر بھی

مریم

مجھے بھی تو ہے یاد وہ رات اب تک
ہیں مٹھی میں میری وہ لمحات اب تک
کلی کی طرح جو کھلے جا رہے تھے
جو گھل کر لہو میں ملے جا رہے تھے
تمنائیں لہراتی تھیں خواب بن کر
برستے تھے جگنو اندھیرے سے چھن کر
حجاب اٹھ گئے تھے زمان و مکاں کے
دریچے تھے والذّتِ جاوداں کے

رگوں میں مری دوڑتے تھے شرارے
ترے گرد تھے رقصاں نئے چاند تارے
وہ رات آئی تھی ایک طوفان بن کر
سمندر کے سینے کا ہیجان بن کر
محبت کی کیف آفریں رات تھی وہ
جوانی کی سب سے حسیں رات تھی وہ

جاوید

وہ رات آج تک حسن برسا رہی ہے
وہ رات آج کی رات بنا رہی ہے

دوسری تصویر

باغ کے آغوش میں گل چاہیے
زندگانی میں تسلسل چاہیے
(جعفری)

جاوید کا گیت

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے
اندھیرا سمت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی تبسم کو چرائے ہوئے
ابھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے
جبیں پہ قوس قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمار نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنا کے شوخ پھولوں سے
سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے سجائے ہوئے

وہ چاند لیے رقص ستاروں کے نرم جھرمٹ میں
ستارے سرخ دوپٹے کے جگمگاتے ہوئے
دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں
نظر کو شرم سے آنکھوں میں اپنی چھپائے ہوئے
کلائیوں اور ہاتھ بازوؤں کی لرزش میں
شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے وہ خود اپنی فضا میں سمٹی لیے قریب
ابھری ایسی ہوئی دل میں پائل کھلائے ہوئے
وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی
حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے
بھووں پہ تنی ہی انکار کی حسین شکنیں
لبوں پہ اپنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے

مریم

نہ محبت کی منزل ہے عورت
تڑپتا مچلتا ہوا دل ہے عورت
پر اس کے زمان و مکاں اور بھی ہیں
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"
ابھرتی ہوئی وقت کے ساحلوں سے
گزرتی ہے وہ کتنی ہی منزلوں سے
کبھی جام بن کر چھلکتی ہے عورت
کبھی اشک بن کر چمکتی ہے عورت
وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے
کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسم نہیں صرف، تلوار بھی ہے
وہ نغمہ نہیں صرف، جھنکار بھی ہے
محبت کی مسند پہ حسن و جوانی
شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی

وہ شمع شبستاں ہے، نورِ سحر ہے
وہ ہر گام پر رہبرِ آتشِ سفر ہے
مگر سب سے بڑھ کر تو یہ ہے کہ ماں ہے
وہ تخلیق کے دل کا سوزِ نہاں ہے
صدف کی تہوں میں ہے موجِ گہر بھی
گلوں میں بہاروں کا جی ہے اور ثمر بھی
نگاہوں میں ہے شعلۂ ناز سرکشانہ
جبیں پر مگر عظمتِ مادرانہ
وہ عورت کی نسوانیت کا چمن ہے
یہ عورت کی روحانیت کی جھلک ہے
جوانی کو شاداب کرتی ہے عورت
محبت کو سیراب کرتی ہے عورت
ہے انساں کی کائنات اس کے دم سے
فروزاں ہے شمعِ حیات اس کے دم سے
جس آنچل کو بچے پہ وہ ڈالتی ہے
جس آغوش میں طفل کو پالتی ہے
اس آنچل میں ہے زندگی کا ستارہ
وہ آغوش ہے تہذیب کا گہوارہ
محبت کی راتوں کی شیرینیوں کو
جوانی کی پرکیف رنگینیوں کو
نگاہوں کے رس کو لبوں کی شکر کو
مہکتے تبسم کے گلہائے تر کو
نیا رنگ اور روپ دیتی ہے عورت
نئی شکل میں ڈھال لیتی ہے عورت

مریم

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
رگ و پے میں کوئی سمایا ہوا ہے
مری روح پر رنگ چھایا ہوا ہے
کوئی دل میں انگڑائیاں لے رہا ہے
مرے خون میں کشتیاں کھے رہا ہے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
مرے ذہن میں چل رہی ہیں ہوائیں
امڈتی ہوں جیسے سنہری گھٹائیں
بگڑتی ہیں، بنتی ہیں، شکلیں، فضا میں
مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں
یہ اک موجِ طوفاں ہے جو بڑھ رہی ہے
ندی سی دم بدم جسم پر چڑھ رہی ہے
نگاہوں پہ نشہ سا چھانے لگا ہے
ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے
زمیں، آسماں، چاند، سورج، ستارے
مجھے دور سے کر رہے ہیں اشارے
بہاریں مری رازداں ہو گئی ہیں
ہوائیں مری ہم زباں ہو گئی ہیں
نسیمِ سحر گدگداتی ہے مجھ کو
کلی دیکھ کر مسکراتی ہے مجھ کو
اک ارمان آغوش میں پل رہا ہے
تصور مرا گھٹنیوں چل رہا ہے
لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

جاوید

جو کونپل تھی کل اب ہے پھولوں کی ڈالی
تو ہے میرے بچے کی ماں بننے والی

جادید

حیاتِ بشر ہے بڑی شاعرانہ
محبت ہے جس کی بقا کا بہانہ
وہ نغمہ جو بنتا ہے سرگوشیوں سے
جو ہوتا ہے پیدا ہم آغوشیوں سے
لرزتی ہیں پلکیں، سمٹتے ہیں ابرو
پھڑکتے ہیں پہلو، مچلتے ہیں بازو
تڑپتے ہیں دل اور دھڑکتے ہیں سینے
جوانی نکلتی ہے لے کر سفینے
چمکتے ہیں ماتھے، دمکتے ہیں چہرے
مہکتے ہیں پھولوں کے شاداب سہرے
بکھرتا ہے صندل، چھلکتی ہے افشاں
لچکتی ہیں شاخیں، چٹکتی ہیں کلیاں
ابھرتے ہیں جلوے بکھرتے ہیں جلوے
بکھرتے ہیں جلوے، سنورتے ہیں جلوے
ڈھلکتے ہیں گیسو، سرکتے ہیں آنچل
امنڈتے ہیں بادل، برستے ہیں بادل
یونہی اڑ رہا ہے نشاں زندگی کا
ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے
کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

تیسری تصویر

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی
(اقبال)

(ہزار) پھٹے ہوئے کپڑوں کے ٹکڑوں
سے اپنے ہونے والے بچے کے لئے
ایک چھوٹا سا کرتہ سی رہی ہے۔
کپڑے کے ٹکڑے مختلف رنگوں
کے ہیں۔ پس منظر سے کورس کی آواز

زندگی کا ترانہ

یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ہوائیں مشک بار ہیں فضائیں زرنگار ہیں
افق کے کوہسار ہیں شفق کے آبشار ہیں
نجوم شاخِ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ترانہ ہائے چنگ ہیں رُدِ موجِ گنگ میں
تبانِ آذری مچل رہے ہیں خشت و سنگ میں
سفینۂ آفتاب کارواں ہے نور و رنگ میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ہمالیہ کی چوٹیاں فلک سے ہمکنار ہیں
حقیر جن کے سامنے جہاں کے تاجدار ہیں
یہ ایشیا کی آبرو، یہ ہند کا وقار ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
تڑپ رہی ہے موجِ بحرِ عشق ماہتاب میں
ہمیشہ کشمکش میں ہے ہمیشہ اضطراب میں
ہمیشہ سوز و ساز میں ہمیشہ پیچ و تاب میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نسیمِ صبح نکہتوں کے کارواں لیے ہوئے
شمیمِ گل سے دل فریب کیفِ جاں لیے ہوئے
سرودِ دلنشیں میکدے کی مستیاں لیے ہوئے
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
دمکتے عارضوں کا رنگ، کاکلوں کی چھاؤں میں
ڈھلکتے آنچلوں کا رقص ریشمی ہواؤں میں
مچلتے قامتوں کی تھرتھراہٹیں فضاؤں میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
لبوں میں شہد انکھڑیوں میں رس شرابِ ناب کا
رباب زندگی پہ پہلا زمزمہ شباب کا
سبق دلوں کے مکتبوں میں عشق کی کتاب کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
جواں لبوں کی مسکراہٹوں میں گل فشانیاں
عرق عرق جبیں کی تابشوں میں کہکشانیاں
شکستِ حسن میں بھی فتحِ حسن کی کہانیاں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
چمن میں گونجتا ہے نغمہ بلبلِ حیات کا
شگفتہ اور رنگ ہو گیا گلِ حیات کا
طفولیت ہے معجزہ تسلسلِ حیات کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئبار میں
ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بے قرار ہیں کسی کے انتظار میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ہیں ذرہ ہائے آتشیں سرشتِ کائنات میں
رواں انہیں کا گرم خون ہے رگِ حیات میں
مگر یہ قوتیں ہیں آج آدمی کے ہات میں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
شکستہ ہے ہر ایک حلقہ قسمتوں کے دام کا
فضائے نیلگوں پہ سکہ ہے بشر کے نام کا
یہ مہر و ماہ و مشتری؟ سفر ہے ایک گام کا
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
یہ برق و باد و رعد سب اسیر ہیں غلام ہیں
عمل کے میکدے میں کامرانیوں کے جام ہیں
وہ نغمے پختہ ہو رہے ہیں اب تلک جو خام ہیں
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
سوارِ دوشِ کہکشاں یہ ہو رہا ہے آدمی
توہمات کی سیاہی دھو رہا ہے آدمی
خوشی کی مے میں اپنے غم ڈبو رہا ہے آدمی
یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
مگر غلام قوم کی گھٹی ہوئی ہے زندگی
مثالِ شمعِ مفلسی بجھی ہوئی ہے زندگی
سیاہیوں کے درمیاں گھری ہوئی ہے زندگی
اگرچہ یہ جہانِ آب و گل بہت حسین ہے
مگر غموں سے چور چور شیشۂ زمین ہے
(شور، نعرے، بندوقیں چلنے کی آوازیں)

مریم

ہر طرف شورِ محشر بپا ہے
شہر میں جانے کیا ہو رہا ہے
(داخل ہوتے ہوئے)

جاوید

تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی ہے
اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوئی ہے
دیکھ اس ننھی منی سی جاں کو
جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے
جب وہ دنیا میں آئے گا تو ماما کی محبت
تیرے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی
تیرے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں
جو محبت کی راتوں میں کھِل اٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگا جاتے تھے
اور شرما کے چاند ابر میں منہ چھپا لیتا تھا
اب انہیں چھاتیوں میں تری ماما کلبلائے گی
اور تو محبت سے بچے کو آغوش میں بھینچ لے گی
اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی بانہیں اٹھا کر
ڈال دیگا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے
گرم بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں
اور جب اپنے ہونٹوں سے، وہ پولے پولے پئے گا
ترا دودھ تو نو مہینوں کی کاری مشقت کی ساری تھکن
تیری رگ رگ سے کھنچ آئے گی
اور تجھے

اپنی بھرپور اٹھتی جوانی کا احساس ہوگا
جب وہ سوتے میں دیکھے گا، پریوں کے خواب
اور آہستہ سے زیرِ لب مسکرائے گا، تو تجھ کو معلوم ہوگا،
کہ ان ننھے معصوم ہونٹوں میں دنیا کے سارے
خزانے سمٹ آئے ہیں
پھر وہ جب گھٹنیوں چلنا سیکھے گا، اور ٹوٹے
ٹوٹے ہوئے لفظ تتلا کے بولے گا، تو
تجھ کو محسوس ہوگا، کہ تخلیق کا رقص و نغمہ،
سمٹ کر تری گود میں آ گیا ہے۔
یہ خوشی وہ ہے جس کے مقابل، زمانے کی جتنی
بھی خوشیاں ہیں سب ہیچ ہیں
لیکن اس ملک میں جس کو ہندوستاں کہتے ہیں
یہ خوشی بھی میسر نہیں
ہر طرف کال کی آندھیاں چل رہی ہیں
خاک سے اٹھ رہے ہیں وباؤں کے کالے بگولے
موت کی ڈائنیں چیختی اور چنگھاڑتی پھر رہی ہیں
مائیں بچوں کو آنچل کے نیچے چھپائے ہوئے
خوف سے کانپتی ہیں
ان کے کانوں میں ہر سمت سے یہ بھیانک صدائیں
چلی آ رہی ہیں
سوکھ جائیں گے ماؤں کے شاداب سینے
اور بچوں کے ہونٹوں سے اڑ جائے گی مسکراہٹ
ریگزاروں میں تبدیل ہو جائے گا یہ چمن
دودھ کی جس میں نہریں رواں ہیں
اور پھر تو بھی مریم
میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے

روتے ہوئے لال کو، دل کے ٹکڑے کو سنبھال
آہوں کی جلتی ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے
گی ان قحبہ خانوں میں جنھیں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے
ایک ٹکڑے کی خاطر جوانی نعمتیں گوشت کے
لوتھڑوں کی طرح بک رہی ہیں
تیرے مظلوم بچے کی چیخیں
دور تک تیری پرچھائیوں کا تعاقب کریں گی
خواب میں روح کو تیری آکر جھنجھوڑیں گی لیکن
تو کسی قحبہ خانے میں روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر
اپنے دل، جسم اور روح کو بیچ دے گی
اپنے ہاتھوں سے خود اپنی ہی ماتا کا گلا گھونٹ دیگی

مریم

آہ! ظالم حکومت

جاوید

روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی والہام بن کر اترتی نہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے ہوئے
گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
آہ یہ روٹیاں آسمانوں میں پکتی نہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
اس کی صدیوں کی محنت کا پھل
چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ایک دہقاں
اپنے لکڑی کے ہل اور لوہے کے پھل سے
کھیت کو جوتتا ہے
اپنی آنکھوں میں صدیوں کی بے چارگی، مفلسی
لے کے آتا ہے اور خاک سے پھوٹ
کو بڑے پیار سے دیکھتا ہے
اپنے روتے بلکتے ہوئے شیر خواروں کا دکھ بھول کر
اپنے ہاتھوں سے، بڑھتے ہوئے سبز پودوں
اس شوق سے سینچتا ہے
جیسے وہ اس کی گودوں کے پالے ہوئے لال ہیں
اور پھر نرم شاخوں میں گیہوں کے خوشے
موتیوں کی طرح پھلتے ہیں
اور دہقاں کی روح بے تاب ہو کر انھیں چومتی ہے۔
آسماں ناچتا ہے زمیں گھومتی ہے
کھیت کٹتے ہیں، کھلیان لگتے ہیں، پھر چکیاں گا
رہی ہیں، لڑکیاں گاتی ہیں
کتنے ہی ہاتھوں میں لاکھ اور کانچ کی چوڑیاں گنگنا
اور آگ کی آنچ میں تمتماتے ہیں رخسار
اس طرح گیہوں کے چاند سورج
گاؤں میں، شہر میں، ہر جگہ، جگمگاتے ہوئے چولہوں
ناچتے ہیں
روٹیاں، گندمی روٹیاں، سرخ سونے کے ترشے
گول ٹکڑے
چاند کی طرح گول اور سورج کے مانند گرم
روٹیاں شاخِ طوبیٰ میں پھلتی نہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں
وحی والہام بن کر اترتی نہیں
یہ انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
لیکن اس وقت انساں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیوں
عصمتیں بک رہی ہیں

عزتیں بک رہی ہیں
گولیاں چل رہی ہیں
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں
چکیاں چپ ہیں، خاموش ہیں، گاؤں کی لڑکیاں،
جو اب گنگناتی نہیں
کھیت کٹتے ہیں اب بھی
اور کھلیان لگتے ہیں اب بھی
لیکن اب گاؤں ویران ہیں
چند بازار کی رونقیں بڑھ رہی ہیں
لڑکیاں چکیاں چھوڑ کر در بدر ٹھوکریں کھا رہی ہیں
اور دہقاں کی آنکھیں جو پتھرا رہی ہیں
اپنی صدیوں کی بے چارگی، مفلسی اور تھکن کو لئے
اپنے بچوں کو فاقوں سے مرتے ہوئے دیکھتی ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

دیکھ اپنے برہنہ بدن کو
نوجوانی کے دل کش چمن کو
جس پہ افلاس رنگ خزاں کی طرح چھا گیا ہے
تیرا پیوند اور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح
ہنس رہا ہے
اور تو مجھ کو ایسی نظر آ رہی ہے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی روتی ہوئی ڈالیاں ہوں

ہم ہیں اس ملک کے بسنے والے
جس کے ڈھاکے کی ململ پہ دھوکا ہو آبِ رواں کا
ہم وہ تن زیب بنتے ہیں جس سے جواں صبح کی جوت
بادل سے چھنتی ہوئی چاندنی کی طرح پھوٹتی ہے
جامدانی کی نازک سبک چولیاں
جن کے ہر تار میں مسکراتی ہیں بیلے کی کلیاں
اور اس سے زیادہ حسیں کامدانی کے آنچل
چھاؤں میں جن کی سوتے ہیں تارے
اور وہ کشمیر کے ریشمی پیرہن
جن پہ قربان سنجاب و دیبا و اطلس
گرچہ یہ سب ہیں ملبوس ہندوستاں کے مگر ہم غلاموں
کو ان کے پہننے کا حق ہی نہیں
ان کا اب ذکر بے کار ہے
دستکاروں کے زخمی انگوٹھے
ڈیڑھ سو سال سے ظلم کی داستاں کہہ رہے ہیں
ہم کو تو کارخانے کا لٹھا
چھینٹ کا ایک ٹکڑا
موٹے کھدر کا کرتا
اور گاڑھے کا بھدّا کفن بھی میسر نہیں
سر کھلی عصمتیں پھر رہی ہیں
بے کفن میتیں سڑ رہی ہیں
ہاں مگر چور بازار میں دیش بھگتی کے بوروں میں لپٹے
ہوئے تھان کے تھان رکھے ہوئے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے میں
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

اپنے آباؤ اجداد کی اس زمیں پر
اس بہشتِ بریں پر
ہم کو اب چین سے سانس لینے کا حق بھی نہیں ہے
دیکھتا ہوں میں جب اپنے گھر کو
اس کے دیوار و در کو
اس کی گرتی ہوئی ٹوٹی چھت کو تو محسوس ہوتا ہے یہ گھر نہیں
جیل کی کوٹھری ہے
جس کی دیواروں سے تیرگی رس رہی ہے
یہ مکاں کیا ہے بیماریوں اور وباؤں کا گہوارہ ہے
اس کے کونوں میں ہر طرح کی لعنتیں پل رہی ہیں
لیکن ایسے بھی انساں ہیں جن کو یہ کوٹھری بھی میسر نہیں ہے
ان کے سر پر ہے چھت آسماں کی
اور چاروں طرف دھوپ گرد اور بارش
غصے میں پیچ و تاب کھاتے عناصر کی دیواریں ہیں
کتنی ہی عورتیں کتیوں اور بلیوں کی طرح اپنے بچے
گلی کوچوں میں جن رہی ہیں
ہم سے بہتر ہیں کیڑے مکوڑے
ان کے سر پر ہری گھاس کے سائباں ہیں
سبز پیڑوں کی ٹھنڈی گھنی چھاؤں میں طائروں کے حسیں
آشیاں ہیں
سانپ بچھو بھی آرام سے رہتے ہیں اپنے اپنے بلوں میں
بھیڑیئے اور گیدڑ پہاڑوں کے غاروں میں اور جنگلوں
کے درختوں کے نیچے
دھوپ گرد اور بارش سے بچ کر بڑے چین سے سوتے ہیں
لیکن انسان، معمار و خلاقِ انساں
آج انگریز کے راج میں گھر سے بے گھر ہوا ہے

دستِ فطرت نے کہسار و دشت و بیاباں بنائے
آدمی نے گلستاں بنائے
اپنے بازو کی قوت سے قصر اور ایواں بنائے
اس نے پتھر میں محراب کا لوچ مینار کا حسن پیدا کیا
اور دیواروں کو استقامت عطا کی
جن کے دروازے آغوشِ محبوب کی طرح وا ہو رہے ہیں
لیکن انگریز کے راج میں
ظالم انگریز کے راج میں
آج معمار و خلاقِ انساں
گھر سے بے گھر ہوا ہے

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

تیری ہم عمر کتنی ہی مائیں
کوئلے اور لوہے کی کانوں میں اپنی شکستہ جوانی میں
لیٹی ہوئی رو رہی ہیں
ان کے بچوں کی معصومیت چھن چکی ہے
دیو ہیکل مشینوں نے لوہے کے دانتوں سے ان کی خوشی
کو چبا ڈالا ہے
دیو ہیکل مشینوں کو انسان نے سیکڑوں سال کی کشمکش
اور مشقت سے پیدا کیا ہے
تب کہیں جا کے لوہے کے یہ ہاتھ حاصل کیے ہیں
جن کی نبضوں میں بجلی کی لہروں کا خوں دوڑتا ہے
وہ اگر چاہیں کوہِ گراں کو اٹھا لیں
کہکشاں کو زمیں پر بچھا لیں
کام کی لمبی گھڑیوں کو لمحوں میں تبدیل کر کے فراغت
کی مدت بڑھا دیں

مفلسی اور بے کاری سب کچھ مٹا دیں
خاک کو سونا پتھر کو پارس بنا دیں
لیکن ان آہنی ہاتھوں میں آج "سرمائے" نے چاندی
کی ہتھکڑی ڈال دی ہے
کارخانوں کے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے
اور مشینوں کے اعصاب جکڑے ہوئے ہیں
سخت لوہے کی نبضوں میں بجلی کا خون جم گیا ہے
اور بیمار "سرمایہ داری"
خون پی پی کے قے کر رہی ہے

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

آج انسان کی ان کنیزوں ۔ مشینوں ۔ کی طاقت پہ
"سرمایہ داری"
کتنی اترا رہی ہے
وہ مشینوں سے انسان کے دل کو برما رہی ہے
اور فراغت نہیں بلکہ بے کاری پھیلا رہی ہے
کالے کالے دھوئیں کے گھنے بادلوں سے وہ دولت کے
موتی نہیں مفلسی کے جراثیم برسا رہی ہے
دیکھو کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی ہی کھال
پہنے ہوئے پھر رہے ہیں
صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے اندھیرے
بلوں سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جا کر
اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کر کے
خوں آشام سرمائے کے جام میں ڈالتے ہیں
شام کو کارخانے اگل دیتے ہیں ان کو جھلسی ہوئی راکھ
کا ڈھیر کر کے
اور پھر رُت کے وقت طاعون، دق اور سِل کے
یہ بھوت
موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوکے دلوں
اور سوکھی ہوئی ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں
دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں ــــ
بھوک اور موت کے سائے میں ــــ
کتنے آزاد ہیں ہم

مریم

آہ ظالم حکومت

جاوید

آج "سرمایہ داری" وہ چنچل حسینہ نہیں جس کی بیباکی پر
بوڑھی جاگیرداری خفا تھی
جو ہواؤں سے لڑتی تھی طوفان سے کھیلتی تھی
جو سمندر میں دھوتی تھی زلفیں
گوندھ کر ان میں سورج کی کرنیں
صبح سے شام تک ناچتی تھیں
اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر
قہقہے مارتی تھی
آج "سرمایہ داری"
بوڑھی قحبہ ہے، دلالی ہے پیشہ اس کا
اب وہ اک سانس لیتی ہوئی لاش ہے
سالہا سال سے مر رہی ہے
قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوئی ہے
اس نے اپنی جوانی میں اپنی غلط کاریوں سے
کتنے بچے جنے ہیں

بھوک، بے کاری، افلاس، قحط و وبا، جہل، وہم، آتشک
بلغم، زہریلی گیس اور ایٹم کے بم اس کی گود میں
کے پالے ہوئے ہیں
اب یہ بچے جواں ہو گئے ہیں
زندگی کے لئے اک بلا ہو گئے ہیں
اور سرمایہ داری، اس بوڑھی چھنال ان کی طاقت سے
انسانیت کا لہو پی رہی ہے

مریم

ظلم اور جبر پر جی رہی ہے

جاوید

آج ہندوستان میں کوئی خوش نہیں ہے
پیٹ کو روٹی، ہاتھوں کو کام اور تن ڈھانپنے کے لئے
چیتھڑے بھی نہیں ہیں
خالی جو ہاتھ ہوں گے وہ بے کار کب تک رہیں گے؟
اک نہ اک روز تلوار پر جائیں گے
ہونٹ خاموش رہتے نہیں
وہ محبت کے بوسوں اور آسودگی کے ترانوں سے محروم
ہوں گے تو مجبور ہو کر
انقلاب اور بغاوت کے چھیڑیں گے نغمے
اور آزادی کے زمزمے گائیں گے
آج ایک ایک دریا میں طوفان ہے
کوہساروں کے سینے میں ہیجان ہے
ذرہ ذرہ بغاوت پر آمادہ ہے
سیکڑوں اور ہزاروں مجاہد قدم سے قدم کو ملائے
ہوئے بڑھ رہے ہیں
گولیاں سنسناتی ہیں اڑتے ہیں پرچم
بادشاہی کے گھر میں ہے ماتم
موت کی چھاؤں میں زندگی رقص فرما رہی ہے

مریم

مرحبا

جاوید

عہدِ نو آ رہا ہے
دولتیں، برکتیں، راحتیں، لذتیں لا رہا ہے
خاک کے بطن میں ان جنمی کونپلیں ناچتی ہیں
کھیتیاں لہلہانے کو بے تاب ہیں
گیہوں اور دھان کی نرم ناپیدا شاخیں
رنگ اور نور میں کھیلنے کے لئے مضطرب ہیں
خاک چلا رہی ہے کہ جاگیردار اور زمیندار نے اپنے
ناپاک قدموں سے مجھ کو نجس کر دیا ہے،،
خار زار اور بنجر زمینیں
کہہ رہی ہیں کہ گنگا کے پانی سے دھو دو ہمیں
پاک اور صاف کر دو ہمیں
تاکہ ہم اپنے مخمل کے پیراہنوں کو پہن کر
جشنِ صبحِ بہاراں منائیں
اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے
"کوئی آکر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انساں کی خدمت کریں گے"
ان کی آنکھوں میں اک خواب لہرا رہا ہے
ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی چرخیاں، گنگناتی ہوئی تکلیاں، سیکڑوں رنگ

کتے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لپکتی ہوئی انگلیوں سے
آسمانوں پہ قوسِ قزح کی حسیں چادریں بن رہی ہوں
ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں
کتنے دیوار و در، کتنے مینار جو سنگِ مرمر کے سینے میں
سوئے ہوئے ہیں
جو عدم کے اندھیرے میں کھوئے ہوئے ہیں
آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں
کاش صنّاع و معمار انہیں ان کے خوابِ گراں سے جگادیں
سنگ و خشت کے ڈھیر کو قصر و ایواں بنادیں
ہم اجنتا کے نقاش، بت گر ایلورا کے معمار ہیں تاج اور
سیکری کے
ہم وہ صنّاع ہیں انگلیاں جن کی پتھر کو موم کر کے سبک
اور حسیں شکل میں ڈھالتی ہیں
لیکن ان انگلیوں کو
ڈیڑھ سو سال کی مفلسی اور غلامی ــــ
ڈیڑھ سو سال کی کوڑھ نے کھا لیا ہے
آج ہندوستاں جاگ اٹھا ہے
یہ حسیں بوستاں جاگ اٹھا ہے
اس کی انسانیت اور روحانیت جاگ اٹھی ہے
بچے گہواروں سے رینگ کر آج باہر نکل آئے ہیں
اور انگریز سے اپنا کھویا ہوا بھولا پن مانگتے ہیں
عورتیں اپنی کھوئی ہوئی عصمتیں
مائیں بے آب سینوں کی شادابیاں مانگتی ہیں
دستکار اپنے مضبوط انگوٹھے
اور صنّاع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگِ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت و جبل اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا
ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں
صرف جینے کا حق مانگتے ہیں

چوتھی تصویر

آج سے کوچہ و بازار میں مرنا ہے روا
ظلم کی چھاؤں میں چپ بیٹھ کے جینا ہے حرام
(جعفری)

تاریخ کا ترانہ

میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے آنسوؤں کے شرار
روم و یونان کے غلام اٹھے
شیر پنجروں سے جیسے چھوٹ گئے
ظالموں کے محل لرزنے لگے
ہاتھ تھرائے، جام ٹوٹ گئے
آج تک گونجتے ہیں کانوں میں
ہم سے جاگتے کسانوں کے
روح میں میری زخم ہیں پنہاں

عہدِ وسطیٰ کے باغبانوں کے
میں نے دیکھیں طلوع ہوتی ہوئی
غازیوں کی حسین تلواریں
میری آنکھوں کے سامنے بیٹھیں
قلعوں کی بلند دیواریں
میری نظروں کے سامنے گزرے
انقلابِ فرانس کے پرچم
میرے سینے پہ ثبت ہیں اب تک
باغیوں کے جوان نقشِ قدم
میری نبضوں میں، میرے خون میں ہے
جوش زن وولگا کا سرخ ابال
نور افشاں ہے میرے ماتھے پر
روس کے انقلابیوں کا جلال
میں نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
آگ کے پھول، آگ کے گلزار
انکھڑیوں کے دہکتے انگارے
آہ کے شعلے، آنسوؤں کے شرار

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
سازِ آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمین
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سلگ اٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے
اگ رہی بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا ابلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا حال ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی
آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

بادباں کھل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جاں باز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزمِ جہاد
حریت ضو فگن جبینوں پر

وہ اٹھیں ایک لاکھ بندوقیں
گولیاں ایک لاکھ چلنے لگیں
جھپٹے وہ ایک لاکھ متوالے
ایک لاکھ آندھیاں بہنے لگیں

ہر سڑک پر سمندروں کا ابال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کر دے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

رہ گئیں ایک لاکھ سینوں میں
ٹوٹ کر ایک لاکھ شمشیریں
گر گئیں ایک لاکھ جبروتے
ٹوٹ کر ایک لاکھ زنجیریں

خون چہرے پہ مل کے اٹھی ہے
یہ ہے کشمیر کی دلہن کا سہاگ
ہر کلی بن گئی ہے چنگاری
شاخِ گل سے نکل رہی ہے آگ

حیدرآباد کے جوانوں کی
فوج میدان میں اتر آئی
پھر سے ٹیپو کی تیغِ جوہر دار
خون میں ڈوب کر ابھر آئی

ان حسیں زعفران زاروں میں
یوں تو ہر سال پھول آتے ہیں
اس برس کاسنی شگوفوں میں
زخم ہی زخم مسکراتے ہیں

بجلیوں کی طرح کڑکتی ہوئی
ٹولیاں آ گئیں کسانوں کی
کیا گھٹا جھوم کر برستی ہے
گونج ہے فتح کے ترانوں کی

جھیل ہے یہ کنول کے پھولوں کی
پاک اور صاف اس کا پانی ہے
مل گیا ہے لہو شہیدوں کا
آج ہر موج ارغوانی ہے

شور ہے، جوش ہے، تلاطم ہے
اڑ گئے ہوش حکمرانوں کے
جاگ اٹھے ہزار جوالا مکھی
آگ ابلنے لگی دہانوں سے

ہے یہ عرصہ گہِ ٹراونکور
ناز کر ناز اے زمینِ دکن
رقص کر رقص موجِ بحرِ عرب
مسکرا اے بہادروں کے وطن

اک طرف ظلم، اک طرف انصاف
فوج سے فوج آ کے ٹکرائی
جن کے دل میں تھا جوشِ قربانی
آج ان کی مراد بر آئی

بہہ رہے ہیں جوان جسموں سے
سرخ اور گرم خون کے دھارے
پھوٹ نکلے اُفق کے سینے سے
روشنی کے طلسمی فوارے

یہ انہیں عورتوں کی لاشیں ہیں
جن کے چہروں پہ رنگ تھا نکھار
آج دامن میں کھل رہے ہیں چمن
آنچلوں میں ٹکی ہوئی ہے بہار

خاک پر سو رہے ہیں جو بچے
اپنے ہی خون میں نہائے ہوئے
شامیوں کو شدید نفرت سے
دیکھتے ہیں نظر جمائے ہوئے

یہ ہیں وہ لال جو نشانی تھے
اپنے ماں باپ کی محبت کے
آج سے یادگار ہیں لیکن
ملک اور قوم کی شجاعت کے

مجھ سے کیا پوچھتی ہے اے "تاریخ"
کیا ہے ہندوستان کا تحفا؟
اس دہکتے ہوئے گلستاں سے
ایک دو سرخ پھول لیتی جا

فرنگی

تم کو معلوم ہے یہ جگہ کونسی ہے؟

جاوید

نہیں

فرنگی

یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف، عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستاں
کی رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے
دیکھو دیوار پر شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستاں کی
شبیہِ مبارک لگی ہے
جس کی آنکھوں میں رحم اور دل میں محبت بھری ہے
اس کے نزدیک آؤ
ہاتھ اٹھاؤ
اور قسم کھاؤ سچ بولنے کی

مریم

پہلے تم یہ بتاؤ کہ سچائی کی تاب بھی لاسکو گے؟

سچ تو یہ ہے کہ انصاف، عدل اور صداقت کی
قندیل ایوانِ شاہی میں روشن نہیں ہے

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ہاتھ میں سچ کا دامن
نہیں ہے

پتھروں کو پگھلتے ہوئے، ریگ زاروں میں چیونوں
کو کھلتے ہوئے ہم نے دیکھا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ اب کوئی ہندوستانی شاہِ برطانیہ کی
رعایا نہیں ہے

مریم

سچ تو یہ ہے کہ انگریز کے ڈیڑھ سو سال کے راج میں
ایک انساں نے بھی امن اور چین پایا نہیں ہے

جاوید

سچ تو یہ ہے کہ یہ اجنبی شخص جس کی شبیہِ مبارک
یہاں لاش کی طرح لٹکی ہوئی ہے
یہ نہ تو شاہِ برطانیہ ہے نہ شاہنشہِ ملکِ ہندوستاں ہے
اک فریب، ایک دھوکا ہے، اک وہم ہے اک
گماں ہے

فرنگی

چپ رہو چپ رہو شاہِ برطانیہ کے غلامو
چپ رہو
اپنا اعمال نامہ سنو
تم نے — جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو
ایک ایک گھر میں سوراج ہو
کھیتوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدور کی راج دھانی
تم پر الزام یہ ہے کہ تم
شاہ برطانیہ اور شہنشاہ ہندوستاں کی حکومت
سلطنت اور قانون ان کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
مختصر یہ کہ تم بدچلن ہو

جاوید

جانتے ہو ہماری نگاہوں میں تم کون ہو!
عصرِ حاضر کے فرعون ہو!
تم وہ قاتل ہو گردن پہ جن کی
ایک دو کا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں کا خوں ہے
تم وہ پاپی ہو کہ پاپ بھی شرم سے سرنگوں ہے
جب تم اس ملک میں آئے تھے ہم نے مہماں سمجھ کر
اپنی آنکھوں پہ تم کو بٹھایا
بھائی کہہ کر گلے سے لگایا
تم مگر مکر اور فن میں استاد نکلے
جنھیں سوداگروں کا بنایا تھا وہ اصل جلاد نکلے
بھائی سے بھائی کو تم نے آ کر لڑایا
خون پانی کی صورت بہایا
اور پھر اپنے آئین و قانون کے نام پر
اونچے قلعے بنائے
فوج لائے
منبروں پہ پہرے بٹھائے
ظلم اور جبر کے تازیانے لگائے
اور ہندوستاں کی بھری بستیاں لوٹ لیں
تم وہ ہو جن کے ہاتھ اپنے ہی محسنوں کے لہو میں بھرے ہیں

تم تو خود جانتے ہو کہ جس شے کو آئین و قانون کا نام تم نے
دیا ہے وہ کیا ہے
یہ ہے وہ تازیانہ جو سینکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ کو
ڈس رہا ہے
جس کی کرامات نے تباہی مچا دی
اپنی بیماریوں کی تاریکیوں میں لے کر
اسے لیے ایک ایک ملک اور ایک ایک دیس میں پھر رہے ہیں
یہ وہ کوڑا ہے جس کے لگائے ہوئے زخم انسان کے جسم اور
روح میں سڑ رہے ہیں
یہ وہ بجلی ہے جو سالہا سال سے مفلسوں کے گھروں پر
گر رہی ہے
یہ وہ تلوار ہے جو نہتوں کی سوکھی ہوئی گردنوں پر
برسہا سال سے پھر رہی ہے
یہ وہ مخمل ہے جس میں تمہارے تشدد کے خونخوار
پنجے چھپے ہیں
اپنے قانون کا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم نے
جابرانہ حکومت کا اچھا بہانہ بنایا ہے تم نے
لیکن اس ملک میں ایسے قانون کی دھجیاں اڑ چکی ہیں
ہم نے اپنے تڑپتے ہوئے دل کے جلتے ہوئے خون سے
اپنی بے غیرتی اور محکومیت کی سیاہی کو دھو ڈالا ہے
اب یہاں ایک آئین ہے ایک قانون ہے
جس کو ہم نے انقلاب اور بغاوت کی بھٹی میں
پگھلا کے اپنے عزم کے سانچے میں ڈھالا ہے

فرنگی

اور جاوید کی بیوی مریم
تم کو کیا کہنا ہے ؟

مریم

جب سے تم آئے ہو گھر کی سب برکتیں اڑ گئی ہیں
تم نے ہندوستاں کی لہکتی ہوئی کھیتیوں سے
ان کی زرخیزیاں چھین لی ہیں
تم نے اس ملک کے سبزہ زاروں کی شادابیاں
چھین لی ہیں
تم نے پھولوں کو کھلنے، ہواؤں کو چلنے سے روکا
تم نے چشموں کو بہنے سے، فواروں کو رقص کرنے
سے روکا
اور دریاؤں میں زہر گھولا
کل جہاں ناچتی تھیں بہاریں
دودھ اور شہد کی پڑ رہی تھیں پھواریں
آج ان وادیوں اور میدانوں میں قحط و افلاس کے
بھوت منڈلا رہے ہیں
اور آئین و قانون کے گدھ ہمارے
جسم کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں
تم کو معلوم ہے آج کیوں نوجوان عارضوں کے کنول
مسکراتے نہیں ہیں ؟
چاند سے ماتھے، سورج سے مکھڑے
کس لئے جگمگاتے نہیں ہیں ؟
تم نے بچپن کے پھولوں سے خوشبو چرائی
اور جوانی کے آئینے سے اس کی رونق اڑالی
تم نے ہنستی ہوئی مانگ اور مسکراتی جبینوں سے
افشاں چھڑالی
صندلی ہاتھوں سے ان کا رنگِ حنا
لے لیا ہے

جاوید

پھر بھی تم امن و تہذیب و اخلاق کا نام لے کر
اک نیا جال پھیلا رہے ہو
ساری دنیا کو بہکا رہے ہو

مریم

خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
امن و تہذیب کا نام کس نے مٹایا
کس نے دکھیاری ماؤں کے گڑیل جوانوں کو توپوں کا
ایندھن بنایا
کس نے شہروں کو اور بستیوں کو جلایا
کس کے بمبار برسوں سے دنیا کے سر پر موت کی راگنی
گا رہے ہیں
کس کے لشکر ہیں جو غیر ملکوں میں طاعون پھیلا رہے ہیں
خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
کس نے قبروں کو کھودا
اور لاشوں کو باہر نکالا
کس نے لاشوں کے ٹکڑے کئے کس نے مُردوں
کو کوڑے لگائے
کس نے آئین و قانون کے نام پر سولیاں گاڑ دیں
اور پھانسی کے پھندے بنائے
کس نے ماؤں کی گودوں سے بچوں کو چھینا
چیر کر کس نے معصوم بچوں کا سینہ
نرم، نازک، دھڑکتے دلوں کو چبایا
خود ہی اپنے گریباں میں منہ ڈال کر پوچھ لو
ملک میں انقلاب اور بغاوت کا طوفان کس نے
اٹھایا
تم جسے جرم کہتے ہو وہ اصل تہذیب ہے اصل اخلاق ہے
ظالموں کے خلاف انقلاب اور بغاوت
آدمیت کی معراج ہے
آدمیت کی معراج ہے

جاوید

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں
ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے کہسار
چلنے لگے ہیں
ریگ زاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں سے
سیلاب ابلنے لگے ہیں
کھیتیاں خاک کی گود سے اٹھ رہی ہیں
اب کی سال ان کی شاخوں میں ہنستے بھپلے ہیں
کارخانے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں ہتھوڑے
اٹھائے ہوئے آ رہے ہیں
اور لوہے کے پہیے
وقت و تاریخ کے تیز رفتار پہیوں کے مانند
انقلاب اور بغاوت کی رتھ میں لگے فتح کی راگنی گا رہے
ہیں
دیکھو کتنی ہی فوجیں افق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
بجلیاں ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں
بل پہ بل کھا رہی ہیں
یہ وہ روحیں ہیں جو رود کاویری کے ساحلوں پر
اور پلاسی کے میدان میں سیکڑوں سال سے سو رہی ہیں
یہ وہ اجسام ہیں غدر کے وقت جن کو
اپنی توپوں سے باندھا تھا تم نے
یہ وہ لاشیں ہیں جن سے ہزاروں کنوؤں اور

گدھوں کو پالا تھا تم نے
یہ وہی سر ہیں تم نے جنہیں گردنوں سے
جدا کر دیا تھا
یہ وہی گردنیں ہیں جنہیں تم نے پھانسی کا پھندا دیا تھا
یہ وہی ہاتھ ہیں جن میں اب تک
آہنی ہتھکڑی کے نشاں ہیں
یہ وہی پیر ہیں جن میں اب تک تمہاری پہنائی ہوئی
بیڑیاں ہیں
یہ وہی سینے ہیں جن میں دل کی جگہ سیسے کی گولیاں
سو رہی ہیں
یہ وہی دل ہیں جن کے ہر اک زخم میں زہر آلود سنگینوں
کی ٹوٹی نوکیں پڑی رو رہی ہیں
دیکھو کتنی ہی فوجیں افق سے
آندھیوں کی طرح آ رہی ہیں
ظلم کے سر پہ منڈلا رہی ہیں

بھاگو بھاگو
اپنا جسم، اپنی جان، اپنا امن، اپنا اخلاق و تہذیب و
قانون سب لے کے بھاگو
اس زمیں کے دہکتے ہوئے سینے سے سلطنت کی پرانی
بساط اب اٹھاؤ
زندگی تم سے تنگ آ چکی ہے
ساری دنیا اب اکتا چکی ہے
موت کے بادباں کھول دو اور اپنے جہازوں کے
لنگر اٹھاؤ

جاؤ جاؤ

فرنگی

اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تم کو
اپنے سارے جرائم کا اقرار ہے

جاوید

ہم کو انکار ہے

مریم

ہم کو انکار ہے

فرنگی

پر یہ قانون کی منصفانہ نگاہوں میں اقرار ہے

جاوید

انقلاب اور بغاوت کا اقرار لیکن جرائم سے انکار

مریم

انکار ہے

فرنگی

تم اسی طرح انکار کرتے رہو گے
پھر بھی قانون کا فیصلہ، فیصلہ ہے
تم نے ـــــ جاوید و مریم
تم نے جمہور کے ساتھ مل کر
انقلاب اور بغاوت کا فتنہ جگایا
تم نے ایک، ایک کونے میں طوفاں اٹھایا
تم یہ کہتے ہو جمہور کا راج ہو

ایسے اک گھر میں سوراج ہو
کھیتوں میں کسانوں کی ہو حکمرانی
کارخانے ہوں مزدوروں کی راجدھانی
تم پر الزام یہ ہے کہ تم
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی حکومت
سلطنت اور قانون ہی کے نہیں
امن و تہذیب و اخلاق کے بیخ کن ہو
اس لئے شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی عدالت
سے تم کو
تم کو جاوید
یہ سزا دی ہے کہ سرکار نے تم سے جینے کا حق لے لیا ہے

جاوید

مجھ سے کیا، سارے ہندوستان سے یہ حق، جب سے
تم آئے ہو چھن چکا ہے

فرنگی

..... تم سے جینے کا حق لے لیا ہے
اب تمہارے لئے قید خانے میں ریشم کا پھندا لگا ہے
تاکہ اس میں تمہارا گلا باندھ کر تم کو پھانسی پہ لٹکایا جائے
یہاں تک کہ دم توڑ دو
شاہِ برطانیہ اور شہنشاہِ ہندوستان کی
سلطنت چھوڑ دو

جاوید

اور تم ہم غریبوں کے ہندوستان کی
مملکت چھوڑ دو

فرنگی

اور تم کو
تم کو مریم
یہ سزا دی گئی ہے کہ تم عمر بھر
عمر بھر صرف رویا کرو
اپنے اشکوں سے اپنے گناہوں کو دھویا کرو
یہ وہ ایوان ہے جس میں انصاف عدل اور صداقت
کی قندیل
سیکڑوں سال سے جل رہی ہے
یہ وہ ایوان ہے جس کے سائے میں ہندوستان کی رعایا
امن اور چین سے پل رہی ہے

مریم

ایسے ایوانِ عدل و صداقت پہ لعنت
ایسی ظالم حکومت پہ لعنت
(دیر تک آواز گونجتی رہتی ہے)

لعنت، لعنت، لعنت

پانچویں تصویر

آج کی رات اور باقی ہے

(مجاز)

موت کا راگ

ہر چیز آنی، ہر چیز جانی

ہر رنگ فانی، ہر نقش فانی
دنیا پریشاں خوابوں کی بستی
نغمیں فسانہ، غمگیں کہانی

ساز ازل کا نغمہ اجل ہے
شمعِ جہاں کا جلوہ اجل ہے
رقصاں اجل کی پرچھائیاں ہیں
پنہاں اجل ہے پیدا اجل ہے

نکہت ہو گل کی تاروں کی ضو ہو
موجِ نظر ہو، بجلی کی رو ہو
چلتا ہے سب پر جادو اجل کا
نقشِ کہن ہو، یا نقشِ نو ہو

ہر پھول بے بس، ہر خار بے بس
ہر ساز بے بس، ہر تار بے بس
بچتے سے میرے کوئی نہ چھوٹا
تسبیح بے بس، زنّار بے بس

آنکھوں کا کاجل اشکوں سے دھویا
میں نے خوشی کو غم میں بھگویا
بچ کر نہ نکلا کوئی سفینہ
سب کو ڈبویا سب کو ڈبویا

قیدی ہیں گورے، قیدی ہیں کالے
انسان و حیواں میرے نوالے
محفل میں میری کرتے ہیں گردش
خوں کے پیالے، خوں کے پیالے

چنگیز و تیمور، نشتر ہیں میرے
خاقان و فغفور خنجر ہیں میرے
میرے پھریرے قحط اور وبائیں
ظلم اور افلاس لشکر ہیں میرے

مجھ کو زمانہ کہتا ہے سفاک
میری نگاہیں سرد اور بیباک
ہر وار بھرپور، ہر وار بھرپور
دستِ اجل ہے چست اور چالاک

لیکن فرنگی میرا بھی استاد
مجھ سے بھی بڑھ کر سفاک و جلاد
سہمی ہوئی ہے دیوارِ زنداں
پھانسی کے پھندے کرتے ہیں فریاد

مریم کی آواز

زندگی ایک بارِ گراں ہے
میرا جاوید آخر کہاں ہے

جاوید

آ میرے پاس آ میری مریم
میری غم خوار و دلدار و ہمدم
میں سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہوں
راہ کب سے تری تک رہا ہوں

(مریم سامنے آتی ہے)

فرض اپنا ادا کر چکا ہوں
دامنِ شوق کو بھر چکا ہوں
بوجھ کوئی نہیں قلب و جاں پر
فخر کرتا ہوں ہندوستاں پر
میرے دل میں نہ ڈر ہے نہ غم ہے
آنکھ تیری محبت میں نم ہے
دل میں بس ایک ہی آرزو تھی
دیکھ لیتا بھری گود تیری
(آگے بڑھ کر)

مریم

کوئی دیوارِ زنداں کو ڈھادے
ان سلاخوں کو پیچھے ہٹا دے
(سلاخوں کو زور سے ہلاتی ہے)

جاوید

کیوں یہ آنکھیں تری لال کیوں ہیں؟
اتنے الجھے ہوئے بال کیوں ہیں؟
کیوں ہے غمگین صورت بنائی؟
رخ پہ کیوں اڑ رہی ہے ہوائی؟
نظریں اس طرح کیوں بجھ گئی ہیں؟
ہاتھ میں چوڑیاں کیوں نہیں ہیں؟
تیرے چہرے پہ افسردگی ہے
تیرے لہجے میں پژمردگی ہے

مریم

میرے دل میں محبت ہے تیری

جاوید

تیرے ہی ہاتھ عزت ہے میری
روک لے آنسوؤں کی روانی
پھیر قربانیوں پر نہ پانی

مریم

تجھ سے کہتی ہوں پھیلا کے آنچل
مجھ کو بھی اپنے ہی ساتھ لے چل

جاوید

مجھ کو مت دیکھ، دیکھ اس چمن کو
لٹ گئی ہے جو اس انجمن کو
دیکھ اے جانِ ہندوستاں کو
اپنے اجڑے ہوئے بوستاں کو
جس کے ہر گل پہ رنگِ خزاں ہے
جس کا ہر برگ و بر نوحہ خواں ہے
گھر کے آئے اگر ابرِ باراں
خاک سے پھوٹے رنگِ بہاراں
آنسوؤں کی نہیں کوئی حاجت
اس کو ہے گرم خوں کی ضرورت

مریم

میرے سر میں بھی آخر جنوں ہے
میری نبضوں میں بھی گرم خوں ہے
موت کا مجھ کو پیغام آتا

کاش میرا لہو کام آتا

جاوید

سرخرو ہو گی اک روز تو بھی
کام آئے گا تیرا لہو بھی
یوں گزرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
صرف مرنا ہی سب کچھ نہیں ہے
اور بھی ہیں بہت سے طریقے
خدمتِ ملک و قوم و وطن کے

مریم

جا کے دوں کس کے در پر دہائی
شاق ہے مجھ کو تیری جدائی
تو کل تو بہت دور ہوگا
میری نظروں سے مستور ہوگا
سوگ چھا جائے گا زندگی پر
اوس پڑ جائے گی ہر خوشی پر
دکھ اٹھاؤں گی صدمے سہوں گی
عمر بھر اب اکیلی رہوں گی
مجھ کو ہر وقت یاد آئے گا تو
میرے خوابوں میں لہرائے گا تو
آنسوؤں میں چمکتا رہے گا
میرے دل میں دھڑکتا رہے گا
شرم ہے اپنی ناکامیوں پر
فخر ہے تیری قربانیوں پر
لیکن اس دل کو سمجھاؤں کیسے
میں تجھے چھوڑ کر جاؤں کیسے
جشنِ نو آئے گا جب وطن میں
ہوں گی تنہا بھری انجمن میں

جاوید

کل کا انداز کچھ اور ہوگا
بزم میں اک نیا دور ہوگا
جنگ ہوگی نہ پیکار ہوگی
تو مسرت سے سرشار ہوگی
گود میں تیری اک چاند ہوگا
جس سے خورشید بھی ماند ہوگا
جب جوانی کا انعام پانا
اس کو میری طرح کا بنانا
اس طرح مجھ کو پا جائیگی تو
پھر نہ اک پل بھی گھبرائے گی تو
کتنی دلچسپ ہے یہ کہانی
مٹ کے بنتی ہے پھر زندگانی

ساری انسانیت اک تڑپتا ہوا شعلہ ہے
اور افراد چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں کتنے ہی بیباک و بیتاب شعلے
پرورش پا رہے ہیں
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں ٹوٹتی ہیں
اتنی ہی اور چنگاریاں پھوٹتی ہیں
اس طرح زندگی
گل بہ آغوش چنگاریوں سے
ہر گھڑی
اک نیا اور مہکتا ہوا ہار اپنے لئے گوندھتی ہے
کچھ تو چنگاریاں ایسی ہیں جو بھڑکتی نہیں

یہ تڑپتی نہیں
صرف اڑتی ہیں اور ناچ کر ایک لمحے میں کھو جاتی ہیں
موت کی سرد آغوش میں جا کے سو جاتی ہیں
لیکن ایسی بھی کتنی ہی چنگاریاں ہیں
جن کے سینوں میں شعلے بھڑکتے ہیں اور خار و خس پر
لپکتے ہیں اور بجھتے بجھتے بھی دنیا اور انسانیت کو
رنگ اور نور کے ایک طوفان میں غرق کر جاتے ہیں
گرمیٔ بزم صرف ایک رقصِ شرر تک نہیں ہے

ہم نسیمِ سحر کی طرح آتے ہیں باغِ انسانیت میں
دو گھڑی سبزہ و گل سے اٹکھیلیاں کرتے ہیں
شاخ پر جھولتے ہیں
کنج کے سائے میں کھیلتے ہیں
اور گلوں کو
رنگ و بو دے کے اس باغ سے رقص کرتے
چلے جاتے ہیں

ابر کی طرح چھاتے ہیں دنیا کے سر پہ
اور پھر سبز کھیتوں کو سیراب کر کے
وادی و دشت و کوہ و بیاباں کو شاداب کر کر کے
گرجتے، برستے، گزر جاتے ہیں

ہم ہمیشہ سے لمحوں کے مانند آتے رہے ہیں
اور آتے رہیں گے
لمحے جو وقت کی وسعت بیکراں سے امنڈتے ہیں اور
ڈوب جاتے ہیں پھر وقت کی وسعتِ بیکراں میں
یوں تو سب لمحے ہیں ایک سے
ایک سی ان کی رفتار ہے
ایک سی ان کی جھنکار ہے
پھر بھی یکساں نہیں
جو بھی لمحہ ہے وہ اک نئی آرزو
اک نئی جستجو
اک نیا ساز ہے اک نیا سوز ہے
اک نئی جوت ہے اک نئی روشنی

ہم ہیں انسانیت کے زمانے کے موسم
جو بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
جو نئے پھول پھل ساتھ لاتے رہے ہیں
اور لاتے رہیں گے
جو نئے رنگ سے کیاریوں کو سجاتے رہے ہیں
اور سجاتے رہیں گے
جو نئی کونپلوں سے نئے پیرہن
شاخساروں کو ہر سال لا کر پنہاتے رہیں گے

ہم زمانے کے دریا سے موجوں کی صورت ابھرتے رہے ہیں
اور ابھرتے رہیں گے
زندگانی کی کشتی کو ہم اپنے سیّال سینے پر لے کر
آگے بڑھتے رہے ہیں
اور بڑھتے رہیں گے
اس سفینے کے ملاح روزِ ازل سے بدلتے رہے ہیں
اور بدلتے رہیں گے
بادباں بن کے افراد اٹھتے رہے ہیں
اور اٹھتے رہیں گے
یہ حسیں ناؤ انسانیت کی اسی طرح چلتی رہی ہے
اور چلتی رہے گی

ہم ہیں معمار انسانیت کے
اپنے آباؤ اجداد معمار تھے
ہم بھی معمار ہیں
آنے والے زمانے کی نسلیں بھی معمار ہوں گی
زندگی کا فلک بوس ایوان اسی طرح بنتا رہا ہے
اور بنتا رہے گا
ہم جہاں اپنی صناعیاں ختم کر کے چلے جائیں گے
کل وہیں سے نئے عہد کے حوصلہ مند صناع
اپنے فن اور صنعت کا آغاز کریں گے

ہم اگر کل نہ ہوں گے تو کیا وقت کی تیز رفتار رک جائے گی؟
زندگی کی کمر بوجھ سے غم کے جھک جائے گی؟
گردشِ ماہ و انجم میں کیا فرق آ جائے گا؟
کیا اندھیرا زمانے پہ چھا جائے گا؟

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزئی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور افق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
اپنے محور پہ گھوما کرے گی
اور فضاؤں کی لاانتہا نیلی پہنائیوں میں
آج کی طرح کل بھی جھوما کرے گی
آرتی بزمِ انجم اتارا کرے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
چشمۂ نور میں غسل کر کے
سرخ سورج کے آئینے میں اپنی زلفیں سنوارا کرے گی

ہاں مگر آج اور کل میں اک فرق ہوگا
زندگی کل کی بھرپور ہوگی
کامرانی کے مے پی کے مخمور ہوگی
کل یہ لوہے کی موٹی سلاخیں
جو مرے اور ترے درمیاں ہیں پگھل جائیں گی
ظلم اور جبر کی ساری زنجیریں گل جائیں گی
کل غلامی کی لعنت، غریبی کی ذلت، مصیبت، مشقت
صعوبت، عداوت، جہالت
وہم کی بادشاہت، بہیمانہ خصلت، درندوں کی سی ظالم
عادت، جبلت
خار و خس کی طرح آدمیت کے طوفاں میں بہہ جائے گی
آدمیت کا طوفان روزِ ازل سے امنڈتا رہا ہے
اور ابد تک امنڈتا رہے گا
یہ طوفان ہے جس کے ریلے میں فطرت کی سفاکیاں
بہہ گئی ہیں
یہ وہ طوفان ہے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں برس سے
گرجتا رہا ہے
اور گرجتا رہے گا
ہم جو برطانوی سلطنت کی
کھوکھلی اور پرانی چٹانوں سے ٹکرا رہے ہیں
ہم بھی انسانیت کے اسی جاودانی سمندر کی اک موج ہیں
زندگی، ارتقا اور تاریخ کی فوج ہیں
ہم بڑھیں گے تو تاریخ آگے بڑھے گی
ظلم اور جبر کی قوتوں سے لڑے گی
آج جس سمت میں ہم مڑیں گے اسی سمت میں ساری
دنیا مڑے گی
زندگی سرخ شہپر لگا کر اڑے گی

ہم ہیں وہ موجِ طوفاں کہ جو بڑھ کے گھٹتی نہیں
لاکھ دشمن ہوں لیکن ہماری سپہ پیچھے ہٹتی نہیں

جب سے انسان نے اپنے نقشِ قدم سے
پشتِ گیتی پہ عظمت کی مہریں لگائی ہیں اس وقت سے
ساری فطرت
آدمیت سے لڑنے پہ آمادہ ہے
اس کا ہمدرد و غمخوار کوئی نہ تھا
اس کا دلدار کوئی نہ تھا
ہر طرف صرف دشمن ہی دشمن نظر آ رہے تھے
وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ
اپنے دامن سمیٹے ہوئے تھے
دیو کی طرح سے سانس لیتے سمندر
اپنے سیّال جسموں کو جھاگ اور طوفان کی چادروں میں
لپیٹے ہوئے تھے
اپنے تاریک سینوں میں جنگل
اپنے اسرار اور بھید سب کچھ چھپائے کھڑے تھے
اونچے اونچے درخت اپنے میٹھے پھلوں کو
آدمی کی پہنچ سے بہت دور سر پر اٹھائے ہوئے تھے
کوہساروں کی نیلی چٹانیں
اور زمیں کی سنہری تہیں
اپنی گہرائیوں میں ہزاروں خزانے دبائے ہوئے تھیں
ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں
سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی
آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں
زلزلے آتے تھے
برف اور آگ کے سخت طوفان چھاتے تھے اور

چاند سورج ستارے
ان میں کھو جاتے تھے
لیکن ان سیکڑوں دشمنوں کی
دشمنی کے اندھیرے میں انساں
اپنے ہاتھوں میں محنت، عمل اور تجسس کی قندیل لے کر
درد، دکھ، شوق، ارماں، مسرت، امنگ، آرزو اور
امید کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے
آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا
اور ہر ہر قدم پر
کامرانی کے اور کامیابی کے پرچم
نصب فرما رہا تھا

آخرش وادیاں، دشت، میداں، پہاڑ اس کے قدموں
کے نیچے
فرش کی طرح سے بچھ گئے
ندیاں اس کے فاتح قدم چومنے کے لیے رک گئیں
اونچے اونچے درختوں کی اونچی ثمردار شاخیں
اس کی تسلیم کو جھک گئیں
برف کی چوٹیاں اس کی تعظیم کو جھک گئیں
کوہساروں کی دولت
آبشاروں کی طاقت
اور زمیں کے خزانے
اس کی خدمت میں حاضر ہوئے
اور انساں ہواؤں پہ اڑنے لگا
موجِ طوفاں پہ چلنے لگا
بجلیاں اس کی آغوش میں آ گئیں اور دنیا
ذہنِ انساں کے انوار سے جگمگانے لگی

ساز نے کر تمدن اٹھا اور تہذیب گانے لگی

سوچ ان مرحلوں کو
سوچ ان راستوں اور ان منزلوں کو
جن سے انسان اب تک گزرتا رہا ہے
اس کی راہوں میں دونوں طرف ڈھیر تھے ہڈیوں کے
اور ہر ہر قدم پر
خون میں لتھڑے بریدہ سروں کے فلک بوس ٹیلے
کھڑے تھے
جن کی چوٹی پہ راتوں کو بھوت اور جنات
اپنی محفل سجاتے تھے اور آتشیں حلقوں میں ناچتے تھے
اور تاریخ کے سبزہ زاروں میں بہتے ہوئے خون کی تیز
بو سے ہواؤں کا دم گھٹ رہا تھا

یہ پرانے زمانے کے ان حکمرانوں کے نقش قدم تھے
جن کی سفاکیوں کے فسانے
آج بھی دل کو دہلا رہے ہیں
لیکن انسان ان مرحلوں سے گزر کر
آج ان منزلوں پر کھڑا ہے جہاں ہر خزاں کے عقب سے
بہاریں گل افشانیاں کر رہی ہیں
اور غم کے اندھیرے افق سے مسرت کی چھنتی ہوئی
تیز کرنیں
رنگ اور نور سے دشت و کہسار کی گودیاں بھر رہی ہیں

اپنے اجڑے ہوئے ملک کی کھیتیاں لہلہائیں گی
شاداب ہو کر
دھان کی بالیاں مسکرائیں گی گیہوں کے خوشوں
میں تارے پھلیں گے

اور دھرتی کے سینے سے پھولوں کے فوارے ابلیں گے

مریم

جن میں نہائیں گے ہم

جاوید

آسمانوں سے اتریں گی رنگیں بہاروں کی پریاں
دور ہو جائیں گی قحط کی کالی پر ہول پرچھائیاں ۔
ہر طرف نور ہی نور ہوگا
نور ہی نور ہوگا

مریم

میرے جاوید کی تیز آنکھوں کا نور، اس کے سینے سے
بہتے ہوئے خون کا رنگ

جاوید

کارخانوں سے نغموں کے طوفاں اٹھیں گے
اور غریبوں کے سوکھے ہوئے زرد چہروں پہ رنگ
آئے گا
زندگی اور آسودگی کا
ان کی مغموم آنکھیں خوشی کی نئی روشنی سے چمکنے لگیں گی

مریم

ہجر کی لمبی راتوں کے آنسو محبت کے ہلکے تبسم میں
شہد و شکر بن کے گھل جائیں گے

جاوید

گرد آلود آئینے دھل جائیں گے

اور ماؤں کی گودوں سے ہنستے ہوئے ننھے ننھے
فرشتے اتر کر زمیں پر چلیں گے
جس طرح باغ میں پھول، آکاش پہ چاند تاروں کے جھرمٹ
سبز مخمل کی وادی میں شبنم کے شفاف قطرے
اور چالیس کروڑ آدمی وہ جو ہلکی سی اک مسکراہٹ سے
محروم تھے
اس طرح کھلکھلا کر ہنسیں گے کہ جس طرح جوالا مکھی پھوٹتا ہے
اور یہ قہقہہ ایک آزاد، بیباک، ابھرتی ہوئی قوم کا قہقہہ
آسمان و زمیں پر
نور بن کر بکھر جائے گا

مریم

سارا عالم سنور جائے گا

جاوید

سچ بتا اب بھی غمگین ہے تو

مریم

ہاں میں غمگین ہوں، اب بھی غمگین ہوں اب بھی
غمگین ہوں
آہ یہ غم ہمیشہ میرے دل میں پلتا رہے گا
میری روتی ہوئی آنکھوں سے اشک بن بن کے
ڈھلتا رہے گا
کون ہے وہ جو پتھر کے سینے سے وزن اور دہکتے
ہوئے سرخ انگاروں کے دل سے ان کی
تپش چھین لے گا؟
کون ہے وہ جو دل کی ہری شاخ سے غم کے چبھتے
ہوئے کانٹوں کو بین لے گا؟
یہ جدائی نہیں دل کا وہ درد ہے جس کی ٹیسیں عمر بھر
میرے پہلو میں اٹھتی رہیں گی
آہیں سینے میں گھٹتی رہیں گی

جاوید

لیکن انسان کی روح سے غم کے دھبے
وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ دھل جاتے ہیں
کشتیٔ زندگانی کے لپٹے ہوئے بادباں
آنے والی مسرت کی ٹھنڈی ہواؤں سے کھل
جاتے ہیں

مریم

پھر بھی بچھڑے ہوئے دوست احباب ملتے نہیں
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہوتی ہے لیکن
قلب اور روح کے زخم سلتے نہیں
رات کی تیرگی میں
پھول شبنم کے بوسوں سے مدہوش ہوتے ہیں،
کھلتے نہیں ہیں
چاندنی کرنیں جب اپنی نرم اور نازک
سیمگوں انگلیوں سے
رات کے الجھے الجھے ہوئے ریشمی بال سلجھانے لگتی ہیں
تو اس کی نیلی رگوں میں
چاندنی خون کی طرح سے دوڑ جاتی ہے لیکن
پھر بھی اس کی جبیں سے اندھیرے کی پرچھائیاں
ہٹتی نہیں ہیں
ہاں تسلی سے تھوڑی سی تسکین ہو جاتی ہے
لیکن اس کے سہارے
عمر کٹتی نہیں ہے

جاوید

یہ [illegible] کہانی نہیں
بلکہ اک حقیقت ہے جو تیری آغوش میں پرورش
پا رہی ہے
جو تیری روح اور دل کو گرما رہی ہے
ہاں یہ سچ ہے کہ میں آج پھانسی کے پھندے کے
نیچے کھڑا ہوں
ایک برگِ خزاں ہوں
تجھ کو جتنا بھی غم ہو وہ کم ہے
تو مگر ایک کھلتا ہوا پھول ہے
ایک پھلتی ہوئی شاخ ہے
جس کے ایک اک رگ و ریشے سے کونپلیں پھوٹتی ہیں
تو محبت کا پیغام ہے
ملک اور قوم کی آرزو کا چھلکتا ہوا جام ہے
اپنے سینے میں تو عہدِ نو کی بشارت چھپائے ہوئے ہے
زندگانی کا بار امانت اٹھائے ہوئے ہے

... ...

(خاموشی)
(صرف ساز بجنے کی آواز)

رات کو میں نے اک خواب دیکھا
گود میں تیری مہتاب دیکھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
ہر طرف موت کی سی خموشی
گویا پتھر کی اک سل تھی جو جیل کی رات کے دل پہ رکھی
ہوئی تھی

میری تنہائی میں میری ہمدم بس اک ٹمٹماتی ہوئی شمع تھی
جس نے چھت اور دیوار پر
ہلکے ہلکے سے اک نور کا جال پھیلا دیا تھا
جیسے مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی جھلملاتی
ہوئی روشنی ہو
میں تھا، یہ کوٹھری اور سلاخیں
جن کی پرچھائیاں صحن کی خاک پر لیٹ کر سو گئی تھیں
اتنے میں نیند آئی
اپنی آنکھوں میں صدیوں کا کاجل لگائے ہوئے
اپنے آنچل میں سکھ کے ستارے چھپائے ہوئے
جیل کے پاسبانوں سے بچتی ہوئی
ہر قدم پر دلھن کی طرح سے ٹھٹکتی، جھجکتی ہوئی
آہٹیں سن کے دیوار کی آڑ لے کر دبکتی ہوئی
چپکے سے کوٹھری میں چلی آئی اور میرے سینے پہ
سر رکھ دیا
اپنی کالی گھنی زلف کو میرے شانوں پہ پھیلا دیا
آسماں کی بلندی سے نیلی گھٹائیں اترنے لگیں
اور پرچھائیاں سی بکھرنے لگیں
ہر طرف تیرگی چھا گئی
سنتری، پاسباں، بھوری دیواریں، چھت اور سلاخیں
شمع اور شمع کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی
ایک پرکیف و مخمور اندھیرے میں گم ہو گئیں
نیند کی مدھ بھری گود میں سو گئیں

نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش
پرچھائیاں کھیلتی ہیں

وہ غریبوں کی غمخوار دکھیوں کی دلدار ہے
اور فرقِ مراتب سے بیزار ہے
رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے، پھولوں کو پیار کرتی ہے اور
سارے عالم پہ جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی
ہے شبنم
اس طرح بزمِ فطرت کی ہر چیز کو
اک نئی زندگی بخشتی ہے
اک نئی تازگی بخشتی ہے
رات وہ مجھ کو اپنے سبک بازوؤں میں اٹھا کر
جیل سے لے گئی
دور ــــ احساس و ادراک کی سرحدوں سے بھی دور
ایک افسانوی سرزمیں تھی
ماضی و حال کی سوتی اور جاگتی وادیوں میں
خواب آلود بکھرے دھندلکے کے ایوان
چاندی کے ستون اور شفق رنگ محرابیں، پیشانیاں
جن کی عقدِ ثریا سے آراستہ تھیں
واں نہ یہ جیل تھی اور نہ اس جیل کے پاسباں تھے
اور نہ یہ سخت اور سرد دیواریں تھیں
اور نہ یہ ہول تنہائی تھی
خواب کی خلوتیں انجمن بن گئی تھیں
کتنے بھولے ہوئے چہرے، بسری ہوئی آنکھیں گزرے
ہوئے ماہ و سال کے مسکراتے افق سے ابھر
آئی تھیں
کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں
اک عجب رقص تھا اک عجب زمزمہ تھا
ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے،
ہواؤں کی سرگوشیاں
دوب کے فرش پر شبنم آلود قدموں کی سرسراہٹ
چاند تاروں کے گیت اور سیاروں کی گنگناہٹ
وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ
قہقہوں کی صدا اور کلیوں کے کھلنے کی آواز
سب کی سب ایک پُرکیف نغمے میں حل ہو گئی تھیں

ناگہاں جنگ کے طبل بجنے لگے
اور کروڑوں قدم ایک آہنگ کے ساتھ اٹھنے لگے
آسماں ہل گیا اور زمیں تھرتھرائی
زندگی تلملائی
اور کوہِ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اٹھائے ہوئے
بڑھ رہا تھا
اور اس کی جلو میں
ساری انسانیت
ایک غضبناک سیلاب کی طرح امڈی چلی آ رہی تھی
سارے ہندوستاں کے بہادر مجاہد
اپنے سر کو ہتھیلی پہ رکھے ہوئے
اپنے دشمن سے ٹکرا رہے تھے
سرخ اور سبز پرچم
ترنگے کے پہلو میں لہرا رہے تھے
گولیاں چل رہی تھیں
لاکھوں سینوں سے ابلتے ہوئے خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں
پھر بھی کوہِ ہمالہ
اپنے ہاتھوں میں ہندوستاں کے علم کو اٹھائے ہوئے
بڑھ رہا تھا
دشمن کی صفوں پہ

چہرہ رہا تھا
ڈری ہوئی ماؤں کی ہچکیاں
بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کی سسکیاں
مزدور، بیکاروں، کسانوں میں ڈھل گئی تھیں
ہر طرف سے صدا آرہی تھی
"عہد نو تو کہاں ہے"
اور پھر شور اٹھا
"عہد نو آگیا ہے"
میں جو پلٹا تو اک اور تصویر دیکھی
تیری گودی میں اک چاند تھا جس کے لب ہل رہے تھے

"عہد نو آگیا ہے"
میں ہوں گوتم کے سینے کی آواز
میں ہوں تخیل انساں کی پرواز
میں ہوں ٹیپو کی تلوار
میں ہوں جھانسی کی رانی کے خوابوں کی تعبیر
میں شہیدوں کے ماتھے کی تنویر
میں بھگت سنگھ کی روح ہوں
میں نئے عہد کے سخت طوفان میں
کشتیٔ نوح ہوں
میں ہوں چٹگاؤں کے باغیوں کا ترانہ
میں محمد علی کا فسانہ
میں ہوں اقبال و ٹیگور کا زمزمہ
میں ہوں دہقان و مزدور کا ہمہمہ
میرے خوں میں ہے گنگ و جمن کی روانی
اور رگوں میں ہمالہ کی کڑیل جوانی
عہدِ نو آگیا ہے
عہدِ نو آگیا ہے

وہ دور ہولے شہنشاہیت کے جذام
جاگ ہندوستاں کے غلام
انتقام، انتقام، انتقام، انتقام"
یہ صدا سن کے افلاک پر بجلیاں کڑکڑانے لگیں
اور میں چونک اٹھا
رات تاریک تھی اور سلاخوں سے باہر
آسماں ابر آلود تھا
جیل کی اونچی دیواروں پر بجلیاں آتشیں راہواروں کو
دوڑا رہی تھیں
اپنے کوڑوں کو کڑکا رہی تھیں
ابر آلود اندھیرے کے دل میں سنہرے عقابوں کے شہپر
چمک اٹھے تھے
بجلیوں کی کڑک اور چمک، بادلوں کی گرج
انقلاب اور بغاوت کی الہڑ حسینہ کی پازیب کی تیز
جھنکار تھی
یہ اندھیرے اجالے کی پیکار تھی
جس کے ادنیٰ سپاہی ہیں ہم

فرنگی

وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم
اب جدا تم کو ہونا ہے باچشم نم

جاوید

دیکھ افق پر اندھیرا مچلنے لگا
دن شفق کی سنہری پہاڑی سے ڈھلنے لگا
اب تلک شام کا چمپئی رنگ آنچل فضاؤں میں
لہرا رہا تھا
آسماں پھول برسا رہا تھا

لیکن اب یک بیک سرخ پھولوں کی ہر پنکھڑی
سرمئی ہو چلی ہے
روشنی تیرگی کے سیہ غار میں کھو چلی ہے
اور زندگی کے چہرے پہ تاریکیاں اک بھیانک ہنسی ہنس
رہی ہیں
نظریں غیظ اور نفرت کے شعلوں سے دہکی ہوئی ہیں
اور رعونت سے اینٹھے ہوئے ہونٹ یہ کہہ رہے ہیں
"وقت باقی رہا ہے زیادہ نہ کم"
اب جدا ہم کو ہونا ہے با چشمِ نم
میری مریم
میری مریم (گھبرا کر)

مریم

ہر طرف ہے یہ کیسا اندھیرا

جاوید

اس کے پیچھے چھپا ہے سویرا
جا کے کہنا ہے یہ اہلِ وطن سے
روح خوش ہو کے نکلی ہے تن سے
ہاتھ میں جام ہندوستاں کا
لب پہ ہے نام ہندوستاں کا

مریم

جو ہے مرنے پہ باندھے کمر ہے
ملک صدا ترا ہم سفر ہے

جاوید

اور کچھ اور نزدیک آجا
اک خلش سی ہے دل میں سما جا
دیکھ لوں آخری بار تجھ کو
کر لوں اک رخصتی پیار تجھ کو
(مریم کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہے)

مریم

رخصت اے میرے جاوید رخصت
ڈوبنے والے خورشید رخصت
(جاتی ہے)

جاوید

رخصت اے مریم، اے جانِ مریم
رخصت اے آدم، اے نسلِ آدم

(اس کی آواز مریم کے قدموں کی آواز کا تعاقب کرتی ہے)

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے آسمانی نظارو
رخصت اے چاند، سورج، ستارو
رخصت اے نیلگوں کوہسارو
رخصت اے نقرئی آبشارو
رخصت اے گنگناتی ہواؤ
رخصت اے مسکراتی فضاؤ

رخصت اے صبح اے شام رخصت
رخصت اے حسنِ گل فام رخصت
رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغبانو
جب سنو خاک میں رنگ ابھرا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

خاک ہے سرخ بوندوں سے گلنار اب بھی
خوں میرے پرچم انگڑائی لیتے ہیں آجا
جنگ کے طبل آواز دیتے ہیں آجا
کب تلک کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا، آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے
میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

چھٹی تصویر

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
(اقبال)

مریم کا نوحہ

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی
تیری محبوب مریم بلاتی ہے تجھ کو
کیا کبھی اس کی بھی یاد آتی ہے تجھکو
اب تو آنکھیں ترستی ہیں صورت کو تیری
ہوگئیں میری تو تیسوں راتیں اندھیری
زہر لگتی ہے اجڑی ہوئی زندگانی
آہ رکتی نہیں آنسوؤں کی روانی
غم کی سل ہوتی جاتی ہے کچھ اور بھاری
بڑھتی جاتی ہے کچھ اور بھی بے قراری
روٹھ کر جانے والے مناتی ہوں تجھ کو
تیری مریم ہوں میں، میں بلاتی ہوں تجھ کو
ملک تیرا ہے معروفِ پیکار اب بھی

میری آنکھوں میں پہلی سی اب بھی چمک ہے
میرے ہونٹوں کے پھولوں میں اب بھی مہک ہے
میں تری آرزوؤں کا گلشن ہوں اب بھی
تیرے رنگین خوابوں کا مسکن ہوں اب بھی
میرے سینے میں ہے زندگی کا شرارہ
میرے پہلو میں ہے حریت کا ستارہ
باندھ کر اپنے ماتھے پہ سونے کا سہرا
یاد ہے تو نے الٹا تھا گھونگھٹ کسی کا
بیاہ کی میرے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی
صندلی مانگ تھی اس میں افشاں چنی تھی
اور اب مہندی ہاتھوں میں رچتی نہیں ہے
کوئی چوڑی کلائی میں بجتی نہیں ہے
ہائے کس نے وہ مہندی کی رنگت اڑا لی
کس نے میرے ماتھے سے افشاں چھڑا لی
میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی
یاد ہوگا تجھے وہ مرا لال جوڑا
تو نے کیا اپنا وہ عہد و پیماں بھی توڑا؟
میرے سنسان دل میں ہے کیسا اندھیرا

کیا کبھی میری دنیا میں ہوگا سویرا؟
تو نہیں ہے تو بھاتا نہیں کچھ بھی مجھ کو
کیا کہوں کس طرح یاد کرتی ہوں تجھ کو
ہار اشکوں کے بیٹھی ہوئی گوندھتی ہوں
میں تجھے رات بھر تاروں میں ڈھونڈھتی ہوں
ہوک اٹھتی ہے چڑیوں کی آواز سن کر
پھینک دیتی ہوں رنگیں دوپٹے کو چن کر

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ہنستی اور کھیلتی چاندنی رات آئی
گرمیوں بعد بھرپور برسات آئی
چھائیں ساون کی وہ کالی کالی گھٹائیں
اور پھر چیت پھاگن کی سنکیں ہوائیں
آم کے سبز باغوں میں بھرپور آیا
کوئلوں نے محبت بھرا گیت گایا
سب ہی آئے مگر ایک تو ہی نہ آیا
اپنے گھر اپنی مریم کو تو نے بھلایا
یوں تو دنیا کی ہر چیز ہے آنی جانی
ہو گئیں کل کی باتیں پرانی کہانی
اس طرح اپنی نظریں پھراتا ہے کوئی
کیا محبت کو بھی بھول جاتا ہے کوئی
شام ہوتی ہے اور ڈوب جاتا ہے سورج
صبح ہوتے ہی پھر لوٹ آتا ہے سورج
میرا سورج مگر جا کے واپس نہ آیا
جانے کیوں میرے پیارے کو پردیس بھایا

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

ندیاں دوڑ کر ملتی ہیں ساگروں میں
بھر کے رس لڑکیاں لاتی ہیں گاگروں میں
رات کی گود میں سوتے ہیں چاند تارے
چومتے ہیں زمیں کو فلک کے کنارے
باغ میں دور سے اڑ کے آتے ہیں بھونرے
پھول کو گیت اپنا سناتے ہیں بھونرے
ساری دنیا پہ چھائی ہوئی ہے محبت
بے محبت کے ممکن نہیں ہے مسرت
(ایک عورت کے ہنسنے کی آواز)

ہنس رہی ہے کہیں کوئی میری سہیلی
اور میں گھر میں بیٹھی ہوئی ہوں اکیلی
دیکھتی ہوں میں جب اپنی ہمجولیوں کو
پیت کے پھولوں سے بھرتی ہیں جھولیوں کو
ان کی آنکھوں کے تارے چمکتے ہیں کیسے
ان کے دوشینو آنچل مہکتے ہیں کیسے
مسکراتے ہیں رہ رہ کے ان کے گریباں
ان کی سانسوں میں کھلتی ہیں رنگیں کلیاں
جگمگاتا ہے چاند ان کی پیشانیوں پر
ان کے سینے ہنسی اور خوشی کے سمندر
میرے دل سے نکلتی ہیں کتنی دعائیں
ان کو اپنی بہاروں کے دن راس آئیں
ناچتی آنند پر نہ پھر جائے پانی
ہو نہ غمگین و افسردہ ان کی جوانی
اور بھی ان کی شاداب کھیتی ہری ہو
مانگ صندل سے بچوں سے گود ہی بھری ہو

میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی

وہ مسرت کے بیتے دلوں کی کہانی
مرے حسن و محبت تری نوجوانی
ان کو میں واپس آتے ہوئے دیکھتی ہوں
زیر لب مسکراتے ہوئے دیکھتی ہوں
رنگ ہی رنگ بس تیرتے ہیں فضا میں
سیکڑوں تتلیاں اڑ رہی ہیں ہوا میں
گزری راتوں کے طوفان دل میں چھپائے
لمحے اڑتے ہیں ہاتھوں پہ شمعیں جلائے

دن نے ہنستے، ہنستے بنے ہیں مہینے
وقت کے چلتے رہتے ہیں یوں ہی سفینے
اک نیا رنگ بھر لیتی ہے زندگانی
بن کے ماں مسکراتی ہے الھڑ جوانی
خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی

جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں
جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں
یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی
جیسے بے تاب رگ رگ میں ہو نوجوانی
سنسنی جسم میں، چیونٹیاں جیسے رینگیں
درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں
زندگی کا نیا پھول ہے کھلنے والا
ہے مرے صبر کا پھل مجھے ملنے والا
سوچتی ہوں کہ وہ تیری تصویر ہوگا
میرے بچپن کے خوابوں کی تعبیر ہوگا
اس کے چہرے پہ ہوگا محبت کا ہالہ
اس کے ماتھے پہ تیری جبیں کا اجالا
کھائے جاتی ہے اس وقت تو تیری دوری
ہائے رہ جائے گی یہ خوشی بھی ادھوری

کھول کر اپنی آنکھیں وہ دیکھے گا کس کو
جانے وہ باپ کہہ کر پکارے گا کس کو
یہ نہیں کہتی ہوں مجھ سے ملنے کو آنا
اپنے بچے کو بس اک نظر دیکھ جانا
وہ مری آنکھ کا تارا وہ میرا دلبر
باپ کے پیار کو رہ نہ جائے ترس کر
میرے ہندوستاں کے سپاہی
اے محبت کی منزل کے راہی
کب تلک، کب تلک کوئی آخر پکارے
آ بھی جا آ بھی جا، آ بھی جا میرے پیارے

آ بھی جا میرے پیارے
میرے دل کے سہارے

(نامہ بر آتا ہے)
کیا یہ جاوید و مریم کا گھر ہے؟

مریم

ہاں مگر یہ بتا کیا خبر ہے؟
تجھ کو اپنا کہوں یا پرایا؟
نامہ بر کس کا خط لے کے آیا؟
موت کا جام یا زندگی کا؟
غم کا پیغام ہے یا خوشی کا؟

نامہ بر

زندگی ہے غموں کی کہانی
موت کا راگ ہے جاودانی
موت کی چھاؤں دیوار و در پر
موت کے پاؤں ہیں بحر و بر پر

موت کا رنگ ہے آبِ گل میں
موت سوتی ہے پھولوں کے دل میں
موت سے کس کو ہے رستگاری
آج وہ کل ہماری ہے باری
لیکن ایسے بھی ہیں مرنے والے
اپنی ماؤں کی گودوں کے پالے
جو اندھیرے سے ڈرتے نہیں ہیں
چڑھ کے سولی پہ مرتے نہیں ہیں
وہ ہیں ہمت کے، جرأت کے پیکر
چلتے ہیں موت کا سر کچل کر
موت کا دل دہلتا ہے ان سے
موت کا دم نکلتا ہے ان سے
زندگی قوم پر وارتے ہیں
موت پر قہقہے مارتے ہیں
تازہ ہے ان شہیدوں کا گلشن
نام ان کا ہمیشہ ہے روشن

مریم

تو تو آیا ہے لے کر شتانی
لٹ گئی ہائے میری جوانی

نامہ بر

تیرا شوہر جہاں سے سدھارا
اب ہے وہ آسماں کا ستارا
خوش ہو وہ فخرِ ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے

مریم

کیا کہا! زندۂ جاوداں ہے؟
سچ بتا میرا شوہر کہاں ہے؟
اس نے جامِ محبت پیا تھا؟
لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا
تیرے ہاتھ اس نے پیغام بھیجا؟
کیا کوئی خط مرے نام بھیجا؟
(خط دکھا کر)

نامہ بر

آخری اس کا پیغام ہے یہ
پر کسی اور کے نام ہے یہ

مریم

اس کا کیا کوئی میرے سوا ہے؟
مجھ کو کیا جانے کیا ہو رہا ہے؟
میں نے دی اس کو اپنی جوانی
آرزو، دل کشی، شادمانی
اپنے ہونٹوں کی شادابیاں دیں
اپنے سینے کی بے تابیاں دیں
روح کو اس کی میں نے جگایا
اس کے سنسان دل کو بسایا
میں نے مہکا دیا اس کا گلشن
حسن سے بھر دیا اس کا دامن
عشق کی پیاس میں نے بجھائی
شمع تاریک گھر میں جلائی

اس کے جذبات کی ترجماں ہوں
اس کے ننھے سے بچے کی ماں ہوں

نامہ بر

اس کی الفت کا پیغام ہے یہ
تیرے بچے ہی کے نام ہے یہ

مریم

میرا بچہ؛ مگر وہ کہاں ہے؟
میرے پہلو میں اب تک نہاں ہے
کیسے وہ تیری باتیں سنے گا؟
کیسے جاوید کا خط پڑھے گا؟

نامہ بر

وہ جو پہلو میں اب تک نہاں ہے
عہدِ نو کا مبارک نشاں ہے
جوشش و ہمت کا پیغام یہ خط
ہے نئی نسل کے نام یہ خط
وہ نئی نسل جو آ رہی ہے
وقت کا خون گرما رہی ہے
تیرے شوہر نے مرنے سے پہلے
خط لکھا تھا یہ اپنے لہو سے
وہ اندھیرے سے ڈرتا نہیں ہے
چڑھ کے سولی پہ مرتا نہیں ہے

مریم

خوش ہوں وہ فخرِ ہندوستاں ہے
آج سے زندۂ جاوداں ہے
زندۂ جاوداں ہے
زندگی جاوداں ہے
آرزو جاوداں ہے
حسن بھی جاوداں عشق بھی جاوداں ہے
میرا بچہ
میرا بچہ
وہ بھی تو زندۂ جاوداں ہے
میرا شوہر
میرا جاوید
فخرِ ہندوستاں ہے
آسمان و زمیں کو سنا دو
ساری دنیا کو جا کر بتا دو
اس نے مجھ کو بھلایا نہیں ہے
نقشِ الفت مٹایا نہیں ہے
عہدِ نو کو بلانے گیا ہے
چاند سورج کو لانے گیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ
صبحِ نو بن کے چھا جائے گا وہ
جب گریں گے غلامی کے ڈیرے
جب اڑیں گے خوشی کے پھریرے
راگنی قہقہوں کی چھڑے گی
ایک آزاد دنیا بنے گی
مسکراتا ہوا آئے گا وہ
جگمگاتا ہوا آئے گا وہ
اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے
میرا جامِ محبت پیا ہے
آئے گا اور ضرور آئے گا وہ

صبحِ نو بن کے چھا جائے گا وہ

(مبہوت کھڑی رہتی ہے)

نامہ بر، نامہ بر ——— میرا شوہر
کیا کہا اس نے پھانسی پہ چڑھ کر؟
کیا مجھے یاد اس نے کیا تھا؟
کیا مرا نام اس نے لیا تھا؟

نامہ بر

ہاں لیا اور لیا نام تیرا
مرتے مرتے پیا جام تیرا
چوم کر اس نے پھانسی کی رسی
آنے والی سحر کی خبر دی
رنگ سا اس کے چہرے پہ آیا
اور وہ زیرِ لب مسکرایا
اور پھر یوں گرج کر پکارا
موت سے کیا رکے گا یہ دھارا
بن کے سورج اٹھیں گے ستارے
پھول بن کر کھلیں گے شرارے
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں
رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نظروں سے کھو جائے
پر اندھیرا پگھل کر رہے گا
صبح سورج نکل کر رہے گا
پھول کو کون کھلنے سے روکے؟
کون آتے زمانے کو ٹوکے؟
یہ حکومت یہ ظالم حکومت کے ظالم شکنجے
کیا یہ ہندوستاں کے غلاموں کے لاکھوں
کروڑوں گلے گھونٹ دیں گے؟
کیا یہ جیلیں، جیلوں کے پاپی ستمگار بدکار جیلر
کیا یہ فوجیں، یہ توپیں، یہ بندوق، سنگین لوہے کے گولے
کیا ہمالہ سے سیلون تک اور بنگال و آسام سے لے کے کشمیر تک
سارے ہندوستاں کو تشدد کے جلتے ہوئے تند
اور تیز دوزخ کی پگھلی ہوئی آگ میں جھونک دیں گے؟
کیا یہ بڑھتی ہوئی نسلِ انساں کو بھی روک دیں گے؟
ہاں کہو ان سے سینے میں دل میں کچوکے لگائیں
اور زخموں سے انساں کے جسم اور روح میں لاکھ سوراخ کر دیں
لیکن اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ ہر زخم سے
ہوں گی پیدا ہزاروں زبانیں جو دریا کو
وادی کو کوہسار کو، دشت کو، در کو، میدان
کو، ایک اک اینٹ ایک ایک پتھر کو،
ایک ایک ذرے کو پیغام دیں گی۔ بغاوت
اور ان پھانسیوں اور جیلوں کے پیچھے دہکتے افق پر
مچلتے ہوئے سرخ خوں کے سمندر سے موجوں
کے بیتاب سینے کو یوں چیر کر آسماں پر ابھر
آئے گا سرخ آزاد دنیا کا آزاد سورج
جس طرح ماں کی گودی میں بچہ

مریم

جیسے جاوید و مریم کا بچہ
موت کے لاکھ طوفان آئیں
ظلم کے ابر کتنے ہی چھائیں

رات کتنی ہی تاریک ہو جائے
آسماں چاہے نغموں سے کھو جائے
پر اندھیرا مجھے کیل کر رہے گا
میرا بچہ ——
کیا کہا میں نے؟
میرا بچہ؟
میرا شوہر؟
میرا سورج نکل کر رہے گا
نامہ بر خط کو پڑھ کر سنا دے
سو رہی ہے یہ دنیا جگا دے
بیت جائیں پرانے زمانے
عہدِ نو کے بجیں شادیانے
(خط کو پڑھ کر سناتا ہے)

نامہ بر

محبت کے ننھے شرارے سلام
اندھیرے کے روشن ستارے سلام
ابھی ماں کے پہلو میں مستور ہے
ابھی زندگی سے بہت دور ہے
اندھیرے میں گم ہیں ترے فکر و ہوش
ابھی ہیں عدم میں ترے چشم و گوش
تری آنکھ محرومِ نظارہ ہے
ابھی بطنِ مادر ہی گہوارہ ہے
ابھی تک ہے ہستی تری بے نمود
فقط گردشِ خوں ہے تیرا وجود
ابھی بن رہے ہیں وہ نقش و نگار
کہ جن کا زمانے کو ہے انتظار

مبارک تجھے گردشِ ماہ و سال
ابھرنے ہی کو ہیں ترے خط و خال
کلی تیری ہستی کی کھل جائے گی
مسرت تری ماں کو مل جائے گی
ترے نقش کو بخش دے گی ثبات
پلائے گی وہ تجھ کو آبِ حیات
ترے دل میں ہو گی تمنائے نور
تری سانس میں زندگی کا سرور
کریں گی ہوائیں تجھے آ کے پیار
تجھے لوریاں دیں گے لیل و نہار
تجھے دیکھ کر مسکرائے گا چاند
اشاروں سے تجھ کو بلائے گا چاند
ستاروں کو حیرت سے دیکھے گا تو
انہیں توڑ لینے کو لپکے گا تو

یہی سوچ کر مسکراتا ہوں میں
تجھے زندگی دے کے جاتا ہوں میں

ڈھلا دن مری عمر کا آئی شام
اجل لائی ہے زہر آلود جام
مجھے ڈر نہیں موت کی رات کا
جو غم ہے تو ہے صرف اس بات کا
وہ دنیا وراثت میں پائے گا تو
جسے دیکھ کر تلملائے گا تو
یہ ہے تیرے ماضی کی کل کائنات
حوادث کے طوفاں مصائب کی رات
عداوت کے نغمے، کدورت کے ساز
لہو کے سمندر، ستم کے جہاز

مگر پھر بھی جنبشِ گراں ہے حیات
رواں ہے دواں ہے جواں ہے حیات

نئی تیری صہبا، نئے ہیں سبو
مری شرم کے داغ دھوئے گا تو
بنانا چٹانوں کے سینے پہ راہ
مگر اپنے ماضی پہ رکھنا نگاہ
کہیں ہاتھوں کا نقش رک نہ جائے
ترے مورثوں کی جبیں جھک نہ جائے
جوانی کہ جذبات کی آگ ہے
تمناؤں کا آتشیں راگ ہے
بھلانا نہ اس آتشیں راگ کو
بجھانا نہ جذبات کی آگ کو
خود اپنے لہو سے جلانا اسے
ہوا و ہوس سے بچانا اسے
جبیں تیری اس سے دمکتی رہے
نظر تیری اس سے چمکتی رہے

اسی آگ میں تپ کے نکھرے گا تو
افق سے زمانے کے ابھرے گا تو

نہ کرنا کبھی چشمِ حیرت کو بند
نہ ٹوٹے کبھی جستجو کی کمند
بتاتا ہوں میں تجھ کو رازِ حیات
عمل ہے عمل کارسازِ حیات
عمل کے لئے ہے فضا سازگار
شکاری ہے انساں زمانہ شکار
جو طوفاں آئیں تو ڈرنا نہیں
مصیبت میں بھی آہ بھرنا نہیں
کبھی جذبۂ شوق گھٹنے نہ پائے
نظر آسمانوں سے ہٹنے نہ پائے
گزرنا مصائب سے منہ موڑ کر
حوادث کی زنجیر کو توڑ کر
یہ مانا کہ تاریک ہوتی ہے رات
ستاروں کے موتی پروتی ہے رات
جہانِ کہن کا یہ دستور ہے
سیاہی کے آغوش میں نور ہے

اگر دل میں ہے آرزو کا سرور
تو ہے زندگی نغمہ و رنگ و نور

مسرت نہاں سنگ پاروں میں ہے
فضاؤں میں ہے شاخساروں میں ہے
ہوائیں بجاتی ہیں جس دم ستار
پہاڑوں پہ گاتے ہیں جب آبشار
ہرے ہو کے جب لہلہاتے ہیں کھیت
بھری دھوپ میں جب چمکتی ہے ریت
کرن پھوٹتی ہے جب افلاک سے
نکلتی ہیں جب کونپلیں خاک سے
افق سے ابلتا ہے جب رنگ و نور
ہواؤں میں اڑتے ہیں جس دم طیور
تو بجتا ہے دل میں خوشی کا رباب
مسرت بلاتی ہے آ کر شراب

یہ دریا یہ وادی یہ صحرا یہ پھول
مسرت نے بھیجے ہیں اپنے رسول

کوئی شے نہیں ہے جہاں میں حقیر
لبوں کا تبسم، نگاہوں کے تیر
یہ شبنم کے قطرے خس و خار پر
یہ ڈھلتی ہوئی دھوپ دیوار پر
یہ شاخوں میں ہنستی ہوئی پتیاں
یہ پانی کے چشمے یہ پگڈنڈیاں
یہ مکڑی کے جالے یہ چاندی کے تار
یہ پیڑوں کی گردن پہ پھولوں کا ہار
یہ آندھی سے طوفان سے کم نہیں
سمندر کے ہیجان سے کم نہیں
انہیں سب سے مل کر بنی ہے حیات
یہ سانچے ہیں جن میں ڈھلی ہے حیات
نہ ہو زندگی سے کبھی دل فگار
عمل سے بنا لے اسے سازگار
شکاری ہے انساں زمانہ شکار

حرفِ آخر

یہ آدمی کی گزرگاہ — شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتبِ تقدیر کی جلی تحریر
گلے سے سیکڑوں نقشِ قدم لگائے ہوئے
گزرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گزشتہ دور کی تہذیب کی منازل کو
جوان ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے

یہ آدمی کی گزرگاہ — شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
ادھر سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے

شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے
جلالِ شیخ و شکوہِ برہمنی کے جلوس
ہوس کے سینوں میں آتشکدے چھپائے ہوئے
جہالتوں کی طویل اور عریض پرچھائیں
توہمات کی تاریکیاں جگائے ہوئے
سفید قوم کے عیار تاجروں کے گروہ
فریب و مکر سے اپنی دکاں سجائے ہوئے
شکست خوردہ سیاسی گداگروں کے ہجوم
ادب سے ٹوٹی ہوئی گردنیں جھکائے ہوئے
غموں سے چند مسافر، تھکے ہوئے راہی
چراغ روح کے، دل کے کنول بجھائے ہوئے

یہ آدمی کی گذرگاہ شاہراہِ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہراتے
ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لئے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارضِ حسین دبائے ہوئے
اٹھو اور اٹھ کے انہیں قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

۲۸، دسمبر ۱۹۴۶ء

خون کی لکیر

(اس کتاب میں: ۵۹ نظمیں اور غزلیں اور (۴۹) قطعات ہیں جن میں (۳۶) نظمیں اور غزلیں پہلے مجموعۂ کلام "پرواز" سے ماخوذ ہیں۔ جعفری صاحب نے نظرثانی کرتے ہوئے کچھ نظموں کے عنوانات بدل دیے ہیں اور کہیں کہیں نہ صرف کچھ الفاظ تبدیل کر دیے ہیں بلکہ کچھ اشعار حذف بھی کر دیے ہیں۔)

انتساب ——— سلطانہ کے نام

پیش لفظ ——— (گرفتاری کے سبب ناشر کا مختصر سا معذرت نامہ)

اشاعت اوّل ——— ۱۹۴۹ء

ناشر ——— نوہند پبلشرز، بمبئی

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے غالبؔ

(انتخاب)

تمہید

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں میں
مے کشو آتش بجام آیا ہوں میں
میرے پیمانے میں گم ہے کائنات
میرے میخانے میں صہبائے حیات
میرے آئینے میں عکسِ صبحِ نو
آفتابِ عہدِ آزادی کی ضو
شہسوارِ گردشِ ایام ہوں
انقلابِ وقت کا پیغام ہوں
ہے مری چشمِ تخیل پر عیاں
اک نئے میلادِ آدم کا سماں
تاکہ ہو آسان پیکارِ حیات
کر رہا ہوں فاش اسرارِ حیات
اب جرس کو حکمِ خاموشی نہیں
کارواں میں خود فراموشی نہیں
حُسنِ معنی ہو رہا ہے بے نقاب
اُٹھ رہے ہیں استعاروں کے حجاب
آشکارا تیغ کا جوہر ہے آج
کسوتِ مینا سے مے باہر ہے آج

خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں
اب امیری کا فسوں چلتا نہیں
زلزلہ ہے ظلم کی بنیاد میں
تہلکہ ہے قصرِ استبداد میں
دم بخود ہیں قیصر و فغفور آج
تیز تر ہے نغمۂ جمہور آج

حلقۂ زنجیر گلنے ہی کو ہے
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

خود پرستی

میں نے پوچھا رات اک ٹوٹے ہوئے تارے سے یہ
" اے سراپا روشنی اے بزمِ انجم کے سفیر
مٹ گئی کیوں آسماں سے ایک ہی لمحے کے بعد
تو نے کھینچی تھی جو اک ہلکی سی سونے کی لکیر"
وہ ستارہ بجھتے بجھتے مجھ سے اتنا کہہ گیا
" خود پرستی کے غلط جذبے کی بیداری تھی وہ
جس کو سمجھا تو نے ایک ہلکی سی سونے کی لکیر
میری آوارہ تمنّا کی فسوں کاری تھی وہ "

فریب

۱۵ راگست اور اس کے بعد

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آپہنچی

اُنگلیاں جاگ اُٹھیں

بربطِ وطاؤس نے انگڑائی لی

اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلّائے کہ فریاد کے دن بیت گئے
راہ زن ہار گئے
راہ رو جیت گئے

قافلے دور تھے منزل سے، بہت دور، مگر
خود فریبی کی گھنی چھاؤں میں دم لینے لگے
چُن لیا راہ کے روڑوں کو خذف ریزوں کو
اور سمجھ بیٹھے کہ بس لعل و جواہر ہیں یہی
راہ زن ہنسنے لگے چھپ کے کمیں گاہوں میں

ہم نشیں یہ تھا فرنگی کی فراست کا طلسم
رہبرِ قوم کی ناکارہ قیادت کا فریب
ہم نے آزردگیٔ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

اب جدھر دیکھو اُدھر موت ہی منڈلاتی ہے
در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے
خواب زخمی ہیں، اُمنگوں کے کلیجے چھلنی
میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول

خوں میں لتھڑے ہوئے پھول
میں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں
قوم کے راہبر و راہزنو
اپنے ایوانِ حکومت میں سجا لو ان کو
اپنے گلدانِ سیاست میں لگا لو ان کو

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

(۲)

کون آزاد ہوا؟
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی

خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لیے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لیے

چور بازاروں میں بدشکل چڑیلوں کی طرح

قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں
ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لیے

کارخانوں پہ لگا رہتا ہے
سانس لیتی ہوئی لاشوں کا ہجوم
بیچ میں اُن کے پھرا کرتی ہے بیکاری بھی
اپنا خونخوار دہن کھولے ہوئے

اور سونے کے چمکتے سکّے
ڈنک اُٹھائے ہوئے پھن پھیلائے
روح اور دل پہ چلا کرتے ہیں
ملک اور قوم کو دن رات ڈسا کرتے ہیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمائے کے دلّالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

بالیاں دھان کی گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

ہم کہاں جائیں کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم

کس کو سمجھائیں، غلامی کے گنہگار ہیں ہم

شوق خود ہم نے بتہہ رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے طوفانوں کو

اب بھی زندانِ غلامی سے نکل سکتے ہیں
اپنی تقدیر کو ہم آپ بدل سکتے ہیں

(۳)

آج پھر ہوتی ہیں زخموں سے زبانیں پیدا
تیرہ و تار فضاؤں سے برستا ہے لہو
راہ کی گرد کے نیچے سے اُبھرتے ہیں قدم

تارے آکاش پہ کمزور حبابوں کی طرح
شب کے سیلاب سیاہی میں بہے جاتے ہیں
پھوٹنے والی ہے مزدور کے ماتھے سے کرن
سُرخ پرچم افقِ صبح پہ لہراتے ہیں

آنسوؤں کے چراغ

ہندوستان کے شرنارتھیوں، اور پاکستان کے مہاجرین کے نام

(۱)

میں سُن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں
داغِ غم بن کے رہ گئی ہیں

وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو مادرِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جل کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ ہمہمے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بیکار کر چکا ہے
وہ عہدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

(۲)

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے
وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے
قدامتوں کے کھنڈر میں ماضی کے بھوت دیوانہ وار ناچے
بہار کے سرخ آنچلوں سے خزاں کے بیمار رنگ برسے

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سلگ رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی بانہوں سے راہ رو کے گرے ہوئے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں
چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خوں بن کے برس رہا ہے

(۳)

یہ رات ہے کس قدر بھیانک
یہ خواب ہے کس قدر پریشاں
ہزاروں سہمی ہوئی نگاہیں
بلکتی آنکھیں سسکتی پلکیں
اندھیری شب میں
کروڑوں اشکوں کے جھلملاتے چراغ لے کر
ہجوم میں قاتلوں کے انصاف کے فرشتے کو ڈھونڈھتی ہیں

مگر میں یہ پوچھتا ہوں تم سے
شریف بہنو
غیور ماؤ
تمہاری آنکھوں میں بجلیوں کی چمک کے بدلے
یہ آنسوؤں کا وفور کیوں ہے

میں جانتا ہوں
تمہارے سینے میں، دل میں، زخموں میں، کتنے آنسو بھرے ہوئے ہیں

تم ان کی بوندوں سے آسمان و زمیں کا دامن بھگو چکی ہو
تم اس تلاطم میں وندھیا اور ہمالیہ کو ڈبو چکی ہو
مگر یہ خوننابہ بار آنکھوں کی بہتی گنگا
زمیں پہ پھیلے ہوئے لہو کے سیاہ دھبے نہ دھو سکے گی
یہ جھلملاتے ہوئے دیے ہیں
جو ظلم کے جھکڑوں، مصیبت کی آندھیوں میں نہ جل سکیں گے
تم ان کی مدھم سی روشنی میں
حسین النعمان کے فرشتے کو کب تلک ڈھونڈھتی رہو گی
کہ وہ بھی اس مقتل وطن میں
تمہاری ہی طرح، زخم خوردہ ہے، اور آوارہ پھر رہا ہے

(۴)

یہ کس سے فریاد کر رہی ہو
یہ کس کو آواز دے رہی ہو
تم اپنے زخموں کی راکھیاں لے کے کس کی محفل میں جا رہی ہو

تمہارے یہ راہبر نہیں ہیں
تمہارے یہ دادگر نہیں ہیں
یہ کاٹھ کی پتلیاں ہیں جن کو
سیاسی پردوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے مداری
سفید ریشم کی ڈوریوں پر نچا رہے ہیں
یہ سامراجی بساط شطرنج کے پیادے ہیں جن کو شاطر
ہزار چالوں سے شاہ و فرزیں بنا بنا کر چلا رہے ہیں
یہی تو ہیں وہ جنھوں نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے

وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی ایک گہری لکیر کھینچی
انھیں نے محفل کے ساز بدلے
انھیں نے سازوں کے راگ بدلے
یہی تو ہیں جو تمہارے اشکوں سے اپنے موتی بنا رہے ہیں
تمہاری عظمت، تمہاری عزّت، تمہاری غیرت چرا رہے ہیں

یہ قصر وہ ہے کہ جس کے دیوار و در میں
صدیوں کی لعنتیں بس کے رہ گئی ہیں
یہ تاج وہ ہے کہ جس کی ضو میں
وطن کے چہرے کا رنگ تحلیل ہو گیا ہے
یہ تخت وہ ہے کہ جس کے پائے
ہمارے دل میں گڑے ہوئے ہیں
یہ فرش وہ ہے جہاں فرنگی کے بھوت دن رات چل رہے ہیں
یہاں شہیدوں کا خوں چھلکتا ہے موجِ رنگِ شراب بن کر
یہاں بلکتا ہے دردِ دل کا سرودِ چنگ و رباب بن کر
یہاں امیدوں کے پھول اور آرزو کے غنچے نہ کھل سکیں گے
یہاں تمھیں عدل اور انصاف کے فرشتے نہ مل سکیں گے
یہ ظالموں کا محل ہے، یہ قاتلوں کا مسکن ہے، یہ لیڈروں کی انجمن ہے

(۵)

شریف بہنو، غیور ماؤ
تمہارے بھائی
تمہارے بیٹے
تمہاری فریاد سن رہے ہیں

ملوں سے، کھیتوں سے، اور کانوں سے تم کو آواز دے رہے ہیں
وہ دیکھو ان کے جوان سینوں میں
عدل اور انصاف کی جوالا بھڑک رہی ہے
نگہ میں بجلی چمک رہی ہے
اندھیری شب سے پرے شفق کی سنہری مینا چھلک رہی ہے

وہ اپنے سینے کا سوز لائیں
میں اپنے نغموں کی آگ لاؤں
تم اپنی آہوں کی مشعلوں کو جلا کے نکلو
ہم اپنی روحوں کی تابناکی سے اس اندھیرے کو پھونک دیں گے
کہ جس کے منحوس دامنوں میں
گناہ پروان چڑھ رہے ہیں

غزل

امتحاں بزمِ وطن میں ہے وفاداری کا
اہرمن تخت نشیں ہے، اسے یزداں کہیے

کیجیے روح کو تیارِ غلامی کے لیے
شوقِ آزادیٔ انساں کو گریزاں کہیے

کسی بھوکے کو بھی بھوکا نہ سمجھیے ہرگز
کوئی عریاں نظر آئے تو نہ عریاں کہیے

یہ نہ کہیے کہ حکومت ہے مصائب کا سبب
گردشِ چرخِ کہن، گردشِ دوراں کہیے

کیجیے شاعری اس طرح کہ سمجھے نہ کوئی
ظلم اور جور کو بھی نازِ حسیناں کہیے

کوئی بھی بات سمجھنے کی نہ زحمت کیجیے
قلب اور ذہن کو آئینۂ حیراں کہیے

کھینچ لیجیے رگِ الفاظ سے خونِ معنی
رقصِ بسمل کی جگہ رقصِ غزالاں کہیے

ہر درندے کو پنہا دیجیے انساں کا لباس
اور جی کھول کے انسان کو حیواں کہیے

رات دن کیجیے سرکار کی چوکھٹ کا طواف
اور اسے حاصلِ جاں حاصلِ ایماں کہیے

شبِ تاریک کو سینے سے لگا کر رکھیے
اور اسے چشمۂ خورشیدِ درخشاں کہیے

دیکھیے خاکِ وطن سے یہ محبت کا ثبوت
کہ خس و خار کو بھی رشکِ گلستاں کہیے

کیجیے کوچہ و بازار میں لاشوں کا شمار
اور پھر ہند کو فردوس بداماں کہیے

سیکھیے ساز پہ آہوں کے غزل خواں ہونا
جھلملاتے ہوئے اشکوں کو چراغاں کہیے

زہر کے جام کو نوشینہ سمجھ کر پیجیے
دل میں اُترے ہوئے نشتر کو رگِ جاں کہیے

اپنے ہر زخمِ ستم کو اک پھول تصور کیجیے
سرخیٔ خونِ عزیزاں کو بہاراں کہیے

چارہ گر جانیے بس دور میں ہر قاتل کو
زندگی موت کو، اور درد کو درماں کہیے

تن سے چھن جائے تو رہزن کو دعائیں دیجیے
چاک ہو جائے تو دامن کو گریباں کہیے

خاک پر سوئیے آکاش کے سائے کے تلے
بسترِ مخمل و کمخواب و شبستاں کہیے

دخترِ دشمنِ ناپاک کو دیجیے بوسہ
اور اسے قیمتِ ناموسِ شہیداں کہیے

مختصر یہ ہے کہ اب سانس بھی لینا ہے حرام
تا کجا قصۂ احوالِ پریشاں کہیے

لطف تو جب ہے کہ دل دار و رسن سے کھیلے
اور اس شغل کو بازیچۂ طفلاں کہیے

۲۵ ستمبر ۴۸ء

جیل

تیرگی رِستی ہے
جیسے زخموں سے سیہ خون کی بوندیں ٹپکیں
خامشی چلتی ہے
چیونٹیاں جیسے بدن پر رینگیں
قید میں چلتے ہوئے سایوں کو
اور پتھرائی ہوئی آنکھوں کی اندھی دیوار
ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھتی ہے
درد کی طرح سے اُٹھتی ہیں امنگیں دل میں
ٹیس کی طرح سے بھولی ہوئی یاد آتی ہے

جیل کی خاک سے آہوں کا دھواں اٹھتا ہے
اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے
بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فغاں کرتی ہیں
کوڑے چیخ اٹھتے ہیں جلاّدوں کی خونخواری پر
کتنی صدیوں سے ہے قائم یہ تشدّد کا نظام
آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے
دھارے اس وادیٔ خاموش میں تھم جاتے ہیں
آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں
نالے بے سود ہیں بیکار ہے فریاد یہاں
ہم ہیں صید اور ہر اک ذرّہ ہے صیّاد یہاں
اپنے ہاتھوں سے تشدّد کو مٹانا ہوگا
آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

خواب

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
اقبالؔ

(۱)

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پُرہول المناک افسانوں کو اپنے دل میں دبائے ہوئے ہوں
کتنے ہی جشن، کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خوں بھری داستانیں

بادشاہوں کی جنگی حکایات
دیو اور پریوں کے قصّے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے
میرے ہونٹوں پہ سوئے ہوئے ہیں
میں انھیں جب کبھی چاہوں جگا لوں

مجھ کو معلوم ہے بابل و نینوا کے کھنڈر
وہ — فرات اور دجلے کی موجیں جنھیں لوریاں دے رہی ہیں
کس لیے آج ویران ہیں
ان میں اُن مطلق الحکم شاہوں کے ایوان تھے
جن کے ہونٹوں کی جنبش
موت کی ہم زباں تھی

ساحلِ نیل پر وہ ابوالہول سکتے کے عالم میں اب تک کھڑا ہے
مصر کے سربلند آسماں بوس اہرام مبہوت ہیں
علم و تہذیب کی اس پرانی زمیں پر
سرپھرے اور مغرور فرعون چھائے ہوئے تھے
جو غلاموں کے انسان کو لوٹتے تھے

(ماخوذ از کارل سینڈبرگ)

اور وہ یونان کے قصر میں
روم کے اونچے اونچے ستون ہیں
وہ بھی اک داستان کہہ رہے ہیں
ان کے سائے میں بردہ فروشی کے بازار تھے
جن میں انسان انسان کو بیچتا تھا

(ماخوذ از کارل سینڈبرگ)

وہ سمرقند کے سبز گنبد
اور بخارا کے ایوان ہیں
جن پہ خونخوار تاتاریوں کی اڑائی ہوئی گرد بیٹھی ہوئی تھی
اُف یہ چنگیز و تیمور کی عیش گاہیں
ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندی ہوئی آدمیت کی
چیخوں سے گونجی ہوئی تھیں
اور وہ بسطیل کے قیدخانے کی دیواریں ہیں
جن کی اینٹیں شرابی، زناکار، جاگیرداروں پہ
جی کھول کر ہنس رہی ہیں
ان کے لوہے کے در پر کلیساؤں کے پادری پاسبان تھے
وہ امیروں کو جنت کے پروانے اور مفلسوں کو
صبر و شکر و سکون اور روحانیت کا سبق دے رہے تھے

اور وہ ماسکو کا کریملن ہے
جس کے ماتھے کا روشن ستارہ
سُرخ کرنوں کی تنویر برسا رہا ہے
اس کے اندر ابھی کل تک
روس کے زارِ کھیتوں کے اور کارخانوں کے مالک
روئی، فولاد، تیل اور بارود کے بین الاقوامی بیوپاری بیٹھے ہوئے
جنگ کی سازشیں کر رہے تھے

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سُن چکا ہوں
آج دلّی کی آواز بھی سُن رہا ہوں
جس کے سینے پہ ظالم فرنگی کے پٹھو بغل بچوں کی ڈگمگاتی حکومت
کا اک بوجھ رکھا ہوا ہے

آہ یہ میری اپنی ہی آواز ہے
میرے اہلِ وطن کے دلوں کی صدا ہے
جو ہمارے گلوں میں
ایک زخمی پرندے کی مانند
ڈیڑھ سو سال تک پھڑپھڑاتی رہی ہے

اب نہ وہ بابل و نینوا کے شہنشاہ ہیں
اور نہ وہ مصر کے سر پھرے اور مغرور فرعون ہیں
اور نہ وہ روم و یونان کے بردہ فروش
اور نہ خونخوار چنگیز و تیمور
اب نہ بسٹیل کے پاسباں ہیں
اور نہ وہ روس کے زار ہیں
صرف ان کے مظالم کی ایک خوں بھری داستاں رہ گئی ہے

آخر خونخوار و خود سر فرنگی کا خونیں سفینہ بھی گرداب میں پھنس چکا ہے
اور اُن کے غلام اُن کے پٹھو
زخم کھائے درندوں کے مانند چلّا رہے ہیں
اُن کی آواز میں موت کا راگ ہے
اُن کے سینے میں بجھتی ہوئی آگ ہے
اور جمہور کے کاروانوں کی گردِ سفر ان کی عظمت کی لاشوں کو کفنا
رہی ہے
اور وہ حادثہ جو ابھی پردۂ آسماں میں چھپا ہے
میرے ادراک کے آئینے میں نظر آ رہا ہے

(۲)

آج دلّی کی کھوئی ہوئی رفعتیں اس کو پھر مل گئی ہیں
اس کا مکھڑا خوشی سے دمکنے لگا ہے
جس کی تنویر سے ایشیا جگمگایا ہوا ہے

کتنے ہی تخت دیکھے ہیں اس نے
کتنے ہی تاج پہنے ہیں اس نے
اس کے سینے پہ کتنے ہی شاہوں کے نقشِ قدم ہیں
کتنی تہذیبیں، کتنے تمدّن
اس کی آغوش میں سو رہے ہیں
کتنے ٹوٹے ہوئے آفتاب اور مہتاب
اس کے کھنڈروں میں بکھرے پڑے ہیں
کتنے ہی گیت، کتنے ہی نغمے
اس کی سانسوں میں اُلجھے ہوئے ہیں
اس کے ماتھے پہ سورج بھی چمکا
چاند بھی جگمگایا
غم کی گھنگھور کالی گھٹائیں بھی چھائیں
دکھ کی راتیں بھی بیتیں
سکھ کی صبحیں بھی آئیں
یہ مگر اک نئے عہد کی، اک نئی نسل کی منتظر تھی

میری دلّی
میری محبوب دلّی
غالب و میر کی سرزمیں

اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ
اور خود کام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکوں کے سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے
تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے، خوابوں کی تعبیر ہے
آرزوؤں کی تصویر ہے
تیرے چہرے پہ میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے سمٹ آئے ہیں
یہ اشوک اور اکبر کے عہدِ حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے
دیکھ ہندوستاں کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخسار پر نور کا جال سا
بن رہی ہیں

روٹیوں کے لیے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستاں کے بہادر سپاہی ہیں جو
انقلاب اور بغاوت کی بھڑکی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں
ننگی تلواروں کی دھار پر چل چکے ہیں
یہ تری مملکت کے طرف دار ہیں
تیری قسمت کے معمار ہیں
تیری آزادی کے پاسباں ہیں

یہ انکھیں کی رگوں کا لہو ہے
ان کے سینے کا خوں ہے
تیرے ماتھے پہ جو آج رنگِ شفق
اور ہتھیلی پہ رنگِ حنا بن گیا ہے

(۳)

جاگ ہندوستاں اپنے خوابِ گراں سے
دیکھ آزادی کی صبح کا نور پھیلا ہوا ہے
تیرے برسوں کے بچھڑے ہوئے لال گھر آرہے ہیں
یہ غلامی کی زنجیر کو توڑ آئے
قید خانوں کے در کھول آئے
اپنی آغوش میں ان کو بڑھ کر اٹھا لے
اپنے دل میں بٹھا لے

یہ ہمالہ ہے، یہ وندھیاچل ہے، یہ نیلگیری
یہ ترے کھیت ہیں، تیرے کھلیان ہیں
تیری کانیں ہیں یہ، باغ ہیں، یہ ترے کارخانے
یہ ترے سبز و شاداب میدان یہ ہنستی ہوئی وادیاں ہیں
یہ تری صاف و شفاف بہتی ہوئی ندیاں
تیری گودوں کی پالی ہوئی بیٹیاں ہیں
ان کو اپنے گلے سے لگا لے
اپنے پاکیزہ آنچل کے نیچے چھپا لے

دیکھ یہ اپنے خونیں کفن میں

یہ تیرے لاکھوں شہیدوں کی روحیں کھڑی ہیں
جو تجھے تہنیت دے رہی ہیں
ان کی آنکھیں مسرّت کے اشکوں سے نمناک ہیں
لیکن ان کے گریباں ابھی چاک ہیں
ان کو اپنی محبّت سے سی دے
پرچم اب سے کہو کھُل کے انگڑائیاں لیں
فوجیں اپنی شکستہ صفوں کو جمائیں
فتح اور کامرانی کے ڈنکے بجائیں
توپیں جمہوریت کی سلامی اتاریں
اور طیّاروں کو حکم دو
آسمانوں پہ جھپٹیں
اپنے مضبوط فولاد کے شہپروں کو ذرا آزمائیں
چاند تاروں کو آکاش سے توڑ لائیں
کشتیاں اپنے لپٹے ہوئے بادباں کھول دیں
اور جہاز اپنے لنگر اٹھائیں
سینۂ بحر سے شاہی جھنڈے ہٹا کر
اپنے جمہوری اور اشتراکی پھریرے اُڑائیں

بچّے گہواروں میں کھلکھلا کر ہنسیں
مائیں اشکوں میں بھیگے ہوئے آنچلوں کو سکھائیں
دیویاں مانگ میں اپنی سیندور رکھیں
بیبیاں اپنے ماتھوں پہ افشاں لگائیں
ناچیں ناچیں اجنتا کی شہزادیاں
اور ایلورا کی پریاں

اپنی صدیوں کی خاموشی کو توڑ کر گیت گائیں

کیتکی اور چمپا کی کلیاں
اپنی خوشبو بکھیریں
اور بہار کی جھیلوں میں ہنستے ہوئے سرخ دلکش کنول
اپنی نازک ہتھیلی پر رنگین شمعیں جلائیں
وادیاں مسکرائیں
کھیتیاں لہلہائیں
کوہسار اپنے سینوں کی دولت نکالیں
آبشار اپنی قوت دکھائیں
کانیں اپنے خزانوں کے در کھول دیں
اور ہندوستاں کے قدم پر
اپنے لعل و جواہر نچھاور کریں
آہنی کارخانوں سے کہہ دو
اپنے پہیّوں کی رفتار کچھ تیز کر دیں
اور نغموں کے طوفاں اٹھائیں
آسماں پر چمکتے ہوئے صبح آزادی کے سرخ سورج
تو ہمیں دور سے کس لیے دیکھتا ہے؟
آ ہماری زمیں پر اُتر آ

تیرے سینے میں وہ روشنی اور حرارت نہیں ہے
جو ہمارے دلوں میں
تیرے ماتھے پہ رنگِ شفق ہے
اور ہماری جبیں پر ہمارے شہیدوں کا خوں ہے

روشنی تیری کرنوں کی سطحِ زمیں تک
اور ہماری نگاہوں سے دل کے کنول جل رہے ہیں
تو نقیبِ سحرِ نو کا پیمبر ہے
ہم نئے عہد کے ترجماں ہیں

اپنے آکاش کے اونچے آسن پہ بیٹھے ہوئے دیوتا
تو کروڑوں برس سے
اپنی ہی آگ میں جل رہا ہے
ایک ہی راہ پر صبح سے شام تک
شام سے صبح تک چل رہا ہے
آ ہماری زمیں پر اُتر آ
ہم ترے دل کو انسان کی روح کا سوز دے دیں

اے ہزاروں برس کے تھکے ماندے بوڑھے مسافر
آ ہماری زمیں پر اُتر آ
دو گھڑی ہند کے سبزہ زاروں میں آرام کر لے
اپنی جھولی کو پھولوں سے بھر لے
اور اپنے سفر پر چلا جا

رومان سے انقلاب تک

(پندرہ برس کی ترقی پسند شاعری پر تنقید)

ساتھیو اب مری انگلیاں تھک چکی ہیں
اور مرے ہونٹ دُکھنے لگے ہیں
آج میں اپنے بے جان گیتوں سے شرما رہا ہوں

میرے ہاتھوں سے میرا قلم چھین لو
اور مجھے ایک بندوق دے دو
تاکہ میں اپنے نغموں میں فولاد و بارود کا زور بھر دوں
میں تمہاری صفوں میں تمہاری طرح
اپنے دشمن سے لڑنے چلوں گا
میں تمہارے نفس کی حرارت
تمہارے لہو کی روانی
تمہارے دلوں کی تڑپ چاہتا ہوں

میں ادب کی بلندی سے واقف ہوں مجھ کو
شعر کی قوّتوں کا بھی احساس ہے
جن سے ریگِ بیاباں میں طوفاں اُٹھے ہیں
لیکن اب مجھ کو اس دور کے
سارے اشعار بے کیف سے لگ رہے ہیں
وہ مرے اپنے اشعار ہوں یا کسی اور کے
ان میں تلوار کی دھار، بجلی کی تیزی نہیں ہے
صرف اشکوں کے طوفان، خوابوں کے رومان ہیں
خوں کی گرمی نہیں ہے

میں نے ہر طرح کے گیت گائے
میں نے ہر رنگ کے پھول برسائے لیکن
پھول زخموں میں اور گیت فریاد میں کھو گئے

میں نے زخموں پہ اشکوں کا مرہم لگایا

میں نے آہیں بھریں
میں نے اپنی امنگوں کی لاشوں پہ ماتم کیا
اپنی مردہ محبت کی قبریں بنائیں
اور انھیں جا کے بازار میں بیچ آیا

میں نے برفاب جسموں کو پگھلا دیا
تھرتھراتے ہوئے نرم آنچل کو سینوں سے ڈھلکا دیا
اور پہلی محبت کے پھولوں سے شبنم کے موتی چنے
اور انھیں
چند کاغذ کے ٹکڑوں میں
کپڑے کی جلدوں میں محفوظ کر کے
کتب خانوں میں رکھ دیا

ان کے اوراق پر تہہ بہ تہہ
ماہ اور سال کی گرد جمتی رہی
اور میں اپنے جذبات کی دھندلی دھندلی فضاؤں میں کھوتا گیا
زندگانی کی شورش سے کچھ اور بھی دور ہوتا گیا

میں نے دہلی میں پنجاب میں اپنے لفظوں کی جھولی پساری
اور ایک ایک سے امن کی بھیک مانگی
اُن کو مجھ پر ترس آ گیا
(اس سے کیا بحث وہ کون تھے
راہزن تھے کہ جلاد تھے
پھر بھی انسان تھے
آخرش وہ مرے ہم وطن تھے)

اور انھوں نے مری گود میں
چند جھلسے ہوئے ہاتھ
ٹوٹی ہوئی ہڈیاں
خون میں لتھڑی ہوئی چھاتیاں پھینک دیں

روٹیوں کو کبھی میں نے چاند اور سورج سے تشبیہہ دی اور کبھی
رنڈیوں سے
اور وہ چاند سورج کی مانند ہم سے بہت دور نیلی فضاؤں میں
اڑتی رہیں
صرف خوابوں میں صورت دکھاتی رہیں
رنڈیوں کی طرح
نفع خوری کے اونچے جھروکوں میں بیٹھی ہوئی مسکراتی رہیں
آنتیں روتی رہیں پیٹ یوں ہی بلکتے رہے
بھوک کی آگ میں روح اور دل سلگتے رہے

میں نے اپنے تخیل میں خوابوں سے کپڑے بُنے
اور ستاروں سے آنچل بنائے
میں نے ان کارخانوں کے نغمے سُنے
جو ابھی صرف میرے تصور میں محبوس ہیں
اور میرا وطن چیتھڑوں ہی میں لپٹا رہا

ریت سے میں نے کتنے گھروندے بنائے
اور ہمالہ کی نیلی چٹانوں کے دل کو ٹٹولا
میں نے پتھر کے سینے میں محراب و مینار کا حسن دیکھا

اور مرا ذہن کیا جانے کتنے ستوں، کتنے دیوار و در ڈھال لایا
میں نے اپنے وطن کو سجایا
اس کے ایک ایک ذرّے کے دل میں اجنتا ایلورا بسایا
پھر بھی میرا وطن آج ویران ہے
اس کے محلوں میں چور اور ڈاکو بسے ہیں
اور انسان سڑکوں پہ آوارہ ہیں

اور میں سوچتا ہوں کہ میں کون ہوں
کس کا شاعر ہوں
کس کے لیے گا رہا ہوں

اک طرف اونچے اونچے محل ہیں
اک طرف جھونپڑے ہیں
اک طرف گوشت کے اور چربی کے بورے دھرے ہیں
اک طرف سخت فولاد کے سخت اعصاب ہیں
اک طرف ظلم اور جبر کی قوتیں ہیں
اک طرف عدل و انصاف کا زور ہے
اک طرف ماؤ ہے اک طرف چیانگ ہے
اک طرف مارشل اک طرف مالوتاف
اک طرف کالی فسطائیت اک طرف انقلاب
اک طرف ایلیٹ اک طرف گورکی
اک طرف فصلِ گل اک طرف خارزارِ خزاں
اک طرف عہدِ ماضی کی ویرانیاں
اک طرف آنے والے زمانے کی تعمیر

اک طرف شب کی پر ہول پرچھائیں ہے
اک طرف سُرخ سورج کی تنویر ہے
اک طرف موت ہے اک طرف زندگی ہے
اک طرف تیرگی اک طرف روشنی ہے
اک طرف خامشی اک طرف شاعری ہے

شاعرو، ساتھیو
وقت نے فیصلہ کر دیا ہے
بولو تم آج کس کے طرف دار ہو
کس کے غم خوار ہو
آج بندوق بربط ہے فولاد کی گولیاں راگنی ہیں

شاعرو، ساتھیو
اپنے تاریک اندیشۂ رومان کے ساز کو توڑ دو
اپنی مضراب کو پھینک دو
اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے
اپنی شہرت کے اونچے مناروں سے
نیچے اتر آؤ
اپنے کتب خانوں سے
آؤ باہر نکل آؤ
اور زندگانی کی رفتار دیکھو
عہد حاضر کے انسان کا جوش دیکھو

شاعرو، ساتھیو

کاکلوں کی گھنی چھاؤں سے
سُرخ پرچم کے سائے میں آؤ
اور نئے گیت گاؤ
گاؤ مزدور کے ساز پر
گاؤ جمہور کے ساز پر
آہنی کارروانوں کے قدموں کی آواز پر
گاؤ جس طرح میداں میں کوئی مجاہد رجز پڑھ رہا ہو
گاؤ جیسے سمندر میں طوفان کا دیوتا چڑھ رہا ہو
گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح
گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح
زلزلوں کی طرح
گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پر برساؤ
سارے عالم پہ چھا جاؤ

غزل

سکوں میسّر جو ہو تو کیوں کر، ہجومِ رنج و محن وہی ہے
بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظامِ دار و رسن وہی ہے

فریب یہ دے دیا ہے کس نے کہ حرّیت کی برات آئی
ترنگی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکر و فن وہی ہے

ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے
نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے، نوائے سازِ کہن وہی ہے

ابھی تو دیوار و در پہ منڈلا رہے ہیں بیکاریوں کے سائے
ملوں کے اعصاب کا تشنّج وہی رگوں کی تھکن وہی ہے

وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی
لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے

سماج کے رُخ پہ ہے غریبوں کے خونِ ناحق کا گرم غازہ
ہیں جس میں پیچیدہ مار و کژدم یہ زلفِ عنبر شکن وہی ہے

لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں، زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

بجھا رہا ہے زمانہ پیاس اپنی علم و حکمت کے میکدوں سے
ہماری محفل میں وہمِ شیخ و جہالتِ برہمن وہی ہے

جنھیں ہم اپنا سمجھ رہے تھے وہ آج بیگانے ہو گئے ہیں
جو غیر کے ابروؤں پہ کل تھی جبیں پہ ان کے شکن وہی ہے

ابھی تو خاشاک کے لیے ہے ہزار طوفان کی ضرورت
اُٹھی تھی جو پیچ و تاب کھاتی یہ موجِ گنگ و جمن وہی ہے

بلند محلوں کے بام و گنبد پہ جھوٹی کرنوں کو ناچنے دو
جو کالی کٹیاؤں کو اُجالا عطا کرے گی کرن وہی ہے

○

امن کا ستارہ

(یہ کتاب تین طویل نظموں کا مجموعہ ہے (۱) سوویت یونین اور جنگ باز (۴۳) اشعار (۲) –
اسٹالن گتھا (۲۶۰) اشعار (۳) امن کا ستارہ (۴۶۰) مصرعے۔ کتاب کے آخر میں
" بیرونی ناموں کی تشریح " کے عنوان سے ایک اشاریہ بھی دیا گیا ہے)

انتساب —— امن عالم کے مجاہدوں کے نام
پیش لفظ —— سردار جعفری
اشاعت اوّل —— جولائی ۱۹۵۰ء
ناشر —— کتب پبلشرز۔ بمبئی

جنگ باز خونخوارو
ہم تمہیں سزا دیں گے
بے غرور زرداری
خاک میں ملا دیں گے
خون کے پیاسے ہو
ہم مزہ چکھا دیں گے
وہ نظام۔ وہ دنیا
جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے
سردار جعفری

(انتخاب)

۱۔ امن کا ستارہ۔ (ایک شاعرانہ تقریر سے اقتباس)

امن کاستارہ

ایک شاعرانہ تقریر!

میرا آدرش انسان ہیں
وہ مرا دین و ایمان ہیں
اُن کے ناموں سے اخبار و تاریخ واقف نہیں
اُن کے ماتھوں پہ عظمت کی کلغی نہیں
سر پہ ادبار ہے
پیٹھ پر بوجھ ہے
ان کو شہرت کی کوئی ہوس ہے
نہ عزّت کی خواہش
نہ انعام و اکرام کی جستجو
وہ ہوا کی طرح صاف دل
پانی کی طرح پاکیزہ
سورج کی پہلی کرن کی طرح گرم دل
پھول کی طرح خاموش
دریاؤں کی طرح فیّاض
اور پیڑ کی پتّوں کی طرح ان گنت
سادگی اور ایمانداری سے دن رات محنت میں مصروف ہیں
زندگی ان کی دن رات کی گردشوں کے سوا کچھ نہیں
ان کے کاندھوں پہ بھاری ملیں اور مشینیں پہاڑوں کی مانند رکھی ہوئی
ریل کی پٹریاں ان کے سینوں پہ لپٹی ہوئی

گرم بجلی کے تاران کی نیلی رگوں سے گذرتے ہوئے
اور ان کے لہو کی دہکتی ہوئی سُرخ باناتِ پر
جنگ، غارت گری، لوٹ اور حکمرانی جلوسوں کی صورت میں چلتی ہوئی

میں اسی سیدھے سادھے غریب اور مجبور انسان کا دردمند
اس کی آشاؤں، اس کی تمناؤں کا ترجماں
اس کے خوابوں کی تعبیر کا رازداں
آج استالنی بارگہ کی طرف
اپنے جوشِ عقیدت، خراجِ محبت کو لے کر چلا ہوں

O

ایشیا جاگ اُٹھا

(یہ طویل نظم جون ۱۹۵۰ء میں سنٹرل جیل ناسک میں لکھی گئی - پہلے ایک منظوم "حرفِ اوّل" (۸۸) اشعار پر مشتمل ہے - پھر اصل نظم جو (۷۰۵) مصرعوں پر محیط ہے ایک ہی بحر میں، کہیں پابند اور کہیں آزاد - ایک طرح سے ایشیا کا تاریخی تجزیہ ہے جو (۱۲) حصّوں میں پھیلا ہوا ہے)

انتساب ــــــ کرشن چندر کی حسین و جمیل کہانیوں کے نام

اشاعتِ اوّل ــــــ اکتوبر ۱۹۵۱ء

ناشر ــــــ سردار جعفری

> جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہوگا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
> قریب تر ہے نمود جس کی، اُسی کا مشتاق ہے زمانہ
> جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا، وہ عالم پیر مر رہا ہے
> جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
>
> اقبال

(انتخاب)

۱- پہلا حصّہ
۲- چھٹا حصّہ
۳- گیارھواں حصّہ

ایشیا جاگ اٹھا

(۱)

یہ ایشیا کی زمیں، تمدّن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب اُلٹی
یہیں سے اگلے یُگوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
اسی بلندی سے ویدنے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی سماتنا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل، انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰؐ کے سر پر چمک چکا ہے
اور اب ہمارے قدیم آکاش کے ستارے
قدیم آنکھوں سے ماؤ کی سُرخ فوج کی شان دیکھتے ہیں

یہ خاک وہ خاک ہے کہ جس نے
سنہرے گیہوں کے موتیوں کو جنم دیا ہے
یہ خاک اتنی قدیم جتنی قدیم انسان کی داستانیں
عظیم اتنی عظیم جتنی ہمالیہ کی بلندیاں ہیں
حسین اتنی حسین جتنی حسیں اجنتا کی اپسرائیں
یہ اپنی فیاّضیوں میں دریائے نیل و گنگا سے کم نہیں ہے
یہ گود بچوّں سے اور پھولوں سے اور پھلوں سے بھری ہوئی ہے

حقیر کپلنگ مر چکا ہے
ذلیل چرچل کو شاید اب تک خبر نہیں ہے
ہمارے کھنڈروں کے نام بھی ان کی ساری بکواس سے گراں ہیں
ہمارا ورثہ مہنجو داڑو سے لے کے دیوار چین تک ہے
ہماری تاریخ تاج اور سیکری سے اہرام مصر تک ہے
ہمیں روایات کے خزانوں سے بابل و نینوا ملے ہیں
فصاحتوں نے ہمارے بچپن کے ہونٹ چومے
بلاغتوں نے بڑی حسیں لوریاں سنائیں
زبان کھولی تو وید، انجیل اور قرآن بن کے بولے
ہماری تخئیل آسمانوں کی اس بلندی کو چھو چکی ہے
جہاں سے فردوسی اور سعدی
نظامی، خیام اور حافظ کے چاند سورج چمک رہے ہیں
بلندیاں جن پہ والمیک اور پاک تلسی
کبیر اور سور حکمراں ہیں
انھیں فضاؤں کی بجلیاں ہیں
جو ساز اقبال اور ٹیگور کے ترانوں میں گونجتی ہیں
جو آج ناظم کی شاعری میں تڑپ اٹھی ہیں
جو توہ سوں کی کہانی بن کر چمک رہی ہیں

(۶)

یہ ایشیا کی زمیں، تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے
جبیں پہ تاروں کا تاج، پیروں میں جھاگ کی جھانجھنوں کا نغمہ
زمین —— صدیوں پرانا چہرہ
کسان —— صدیوں پرانے ہاتھوں میں اپنے لکڑی کے ہل سنبھالے

غریب مزدور، جلتی آنکھیں
اُچاٹ نیندوں کی تلخ راتیں
تھکے ہوئے ہاتھ، بھاپ کا زور، گرم فولاد کی روانی
جہاز، ملّاح، گیت، طوفاں
کمہار، لوہار، چاک، برتن
گوالنیں دودھ میں نہائی
الاؤ کے گرد بوڑھے افسانہ گو، کہانی
جوان ماؤں کی گود میں ننھے ننھے بچوں کے بھولے چہرے
لہکتے میدان، گائیں، بھینسیں
فضاؤں میں بانسری کا لہرا
ہری بھری کھیتوں میں شیشے کی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہیں
اُداس صحرا پیمبروں کی طرح سے خاموش اور گمبھیر
کھجور کے پیڑ بال کھولے
دفوں کی آواز ڈھلکیوں کی گمک
سمندر کے قہقہے ناریل کے پیڑوں کی سرد آہیں

ستار کے تار سے برستے ہوئے ستارے
انار کے پھول، آم کا بور، سیب و بادام کے شگوفے
کوٹھار، کھلیان، کھاد کے ڈھیر، کنواری پگڈنڈیوں کی گردش
بلند بانسوں کے جھنڈ ہنستی دھنک کے نیچے
گھنیرے جنگل
پہاڑ، میدان، ریگزاروں کے گرم سینے
گپھائیں جنّت کی طرح ٹھنڈی
سمندروں میں کنول کے پھولوں کی طرح رکھے ہوئے جزیرے

چمکتے مونگوں کی مسکراہٹ
وہ سیپیوں کی ہنسی، وہ سنتھال لڑکیوں کے چمکتے دانتوں کی آبِ موتی
وہ مچھلیاں گوشت سے بھری کشتیاں جو نکھلی
سفید چاندنی میں تیرتی ہیں
وہ لمبی لمبی حسین ندیاں
جو اپنی موجوں سے ساحلوں کے لرزتے ہونٹوں کو چومتی ہیں
دلہن بنی وادیوں کی نازک کمر میں جھرنوں کے نرم حلقے
پہاڑیوں کی ہتھیلیوں پر دھرے ہوئے نیلگوں کٹورے
ستارے منہ دیکھتے ہیں جھیلوں کے آئینے میں
ہمالیہ کے گلے میں گنگا کی اور جمنا کی شوخ بانہیں
پہاڑ کی آندھیوں کے ماتھوں پہ برف کے نیلگوں دوپٹے
بلندیوں پر خفیف سا ارتعاش، ہلکی سی راگنی کا
ہوا کے پیروں میں جیسے گھنگھرو بندھے ہوئے ہوں
کہیں فضاؤں میں برف کے پھول اُڑ رہے ہیں
کہیں جوالا مکھی کے شعلے
جو اپنی زلفوں کو پگھلے لاوے کی کنگھیوں سے سنوارتے ہیں
ہواؤں کی انگلیاں چناروں کے سُرخ بالوں میں رنگتی ہیں

یہ ایشیا ہے، جوان، شاداب اور درخشاں ایشیا ہے
کہ جس کے نردھن غریب بچّوں کو بھوک کے ناگ ڈس رہے ہیں
وہ ہونٹ جو ماں کے دودھ کے بعد پھر نہ واقف ہوئے کبھی دودھ کے مزے سے
زبانیں ایسی جنھوں نے چکّھا نہیں ہے گیہوں کی روٹیوں کو
وہ پیٹھ جس نے سفید کپڑا چھوا نہیں ہے
وہ انگلیاں جو کتاب سے مس نہیں ہوئی ہیں

وہ پیر جو بوٹ اور سلیپر کی شکل پہچانتے نہیں ہیں
وہ سر جو تکیوں کی نرم لذّت سے بے خبر ہیں
وہ پیٹ جو بھوک ہی کو بھوجن سمجھ رہے ہیں
یہ نادار، روزگار انساں
تمہیں فقط ایشیا کی جنّت ہی میں ملیں گے
جو تین سو سال کے "تمدّن" کے بعد بھی "جانور" رہے ہیں

کہاں ہو "تہذیب اور تمدّن" کی روشنی لے کے آنے والو
تمہاری "تہذیب" کی نمائش ہے ایشیا میں
نظر اٹھاؤ قریب آؤ
یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو
یہ دیکھو ہیضے کی قے، یہ طاعون کی گلٹی
یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی
جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی سپاہیوں سے
یہ پیٹھ دیکھو، یہ پیٹھ کتنی حسیں ہے جس پر
تمہارے کوڑوں کی بدّیاں ہیں
یہ پھانسیوں پر لٹکتی لاشیں
یہ جیل خانوں میں بند انساں
یہ دل جو ہیں گولیوں سے چھلنی
یہ آنکھ کی پتلیاں جو خون اور پیپ کی طرح بہہ رہی ہیں
یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے
یہ ہاتھ لکڑی کی طرح سوکھے
یہ پیٹ مٹکوں کی طرح پھولے
یہ مفلسی اور یہ جہالت کی رات، بے چاند بے ستارا

یہ بھوک، یہ بے بسی، یہ نفرت
یہ ہنستے پھوڑے
بلکتے گھینگے
دہکتے ناسور، چیختے زخم، رینگتے جسم جیسے کیڑے
تمہاری سرمایہ دار "تہذیب" کی کہانی سنا رہے ہیں
بلاؤ اپنے مصوّروں اور بُت گروں کو
کہیں زمانے میں اس قدر دردناک چہرے نہیں ملیں گے
تمہاری شاہانہ یادگاروں سے ایشیا کا
ہر ایک کونا بھرا ہوا ہے
کہیں یہ محراب فتح باندھی
کہیں رعونت کی لاٹ اٹھائی
کہیں یہ کانسے کے گھوڑے ڈھالے
کہیں یہ پتھّر کے بُت بنائے
مگر یہ "تہذیب اور تمدّن" کی یادگاریں کہیں نہیں ہیں
بلاؤ اپنے مصوّروں اور بُت گروں کو
کہو کہ ان دردناک چہروں سے ایک اک میوزیم سجا دیں
تمہارے کارِ عظیم کو جاوداں بنا دیں

(۱۱)

یہ شاعری شاعری نہیں ہے
رجز کی آواز، بادلوں کی گرج ہے، طوفان کی صدا ہے
کہ جس کو سُن کر
پہاڑ آتے ہیں سبز ہاتھوں پہ برف کی کلغیاں لگائے
دھوئیں کے بالوں میں سُرخ شعلوں کے ہار گوندھے

سمندر آتے ہیں جھاگ کی جھانجنیں بجاتے
ہوائیں آتی ہیں اپنے جھونکوں کی نیلگوں گوپھنیں گھماتی
گھٹائیں آتی ہیں بجلیوں پر سوار ہو کر
پہاڑ آتے ہیں اپنے کاندھوں پہ ندّیوں کی کمند ڈالے
چٹانیں آتی ہیں اپنا گرزِ گراں سنبھالے
وہ جنگل آتے ہیں آندھیوں کے نشاں اُڑاتے
وہ ریگ زاروں کے غول اپنے دفوں پہ گاتے
ببول آتے ہیں اپنے کانٹوں کے ہاتھ اُٹھائے
درخت آتے ہیں پتّوں کی ہری ہری تالیاں بجاتے
منار آتے ہیں گنبدوں کے بلند ڈنکوں پہ چوٹ دیتے
زمین آتی ہے اپنی ڈھولک پہ تال دیتی
اُجالے آتے ہیں گرم سورج کی ڈھال اُٹھائے
اندھیرے آتے ہیں سرد تاروں کے تیر جوڑے
وہ کھیت آتے ہیں اپنے پودوں کی فوج لے کر
وہ جھاڑ جھنکار اپنے سینے میں جھاڑیوں کے دل چھپائے
شہید آتے ہیں خوں کے ہونٹوں سے گیت گاتے
سیاسی قیدی شکستِ زنداں کے خواب لے کر
کسان کنّیائیں، جلتی آنکھوں میں جلتی دوزخ کے گرم شعلے
جوانیاں عارضوں کی سرخی میں رنگ و بوئے گلاب گھولے
دھڑکتے سینے شفق کے آنچل میں حُسن کی بجلیاں چھپائے
ہتھیلیاں آتی ہیں حنا کے کنول جلائے
پیار آتے ہیں ہنستے ہونٹوں کے پھول لے کر
حسین مائیں بدن پہ فصلِ بہار کی کونپلیں سجائے
ہمکتے بچّوں کی مٹھیاں تتلیاں دبائے

ستارے پلکوں سے نور کی کشتیوں کو کھیتے
کتابیں آتی ہیں گنگناتی
مکان آتے ہیں آہ بھرتے
کلرک آتے ہیں اپنی بغلوں میں کاغذی فائلیں دبائے
ہتھوڑے آتے ہیں جنگ بازوں کا دل ہلاتے
جہاز آتے ہیں راج ہنسوں کا روپ دھارے
وہ سگنل آتے ہیں اپنے مغرور سر اُٹھائے
وہ انجن آتے ہیں بھاپ کے قہقہے لگاتے
بوائلر آتے ہیں جہنم پہ مسکراتے
وہ پہیے آتے ہیں سامراجی حرام خوروں کا سر کچلتے
کھنکتی رنگین چوڑیاں جیسے کرشن کے چکر کو گھماتی
چمکتے ٹیکے بھوؤں کی ترچھی کماں اُٹھائے
وہ آنکھیں آتی ہیں جن میں اپنے غموں کا کاجل لگا ہوا ہے
وہ ہونٹ آتے ہیں جن میں کلیاں کھلی ہوئی ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن کو دھویا گیا ہے شبنم کے آنسوؤں سے
وہ ہاتھ آتے ہیں جو ہلوں کو چلا رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو مشینوں کو چھو رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن میں جھنڈے اُگے ہوئے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جن پہ نظمیں لکھی ہوئی ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو کہانی سنا رہے ہیں
وہ ہاتھ آتے ہیں جو ستارے بنا رہے ہیں
وہ ہاتھ جو بجلیوں کی گردن پکڑ رہے ہیں
وہ سنگ و آہن سے اپنا پنجہ لڑا رہے ہیں
وہ ہاتھ جو ساریوں کو رنگوں کی نازنینی دبے رہے ہیں
وہ ہاتھ جو اپنی انگلیوں سے زمیں کی تقدیر لکھ رہے ہیں

اب ایشیا کی زمیں پہ ہاتھوں کا ایک جنگل اُگا ہوا ہے
یہ سنگ مرمر کی، سنگ اسود کی مٹھیاں ہیں
کنول کی کلیاں، کپاس کے پھول، بم کے اور ناریل کے گولے
کہاں ہے اے نو عروسِ صبحِ بہار آجا
ہماری بے تاب مٹھیوں میں
شفق کا سیندور
چاند تاروں کے پھول
کرنوں کی سُرخ افشاں بھری ہوئی ہے

○

پتھر کی دیوار

(اس کتاب میں (۲۹) طویل مختصر نظمیں اور (۱۸) غزلیں ہیں۔ بیشتر کلام جیل میں لکھا گیا اور کتابی صورت میں جعفری صاحب کی رہائی کے بعد شائع ہوا۔)

انتساب ——— سجاد ظہیر اور فیض کے نام
پیش لفظ ——— سردار جعفری
اشاعت اوّل ——— اگست ۱۹۵۳ء
ناشر ——— مکتبۂ شاہراہ۔ دہلی

> شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
> ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند
>
> حافظ شیرازی

(انتخاب)

۱۔ فیض کے نام
۲۔ سجاد ظہیر کے نام
۳۔ اردو
۴۔ غزل۔ پھر شمیم گل، نوید جانفزا لائی ہے آج
۵۔ پتھر کی دیوار
۶۔ نیند
۷۔ تمہاری آنکھیں

فیض کے نام

کل تھا جب میں جیل میں تنہا
پتھر کے تابوت کے اندر
خاموشی کے سرد کفن میں
لپٹے ہوئے تھے نغمے میرے
کالی سلاخوں کے جنگل میں
دوستوں کی اور محبوبوں کی
کھوئی ہوئی تھیں سب آوازیں
تیرے نغمے ساتھ تھے میرے

اور تری آواز کی شبنم
گھانس کے لب تر کر جاتی تھی
گل کے کٹورے بھر جاتی تھی
شام کی رنگت بن کر اکثر
روئے جہاں پر چھا جاتی تھی
چاندنی کا ملبوس پہن کر
آم اور املی کے پیڑوں پر
تھک کر جیسے سو جاتی تھی
اور میں تیرے نازک میٹھے
پیارے گیتوں کا گلدستہ
اپنے دھڑکتے دل سے لگائے

خوابوں کی نیلی وادی میں
آہستہ آہستہ چلتا
جیل سے باہر آجاتا تھا
ظلم کے دل پر چھا جاتا تھا

آج مگر تو قید ہے ساتھی
کیسی ہے یہ قید کی دنیا؟
قلب و نظر کی محرومی ہے
تاریکی اور تنہائی میں
پتھر کی خاموش ہنسی ہے

آج ہے جب تو جیل میں تنہا
میں اپنی آواز کا شعلہ
اور اپنی للکار کی بجلی
گیتوں کے ریشم میں رکھ کر
تیری خاطر بھیج رہا ہوں
یہ میری آواز ہے لیکن
صرف مری آواز نہیں ہے
جوشؔ، فراقؔ، آنندؔ، اور بیدیؔ
عصمتؔ، ساحرؔ، کرشنؔ اور کیفیؔ
میری زباں سے بول رہے ہیں
ہند کے سارے لکھنے والے
ناچنے والے، گانے والے
اپنی محبت کے گلدستے

تیری جانب بھیج رہے ہیں
جلتی ہوئی یہ شاخ اُٹھالے
دیکھ اس میں کیا پھول کھلے ہیں
شعلہ، بجلی، نغمہ بن کر
بچھڑے ساتھی آن ملے ہیں
دور ہے گو لاہور کی بستی
اونچی زنداں کی دیواریں
اک جھوٹے آئین کی سرحد
تپتا جنگل، جلتا پربت
دل اور روح کے بیچ میں حائل
پھر بھی کوئی دیوار نہیں جو
زخموں کو تقسیم کرے گی

میرے ہاتھ میں ہاتھ ہے تیرا
تیرے ہاتھ میں ہاتھ ہے میرا
سانس کا زیر و بم ہے یکساں
ہم آہنگ ہے چاپ قدم کی
ایک ہی جادہ ایک ہی منزل
ایک ہی لیلےٰ ایک ہی محمل
ایک ہی مقصد ایک ہی حاصل
میٹھا رہے راوی کا پانی
ٹھنڈی رہیں گنگا کی لہریں
گائے کے تھن سے دودھ کی دھاریں
ساون بھادوں بن کر برسیں

سبز رہیں کھیتوں کے آنچل
بجتی رہے بادل کی چھاگل
دل میں ہوک نہ اُٹھنے پائے
پیٹ میں بھوک نہ اُگنے پائے
گیہوں کا ہر خوشہ سر پر
زرّیں تاج پہن کر آئے
ماؤں کے سینے دودھ سے چھلکیں
ہنستی رہیں بچّوں کی پلکیں
زلفوں کے گہرے سائے میں
رنگ برنگے آویزوں کے
ننّھے ننّھے جگنو چمکیں
چولہے دہکیں، روٹیاں مہکیں
شاخیں لہکیں، چڑیاں چہکیں
بانہیں کھنکھیں، چوڑیاں گائیں
شانوں پر آنچل لہرائیں
امن و اماں کا جشن منائیں

اپنا مقصد ایک ہے ساتھی
اس مقصد کے آگے سارے
ظالم، دشمن، ڈاکو، قاتل
سہمے ہیں گھبرائے ہوئے ہیں
بستی بستی جنگل جنگل
ظلم کے بادل چھائے ہوئے ہیں
زنجیروں کے کالے حلقے

ناگ ہیں پھن پھیلائے ہوئے ہیں

ظلم ہے لیکن ڈرنا کیسا !
موت سے پہلے مرنا کیسا !
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"
"بول زباں اب تک تیری ہے"
بول کہ کس قاتل کا دامن
خونِ بہاراں سے رنگیں ہے
کس کی گردن میں ڈال کے
سونے کی زنجیر پڑی ہے
کس نے امریکہ کے ہاتھوں
خاکِ وطن کو بیچ دیا ہے
بیٹی اور بہن کے آنچل
ماں کے کفن کو بیچ دیا ہے
کون ہے جو جنگی شعلوں میں
پاکستان کو جھونک رہا ہے
کون ہے جو اقبال کے دل میں
ظلم کی کیلیں ٹھونک رہا ہے
شاعر کی آواز کو کس کا
خونیں پنجہ گھونٹ رہا ہے
ریشم کے رومال میں کس کے
رنگ لہو کا چھوٹ رہا ہے
جیلوں کی دیوار میں یہ کون
انسانوں کے دل چنتا ہے

کون ہے جو قانون سے اپنے
مکڑی کا جالا بنتا ہے
کون اُجالے سے خائف ہے
کون انسانوں سے ڈرتا ہے
سورج کی کرنوں سے ہراساں
جنتا کی نظروں سے پریشاں
کس نے عدالت کا دروازہ
سنگینوں سے روک دیا ہے
یہ کس نے انصاف کے منہ میں
ظلم کا کپڑا ٹھونس دیا ہے

"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"
"بول زباں اب تک تیری ہے"
"تیرا ستواں جسم ہے تیرا
"بول کہ جاں اب تک تیری ہے"

اپریل ۱۹۵۱ء

سجاد ظہیر کے نام

مجھے یقیں ہے کہ زنداں میں بھی لبوں پہ ترے
وہ موجِ نور وہ ہلکا سا اک تبسّم ہے
تری حیات سہی نفرتوں کے گھیرے میں
تری نظر میں محبت بھرا تکلم ہے
مجھے یقیں ہے کہ زنداں میں بھی خیال ترا
بنا رہا ہے نئے آدمی کی تصویریں

نیا سماج، نئی زندگی، نئی تہذیب
پہنائی جاتی ہیں جس کو ہزار زنجیریں

کھڑی ہوئی ہے ترے سر پہ موت یوں آکر
کہ تو حیات کے پیغمبروں کا رہبر ہے
خزاں کو تیرے گلستانِ زندگی کی تلاش
کہ تیرے سینے میں دل، دل میں اک گلِ تر ہے

اندھیرا تجھ سے خفا ہے کہ اس کے سینے پر
تجھے چراغ جلانے کی آرزو کیوں ہے
بگڑ گئے ہیں لہو کے ذلیل بیوپاری
کہ تجھ کو امن و محبت کی جستجو کیوں ہے

بلند ہوتی ہیں یوں پھانسیوں کی جھنکاریں
کہ تو نے ان کے مٹانے کا اہتمام کیا
درندے تجھ پہ جھپٹتے ہیں اس لیے مرے دوست
کہ تو نے عظمتِ انسانیت کا نام لیا

ہیں قصر چیں بہ جبیں دانت پیستے ہیں محل
کہ تیرے خواب ہیں بدحال جھونپڑوں کے لیے
ہیں جنگ باز ترے گرم خون کے پیاسے
کہ تو سکون کا پیغام ہے دلوں کے لیے

یزید و شمر کو قتلِ حسین کی ہے فکر
وہ ارضِ پاک کو بھی کربلا بنا دیں گے
ترا یہ عہد کہ انسانیت کی محفل سے
ستم گروں کا رواجِ ستم اٹھا دیں گے

انھیں یہ فکر کہ ماؤں کی جھرّیاں بک جائیں
تجھے یہ فکر کہ بہنوں کے سر پہ چادر ہو

اُنھیں یہ فکر کہ زخموں سے چور چور ہوں دل
تجھے یہ فکر کہ دنیا گلوں کا منظر ہو

اُنھیں یہ فکر کہ تیغ و تفنگ کا ہو عروج
تجھے یہ فکر کہ ہو خنجروں کی رسوائی
اُنھیں یہ فکر کہ بارود کا اندھیرا چھائے
تجھے یہ فکر کہ پھیلے شفق کی رعنائی

اُنھیں یہ فکر کہ راتیں طویل ہو جائیں
تجھے یہ فکر کہ رنگِ سحر نکھر آئے
اُنھیں یہ فکر کہ ٹھہر جائے گردشِ ایّام
تجھے یہ فکر کہ سیلابِ غم گزر جائے

جکڑ سکی نہ ارادوں کو تیرے جب زنجیر
تو قاتلان کہن آ گئے رسن لے کر
ترے لیے ہی نہیں ارضِ پاک کے بھی لیے
وہ آج پلٹے ہیں امریکہ سے کفن لے کر

مگر زمانے کے تیور کچھ اور ہیں، یہ رسن
کہیں اُنھیں کے گلوں کی رسن نہ بن جائے
وہ عصرِ نو کے لیے لے کے آئے تو ہیں کفن
یہ قاتلوں کا خود اپنا کفن نہ بن جائے

ذلیل و خوار ہیں وہ اور سربلند ہے تو
جبیں کے حُسن میں اک تازہ آفتاب لیے
لبوں سے پھوٹ رہی ہے کرن تبسّم کی
سحر کا نور لیے رنگِ انقلاب لیے

تری نگاہوں میں کتنے حقیر ہیں جلّاد
کہ سر سے پاؤں تلک بزدلی کے پیکر ہیں

وہ تیری آنکھوں سے آنکھیں ملا نہیں سکتے
جو ڈر رہے ہیں اسیروں سے یہ وہ جیلر ہیں

وہ آپ اپنی عدالت کو قید کرتے ہیں
جو جوں کو اپنے بٹھاتے ہیں جیل خانے میں
یہ چند بھوت جو زندہ ہیں نور و وحشت کے
پنپ سکیں گے نہ جمہور کے زمانے میں

تری بلندیٔ فکر و نظر کا کیا کہنا
وہ دیکھ پست ہوئی جا رہی ہیں دیواریں
ہم اپنے دل کی محبت سے ڈھانپ لیں گے تجھے
ستم کے ہاتھ سے ہم چھین لیں گے تلواریں

میں پڑھ رہا ہوں لکھا ہے جبینِ وقت پہ کیا
زمانہ تجھ سے ہی انساں کے انتظار میں ہے
ہے تیرے دل میں بہاراں کی آرزو لیکن
تو آرزو کی طرح خود دلِ بہار میں ہے

مئی ۱۹۵۱ء

اُردو

ہماری پیاری زبان اردو
ہمارے نغموں کی جان اردو
حسین و دلکش جوان اردو
زبان وہ دُھل کے، جس کو گنگا کے جل سے پاکیزگی ملی ہے
اودھ کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جس کے دل کی کلی کھلی ہے
جو شعر و نغمہ کے خلدزاروں میں آج کوئل سی کوکتی ہے
اسی زباں میں ہمارے بچپن نے ماؤں سے لوریاں سُنی ہیں

جواں ہو کر اسی زباں میں کہانیاں عشق نے کہی ہیں
اسی زباں کے چمکتے ہیروں سے علم کی جھولیاں بھری ہیں
اسی زباں سے وطن کے ہونٹوں نے نعرۂ انقلاب[1] پایا
اسی سے انگریز حکمرانوں نے خودسری کا جواب پایا
اسی سے میری جواں تمنا نے شاعری کا رباب پایا
یہ اپنے نغمات پُراثر سے دلوں کو بیدار کر چکی ہے
یہ اپنے نعروں کی فوج سے دشمنوں پہ یلغار کر چکی ہے
ستمگروں کی ستمگری پر ہزار ہا وار کر چکی ہے
کوئی بتاؤ وہ کون سا موڑ ہے جہاں ہم جھجک گئے ہیں
وہ کون سی رزم گاہ ہے جس میں اہلِ اردو دبک گئے ہیں
وہ ہم نہیں ہیں جو بڑھ کے میداں میں آئے ہوں اور ٹھٹھک گئے ہیں
یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں[2] کی تیرگی کے دیے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فرازِ دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی[3] کے گیت گائے
کہا ہے کس نے ہم اپنے پیارے وطن میں بھی بے وطن رہیں گے
زبان چھن جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن رہیں گے
ہم آج بھی کل کی طرح دل کے ستار پر نغمہ زن رہیں گے
یہ کیسی بادِ بہار ہے جس میں شاخِ اردو نہ پھل سکے گی
وہ کیسا روئے نگار ہوگا نہ زلف جس پر مچل سکے گی
ہمیں وہ آزادی چاہیے جس میں دل کی مینا اُبل سکے گی

---

[1] "انقلاب زندہ باد" تحریک آزادی کا سب سے مشہور نعرہ اردو زبان ہی کی دین ہے۔
[2] اردو کے درجنوں ادیب اور شاعر قیدِ فرنگ میں رہ چکے ہیں۔
[3] سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

ہمیں یہ حق ہے ہم اپنی خاکِ وطن میں اپنا چمن سجائیں
ہماری ہے شاخِ گل تو پھر کیوں نہ اس پر ہم آشیاں بنائیں
ہم اپنے انداز اور اپنی زباں میں اپنے نہ گیت گائیں
کہاں ہو متوالو آؤ بزمِ وطن میں ہے امتحاں ہمارا
زباں کی زندگی سے وابستہ آج سود و زیاں ہمارا
ہماری اردو رہے گی باقی اگر ہے ہندوستاں ہمارا
چلے ہیں گنگ و جمن کی وادی میں ہم ہوائے بہار بن کر
ہمالیہ سے اتر رہے ہیں ترانۂ آبشار بن کر
رواں ہیں ہندوستاں کی رگ رگ میں خون کی سرخ دھار بن کر

غزل

(ہند پاک مشاعرے کے موقع پر کہی گئی)

پھر نسیمِ گل نویدِ جانفزا لائی ہے آج — میرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آئی ہے آج
پھر اٹھا ہے وادیٔ گنگا سے ابرِ نو بہار — سمتِ راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج
آج پھر ہے اتحادِ شیشہ و ساغر کا دور — محفلِ رنداں میں جشنِ بادہ پیمائی ہے آج
چشمِ ساقی تجھ میں سارا میکدہ آباد ہے — قامتِ رعنا میں موجِ مے کی انگڑائی ہے آج
کھل گئے ہیں اشتیاقِ دید میں آنکھوں کے در — دوستوں کی خانۂ دل میں پذیرائی ہے آج
"آ ملے ہیں سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" — شور ہے محفل میں دیوانوں کی بن آئی ہے آج
پھر وہی گلیاں وہی اگلا طوافِ کوئے دوست — عشق کو مژدہ کہ پھر سامانِ رسوائی ہے آج
کون ہے جس سے سنبھالا جائے گا میرا جنوں — خود ہی پہلے شوق کو زنجیر پہنائی ہے آج
ڈر رہا ہوں جان و تن کو پھونک ڈالے گی یہ آگ — میرے سینے میں جو ضبطِ غم نے بھڑکائی ہے آج
آج بے باکی میں ہے اہلِ خرد کی مصلحت — سرفروشی ہی میں اہلِ دل کی دانائی ہے آج
مسکرائے زخمِ دل ہنسنے لگے سینے کے داغ — روحِ استبداد کیسی کیسی شرمائی ہے آج
خونِ ناحق لالہ و گل بن کے پھوٹا خاک سے — تیشہ زن کے خوں سے دشت و در کی زیبائی ہے آج

کہہ دو صیادوں سے، گلچینوں کو کردو ہوشیار
فصلِ گل نے دور تک زنجیر پھیلائی ہے آج

ہاں یہی ہے روزِ محشر، ہاں یہی روزِ حساب
تیری رسوائی ہے اب یا میری رسوائی ہے آج

پھر ہے میناروں پہ رعشہ، پھر ہیں گنبد سرنگوں
پھر نوا شاعر کی ایوانوں سے ٹکرائی ہے آج

آج پھر قدموں پہ میرے جھک رہی ہے کائنات
میرے قبضے میں جہانِ نو کی دارائی ہے آج

خاک پر جھکتی نہیں افلاک پر رکتی نہیں
جو نگہ تقدیرِ عالم کی تماشائی ہے آج

ایک ساحل ہے کہ ابھرا ہے بھنور کی گود سے
ایک کشتی ہے کہ طوفانوں سے ٹکرائی ہے آج

رنگِ مے، حسنِ نگاراں، جشنِ گل، فصلِ بہار
ہند کی روحِ جواں شعروں میں کھنچ آئی ہے آج

جل اٹھا نبضوں میں خوں روشن ہوئے دل میں چراغ
شاعرِ آتش نوا نے آگ برسائی ہے آج

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزر جائے

آدمی، محبت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
اک طویل سنّاٹا
جیسے سانپ لہرائے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریخیں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے

زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ مسکراتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
تخیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی دیواریں
بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدّے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی دیواریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی

نیم جاں قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہروں پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی

پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں، تمنائیں
آرزوئیں، امیدیں
اشک، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں
اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے میں
سرخ ہاتھ اگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں

بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجواں جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک، آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقشِ پا بغاوت کے
جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دُکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
ظالموں کی شدت پر
ظلم چیخ اٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
انقلاب زندہ باد

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتیوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کی کوروں پر
آندھیوں کی راہوں پر
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری

نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عامِ جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بے کسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے

(سنٹرل جیل ناسک)

نیند

(اپنے بچے کی پہلی سالگرہ پر)

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

دن کی خشمگیں نظریں
کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور
بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کی سانسوں کی
تند و تیز آوازیں
جیلروں کی بدکاری
گالیوں کی بوچھاریں
بے بسی کی خاموشی
خامشی کی فریادیں
تہہ نشیں اندھیرے میں

شب کی شوخ دوشیزہ
خاردار تاروں کو
آہنی حصاروں کو
پار کر کے آئی ہے
بھر کے اپنے آنچل میں
جنگلوں کی خوشبوئیں
ٹھنڈکیں پہاڑوں کی
میرے پاس لائی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

سیمگوں جواں سینہ
سیمگوں جواں بانہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم چھلکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

رات پینگ لیتی ہے
چاندنی کے جھولے میں
آسمان پر تارے
ننھے ننھے ہاتھوں سے
بُن رہے ہیں جادو سا
جھینگروں کی آوازیں
کہہ رہی ہیں افسانہ
دور جیل کے باہر
بج رہی ہے شہنائی
ریل اپنے پہیوں سے
لوریاں سناتی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

روز رات کو یوں ہی
نیند میری آنکھوں سے
بے وفائی کرتی ہے
مجھ کو چھوڑ کر تنہا
جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹکھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انکھڑیوں کے بچپن میں
میٹھے میٹھے خوابوں کا
شہد گھول دیتی ہے
اک حسین پری بن کر

لوریاں سُناتی ہے
پالنا جھلاتی ہے

رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

(سنٹرل جیل ناسک)

تمہاری آنکھیں

تمہاری آنکھیں
حسین، شگفتہ، مسکراتی، جوان آنکھیں
لرزتی پلکوں کی چلمنوں میں
شہابی چہرے پہ ابروؤں کی کماں کے نیچے
تمہاری آنکھیں
وہ جن کی نظروں کے ٹھنڈے سائے میں میری اُلفت
مری جوانی کی رات پروان چڑھ رہی تھی

تمہاری آنکھیں
اندھیری راتوں میں جو ستاروں کی روشنی سے
فضائے زنداں میں جھانکتی ہیں

میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پر اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
میں پڑھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھنوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں
تمہاری آنکھیں تمہاری پلکیں کہانیاں سی سنا رہی ہیں
میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
مسرتوں کے گلاب ہر سمت کھل رہے ہیں
تمہاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں

مجھے گرفتار کر کے جب جیل لا رہے تھے پولیس والے
تم اپنے بستر سے اپنے دل کے
ادھورے خوابوں کو لے کے بیدار ہو گئی تھیں
تمہاری پلکوں سے نیند اب بھی ٹپک رہی تھی
مگر نگاہوں میں نفرتوں کے عظیم شعلے بھڑک اُٹھے تھے
تمہاری آنکھیں حقارتوں کے جہنموں کو جگا رہی تھیں
نظامِ ظلم و ستم پہ بجلی گرا رہی تھیں
مری محبّت نے اپنی جنّت کا حسن دیکھا
تمہاری آنکھوں پہ میری نظروں کے پیار برسے
مری اُمیدوں مری تمنّاؤں نے صدا دی
یہ نفرتوں کی عظیم مشعل جلائے رکھنا
کہ یہ محبّت کے دل کا شعلہ ہے جس کی رنگین روشنی میں
ہمارے خوابوں کے راستے جگمگا رہے ہیں

تمہاری آنکھیں
جو میرے سینے میں تیرتی ہیں
کنول کی کلیاں جو میرے دل میں کھلی ہوئی ہیں
انھیں سے دو اور آنکھیں بیدار ہو گئی ہیں

وہ ننھے ننھے چمکتے ہیروں کی ننھی کنیاں
جو میری آنکھوں کا نور لے کر تمہارے آنچل سے جھانکتی ہیں
پھر ایسی آنکھیں پھر اور آنکھیں پھر اور آنکھیں
یہ سلسلہ تا ابد چلے گا
زمانے کی گود میں ستاروں کے حسن کی ندیاں بہیں گی
وہ سب تمہاری
وہ سب ہماری ہی آنکھیں ہوں گی
ہماری آنکھیں کہ جن سے شعلے برس رہے ہیں
مگر وہ کل کا حسین دن دیکھو کتنا نزدیک آگیا ہے
ہماری آنکھوں سے جب بہاریں چھلک پڑیں گی

(سنٹرل جیل ناسک)

O

ایک خواب اور

(اس کتاب میں (۱۰۲) مختصر نظمیں، غزلیں اور قطعات ہیں۔ ان کے علاوہ آخر میں کچھ متفرق اشعار بھی دیے گئے ہیں)

انتساب ——— سلطانہ کے نام
پیش لفظ ——— سردار جعفری (چند سطریں)
اشاعتِ اوّل ——— مارچ ۱۹۶۵ء
ناشر ——— حلقۂ ادب بمبئی

ہزاراں سال با فطرت نشستم
بہ او پیوستم و از خود گسستم
و لیکن داستانم ایں دو حرف است
تراشیدم، پرستیدم، شکستم

(انتخاب)

۱۔ ایک خواب اور
۲۔ ہاتھوں کا ترانہ
۳۔ غزل۔ شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
۴۔ مشرق و مغرب
۵۔ میرا سفر
۶۔ حسین تر
۷۔ ایک پھول
۸۔ غزل۔ کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
۹۔ 〃 یاد آئے ہیں عہدِ جنوں کے کھوئے ہوئے دلدار بہت
۱۰۔ 〃 میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
۱۱۔ 〃 کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں

ایک خواب اور

خواب اب حسنِ تصوّر کے افق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
اور تعبیروں کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا، شعلہ بکف موجِ سراب
یہ تو ممکن نہیں بچپن کا کوئی دن مل جائے
یا پلٹ آئے کوئی ساعتِ نایابِ شباب
پھوٹ نکلے کسی افسردہ تبسّم سے کرن
یا دمک اُٹھے کسی دستِ بریدہ میں گلاب
آہ پتھّر کی لکیریں ہیں کہ یادوں کے نقوش
کون لکھ سکتا ہے پھر عمرِ گزشتہ کی کتاب
بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
تابشِ رنگِ شفق، آتشِ روئے خورشید
مَل کے چہرے پہ سحر آئی ہے خونِ احباب
جانے کس موڑ پہ کس راہ میں کیا بیتی ہے
کس سے ممکن ہے تمنّاؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑ لیتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منھ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب

در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہے جواب
سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
میں ترا شاعرِ آوارہ و بے باک و خراب
پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

ہاتھوں کا ترانہ

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کے چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو
تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی اِن سے ہے
تہذیب کی اور تمدّن کی بھرپور جوانی اِن سے ہے
دنیا کا فسانہ اِن سے ہے، انساں کی کہانی اِن سے ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو
صدیوں سے گزر کر آئے ہیں، یہ نیک اور بد کو جانتے ہیں
یہ دوست ہیں سارے عالم کے، پر دشمن کو پہچانتے ہیں
خود شکتی کا اوتار ہیں، یہ کب غیر کی شکتی مانتے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو
ہیں زخم ہمارے ہاتھوں کے، یہ پھول جو ہیں گلدانوں میں
سوکھے ہوئے پیاسے چلّو تھے، جو جام ہیں اب میخانوں میں
ٹوٹی ہوئی سو انگڑائیوں کی محرابیں ہیں ایوانوں میں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

راہوں کی سنہری روشنیاں، بجلی کے جو پھیلے دامن ہیں
فانوس حسیں ایوانوں کے، جو رنگ و نور کے خرمن ہیں
یہ ہاتھ ہمارے جلتے ہیں، یہ ہاتھ ہمارے روشن ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

خاموش ہیں یہ خاموشی سے، سو بربط و چنگ بناتے ہیں
تاروں میں راگ سلاتے ہیں، طبلوں میں بول چھپاتے ہیں
جب ساز میں جنبش ہوتی ہے، تب ہاتھ ہمارے گاتے ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا، ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں، کالکھ کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

بہتی ہوئی بجلی کی لہریں، سمٹے ہوئے گنگا کے دھارے
دھرتی کے مقدر کے مالک، محنت کے افق کے سیارے
یہ چارہ گرانِ دردِ جہاں، صدیوں سے مگر خود بے چارے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

تخلیق یہ سوزِ محنت کی، اور فطرت کے شہکار بھی ہیں
میدانِ عمل میں لیکن خود، یہ خالق بھی معمار بھی ہیں
پھولوں سے بھری یہ شاخ بھی ہیں اور جلتی ہوئی تلوار بھی ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ ہاتھ نہ ہوں تو مہمل سب، تحریریں اور تقریریں ہیں
یہ ہاتھ نہ ہوں تو بے معنی، انسانوں کی تقدیریں ہیں
سب حکمت و دانش علم و ہنر، ان ہاتھوں کی تفسیریں ہیں
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ کتنے سُبک اور نازک ہیں، یہ کتنے سڈول اور اچھے ہیں
چالاکی میں استاد ہیں یہ اور بھولے پن میں بچے ہیں
اس جھوٹ کی گندی دنیا میں بس ہاتھ ہمارے سچے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

یہ سرحد سرحد جڑتے ہیں اور ملکوں ملکوں جاتے ہیں
بانہوں میں بانہیں ڈالتے ہیں اور دل سے دل کو ملاتے ہیں
پھر ظلم و ستم کے پیروں کی زنجیرِ گراں بن جاتے ہیں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو

تعمیر تو ان کی فطرت ہے، اک اور نئی تعمیر سہی
اک اور نئی تدبیر سہی، اک اور نئی تقدیر سہی
اک شوخ و حسیں خواب اور سہی اک شوخ و حسیں تعبیر سہی
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو
دنیا کو چلانے والے ہیں
ان ہاتھوں کو تسلیم کرو

غزل

شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے
جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے

خیالِ یار کو دیجے وصالِ یار کا نام
شبِ فراق کو گیسوئے مُشک بو کہیے

چراغِ انجمنِ حیرتِ نظارہ تھے
وہ لالہ رُو جنھیں اب داغِ آرزو کہیے

مہک رہی ہے غزل ذکرِ زلفِ خوباں سے
نسیمِ صبح کی مانند کو بہ کو کہیے

شکایتیں بھی بہت ہیں، حکایتیں بھی بہت
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے

یہ حکم، کیجیے پھر خنجروں کی دلداری
دہانِ زخم سے افسانۂ گلو کہیے

زبانِ تیغ سے کرتے ہیں پرسشِ احوال
اور اس کے بعد یہ کہتے ہیں آرزو کہیے

ق

ہے زخم زخم مگر کیوں نہ جانیے اُسے پھول　　لہو لہو ہے، مگر کیوں اُسے لہو کہیے
کہیے قامتِ یارانِ کج ادا کی قبا　　حنائے پائے نگارانِ تند خو کہیے
جہاں جہاں بھی خزاں ہے وہیں ہیں ہے بہار　　چمن چمن یہی افسانۂ نمو کہیے
زمیں کو دیجئے دلِ مدّعا طلب کا پیام　　فضا کو وسعتِ دامانِ آرزو کہیے
سنواریے غزلِ اپنی بیانِ غالبؔ سے　　زبانِ میرؔ میں ہاں ہاں کبھو کبھو کہیے
مگر وہ حرف دھڑکنے لگے جو دل کی طرح　　مگر وہ بات جسے اپنی گفتگو کہیے

ق

وہ جس کے فیض سے غالبؔ ہوا تھا نغمہ سرا　　زبان ہے جسے دلّی کی آبرو کہیے
روانی ایسی کہ گنگا کی کھائیے قسمیں　　جوانی ایسی کہ جنّت کی آبِ جو کہیے
رہے تو معجزۂ نطق کی دعا دیجے　　مٹے تو آنکھ سے ٹپکا ہوا لہو کہیے

جراحتوں کی سیاست ہے جن کا فن سردارؔ
اب ان سے کہیے تو کیا حاجتِ رفو کہیے

مشرق و مغرب

زندگی ایک، زمین ایک ہے، انسان بھی ایک
فکر کا بحر بھی، جذبات کا طوفان بھی ایک
وہی سورج ہے، وہی چاند ہے، تارے ہیں وہی
نیلے آکاش کے گلرنگ کنارے ہیں وہی
شرق سے غرب تلک وقت کی پرواز ہے ایک
دل جو سینوں میں دھڑکتے ہیں تو آواز ہے ایک
ہیرؔ مغموم ہے پنجاب کے میدانوں میں
جولیٹ روتی ہے انگلینڈ کے افسانوں میں
عشق کو بخش دیا ذوقِ تماشا ہم نے

حرفِ دل شعلۂ عارض سے ترا شا ہم نے
باغِ مشرق ہو کہ مغرب ہو، ہوا ایک سی ہے
سرد یا گرم، بہر حال فضا ایک سی ہے
ایشیا والے سے یورپ کی زمیں کھنچ کے نہ مل
میری سوغات بھی دل ہے تری سوغات بھی دل
جس نے لوٹا ہے ہمیں جس نے ستم ڈھایا ہے
ارضِ مغرب نہیں مغرب کا وہ سرمایہ ہے
اور سرمایہ نہ ہندی ہے نہ برطانی ہے
یہ مرے اور ترے خون کی ارزانی ہے
تیرا قاتل بھی وہی ہے مرا قاتل بھی وہی
زیست کی جہد بھی اور جہد کا حاصل بھی وہی
ٹیمس[1] اور سین[2] میں جمنا کی سی بے تابی ہے
موجِ ڈینیوب[3] میں گنگا کی سی بے خوابی ہے
ایسا کچھ فرق نہیں دونوں گلستانوں میں
آہوئے رم خوردہ ہیں تیرے بھی بیابانوں میں
چشمے مغرب کے ہیں مشرق کے غزالہ کی طرح
نیلگوں سلسلۂ کوہ ہمالہ کی طرح
جنگلوں میں وہی آوارہ ہوا گاتی ہے
کسی بھٹکے ہوئے رہرو کی صدا آتی ہے
کلیاں کھلتی ہیں سنورتے ہوئے گیسو کے لیے
تتلیاں اڑتی ہیں بکھری ہوئی خوشبو کے لیے

ٹیمس[1] ۔ انگلینڈ کا دریا جس کے کنارے لندن آباد ہے   سین[2] ۔ فرانس کا دریا جس کے دونوں طرف پیرس آباد ہے
ڈینیوب[3] ۔ یورپ کا مشہور دریا جو کئی ملکوں سے گزرتا ہے۔

پریاں موسم کی ہواؤں میں مچل جاتی ہیں
رُت بدلتے ہی قبائیں بھی بدل جاتی ہیں
کشتیاں خوش ہیں سمندر کی گزرگاہوں سے
تیرے ساحل بھی جواں رہتے ہیں ملّاحوں سے
تیری محرابیں بھی تہذیب کی انگڑائی ہیں
تیری آغوش میں بھی دہلی و شنگھائی ہیں
ایک جادو کا اثر گردشِ ایّام میں ہے
زندگی یاں بھی طلسمِ سحر و شام میں ہے
شب کو جلتے ہیں کنول صبح کو بجھتے ہیں چراغ
مسکراتے ہیں شبستاں میں جوانی کے ایاغ
صبح در کھلتے ہیں محبوب کی بانہوں کی طرح
راہ پر ملتے ہیں راہوں میں نگاہوں کی طرح
دن کے تھا روں کو آنکھوں میں چھپا لیتی ہیں
کھڑکیاں رات میں پلکوں کو جھکا لیتی ہیں
دودھ مغرب کے بھی سینے میں رواں ہوتا ہے
ہندوایراں کی طرح طفل جواں ہوتا ہے
راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
بچّے پھولوں کی طرح گھاس میں کھل جاتے ہیں
یاں بھی جو آنکھ ہے عالم کی تماشائی ہے
ہر نظر لذتِ دیدار کی شیدائی ہے
دل کا آہنگ حسیں تیرے بھی نغمات میں ہے
کیفیت روح کی رنگوں کے طلسمات میں ہے
خیر ہو پیرس و لندن کے ہنرداروں کی
خیر ہو روم کے، یونان کے بت کاروں کی

تیرے بازار میں یوسف بھی زلیخائیں بھی
تیرے ویرانوں میں مجنوں بھی ہیں لیلائیں بھی
دورِ افلاس کا، دولت کی فراوانی بھی
یاں قبا پوشی بھی ہے، چاک گریبانی بھی
حرفِ حق بھی ہے یہاں اور رسن و دار بھی ہے
لذتِ شوق بھی ہے، جرأتِ کردار بھی ہے
ہم حقیقت سے کبھی دور جو ہو جاتے ہیں
کچھ مظاہر کے طلسمات میں کھو جاتے ہیں
زہر سا نفرت و نخوت کا پیا کرتے ہیں
یوں ہی انسانوں کو تقسیم کیا کرتے ہیں
گیسو کالے ہیں مرے دیس کے محبوبوں کے
اور بادل ہیں سنہری ترے معشوقوں کے
آنکھیں نیلی ہیں تری شوخ حسیناؤں کی
جھیلیں کاجل کی مرے آئینہ سیماؤں کی
مختلف کچھ ہیں تراشیں ترے پیراہن کی
شکلیں کچھ اور مرے جیب مرے دامن کی
اصلیت نکہتِ گل کی نہیں گلدانوں سے
مے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے
بوئے گل ایک سی ہے، بوئے وفا ایک سی ہے
میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

○

میرا سفر

"ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ایم"

(رومی)

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگِ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اُڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح سے کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
خوں کی گردش، دل کی دھڑکن
سب راگنیاں سو جائیں گی
اور نیلی فضا کی مخمل پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی یہ کنی
یہ میری جنت، میری زمیں
اس کی صبحیں، اس کی شامیں
بے جانے ہوئے، بے سمجھے ہوئے
اک مشتِ غبارِ انساں پر
شبنم کی طرح رو جائیں گی
ہر چیز بھلا دی جائے گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا
جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی، کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
سرسبز ہتھیلی پر لے کر
شبنم کے قطرے تولوں گا
میں رنگِ حنا، آہنگِ غزل
اندازِ سخن بن جاؤں گا
رخسارِ عروسِ نو کی طرح
ہر آنچل سے چھن جاؤں گا
جاڑوں کی ہوائیں دامن میں
جب فصلِ خزاں کو لائیں گی
رہرو کے جواں قدموں کے تلے
سوکھے ہوئے پتوں سے میرے
ہنسنے کی صدائیں آئیں گی
دھرتی کی سنہری سب ندیاں

آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصّہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

۱۹۵۶ء

حسین تر

کل ایک تو ہوگی اور اک میں
کوئی رقیبِ رفیق صورت
کوئی رفیقِ رقیب ساماں
مرے ترے درمیاں نہ ہوگا

ہماری عمرِ رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تارِ چاندی کے گوندھ دے گی
ترے حسین عارضوں کے رنگیں
گلاب بیلے کے پھول ہوں گے
شفق کا ہر رنگ شرق ہوگا
لطیف و پرکیف چاندنی میں

تری کتابِ رُخِ جواں پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب
زمانہ لکھے گا اک کہانی
اور ان گنت جھرّیوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

ہم اپنی بیتی ہوئی شبوں کی
سلونی پرچھائیوں کو لے کر
ہم اپنے عہدِ طرب کی شام و
سحر کی رعنائیوں کو لے کر
پرانی یادوں کے جسمِ عریاں
کے واسطے پیرہن بنیں گے

پھر ایک تو ہوگی اور اک میں
کوئی رقیبِ رفیق صورت

کوئی رفیق رقیبِ ساماں
مرے تیرے درمیاں نہ ہوگا
ہزاروں کی نظروں کو تیرے رُخ پر
جمالِ نو کا گماں نہ ہوگا
فقط مری، حسن آزمودہ
نظر ہی تجھ کو بتا سکے گی
کہ تیری پیری کا حُسن تیرے
شباب سے بھی حسین تر ہے

ایک پھول

میں دیکھ چکا ہوں سب بہاریں
بیٹھا ہوں گلوں کی انجمن میں
کتنی ہے لطافت اور نزاکت
بیلے کی کلی کے کنوار پن میں
کیا رنگ کنول کے ہے لبوں پر
کیا رس ہے گلاب کے دہن میں
چمپا کے بدن میں ہے جو خوشبو
ملتی نہیں حور کے بدن میں
اک پھول ہے تو بھی شوخ و شاداب
ریشم کے لرزتے پیرہن میں
لیکن ہے تری ادا ہی کچھ اور
کچھ اور ہے تیرے بانکپن میں
شرمندہ ہیں دخترانِ گلزار
گلزار ہے ایسا تیرے تن میں
جو نکہت و رنگ میں ہو تجھ سا
اک پھول بھی تو نہیں چمن میں
پھولوں کی بہشت باغ میں ہے
اور تیری بہشت میرے من میں
یہ عمر شگوفہ کار تیری
راس آئے تجھے بہار تیری

غزل

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا / راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے تنہا رویِ رہروِ شوق / ہم سفر کوئی نہیں دوریِ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو / لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا
تیغِ منصف ہو جہاں، دار و رسن ہوں شاہد / بے گنہ کون ہے اس شہر میں قاتل کے سوا
جانے کس رنگ سے آئی ہے گلستاں میں بہار
کوئی نغمہ ہی نہیں شورِ سلاسل کے سوا

غزل

یاد آئے ہیں عہدِ جنوں کے کھوئے ہوئے دلدار بہت
اُن سے دور بسائی بستی، جن سے ہمیں تھا پیار بہت

ایک اک کرکے کھلی تھیں کلیاں، ایک اک کرکے پھول گئے
ایک اک کرکے ہم سے بچھڑے باغِ جہاں میں یار بہت

حُسن کے جلوے عام ہیں لیکن ذوقِ نظارہ عام نہیں
عشق بہت مشکل ہے لیکن عشق کے دعوے دار بہت

زخم کہو یا کِھلتی کلیاں ۔ ہاتھ مگر گلدستہ ہے
باغِ وفا سے ہم نے چُنے ہیں پھول بہت اور خار بہت

جو بھی ملا ہے لے آئے ہیں داغِ دل یا داغِ جگر
وادی وادی منزل منزل بھٹکے ہیں سردار بہت

غزل

میں جہاں تم کو بلاتا ہوں وہاں تک آؤ
میری نظروں سے گزر کر دلِ و جاں تک آؤ

پھر یہ دیکھو کہ زمانے کی ہوا ہے کیسی
ساتھ میرے مرے فردوسِ جواں تک آؤ

حوصلہ ہو تو اڑو میرے تصوّر کی طرح
میری تخییل کے گلزارِ جناں تک آؤ

تیغ کی طرح چلو چھوڑ کے آغوشِ نیام
تیر کی طرح سے آغوشِ کماں تک آؤ

پھول کے گرد پھرو باغ میں مانندِ نسیم
مثلِ پروانہ کسی شمعِ تپاں تک آؤ

لو وہ صدیوں کے جہنّم کی حدیں ختم ہوئیں
اب ہے فردوس ہی فردوس جہاں تک آؤ

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہنچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اسی دنیا میں دکھا دیں تمہیں جنّت کی بہار
شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

غزل

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں
کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چہروں کے پیلے پن میں

بچوں کے میٹھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں

ریگستانوں میں جلتے ہیں پڑے ہوئے سو نقش قدم
آج خراماں کوئی نہیں ہے امیدوں کے گلشن میں

چکنا چور ہوا خوابوں کا دل کش، دل چسپ آئینہ
ٹیڑھی ترچھی تصویریں ہیں ٹوٹے پھوٹے درپن میں

پائے جنوں میں پڑی ہوئی ہیں حرص و ہوا کی زنجیریں
قید ہے اب تک ہاتھ سحر کا تاریکی کے کنگن میں

آنکھوں کی کچھ نورس کلیاں نیم شگفتہ غنچۂ لب
کیسے کیسے پھول بکھرے ہیں گل چینوں کے دامن میں

○

پیراہنِ شرر

(اس کتاب میں ۔ نظمیں ۱۵ ۔ قطعہ ۱ ۔ غزلیں ۵)

انتساب ــــــ کسی کے نام نہیں ہے
پیش لفظ ــــــ پنڈت آنند نرائن ملاؔ
مقدمہ ــــــ سردار جعفری
اشاعتِ اوّل ــــــ ۱۹۶۱ء
ناشر ــــــ حلقۂ ادب ۔ ۱ سیتا محل بومن جی پیٹٹ روڈ بمبئی

(انتخاب)

۱۔ پیراہنِ شرر
۲۔ موسموں کا گیت (کالی داس کی نظم سے ماخوذ)
۳۔ صبح فردا
۴۔ اشکِ ندامت
۵۔ غزل ۔ بیٹھے ہیں جہاں ساقی پیمانۂ زر لے کر
۶۔ " وہ بہاریں وہ ہوائیں جو زمیں زمیں چمن دیں
۷۔ قطعات

۱۔ تمام رات اندھیرے کا جسم جلتا رہا
۲۔ ابھی جواں ہے غمِ زندگی کا ہر لمحہ
۳۔ درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
۴۔ ہر منزل اک منزل ہے نئی، اور آخری منزل کوئی نہیں
۵۔ دل ترے لیے ہے پھر زخمِ تازہ کی صورت

پیراہنِ شرر

کھڑا ہے کون یہ پیراہنِ شرر پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے
زمانہ گزرا کہ فرہاد و قیس ختم ہوئے
یہ کس پہ اہلِ جہاں، حکمِ سنگ باری ہے
یہاں تو کوئی بھی شیریں ادا نگار نہیں
یہاں تو کوئی بھی لیلیٰ بدن بہار نہیں
یہ کس کے نام پہ زخموں کی لالہ کاری ہے

کوئی دِوانہ ہے، لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک
ہے بات صاف سزا اس کی سنگ ساری ہے

۶ر اگست ۱۹۶۵ء

موسموں کا گیت

(کالی داس کی نظم "رِت سیوں ہار" سے ماخوذ)

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، ان میں
حسن کی بات کریں، عشق پہ اصرار کریں
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو

جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل، فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہے مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

(۱)

گرمیاں آئی ہیں برساتی ہوئی انگارے
دیکھنا شعلہ بدن دھوپ پہ آیا ہے شباب
لوگ تالابوں میں اُترے ہیں نہانے کے لیے
تہ نشیں ہوتی چلی جاتی ہے ہر چادرِ آب
اک ذرا دیر کو تھوڑا سا سکوں ملتا ہے
جسم کو چھوتا ہے جب وقت خنک شام کا ہاتھ
اتنی سوزش ہے کہ بس سرد ہوئی گرمیِ عشق
پیار کے منہ سے نکلتی ہی نہیں پیار کی بات

نیند آسکتی نہیں عشق کے بیماروں کو
ان دنوں جاگتے رہنے کے بہانے ہیں بہت
تیرتی رہتی ہیں بینا کی سریلی تانیں
گیت شیریں ہیں بہت، نرم ترانے ہیں بہت
آبِ صندل میں ڈبوئے ہوئے پنکھوں کی ہوا
اپنے مہکے ہوئے ہاتھوں سے تھپک دیتی ہے
اور دھڑکتے ہوئے سینوں پہ دھڑکتے ہوئے ہار
ہر لڑی موتی کی بس جان ہی لے لیتی ہے

آگ برساتی ہوئی دھوپ کی کرنوں کا جلال
تیز اور تند ہو جس طرح جوانی کا شعلہ

دشمنی سانپ کی طاؤس سے بس ختم ہوئی
وہ بھی طاؤس سے دیرینہ عداوت بھولا
اتنی گرمی ہے کہ کھلتی نہیں منقار اُس کی
بھوک باقی نہیں، کیا جائے غذا کے پیچھے
دھوپ کی جلتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے
سانپ آ بیٹھا ہے رنگین پروں کے نیچے

میری جاں، اے مرے نغموں کی جواں شہزادی
فصلِ گرما سحر و شام تجھے راس آئے
چاندنی رات سجائے تری مہکی ہوئی سیج
جسمِ سیمیں کے لیے پھولوں کے تحفے لائے
تیری صبحوں کو رکھیں سرو کنول کی جھیلیں
ٹھنڈے پانی کے اُچھلتے ہوئے فوّاروں سے
تیری شاموں کو ترے چاہنے والے مل جائیں
جو چُنیں پھول ترے حُسن کے گلزاروں سے
دھوپ بے جان ہو، گیتوں کی گھٹا چھائی ہو
تو ہو، احباب ہوں، اور گوشۂ تنہائی ہو

(۲)

دیکھنا میگھ کا وہ شاہسوار آ پہنچا
گونج اُٹھے کوہ و دمن، گونج اُٹھے دشت و جبال
گھن گرج وہ ہے مری جان، کہ شاہی ڈنکے
جس طرح بجتے ہیں میداں میں بہ صد شان و جلال
بجلی لہراتی ہے شعلوں کا سنہری پرچم
ابر کے فیل پہ بارش کا شہنشاہ سوار

گھر سے سب اس کے سواگت کو نکل آئے ہیں
غول عشاق کے، بدمست حسینوں کی قطار

فوجیں بادل کی چلی آتی ہیں کرتی ہوئی کوچ
چوٹ پڑتی ہے گرجتے ہوئے نقاروں پر
آگ کی ڈور ہے، رنگوں کی کڑکتی ہے کمان
بجلیاں باندھی گئیں اندر دھنش پر کس کر
چھینٹا بارش کا ہے یا تیروں کی بوچھاریں ہیں
جو کیے دیتی ہیں متوالوں کے دل کو چھلنی
عشق تو زخم رسیدہ ہے، ستم دیدہ ہے
آج تو حسن پہ بھی ہوتی ہے ناوک فگنی

ایسا لگتا ہے کہ ہنسنے لگا جنگل سارا
اور نیپا کے درختوں میں نئے پھول کھلے
شاخیں بیتاب ہواؤں میں نرت کرنے لگیں
جیسے مدہوشی کے عالم میں کوئی رقص کرے
آئی نورستہ شگوفوں کے لبوں پر ہلکی
دل نوازانہ تبسم کی دل آویز لکیر
در د باقی ہے تپش کا نہ نشاں گرمی کا
نکلی برسات جو پہنے ہوئے پوشاکِ حریر

تجھ کو اے نور کی تصویر، مبارک ہوں یہ دن
لے کے آئے ہیں جو گھنگھور گھٹاؤں کا پیام
آتشِ شوق میں جل جائے جوانی تیری

نو عروسی کو تری عیش و مسرّت کا سلام
زندگی جس سے تر و تازہ ہے اس بارش سے
سبز بیلوں کی طرح تو بھی تر و تازہ رہے
میری محبوبہ پہ ہو رحمتِ حق کی بارش
جگمگاتا ہوا رخسار رہے غازہ رہے

(۲)

لو وہ آتی ہے خزاں، گاؤں کی کنواری جیسے
نازو انداز کی جاں، حُسن کی نازک مورت
بالیاں دھان کی بالوں میں سجا رکھی ہیں
دونوں رُخسار دمکتے ہیں کنول کی صورت
جسم پر گھاس کے پھولوں کا مہکتا ملبوس
اپنی رفتار سے ہنسوں کو بھی شرماتی ہوئی
اس کے سواگت میں چہک اُٹھتی ہیں چڑیاں جیسے
کسی معشوق کی پائل کی صدا آتی ہوئی

رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں
تاجِ مہتاب سے کچھ اور بھی روشن ہے جبیں
پیرہن، چاند کی کرنوں کا چمکتا ریشم
اتنا شفاف کہ یا دل کا کہیں نام نہیں
ہنستی ہے دیکھ کے منہ چاند کے آئینے میں
پڑتی ہے سانولے مکھڑے پہ تبسم کی پھوار
ایسا لگتا ہے کہ نو عمر ہے، دوشیزہ ہے
ابھی آنے کو ہے بھرپور جوانی کی بہار

دھان کے کھیت، وہ استادہ ثمربار درخت
جھوم اٹھتے ہیں جب آتے ہیں ہوا کے جھونکے
لے کے آغوش میں جب ناچتی ہے بادِ خزاں
پھول ہی پھول برس جاتے ہیں پیڑوں کے تلے
جھرجھری لیتی ہیں آہستہ کنول کی جھیلیں
کلیاں منہ چوم کے کلیوں کا جھجک جاتی ہیں
عشق کے ماروں کو آتا ہے محبت کا خیال
خواہشیں دل کے کٹوروں سے چھلک جاتی ہیں

اس خزاں میں بھی مگر تو ہے بہاروں کی بہار
نوجواں جسم سے گل رنگ شگوفے پھوٹیں
پیار کے ہاتھ محبت سے سنواریں تجھ کو
کبھی ہونٹوں، کبھی مشتاق نگاہوں سے چھوئیں
مسکرائے ترے پیروں کی حنا، اور مہکے
زعفراں جسم کی، سینے کا سنہرا صندل
دل پہ عشاق کے زلفوں کی گھٹائیں برسیں
ڈھونڈھیں خود بھونروں کو ہنستی ہوئی آنکھوں کے کنول

(۴)

جا چکی فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں آئی
کوئی تنہا سی کلی شاخ پہ نم دیدہ ہے
اپنے دامن میں لیے اپنے سنہرے موتی
خوشۂ گندم نو کھیت میں بالیدہ ہے
غم نہ کر جانِ جہاں، لُٹ گئی گر دولتِ گل
سخت جاں پھول کوئی اب بھی نظر آتا ہے

(۶)

آخرش موسمِ گل، ویرو سنت آ ہی گیا
اپنے ہاتھوں میں لیے عشق کی رنگین کمان
کالے بھونروں کی قطاروں کی لچکتی ڈوری
آم کے بور کے تیر آتے ہیں یا پریم کے بان
چھیدتے ہیں یہ مرے دل کو، ترے سینے کو
ہم تو اے چندر ودن عشق کے متوالے ہیں
ہم نے کب عشق کے دیوتا سے کیا ہے انکار
ہم نے کیا شوق کے پیغام کبھی ٹالے ہیں

جوشِ گل یہ ہے کہ شاخوں کی جھکی ہے گردن
اور ہوا چلتی ہے مہکی ہوئی اترائی ہوئی
جھیلیں ہیں سرخ کٹوروں سے کنول کے روشن
عورتیں عشق کی کرنوں سے ہیں گدرائی ہوئی
دن سبک، نرم، رواں، شام حسین و شاداب
دل کے لے لینے کا انداز انھیں آتا ہے
جو بھی اِس فصل میں بالیدہ و روئیدہ ہے
بوئے گل، رنگِ بہاراں میں بدل جاتا ہے

بیلا پھولا ہے کہ جلتے ہیں خیاباں میں چراغ
نور کا کنج نظر آتا ہے مدھ بن جیسے
جس طرح عشق میں ہنستی ہے حسینہ کوئی
جگمگا اُٹھتے ہیں رخساروں کے گلشن جیسے
زاہدِ خشک کی بھی خیر نہیں ہے کہ رواں

ہر طرف حسن کی اور عشق کی تنویریں ہیں
نوجواں سینوں میں جذبات ہیں یا آویزاں
وصل کے خوابوں کی ہنستی ہوئی تصویریں ہیں
فصلِ گل آئی ہے یا فصلِ وصال آئی ہے
ایک معشوقۂ خورشید جمال آئی ہے

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، اِن میں
حُسن کی بات کریں عشق پر اصرار کریں
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھول لیں کتابِ دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل، فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہے مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء

صبحِ فردا

اِسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اِسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلواریں اُگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے

یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اُگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے
میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں، صبحِ فردا کا

(۲)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی، بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی، اک دولہن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصّوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی اُنگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بیقراروں کی
یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غم گساروں کی
سحر کو آئے خورشیدِ درخشاں پاسباں بن کر
نگہبانی ہو شب کو آسماں کے چاند تاروں کی
زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی یورش سے
سپاہیں حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کی

خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی
کچل دیں اس کو فولادی قدم بھاری مشینوں کے

کرے یلغار اس پر ضرب کاری دستکاروں کی
اُڑیں چنگاریوں کے پھول پتھّر کے کلیجے سے
جھکے تیشوں کی محرابوں میں گردن کوہساروں کی
لبوں کی پیاس ڈھالے اپنے ساقی اپنے پیمانے
چمک اٹھیں مسرّت سے نگاہیں سوگواروں کی
محبت حکمراں ہو، حُسن قاتل ، دل مسیحا ہو
چمن میں آگ برسے شعلۂ پیکر گل عذاروں کی
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

(۳)

یہ سرحد من چلوں کی ، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمین دل کے بانکے شہسواروں کی
یہ سرحد کج کلاہوں کی ، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور و دلّی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، اُبھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

۲۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

اشکِ ندامت

کہاں ہیں اشکِ ندامت، کہ دھوئیں دامن سے
لہو کا داغ ، دلوں سے کدورتوں کا غبار

یہ اشک ہوں تو ابھی روح پر جلا ہو جائے
یہ آدمی کہ جو ہے نفرتوں کے حلقے میں
یہ آدمی جو ہوا و ہوس کے دام میں ہے
شکار اپنی بنائی ہوئی سیاست کا
مقامِ عشق پہ فائز ہو اور خدا ہو جائے

۱۶ر ستمبر ۱۹۶۵ء

غزل

بیٹھے ہیں جہاں ساقی، پیمانۂ زر لے کر
اس بزم سے اٹھ آئے ہم دیدۂ تر لے کر
یادوں سے تری روشن محرابِ شبِ ہجراں
ڈھونڈیں گے تجھے کب تک قندیلِ قمر لے کر
کیا حسن ہے دنیا میں، کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا اندازِ نظر لے کر
ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی
نکلو تو ذرا گھر سے اک ذوقِ سفر لے کر
راہیں چمک اٹھیں گی خورشید کی مشعل سے
ہمراہ صبا ہوگی خوشبوئے سحر لے کر
مخمل سی بچھا دیں گے قدموں کے تلے ساحل
دریا اُبل آئیں گے صد موجِ گہر لے کر
پہنائیں گے تاج اپنا پیڑوں کے گھنے سائے
نکلیں گے شجر اپنے خوش رنگ ثمر لے کر
لپکیں گے گلے ملنے سرو اور صنوبر سب
اٹھیں گے گلستاں بھی شاخِ گلِ تر لے کر
ہنستے ہوئے شہروں کی آواز بلائے گی
لب جام کے چمکیں گے سو شعلۂ تر لے کر
افلاک بجائیں گے ساز اپنے ستاروں کا
گائیں گے بہت سے لمحے انفاسِ شرر لے کر
یہ عالمِ خاکی اک سیارۂ روشن ہے
افلاک سے ٹکرا دو تقدیرِ بشر لے کر

۲۰ر ستمبر ۱۹۶۵ء

غزل

وہ بہاریں وہ ہوائیں، جو زمیں چمن دیں
وہی مہر و ماہ لائیں، جو اُفق اُفق کرن دیں

یہ نیا زمانہ اسے دل جو وقار کھو چکا ہے — اسے اپنی سربلندی، اسے اپنا بانکپن دیں
جو ہیں رند بہکے بہکے، جو ہیں ساقی بہکے بہکے — انھیں درسِ میکدہ دیں، انھیں ذوقِ انجمن دیں
بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے — چلو اب شبِ سیہ کو، نئی صبح کا کفن دیں
لبِ تیغ پر لہو ہے، لبِ زخم پر تبسم — یہ حیاتِ تن برہنہ، اسے کیسا پیرہن دیں
نئی روحِ جسمِ خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو — یہ کریں کہ روحِ نو کو، کوئی اک نیا بدن دیں
نئی ابروؤں کو بجلی، نئی انکھڑیوں کو صہبا — نئی تیغ دیں نظر کو، نئی زلف کو شکن دیں
یہ زمیں مری زمیں ہے، یہ فلک مرا فلک ہے — انھیں صید کر چکی ہیں، مرے فکر کی کمندیں

اسی بزم میں ملیں گے ابھی شعرِ تر کے ساغر
چلو بزمِ جعفری میں تمھیں جامِ فکر و فن دیں

۲۸ اگست ۱۹۶۵ء

قطعات

تمام رات اندھیرے کا جسم جلتا رہا
تمام رات چٹختا رہا سیاہ بلور
تمام رات ستاروں کی طرح پلکوں پر
لرزتے اشک سناتے رہے حکایتِ نور

ابھی جواں ہے غمِ زندگی کا ہر لمحہ
دھڑک رہا ہے دلِ بے قرار کی صورت
حسین و شوخ ہے مستقبلِ بشر کا خیال
کسی تبسمِ بے اختیار کی صورت

درد دریا ہے ایک بہتا ہوا
جس کے ساحل بدلتے رہتے ہیں
وہی تلوار اور وہی مقتل
صرف قاتل بدلتے رہتے ہیں

ہر منزل اک منزل ہے نئی اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیلِ روانِ دردِ حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں
ہر گام پہ خوں کے طوفاں ہیں، ہر موڑ پہ بسمل رقصاں ہیں
یہ لحظہ ہے قتل عام مگر کہتے ہیں کہ قاتل کوئی نہیں

دل ترے لیے ہے پھر، زخم تازہ کی سوغات
آج ظلم پر اپنے، پھر کوئی پشیماں ہے
کیا عجب سحر تک خود آفتاب بن جائے
اک چراغ پلکوں پر شام سے فروزاں ہے

لہو پکارتا ہے

(اس کتاب میں (۴۸) مختصر نظمیں، غزلیں اور قطعات ہیں۔ آخر میں "ایاں میکدہ" کے عنوان سے چند اہم شخصیتوں پر نظمیں ہیں جو ۸۵-۱۹۷۵ء کے دوران لکھی گئی تھیں اور جعفری صاحب کی کسی کتاب میں شامل نہیں ہیں۔)

حرفِ اوّل ——— قطعہ

اشاعتِ اوّل ——— ۱۹۷۸ء

ناشر ———

یہ وہ صدا ہے جسے قتل کر نہیں سکتے

(ترجمہ)

(انتخاب)

۱۔ آرزوئے تشنہ لبی

۲۔ تمہارا شہر

۳۔ غزل۔ شمع کا، مے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ

۴۔ کون سچ بولے گا

۵۔ نظم۔ (زندگانی ہے کہ شمشیر برہنہ ……)

۶۔ غزل۔ صبح کے اجلے پہ رات کا گماں کیوں ہے؟

۷۔ چھوٹا ساحل

۸۔ غزل۔ (ایرانی طلبہ کے نام)

آرزوئے تشنہ لبی

خشکیٔ لب ہے نہ اب دیدۂ تر باقی ہے
جانے کیا ہو گئے وہ عہدِ گزشتہ کے رفیق
وقت نے چھین لیا بھوک کا فاقوں کا غرور

وہ جو اٹھے تھے زمانے کو بدلنے کے لیے
ایسے بدلے ہیں کہ حیران ہیں نگاہیں سب کی
زیرِ پا مخملِ آسودہ خرامی کا ہے فرش
زیبِ تن خلعتِ پشمینۂ دریوزہ گری
دل ہے یا تمغۂ خوں گشتۂ آوازِ ضمیر

جن میں تلوار تھی اُن ہاتھوں میں اب ساغر ہیں
جن میں شفقت تھی ان آنکھوں میں رعونت اب ہے
اور ان سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر رکھتے ہیں
چند خیرات میں بخشی ہوئی مے کے جرعے
چند مانگے ہوئے، چھلکے ہوئے، ٹوٹے ہوئے جام

دوستو جراتِ شعلہ طلبی لے کے اٹھو
آج پھر آرزوئے تشنہ لبی لے کے اٹھو

۱۹۶۶ء

تمہارا شہر

تمہارا شہر تمہارے بدن کی خوشبو سے
مہک رہا تھا، ہر اک بام تم سے روشن تھا
ہوا تمہاری طرح ہر روش پہ چلتی تھی
تمہارے ہونٹوں سے ہنستی تھیں نرم لب کلیاں
عطا ہوئی تھی سحر کو تمہاری سیم تنی
ملی تھی شام و شفق کو تمہاری گل بدنی

تمہارا نام تصوّر بھی تھا، تخیّل بھی
یقیں بھی، شوق بھی، اُمید بھی، تمنّا بھی
سجی تھی زلف جواں آرزو کے پھولوں سے
"امیدوار تھے ہر سمت عاشقوں کے گروہ"

مگر یہ کیا ہے کہ ہر کوچہ آج ویراں ہے
گلی گلی میں ہیں فولاد پا سیہ عفریت
چمن چمن میں سڑی لاش کا تعفّن ہے
ہوائیں گرم ہیں، بارود کا اندھیرا ہے
خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے

تمہارا شہر تمہارے بدن کی خوشبو کو
ترس رہا ہے، ہر اک بام تیرہ ساماں ہے
نہ روشنی ہے، نہ نکہت، نہ نغمہ ہے، نہ نوا
ہر اک روش پہ ہوا چل رہی ہے نوحہ کناں

سحر کی گلبدنی ہے لہو کا پیراہن
نہ شام ہے نہ سحر، صرف ایک سیاہ کفن
تمھارے شہر کی عریانیوں کو ڈھانپتا ہے

خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے

وہ اک جلوس سا اس موڑ پر نظر آیا
کوئی عظیم جنازہ گزرنے والا ہے
ہوا میں نالہ و فریاد کی ہے کیفیت
ہر اک آنکھ میں آنسو، ہر ایک ہونٹ پہ آہ
دلوں کا توحۂ غم سسکیوں میں ڈھلتا ہے
وہ درد ہے کہ کوئی کھل کے رو نہیں سکتا

مگر جنازہ کہیں بھی نظر نہیں آتا

کفن فروش بھی ہیں، گورکن بھی ہیں لیکن
کوئی بتا نہیں سکتا کہ کس کی میت ہے
کوئی بتا نہیں سکتا کدھر گیا تابوت
کوئی بتا نہیں سکتا کہاں ہے قبرستان

چلو قریب سے دیکھیں یہ بدنصیب ہیں کون
کلرک ہیں جو ابھی دفتروں سے نکلے ہیں
تمام ایک سی شکلیں ہیں ہندسوں کی طرح

سردار جعفری

کسان ہیں جو ابھی کھیتیوں سے پلٹے ہیں
نکل کے آئے ہیں مزدور کارخانوں سے
اور اُن کی پشت پہ افسردہ کھوپڑیوں کی قطار
سروں پہ اڑتے دھوئیں کے سیاہ رنگ علم
برہنہ بچوں کے رونے کی دردناک صدا

جلوسِ غم ہے جنازہ بدوش چلتا ہے
مگر جنازہ کدھر ہے نظر نہیں آتا
خبر نہیں کہ یہاں سے کدھر کو جانا ہے

۱۹۶۶ء

مطبوعہ۔ بلٹز (اردو) بمبئی

غزل

شمع کا، مے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ

تہہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں
لطفِ اقرار ہے یا شوخیٔ انکار کا رنگ

آئی مہکی ہوئی پھر جشنِ ملاقات کی رات
جام میں ڈھلنے لگا شام کے رخسار کا رنگ

عکسِ ساقی سے دمک اُٹھی ہے ساغر کی جبیں
اور کچھ شوخ ہوا بادۂ گلنار کا رنگ

اُن کے آنے کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے
بدلا بدلا سا ہے میرے در و دیوار کا رنگ

اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رُخِ یار کا رنگ

موجِ طوفاں بھی ہے اور جوششِ بہاراں بھی ہے
کون سا دیکھو گے تم دیدۂ خونبار کا رنگ

شفقِ صبحِ شہادت سے ہے تابندہ جبیں
ورنہ آلودۂ خوں تھا اُفقِ دار کا رنگ

آفتابوں کی طرح جاگی ہے انساں کی جوت
جگمگاتا ہے سرِ پردۂ اسرار کا رنگ

وقت کی روح منور ہے نوا سے میری
عصرِ نو میں ہے مری شوخیٔ گفتار کا رنگ

۲۴، ۲۵؍ فروری ۱۹۷۱ء

کون سچ بولے گا؟

کون اس عہد میں سچ بولے گا
حرف آتے ہیں قطاروں میں سپاہی کی طرح
حکم شاہی کی طرح
اور پھر آتے ہیں کچھ اور بھی حرف
صف بہ صف دستِ جنوں باندھے ہوئے
ایک بھی حرف نہیں جو دل و جاں بن جائے
عہدِ حاضر کی زباں بن جائے
سچ تو اک درد ہے، اک زخم ہے، اک جرأت ہے
قید و زنداں بھی ہے سچ اور رسن و دار بھی ہے
لذتِ شوق بھی ہے ندرتِ اظہار بھی ہے
"کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق"

۲۰ ستمبر ۱۹۸۲ء

نظم

زندگانی ہے کہ شمشیرِ برہنہ جس کی
دھار پر چلتے ہیں ہم
اور ہر قطرۂ خوں کے دل میں
اپنے قدموں کے نشاں چھوڑتے ہیں
دور تک جاتا ہے قطروں کا جلوس
خوابِ گلرنگِ بہاراں کی ردا اوڑھے ہوئے

اکتوبر ۱۹۸۲ء

غزل

صبح کے اُجالے پر رات کا گماں کیوں ہے
جل رہی ہے کیا دنیا، چرخ پہ دھواں کیوں ہے

قطرہ ہائے شبنم ہیں یا لہو کی بوندیں ہیں
رنگ و نور کا دامن آج خونچکاں کیوں ہے

خُم بھرے ہیں یا خالی کچھ پتا نہیں چلتا
آج وقت کا ساقی اتنا سرگراں کیوں ہے

خنجروں کی سازش پر کب تلک یہ خاموشی
روح کیوں ہے یخ بستہ، نغمہ بے زباں کیوں ہے

قافلے بھٹکتے ہیں منزلِ تمنّا پر
عشق کیوں ہے سرگرداں، حُسن بے نشاں کیوں ہے

راستہ نہیں چلتے صرف خاک اُڑاتے ہیں
کارواں سے بھی آگے گردِ کارواں کیوں ہے

کچھ کمی نہیں لیکن، کوئی کچھ تو بتلاؤ
عشق اس ستمگر کا شوق کا زیاں کیوں ہے

تم تو گھر سے نکلے تھے جیتنے کو دل سب کا
تیغ ہاتھ میں کیوں ہے دوش پہ کماں کیوں ہے

اک جہاں میں شہرت ہے تم بڑے مسیحا ہو
پھر یہ شاہراہوں پر درد کی دکاں کیوں ہے

قتل کر کے آئے ہیں اور تن کے بیٹھے ہیں
پوچھتے ہیں حیرت سے، نالہ و فغاں کیوں ہے

فرش ہو کہ عرش اے دل یہ جبیں نہیں جھکتی
راہِ سرفروشی میں سنگِ آستاں کیوں ہے

یہ ہے بزمِ مے نوشی اس میں سب برابر ہیں
پھر حسابِ ساقی میں سود کیوں زیاں کیوں ہے

۱۳ر فروری ۱۹۷۴ء

چھوٹا سا دل

میں بازارِ مہر و وفا میں
چھوٹا سا دل بیچ رہا ہوں
اس کی قیمت سیم و زر میں
لعل و گہر میں ناممکن ہے
تاجِ شاہی، تختِ رعونت
سب سستے ہیں، دل مہنگا ہے

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو
صبحِ تبسم عطا کرے
پیاس سے پیلے برگِ خزاں کو
فصلِ گل کی مے میں ڈبو دے
کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے
آنسو کے قطرے چُن لے
اور موتی کر کے واپس دے دے
جو خالی بے بس ہاتھوں کو
کام کی دولت عطا کرے
مایوسی کو کوئے تمنا میں لے جائے
شاہدِ فردا کے جلووں سے دل کی جوت جگائے
جو دھرتی کی بھوک مٹائے
اس کا آنچل گیہوں کے خوشوں سے بھر دے
انساں کی تفریق مٹا کر
انساں کی تخلیق کرے

کیا کوئی ایسا ہے جس کی پلکوں پر
میرے خوابوں کا یہ عکس ملے
میں اس کے قدموں میں اپنا قیمتی دل
چھوٹا سا دل
پھول کی صورت رکھ دوں گا

جنوری ۱۹۷۰ء

غزل

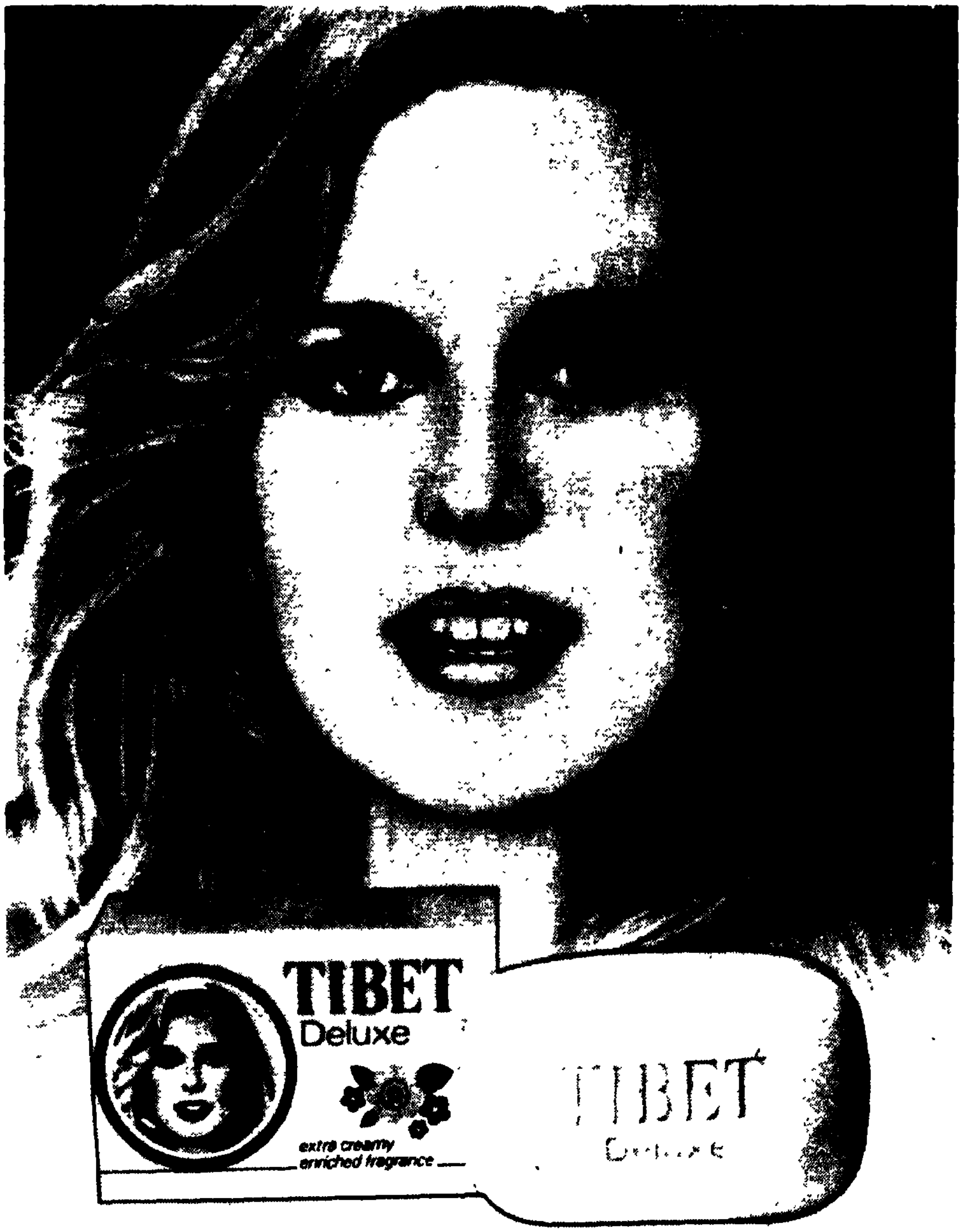
(ایرانی طلبہ کے نام)

خونِ ناحق سے ہوا رنگیں گلستانِ عجم　　　مشعلوں کی طرح روشن ہیں جوانانِ عجم
دل کی ٹھنڈک، روح کی گرمی، نگاہوں کا سرور　　　شعلہ و شبنم کے پیکر ہیں حسینانِ عجم
آندھیوں کا زمزمہ، بیتابِ طوفانوں کا گیت　　　ہیں قیامت کے مغنّی نغمہ سنجانِ عجم
نوجواں سینوں پہ زخموں کے سنہری آفتاب　　　آخرش ظاہر ہوئے افکارِ پنہانِ عجم
سعدی و فردوسی و حافظ کی آتی ہے صدا　　　خود عجم کے درد میں پنہاں ہے درمانِ عجم
جبر کر سکتا ہے کب تک عزم و ہمت کو اسیر　　　کھلکھلا کر ہنس پڑی دیوارِ زندانِ عجم
خرمنِ ظلم و ستم کا آخری لمحہ ہے یہ　　　بن چکی ہے برق زنجیرِ غلامانِ عجم
صاحبِ سرمایہ ہوں گے اب تہی دستانِ شرق　　　ہر شکستہ دل ہے اک لعلِ بدخشانِ عجم
سرد جن سینوں میں ہے احساسِ انسانی کی آگ　　　ہاں ادھر بھی ایک شعلہ، شعلہ دستانِ عجم
مٹ رہا ہے فرقِ سلطان و گدا، میر و فقیر　　　نامۂ اعمال ہے اور محشرستانِ عجم

اے گلِ خونیں جگر چاکِ گریبانم نگر
چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ عجم

۵ نومبر ۱۹۷۸ء


سب سے اچھا سب سے اعلیٰ — سب سے زیادہ چلنے والا
چندا بیٹری سیل
CHANDA
LEAKPROOF
FLASHLIGHT BATTERY
ٹرانسسٹر ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، ٹارچ اور کھلونوں کی
دیرپا کارکردگی کے لئے چندا بیٹری سیل
Adarts-KBM 2/87


TIBET
Deluxe
extra creamy
enriched fragrance
TIBET

تنقیدی جائزے

ملک راج آنند

یادوں کے دریچے

(سردار جعفری کے نام ایک خط)

۲۵۔ کف پریڈ
ممبئی ۴۰۰۰۰۵
۲۵ ستمبر ۱۹۸۶ء

میرے پیارے سردار،

جب مجھ سے ماہنامہ "انکار" نے تمہاری ۷۰ دیں سالگرہ کی مناسبت سے اپنی خصوصی اشاعت کے لیے اپنے تاثرات تحریر کرنے کے لیے لکھا تو مجھے یہ خیال گزرا کہ یہ ایک ایسا موقع ہے کہ میں تمہیں ان دنوں کی یاد دلاؤں جب میں نے تمہیں لارڈ بائرن کے "چائلڈ ہیرالڈ" (CHILD HAROLD) کا خطاب دیا تھا اور میں اب اپنی بے پایاں اندرونی مسرت کے بارے میں کیا بتاؤں جو تمہیں بغیر کسی رسمی طمطراق کے، ایک عالمی حیثیت کے شاعر کی حیثیت میں دیکھ کر محسوس کرتا ہوں۔

تم، ہماری پہلی ملاقات کا، جو وزیر منزل لکھنؤ میں ہوئی، وہ سماں یاد کرو جب اودھ کے ایک شریف اور خوش طینت سرپرست نے سب سے پہلے سیدھے شعراء پر اپنے بڑے گھر کا دروازہ وا کیا تھا، خصوصیت کے ساتھ اس دور کے نوجوان شعراء پر اور تمہیں پتہ ہے کہ ہم اسرار الحق مجاز کی نظم "آوارہ" کے دل گداز اور رقت آمیز نالوں پر کس درجہ پُر جوش کیفیت سے دوچار ہو رہے تھے۔ اس نظم نے ہماری پوری پڑھی لکھی اور سوچنے والی برادری کے اجتماعی لاشعور کے مافیہ کا مختلف طریقوں سے اظہار کیا تھا۔ مؤخر الذکر گروپ فرنگیوں کے آوردہ ایک مستقل نوعیت کے اعصاب شکن دبائو کے المناک دور سے گذر رہا تھا اور یہ وہ دور تھا جس کا نزول میر جعفروں کی اعانت سے ممکن ہو پایا تھا اور سامراج کے قدم جماتے ہی برصغیر کے طول و عرض میں میر جعفروں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔

"آوارہ" میں بیان کردہ نا امیدی کا جذبہ ہی وہ تمثیل بن گیا جس نے اس دور کے نوجوانوں کے لاشعور کی نچلی سطحوں کو مس کیا تھا۔ محل کی اوٹ سے نکلنے والے زرد چاند، ملا کا عمامہ اور ایک بیوہ کی جوانی جیسے لسانی پیکروں نے اردو کی مہتاب زدہ اولین رومانیت کو تم جیسے شعراء کے آتشیں شعور کی بھٹی میں پگھل کر ایک ایسی حقیقت بنا دیا تھا جو پرانی نسل کے شعراء کے ادراک

سے باہر تھی۔

یہ نظم (آوارہ) ایک ایسی موج شعور بن گئی جس نے ہمیں زندگی کی سچائیوں کی مختلف جہتوں کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ تم جانتے ہو کہ ملک بھر میں ہم جیسے لوگ صورت حال کی حقیقتوں کے ادراک کے سبب سرگرم سفر ہو چکے تھے۔

میرے ذہن میں ایک کہانی ہے جو مجھے اس وقت یاد آئی تھی۔ یہ کہانی ایک ایسے فقیر کے بارے میں ہے جو بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس تھا اور ایک گاؤں کی گلی سے گزر رہا تھا۔ وہ اس وقت "غیر مرئی" طاقت کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ گاؤں کے بچوں نے اس پر پتھر پھینکنے شروع کیے، وہ اپنے استغراق سے باہر آیا اور اس نے التجا کی کہ اس پر پتھر نہ پھینکے جائیں۔ ان بچوں میں سے ایک نے بھی فقیر کی التماس پر کان نہ دھرا، پھر وہ یوں گویا ہوا "میں تمہیں ایک عجیب و غریب بات سناؤں گا۔" "اچھا" ایک لڑکے نے کہا "لیکن خدا کے بارے میں بات نہ کرنا۔"

"جاؤ اور دیکھو" فقیر نے کہا "کہ راجہ ہر شخص کو مٹھائی دے رہا ہے۔" بچے مٹھائیاں حاصل کرنے کے لیے راجہ کے محل کی طرف دوڑے۔ اس نے دیکھا کہ بچے ایک دم دوڑنے لگے اور اسے یک گونہ سکون مل گیا، اسے تعجب ہوا کہ وہ ذرا سے مذاق کی بدولت محفوظ ہو چکا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی محل کی سمت جائے گا اور اسے مدرآنش کر دے گا، مبادا بچے یہ خیال کریں کہ اس نے جھوٹ بولا۔

اس پوری کہانی سے یہ سبق ملا کہ تخیل کا سفید جھوٹ حل پیدا کر سکتا ہے اور عام سکوت سے تزکیۂ نفس (CATHARSIS) کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اس دور کی نظموں میں اور خود تمہاری نظموں میں انسانی صورت حال بہت زیادہ گہرائی اور عمق کی حامل نظر آتی ہے۔ علی گڑھ کی تعلیم نے تمہیں شاعروں کے یہاں پائے جانے والی یاسیت اور اضمحلال کی طرف متوجہ کیا تھا جس طرح حالی کے "مسدس" سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تم نے میر، غالب اور اقبال کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ تم میر کے یہاں رومانوی محبت کے بارے میں افسردگی اور مایوسی کے مراحل سے بھی گزرے ہو گے۔ غالب کے یہاں خود اپنی معصومیت پر حیرت کے اظہار پر حیرت ہوئی ہوگی جب وہ اپنے معصوم دل سے پوچھتے ہیں کہ تجھے کیا ہو گیا ہے! تم نے اقبال کے یہاں "اسرار خودی" میں اپنے آپ سے سوالات کرنے کے ہر مرحلے پر غور کیا ہو گا اور ان کی نظم "لینن کے حضور میں" پائی جانے والی استفہامیہ کیفیت کا اندازہ لگایا ہو گا کہ اقبال کس طرح کسانوں کو ظالموں اور غاصبوں کے خلاف بغاوت پر اکساتے ہیں۔

تم نے اسلام کے فرقوں کے مابین محاربات پر غور کیا ہو گا۔ تم نے تعصب کی آگ میں دوسروں کے ساتھ امتیاز برتنے کے مظالم کا جائزہ لیا ہو گا جو برہمنوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے اچھوتوں کے ساتھ روا رکھے تھے۔ تم خود بلرام پور اور دوسرے بلرام پوروں کی کیچڑ اور گندگی سے باہر نکل کر آئے تھے اور تم نے مارکس کی تنقیدی تحریروں سے حاصل شدہ روشنی میں ایک عجیب سی کلیت محسوس کی تھی۔

کیا ہم حالت سرشاری کے جھگڑوں میں حسن ظہیر کے گھر میں اور اپنے اسٹڈی سرکلز میں اس بات پر غور نہ کیا کرتے تھے کہ عدل اور راستی والے مستقبل کے دشمنوں نے ہماری زندگیوں کو کس طرح چکنا چور کیا تھا۔

لکھنؤ کے دور کی نظموں میں تمہارے یہاں "وجود" اور شکست و ریخت کے بارے میں بہت شدید احساس کارفرما نظر آتا ہے۔ وجود کی یہ ریزگی، زوال، شکست و ریخت اور ناامیدی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جو غیر ملکیوں نے اپنی حکمت عملیوں کے ذریعے پیدا کی تھی۔

میرا خیال ہے کہ ہم پرانے وجودی رویوں کے سیلاب سے اپنے اپنے طریقے سے بڑی کامیابی کے ساتھ گزرے اور ہم ایک ناصیاتی زندگی کی کلیت میں ظہور پذیر ہو رہے تھے اور تم اس پیدائش نو کے دوران ہر روز ایک نئی نظم لکھ رہے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ جس ارفع تخلیقیت کی وجہ سے تمہارے اندر سے امید کی تمثالیں طلوع ہو رہی تھیں اسی تخلیقیت نے تمہیں تخلیقیت کے سلسلے میں ایک شعوری ایقان دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کیفیت میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ چونکہ ہمارا خیال تھا کہ ہم اہل مشرق ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے کھوکھلے لوگ (THE HOLLOW MEN) بننے پر متفق الرائے نہیں ہو سکتے کہ ہم اپنے وجود کو اصنامی دور کے ان پرانے خداؤں سے نہیں بھر سکتے تھے۔ ہم اپنے اندر اور اپنے اردگرد فرسودہ عقائد کے خالی پن پر خط تنسیخ کھینچنا چاہتے تھے۔ شاید اسی دور میں تم جیسے نوجوان شاعروں اور بے اطمینانی کی موجوں میں بہتی ہوئی پرانی نسل کے شعراء کے درمیان ایک ایسی کڑی تھا جس نے سامراجیوں کے فاشی بھائیوں (اسپین کے فرانکو وغیرہ) کے خلاف سب ہی کو نبرد آزما اور خندقیں کھودنے پر مجبور کر دیا تھا (مالرو، نرودا، کارن فیلڈ، ہمنگوے اور آڈین، پاز)

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تم دونوں نسلوں کے شعراء کی ماورائی سیاسی سرحدات کو یکجا کیا اور اس برادری کے رشتے کے ساتھ منسلک کیا تھا جس میں آزادی کی محبت پروان چڑھی تھی یہ سب اس لیے ممکن ہو سکا تھا کہ ہمارا ایقان تھا کہ دنیا کے لیڈروں نے غریبوں کے خلاف سرحدیں کھڑی کر رکھی ہیں اور اس لیے ان سرحدوں کو گرانا ہی چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں دیر ہوئی۔ دنیا کا بندر بانٹ کرنے والوں نے جیسا کہ ہمارے رہنما اقبال نے کہا تھا۔ پہلے ہی سے قبریں الاٹ کر دی تھیں، پھر ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ نہ صرف ایشیا کے مفکر بلکہ یورپ کے صاحبانِ فکر و بصیرت بھی اپنے "خالقوں" کے والات بغاوت پر کمربستہ ہونے کے معاملے میں بزدل تھے۔ وہ ابھی تک تبدیل نہ ہو پائے تھے اور وہ ردعمل کی خوشنودی کے سلسلے میں بالکل ہی لاچار تھے۔ یعنی اپنے بزرگوں کے سامنے لاچار تھے اور وہ ہٹلر کے بڑے جھوٹ کے مقابلے میں چرچل کے "نصف جھوٹ" کی وکالت کرنے لگے تھے۔ میں جنگ کے سات سالہ "ڈراؤنے خواب" کے درمیان لندن میں خاموش تماشائی بنا رہا لیکن تم اور دوسروں نے یوں لگتا ہے کہ اپنا مشن جاری رکھا۔ میرا خیال ہے کہ اعصابی جنگ کے وہ تمام سال ہم سب کے لیے ضائع شدہ دورانیہ تھے۔ تمہاری نظم "ایشیا جاگ اٹھا" عالمی خون خرابے کے بعد ایک تطہیری نظم تھی۔ اس نظم میں تمہارے "مقدس غصے" کی گونج تھی جو ہمارے بزرگوں کی جانب سے سامراجیوں کی سربراہی قبول کرنے کے باعث ظاہر ہوئی تھی۔ غالباً اس نظم کا محرک وہ جوان جذبہ تھا جو تم میں باقی رہ گیا تھا اور ملک کے بعض دوسرے شعراء میں بھی۔ ہر چند کہ تم جنگ عظیم دوم کے ہندوستان کے ایک ایسے گندے جہنم میں زندہ رہے جب چاروں طرف موت کا سماں تھا اور اندر قحط تھا۔

تم نے "منسوراد تیاتوس" کے نعرے بھی سنے تھے اور جنگ کے وسیع و عریض المیے کے پریشاں حال "بلکہ مغضوب" کرداروں سے بھی واقف تھے جو اپنی جانیں بچانے کے لیے اپنے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتوں میں، چھوٹے شہروں میں، ہمارے منقسم ممالک کی کارگاہوں میں۔ وہ اس خیالِ خام میں گرفتار تھے کہ وہ لافانی ہیں۔ انھیں خوف و خطر نے آگھیرا تھا انھیں دنیا کے بیشتر لوگوں کے مقابلے میں بہت کم غذا اور مسرت حاصل تھی۔ وہ اپنے تہواروں کی خوشیوں سے بھی مبرا ہو چکے تھے۔ انھیں لہر ملکِ نفات پر بھروسہ تھا جو روٹی اور صاف پانی کی اصطلاحوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ خود تو خاموش تھے، لیکن

بڑے بڑے جلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے اور ان کی خفیہ "قوتِ ارادی" امید کے ساتھ جڑ چکی تھی۔ تم نے اس خاموش انبوہ کو زبان دی تھی۔ تم نے اور بھی بہت سی نظمیں تحریک کی تعبیر، بہت سی "نئی نظمیں"، مثلاً سلطانہ کے ساتھ اپنی محبت کی نظمیں۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی نظم "ایشیا جاگ اٹھا" میں ہندو فلسفہ کرما کی جبریت اور معروف اسلامی عقیدہ کی نسبت سے اپنی براءت کا اعلان کیا تھا جس کے تحت قرآن نیک لوگوں ہی پر الطاف و انعام کی بارش ہو سکے گی جو دنیا میں ٹھیک بات کہے۔ پیارے تم نے اپنے جیالے پن میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ یہ احساس رقم کیا ہے کہ زندگی بجز ان آزادیوں کے کیا ہے کہ زندہ رہا جائے، احساس لیا جائے اور اذیت کے مقابلے میں مسرت کے لیے جنگ کی جائے۔

ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا، ہمیں زمانۂ ماضی کی غلطیوں کو یاد کرنا چاہیے۔ انسانی صورتِ حال کے "ہم" سے آگہی کی منزل میں ڈانواں ڈول ہونا غلط ہوگا۔ تم نے اس گھٹیا مفروضے کو چیلنج کیا ہے کہ "انسانی فطرت تبدیل نہیں کی جا سکتی"۔ تم نے ذات پات کی اس نوع کی جبریت جیسی کہ انسانی فطرت کے مفروضے میں پنہاں ہے میرے سامنے موجود ہے۔ تم نے اپنے خدشات رفع کر دیا ہے۔ ہر چند کہ تم نے اپنے رشتے کو برقرار رکھے ہیں۔ تم ناامیدی کے سیاہ آسمانوں میں پناہ لینے کے خلاف ہو۔ تم نے شاعری کا رشتہ جرأت کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور تم مجھے آج بھی "لارڈ بائرن کے چائلڈ ہیرالڈ" ہی لگتے ہو، بعینہٖ جس طرح تم مجھے پہلی ملاقات میں محسوس ہوئے تھے۔

تمہارا مخلص

ملک راج آنند

سجاد ظہیر

ایک خواب اور بھی

"ایک خواب اور" اردو کے ممتاز و معروف ترقی پسند شاعر سردار جعفری کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔ یہ مجموعہ سردار جعفری کے آخری مجموعۂ کلام "پتھر کی دیوار" کے تقریباً دس سال بعد شائع ہوا ہے اور اس طرح اس میں ان کے آخری دس سال یعنی ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۶۳ء کے آخر تک کا کلام جمع ہے۔ مجموعے کی کتابت، طباعت اور سرورق، روشن اور دیدہ زیب ہے۔

سردار جعفری کی شاعری، جدید اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، ادب کی وہ تحریک جو اردو میں ترقی پسند ادب کے نام سے مشہور ہے اور جس کا آغاز آج سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے ہوا تھا نسبتاً طویل مدت میں کئی پرپیچ راستوں سے گزری ہے۔ اس پر قومی اور بین الاقوامی واقعات اور تاریخ کا اثر پڑا ہے، کبھی اس پر شدت اور جوش کی والہانہ کیفیتیں طاری ہوتی رہیں، کبھی خیال و نظر کی ایسی گتھیوں میں پھنسی ہے جن میں شوریدگی زیادہ اور بصیرت کم تھی اور کبھی انفرادی اور اجتماعی شعور اور نفسیاتی کیفیتوں کا اس میں ایسا حسین، پُراثر اور صناعانہ اظہار ہوا ہے کہ اس نے فن کی سب سے بلند چوٹیوں کو چھو لیا ہے۔ جعفری کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اردو کی ترقی پسند ادبی خلاقی اپنے پورے آب و تاب اور اپنے تمام پیچ و خم کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ گذشتہ تیس سال میں جعفری نے جو شعری تخلیقات کی ہیں اس کا ابتدائی سرا اقبال اور جوش کی شاعری کے ساتھ ملتا ہے جو اس صدی کی بیسویں اور تیسویں دہائی تک نظریاتی اعتبار سے ہماری شاعری پر حاوی تھے، لیکن جب تیسویں دہائی اور اس کے بعد کے زمانے میں قومی اور بین الاقوامی طور پر اشتراکی تحریکوں اور نظریات کا عروج ہوا اور ہمارے ملک کی قومی آزادی کی تحریک بھی اس سے متاثر ہوئی اور مزدوروں، کسانوں اور انقلابی دانشوروں نے اس تحریک کو بائیں طرف موڑ دیا۔ تب اردو شاعری کے میدان میں اس کا سہرا سردار جعفری کے سر ہے کہ انہوں نے اپنے تمام ہم عصروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ واضح اور شعوری طور پر اس کام کو سرانجام دیا۔

بعض لوگ یقیناً اس بات پر چیں بجبیں ہوں گے، ان کا کہنا ہے کہ جعفری مبلغ اور خطیب زیادہ ہیں اور شاعر کم، ایسے معترض خود ترقی پسندوں کے حلقے میں بھی موجود ہیں، لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو یہ دراصل کافی پرانی بحث ہے، البتہ جدید زمانے میں یہ ہمارے سامنے نئی طرح سے ضرور آتی ہے۔ جعفری کی شاعری پر اس قسم کا اعتراض کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو وہ ہیں جو ان خیالات، تصورات اور نظریات سے ہی اختلاف کرتے ہیں جو سردار جعفری کے ہیں۔

ظاہر ہے کہ سردار جعفری کی ایسی شاعری جس میں اس قسم کے انقلابی نظریات کا اتنے جوش اور یقین کے ساتھ اظہار

کیا گیا ہے، ان قدامت پرستوں کے لیے جو شاعری کو تفریح اور تفنن اور سطحی لذت اندوزی کا وسیلہ سمجھتے ہیں، بہت ہی تکلیف دہ ہوگی، لیکن کوئی بھی ایماندار نقاد شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے اس قسم کی شاعری کو اس کا مناسب مقام دینے سے گریز نہیں کر سکتا، لیکن آج کل ایسے بھی لوگ ہیں جو شاعری کو باطنی کیفیات، مبہم اور پیچیدہ نفسیاتی واردات اور ان کے اظہار کے لیے نئے اسلوب، نئے استعاروں، انوکھے اور غیر مانوس انداز بیان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم اس قسم کی نئی فنی کوشش کو اگر وہ کامیاب ہو مسترد نہیں کر سکتے۔ نئے زمانے میں فرد اور جماعت یقینی طور پر نئے حالات، زندگی کے نئے رشتوں اور تعلقات سے دوچار ہیں اور ان کا اظہار نئے انداز سے کیا جا رہا ہے اور کیا جائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ بعض لوگ فن کی ماہیت کو ہی اور اس نئے طرز اظہار کو ہی شاعری کا اصل اور واحد جوہر سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا یہ میدان اس قدر وسیع ہے کہ اگر اس میں ایک طرف باریک نگاری کی گنجائش ہے، جس طرح کہ مصوری میں چھوٹے چھوٹے نازک اور لطیف منیاتورز (MINIA TURES) کی تو دوسری طرف وسیع نمونے پر توانا اور مضبوط خطوں اور روشن رنگوں کے امتزاج سے بنائی ہوئی تصویروں کی بھی ہے۔ میکسیکو کے عوام کی انقلابی جد و جہد کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ وہاں کے آرٹسٹوں نے عمارتوں کی دیواروں پر بڑی بڑی اور عوام کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ، بے حد زوردار اور پُرجوش تصویریں (دیواری یا میورل تصویریں) بنانے کا فن اختراع کیا اور اب اسے عالمگیر مقبولیت حاصل ہے۔۔ سردار جعفری کی بڑی نظموں میں ایسی ہی بڑی دیواری مصوری کی سی کیفیت ہے۔ ان کے خط واضح اور توانا ہیں، ان کا آہنگ بلند اور پرجوش ہے اور یقینی طور پر اپنے بہترین معنوں میں ان کا انداز خطیبانہ ہے اس لیے کہ وہ ہمارے عوام کے بڑے بڑے مجمعوں میں سنانے کے لیے بھی کہی گئی ہیں اور یہ ان کی خوبی ہے ان کی کمزوری نہیں۔ کیا مولانا روم کی مثنوی کا، میر انیس کے مرثیوں کا، اقبال کے شکوے کا، شیکسپیر کے ڈراموں کا انداز خطیبانہ نہیں؟ یہ سب تخلیقات بھی عوام کے مجمعوں میں سنانے کے لیے کہی گئی تھیں، جعفری کی طویل نظمیں اسی صنف کی ہیں ان میں سادگی، روانی اور خلوص ہے اور وہ سننے والوں پر سیدھا اور براہ راست اثر ڈالتی ہیں اور کامیاب ہیں۔

سردار جعفری کے نئے مجموعے "ایک خواب اور" میں ان کی بعض نظمیں پہلے دور کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ گہرے شعور اور زیادہ فکری پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ تیس سال شعر لکھنے کے بعد اور تیس سال کی بھرپور اشتراکی تحریک کے تجربے کے بعد سردار جعفری سے اس قسم کی پختگی کی امید بھی کی جا سکتی تھی۔ نئی دنیا بنانے کی جد و جہد میں ہم کو بہت سے تلخ تجربے بھی ہوئے ہیں۔ خود اشتراکی تحریک کبھی اندھے کٹرپن اور کبھی موقع پرستانہ ڈھیلے پن کا شکار ہوئی ہے۔ ہم نے معروضی حقیقتوں کو دیکھنے اور سمجھنے سے گریز بھی کیا ہے۔ اپنی غلطیوں کو مان کر اپنی اصلاح کرنے میں دیر بھی لگائی ہے، ان کیفیتوں کا ہی اظہار "ایک خواب اور" کے عنوان کی نظم میں ہے۔ اس نظم کے یہ دو شعر جو ایک بار پڑھنے کے بعد دل پر نقش ہو جاتے ہیں (چونکہ وہ ایک تلخ حقیقت کا اظہار ہونے کے باوجود بے حد سچے ہیں)، اثر پذیری میں اپنی مثال نہیں رکھتے ؎

دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے انداز خطاب
دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب

لیکن اس سخت اور کڑوی بات کے محسوس کرنے اور کہنے کے باوجود انسان اور انسانیت اور اس عہد کے بلند ترین نصب العین اشتراکیت کے حصول کی کاوشیں اب بھی ان کے امید پرور سینے میں منارۂ نور کی طرح روشن ہے اور وہ نظم کو اس شعر پر ختم کرتے ہیں :-

پھینک پھر جذبۂ بیتاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمّتِ دشوار پسند

آپ خود "ایک خواب اور" خرید کر پڑھیے اور جدید اردو شاعری کے اس بلند پایہ نمونے سے لطف اندوز ہوجیے۔ البتہ ان لوگوں کو مزید اس مجموعے کو پڑھ کر دھچکا لگے گا جنھوں نے آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے یہ اعلان کرنا شروع کر دیا تھا کہ ترقی پسند ادبی تحریک ختم ہو گئی ہے۔ ▼

آنند نرائن ملا

پیراہنِ شبنم

علی سردار جعفری کو میں اندازاً ۲۷ یا ۲۸ سال سے جانتا ہوں۔ یہ اُس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کی لکھنؤ کی شاخ کے سرگرم رُکن۔ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کرتا تو وہ شاید اس ادبی انجمن کے سکریٹری تھے۔ اس انجمن کے جلسے مرحومہ رشید جہاں کے مکان پر ہوتے تھے اور گو اُس زمانے میں بھی یہ شعر کہتے تھے لیکن اُس وقت سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک پُرجوش باحوصلہ اور باعمل اشتراکیت پر ایمان لانے والے نوجوان کارکن زیادہ ہیں اور شاعر کم۔ اراکین انجمن ترقی پسند مصنّفین کے امیرِ کارواں اُس وقت بہ ظاہر تو جوشؔ ملیح آبادی تھے لیکن اُن کے محبوب ترین شاعر دراصل مجازؔ مرحوم تھے اور اُس کے بعد جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ کا نام آتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ چند ہی سال بعد سردارؔ ان سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا اور دُنیائے شعر میں اپنا مخصوص اور بلند مقام خالی اپنے وطن ہی میں حاصل نہ کرے گا بلکہ اُس کی شاعرانہ عظمت اپنے ملک کے باہر بھی تسلیم کی جائے گی۔

سردارؔ مجھ سے عمر میں ۱۲ یا ۱۳ سال چھوٹے ہیں۔ اگر زندگی میں جمود نہ ہو تو یہ عرصہ ادبی قدروں کو بدل دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ موجودہ دَور تو اتنا برق رفتار ہو چکا ہے کہ صبح کا مستقبل شام آتے آتے ماضی بن چکا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سردارؔ کی شاعری کا میرے دَور کی شاعری سے موضوعاتِ سخن، اندازِ بیان، علامات اور تخلیقِ حسن کے نظریات، چاروں اعتبار سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ ایک سردارؔ کیا آج کے دَور کے سب شاعر اپنے اپنے انداز میں نئے تخلیقی تجربے کر رہے ہیں اور جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاعری کچّی ہے اور انحطاطِ ادب کی دلیل ہے وہ بڑی حد تک اپنی پرانی مِٹتی ہوئی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور بدلتی ہوئی زندگی کی زندہ قدریں قبول کرنے کو راضی نہیں۔

موجودہ دَور کے شعرا کی طرف جب بھی میرا خیال جاتا ہے تو میرے ذہن میں پہلا نام سردارؔ ہی کا آتا ہے کہ یہ میری پسند کی بات ہے۔ شاید اس پسند کی وجہ یہ ہے کہ سردارؔ کی اور میری محض ادبی قدریں ہی نہیں بلکہ انسانی قدریں بھی بہت کچھ مشترک ہیں اور گو آج وہ دھارے پر ہے اور میں کنارے سے لگ چکا ہوں لیکن پھر بھی ہماری نظریں ایک ہی اُفق کی طرف اُٹھتی ہیں۔ ہم نے ایک ہی خواب دیکھا ہے اور اپنی بساط بھر اسی طرف اپنی کشتیاں بڑھا کر اوروں کو بھی اس خواب کو حقیقت بنانے کی دعوت دی ہے۔

آج زندگی کا ہر فن کار سے خالی یہی تقاضا نہیں ہے کہ وہ زندگی کی نا انصافیوں اور غلط نظریوں کی وجہ سے جو انسانی

شکلیں اور محرومیاں ہیں اُن کو سمجھے بلکہ اُن کے خلاف آواز بھی اُٹھائے اور جہد بھی کرے۔ صحیح مفہوم میں آج کے شاعر کو مجاہد بھی ہونا ضروری ہے۔ لیکن شاعر کا جہد میدانِ جنگ میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شاعر بھی تلوار اُٹھا لے لیکن یہ فعل اُس کا بہ حیثیت ایک شہری کے ہوگا بہ حیثیت ایک فن کار کے نہیں کیوں کہ اصل لڑائی تو دلوں اور ذہنوں میں لڑی جا رہی ہے۔ اور تلوار اس نزاع میں کام نہیں دیتی۔ سردار کی زندگی میں ایک مقام ایسا آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردار کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار نہ اُٹھا لے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی اور سردار نے قلم ہی کو تلوار بنا لیا۔ سردار کے ارتقائے فن میں یہ ایک اہم منزل تھی اور اس مقام سے گزرنے کے بعد اس کا شعور جو پہلے ہی سے بیدار تھا اور زیادہ پختہ ہوا اور اُس کے لہجے میں تندی کی جگہ وہ نرمی آگئی جس نے اُسے ساری نوعِ انسان کے قریب کر دیا۔ "پیراہنِ شرر" تک پہنچتے پہنچتے یہ قلم کی تلوار اب اُس کے ہاتھ میں "شاخِ گل" بن چکی ہے اور وہ نظریاتی غبار کی سطح سے اُبھر کر کرۂ نور پر پہنچ گیا ہے۔ اب اُس کے پیام میں ایک پیمبرانہ حلاوت ہے اور اس کی نظر میں زخمِ انساں کے لیے مرہم۔ آج اُس کی منزل کا تعین اس مجموعے کا آخری شعر کرتا ہے ؎

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی   تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے

حرفِ اوّل میں وہ اپنا نظریہ اِن الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی ہے۔ بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی ناکافی ہے .... معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساسِ برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

جب سے انسان نے متمدّن زندگی میں قدم رکھا ہے وہ امن کا جویا رہا ہے لیکن ابھی تک اُس کی قسمت میں ایک کے بعد دوسری جنگ آتی چلی گئی ہے۔ انسان کا بڑھتا ہوا علم ہر آنے والی جنگ کو جنگِ گزشتہ سے اور زیادہ ہولناک اور تباہ کن بناتا چلا جا رہا ہے اور آج یہ نوبت آگئی ہے کہ نوعِ انسان کے مرنے جینے ہی کا سوال سامنے آگیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کی عقل (جو اس کی ذاتی غرض اور حرص کا دوسرا نام ہو کر رہ گئی ہے) اُس کے دل (جو جذبۂ اخوت کا دوسرا نام ہے) کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ اب وہ اُس کی آواز بھی نہیں سُن سکتی۔

آج دُنیا کو تباہی سے بچانا دراصل صرف اس سوال پر منحصر ہے ؎

نمو کی طاقت ابھی دلوں میں ہے یا اسے زیست کھو چکی ہے
ضمیرِ انساں میں آنچ باقی ہے یا یہ لَو سرد ہو چکی ہے

آج ہر فن کار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ عقل اور دل کا یہ فاصلہ اور بڑھنے نہ دے بلکہ انھیں قریب لانے کی کوشش کرے اور ضمیرِ انساں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس انسانی اخوت کی لَو کو بجھنے نہ دے بلکہ ہَوا دے دے کر اسے شعلۂ جوّالہ بنا دے۔

اگر اس نظر سے اردو شعری ادب کا جائزہ لیا جائے تو سردار کا مقام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ "پیراہن شرر" کی زیادہ

تر نظمیں نوعِ انسان کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سردار کا بیدار شعور اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا فن کارانہ حُسنِ انتخاب ان نظموں کو دل نشیں شہ کار بنا دیتا ہے اور اس کے احساس کی صداقت اور خلوص اس کے لہجے کو وہ درد مندی بھی عطا کر دیتا ہے جو بعض نظموں کو انسانی دستاویز کا درجہ دے دیتا ہے۔ ان نظموں میں سردار ایک معلّم اور فلسفی بن کر نہیں بلکہ ایک دوست بن کر سامنے آتا ہے اور چونکہ وہ غمِ مشترک میں اپنا ساتھی ہے لہٰذا اس کی آواز میں ایک بے پناہ کشش اور اس کے پیام میں ایک پائندہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ظریف مرحوم نے شاعر کے بارے میں کہا تھا ؎

تو معالج نفسِ امّارہ کی بیماری کا ہے
تو ذریعہ قوم اور ملّت کی بیداری کا ہے

"میں نے بھی اپنے مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں ایک عظیم فن کار کی تعریف یوں کی تھی۔

"میں تو اُس فن کار کو عظیم فن کار سمجھتا ہوں جو نوعِ انسان کی اکائی بن کر انسانی درد و غم سہے اور اس غم کا مکمل احساس ہونے کے باوجود اس کی ذات میں اتنی لوچ اور اس کے فن میں اتنی سکت ہو کر وہ اس زہر کو امرت بنا کر پی جائے، اپنے دل و دماغ کی معصومیت، تازگی اور حُسن کو برقرار رکھے اور پھر دانائی کی چوٹیوں سے کُل نوعِ انسان کو جس میں مرد انسان بھی شامل ہیں ایک طفلِ معصوم کے میٹھے اور سُریلے بولوں میں پکارے اور منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے"!

"پیراہنِ شرر" کی ان نظموں میں سردار نے اگر یہ مقام حاصل نہیں کر لیا ہے تو اس مقام سے بہت دور بھی نہیں ہے۔

زندگی اور ادب دونوں ایک سلسلۂ لامتناہی ہیں۔ دونوں اُفق در اُفق آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب تک دُنیا قائم ہے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ وہ نظامِ حیات کبھی بھی مرتّب نہ ہو سکے گا جس سے خوب تر کا جلوہ کچھ نگاہوں میں نہ ہو۔ یہ خوب تر کی خواہش ہی ارتقائے زندگی کا راز ہے۔ عظیم فن کار وہی ہے جس کا دیدۂ بینا اس خوب تر کو دیکھ سکے اور کاروانِ انسان کو خوب تر منزل کی طرف گامزن ہونے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ایک سچّا شاعر ان سے ڈر کر اپنی آواز اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ غالب کے اس شعر میں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور چکبست کے اِس شعر میں ؎

نظر کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

اور فیضؔ کے اِس قطعے میں ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو غم کیا ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا ؟ کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور سردار کے "پیراہنِ شرر" کے اِن اشعار میں ؎

کھڑا ہے کون یہ "پیراہنِ شرر" پہنے
بدن ہے چُور تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دِوانہ ہی لیتا ہے صبح کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

باوجود" اندازِ بیان" اور علامات کے نمایاں فرق کے ایک حیرت انگیز خاندانی مشابہت ہے۔ ایک کرب جو دَور بہ دَور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن سردار کی آواز یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی نگاہ بینا ایک درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دیتی ہے۔ اس مجموعے کی آخری نظم "امانتِ غم" میں سردار کہتا ہے ؎

امانتِ غم انساں امانتِ غمِ دل
یہ اک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

. . . .

اٹھو کہ جشنِ دل و جاں منایا جائے گا
ہر اک چمن میں یہی گل کھلایا جائے گا
یہ گل جو دردِ محبت امانتِ غم ہے
یہ گل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے
خدائے عشق بھی ہے امن کا رسول بھی ہے

انسان کے دل کی آرزو ناموافق ماحول سے لڑنے کے لیے ایک شاعر کا پیام بن کر ہمیشہ ہونٹوں تک آتی رہی ہے۔ غالب کے کاغذی پیرہن سے لے کر سردار کے پیراہنِ شرر تک یہ آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر گھڑی گھڑی سامنے آتی ہے لیکن جو چیز "پیراہنِ شرر" کو طرۂ امتیاز بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پیراہنِ شرر کے نیچے ایک پیراہنِ شبنم بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس شگفتہ ہوتی دنیا کو یہ پیراہنِ شبنم ابھی سالوں میسر نہ ہو لیکن ایک سچے فن کار کا حوصلہ اس خیال سے پست نہیں ہوتا۔ وہ تو اس عقیدے پر عمل کرتا ہے ؎

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے　　فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

سردار جعفری بہ حیثیت نقّاد

سردار جعفری ایک انجمن ہیں ایک تحریک ہیں انسانی اقدار کو فروغ دینے والے بڑے شاعر اور بڑے نقاد ہیں میری یہ رائے کہ سردار جعفری شعرِ جدید کے اردو ادبیات کے گل سرسبد ہیں، اخلاقی اقدار سے عبارت ہے۔ نہ انفرادی و اجتماعی نفسیاتی جہات سے مستبط کسی ادیب شاعر اور ناقد کو بھرپور صلاحیت کا حامل جبھی سمجھا جا سکتا ہے جب اس کے جذبات بیدار و زندہ، اس کے ہوش و حواس استدلالی اور اس کا اخلاق خلوص و ایمانداری پر مبنی ہو۔ سردار جعفری کے جذبات مردہ نہیں ہوئے انسانی تہذیب و تمدن کی ارتقا پذیری پر ان کی گہری نظر رہی ہے لہٰذا ان کا دل استحصال سے تڑپ اٹھتا ہے۔ سماجیاتی و جدلیاتی نظریات سے ان کا ذہنی و جذباتی لگاؤ ہے نیز ان کے کردار میں اس لگاؤ کی شعلگی نے ان کی نگارشات و تخلیقات کو ایک منفرد مقام و مرتبہ عطا کیا ہے جس کو ساحر کی نظم "تاج محل" کو ایک فحش چیخ اور آوازہ کشی سمجھنے والے بزعم خود نقاد نہیں سمجھ سکتے کیونکہ ان کے دل یزداں میں سردار جعفری کانٹے کی طرح باوجود کھٹکتے ہیں۔ ان کی شاعری پر یہ اعتراض اکثر سننے میں آتا رہا ہے کہ سردار جعفری کی شاعری بے جان ہے۔ رومانیت بیگانہ ہے۔ انسانیت کا تصور اشتراکیت کا پس خوردہ ہے اور وہ فراق شکن ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس نوعیت کی چہ میگوئیاں بہتان طرازی سے زیادہ کچھ نہیں، ملاحظہ ہو۔ اس خط سے اقتباس جو انہوں نے اپنی شریک حیات سلطانہ کے نام سنٹرل جیل ناسک سے لکھا کہ

"میری شاعری میں جو انسانیت کا تصور ہے۔ .... وہ تصور بہت اہم ہے۔ میرے سر یہ الزام آگیا ہے کہ میں پچھلے پندرہ سال کی ساری شاعری کو رومانی شاعری کہہ کر نظر انداز کر رہا ہوں۔ میں رومانیت کے خلاف نہیں ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر رومانیت کے شاعری ممکن نہیں ہے۔۔ میں دراصل رومان پرستی کے خلاف ہوں اسی لیے میں نے اپنی نظم میں یہ لکھا تھا۔

اپنے تاریک اندیشہ رومان کے ساز کو توڑ دو
اپنی مضراب کو پھینک دو
اس کے نغموں سے آنسو ٹپکتے رہیں گے۔۔۔۔"

(مراسلہ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۵۰ء)

یعنی وہ لا یعنی رومانیت کے خلاف ہیں۔ ایسی رومانیت جو کسی نصب العین کی جانب اشارہ نہ کرے اس کو روشن اندیشی کہہ کر کہا جا سکتا ہے۔ رہی یہ بات کہ سردار جعفری فراق شکن ہیں۔ اس کی تردید اس حقیقت سے ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے خطوط میں نہ جانے فراق کے کتنے شعر بسبیل تذکرہ لکھے مثلاً ؎

یہ زندگی کے کڑے کوس یاد آتا ہے۔
تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ

کچھ آشنا تو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
اسے وہ درد محبت سہی تو کیا مر جائیں

محولہ فوق دونوں اشعار فراق کے ہیں۔ سردار جعفری کے یہاں جو رومانیت ہے وہ یک ٹٹ رومانیت نہیں ہے بلکہ حقائق زندگی پر استوار نصب العینی رومانیت ہے مثال کے لیے یہ دو شعر جو جیل میں کہے گئے اور ایک خط میں لکھ کر بیگم سلطانہ صاحبہ کو بھیجے ؎

راہ میں فوجوں کا پہرہ سر پہ تلواروں کی چھاؤں
آئے ہیں زنداں میں بھی باشوکت شاہانہ ہم
جاتے جاتے دے گئے ہم زندگی کو رنگ و نور
رفتہ رفتہ بن گئے اس عہد کا افسانہ ہم

اسی زمانے کی ایک نظم کا یہ شعر ؎

سنا کرتے تھے حسن وینس ہیلن کے افسانے
جمال وینس و ہیلن کا آخر اعتبار آیا

کیا اس میں رومانیت کی شے صد آتشنہ نہیں ہے حالانکہ یہ شعر غزل کا شعر نہیں ہے متلکات ذہنی کے تحت میرے لوح حافظہ پر سردار جعفری کے چند فارسی اشعار ابھر آئے جن کو پیش کرنے کی خواہش بیدار ہو اٹھی ہے۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۸۱ کو تاجکستان سے میرے نام خط میں لکھے تھے جہاں وہ میرزا ترسون زادہ کے ستر سالہ جشن میں شریک ہوئے تھے۔

دوشنبہ از دیار ہند یک دیرینہ یار آمد
بیاد میرزا ترسون زادہ بے قرار آمد
طلب اعجاز دارد شعر آں دانائے تاجیکی
کہ از میخانۂ اور ند مشرق ہوشیار آمد
بسوزد برق فکرش خرمن خاشاک عالم را
ز خاک مرقد او لالہ و گل شعلہ بار آمد
سر خاک شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش باز نہال تاجکستان سازگار آمد

زشور میر زا رقصاں سبہ چشمانِ تاجیکی
ز زلف بر ہوا پیچیدہ خوشبوئے تتار آمد

غرض کہ کلاسیکی رکھ رکھاؤ، درد و سوز و آرزو مندی" پر محیط سوز و مندرومانیت، گرد و پیش سے باخبری، حال کو بہتر مستقبل کی جانب رواں دواں کرنے والے نظریاتی و سماجیاتی جذبات وغیرہ خصوصیات بدرجۂ اتم سردار جعفری کی شاعری میں رنا کرن نظر آتی ہیں اور نثری تخلیقات بھی گل ریزِ بصیرت بہم پہنچاتی ہیں۔

مجھے اے شبِ زندگی، وہ طلوعِ صبح نصیب ہو جو بِلک مجھے رخ زرستن سے جو مہک مجھے لب یار سے

وہاں زمین کی سب نعمتیں میسر ہیں
یہاں پہ نجمِ مقدر کی ایک ضو بھی نہیں
ہمارے پاس ہے حرفِ دعا کی رعنائی
مگر نصیب میں چھوٹی سی نانِ جو بھی نہیں

تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے، زندگی کا ترانہ
کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے
کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

دل و نظر کو ابھی تک وہ دے رہے ہیں فریب تصوراتِ کہن کے قدیم بت خانے

انقلاب آئے گا رفتار سے مایوس نہ ہو بہت آہستہ نہیں ہے جو بہت تیز نہیں

وہ جانتے ہیں کہ دور دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے۔ اور ہوگی۔ لیکن انسان ناقابلِ شکست ہے۔ کیونکہ اس کی محنت عمل اور جدوجہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا (ورا زپیش لفظ، نئی دنیا کو سلام)
اس نظریے و اعتماد کو اس شعر میں دیکھیے ؂

پھینک کر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور بھی اے ہمتِ دشوار پسند

یہ خواب شمعِ جلی کی بے سرو پا آرزو مندی نہیں ہے بلکہ یہ دعوت و عزیمت بہ کنار جذبہ ہے جو جرأت عمل پیدا کرتا ہے۔

ڈاکٹر تاراچرن رستوگی

جعفری ... نمبر

" جذبات اور شعور کا تعلق بہت اہم ہے۔ جذبہ میں شعور کے بغیر گہرائی پیدا ہو ہی نہیں سکتی ... نہیں رہ سکتا۔ جذبہ خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے اور تخیل بھی شعور کا محتاج ... شدت اور گہرائی جھلکتی ہے ....

... ہے۔ شعور وہ کسوٹی ہے جس پر سچے جذبے اور جھوٹے جذبے کو پرکھا اور پہچان کو ... تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تاریخی ارتقا ہوا ہے اور وہ تغیر ... انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے ... شعور اور جذبہ ... تخیل ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔ تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ (ترقی پسند ادب، ص ۳۰ - ۳۲)

جذبہ و تخیل ازلی و ابدی نہیں ہوتے بلکہ ان کا تاریخی ارتقا ہوتا ہے۔ کیونکہ شعور کو ماحول و تاریخ سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ معاشی و اقتصادی رشتہ و تعلق پر سماج استوار ہوتا ہے۔ نیز رشتہ و تعلق جو اپنی نوعیت میں ... مادی ہوتے ہیں۔ انسانی شعور پر منزل بہ منزل اثر انداز ہوتے رہے ہیں ہر چند کہ سردار جعفری ناقد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی تنقید بھی بلند پایہ در جہ مرتفع مقام رکھتی ہے کہنے کو ان کی تصنیف اقبال شناسی مقالات کے شمار کے اعتبار سے ضخیم کتاب نہیں ہے۔ مگر اس میں شعر اقبال کا جو تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ معنوی ضخامت میں محیط ہے انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے۔ ترقی پسند ادب ایسی تصنیف ہے جو کسی اعتبار سے کم قابل قدر نہیں کہی جاسکتی اس سلسلے میں ان کا ترتیب دیا ہوا گفتگو کا خصوصی" شمارہ ترقی پسند ادب نمبر" ایک ایسی گراں مایہ دستاویز ہے جس کو ادبی حلقے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے اقبال شناسی کا مرتبہ و مقام حالی کے یادگار غالب سے کم نہیں ہے۔ اگر حالی نے غالب کو شہرت سے آشنا کیا تو سردار جعفری نے اپنی تصنیف " اقبال شناسی " سے شعر اقبال کو ایک مخصوص زاویہ سے شہرتِ دوام سے ہمکنار کر دیا۔ یہی نہیں شعر اقبال سے متعلق اپنے تنقیدی نظریہ پر عمل پیرا ہو کر نومبر ۷۷ء میں اقبال کو عالمی فورم پر پیش کر کے اس کو بہ حیثیت عالمی شاعر ثابت کرنے کی نہایت کامیاب کوشش کی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو شاعر بمبئی میں مشمولہ میرا مضمون " سردار جعفری اور اقبال ") مزید ثبوت ان مقالات سے جو عالمی سیمینار منعقدہ نومبر ۷۷ء وگیان بھون دہلی میں پیش کیے گئے اور جن کو کتابی شکل میں اقبال سینٹنری کمیٹی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس کی کامیابی کا سہرا سردار جعفری کے سر بندھتا ہے جو ترقی پسند ادب کے روح رواں رہے ہیں۔ دنیا بھر کے چوٹی کے ادیبوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دینا جوئے شیر لانے سے کم مشکل و دشوار کام نہیں تھا یہ معروضہ قصیدہ خوانی نہیں ہے۔ بلکہ تنقیدی استدلال ہے۔ نہ معلوم کیوں سردار جعفری کی ناقدانہ صلاحیت و کاوش کو اردو تنقید میں صرفِ نظر کیا جا رہا ہے جبکہ صرف کوری جذباتی شعور بیگانہ کتابوں کو اہم سمجھا جاتا ہے۔

نا ہے طاقتِ گفتار۔ یہ انسانوں کو
بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو (اقبال)

اشتراکیت پر استوار اور پروان چڑھے شعور کے حامل سردار جعفری نے تنقید کے میدان میں نمایاں جوہر

[illegible] انھوں نے دیوانِ غالب، دیوانِ میر، کبیر بانی اردو اور دیوانِ گمری، رسم الخط میں مرتب کیے۔ ہر ایک کا [illegible] قابل توصیف مثال پیش کرتا ہے۔ ان دیباچوں کو پیغمبرانِ سخن میں جمع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ کبیر، میر اور غالب یہ تینوں شاعر۔۔۔ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں" یہ اُردو والوں کی کوتاہ نظری تھی کہ۔۔۔ انھوں نے قطب شاہی اور اس سے پہلے کی دکنی شاعری کو تو اُردو ادب کی میراث کی حیثیت سے قبول کیا لیکن کبیر سے بے توجہی کی اور ہندی والوں کی تنگ نظری سے کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل کے سب سے بڑے شاعر میر اور غالب کو ہندی کا رتن ماننے سے انکار کر دیا اب ہندی، اُردو دو مستقل زبانیں بن چکی ہیں لیکن ان کی میراث میں کچھ مشترکہ قدریں شامل ہیں۔۔۔۔۔ کبیر کی شاعری کا پیرایۂ مذہبی [illegible] بھگتی اور تصوف کے امتزاج کا دوسرا نمونہ میر اور غالب کی شاعری کا پیرایہ غیر مذہبی ہے۔ لیکن۔۔۔ کبیر کا مزاج [illegible] ہے۔ مزاج روحی کا ہم ہے اور رنگ کا بھی اور [illegible] شعلہ [illegible] یہاں مل جائے گا۔۔۔ میر [illegible] غالب کی شاعرانہ بازیافت خود میری شعر گوئی کے لیے ضروری ہے [illegible] نظریۂ تاریخ پر یقین [illegible]۔۔۔ میں نے اسی نظریے سے ان [illegible] پر نظر ڈالی ہے یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں۔ وقت کا وہ رواں دریا جو ماضی، حال و مستقبل کے بہتے ہوئے دریا کی شکل میں پیش کرتی ہے اس کی موجوں میں شعر و فن بھی شامل ہیں"۔۔۔۔ (دیباچہ پیغمبرانِ سخن، ص ص ۷-۸ [illegible])

۔۔۔۔۔۔ ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس روشنی کی ضرورت ہے۔ جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی۔ آج دنیا آزاد ہو رہی ہے۔ سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھایا ہے۔ صنعتوں نے اس کے دست و بازو کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔ انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے۔ پھر بھی حقیر ہے مصیبت زدہ ہے دردمند ہے اور زندوں میں بٹا ہوا ہے۔ قوموں میں تقسیم ہے۔ ان کے درمیان مذہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں، طبقاتی کشمکش کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیورو کریسی نے رہی ہے۔ دلوں کے اندر اندھیرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی رعونتیں اور خود غرضیاں ہیں جو انسان کو انسان کا دشمن بنا رہی ہیں۔ جب وہ حکومت، شہنشاہیت اور اقتدار سے آزاد ہوتا ہے تو خود اپنی بدی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کو ایک نئے یقین، نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہے۔ جتنی کبیر کی آواز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (کذا) ص ۵۵] محولہ فوق اقتباس کے تناظر میں یہ حقیقت واشگاف طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ بہ حیثیت ناقد بھی سردار جعفری کا انداز و کردار تنقید درخور اعتنا ہے"کبیر پر اس طرح کی مثبت تنقید ہندی میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اب ملاحظہ ہو میر کے متعلق ان کی رائے۔

"ور شاعر کو تلمیذ رحمان بھی کہا گیا اور پیغمبر کا بھی درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن میر تقی میر تنہا شاعر ہیں جن کو خدائے سخن کہا گیا ہے۔۔۔۔۔ ہر عہد کے بڑے سے بڑے شاعر نے اپنا سر میر کی بارگاہ میں جھکا دیا ہے۔۔۔۔۔۔ ان کا مقام شاعری ہی میں بلکہ زبان کے ارتقا کی تاریخ میں بھی بہت اہم ہے۔ کھڑی بولی جس پر جدید ہندی اور اُردو زبان کی بنیاد ہے اتنے نکھرے ہوئے روپ میں میر کے ہاں نظر آتی ہے۔ کہ اس کے بعد کا ہر روپ میر کی دین معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ میر ان معنوں میں عشقیہ شاعر نہیں ہیں جن معنوں میں نقاد اور نیم رومانی شاعر اُردو کی ساری شاعری کو جنسیات تک محدود کر دینا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ قرونِ وسطیٰ میں انسان دوستی کی سب سے بڑی تحریک تصوف کی شکل میں ابھری۔ بھگتی اور مسٹی سزم

بس کی بظاہر اسلامی شکلیں ہیں، ان تحریکوں کا رشتہ دستکاروں اور کسانوں کی بغاوتوں سے بھی رہا ہے۔ لیکن میر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے صرف یک نکری نظام باقی رہ گیا تھا جو جاگیرداری نظام کی قدروں سے مختلف قدریں رکھتا تھا اور ان میں سب سے زیادہ اہم وحدت انسان کا تصور تھا جو مذہب ذات پات اور پیشوں کی بنیاد پر تقسیم ہو جانے والے انسانوں کو ایک ہی رشتے میں پرو دیتا تھا۔ ...... صرف انسان سے محبت کر کے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ .... اس طرح جنسی محبت، بنی نوع انسان کی محبت اور خدا کی محبت تینوں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ جتنے محبوب کے جلوے ہیں اتنے ہی عشق کے روپ ہیں۔ ...... میر کے یہاں دل اور دل کی خرابی کا ذکر ایک ساتھ آتا ہے اور عاشق اور آدم ہم معنی الفاظ ہیں .... ؎

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت

اور دوسرے میں یہ ہے ؎

کشتنِ مردماں اگر ہے ثواب
تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

...... میر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں براہ راست سماجی معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے۔ ... ؎

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہے جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و ساماں کی   اب بڑھ گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی

غیر از خدا کی ذات مرے گھر میں کچھ نہیں   یعنی کہ اب مکان میرا لامکاں سے ہوا

..... جفا شعاری شہروں ہی کی نہیں، دل کی خرابی کا بھی باعث ہے جسے میر نے تشبیہ کی شکل میں پیش کیا ہے...... ؎

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے۔   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

...... یہ بات بھی غور طلب ہے کہ میر کے یہاں وصال کا اضطراب درد و کرب اور خالص نشاط سب کچھ ہونے کے بعد بھی ان کا کلام وصال کی اس لذت اور معشوق نوازی کی کیفیت سے خالی ہے۔

سبھی تم مکھ ستی اٹھو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیوں گل سے نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

...... چیکو سلواکیہ میں ایک مقام تابورہے۔ اس کے میوزیم میں قرون وسطیٰ کی عیسائی صوفی تحریک مسٹی سزم کے ایک رہنمایان ہس کی یادگاریں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک شاعر کی نظم میں یہ شعر پڑھ کر کے "موت عصائے شاہی اور کسان کے ہل کو ایک ہی قبر میں سلا دیتی ہے"۔ مجھے بے ساختہ میرؔ کا شعر یاد آگیا ؎

سب ہیں یکساں جب فنا اک بارگی طاری ہوئی
ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا سر فغفور کیا!

...... میرؔ کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں کانٹے بھی، بلبل بھی ہے اور صیاد بھی ہے، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔ (ص ص ۵۵ - ۱۴۷)

سردار جعفری کا مرتبہ دیوان غالب بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے بالخصوص اس اعتبار سے کہ اس میں مشمولہ دیباچہ اہم تنقیدی ہوش و خرد کی آئینہ داری کرتا ہے۔ غالب پر کہی نظم بھی جاذب توجہ ہے۔ کچھ اشعار بطور مثال پیش کرنا غالباً غیر مستحسن نہ ہوگا ؎

جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داد سخن ایسا نہ تھا
وہ صداقت وہ حقیقت وہ جمال برق پاش
زندگی جس کے لیے قرنوں سے سرگرم تلاش
وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں
تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثال شمع ماضی کے سیہ خانوں میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانوں میں ہے

غالب کو شعری عقیدت پیش کرنے والے شعراء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر ثروت بیتی اس موضوع پر

اس کو بیشتر اسلامی شکلیں تیں ان تحریکوں کا رشتہ دستکاروں اور کسانوں کی بغاوتوں سے بھی رہا ہے۔ لیکن میر کے عہد تک پہنچتے پہنچتے صرف ایک فکری نظام باقی رہ گیا تھا جو جاگیرداری نظام کی قدروں سے مختلف قدریں رکھتا تھا اور ان میں سب سے زیادہ اہم وحدت انسان کا تصور تھا جو مذہب ذات پات اور پیشوں کی بنیاد پر تقسیم ہو جانے والے انسانوں کو ایک ہی رشتے میں پرو دیتا تھا۔ ...... صرف انسان سے محبت کرکے خدا تک پہنچا جا سکتا ہے۔ .... اس طرح جنسی محبت، بنی نوع انسان کی محبت اور خدا کی محبت تینوں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ جتنے محبوب کے جلوے ہیں اتنے ہی عشق کے روپ ہیں۔ .... میر کے یہاں دل اور دل کی خرابی کا ذکر ایک سانحہ آتا ہے اور عاشق اور آدم ہم معنی الفاظ ہیں ...... ہے

مارنا عاشقوں کا گر ہے ثواب
تو ہوا ہے تمہیں ثواب بہت

اور دوسرے دن یہ ہے

کشتنِ مردماں اگر ہے ثواب
تو ہوا ہے اسے ثواب بہت

...... میر کی غزلوں میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں براہِ راست سماجی معاشی اور سیاسی مضامین کو ڈھال دیا ہے...... ہے

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدا زر خواہاں ہیں
چین میں ہے جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب

کیا شہر میں گنجائش مجھ بے سر و ساماں کی   اب بڑھ گئے ہیں میرے اسباب کم اسبابی

غیر از خدا کی ذات مرے گھر میں کچھ نہیں   یعنی کہ اب مکان مرا لامکاں ہوا

..... جفا شعاری شہروں ہی کی نہیں، دل کی خرابی کا بھی باعث ہے جسے میر نے تشبیہ کی شکل میں پیش کیا ہے.........

شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے۔   دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

.... یہ بات بھی غور طلب ہے کہ میر کے یہاں وصال کا اضطراب درد و کرب اور خالص نشاط سب کچھ ہونے کے بعد بھی ان کا کلام وصال کی اس لذت اور معشوق نوازی کی کیفیت سے خالی ہے۔

سبھی تم کھسکتی اٹھو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیوں گل سے نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ
عجب کچھ لطف رکھتا ہے شبِ خلوت میں گل رو سیں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

...... چیکو سلواکیہ میں ایک مقام تابور ہے۔ اس کے میوزیم میں قرون وسطیٰ کی عیسائی صوفی تحریک ہسی سزم کے ایک رہنما یان ہس کی یادگاریں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک شاعر کی نظم میں یہ شعر پڑھ کر کہ "موت صاحب شاہی اور کسان کے ہل کو ایک ہی قبر میں سلا دیتی ہے"۔ مجھے بے ساختہ میرؔ کا شعر یاد آگیا ؎

سب ہیں یکساں جب فنا اک بار گی طاری ہوئی
ٹھیکرا اس مرتبے میں کیا میر فغفور کیا!

...... میرؔ کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں کانٹے بھی، بلبل بھی ہے اور صیاد بھی ہے، نشیمن بھی ہے اور بجلی بھی، زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مرجانے کا حوصلہ بھی اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔ (ص ص ۵۵ - ۱۴۷)

سردار جعفری کا مرتبہ دیوان غالب بھی منفرد حیثیت کا حامل ہے بالخصوص اس اعتبار سے کہ اس میں مشمولہ دیباچہ اہم تنقیدی بصیرت و خرد کی آئینہ داری کرتا ہے۔ غالب پر کہی نظم بھی جاذبِ توجہ ہے۔ کچھ اشعار بطور مثال پیش کرنا غالباً غیر مستحسن نہ ہوگا ؎

جو لگا دے آگ کوئی نغمہ زن ایسا نہ تھا
تجھ سے پہلے کوئی داورِ سخن ایسا نہ تھا
وہ صداقت وہ حقیقت وہ جمال برق پاش
زندگی جس کے لیے قرنوں سے سرگرم تلاش
وہ صداقت عکس افگن ہے تری تقریر میں
وہ حقیقت جلوہ فرما ہے تری تحریر میں
تو نے دل کو گرم سینوں کو فروزاں کر دیا
روح کو روشن دماغوں کو چراغاں کر دیا
تو مثالِ شمع ماضی کے سیہ خانوں میں ہے
نور تیرا حال و مستقبل کے کاشانوں میں ہے

غالب کو شعری عقیدت پیش کرنے والے شعراء کی تعداد ہزاروں تک پہنچ سکتی ہے۔ مگر ژرف بینی اس موضوع پر

کی نظموں میں صرف دو ہی کو درخورِ اعتنا سمجھے گی اقبال اور سردار جعفری کی نظمیں ہی سرفہرست نظر آئیں گی غالب کی شاعری بلاشبہ انسانی تمنا کا دوسرا قدم تھی یعنی بڑھتا قدم۔ منجملہ دیگر خیالات و تصورات غالب جانتے تھے کہ دنیا کی ساری رونق اس انسان کی وجہ سے ہے ؎

زماگرم است این ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد

".... غالب کے پاس سماجی ارتقاء کا ایک معقول تصور تھا۔ اب یہاں اگر مہر نیم روز کی یہ بات دہرائی جائے کہ ایک آدم کے بعد دوسرا آدم ظہور کرے گا .... وہ اکبری عہد کے آئین کے مقابلے میں نئے صنعتی نظام کو ترجیح دیتا تھا اور سائنسی ایجادات اور تصورات کو شاعری میں جگہ دینے کے حق میں تھا۔ .... غالب کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے نیا اضطراب پیدا کیا۔ اس کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس نے اپنے ہر تجربے کو جو ایک انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق رکھنے والے ذہن کی کار فرمائی تھی۔ انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلایا ہے، کلیے کی کسوٹی پر کسا ہے اور پھر شعر کی شکل میں ڈھالا ہے تب اس کے یہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا ہے اور وہ زندگی کے ہر شعبے کا شاعر بن گیا ہے۔" .... (دیباچہ دیوان غالب)

اگر محولہ دیباچوں کو بین السطور پڑھا جائے اور غیر تعصب زدہ نیز مضمرات ذہنی کی کمین گاہوں سے محفوظ دل و دماغ سے غور کیا جائے تو سردار جعفری ہر چند کہ وہ اپنا شمار نقادوں میں نہیں کرتے، بڑے ناقد ہیں۔ ان کی تنقید صحت مند جمالیاتی اقدار تاریخی و سماجی تناظر، نفسیاتی جبر و نظر وغیرہ پر محیط ہونے کی وجہ سے قابل توصیف و درخور اعتنا ہے۔ بہ حیثیت شاعر نیز ناقد وہ اردو شعر و تنقید کو نو بنو جہت و افق سے آشنا کرتے رہے ہیں۔ وہ بیک وقت انسان دوست بڑے شاعر اور کار آگاہ ناقد سخن ہیں۔ اردو ادبیات کو عالمی سطح انہیں کی مساعی جمیلہ نے دی ہے ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر وحید اختر

سردار جعفری ۔ خواب اور شکستِ خواب

"خواب اور شکستِ خواب اس دور کا مقدر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت کوئی اقتدار اسے محروم نہیں کر سکتا اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے۔"

تراشیدم پرستیدم شکستم،

سردار جعفری شاعر کی حیثیت سے خوابوں کی دنیا کے باسی ہیں وہ خواب دیکھتے ہی نہیں، تخلیق بھی کرتے ہیں۔ ایک باشعور فرد کی حیثیت سے وہ خوابوں کے دھندلکے سے اتر کر حقیقت کی سنگلاخ زمین پر تعبیر کے صحراؤں میں آبلہ پا سرگرداں بھی رہتے ہیں، مگر خوابوں کو آنکھوں میں بسائے ہوئے۔ وہ خواب دیکھنے والے شاعر ہی نہیں بلکہ حیات و کائنات کے ناظر بھی ہیں اور اپنے عہد کے نباض بھی۔ اُن کی شخصیت میں کئی شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ مخدوم نے بساطِ رقص" کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ شاعر ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سردار جعفری شاعر ہی نہیں بلکہ ناقد بھی ہیں اور نظریہ ساز بھی۔ وہ ایک عمر میں اب تک کئی عمریں بسر کر چکے ہیں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت شیعہ مذہبی ماحول میں ہوئی۔ ابتدائے سخن میں انہوں نے ایک مرثیہ لکھا شیعیت محض ایک مذہب نہیں، ایک تحریک بھی ہے۔ اور ایک تہذیب بھی۔ تحریک یوں کہ کربلا سے آج تک شیعیت ذہنی بستگی، قدامت، ظلم، جبر، ملوکیت، استبداد، استحصال اور ناانصافی کے خلاف جہاد کرتی رہی ہے۔ عدل توحید کے ساتھ شیعہ عقیدے کے اصولِ دین میں دوسرا رکن ہے۔ اس کے زیر اثر ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اصولِ دین میں سے ہیں جس عقیدے کی بنیاد ان اصولوں پر ہو حیرت نہیں

کہ اس کے ماننے والے تاریخ اسلام میں عقلیت، روشن خیالی اور انقلابی خیالات کے نقیب رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں اگر شیعوں کی تعداد قابلِ لحاظ ہے۔ تو اس کا سبب یہی مذہبی ماحول ہے جو مجالسِ عزا کے توسط سے حریتِ فکر و اظہار کے لیے ذہنوں کو آمادہ کرتا ہے۔ میرے نزدیک عزاداری صرف مذہبی رسوم کا نام نہیں، ایک تہذیب کا نام ہے۔ تہذیب یوں کہ عقائد کی بنیاد پر اس مذہب نے روایات کی وہ عمارت کھڑی کی جس نے شاعرانہ تخلیقی اظہار کو پروان چڑھایا اور اسے وہ تاریخی بصیرت عطا کی جو اپنے عصر سے ماورا مستقبل کے امکانات کو دیکھ سکتی ہے۔ مارکسی اصطلاح میں تہذیب بالائی ڈھانچہ SUPER STRUCTURE ہے۔ شیعیت نے صفویوں کے عہد سے لے کر شاہانِ اودھ کے عہد تک اسلامی تہذیب میں جو نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کیں اُن کے لیے اقبال نے بجا طور پر کہا ہے۔ کہ مرثیہ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ زوال میں بھی اس عقیدے نے فنونِ لطیفہ اور دوسرے تہذیبی اداروں کو تخلیقیت کے جذبے سے سرشار رکھا۔ سردار جعفری اسی فرہنگ و تہذیب کے زائیدہ و پروردہ ہیں۔ اُن کی دوسری عمر اس وقت شروع ہوئی جب وہ مارکسزم کے زیرِ اثر آئے۔ جعفری نے تو یونیورسٹی میں باضابطہ جدید علوم پڑھے، کیفی اعظمی اور ظ انصاری مذہبی مدرسوں سے نکل کر سیدھے اس نظریے کی آغوش میں پہنچے۔ جعفری طلب کی تکمیل کر کے اس منزل تک آئے۔ ظاہر ہے کہ جعفری اپنے ہم عصروں سے زیادہ باشعور تھے۔ وہ نیا ادب کے مدیر کی حیثیت سے ترقی پسند تحریک کے ہراول دستے میں پیش پیش تھے انتہا پسندی کے دور بھیونڈی کانفرنس تک وہ اس تحریک کے نظریہ ساز اور قائد رہے۔ آزادی اور تقسیم ملک نے سجاد ظہیر کو پاکستان بھیجا تو جعفری ہی ترقی پسند تحریک کے سب بڑے رہنما بن کر سامنے آئے اس دور میں مخدوم روپوشی کے زمانے میں زیرِ زمین تھے۔ ڈاکٹر علیم اور احتشام حسین یونیورسٹیوں میں استادی کے منصب پر مامور اپنی دستارِ فضیلت کی نگہداری کر رہے تھے اس لیے سردار جعفری کو وہ تمام ناگوار معرکے اور مجادلے کرنے پڑے جو اس وقت ترقی پسندی کے واجبات سمجھے جاتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب نئی نسل نے ترقی پسندی کی نظریاتی اور ادبی آمریت کے خلاف بغاوت کی تو جعفری ہی اس کا ہدف بنے آزادی اور ترقی پسند تحریک کی گرفت ادب پر کم ہونے کے ساتھ ایک نیا دور شروع ہوا اسی دور میں جعفری نے " ترقی پسند ادب " لکھی تھی جو انتہا پسندی کے اثرات سے معمور تھی اور بہت سے محاکمے انتہا پسندانہ اور نظریہ گزیدہ تھے۔ اس کے خلاف بھی ردِ عمل ہوا، مثلاً انہوں نے نیاز حیدر ایسے نعرہ باز شاعر کو کئی صفحات دیئے اور مخدوم ایسے سچے اور معتبر شاعر کا ذکر حاشیے میں کیا۔ جبکہ مخدوم کمیونسٹ نظام کے نفاذ کے لیے تلنگانے میں مسلح جدوجہد کے قائدین میں سے تھے غزل کے ضمن میں انہوں نے یگانہ کو یکسر نظر انداز کیا اسی زمانے میں انہوں نے جدوجہدِ آزادی کے دور کا ادبی انتخاب " آزادی کی منزلیں " کے نام سے شائع کیا تو نیاز حیدر، معاصر اور ایسے ہی کئی شاعروں کو اُن سے بہتر اور زیادہ باشعور شاعروں سے زیادہ نمائندگی دی۔ اس کا ردِ عمل فطری تھا اس کے بعد وہ " شکستِ خواب " کا دور آتا ہے۔ جس کی نمائندگی ان کی نظم " تشنگی " کرتی ہیں۔ اب جعفری کو خود یہ احساس ہوا کہ پرانے انقلابی اپنے خوابوں کو حکومت اور اقتدار کے ہاتھوں چند مراعات کے عوض بیچ رہے ہیں۔ ملک کی سیاست نہرو کے بعد موقع پرستی، مفاد پرستی اور اقتدار کوشی کے ہاتھوں رہن ہو چکی تھی۔ اسی زمانے میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ سردار نے " لہو پکارتا ہے " کے نام سے جو مجموعہ چھپوایا وہ ان لڑائیوں کی بے معنویت ABSURDITY

کے خلاف احتجاج ہونے کے ساتھ دونوں ملکوں کی مشترکہ تہذیب اور اقدار کا اشاریہ بھی تھا۔ خواب اور شکستِ خواب کا یہ سلسلہ سردار کی شاعری میں اُن کے ہر شعری مجموعے کے وسیلے سے تخلیقی اظہار کرتا رہا۔

سردار جعفری نے ایک طرح کی عمریں ہی نہیں گزاریں بلکہ ہر عمر میں مختلف سطحوں پر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ادب کے اچھے ناقد بھی ہیں۔ یہ مثال مقرر بھی ہیں۔ کلاسیکی ادب کے شارح بھی سیاسی رہنما بھی اور ادبی نظریہ ساز بھی۔ اسی طرح انھوں نے اپنی ہر عمر کی سطحوں پر بسر کی اور اس کا تخلیقی اظہار کیا اگرچہ کہ جدیدیت کا سب سے بڑا ہدف وہی رہے۔ لیکن جدیدیت کو " ترقی پسندی کی توسیع "، مجھ کو سب سے پہلے ان ہی نے قبول کیا۔ میں نے " ترقی پسند ادب " پر " صبا " میں تلخ و تند تبصرہ کیا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں حیدر آباد میں ترقی پسندی پر جو سیمینار ہوا اُس میں جعفری ہی تمام تنقیدوں کے ہدف تھے۔ لیکن ۱۹۶۶ء میں جب میرا مجموعہ " پتھروں کا مغنی " شائع ہوا تو انہوں نے مجھے " جدلیاتی شعور " کی سند مرحمت کرتے ہوئے میری تنقید اور شاعری کو سراہا۔ سجاد ظہیر نے بھی " نئے صبا " کے صفحات پر میری اور بحث ہوئی تھی جس کی گونج ہندوستان اور پاکستان کے ادبی رسائل میں برسوں باقی رہی میری شاعری کو صحیح معنوں میں انقلابی شاعری قرار دیا لیکن سجاد ظہیر اس نتیجے پر بعد از وقت پہنچے جب کہ سردار جعفری کا تخلیقی شعور جدید نسل کے ادبی رویے سے انہیں بہت پہلے خود بخود آگاہ کر چکا تھا۔ جعفری ان ترقی پسندوں میں سے ہیں جنہوں نے جدیدیت کو نئے دور کی تخلیقی حسیت اور اظہار کے طور پر ترقی پسندوں میں سب سے پہلے قبول کیا میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ وہ نظریے کی سطح پر ادعائیت پرست ہونے کے باوجود اپنے تخلیقی تجربے کی سطح پر اسی کرب سے گزرے تھے جو بعد کی نسل کا مقدر تھی اس شکستِ خواب DISILLUSIONMENT کا تجربہ اُن کی " ایک خواب اور " کی نظموں میں نمایاں ہے۔

شاعر کے ساتھ جعفری نظریہ ساز بھی ہیں۔ اور نقاد بھی۔ انہوں نے میرؔ اور غالبؔ کے دیوانوں کا انتخاب کرنے کے ساتھ اُن پر بسیط مقدمے بھی لکھے ہیں۔ جن کے لیے انہیں کلاسیکی روایت اور تصوف کے مسائل کی دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا اسی کے ساتھ انہوں نے کبیرؔ اور میرا بائی کا انتخاب بھی کیا۔ بظاہر یہ تحقیق و تدوین کے کام ہیں لیکن جعفری محض محقق نہیں اُن کی ناقدانہ نظر اور سیاسی سماجی شعور تحقیق میں بھی کار فرما نظر آتا ہیں۔ کٹر ترقی پسندی سے کلاسکیت کی طرف یہ مراجعت اُن کے ذہنی سفر کی ایک اور سمت ہے وہ عصرِ حاضر اور اس کے تقاضوں سے باخبر ہونے کے ساتھ کلاسیکی روایت کے بھی مزاج داں ہیں۔ اس طرح اُن کی نظم و نثر کے مطالعے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ایک عمر میں کئی عمریں گزارنے کے ساتھ ہر عمر کو کئی سطحوں پر بھی تخلیقی لحاظ سے برتا ہے۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعہ " پرواز " شائع ہوا تو مجنوں گورکھپوری نے انھیں جوش سے بہتر اور باشعور شاعر قرار دیا۔ مجھ ایسے ناپختہ ذہنوں پر اُس وقت یہ اثر ہوا کہ جعفری کی شاعری ہی عصری شاعری کی معراج ٹھہری۔ اُس وقت تقریباً پورا " پرواز " مجھے زبانی یاد تھا۔ حالانکہ " پرواز " میں جعفری کی شاعری جوش اور اقبال دونوں کے اثر میں اتنی زیادہ تھی کہ ان کا اپنا انفرادی لہجہ کہیں ابھر نہ سکا تھا۔ یہ ستم ظریفی ہے کہ جن حضرات نے اُردو میں آزاد نظم کی مخالفت کی اور اسے انحطاط پسند ذہن کا مظاہرہ قرار دیا اُن میں سردار جعفری اور سجاد ظہیر کے نام سرِ فہرست ہیں مخدوم پہلے ترقی پسند شاعر ہیں جنہوں نے پہلی آزاد نظم " استالین " لکھی اور لطیفہ یہ ہے کہ آزاد نظم میں جس شخص نے میرا جی اور ن۔م راشد سے

ہے کر اپنا منفرد رنگ مستحکم کیا۔ دوسرا مرحلہ تھے "پتھروں کی دیوار"، ان کا دوسرا شعری مجموعہ۔ جس میں انہوں نے آزاد نظم کو نئی م ایہوی سے روشناس کیا۔ اس کی نقل برسوں بعد تک ناپختہ ترقی پسند نظم نگار کرتے رہے۔ جعفری نے آزاد نظم کو نئے ابعاد DIMENSIONS سے روشناس کیا۔ حیرت یہ ہے کہ اُن کے بعد کے مجموعے "ایک خواب اور" میں ایک بھی آزاد نظم نہیں ہے جبکہ میرے نزدیک جعفری کا یہی کارنامہ تھا جو انہیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتا تھا۔ لیکن مجھے اس وقت "ایک خواب اور" یا "پیراہن شرر" کے ہیئتی تجربوں سے بحث مقصود نہیں۔

سردار جعفری نے "پرواز" سے "نئی دنیا کو سلام"، "جمہور"، "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "ایک خواب اور"، "پیراہن شرر" اور آج تک کی شاعری میں جو سفر طے کیا وہ ایک عمر میں کئی عمریں گزارنے کے ساتھ ہر عمر میں کئی زندگیاں گزارنے سے بھی عبارت ہے۔

جعفری کے ذہن کی تشکیل میں شیعیت، مارکسزم، انقلابی رومانیت اور عصریت کے ساتھ اور بھی بہت سے عوامل کارفرما رہے ہیں۔ اردو میں یہ تعصب عام ہے۔ کہ شاعر یا نثر نگار دو مختلف قبیل کے افراد مانے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس تعصب کی بنیاد لاعلمی پر ہے۔ میر اردو کے سب سے بڑے شاعر پہلے تنقید نگار بھی ہیں۔ اور خود نوشت سوانح نگار بھی۔ غالب جتنے بڑے شاعر ہیں اتنے ہی بڑے نثر نگار بھی (خطوط) حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد نئی شاعری ہی کے نہیں بلکہ جدید نثر کے بھی بانی ہیں۔ یہ تو خدا بھلا کرے تلمیذ الرحمان شعرا کا کہ جو داغ اور امیر اور اُن کے بعد اُن سے زیادہ ناخواندہ شعرا کے اثر سے شعر اور علم کو دو متضاد چیزیں سمجھتے رہے جس کا نتیجہ مشاعرہ بازی، ترنم ریز شاعری تک یہ ہوا کہ شعرا اُمیتوں کا فرفر بن کر رہ گئے۔ ناقدوں کے خلاف جوش سے لیکر جذبی تک تمام شعرا کے ردِ عمل اسی احساسِ کمتری کا نتیجہ ہیں۔ سردار جعفری اُن شعرا میں سے ہیں جنہوں نے شاعر کو نقاد کا منصب بھی دیا اور اسے علمی حلقوں میں معتبر بنایا۔ جعفری اپنے دور کے بیشتر نقادوں سے زیادہ پڑھے لکھے تھے جس کا ثبوت اُن کی تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کے ساتھ اُن کے مطالعات ہیں جو عہدِ وسطیٰ کے شعرا کا جامع و بسیط تجزیہ محاکمہ ہیں۔ اس طرح انہوں نے علم اور تنقید کے میدان میں خالص شاعروں کا اعتبار قائم کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔

ہندوستان میں گزشتہ تیس چالیس سال کا زمانہ بڑی اتھل پتھل اور افراتفری کا زمانہ رہا ہے اگر اس دور میں کسی نے اپنی فکری عصمت کو بچائے رکھا اور اسے راسخ العقیدگی کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ تو وہ لائق تحسین ہے۔ جعفری نے ہر دور کے مسائل کو اپنی راسخ العقیدہ ترقی پسندی کے باوجود تخلیقی تجربے اور اظہار سے محروم نہیں رکھا۔ یہی ان کی بڑائی ہے اور اسی میں اُن کی عصری معنویت کا راز مضمر ہے جعفری کی شاعری کا ارتقاء اُفقی جہت میں نہیں ہوا بلکہ ارتفاعی سمت میں بھی ہوا ہے۔ اُردو میں غزل اور نظم کی بیشتر شاعری افقی سمت میں پھیلتی رہی ہے۔ جوش اس کی بدترین یا بہترین مثال ہیں۔ جعفری نے شعور کی سطح پر اُردو شاعری کو دنیا کی بہترین فکری شاعری کی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کس حد تک کامیاب یا ناکام ہوئے یہ الگ بحث ہے لیکن اُن کے اس کارنامے سے انکار کفرانِ حقیقت ہے۔ وہ نظم اور نثر دونوں میں ہمارے عہد کے ممتاز ترین نمائندگان میں سے ہیں اور یہی ان کی اہمیت اور عصری وقعت کا راز ہے۔ جعفری کے بغیر نہ ترقی پسند تحریک کے نشیب و فراز کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اور نہ بعد کی جدیدیت کے انحرافات کو۔ وہ ترقی پسندی اور

جدیدیت کے درمیان پل بنے ہوئے ہیں "پرواز" کے بعد سردار جعفری کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے اُن کی تاریخی ترتیب یہ ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" (۱۹۴۸ء) "خون کی لکیر" (۱۹۴۹ء)، امن کا ستارہ" (جولائی ۱۹۵۰ء) "ایشیا جاگ اٹھا" (اکتوبر ۱۹۵۰ء) "پتھر کی دیوار" (۱۹۵۳ء) "ایک خواب اور" (۱۹۶۵ء) "پیراہن شرر" (۱۹۶۶ء تک کی نظمیں) "لہو پکارتا ہے" (۱۹۷۸ء)۔ اِن مجموعوں کے بعد بھی اُن کی شاعری کا سلسلہ جاری ہے اس وقت وہ اپنی منظوم خود نوشت لکھ رہے ہیں۔ جو طویل نظم میں ایک منفرد تجربہ ہے۔ اُن کا تخلیقی جوہر اَب بھی آبدار ہے اور اُن کا ذہن جوان و بالیدہ۔ "پرواز" سے خود نوشت تک اُن کی شاعری کئی مرحلوں سے گزری اور کئی موڑوں سے دوچار ہوئی۔ اسی لیے اُن کے یہاں کئی اسالیب ملتے ہیں۔

سردار جعفری کے معاصرین میں بیشتر یک اسلوبی شاعر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو یا تین اسلوب مل جائیں گے جیسے اختر الایمان کہ اُن کی شاعری میں دو سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ سردار جعفری کے یہاں اس سے بھی زیادہ اسالیب ہیں۔ اُن کے معاصر ترقی پسندوں نے طویل نظمیں لکھیں جیسے اختر الایمان (تاریک سیارہ) ساحر (پرچھائیاں، کیفی (مثنوی) جاں نثار اختر (آخر شب کی ایک نظم جو بچی کے نام ہے۔) فیض، مخدوم، مجاز، جذبی کسی نے طویل نظم نہیں لکھی۔ فیض نے چند برس قبل "شہید کربلا" کا ایک مرثیہ شروع کیا مگر شاید غالب کی طرح یہ سوچ کر کہ مرثیہ انیس اور دبیر کا حق تھا اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا۔ طویل نظم کا معاملہ مختصر نظموں اور غزلوں سے بہت مختلف ہے۔ غزل کے مقابلے میں نظم ـــــ خواہ وہ مختصر ہو یا طویل مختصر زیادہ فکری ارتکاز اور تسلسل چاہتی ہے غزل میں جہاں ہماری شعری روایت کا عطر ملتا ہے وہیں اس روایت نے ادھ یا اس سے بھی نچلے درجے کے شعر گویوں کی پریشاں خیالی اور ژولیدہ بیانی کو فروغ بھی دیا۔ اسی روایت کا نتیجہ ہے۔ کہ آج بھی ہمارے بیشتر جدید اور جدید تر شعراء غزل کے مزاج میں ڈھلی ہوئی مختصر نظمیں لکھ رہے ہیں یا محض غزل کی غیر مربوط اکائیوں کو قافیہ اور ردیف کے سلک میں پروتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اُردو کے جدید ذہن اور شعری اظہار کی تنگ دامنی کا ثبوت ہے جو کوئی نیک فال نہیں۔ میر سے پہلے دکنی شعراء نے طویل مثنویاں لکھیں۔ خود میر نے مثنویات اور شکار نامے نظم کیے مثنوی کی روایت میر حسن، اثر، دیا شنکر نسیم اور مرزا شوق تک برابر ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ قصیدہ بھی ایک طرح سے نسبتاً طویل نظم کے ذیل میں آتا ہے۔ سودا سے غالب تک مثنوی اور قصیدے کا سلسلہ جاری رہا۔ حالی نے مسدس مدوجزر اسلام، لکھ کر انیس اور دبیر اور دوسرے مرثیہ گویوں کی روایت کو ایک نئے اسلوب نئی زبان اور نئے موضوع سے روشناس کیا۔ شاد عظیم آبادی نے مرثیے لکھے، اقبال کی طویل نظمیں مثنوی کے انداز میں یا اس سے ہٹ کر فارسی میں ہیں (اسرار خودی) رموز بیخودی، جاوید نامہ، لیکن اُردو میں بھی اُن کی چند نظمیں جیسے مسجد قرطبہ ساقی نامہ، یا ذوق و شوق بہت طویل نہ ہوتے ہوئے بھی طویل نظموں کی تعمیری ساخت رکھتی ہیں۔ جوش نے بیشتر طویل نظمیں مسدس کی ہیئت میں لکھی ہیں جن میں ان کے مراثی بھی شامل ہے۔ اُن کی سب سے طویل نظم "حرف آخر" جو نامکمل رہ گئی تھی۔ لیکن سنا ہے کہ اب مکمل صورت میں ان کی موت کے بعد شائع ہونے والی ہے) مسدس کے فارم میں نہیں۔ بعد کے شاعروں نے طویل نظم سے نہ جانے کیوں ہاتھ اٹھا لیا۔ جدید شاعری کو سردار جعفری ہی نے پہلی بار طویل نظم سے روشناس کیا "نئی دنیا کو سلام" اُن کی سب سے طویل نظم ہے اور اُن کا یہ دعویٰ غلط نہیں کہ "و

اُردو زبان میں اس طرح کی کوئی چیز اب تک نہیں لکھی گئی"

نئی دنیا کو سلام پیش کرتے ہوئے سردار جعفری کو جھجک ہو رہی تھی جس کی وجہ نظم کا نیا پن تھا۔ موضوع بھی

اور ٹیکنک بھی نئی۔ یہی نہیں زندگی کے متعلق زاویۂ نگاہ بھی دوسرے شعرا سے مختلف ہے۔ ا　　　خود انہوں نے ۔ تمثیلی نظم کہا تھا اور اس کے کرداروں کو علامتیں قرار دیا تھا۔ کہانی پلاٹ نہیں بلکہ مبہم سا خاکہ ہے"۔ اس وقت تک اُردو نظم علامتی شاعری سے آگاہ نہیں تھی اس لیے انہیں اشاروں اور کنایوں کی جگہ تفصیلات سے کام لینا پڑا۔ جعفری اس بات کو پیش لفظ میں بطورِ عذر پیش کرتے ہیں۔ لیکن تفصیل نگاری ان کا مزاج بھی ہے۔ اور طویل نظم کا تقاضا بھی تھا۔ اشاروں کنایوں اور علامتوں کی زبان میں انہوں نے "پتھر کی دیوار" اور بعد کی نظموں میں بات کی ہے۔ طویل نظم ایک عظیم الشان عمارت بلکہ قلعہ کی سی تعمیری پلاننگ اور اس کے ساتھ بڑے آرکیٹکٹ کی تعمیری خلاقیت کا مطالبہ کرتی ہے۔ سردار جعفری کے معاصرین میں ہو سکتا ہے کہ بعض کے یہاں شعریت زیادہ ہو لیکن کسی کے پاس یہ تعمیری خلاقیت نہیں تھی جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ کسی اور شاعر کا مطالعہ و مشاہدہ اتنا وسیع نہ تھا۔ جعفری کے بعض معاصرین کو میں نے یہ کہتے سنا ہے۔ کہ وہ نثار، خطیب یا ناظم ہیں لیکن یہ محض تعصب ہے یا خود ان شاعروں کی اپنی شاعرانہ تعمیری صلاحیت کے فقدان کا احساس! اقبال کو بھی اُن کے معاصر غزل گو ناظم کہتے رہے، اور جوش کو بھی۔ دراصل ہماری شاعری کے مزاج کو غزل کی مقبولیت نے بگاڑا ہی نہیں بلکہ شعریت کے تصور کو بھی حد سے زیادہ محدود کر دیا "غلط یہ لفظ' وہ بندش بری، یہ مضمون سست"، انہیں کو بھی اپنے ہم عصروں سے یہ شکایت تھی کہ اس کے علاوہ وہ کوئی ہنر ہی نہیں جانتے۔ دراصل غزل کے زوال آمادہ مزاج نے اُسے اتنی تنگ کناری کا عادی بنا دیا کہ اُسی کے پیمانے سے نظم کو بھی جانچا جانے لگا۔ سودا اور میر کی غزلوں میں جو الفاظ ملتے ہیں اور جس جس طرح کے مختلف اسالیبِ اظہار نظر آتے ہیں وہ بعد کی انحطاط زدہ غزل میں شجرِ ممنوع قرار دیئے گئے خود غالب کی زبان اور اسلوب اس روایت ناآشنا اور ذہن بستہ اظہار بستہ (INHIBITED) ذوقِ شعر کے لیے ناقابلِ قبول تھے۔ اس شعری مذاق کے ماحول میں "نئی دنیا کو سلام" ایک نیا تجربہ ہی نہیں بلکہ شاعری کا ایک نیا اسلوب اور نیا لہجہ اور موضوع کو برتنے کا ایک نیا سلیقہ لے کر سامنے آئی جعفری خود کہتے ہیں کہ اس نظم کے مرکزی کردار جاوید اور مریم جدوجہد کی علامتیں ہیں۔ فرنگی ظلم کی علامت ہے ملیر کا روایتی کردار بدلا ہوا ہے۔ اس نظم کے دوسرے کردار گوشت پوست کے مرئی کردار نہیں بلکہ ایسے کردار ہیں جن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مابعد الطبیعات اور فلسفۂ تاریخ و تصورِ زماں و مکاں کا علم ایک حد تک ضروری ہے۔ اس طرح سے جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" میں فلسفیانہ تصورات کو زندگی کے ڈرامے کے کردار بنا کر شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ اقبال کی کئی نظموں میں وقت ایک اہم کردار ہے۔ لیکن اُن میں ڈرامائی کشمکش نہیں ہے اس ذیل میں اقبال کی "مسجد قرطبہ" اور "ساقی نامہ" وقت کے متحرک، فعال اور تخلیقی کردار کی نمائندگی کی بہترین مثالیں ہیں۔ جعفری کی نظم کا مزاج بالواسطہ طور پر اقبال سے متاثر سہی لیکن ان کی نظم میں وقت، زندگی، تاریخ اور موت جیتے جاگتے، دکھ بھوگتے، سکھ پاتے گوشت پوست کے کردار بن جاتے ہیں۔ موت فانی کی غزل اور لکھنوی شعرا کی سینہ کوب و ماتم زدہ شاعری میں کبھی دلہن بنی نظر آتی ہے۔ اور کبھی کفن میں لپٹی ہوئی۔ وجودیت (EXISTENTIALISM) کے فلسفے نے موت کی حقیقت کا عرفان عام کیا۔ موت "نیستی" ہے۔ اس پر تحلیلی فلاسفہ (ANALYTICAL PHILOSOPHERS) کا اعتراض یہ ہے کہ نیست (NOTHING)، کے ساتھ "ہے" (BEING) کا استعمال خود متناقض (SELF CONTRADICTORY) ہے لیکن موت بہر حال ایک حقیقت ہے۔ وہ نفی ([illegible]) ہوتے ہوئے بھی موجود ہے "غالب نے کہا تھا کہ

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا　　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

یہ شعر غالب کے وجودیتی (EXISTENTIALIST) عرفان کا ثبوت ہے۔ موت زندگی کا فطری خاتمہ ہے مذہب کہتا ہے کہ اس کے بعد نئی زندگی ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
(میر)

مذہب سے منکر وجودیتی مفکرین بقائے روح اور حشر کے قائل نہیں لیکن وہ بھی موت کو انسانی وجود کے خود سے ماورا ہونے کا اشاریہ سمجھتے ہیں (EK-ZISTENCE) جرمن لفظ کے معنی ہیں: (TO STAND OUT) یعنی اپنے وجود سے ماورا ہونا۔ اس طرح سے یاسپرز (JASPERS) جو مذہبی ہے۔ وجود کی ماورائیت کے ساتھ حیاتِ بعدِ ممات کا اثبات کرتا ہے۔ مگر یہ اثبات قبل ممات انسانی وجود کی ماورائیت پر زیادہ زور دیتا ہے۔ سارتر مذہب کا منکر ہے۔ مگر انسانی وجود کی ماورائیت کو آزادی سے لاینفک طور پر مربوط سمجھتا اور اس طرح سے اس کے لامحدود امکانات کو تسلیم کرتا ہے۔ جو ہے نہ ہوگا، جو نہیں ہے۔ وہ ہوگا اس طرح سے موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ انسانی انتخاب (CHOICE) و اختیار کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" میں جب موت کو کردار بنایا تو جہاں اُن کا مارکس سے مستفاد جدلیاتی شعورِ حیات و مرگ کے باہمی تضاد کو پیش کر رہا تھا۔ وہیں ان کی ترکیب (SYNTHESIS) سے نا آفریدہ کائنات کے میلاد کا بھی رجز پڑھ رہا ہے۔ انہوں نے خود اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے۔ کہ "سب سے زیادہ اہم کردار وہ بچہ ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ابھی اس کے نقش و نگار بن رہے ہیں۔ وہ نئی دنیا کی علامت ہے اس کی حسین اور معصوم روح پوری نظم پر حاوی ہے"۔ وہ انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں اُس کا ماضی بڑا شاندار ہے اور حال دلکش امکانات سے معمور اُن کا یہ ایمان مارکسزم ہی کی دین نہیں بلکہ اُن کے اُس اسلامی مذہبی شعور کا بھی عکاس ہے۔ جو کربلا کی شہادتوں میں نئی زندگی کی فتح کا مژدہ سنتا آیا تھا۔ اگر ان کے یہاں محض مارکسی مادیت ہوتی تو اثر لکھنوی ایسے روایت پسند اور مذہب شناس شاعر اُن کی طویل تمثیل اور مثنوی "جمہور"، پر اتنا اچھا تبصرہ نہ کرتے کہ اسے سردار جعفری "نئی دنیا کو سلام" کے دیباچے کے طور پر نئے ایڈیشن میں شامل کرتے۔

اثر نے اس نظم کو فنکارانہ انفرادیت کا شاہکار مانا ہے۔ اور دوسرے ترقی پسند شاعروں کو اس سے بیگانہ جانا ہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے ابہام زدہ اور مہملیت گزیدہ نئی شاعری کے مقابلے میں نظم کی صراحت اور تشریح کو سراہا ہے انہوں نے اس نظم کے حرفِ اول سے کہ چھ تصویروں اور حرفِ آخر تک ہیئت میں جو دلکشی، موسیقیت اور منطقی تسلسل ہے۔ اس کی داد دی۔ انہوں نے پابند حصوں کو جعفری کی عروض سے واقفیت اور زبان پر قدرت کا ثبوت سمجھا ہے۔ جعفری نے اس نظم میں نظم آزاد، مثنوی اور دوسرے کئی قدیم شعری ہیئتوں کو برتا ہے۔ اثر کے نزدیک مختلف ہیئتوں کا استعمال، بحر کا انتخاب مصرعوں کی ترتیب، ارکان کی کمی بیشی یہ سب جعفری صاحب کے شاعرانہ احساس کی ترجمان ہیں۔ اس کو راگ کی سرگم یا دھرپد کہنا چاہیے" چوتھی تصویر کو انہوں نے موسیقی کا ٹھپا کہا ہے۔ پانچویں تصویر کے قطعات اُن کے نزدیک گٹکری کہ

حیثیت رکھتی ہیں۔ اور قوافی میں کہیں بلیت سے ہے۔ کہیں وحدت ہے، کہیں مدغم، کہیں پنجم چھوٹی تصویر پھر مثنوی کے طرز میں ہے۔ بحروں اور ہیئتوں کے اس تنوع کو اثر نے ایک خاص مقصد کا تابع قرار دیا اور انہیں اس تنوع میں مجانست نظر آتی ہے۔ آخر میں انہوں نے بعض فنی، عروضی اور لسانی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مگر ان کے نزدیک ان تسامحات سے نظم کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ نظم کی خوبی کو دلیلوں سے واضح کرنے کے لیے اقتباسات دیتے ہیں مگر انہیں یہ احساس ہے کہ اس طرح نظم کا بڑا حصہ نقل کرنا پڑے گا۔ ان کے نقل کئے ہوئے چند اجزا حسب ذیل ہے۔

پہلی محبت پاک اور معصوم محبت سے

نوازش پائی جاتی ہے میری نظر سے   حجاب اور گل کو نسیم سحر سے

غروب آفتاب کی تصویر:

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا   فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
افق پر کرن جال سا بن رہی تھی   ڈوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی

ماں بننے سے پہلے عورت کے جذبات کی مصوری اور نفسیات سے

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے   مرا سانس میں دل دھڑکتا ہے جیسے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ   رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
نگاہوں میں نشہ سا چھلنے لگا ہے   ہر اک چیز پر پیار آنے لگا ہے

منظر نگاری کا ایک مرقع:

ہوائیں مشکبار ہیں فضائیں زرنگار ہیں   افق کے کوہسار میں شفق کے آبشار ہیں
نجوم شاخ کہکشاں فلک کے برگ و بار ہیں   یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے
ہزاروں قوتیں مچل رہی ہیں جوئے بار میں   ہزاروں جلوے مسکرا رہے ہیں اک شرار میں
ازل سے بیقرار ہیں کسی کے انتظار میں   یہ آب و خاک و باد کا جہاں بہت حسین ہے
اگر کوئی بہشت ہے تو بس یہی زمین ہے

نیند کی نقاشی:

نیند ہے اک حسینہ / سرمئی آنکھوں میں / نیلگوں اس کا سینہ / اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں / وہ غریبوں کی غم خوار، دکھیوں کی دل دار ہے۔ / اور فرق مراتب سے بیزار ہے۔ / رات کو آتی ہے / تھپکیاں دے کے سارے جہان کو سلا جاتی ہے۔ / بچوں کو لوریاں دیتی ہے / پھولوں کو پیار کرتی ہے۔ اور سارے عالم پر جادو بھری انگلیوں سے چھڑکتی ہے۔ شبنم / اس طرح بزم کی فطرت کی ہر چیز کو / ایک نئی زندگی بخشتی ہے۔ / ایک نئی تازگی بخشتی ہے۔

اثر نے بطور خاص نظم کی ابتدا اور انتہا کو سراہا ہے۔ حرف اول سیاہ رنگ کے مختلف تلازمات اور لفظ "سیاہ" کی تکرار سے تاریکی اور سیاہی کی فضا کو اجاگر کرتا ہے۔ حرف آخر روشنی امید ارتقا اور انقلاب کی شعاعوں سے پورے منظر کو

کو ایک منور نقطۂ انتہا تک پہنچاتا ہے۔ ؎

یہ آدمی کی گزرگاہ شاہراہِ حیات ... ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
اٹھو اور راٹھ کے انھیں قافلوں میں مل جاؤ ... جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے

یہ نظم جعفری کی طویل نظم نگاری کی تمہید ہی نہیں، اس صنف پر اُن کی قدرت کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اُن کی تقلید میں لکھی ہوئی بعض عربی ترقی پسند نظمیں جیسے معصوم رضا راہی کی "۱۸۵۷ء" بلکہ بعد میں جدید شاعری میں طویل نظم کے فروغ کی نمائندہ نظمیں (عمیق حنفی) بھی اس کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ عمیق نے بھی اپنی نظموں سندباد اور صلصلۃ الجرس وغیرہ میں یہی تکنیک اپنائی ہے۔ سردار جعفری کی دوسری طویل نظمیں جو نئی دنیا کو سلام کے فوراً بعد لکھی گئیں۔ اس نظم کے معیار کو نہیں پہنچیں۔ "امن کا ستارہ" دراصل تین نظموں کا مجموعہ ہے۔ سوویت یونین اور جنگ باز، یہ مختصر تمہیدی نظم ہے۔ اس داستان کتھا اور ڈھولک پر گانے کے بیے اُردو شاعری کے مروجہ ڈکشن اور محاورے انحراف ہے جس میں انہوں نے نغزل خود بازاری محاورے اور الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن وہ جانتے ہیں کہ عوام ہی نہیں بلکہ شعرائے متقدمین نے گالیوں سے بھی شعری اظہار کا کام لیا۔ سردار نے اس کے ساتھ دیہاتی بولی میں ہندی اور اُردو کی ادبی زبان کی آمیزش کردی۔ کہیں کہیں لفظوں کا تلفظ بھی عوام کی زبان کے مطابق کیا ہے۔ مثلاً کرفانوں بدماشوں وغیرہ اس نظم کا فکری سرمایہ استالن کے زمانے کے مارکسی انقلاب اور اس کی فکر کا مرہون اور اسی لیے محدود رہے۔ لیکن بحر اس طرح سردار نے ساڑھے سات ارکان کی بحر میں کہیں کہیں انحراف کر کے فنی اصول کو توڑا ہے وہ ایک وقیع تجربہ ہے۔ اس سلسلے کی تیسری نظم "امن کا ستارہ" ہے جسے سردار نے خود ایک شاعرانہ تقریر کہہ کر اُن کی اپنی شاعری پر خطابت کا الزام لگانے والوں کا منہ بند کر دیا ہے۔ لیکن یہ نظم محض تقریر نہیں۔ اس میں نئے تمثیلات اور شعری پیکروں کی اتنی خوبصورت مثالیں ہیں جو ان کی بعد کی شاعری خصوصاً پتھر کی دیوار کے نظموں کے ابتدائی نقوش نظر آتی ہیں۔

سردار جعفری کی تیسری طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا ہے" اس نظم کی ابتدا اور خاتمہ نظم پابند میں ہے۔ بیچ بیچ میں بھی کہیں کہیں قافیہ اور ردیف کی پابندیاں ہیں۔ لیکن بڑا حصہ آزاد ہے۔ آزاد نظم کا وہ لہجہ جو انہوں نے "نئی دنیا کو سلام" میں دریافت کیا تھا یہاں کچھ اور نکھر گیا اس کا آہنگ رجزیہ ہے۔

یہ ایشیا کی زمین تمدن کی کوکھ، تہذیب کا وطن ہے۔
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں پہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب الٹی
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سُنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کو سماتا کا سبق پڑھایا
یہیں سے مزدک نے عدل و انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں۔
ہمارا سورج محمد مصطفےٰ کے سر پر چمک چکا ہے۔
اور اب ہمارے قدیم آکاش کے ستارے

قدیم آنکھوں سے ماؤ کی سرخ فوج کی شان دیکھتے ہیں۔ ؎۱

اس نظم میں جعفری نے نئی تشبیہیں استعارے اور امیجری استعمال کی ہے:

عوام مرتے نہیں ہیں سو جاتے ہیں زمیں کی سنہری مٹی میں منہ چھپا کر۔ وہ اپنی ماں کی سنہری چھاتی سے سر لگا کر بہار کے خواب دیکھتے ہیں

زمین پیاسی تھی، قحط، کھیت سے بھوک اُگ رہی تھی

زبان ٹوٹی تھی، انگلیاں سُن تھیں، سانس بے کیف و بے ترنم

ستار کے تار ہچکیوں میں الجھ گئے تھے۔

ہری بھری کھیتیوں میں شیشے کی چوڑیاں کھنکھنا رہی ہیں

اُداس صحرا بہیروں کی طرح خاموش اور گمبھیر

کھجور کے پیڑ بال کھولے

"امن کا ستارہ" اور "ایشیا جاگ اٹھا" دراصل "پتھر کی دیوار" ہی میں شامل ہونے والی تھیں۔ ان نظموں اور "پتھر کی دیوار" کی نظموں میں جعفری نے جو اجتہاد کیا ہے اُس کے سلسلے میں اُن کے "حرفِ اول" سے چند اقتباسات پیش کرنا ضروری ہیں۔

"میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف قسم اور مختلف سطح کی شاعری کرتا ہوں۔ میری تمام تر کوشش یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کے لیے اپنی شاعری کو آسان بنا سکوں۔ اس کوشش میں میں اِن حدوں کو توڑ دینا چاہتا ہوں جو بول چال کی زبان اور "شاعرانہ" زبان کے بیچ میں حائل ہیں۔ جہاں میں اِن حدود کو نہیں توڑ پاتا اور بول چال کی زبان میں اپنا مطلب ادا کرنے سے قاصر رہتا ہوں وہاں "شاعرانہ" زبان بھی استعمال کر لیتا ہوں یہ دراصل بول چال کی زبان کا عجز نہیں بلکہ میری تربیت کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بول چال کی زبان ہی سب سے زیادہ شاعرانہ زبان ہے۔ لیکن جب کبھی بول چال کی زبان سے ہٹ کر "شاعرانہ" زبان بنائی جاتی ہے تو وہ مصنوعی ہوتی ہے۔"

"پرانی تشبیہیں اور استعارے، پرانی علامتیں ایک بہت بڑا خزانہ ضرور ہیں لیکن اس خزانے پر قناعت کر لینا نادانی ہے کبھی تو اِن کے استعمال سے بڑا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی وہ خیالات اور احساسات کو جکڑ بھی لیتے ہیں اور اصلیت پر پردہ ڈال دیتے ہیں کیونکہ زندگی کی نئی حقیقتیں نئے طریقِ اظہار اور اندازِ بیاں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس لیے میں بغیر کسی جھجک کے نئی تشبیہیں اور استعارے بھی استعمال کرتا ہوں اور نئی امیجری بھی میں نے اس اُصول کو بہت مفید پایا ہے کہ تشبیہہ اور استعارے اور امیجری موضوع کے ماحول سے حاصل کرنے چاہییں اس لیے آپ کو میرے یہاں ایسے مصرعے ملیں گے جیسے ؎

شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر

یا

پہرے داروں کی نگاہوں سے ٹپکتا ہے لہو

رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام

گولیاں کرتی ہیں سینے کی زبان سے باتیں

؎۱: پہلے اور دوسرے ایڈیشن کے بعد آخری مصرعہ کی شکل اب یہ ہے "قدیم آنکھوں سے ایشیا کی نئی جوانی کو دیکھتے ہیں"

یا

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں
جن کو سرمایہ کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے

یا

چاولوں کی صورت پر مفلسی برستی ہے"

زبان اور نئی امیجری کا یہ استعمال اُردو نظم میں منفرد ہے۔ یوں تو نظیرؔ نے بول چال کی زبان میں شاعری کی لیکن اُن کی اور بیسویں صدی کے صنعتی معاشرے کی بول چال میں بڑا فرق ہے۔ نظیرؔ کے الفاظ متروک ہو گئے اور اُن کی جگہ صنعت و حرفت تجارت و معیشت کی تبدیلی کے ساتھ انگریزی سے بہت سے الفاظ اُردو میں داخل ہوئے اور سیکڑوں نئے الفاظ نے جنم لیا۔ لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے جوان ہوتے، بوڑھے ہوتے اور مرتے ہیں۔ جب وہ جوان ہوتے ہیں تو اُن میں تخلیقی اظہار کی بھرپور توانائی ہوتی ہے۔ سردار جعفری نے نئے لفظوں کی اسی توانائی سے اپنی نظموں میں کام لیا ہے۔

اُردو نظم اقبالؔ اور جوشؔ کے ساتھ جوان ہو چکی تھی جہاں تک مجموعی فن کارانہ مفکرانہ اور جذبات کی اعلیٰ سطح کو چھونے کا سوال ہے۔ اقبالؔ بلاشبہ اُردو کے سب سے بڑے نظم گو ہیں لیکن جہاں تک جدید نظم کی تکنیک اور تعمیر کا سوال ہے اُن کی نظمیں مکمل نہیں ہیں۔ "مسجد قرطبہ" ہو یا "ذوق و شوق" ان میں کہیں کہیں تعمیری جھول نظر آتا ہے۔ اقبالؔ کی بیشتر نظموں کے اشعار غزل کے شعروں کی طرح علیحدہ حیثیت بھی رکھتے ہیں ان نظموں میں سے کہیں کہیں تو اگر پورا بند بھی نکال دیا جائے تو مرکزی خیال کے تسلسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح بندوں میں سے اشعار خارج کر دیئے جائیں تب بھی مرکزی خیال اپنی جگہ باقی رہے گا۔ جوشؔ کی نظمیں اس معیار سے اور بھی کمزور ہیں۔ اس لیے کہ ان میں افقی پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔ وہ اوپر کی طرف کم ہی اُٹھتی ہیں جوشؔ انیسؔ کی طرح ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے تو باندھتے ہیں مگر انیسؔ کے برابر تعمیری صلاحیت نہیں رکھتے۔ انیسؔ کے مرثیہ کا ہر جزو دوسرے جزو کے لئے زینے کا کام کرتا ہے اور منظر نگاری دراصل پس منظر بن جاتی ہے کرداروں کے عمل اور جذبات کا۔ جوشؔ کے یہاں منظر بذاتِ خود موضوع بن جاتا ہے۔ اُن کی نظمیں ایڈیٹنگ اور قطع برید کی محتاج ہیں۔ ترقی پسند شاعروں اور ان کے معاصرین جدید نظم گویوں نے اُردو شاعری کو جدید نظم کی تکنیک سے پہلی بار روشناس کیا۔

مجازؔ، جذبیؔ، مخدومؔ، سردار جعفری کیفیؔ اعظمی، حتیٰ کہ راشدؔ اور فیضؔ تک کی ابتدائی نظمیں جوشؔ اور اخترؔ شیرانی کی تکنیک میں ہیں اور اتنی ہی ڈھیلی ڈھالی۔ اس دور کی سب سے مقبول نظم "آوارہ" آج نظم کے معیار پر تکنیک کے لحاظ سے پوری نہیں اترتی کوئی بند نکال دیجیے۔ تاثر میں کمی نہ ہوگی۔ بلکہ شاید تاثر بڑھ ہی جائے۔ مخدومؔ نے سب سے پہلے ترقی پسندوں میں آزاد نظم لکھی راشدؔ، میراجیؔ، تصدق حسین خالدؔ، مختار صدیقی، یوسف ظفرؔ اور قیوم نظرؔ وغیرہ پہلے سے آزاد نظم لکھ رہے تھے۔

سردار جعفری نے دونوں طرح کی شاعری کی پابند بھی اور آزاد بھی وہ کسی ایک ہیئت کے اسیر نہیں ہو سکے لیکن وہ پابند اور آزاد نظم کے فرق کو بخوبی سمجھتے تھے اُن سے پہلے کسی اور شاعر یا نقاد میں نظم کی مزاج شناسی کا یہ شعور نہ تھا

"...... پابند نظم میں زیادہ تر مصرعوں اور شعروں کی تعمیر پر زور دیا جاتا ہے۔ لیکن میں اس کے برعکس آزاد نظم میں بندوں کی تعمیر ہی کو انفرادی مصرعوں کی تعمیر سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں چونکہ آزاد نظم میں ردیف اور قافیوں کی جھنکار نہیں ہوتی اس لیے اس میں داخلی ترنم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ ترنم خارجی بھی ہوتا ہے۔ اور داخلی بھی اس لیے انتخاب الفاظ کے علاوہ مصرعوں کے باہمی ربط سے بھی پیدا ہوتا ہے۔ بند اپنی جگہ معنوی تسلسل کا محتاج ہوتا ہے۔ (اس لیے ہر بند کو ایک مکمل تصویر ہونا چاہیے تاکہ مکمل نظم ایک بہت بڑی تصویر کی طرح ہو جیسے تمام چھوٹی چھوٹی تصویریں مل کر آتی ہوں) اس کے بغیر آزاد نظم کے مصرعے الگ الگ، ایک دوسرے کی طرف سے منہ پھیرے ہوئے ٹکڑے نظر آئیں گے)

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ آزاد نظم ردیف، قافیہ، بحر اور ترنم سے عاری نہیں ہوتی وہ حسب ضرورت قافیوں کا بھی استعمال کرتے ہیں اور ردیف کا بھی:

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موج پایاب کا ساحل ہے یہی
تم نے فردوس کے بدلے میں جہنم لے کر
کہہ دیا ہم سے گلستاں میں بہار آئی ہے
چند سکوں کے عوض چند ملوں کی خاطر
تم نے ناموس شہیدان وطن بیچ دیا
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

(فریب)

قافیہ اور ردیف کی اس جھنکار سے آزاد نظم میں کئی شاعروں نے کام لیا ہے جن میں خصوصیت سے قابل ذکر ن۔ م۔ راشد، فیض اور منیب الرحمان ہیں۔ بعد کی جدید نظم نے زیادہ کھردرا لہجہ اختیار کیا اور شعوری طور پر قافیہ ردیف سے آزاد نظم کو آزاد کر دیا۔ حالانکہ اختر الایمان نے جن کا لہجہ کھردرا اور جن کے مصرعوں کی ساخت غزل کے مصرعوں سے یکسر مختلف ہوتی ہے اپنی آزاد نظموں میں اکثر قافیہ ردیف سے موسیقیت پیدا کر کے لہجے کے کھردرے پن کی تلافی کی ہے۔ آزادی کے بعد کے شعرا میں جنہوں نے ترک قافیہ ردیف کے جھلاوے کو رد کیا میرا نام شاید سب سے پہلے آئے گا۔ ایک جگہ سردار جعفری نے لکھا ہے کہ شاعری تو نثر بھی ہو سکتی اور دوسری زبانوں میں ہو رہی ہے۔ لیکن نظم کے تاثر کے لیے قافیہ اور ردیف کبھی کبھی بڑا کام کرتے ہیں۔

سردار جعفری کے یہاں جو بلند آہنگی ہے۔ اس کا جواز اس بیان میں ملتا ہے۔ "چونکہ میں شاعری کو بنیادی طور پر گانے یا بلند آواز سے پڑھ کر سنانے کی چیز سمجھتا ہوں اور اس سے شعور کو بیدار کرنے اور جذبات کو ابھارنے کا کام لینا چاہتا ہوں اس لیے میں نے اپنی آزاد نظموں میں بھی یہ کوشش کی ہے۔ کہ وہ محض کاغذ پر پڑھنے کی چیز بن کر نہ رہ جائیں۔ .... مجھ سے پہلے مخدوم نے اپنی نظم "اندھیرا" اور استالن کی آواز" کے ذریعے سے یہ کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔" حلقہ ارباب ذوق کے نظم گویوں کی آزاد شاعری کاغذ کی چیز تھی جبکہ سردار جعفری نے اسے قبولیت عام کی سند دلوائی۔ پتھر کی دیوار کی آزاد اور پابند دونوں طرح کی نظمیں لفظیات لہجے اور آہنگ کے لحاظ سے اردو شاعری میں ایک نئے اسلوب کی بنا ڈالتی ہیں۔ پہلی ہی نظم

پتھر کی دیوار، اس کا دیباچہ ہے۔

درد و غم کے پہروں میں
آنسوؤں کا زنجیریں
بے بسی کا قفل ہیں
حسرتوں کی تعزیریں
رسیوں کا کانٹوں ہیں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں ہیں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھر کی تکرار سے جس طرح فضا آفرینی کی گئی ہے اس کے لیے یہ بند دیکھیے۔

پتھروں کی دیواریں
پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں

زنداں کے ایک قیدی کو جو پتھروں کے حصار میں رہتا ہے۔ ساری دنیا پتھر نظر آتی ہیں۔ یہ پتھر ظلم و جبر اور استحصال کی علامت ہیں یہاں موت ہر وقت اسلحوں کی شکل میں نظر کے سامنے ہے۔ اس کی ایک تصویر دیکھیے

اور اک دم سے پھاٹک کھلا
سائرن بج اٹھا
اونچے مینار پر خطرے کے جھنڈے نے انگڑائی لی

موت داخل ہوئی

میں نے دیکھا

اور ہم سب نے دیکھا

موت کے بیسوں سر تھے اور سیکڑوں ہاتھ تھے

لاٹھیوں کی طرح

رائفل کی طرح

انگلیاں لمبی لمبی تھیں، ناخون سنگینوں کے

جسم خاکی تھا،

چہرہ گلابی تھا،

بارود کی سانس تھی

پاؤں چمڑے کے جوتوں میں

لوہے کی کیلوں

پتھر کی راہوں پہ بجتے ہوئے

لیکن شاعر کو موت سے ملنے کی فرصت نہیں وہ زندگی اور اُس کے خوبصورت مظاہر سے لطف لینا اور محبت کرنا بھی جانتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ زندگی کے بھیانک اور مکروہ پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتا۔

"بمبئی"، اور دکن کی شہزادی میں بمبئی اپنے تمام حسن اور قبح کے ساتھ سامنے آتی ہے "اودھ کی خاکِ حسین" اس مجموعے ہی کی نہیں سردار جعفری کی بہترین نظموں میں سے ہے۔

میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں جیسے مجھ کو

اودھ کی مٹی بلا رہی ہے۔

حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں

فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں

نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لیکر

گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی

گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر

خلیج بنگال اور بحرِ عرب کے موتی پرو رہی ہیں

ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں

کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں

قدیم برگد کے پیڑ اپنی جٹائیں کھولے ہوئے کھڑے ہیں
یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے۔
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
سپید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے۔
سنہری چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

زندگی سے ہی محبت اُن کے یہاں خواب پرستی بھی بن جاتی ہے یہ خواب لگوں کی محبت میں پلے ہیں آنسوؤں کی شبنم سے دھلے ہیں، محبت کرنے والوں اور محنت کشوں کی تمناؤں کے ساتھ پروان چڑھے ہیں۔ یہ خواب آزاد ہیں۔ انہیں کوئی قید نہیں کر سکتا جعفری کی شاعری انہی خوابوں کی تلاش اور تعاقب ہے۔ خوابوں کی پرورش کرنے والی آنکھیں اندھیرے میں روشنی اور قید خانے میں محبوبہ کی آنکھوں کی دلنوازی اور رفاقت کو مرئی پیکروں میں دیکھ سکتی ہیں۔

میں لکھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں سفید کاغذ پہ اپنی پلکوں سے چل رہی ہیں
میں پڑھ رہا ہوں
تمہاری آنکھیں ہر اک سطر کی بھوؤں کے نیچے لرز رہی ہیں
میں سو رہا ہوں۔

تمہاری آنکھیں تمہاری پلکیں کہانیاں سی سنا رہی ہیں
میں دوستوں اور ساتھیوں میں گھرا ہوا ہوں
مسرتوں کے گلاب ہر سمت کھل رہے ہیں
تمہاری آنکھوں کے پھول گویا مہک رہے ہیں

ہر خواب بہ مست آنکھیں اِن سے نیند گریزاں ہے۔ نیند کو بھی ایک جوان و حسین پیکر کی صورت میں دیکھتی ہیں

شب کی شوخ دوشیزہ
نیلگوں جوان سینہ
نیلگوں جوان باہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
پلکیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خاموشی کے شانوں پر
خم بہ خم لہکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں
رات خوبصورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

میں نظموں کے اقتباسات سے مضمون کو طول دینا نہیں چاہتا صرف چند نظموں کے عنوانات کی طرف توجہ دلاؤں گا جنگ کی ہولناکی پر "آخری رات"، "گوریلا"، قید و بند پر "زندان بہ زندان"، (ناظم حکمت کے نام) "فیض کے نام"، "سجاد ظہیر کے نام" اور "یلغار" کے عنوان سے جنگ پر امن کی لشکر آرائی۔ اردو پر ایک بے عنوان نظم، احتیاجات زندگی پر اناج یہ سب نظمیں زندگی کے مختلف پہلوں کا احاطہ کرتی ہیں اور موت کی نفی۔ ہر شکستِ خواب نئے خواب کی تمہید نظر آتی ہے۔ اِن نظموں کے حوالے سے میں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا سردار نے "پتھر کی دیوار"، اور "نیند"، ایسی نظموں کو بھی آزاد مانا ہے۔ جن کے مصرعے برابر ہیں لیکن قافیہ اور ردیف کے پابند نہیں انھوں نے نظم معرّا

وہ نظم آزاد میں کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا شاید اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے آزاد نظم کی تشکیل میں ہر بند کی تعمیر کو جو اہمیت دی وہ ان نظموں میں بھی ملتی ہے۔ ہر بند اپنے آخری مصرعے ہی سے مکمل ہوتا ہے۔ نظم کے مزاج کو اس تعمیری شعور سے سردار نے آگاہ کیا اُن کی خوبی یہ ہے۔ کہ بظاہر غیر شاعرانہ اور بول چال کے لفظوں کو بھی شعریت کے قالب میں ڈھالنا جانتے ہیں سردار کی آزاد نظمیں نہ ہوتیں تو آزادی کے بعد کی جدید نظم کو آج کی زبان میں بات کہنے کا سلیقہ نہ آتا۔ عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدید نظم حلقۂ ارباب ذوق کے شعراء کی ڈالی ہوئی روایت کی توسیع ہے لیکن یہ دعوےٰ کرنے والے ناقدین دو شعراء کو بھول جاتے ہیں۔ سردار جعفری اور اختر الایمان سردار جعفری کے لہجے کو عام طور سے بلند آہنگ، خطیبانہ اور پرشکوہ سمجھا جاتا ہے یہ ان کا ایک لہجہ ہے۔ جس کا اثر خود ان کے معاصرین میں کیفی اعظمی، ظہیر کاشمیری اور نیاز حیدر کے یہاں ملتا ہے اور ان کے فوری بعد کی نسل کے شعراء میں مصطفیٰ زیدی، عزیز حامد مدنی، فہمیدہ ریاض، راہی معصوم رضا، اور احمد فراز کے یہاں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ابن انشا کے یہاں بھی کہیں کہیں اس لہجے کی موجیں اٹھتی ہیں، عمیق حنفی کی بعض نظموں میں بھی اس کا اثر ملے گا۔

ہوسکتا ہے کہ بعض شعرا اور ناقدین کو خود میری بعض نظموں میں یہ لہجہ نمایاں دکھائی دے دراصل سماجی اور سیاسی موضوعات پر لکھنے والا کوئی بھی شاعر اس لہجے سے نہیں بچ سکتا سردار جعفری ہنگامی شاعری کو بھی اہمیت دیتے ہیں اور انہیں یہ بات تسلیم کرلینے میں ذرا سی بھی جھجک نہیں کہ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں "آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی ہم تو آج ہی کا راگ چھیڑ سکتے ہیں"۔ سارتر نے جو ادیب کی سیاست وابستگی کا قائل تھا یہی بات دوسری طرح سے کہی ہے۔ لمحۂ موجود اور اپنے تاریخی موقف کی ترجمانی وجودیتی تجربے کا تقاضا ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ آنے والے زمانوں اور نسلوں کے لیے اقتدار کا فیصلہ کریں ہر دور اور ہر نسل اپنا اقتدار خود بناتی ہے۔ ترقی پسندی سے انحراف کے جوش میں ہمارے بہت سے جدید شعرا نے سماجی اور سیاسی مسائل کو شجر ممنوع سمجھ رکھا ہے۔ ان کے وکلا اور نظریہ ساز نقاد خود کلامی اور حرفِ زیرِ لب ہی کو جدید طرزِ اظہار کہہ کر لہجہ پرستی اور ہیئت پرستی کے گرفتار ہو جاتے ہیں۔ نظریاتی وابستگی سے آزادی اور ناوابستگی کے نام پر یہ خود ایک نئے عنوان کی پابندی اور بندشِ اظہار ہے۔ جعفری نے ایسے شعرا پر ایک نظم لکھی ہے "انٹلکچول"

وقت اور موت کے پنجے سے ملے گی نہ نجات
سب ہی بے کار ہیں شمشاد قدوں کی باتیں
لب لعلیں کی نسیم نفسی کے قصے
حق و باطل کے تمام افسانے
اک حقیقت ہے تو وہ روح کی تنہائی ہے
مئے تنہائی سے تنہائی کا پیمانہ بھرو
مئے تنہائی سے
مئے تنہائی سے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

سردار جعفری اور نیا تنقیدی شعور

جب کوئی اہم تخلیق کار تنقید کے میدان میں وارد ہوتا ہے تو اکثر اس کی نیت اور نظریات دونوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ بڑا فنکار اپنی ایک الگ بیاض فکر لیے کر آتا ہے۔ جو ابتدا میں لوگوں کو چونکاتی ہی نہیں مشتعل بھی کرتی ہے۔ یہ فنکار جب خامۂ نقد و نظر ہاتھ میں سنبھالتا ہے تو لوگ کچھ اس طرح سوچتے ہیں۔

(۱) اس کا مقصد حریفوں کو چپت کرنا ہے۔

(۲) اپنے فن (شاعری) کا لوہا منوانا ہے۔

(۳) اپنی بوطیقا کا جواز پیدا کرنا ہے۔

اور دیکھا یہ گیا ہے کہ اس کی تنقید کے ابتدائی محرکات میں یہ سارے ہی اجزا کسی نہ کسی تناسب میں شامل ہوتے ہیں۔ خواہ ورڈس ورتھ ہو یا کولرج اسکوڈ اللہ ہو یا ایلیٹ۔ یا پھر اپنے یہاں حالی اور فراق سب کی تنقیدات کا ابتدائی محرک معروضی کم ذاتی زیادہ رہا ہے۔ لیکن بتدریج ان کی تنقید ذاتی عوامل سے ارفع ہو کر فن و ادب کی زیادہ پیچیدہ اور گہری سچائیوں کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتی ہے اور وہ بعض ایسی حقیقتوں کی دریافت پر قادر ہوتی ہے جو ایک غیر تخلیقی نقاد کی رسائیوں سے پرے ہوتی ہیں۔

سردار جعفری یوں تو زمانۂ طالب علمی سے ہی ادبی مسائل پر سوچنے اور لکھنے لگے تھے لیکن ان کی تنقید کا باضابطہ آغاز ۱۹۵۰ء میں اس وقت ہوا جب ترقی پسند تحریک اپنے اوّلین سنہرے دور کی تکمیل کر چکی تھی اور خود جعفری اس کے ایک نمائندہ اور ہر دلعزیز شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ہر چند کہ اُس وقت ان کی شاعری کی عمر چودہ پندرہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن اپنے اسلوب اور افتاد کے اعتبار سے وہ ماقبل ہی نہیں معاصر شعرا سے بھی الگ پہچانی جاتی تھی۔ اس لیے جب ان کی کتاب ترقی پسند ادب شائع ہوئی تو اگر ایک طرف ترقی پسند حلقے سے باہر اسے ترقی پسند تحریک اور نظریات کا ترجمان سمجھا گیا تو دوسری طرف خود ترقی پسندوں کے مخصوص حلقے میں اسے نمائندہ دستاویز کا درجہ حاصل ہوا۔ اور یہ فطری بھی تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک ترقی پسند ادبی نظریات کے خط و خال واضح نہیں ہوئے تھے بہت سے تصورات سیال اور اختلافی تھے۔ اور ان پر بحث جاری تھی۔ لیکن تحریک کی شیرازہ بندی اور اشاعت

کی خاطر یہ خطرہ تو کسی نہ کسی کو مول لینا ہی تھا۔ سردار جعفری چونکہ ابتدا ہی سے اس تحریک کے فعال رکن تھے اور اس کی دستاویزوں اور جرائد کی تسوید و ترتیب میں وہ اہم رول ادا کرتے رہے تھے۔ اس لیے قرعۂ فال ان کے نام ہی پڑا اور اس میں بھی شک نہیں کہ جہاں تک ترقی پسند ادبی تحریک کے بنیادی یا کلیدی تصورات کی تفہیم و تعبیر کا سوال تھا انھوں نے بڑی محنت اور لگن سے اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب بھی ہیں۔ اس کے باوجود اگر خود جعفری کو اس کتاب کا ہیرو قرار دیا گیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

اس کتاب پر سب سے شدید اعتراضات ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی مرحوم نے کیے جو ۱۹۵۰ء تک خود بڑے جوشیلے ترقی پسند تھے۔ صرف یہی نہیں وہ سردار جعفری کے شعری اسلوب کے سب سے بڑے مقلد بھی تھے جس کا ثبوت ان کی طویل سیاسی نظم "آئینہ خانہ" ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۹ء میں ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی قید سے رہا ہوئے تو بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی ترقی پسند خیالات سے منحرف اور تائب ہو گئے۔

یہاں یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ ڈاکٹر اعظمی نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" میں سردار جعفری پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ ان میں سے بیشتر ان دو مضامین کے حوالے سے کیے گئے ہیں جو جعفری نے زمانۂ طالب علمی میں یعنی ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۹ء لکھے تھے اور جن میں اختر حسین رائے پوری کی طرح ایک انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا تھا اس لیے ان اعتراضات کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسے آج ڈاکٹر اعظمی کی شاعری سے بحث کرتے ہوئے ان کی طالب علمی کے زمانے کی سطحی اور جذباتی شاعری سے مثالیں دی جائیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ جہاں تک جعفری کی تصنیف "ترقی پسند ادب" کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر اعظمی کے بیشتر اعتراضات ایک سوچے سمجھے معاندانہ رویے کے غماز ہیں۔ صرف یہی نہیں انہوں نے سردار جعفری کے بعض بیانات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر اعظمی لکھتے ہیں۔

"جعفری نے اپنی ذات کا جو طلسم تیار کیا ہے وہ اس خود پسندی اور خود فریبی کو اور بھی آگے لے جاتا ہے۔ چونکہ وہ عوام کے لیے عوام ہی کی زبان سے براہ راست شاعری کرتے ہیں اس لیے ان کو محض فیض ہی پر فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ"۔

"ہم اپنے بزرگ اساتذہ سے زیادہ خوش قسمت ہیں کہ ہمارے سننے اور پڑھنے والوں کا حلقہ زیادہ وسیع ہے اور آج ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ آرٹ اور ادب زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچ سکتا ہے۔"

(ترقی پسند ادب (جعفری) صفحہ ۱۷)

جعفری نے اس اقتباس میں ان نئے مادی حالات، تعلیم کی اشاعت اور نئے ذرائع ترسیل کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ادبی تخلیقات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر اعظمی نے اسے جعفری کی نیت اور ذات پر حملہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ کچھ یہی نوعیت ان کے دوسرے اعتراضات کی ہے۔ بہر حال

یہاں میرا مدعا ڈاکٹر اعظمی (مرحوم) کے اعتراضات کا جواب دینا نہیں بلکہ جعفری کے تنقیدی مؤقف کو سمجھنا ہے۔

جہاں تک خود جعفری کے اس کتاب میں موجود ہونے کا تعلق ہے۔ اس کے تین پہلو ہو سکتے ہیں اوّل یہ کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر جعفری نے اسے اپنی شاعری کے جواز کا ذریعہ بنایا۔ دوئم یہ کہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے جعفری اپنے آپ کو اس مطالعے سے الگ نہیں رکھ سکے اور سوئم یہ کہ ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن اور رہنما ہونے کی بنا پر انہوں نے کسی معروضی مطالعے کے بجائے اس تحریک اور اس کے نظریات کی زوردار وکالت کا فریضہ انجام دیا۔ حقیقت یہ کہ یہ تینوں ہی پہلو ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور تینوں میں جزوی طور پر صداقت کا عنصر موجود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تصنیف کے محرکات خود جعفری کے نزدیک کیا رہے ہیں؟

"میری کتاب کا موضوع صرف نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات تک محدود ہے اس لیے بیشتر ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا ذکر صرف حوالوں اور مثالوں کی شکل میں آیا ہے۔" حرفِ اوّل میں دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

> "درحقیقت میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیے ہیں۔ کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں ہے میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے اور جس سے میرا شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اس کو کاغذ پر منتقل کر دیا ہے۔"

ظاہر ہے کہ جعفری —— یہاں اس تحریک اور اس کے مقاصد سے اپنی ذاتی وابستگی یا کمٹ منٹ کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن اسی حرفِ اوّل میں انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اپنے اس مطالعے کو انھوں نے "حتی الامکان سائنٹفک اور علمی رکھنا چاہا ہے۔" یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے تجزیے اور تبصرے تحریک کے پس منظر اس کے نظریاتی تناظر، محرکات اور رجحانات کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یقیناً اردو میں مقدمہ حالی کے بعد اپنی نوعیت کی یہ پہلی تصنیف ہے۔ ہمیں یہ ماننے میں تامل نہیں کرنا چاہیے کہ اردو میں پہلی بار نظریاتی پاس داری رکھنے والا افادی ادب سرسید تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہوا اور حالی نے مقدمہ لکھ کر اس کی اصولی اور جمالیاتی بنیادیں تلاش کیں۔ جعفری نے بھی یہی فریضہ انجام دیا۔ ترقی پسند تحریک چونکہ صرف اردو کی تحریک نہیں تھی بلکہ زیادہ ہمہ گیر قومی اور بین الاقوامی تحریکوں سے اس کا رشتہ تھا۔ اس لیے جعفری نے زیادہ وسیع ذہنی تناظر میں حقیقت نگاری کے اس رجحان یا اس نئے طرز کے افادی ادب کی وضاحت کی ہے۔ انہوں نے اس کی سماجی معنویت کے ساتھ ساتھ اس کے جمالیاتی تلازمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ کام انہوں نے سنجیدہ استدلال کے ساتھ کیا ہے۔ اور تحریک سے گہری وابستگی کے باوجود کوشش کی ہے کہ تحریک کا سب سے بڑی دین یعنی عقلیت اور معروضیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس وقت تک سید احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، اختر انصاری اور ممتاز حسین نے اپنے مضامین میں جس نئے تنقیدی شعور کے نقوش ابھارے تھے سردار جعفری نے اس کو ایک ارفع اور اصولی نظم و ضبط کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ کتاب کے چوتھے باب تک یہ ساری بحث ختم ہو جاتی ہے۔ آخری دو ابواب

میں ترقی پسند ادب اور اس کے رجحانات کا جائزہ ہے۔ یہاں میرا مدعا موازنۂ حالی و جعفری ہرگز نہیں کہنا صرف یہ ہے۔ کہ یہ دونوں کتابیں ہمارے معاشرہ اور ادب کی دو بڑی تحریکوں کے پس منظر میں اور ان کے عہدِ شباب میں لکھی گئیں، دونوں نے ہمارے ادب میں کچھ نئی قدروں، نئے رجحانات کی آبیاری کی۔ شعر و ادب کو بدلتی ہوئی زندگی کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ بنایا۔ دونوں نے حتی الامکان مادی اور معروضی نقطۂ نگاہ پر زور دینے کے باوجود ایک طرف اپنی تحریک کی تو دوسری طرف اپنے موقف شعری کی ترجمانی کی اس کے بغیر شاید وہ اپنے خیالات کو اتنے موثر اور کارگر ڈھنگ سے پیش نہیں کر سکتے تھے۔ سردار جعفری کی کتاب زیادہ نزاعی اس لیے ٹھہری کہ انہوں نے مثالیں اپنے معاصرین سے دی تھیں۔ اور ترقی پسند ادب کے جائزے میں بڑی سفاکی سے بعض کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ ان کے بعض فیصلے اگر صحیح ہیں تو بعض جارحانہ رویے کی غمازی کرتے ہیں۔ مثلاً سعادت حسن منٹو کی کچھ کہانیوں کو اگر فحش اور بے ہودہ مان لیا جائے تب بھی انھیں غلاظت نگار کہنا یا انھیں بنیادی طور پر انسانوں کی محبت سے عاری بتانا تنقید کا بڑا ادعائی انداز تھا جو جعفری نے روا رکھا۔

لیکن جعفری کے تنقیدی مسلک کے بارے میں خلیل الرحمان اعظمی کا یہ بیان بھی طبیعت اور جارحیت کی دلیل ہے کہ "یہ تنقید ترقی پسندی اور شاعری دونوں کو اپنے معیار پر لانا چاہتی ہے۔ تاکہ سب سے اونچے منصب پر جعفری کو فائز کر دیا جائے۔ اس لیے کہ محت مند سماجی اور نظریاتی رویوں پر اصرار صرف جعفری کی کمزوری نہیں تھی بلکہ یہ ادعائیت اس زمانے کی عالمی ترقی پسند تنقید کا عام انداز تھا۔ اسٹالن کے دور میں سوویٹ روس کے A. A. ZHADANOV نے اشتراکی حقیقت نگاری کا جو نظریہ پیش کیا تھا۔ اس نے غیر اشتراکی ملکوں کے ادب میں خاصی گمراہی پھیلائی۔ یورپ میں کرسٹوفر کاڈویل بھی انتہا پسندی کے اسی میکانکی موقف کو لیکر چل رہے تھے۔ جعفری بھی ان سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور تھے ہمارے یہاں پہلی بار ممتاز حسین نے ہنگری کے دانشور گیورگی لوکاچ کی طرح (جو سوویت یونین میں معتوب رہا) ادب کے مسائل پر براست سیاسی عوامل سے ہٹ کر فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے غور و فکر کرنے کی طرح ڈالی۔ سردار جعفری نے بلنسکی گورکی، امورس ڈاب اور خود لینن کے ادبی نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے بیسوی صدی کے سیاسی اور تاریخی عوامل کے تجزیے سے جو ذہنی اور ادبی رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔ اس میں ایک صاف منطقی ذہن کی کارفرمائی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ بات بھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی جمالیاتی اساس تلاش کرنے کی کوشش کی یا کم از کم اس اہم مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس سعی کا نقطۂ آغاز انھوں نے پریم چند کے خطبۂ صدارت کا وہ مقولہ بنایا ہے۔ جس میں انہوں نے کہا ہے ——— "ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا"۔ اس وقت تک دنیا کے مشہور مارکسی عالموں نے بھی اس مسئلے پر گہرائی سے غور نہیں کیا تھا۔ ہمارے ہاں اختر انصاری نے ادب میں حسن کے تصور کو افادیت سے جوڑ کر ایک نیا اور چونکا دینے والا تصور دیا تھا۔ سردار جعفری نے پلیخانوف کے حوالے سے انسان کے ذوق و جمال کے ارتقا اور سرچشموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ تہذیبی ارتقا کی مختلف سطحوں اور سماج کے مختلف طبقوں کے ذوق جمال کے فرق کی نشان دہی بھی انہوں نے کی ہے۔ ذوقِ جمال کے اجتماعی یا طبقاتی کردار

پر زور دینے کے باوجود انھوں نے اس کے انفرادی پہلو کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ لکھتے ہیں "تہذیب و تمدن کی ایک ہی سطح پر بھی ایسے دو آدمی نہیں ملیں گے جن کے جمالیاتی احساسات یکساں ہوں۔ احساس جمال کی اس انفرادی نشاخت کو انھوں نے متضاد سماجی عوامل میں تلاش کیا ہے۔"

اسی طرح سردار جعفری کا یہ خیال بھی ذوق صحیح کا غماز ہے۔ کہ "جب تک ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان مشترک جمالیاتی قدریں نہ ہونگی۔ ان دونوں کے جمالیاتی ذوق کی قدریں ملیں گی نہیں۔ تب تک نہ ادب سے لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ نہ اُسے سمجھا جا سکتا ہے۔"

جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" نے کم از کم دو دہوں تک ترقی پسند ادبی نظریات کی تفہیم اور فروغ میں مؤثر رول ادا کیا ہے۔ پینتیس[۳۵] سال قبل لکھی ہوئی اس کتاب میں آج اگر گہرائی کی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ آج کی مارکسی تنقید میں زیادہ دقت نظر اور علیمانہ بصیرت پیدا ہو گئی ہے۔ مارکسی تنقید اب بڑی حد تک مارکسی تصورات کے یک رخے میکانکی اطلاق سے آزاد ہو گئی ہے۔ اب گیورگی پلیخانوف، گیورگی لوکاچ اور برطول بریخت کی کم و بیش ساری تحریریں انگریزی میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ وی۔ جے جیروم، اڈالف سانکیز واز کوئیز، ڈیوڈ کریگ، گرامچی اور وکٹر کیرنن جیسے مارکسی دانشوروں کی کتابیں بھی مل جاتی ہیں جو عالمی اور قومی سطح پر ادب اور تہذیب کے مسائل کی تفہیم میں ایک نئی فلسفیانہ اور تخلیقی بصیرت عطا کرتی ہیں۔ جس کے شواہد نوجوان نقادوں محمد علی صدیقی، اصغر علی انجینئر، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر طارق اختر، عتیق احمد، اشفاق احمد، ڈاکٹر صادق اور دوسروں کے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ خود جعفری کے شعور اور تنقیدی رویوں میں گزشتہ پندرہ برسوں میں نتیجہ خیز اور خوشگوار تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ ہر چند کہ اس دور میں انہوں نے تنقید کم لکھی ہے۔ اور انھیں نقاد ہونے کا دعویٰ بھی نہیں لیکن اقبال اور بعض کلاسیکی شعرا کے بارے میں انہوں نے جو مقالات، دیباچے لکھے ہیں وہ اس نئی بصیرت کا ثبوت ہیں۔

صد سالہ جشن اقبال کے موقع پر سردار جعفری نے اقبال کے بارے میں اردو اور انگریزی میں کئی مضامین لکھے یوں تو ترقی پسند نظریات کی تشکیل میں انھوں نے فکرِ اقبال کی اہمیت کا اعتراف اپنی کتاب ترقی پسند ادب میں بھی کیا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ۱۹۵۸ء کے بعد انھوں نے اقبال کو از سر نو پڑھا اور ایک بار پھر ان کے فکر و شعور اور فن کے باریک پہلوؤں کا سراغ لگایا جس کا ثبوت ان کی اس دور کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ جوش کے بجائے اس دور میں وہ اقبال سے زیادہ قریب رہے ہیں۔

جعفری نے اقبال کی بین الاقوامیت پر اپنے مضامین میں خاص طور پر زور دیا ہے۔ اقبال نے تیسری دنیا اور خاص کر اردو اور فارسی بولنے والی اقوام کو استعماری طاقتوں کی سازشوں سے خبردار اور بیدار رہنے کا جو پیغام دیا تھا۔ اس کی معنویت اور ہمہ گیر اثرات کا اعتراف جعفری نے کھل کر کیا ہے۔ صرف یہی نہیں وہ اقبال کی بازیافت کے شوق میں فکرِ اقبال کے بعض ایسے منطقوں میں بھی داخل ہو گئے جن کا تعلق اساساً مابعد الطبیعاتی یا ماورائی مسائل سے ہے۔ مثلاً اقبال کا تصور وقت۔ جعفری نے ایسے ہند و فلسفہ (پرانوں) میں دیئے ہوئے کائنات کی تخلیق کے تصور سے جوڑ کر اور ایک شاعرانہ تمثیل بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے جس جو خیلی شاعرانہ

نثر تک زمان و مکان کے حوالے سے اقبال کے تصورات کی شرح کی ہے۔ وہ تاثراتی تنقید کا دلکش نمونہ بن جاتا ہے لیکن اس طرح کے مطالعے سے علمی طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ بھر ہوتا یہ ہے کہ نقاد خود شاعر (اقبال) کے طلسم خیال میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

سردار جعفری کی تنقیدی دانش کا ایک اہم نمونہ "پیغمبران سخن" ہے جو کبیر، میر اور غالب تین شعرا کے بارے میں ان کے مفالوں (اصلاً دیباچوں) پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۵ء تک انھوں نے ہندوستان کے تین عظیم کلاسیکی شعرا کے کلام کا مطالعہ بڑی کاوشوں اور دقتِ نظر سے کیا۔ اس کا اثر ان کی تخلیقی فکر اور جمالیاتی حیثیت پر بھی پڑا جیسا کہ ان کے بعد کے مجموعوں "پیراہن شرر"، اور "لہو پکارتا ہے" سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان شعرا کے کلام میں علاوہ دیگر عناصر کے انہوں نے اس سوال کا جواب بھی ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کسی شاعر کا کلام لوگوں کے ذہن کی تسکین کا باعث کیونکر بنتا ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنے آپ کو نقادوں کی صف میں شمار نہیں کرتا اور میں نے پیشہ ور نقادوں کا سا رویہ بھی نہیں اختیار کیا ہے ... کبیر، میر اور غالب کی شاعرانہ دنیا کی بازیافت خود میری شعرگوئی کے لیے ضروری ہے۔ میں جس نظریہ جمال اور نظریہ تاریخ پر یقین رکھتا ہوں اور جو میرے اندر گزشتہ تیس سال میں راسخ ہو چکا ہے۔ میں نے اسی نظریے سے ان بزرگ شعرا کے کلام پر نظر ڈالی ہے۔ یہ کلام ابدی قدروں کا حامل ہے۔ لیکن اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہے .... عظیم ادب کی جڑیں اس عہد کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ لیکن پھول اور پھل عہد کی حدوں کو توڑ کر نکل جاتے ہیں۔"

جس طرح مارکسی نقاد G. M. MATHEWS نے شیکسپیر کے ڈرامہ "اتھیلو" کا مطالعہ یورپ کی عہد وسطیٰ کی تاریخ کے تناظر میں کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح شیکسپیر لطیف تمثیلی انداز سے اس ڈرامے میں انسانی وقار DIGNITY کے ناقابل تقسیم ہونے کا نظریہ پیش کیا اسی طرح جعفری نے کبیر اور میر کی شاعری میں بھگتی اور تصوف کے مسلک کا مطالعہ تاریخی حوالوں سے کر کے انسانی مساوات کے تصوّر پر زور دیا ہے۔ ذات پات رنگ و نسل اور سماجی اونچ نیچ کی تفریق کے مقابلے میں کبیر نے انسانی وحدت، انسانی دردمندی اور عالمگیر محبت کی تبلیغ کی۔ جس کے اثرات ہندوستانی سماج اور اس سے زیادہ ہندوستانی فکر کے ارتقا میں نمایاں رہے ہیں۔ سردار جعفری کہتے ہیں "ہمیں آج بھی کبیر کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس روشنی کی ضرورت ہے۔ جو اس سنت صوفی کے دل سے پیدا ہوئی تھی" انہوں نے کبیر کی شاعری کے جمہوری اور سیکولر کردار پر زور دیتے ہوئے۔ ایک موقع پر لکھا ہے۔

"آج جب کہ ہندوستان کے بعض حلقے تنگ نظری کا ثبوت دے رہے ہیں اور ایک محدود تہذیبی تصور کو فروغ دینے کی فکر میں ہیں تو قومیت کے ایک جامع تصور پر اصرار کرنے کے لیے جس کے اندر ہندوستان کے مزاج کی وسعت ہو یہ ضروری ہے کہ ایک طرف موجودہ مغربی سائنس سے استفادہ کیا جائے اور دوسری طرف اپنے ملک اور قوم کی وسیع القلبی کی روایتوں کو یاد رکھا جائے۔

جدید عہد کی سیاسی انقلابی تحریکوں کو مزید تقویت حاصل کرنے کے لیے قرون وسطیٰ کی انقلابی فکر سے رشتہ جوڑنا چاہیے۔"

کبیر میر اور غالب کی شاعری میں سامنتی عہد کے سماجی اداروں، روایتوں اور نظریوں کی عوام دشمنی کے خلاف احتجاج کرنے یا ان کی معنویت پر شک کرنے کی جو صفات ملتی ہیں۔ جعفری نے ان پر زور دیا ہے۔ انھوں نے ایک طرف ان شعرا کی آفاق گیر محبت اور اخوت کی اہمیت جتائی ہے تو دوسری طرف اس مقدس نفرت کا ذکر بھی کیا ہے جو دلوں میں اضطراب پیدا کرتی ہے اور جبر و استحصال کے فتنوں کو پھونک کر خاک کر سکتی ہے یقیناً جعفری سرفروشانِ محبت کا دل ایسے جنوں سے بھی معمور ہوتا ہے جو دستِ جلاد سے شمشیر ستم چھین لے اور باطل کے سینے پر حرفِ حق لکھ سکے۔ ان شعرا کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے سماج اور انصاف کے اجارہ داروں اور ان کی حمایت کرنے والے تصورات کے خلاف بغاوت اور نفرت کی چنگاری کو ہوا دی تھی۔ ان کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

جیسا کہ جعفری نے بار بار کہا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور اپنی شعرگوئی کے محرکات کو سمجھنے اور توانا رکھنے کے لیے یہ مقالات لکھے ہیں۔ ان میں بھی ان کی ارتقا پذیر شخصیت کے وہی پہلو روشن ہیں جو ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے علمی اور معروضی نقطۂ نگاہ پر زور دے کر اُردو میں ادبی تنقید کے اس سائنسی نظریے کو تقویت بخشی جس کا آغاز ترقی پسند نقادوں نے کیا تھا۔

محمد علی صدیقی

سردار جعفری ــــ جلال سے جمال تک

علی سردار جعفری اور جدید اردو ادب کے مابین نصف صدی کا ماجرا ہے۔ سردار جعفری نے اس صدی کی چوتھائی دہائی میں آغاز سفر کیا اور یہ آغاز سفر ایک ایسی ادبی تحریک کے ہراول دستے کے اہم رکن کی حیثیت سے کیا جس نے جدید اردو ادب اور سرسید اور حالی کی روایت کے باہمی تعلق کو مزید تقویت دی انہوں نے یہ تعلق کچھ اس طور استوار کیا کہ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے چند برس کے اندر اندر اوائل صدی کی رومانی تحریک کے اثرات ماند پڑ گئے اور ایک نئی رومانیت نے جس میں انقلابیت کا تلاطم تھا اور جذبہ بھی، جنم لیا۔

سردار جعفری کے کارنامے بلاشک و شبہ، ترقی پسند تحریک کے کارناموں میں شمار ہوتے ہیں اور اس صحیح دعوے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے ناقدین کی اس رائے کو بھی رکھا جا سکتا ہے کہ علی سردار جعفری کی ناکامیاں ترقی پسند تحریک کی ناکامیاں بن چکی ہیں شاید ہی کسی اور ترقی پسند شاعر کے لئے بشمول فیض، مخدوم، مجروح، کیفی اور قاسمی یہی رائے دہرائی جا سکتی ہو۔ فیض مخدوم، کیفی، مجروح اور قاسمی کا ترقی پسند تحریک کے نشیب و فراز سے سردار جعفری کے مقابلے میں قدرے مختلف تعلق رہا۔ مخدوم عملی جدوجہد کے دور شباب کے شاعر ہیں لیکن اس کے باوجود ان کی بیشتر شاعری ترقی پسند شاعری کی جذباتیت اور سیاسیت سے مملو نہیں ہے۔ کیفی شروع ہی سے ترقی پسند تحریک کے فعال رہنما ہیں اور وہ علی سردار جعفری کی طرح تحریک کے حوالہ سے تقریباً "برزخ" کی کیفیات سے کسی بھی لمحہ دوچار نہ ہو سکے۔ مجروح اور قاسمی کو اپنے ساتھیوں اور تحریک سے جس نوعیت کی شکایتیں رہی ہیں۔ علی سردار جعفری کبھی بھی تحریک کے بعض ساتھیوں کے رویے سے شاکی نہ ہو سکے۔ وہ کبھی بھی اپنے خلاف اعتراضات پر برہم نہ ہو سکے۔

سردار جعفری کو ترقی پسند تحریک کی کامیابیوں اور ناکامیوں کے لئے یکساں سزاوار ٹھہرایا تو اس کا مدعا یہی تھا کہ سردار جعفری کی ادبی زندگی میں بھیونڈی کانفرنس سے قبل کا ادبی رویہ بھی ہے اور اس کے بعد کا بھی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ تحریک کی غلطیوں کو قبول کیا ہر چند ان کے خلاف کانگریسی حکومت کے لئے گوشہ رعایت کے الزامات لگتے رہے ہیں لیکن وہ اپنے انفرادی موقف پر قائم رہے۔ وہ ہر دور میں اپنے دوستوں کے ہجوم میں ایک منتظم اور مقتدر رہنما کے طور پر استادہ نظر آتے ہیں اور کبھی وہ جیسے ہندوستانی وزیراعظم آنجہانی اندرا گاندھی کی جانب سے اعلان کردہ ایمرجنسی کے زمانے میں وہ خاصے تنہا بھی رہے۔ ترقی پذیر ممالک کی سوشل ڈیموکریٹک جماعتوں کے ساتھ ترقی پسندوں کا معاملہ متنازعہ فیہ رہا ہے۔ بسا اوقات ترقی پسند بعض جمہوریت دشمن سوشل ڈیموکریٹک جماعتوں کا صرف

اس لئے ساتھ دے بیٹھے کہ ان جماعتوں کی خارجہ پالیسی خود غرضانہ وجوہات کی بنا پر ترقی پسندوں کے نظریاتی رزلوم کے مطابق تھی اور یہ ظاہری مطابقت ترقی پذیر سماجوں کے اندرونی تضادات بلکہ ان تضادات میں اضافے کی روش کو یکسر فراموش کرنے کا پیش خیمہ بن گئی۔ ایک وہ زمانہ بھی آیا کہ علی سردار جعفری محض "کانگریس وادی" بن کر رہ گئے۔ پھر بائیں بازو کے اتحاد کی لہر اٹھی تو سردار جعفری بھی اس اتحاد کے موید اور وکیل بن گئے اور علی سردار جعفری کی زندگی کے موجودہ مرحلے میں کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (اردو) کی سربراہی اس لئے ممکن ہو سکی کہ انھوں نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن کی گولڈن جوبلی منعقدہ لکھنؤ (۱۹۸۶ء) میں ہندی دانشوروں کی برہنہ اردو دشمنی کا مقابلہ کرنے کے لئے مختلف النوع مکاتبِ فکر کے اردو ترقی پسند ادیبوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری کے سیاسی نظریات نے ہندوستان کی مجموعی صورتحال کے حوالے سے بہت اہم قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ کیفی اس نوع کے جوار بھاٹا سے نہ گذرے۔ مجروح کے یہاں ترقی پسند دوستوں کے رویہ کی شکایتوں کا سلسلہ موجود رہا لیکن مجروح تنظیمی طور پر سردار جعفری کی طرح ترقی پسند تحریک کے کلیدی عہدہ دار نہ تھے اس لئے مجروح کے سلسلے میں وہ ردعمل سامنے نہ آسکا جو علی سردار جعفری کے بارے میں ممکن ہو پایا تھا۔ ممتاز حسین کے بقول شروع ہی سے صوفی ترقی پسند شمار کئے گئے لیکن اس بوالعجبی کا کیا کیا جائے کہ وہ نظریۂ پاکستان سے اپنی واضح وابستگی کے باوجود بھی دائیں بازو کے دانشوروں کے لئے ہدفِ تنقید بنے رہے۔ کیفی کی حیثیت ہمیشہ متفق علیہ رہی اس لئے وہ ترقی پسند تحریک کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کا گراف متواتر آگے کی سمت بڑھتا رہا ہے۔

میں نے سردار جعفری کے بارے میں مندرجہ بالا پس منظر اس وجہ سے بھی بیان کیا کہ علی سردار جعفری کے بارے میں ممکنہ پیمانہ [illegible] ترقی پسند شمار کئے گئے لیکن اس سب کچھ کہہ چکنے اور سننے اور اس بنیاد پر جمع تفریق کے بعد جو کچھ "حاصل" کے طور پر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سردار ترقی پسند تحریک کے مقرر کردہ میارات پر پورے نہ اترتے رہے ہوں بلکہ سردار جعفری کے شعری سفر کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے نظریاتی بنیاد پر شکایتوں اور وسوسوں کے زمانے میں بہتر شاعری کی اور اپنے اوائلی دور کی براہ راست شاعری کے بجائے استعاراتی زبان کا زیادہ استعمال کیا۔

سردار جعفری، بلاشک و شبہ تی زمانہ ترقی پسند تحریک کے سب سے نمایاں نام ہیں انھوں نے برصغیر میں روشن خیالی کی تحریک کے لئے نہ صرف بحیثیت شاعر بلکہ مفکر، محقق، شارح اور مترجم کی حیثیتوں میں جو کچھ کام کیا اور بطور صحافی جس جزئیات نگاری یا دور نگاہی کا مظاہرہ کیا ہے وہ صرف اسی شخص کا حصہ ہو سکتا ہے جس کا ذہن صاف، منزل متعین اور فکر انسان دوستی کی ترجمان ہو۔

علی سردار جعفری کی شاعری ترقی پسند تحریک کی تاسیس کے وقت کی ذہنی فضا، نازی ازم اور جمہوریت کے مابین معارکہ آرائی کے حوالے سے جنگِ عظیم کی اہمیت، آزادی کی تڑپ، سامراج کے خلاف توانا آواز، اندرونی استحصالی ڈھانچہ میں سامراج کے حلیف طبقے کے خلاف غم و غصہ، آزادی اور آزادیٔ موہوم کے مابین فرق۔ انسانی اخوت اور بین الاقوامی امن کے عنوانات کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دائیں بازو کے حضرات اپنی جانب آنے والے ادیب یا شاعر سے سو فیصد مطابقت چاہتے ہیں جبکہ ترقی پسند محض "عاداعظم مشترک" کی بنیاد پر غیر سکہ بند ترقی پسندوں کو بھی اپنوں میں شمار کرتے ہیں اور یہی وہ وجہ ہے جس کے باعث آج اردو کے بیشتر ادبا اپنے مواد Content اور اس مواد کے ساتھ treatment کی بنیاد پر ترقی پسند ٹھہرتے آئے ہیں۔

بعض غلط العنان سماجوں کے "لبرل" دانشور بھی ترقی پسند ہوتے ہیں خواہ وہ خود کو ترقی پسندوں میں شمار کروانا نہ چاہتے ہوں۔
سردار جعفری، ہر لحاظ سے ترقی پسند تحریک کے مقتدر رہنما ہیں اور وہ کم از کم ان تمام حضرات کے لیے جو ترقی پسندی کی کم از کم تعریف پر بھی پورے نہیں اترتے، ہدف بن جاتے ہیں، وہ چوٹی کے ترقی پسند ہیں۔ وہ اپنے commitment میں کسی طرح بھی فیض سے کم ترقی پسند نہیں اور اب تو وہ اپنے ڈکشن میں بھی فیض کے اس قدر قریب آ چکے ہیں کہ اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ آج فیض کے ڈکشن کا سب سے ممتاز شاعر کون ہے تو میں آسانی کے ساتھ سردار جعفری کا نام لوں گا۔ فیض احمد فیض سے جب ڈاکٹر نصرت چودھری نے سردار جعفری اور ان کے لہجے میں فزوں تر مشابہت کے بارے میں رائے دریافت کی تو فیض نے جواب دیا تھا۔

"ہمارا رنگ تو اب ایک عام رنگ بن گیا ہے۔ لہٰذا ہمارا نہیں رہ گیا۔ یہ رنگ کسی کا ذاتی نہیں ہوتا، بلکہ ہوتا یوں ہے کہ وقت کے ساتھ ایک محاورہ، ایک خاص قسم کی تشبیہ، ایک خاص قسم کا استعارہ مقبول ہو جاتا ہے جس سے اس عہد کا مزاج بنتا ہے۔ کسی نے اس کو پہلے اختیار کر لیا اور بعد میں وہی رنگ عام ہو گیا۔"

(اقتباس از فیض کی شاعری۔ ایک مطالعہ ڈاکٹر نصرت چودھری، نگارشات لاہور، ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۰۱)۔

فیض اور سردار جعفری کی شعری سخت میں بین فرق یہی ہے کہ فیض استعاراتی اظہار کے قریب تر ہیں۔ سردار جعفری کی ابتدائی شاعری میں انیس، اقبال اور جوش کے غیر استعاراتی رنگ سے زیادہ استفادہ ملتا ہے جب کہ ان تینوں شاعروں کے یہاں ڈکشن موجود ہے اور اقبال کے یہاں تو استعاراتی ڈکشن کی طرف جھکاؤ اس قدر زیادہ ہے۔ خاص طور سے اردو غزل اور فارسی غزل میں کہ فیض کی شاعری کی فارسی روایت ایک طرح سے اقبال کی روایت ہی کی توسیع ہے۔

جیسا کہ میں نے لوٹس ٹوڈ کنساڈا میں سردار جعفری کی ۷۰ ویں سالگرہ کی تقریب ۱۹۸۴ء کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر کے مقالہ میں کہا تھا کہ علی سردار جعفری نے شعری مجموعہ "لہو پکارتا ہے" کے ذریعہ جس استعاراتی ڈکشن سے اپنی رغبت و موانست کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ فیض احمد فیض کے شعری ڈکشن سے بہت قریب ہے۔ خود فیض نے بھی نصرت چودھری کے سوال کے جواب میں جو کچھ کہا ہے وہ میرے دعوے کی تصدیق ہے۔ میں اس گفتگو میں جس نکتہ پر زور دے رہا ہوں اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ سردار جعفری عملی جدوجہد کی سیاسی حقیقتوں کی کھردراہٹ سے شعوری طور پر گریز کی وجہ سے ایک زیادہ غنائی اور شیریں ڈکشن کی طرف آ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض ناقدین یہ خیال ظاہر کریں کہ سردار جعفری کے شعری ڈکشن کا موجودہ دور ایک موڑ ہے اور بس لیکن خواہ کچھ ہی کہا جائے یہ ایک خوبصورت لمحہ ہے اگر ہم ذرا دیر کے لیے اس لمحہ پر توقف کر کے یہ غور کریں کہ آیا سیاسی حقیقتوں سے عملی طور پر نبرد آزمائی غیر شیریں جلال کو جنم دیتی ہے اور ان حقیقتوں سے دوری شیریں لہجہ کو تو شاید بحث و تمحیص کا ایک اور در کھل سکتا ہے۔ سردار جعفری کے اشعار ملاحظہ کیجیے۔

سینے میں حرارت ہے افسونِ تمنا سے
امروز مرا روشن رنگِ رخِ فردا سے

شبِ ہجر صبحِ وصال ہے ترا عکس جب بھی جگا لیا
تری یاد دل کا چراغ ہے، سرِ شام ہی سے جلا لیا

غمِ زندگانی تھا تلخ تر، غمِ عشق اس کو بنا لیا
یہ امانتِ غمِ دوست ہے اسے طاقِ دل میں سجا لیا

ترا حسن بادۂ ناب ہے جو کھنچا ہے رنگِ بہار سے
مری جرعہ نوشیٔ شوق ہے ترے لعلِ لب کے کنار سے

تجھے اے شبِ غمِ زندگی، وہ طلوعِ صبح نصیب ہو
جو دمک اٹھے رخِ دوست سے، جو چھلک اٹھے لبِ یار سے

شمع کا، مے کا، شفق زار کا، گلزار کا رنگ
سب میں اور سب سے جدا ہے لبِ دلدار کا رنگ

اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رخِ یار کا رنگ

یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کا عروج
یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو!!

دورِ مے ختم ہوا، ختم ہوئی صحبتِ شب
ہو چکی صبح، مگر رات ابھی باقی ہے

ایسا لگتا ہے کہ بچھڑی ہے ابھی مل کے نگاہ
ایسا لگتا ہے ملاقات ابھی باقی ہے

عارضِ گل ہے کہ محرومِ تجلی اب بھی ہے
کب سے رکھی ہے خزاں کے دل پہ تیغِ نوبہار

سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے شاید
مثالِ بادِ صبا ہو کے بے قرار چلو

آپ مندرجہ بالا اشعار کی ایمائیت سے اندازہ لگائیں گے کہ سردار جعفری نے ان اشعار میں اسوات تمنا، رنگِ رخِ فردا، جرعہ نوشیِ شوق، لعلِ لب کے قشار اور لبِ دلدار کی باتیں کی ہیں۔ سردار جعفری نے ایک عجیب بزمیہ شعر کہا ہے۔

اور ہے عشق کی نظروں کا نکھارا ہوا روپ
یوں تو شائستہ تھا پہلے بھی رخِ یار کا رنگ

سردار جعفری کے یہاں عقل پر عشق کی بالادستی کی طرف اشارہ ایک واضح موڑ ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں سردار جعفری اقبال کے تصورِ عشق سے بہت قریب آگئے ہیں اور ان کا عشق جذبہ و فکر کا اس قدر خوبصورت ملاپ بن گیا ہے کہ اس کی وجہ سے رخِ یار کا رنگ بھی نکھر گیا ہے۔ رخِ یار کے شائستہ رنگ میں نکھار کا پہلو دراصل عشق کے صفاتی ([illegible]) تفوق پر ہے۔ شاید یہی حصہ ہے کہ ملی سردار جعفری نے اپنی نظم "فیض احمد فیض" میں جو "ہو پکارتا ہے" 'میں یارانِ میکدہ' کے عنوان کے تحت شامل نظموں میں سے ہے اور جس میں جولیو کیوری، پال روبسن، ایلیا ایرن برگ، فیض احمد فیض اور کرشن چندر شامل ہیں، ایک ذی حیات ہم عصر کے حضور اس قدر والہانہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

سوز ہے دل میں نگاہوں میں محبت کا گداز
ایک بجلی ہے کہ جو شعلہ فشاں ساز میں ہے
کاٹ تلوار کی شعروں کو عطا کرتی ہے
وہ کسک درد کی جو فیض کی آواز میں ہے

سردار جعفری نے فیض کی شاعری کو سوز، گداز اور کسک کی شاعری قرار دیا ہے اور اسے شعلہ فشاں ساز اور تلوار کی کاٹ سے تعبیر کیا ہے۔ غالباً سردار جعفری نے ان صفات کا ذکر ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اپنے شعری سفر کے موجودہ دور میں اپنی شاعری کو بھی انہی صفات کے خمیر میں گوندھنے کی طرف شعوری طور پر مائل ہو چکے ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل کی شیرینی کا راز روایت کی طرف شعوری سفر میں پوشیدہ ہے اس لئے سردار جعفری فیض کے بجائے تغزل کی روایت کے قریب آگئے ہیں۔ بات کسی حد تک درست ہے کہ پھر مندرجہ ذیل

سینے میں حرارت ہے افسونِ تمنا سے
افروختہ ہوا روشن رنگِ رخِ فردا سے

میں پنہاں اس جدلیاتی فکر کے روشن رنگ کے بارے میں کیا کہا جائیگا جو اپنی مانوس لغت کی بجائے اپنے انقلاب آفریں جدید خیال کی مرہونِ منت ہے اور پھر سردار جعفری کی نظموں کے مندرجہ ذیل اقتباسات کے بارے میں کیا کہا جائیگا؟ میں عمداً فیض کی بعض نظموں کے آہنگ (Rhythm) کے ساتھ موازنہ سے گریز کر رہا ہوں اور اپنے قارئین سے توقع رکھتا ہوں کہ ان کی توجہ فیض کی بعض نظموں کی جانب منعطف ہوگی۔

گفتگو بند نہ ہو
بات سے بات چلے
صبح سے شام ملاقات چلے
ہم پہ ہنستی ہوئی تاروں بھری رات چلے
(گفتگو)

انگلیاں بادِ صبا کی بھی لہو سے تر ہیں
چاک ہوتے ہوئے دیکھا ہے چمن کا سینہ
تار پیراہنِ گل اڑتے ہوئے دیکھا ہے ۔ ۔ ۔ ۔
کوئی بتلاؤ کہ اس دورِ سیہ وحشت میں
حسنِ معصوم و دل آرا کی ادا کیا ہوگی
عشقِ برباد کے آدابِ جنوں کیا ہوں گے
(نظم)

کیا کوئی ایسا ہے جو ہونٹوں کی افسردہ شاموں کو
صبحِ تبسم عطا کرے
پیاس کے پیلے برگِ خزاں کو
فصلِ گل کی مے میں ڈبو دے
کیا کوئی ایسا ہے جو بھیگی آنکھوں سے
آنسو کے قطرے چن لے
اور موتی کر کے واپس دے دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
(چھوٹا سا دل)

تمہارا بستر تمہارے بدن کی خوشبو سے
مہک رہا تھا، ہر ایک بام تم سے روشن تھا
ہوا تمہاری طرح ہر روش پہ چلتی تھی
تمہارے ہونٹوں سے ہنستی تھیں نرم لب کلیاں
عطا ہوئی تھی سحر کو تمہاری سیم تنی
ملی تھی شام و شفق کو تمہاری گل بدنی
تمہارا نام تصور بھی تھا، تخیل بھی
یقیں بھی، شوق بھی، امید بھی، تمنا بھی

سبھی تھی زلف جواں آرزو کے ہاتھوں سے
"امید دستے ہر سمت عاشقوں کے گرد"۔
مگر یہ کیا کہ ہر اک کوچہ آج ویراں ہے
گلی گلی میں ہے فولاد پاسیہ عفریت
چمن چمن میں سڑی لاش کا تعفن ہے۔
ہوائیں گرم ہیں، بارود کا اندھیرا ہے.....

(تمہارا شہر)

اگر مندرجہ بالا سطور کے مقابلہ میں جو "لہو پکارتا ہے" سے اقتباس کی گئی ہیں سردار جعفری کے ابتدائی دور کی نظموں کے شعری لہجہ کا مقابلہ کریں جو جوش کے تتبع میں ہے تو ایک واضح فرق نظر آتا ہے سردار جعفری نے اپنی نظم "ترقی پسند مصنفین" میں اقرار کیا تھا۔

کھول دیں سب کے لئے قفل در میخانہ
حضرت جوش کو سر حلقۂ رنداں کر دیں

بلکہ اسی لئے "پرواز" کی نظموں اور ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۶ء تک کی نظموں پر جوش کا رنگ چھایا ہوا ہے "بغاوت" اس طرح شروع ہوتی ہے۔

بغاوت میرا مذہب ہے، بغاوت دیوتا میرا
بغاوت میرا پیغمبر، بغاوت ہے خدا میرا
بغاوت رسولی سے لکشمی سے بھیم وارجن سے
بغاوت دیویوں اور دیوتاؤں کے تمدن سے

"قیدی کی موت" اور "لیسنٹ" میں بھی یہی رنگ غالب ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ نظم "گفتگو" بمبئی کے ترقی پسند ادب میں شامل ہے۔ "سردار جعفری کے خطوط سلطانہ کے نام" میں سردار آخری خط ۱۹۴۹ء میں لکھتے ہیں۔

"اب سکون ہے اور سناٹا۔ نئے نئے شعری پیکر ڈھل رہے ہیں جن سے ہماری شعری روایت بالکل بیگانہ ہے۔ جیسے۔ شام کی آنکھ میں بارود کے کاجل کی لکیر۔ رائفل کرتی ہے فولاد کے ہونٹوں سے کلام۔ گولیاں کرتی ہیں سیسے کی زباں سے باتیں۔ بارود کا کاجل، فولاد کے ہونٹ، سیسے کی زبان اردو کی نازک مزاجی اس انداز بیان کو کیسے برداشت کر سکے گی یہ خم شمشیر۔ تیر نگاہ اور پیکان یار سے کس قدر مختلف ہے۔ اردو والوں کو میری شاعری سے مانوس ہونے میں دقت لگے گی۔ لندن والوں نے تو اب تک اقبال کو بھی قبول نہیں کیا ہے جس کی ساری شعری روایت کلاسیکی ہے۔

(گفتگو، ترقی پسند ادب نمبر جلد اول ۱۹۸۰)

گفتگو کے ترقی پسند نمبر میں سردار کے سولہ خطوط شامل ہیں۔ یہ خطوط آرتھر روڈ جیل بمبئی اور سینٹرل جیل ناسک سے تحریر

کئے گئے ہیں خطوط کے ساتھ شامل نظمیں، پتھر کی دیوار، تمہاری آنکھیں، جیل کی رات، شادی کا دن، نیند اور اودھ کی خاک حسین (نامکمل) جوش ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں ان نظموں میں جوش کی طرح کفایت لفظی پر زور نہیں ہے۔ ہرچند کہ یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ جسے تکرار سمجھا جا رہا ہے وہ مختلف زاویے angles ہی تھے۔ جوش سے سردار جعفری کو خاص نسبت ہے اور "لہو پکارتا ہے" میں بھی ایک غزل نذرِ جوش ہے۔ جوش کے ساتھ صرف نظریہ کا ہی رشتہ نہیں طرزِ ادا کا بھی رشتہ ہے اور اس قدر گہرا رشتہ کہ شاید ہی کوئی دوسرا ہم عصر جوش سے اس قدر متاثر ہوا ہو جس قدر کہ علی سردار جعفری۔

وہ صبحِ گل، وہ جوشِ شام یاد ہے کہاں ساقی
نہ جشنِ دل، نہ فصلِ روح سازہ ہے یہاں ساقی
حیات تو گریباں چاک پیراہن دریدہ ہے
سحر کی روشنی پہ شعلۂ دل کا ہے گماں ساقی

علی سردار جعفری نے "لہو پکارتا ہے" میں شامل ۱۹۶۵ء کی شاعری کے بعد ہی جوش کے اثرات سے باہر نکلنے کی کامیاب کوشش کی یہی وہ موڑ ہے جب ان کے یہاں تشبیہ کے مقابلے میں استعارہ اور روایت کے مقابلے میں ایمائیت کے لئے شیفتگی کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے "تو بہر مرا گہوارہ" جو غالباً ابھی تک نامکمل ہے اس دائرہ کی تکمیل کرتی ہے میرا خیال ہے کہ سردار جعفری نے اس عرصہ میں پابلو نیرودا اور بھگتی تحریک کے شاعروں کا سب سے زیادہ اثر قبول کیا ہے۔

انہوں نے اس عرصہ میں میر تقی میر اور مصحفی پر بھی گہری نظر ڈالی ہے پوری شیفتگی اور سپردگی کے ساتھ جب کبھی بھی سردار کے پایہ کا شاعر جوش کی گھن گرج سے کبیر، میرا اور میر کی آہ سپردگی کی نرم اور گداز لہروں کی طرف آئے گا تو پھر وہ لازمی طور پر اسی دلکشی کی طرف منعطف ہوگا جو ترقی پسند شاعروں میں فیض احمد فیض سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے شاید اس لئے کہ فیض بھی مندرجہ بالا شعراء سے متاثر ہیں ان کے یہاں روسیتی اور سوئن برن کے اثرات کے علاوہ "میٹا فزیکل" شاعروں کے اثرات مستزاد ہیں۔ سردار جعفری فیض کے علی الرغم، موجودہ دلکشی کی طرف ڈھلتی عمر کے زمانے میں آئے ہیں اور حق تو یہ ہے کہ وہ بہت جم کر آئے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ جیسے سردار جعفری نے اپنے شعری اظہار میں جلال و جمال کی دونوں کیفیات کا اعلیٰ صد فیصد آمیزہ حاصل کر لیا ہے۔

موجودہ دور علی سردار جعفری کی شاعری کا خوبصورت ترین لمحہ ہے۔ ایک ایسا لمحہ جس کی فسوں کاری جس قدر مؤثر ہے اسی قدر دلنشین بھی۔ اگر مرزا احمد آج زندہ ہوتے اور علی سردار جعفری کے چند مرحوم ناقدین بھی تو وہ سردار جعفری کے بارے میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو جاتے اگر اب بھی کچھ ناقدین علی سردار جعفری کی شاعری کو دورِ جلال کے "اجنبی" (یعنی کھردراہٹ) دلکشی کی شاعری سمجھتے ہیں تو پھر وہ اس بہت ہی مانوس اور مترنم دلکشی کا جمال محسوس کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کا سردار جعفری کے یہاں فی الوقت وفور ہے۔ یہ مناسب تو نہیں لیکن ناقدین کے اس غیر لچک دار رویہ کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک نقطہ پر آ کر رک گئے ہیں جب کہ سردار جعفری کا فنی دور بلکہ بہت دور نکل گئے ہیں۔ ان شاعروں کی صفوں میں جو اپنے دور کی سچائی کو اور فنی بلندیوں کو پہچاننے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ میں اس مضمون کا اختتام سردار جعفری ہی کی مندرجہ ذیل سطور پر کرتا ہوں۔

لرزہ گلچینوں پہ طاری ہے وہ گلشن ہے یہی
بجلیوں سے جو جلا ہے وہ نشیمن ہے یہی

عزیز قیسی

سردار جعفری کی نظمیں

سردار جعفری پر لکھنا بہت جی داری کا کام ہے جسے سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے۔

سردار جعفری پچاس برس سے اردو کے بہت اہم اور ممتاز شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت لکھا ان پر بھی بہت لکھا گیا۔ اردو میں، اردو کے علاوہ دنیا کی اور کئی زبانوں میں ان کی شاعری کے ترجمے ہوئے۔ شعر کے علاوہ ان کی تنقیدیں، تقریریں، دوسری کتابوں کے دیباچے تقریظیں کئی رسالوں کی ادارتی تحریریں، ان کی تشریحات اور مرتب کردہ کتابوں کے حواشی سب ہی اہم تحریریں ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں اور تنظیم کے سرکردہ لوگوں میں ہیں۔ وہ تحریک کی تبلیغ و ترویج کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے اور اب تک ہیں۔ اور اس سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، مخالفین کے طعن و تشنیع سے لے کر اتہام تک سہتے رہے۔ ستم بھی رہے اور مستحسن بھی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں ادب کے ایوانوں میں موضوع بحث رہے۔ مقبول بھی رہے اور متنازعہ فیہ بھی۔

ان کی شاعری ان کی تحریریں، اور ان کی شخصیت ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے۔ کمیونسٹ تحریک سے ان کی وابستگی اور اسکو بڑھاوا دینے میں ان کا حصہ ان کی "سابقون الاولون" کی طرح پارٹی لائن سے استوار وابستگی کا جائزہ، ایسے کہ ان کا حق ادا ہو مجھ جیسے بے آدمی کے لئے ممکن نہیں۔ جعفری صاحب سے کئی باتوں میں مجھے اختلاف رہا ہے، اب بھی ہے اور اپنی کم حیثیتی کے باوجود اختلافات کے حق کو میں اپنا حق سمجھتا ہوں اور یہ حق محفوظ رکھتا ہوں۔ نظریات کے سلسلے میں ادب اور فن کی بحثیں ہوتی رہی ہیں، ہوتی رہیں گی، بقول جعفری صاحب کہ "گفتگو ختم نہیں ہوگی بات سے بات چلتی رہے گی" میں اپنی نسل کے دوسرے ساتھیوں کی طرح جعفری صاحب سے متاثر رہا ہوں اور اس کا اعتراف کھلے بندوں کرتا ہوں۔ کچھ دوستوں کی طرح ہٹ دھرمی اور کج روی کا شکار نہیں ہوں۔

میں اور میرے ساتھ کے شاعروں میں بیشتر آج اس اعتراف سے کتراتے ہیں۔ جعفری صاحب اور ان کے ہم عصروں اور ہم عہد شاعروں سے سراسر متاثر تھے اور ان کے موضوعات ان کے پیرایۂ اظہار ان کے لہجے کی نقل کرتے تھے۔ مخدوم، جذبی، جاں نثار اختر، کیفی، مجروح سلطان پوری، نیاز حیدر، وامق جونپوری اور کئی ایسے شاعر تھے جن کے تتبع میں ہم نے اپنی شاعری کا اولیں حصہ تخلیق کیا ہے۔ اور یہ اعتراف کہ ہم اپنے پیش روؤں سے متاثر ہوئے، کوئی کمتری کا اظہار نہیں

ہے بلکہ ایک فطری امر ہے۔ اس دور کے شعراء خود غالب، اقبال، انیس و میر اور جوش ملیح آبادی سے متاثر تھے اور جوش و اقبال جن کے انداز کلام نے ایک نئی نسل کو متاثر کیا، خود اپنے پیش روؤں سے متاثر ہے

۱۹۴۸ء ۱۹۴۹ء میری زندگی کے اہم سال ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن ہوا اور ۱۹۴۹ء ہماری قومی زندگی کا بھی اہم سال ہے اس لئے کہ ۱۹۴۹ء میں ہندوستانی ری پبلک کا دستور مرتب ہوا۔ یہ دو برس میرے لئے اس لئے اہم ہیں کہ ان دنوں میں پہلی بار کمیونسٹ تحریک سے روشناس ہوا۔ حیدرآباد دکن کو انڈین یونین میں شامل ہوئے صرف ایک برس گزرا تھا اور انڈین یونین کے پولیس ایکشن کو حیدرآباد دکن کے فرقہ پرست نظام کے استیصال کے لئے ایک نجات دہندہ اقدام کا نام دیا گیا تھا اور نجات دہندگی کی یہ سعادت جن مبارک لوگوں کو ملی وہ آزاد ہندوستان کے قومی رہنما تھے جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں بدیسی حکمرانوں کی جگہ لے لی تھی۔ اس وقت سارے عالم میں اس بات کا پرچا تھا کہ ہندوستانی حکومت نے اپنی فوج حیدرآباد کی رجعت پسند فرقہ وارانہ ریاست اور رضاکاروں کی جنونی سیاست کو فرو کرنے کے لئے بھیجی ہے۔ کمیونسٹ تحریک کے رہنما بھی اس پولیس ایکشن کو پہلے پہل اسی تناظر میں دیکھتے تھے۔ لیکن جب نجات دہندہ فوجوں کی بندوقوں کی زد میں تلنگانہ کے کسان آئے۔ سیکڑوں نوجوان مارے گئے۔ جیلوں میں بند ہوئے۔ ان کی آنکھیں پھوڑ دی گئیں، ان کے ہاتھ کاٹ دئے گئے اور ان جیالوں اور بے زمین کسانوں کو اس مٹی میں دبا دیا گیا جس مٹی کے حصول کے لئے انہوں نے زمینداروں اور جاگیرداروں سے اور نظام کی فوج سے لوہا لیا تھا تو اس پولیس ایکشن کا کردار مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر کھلا جو اس وقت کالجوں اور مدرسوں میں تھے اور اس پولیس ایکشن کی اتھل پتھل کی وجہ سے اپنے ماموں گھروں سے باہر نکال دئے گئے تھے اور سیاستدانوں کے قبیح اعمال کی سزا بھگت رہے تھے اور اپنی ناکردہ گناہی کی بےبسی کا اظہار منفی اور سلبی طریقے پر قومی حکومت اور قومی رہنماؤں کی بےزاری اور نفرت کے ذریعے کر رہے تھے

۱۹۴۹ء وہی سال ہے جب سردار جعفری کی کتاب "خون کی لکیر" منصۂ شہود پر آئی تھی اور اس کا منظوم دیباچہ اپنی طرف ہمیں کھینچتا تھا:

زندگانی کی اندھیری رات میں
درد اور دکھ کی بھری برسات میں
لے کے اک ماہِ تمام آیا ہوں میں
میکشو آتش بجام آیا ہوں میں
حسن معنی ہو رہا ہے بے نقاب
اٹھ رہے ہیں اشعار وں کے حجاب
آشکارہ تیغ کا جوہر ہے آج
کسوتِ مینا سے مئے باہر ہے آج
خون پیمانوں میں اب ڈھلتا نہیں
اب امیری کا فسوں چلتا نہیں
زلزلہ ہے ظلم کی بنیاد میں
تھلکہ ہے قصرِ استبداد میں

[redacted]

دم مخدوم میں قیصرِ فغفور آج
تیز ترہے نغمۂ جمہور آج
حلقۂ زنجیر گھٹنے ہی کو ہے
زندگی کروٹ بدلنے ہی کو ہے

ان دنوں ترقی پسند شعرا کی اکثریت حیدرآباد میں قیصرِ فغفور کی طرح دم مخدوم تھی کچھ محبوس تھے، کچھ جیلوں میں تھے روپوش تھے اور پولیس ایکشن اور اس سے پہلے کی ہنگامہ خیزی کی اڑائی ہوئی دھول ابھی بیٹھی نہیں تھی۔ میں اور میرے ہمعصر جب اپنی عمر کی بے شعوری کے خواب سے بیدار ہوئے تو بندوقوں کے دھماکوں، خون ریزیوں، قدغن و گیروداری سے دو چار ہوئے۔ ایسے ہی جیسے کوئی نیند سے اٹھے تو دیکھے اس کا گھر جل رہا ہو۔ ان دنوں ہم پر قیامت کا طاری تھا۔ تلنگانہ کی مسلح جدوجہد جسے بعد میں خود کمیونسٹ پارٹی نے Individual Terrorism کا لیبل دیا تھا ان دنوں شباب پر تھی۔ خون گرم تھا، نسیں کشیدہ تھیں اور لاوا سا سینوں میں بل کھا رہا تھا۔ ہم نے شاعری شروع کی مخدوم کے علاوہ ۔ جنہوں نے بہت کم لکھا تھا۔ لیکن جن کو حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر بھی سرخیلِ انقلاب اور کمانڈر کہا جاتا تھا۔ سردار جعفری کی شاعری اور شخصیت میں ایک سرکش اور بے باک انقلابی کا image نظر آیا۔ ان دنوں جعفری کی "خون کی لکیر" نے ترقی پسند تحریک میں شامل پورے ادبی ماحول کو متاثر کیا۔ ان کا لہجہ، ان کا بے نیازیٔ گفتار، ان کی سوچ نے لیا اور ایک پوری نسل اس آواز کے سائے میں پروان چڑھتی رہی

جعفری صاحب کی نظم "تلنگانہ کے بارے میں" کا ایک بند ہے۔

بوڑھے ہونٹوں سے جوانوں کو دعا ملتی ہے
انگلیاں پیار سے بندوق کو سہلاتی ہیں
گھر میں ڈھالے ہوئے بم گووں کی پیشانی کو
عورتیں پھول سے صندل سے سجا دیتی ہیں
مائیں بچوں سے یہ کہتی ہیں کہ اکرام کرو
دیوتا آئے ہیں پرنام کرو

ہم کو سردار جعفری ہماری روح کے نزدیک رجز خواں معلوم ہوئے۔ اگرچہ ہم تلنگانہ کی مسلح جدوجہد میں "دلم" میں نہیں۔ اگرچہ ہم ادبی محاذ پر کمیونسٹ تحریک کے اس ابھار اور ابال کے ترجمان و مبلغ تھے لیکن ۔۔ ہماری کیفیت ایسی ہی تھی۔

خبریں جب آتی ہیں کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے لاش
گود میں جنگ کے ٹوٹے ہوئے ہتھیار لئے
بہر کے چلو میں شہیدوں کے لہو کی بوندیں
وہ مری روح کے چہرے پہ چھڑک دیتی ہیں
اور مرے سینے میں اک آگ سی لگ جاتی ہے
میرا ہر قطرۂ خوں مجھ سے یہ کرتا ہے سوال

بڑھو ہم جنگ کے میدان میں کب اتریں گے
اس سعادت کی حسین راہ سے کب گزریں گے

ایک طرف ۱۹۴۲ء میں مسلح جدوجہد کے طوفانوں کی پرورش تھی۔ دوسری طرف پورے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کمیونسٹ پارٹی کی سربراہی میں ہماری آزادی کو فریب کہہ رہی تھی اور وہ آزادی جو تصور میں تھی، انقلاب جو ایک خواب کی صورت دلوں کو گرماتے ہوئے تھا جو یہ کہلواتا ہے

آسمان پر چمکتے ہوئے صبح آزادی کے سورج
تو ہمیں دور سے کس لئے دیکھتا ہے
آ ہماری زمین پر اتر آ
تیرے سینے میں وہ روشنی وہ حرارت نہیں
جو ہمارے دلوں میں ہے
ترے ماتھے پر یہ رنگ شفق
اور ہمارے شہیدوں کا خون

انہیں آزادی کا حصول اب اک سازش، سامراج کی سازش لگتا تھا۔

"کون آزاد ہوا
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں سے گزرنے کے لئے"

اس زمانے میں آزادی کے سلسلے میں یہ نظریہ کمیونسٹ پارٹی کے توسط سے ترقی پسند تحریک کا پسندیدہ نعرہ تھا۔ اور بیشتر بلکہ سبھی شعراء اسی لائن پر آزادی کے خلاف نعرہ زن تھے یا اداس و غمزدہ تھے۔

جعفری صاحب نے جب شاعری شروع کی تھی تو ہندوستان کی قومی تحریک ایک ہمہ پہلو اشتعال اور اضطراب سے معمور تھی۔ یہ شاعری احتجاج کی شاعری تھی agistational شاعری تھی اور اس وقت ایسی ہی شاعری کی ضرورت تھی۔ اس وقت جوش کے دبدبے، گھن گرج اور اقبال کے حرکت و عمل کے پیغام کا دور دورہ تھا۔ چنانچہ جعفری صاحب کی شاعری میں (چاہے وہ رومانی ہو یا مسائلی انہیں موضوعات یا موضوعات کے برتاؤ لفظوں کے انتخاب میں) مقصدیت یا تبلیغ کا انداز تھا۔

عام ہو غالب و اقبال کی رعنائی فکر
بے زبانوں کو زباں دے کے زباں داں کر دیں
کھول دیں سب کے لئے قفل در میخانہ
حضرت جوش کو سر حلقۂ زنداں کر دیں

میں تجھ کو بھول گیا اس کا اعتبار نہ کر
مگر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

خراج اپنی جوانی سے لے رہا ہوں میں
سفینہ خون کے دریا میں کھے رہا ہوں میں
صدا اجل کے فرشتوں کو دے رہا ہوں میں
بس اب نوازشِ پیہم سے شرمسار نہ کر
نہ کر خدا کے لئے میرا انتظار نہ کر

وہ زیرِ افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
جلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ القدس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے
یہ خدا یہ دیوتا دو روز ہی رہ پائیں گے
جہل سے پیدا ہوئے ہیں علم سے مر جائیں گے

سرمایہ دار لڑکیاں:

عشق کے ذوقِ افکار نے نکھارا ہے انہیں
مرد کی صدیوں کی محبت نے سنوارا ہے انہیں
ڈوب تو سکتی ہیں یہ لیکن ابھر سکتی نہیں
یہ کنارِ ہوس کی حد سے گزر سکتی نہیں

روحِ آزادی کو سینوں میں جکڑ سکتا ہے کون
ناچتے سورج کی کرنوں کو پکڑ سکتا ہے کون

جعفری صاحب نے اپنے ایک تازہ مضمون میں جو ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری کے عنوان سے چھپا ہے لکھا ہے کہ "ہمارا ہندوستانی جمالیاتی نظام تو بنیادی انسانی جذبات پر مبنی ہے جنہیں رس کہا جاتا ہے۔ ان رسوں میں غصے اور نفرت کو بھی جمالیات کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ غصے اور نفرت کو آپ اچھا کہیں یا برا، پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ انسانی جذبات ہیں اور اس حیثیت سے شاعری میں ان کی جگہ ہے۔ میں نفرت کا پرچار کرنا نہیں چاہوں گا لیکن شاعری میں اسکے اظہار کو جائز سمجھتا ہوں اور یہ کہ اگر اس کا ہدف ظلم اور جبر ہو تو یہ جذبہ مقدس بن جاتا ہے۔ نفرت کا یہ شعلہ مہابھارت اور فردوسی کے شاہنامے کے صفحات میں بلند ہوتا ہے۔ ترقی پسند شاعری میں اس کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

پھونک دو کالے فرنگی کے صنم خانے کو
کھود کر گاڑ دو بزدلی کے افسانے کو
آج جاتی ہے ہر اک راہ تلنگانے کو
قافلے کر نہیں سکتے کسی منزل پہ قیام — ساتھیو لال سلام

گاؤ گاؤ گرجتے ہوئے بادلوں کی طرح   گاؤ گاؤ کڑکتی ہوئی بجلیوں کی طرح
آندھیوں کی طرح زلزلوں کی طرح   گولیوں کی طرح اپنے الفاظ دشمن پہ برساؤ
سارے عالم پہ چھا جاؤ
کاٹنا پڑتا ہے تلوار کو تلواروں سے   اپنی طاقت کو ذرا اور بڑھانا ہوگا
ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب   جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہوگا

یہ جلال کی شاعری، اس ملک کے ہیجانی دور کی شاعری سے مملو ہے اور جعفری صاحب کی شاعری کا معتد بہ حصہ اسی رس کا اظہار ہے اور ظلم اور جبر سے نفرت کا شعلہ، ان کی شاعری اور ان کی تحریروں میں جگہ جگہ زندہ و درخشندہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ظلم، نفرت اور غصے کی بنیاد، انصاف کی آرزو، محبت اور زندگی کی شدید محبت ہے۔ جعفری صاحب نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے ؎

مری نگہ میں

مری نگہ میں بسے ہوئے ہیں   ہزار انداز دل ربائی
میں اپنے سینے کو چاک کر کے   اگر تمہیں اپنا دل دکھادوں
تو تم کو ہر زخم کے چمن میں   ہزار سرو رواں ملیں گے
اداس مغموم وادیوں میں   ہزار ہا نغمہ خواں ملیں گے
مرے عزیزو، مرے رفیقو   مری کمیونزم کچھ نہیں ہے
یہ عہد حاضر کی آبرو ہے   مری کمیونزم زندگی کو
حسین بنانے کی آرزو ہے

جعفری صاحب کی "خون کی لکیر" اور "پتھر کی دیوار" کی شاعری میں ظلم و استبداد سے نفرت کا شدید اظہار ہے۔ اور یہ اظہار ایک جارحانہ الفاظ کی یلغار معلوم ہوتا ہے اور موشگافی و گداختن کی جگہ شعلہ افگنی اور شعلہ فشانی کا مظہر ہے۔ جس حساس دل کے لیے پورا ملک ایک پتھروں کا اور پتھر والوں کا قید خانہ معلوم ہو اور جس کو ہر لمحہ یہ احساس ہو کہ انسان کی تذلیل و تحقیر کا ذلیل کھیل ہر جگہ کھیلا جا رہا ہے۔ استحصال، ننگے روپ میں انسانی قدروں کو، انسانی جذبوں کو پامال کر رہا ہے۔ وہاں یہ غصہ اور نفرت فطری ہیں۔ جو لوگ اس شاعری کی کاٹ کو برداشت نہیں کرتے وہ کہیں نہ کہیں اس ظلم و جبر کے نظام کو بے ارادہ یا اِرادۃً گوارہ اور خوشگوار سمجھتے ہیں۔ جعفری صاحب اپنے نفرت اور غصے کے اظہار میں بے باک ہیں۔ انہیں اس کی بھی پرواہ نہیں کہ فن اور آرٹ کے پارکھ، جمالیات کے مبلغ اور شائستہ ذوق کا نقاب چہروں پر لگائے ہوئے متین و سنجیدہ لوگ انہیں کل یاد نہ رکھیں۔ وہ کہتے ہیں:-

"مجھے یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ ہر شاعر کی شاعری وقتی ہوتی ہے۔ کوئی اور اسے نہ مانے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم اگلے وقتوں کا راگ الاپیں گے تو بے سُرے ہو جائیں گے۔ آنے والے زمانے کا راگ جو بھی ہوگا وہ آنے والی نسلیں گائیں گی۔ ہم تو آج کا راگ چھیڑ سکتے ہیں۔

کوئی فنکار اپنے بارے میں کچھ بھی کہے کوئی بھی رائے دے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کا فن اس کے اعلانات اور معتقدات پر پورا نہیں اترتا۔ فن ایک پیچیدہ عمل ہے جسے فنکار اپنے عقائد پر منطبق کرنے کی لاکھ کوشش کے باوجود منطبق نہیں کر سکتا جعفری صاحب نے "پتھر کی دیوار" کے دیباچے میں جو کچھ بھی لکھا ہے خود ان کا یہ مجموعہ کچھ اور کہتا ہے۔ اسی مجموعے میں جہاں ان کی نفرت اور غصے کے رس کی شاعری ہے وہیں دوسرے رس کی بہت اچھی نظمیں ہیں اور غصے اور نفرت کے علاوہ۔۔۔ دوسرے رسوں کے ٹکڑے جا بجا ملتے ہیں۔ جلالی نظموں میں جمال اور جمالی نظموں میں جلال کی آمیزش جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

"خون کی لکیر" کی آزاد نظمیں، "پتھر کی دیوار" جعفری صاحب کی کتابوں میں میرے خیال میں سب سے اہم کتابیں ہیں۔ "خون کی لکیر" آزاد نظمیں، "پتھر کی دیوار" اور "ایشیا جاگ اٹھا" کا نقطۂ آغاز ہیں۔ ان نظموں میں جعفری صاحب کا اپنا لہجہ مخصوص انتخاب الفاظ اور image کا سراغ ملتا ہے اور ۱۹۳۶ء میں جس شاعر نے آزاد نظم کے بارے یہ لکھا تھا۔

"ردیف، قافیہ اور بحر کی یک رنگی ایشیائی شاعری میں ایک ایسی چیز ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔ بعض نوجوان ہے یہ جا قیود کا نام دیکر مغرب کی تقلید میں بلینک ورس کی طرف راغب ہو گئے ہیں اور ایسی چیزیں پیش کر رہے ہیں جو اردو ادب کے دامن پر بدنما دھبہ ہیں۔"

وہ ایک اسلوب اور لہجے کو آزاد نظموں میں فروغ دینے لگا جس کی تقلید ایک نسل نے کی اور یہ صنف سخن معتبر ہوئی۔ ان کی شاعری کا نیا اور تابناک پہلو "پتھر کی دیوار" میں بہت نمایاں ہو کر آیا ہے۔ ان کے صوری، بصری، سماعی اور حسی (images) مرئی مظاہر کی مرئی تجسیم، غیر مرئی جذبات کا تشخص، ان کی "پتھر کی دیوار" کی بیش تر نظموں میں ملتا ہے جو بعد کو جعفری صاحب کی پہچان بن گیا۔

پتیوں کی پلکوں پر اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر دھوپ پر سکھاتی ہے
منزلوں کے زخموں سے پیپ سی ٹپکتی ہے
پتھروں کے سینے سے سرخ ہاتھ اگتے ہیں

ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں　　سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی　　آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں

روٹیاں چکلوں کی قحبائیں ہیں　　جن کو سرمائے کے دلالوں نے
نفع خوری کے جھروکوں میں سجا رکھا ہے
قیمتیں کالی دکانوں پہ کھڑی رہتی ہیں　　ہر خریدار کی جیبوں کو کترنے کے لئے

ایسی تصویریں ان کی شاعری میں بے شمار ہیں۔ رفیعہ شبنم عابدی نے ایک طویل مضمون اس بارے میں لکھا ہے جو ان کی کتاب "نظر نظر کے چراغ" میں شامل ہے جس پر رائے دیتے ہوئے ظ انصاری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "کام کا مضمون جیسے

"ایشیا جاگ اٹھا" اور "نئی دنیا کو سلام" میں نے اپنے اس مطالعے میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ یہ دونوں طویل نظمیں اپنی جگہ الگ نوع کی نظمیں ہیں جو ایک تفصیلی مضمون کی متقاضی ہیں۔

ایک بار سے زیادہ پڑھا جا سکتا ہے سردار جعفری کی شاعری کے بارے میں ہے۔ یہ ایک ایسا مضمون ہے جسے وہ اور پھیلاتیں تو پوری کتاب بن جاتا اب بھی اس کتاب پر حاوی ہے۔"

جہاں ان کی نظموں میں ایسے جلالی تیور ہیں۔"

انہیں یہ حق ہے کہ کارخانوں کو جیل بنا کے رکھ دیں
کسان کے کھیتوں کو نیلام پر چڑھا دیں
زمین سے انسانیت کا سارا رواج اٹھا دیں
وہ رات کے وقت آکے نیند اور میٹھے خوابوں کو قید کر لیں
وہ بھوک کو جرم پیاس کو اک گناہ کہہ دیں
ہر انسان پر سانس لینا حرام کر دیں

یہ ان کا حق ہے جو حکمراں ہیں
ہمارا حق بھوک بے بسی، مفلسی جہالت خود اپنے سینے کی آگ اپنے لہو کا طوس، اپنے زخموں کی پاسبانی

وہیں نیند، شادی کا دن، تمہاری آنکھیں، جیل کی رات اور تجدید وفا، جیسی جمالی نظمیں بھی ہیں

رات خوبصورت ہے نیند کیوں نہیں آئی

نیند مری آنکھوں سے بے وفائی کرتی ہے   مجھ کو چھوڑ کر تنہا جیل سے نکلتی ہے

بستی میں /میرے گھر کا دروازہ / جا کے کھٹکھٹاتی ہے / ایک ننھے بچے کی
میٹھے میٹھے خوابوں کا نہر گھول دیتی ہے۔
نرم نرم گالوں کو / گرم گرم آنکھوں کو / جھک کے پیار کرتی ہے / لوریاں سناتی ہے / پالنا ہلاتی ہے۔

جعفری صاحب کی پابند، مقفیٰ نظموں کے تناظر اور تقابل میں ــــــ اگر ان کی آزاد نظمیں دیکھی جائیں تو یہ بات بالکل واضح ہوتی کہ Imagery کا یہ استعمال جعفری صاحب کا منفرد انداز ہے اور اس انداز نے اردو میں آزاد نظم کو اعتبار کا درجہ دیا ہے اور ان کی بیش تر طویل نظمیں epic poetry کے قریب ہو گئی ہیں۔

سحر کی رنگین وادیوں میں سیہ بگولے مچل رہے ہیں
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں
ہرے بھرے کھیت گرم شعلوں کے پیرہن سے دہک رہے ہیں
شگوفے لپٹے ہوئے دھوئیں کے سیہ کفن میں سسک رہے ہیں
کٹے ہوئے ہاتھ اپنی باہوں سے رہ رہ کے کٹ کے چھوٹتے ہیں
پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں

چھدی ہوئی دھرم اور مذہب کے خنجروں میں ماؤں کی لاشیں
کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خون بن کے رس رہا ہے

۱۹۴۷ء کے بعد جعفری صاحب کو جب اس حکومت نے زنداں کی دیواروں میں محبوس کر دیا تو ظلم و جبر سے ان کی نفرت شدید ہو گئی ——— ناانصافیوں پر ان کی برہمی سخت ہوئی ——— اور ساتھ ہی ساتھ زندگی اور اس کے حسن سے ان کا پیار بھی شدید ہو گیا ——— پتھر کی دیواریں' یہ دونوں رس پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں دونوں رسوں کا متوازن اظہار جگہ جگہ ہے ۔

انجم و مہتاب کے سائے میں جب آئیگی رات
نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائیگی رات
مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح
آنچلوں کے ریشمی شکنوں میں سرسرائے گی رات
جرعہ جرعہ کر کے دردِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کر کے پیمانوں میں ڈھل جائیگی رات

میری بہن نے مجھے لکھا ہے / ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں / پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں / ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہی ہیں / . . . . میں رات کے وقت چونک پڑتا ہوں / جیسے مجھ کو / ادھر کی مٹی بلا رہی ہے / میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں / جو ہو سکے تو لودھو کی پیاری زمین کو گود میں اٹھا لوں اور اس کی شاداب اور لہلہاتی جبیں کو / ہزاروں بوسوں سے جگمگا دوں ۔

صدی کی اور درد کے ساتھ اداس آرزوؤں کی پرچھائیاں کئی جگہ پر ابھرتی نظر آتی ہیں ۔

۱۹۵۳ء میں انہوں نے لکھا تھا کہ مجھے اس پر ناز ہے کہ میں اس صدی کا شاعر ہوں جو ہزار ہا برس پرانے خوابوں کے تعبیر کی صدی ہے ۔ مری نظروں کے سامنے یہ دنیا بن رہی ہے ۔ سنور رہی ہے ۔ مری نظروں کے سامنے انسان کی تخلیق ہو رہی ہے . . . . یہ دل فریب نظارہ، اس صدی کے پہلے شاعروں کو کہاں نصیب تھا ۔

اے زمیں اے آسماں ، اے آفتاب و ماہتاب اے جلال عصر حاضر اے ہولِ انقلاب' اے مقدس وید' اے انجیل اے ام الکتاب آج پورا ہو رہا ہے عظمت انساں کا خواب ۔

اک نئی جنت میں اب آدم کو گھر مل جائے گا سیکڑوں صدیوں کی محنت کا ثمر مل جائے گا

وہ میلادِ آدمِ نو کے قصیدہ خواں ہیں، عہدِ آدمِ نو کے رجز خواں ہیں۔ سوویت انقلاب، چین کے انقلاب اور ساری دنیا کے محنت کشوں کی جد و جہد پر ان کا ایمان ہے کہ وہ دنیا کو بدل دے گی ۔ اس لئے ان کی شاعری کا آہنگ پُرجوش، لہجہ تیز اور دلکش پُرشکوہ ہے۔ اقبال اور جوش کی طرح ——— گگارین کی پرواز پر ان کی نظم میں اسی شکوہِ لفظی کی گونج ہے ۔

مژدہ ہو مہ جبینانِ افلاک کو بزمِ گیتی کا صاحب نظر آگیا
تہنیت حسن کو بے نقابی کی دو دیدہ ور آگیا پردہ در آگیا
(نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد) (اقبال)

اقبال کے لہجے کی یاد دلاتی ہے اور کئی نظمیں جوش کی نظموں کے ہیئت، و ترکیب لفظی کی گونج معلوم ہوتی ہیں —— زندگی کے تسلسل پر انہیں پورا یقین ہے۔

ہر منزل اک منزل ہے اور آخری منزل کوئی نہیں
اک سیل رواں دور حیات اور درد کا ساحل کوئی نہیں

موت اور زندگی

اپنی گڑیا سے مگر کھیل رہا ہے یہ کون
مجھ کو جیسے مری تصویر نظر آتی ہے
اس کی ننھی سی دمکتی ہوئی پیشانی پر
ایک کھوئی ہوئی تنویر نظر آتی ہے
اس کے چہرے پہ نرے حسن کی تابانی ہے
اس کی آنکھوں میں مچلتی ہے جوانی تیری
نرم سینے میں ایک موج نفس ہے بے تاب
لب معصوم پہ ہے نغمہ فشانی تیری
موت جب آکے کوئی شمع بجھا دیتی ہے
زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

ماں کی آغوش میں ہنستا ہوا اک طفل جمیل
جس طرح ذہن ازل میں ہو ابد کی تخئیل
دیکھ لیں وہ جو سمجھتے ہیں کہ فانی ہے حیات
زندگانی کے طرب ناک تسلسل کی دلیل

اسی خیال کو ایک اور پہلو سے ایک اور نظم میں انہوں نے پیش کیا ہے جو ایک سوویت سپاہی کے خط پر مبنی ہے جو محاذ جنگ سے اس نے اپنی محبوبہ کو لکھا ہے —— اور اس کی خوبصورت اور بہترین مثال اس کی نظم میرا سفر ہے۔ یہ اکیلی نظم اردو ادب کی بہترین نظموں میں ہے۔ چاہے جعفری صاحب کچھ ہی کہیں کہ شاعری وقتی ہوتی ہے۔ اس نظم کی امیجری، تسلسل، خیال، ایک شیریں لب ولہجہ، جعفری صاحب کے فنکارانہ فکر و نظر کا بے حد حسین اظہار ہے۔ میں ابدیت، عظیم قسم کے CLICHE استعمال نہیں کرتا اس لئے کہ یہ لفظ اپنی معنی کھو چکے ہیں۔

جعفری صاحب کی بعد کی شاعری جو پیراہن شرر سے شروع ہوتی ہے اور لہو پکارتا ہے تک آتی ہے۔ ان کی شخصیت کے ایک اور پہلو کی ترجمان ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ خواب اور شکست خواب اس دور کا مقدر ہے، اور میرے خیال میں خواب اور شکست ہر دور کا مقدر ہے۔ مارکسزم نے جو انسانی تاریخ کا پہلی بار جدلی مادیت کے ذریعہ تجزیہ کیا اور پہلی بار یہ احساس دلایا

کہ زندگی ہمیشہ بالتضاد ترقی کرتی ہے۔ ایک صورت اس کی داخلی ہے دوسری خارجی۔ ایک قوت اپنے بطن سے دوسری قوت پیدا کرتی ہے، ایک منفی قوت، ایک مثبت قوت۔ منفی مثبت کا کفارہ ہے اور مثبت منفی کا خمیازہ۔ انسانی تاریخ اور تہذیب انہیں متصادم و مخالف و متجانس دھاروں سے عبارت ہے۔ ایک وقت میں ایک سماج ایسی بالضد قوتوں کے عمل اور ردعمل سے جو ارتقاء کے راستے میں کبھی فتح مند ہوتا ہے کبھی پسپا، اور بقول جعفری صاحب کے

آج کے مظلوم کل کے ظالم بن جاتے ہیں

انہیں خارجی اور داخلی عوامل کا اثر فرد پر بھی پڑتا ہے جو انسانی سماج کی ایک اکائی ہے جو آزاد بھی ہے اور محکوم بھی۔ شاعر بھی بہ حیثیت فرد، بہ حیثیت شہری اور بہ حیثیت انسان انہیں اضداد کا مجموعہ ہے۔ چاہے وہ اپنے معتقدات و ایقانات کے بارے میں کچھ بھی کہے۔

ہر زمانے میں کئی زمانے ایک ساتھ زندہ موجود ہوتے ہیں۔ آج کے زمانے میں جب انسان آسمان شکار و یزداں گیر ہو چکا ہے۔ قرونِ اولیٰ کا وحشی اور پتھر کے زمانے کا نیم جانور بھی انسان میں موجود ہے۔ قوموں، قومیتوں ـــــ ملکوں اور تہذیبی گروپوں میں تاریخ کے ہر زمانے کی باقیات موجود ہیں۔ ایسے ہی افراد میں بھی ترقی، تنزل، وہم و یقین، نفرت اور محبت کی کئی دنیائیں آباد ہیں۔ ہر شخص ورق ناخواندہ ہے۔ دوسروں کے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔ ہر ذہن محشرِ خیال ہے۔ حقیقت کبھی ایک رخی نہیں ہوتی۔ ادراک و شعور کی ایک دنیا اگر موجود و مستور ہے تو وہم و قیاس، وجدان و تخیل کا ایک عالم بھی موجود و محسوس ہے۔

چھوڑ کر وہم و گماں حسنِ یقیں تک پہنچو
پر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ

اور جب زہرِ غم رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو تلخیِ کام و دہن کی منزل کے بعد دلِ گداختہ کی شائستگی کا دور آتا ہے اور جعفری صاحب کو یہ احساس ہوتا ہے کہ . . .

کم ظرفیٔ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیٔ دیدۂ تر ہے

غم میرا / دل میں رکھو / کس کو دکھاتے پھرتے ہو / یہ چوروں کی دنیا ہے۔

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا
باعثِ رشک ہے تنہا رویٔ رہروِ شوق
ہم سفر کوئی نہیں دوریٔ منزل کے سوا
ہم نے دنیا کی ہر اک شے سے اٹھایا دل کو
لیکن اک شوخ کے ہنگامۂ محفل کے سوا

بہتے ہوئے لمحات کے ٹوٹے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب

دہ بہ بہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

"پیراہن شرر" کے دیباچے میں جعفری صاحب نے لکھا ہے "میری یہ نظمیں جو پیراہن شرر پہنے کھڑی ہیں سیاسی دستاویزیں نہیں ہیں واقعات ان کی تخلیق میں کارفرما ضرور ہیں لیکن یہ واقعات کا بیاں نہیں ہیں بلکہ ان سے پیدا ہونے والے روحانی کرب کا اظہار ہیں" ـــــ اور آگے چل کر لکھتے ہیں "خارجی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد سیاسی جماعتوں کا اجتماعی عمل ہے لیکن انسانی روح کے داخلی نظام کی ترتیب و تربیت کی جدوجہد شاعروں اور دانش وروں کے حصے میں آئی ہے۔

اب جعفری صاحب ہیجان، نفرت، غصے اور خارجی تحریک و فعالیت کے علاوہ روح کے "داخلی نظام" کے احساس اور شائستگی دیدہ تر ـــــ اور شکستِ خواب کے لطف و کرب کی بات کرنے لگے ہیں۔

تخلیق شعر کا عمل بہت پیچیدہ و پُراسرار ہے اور خود شاعر کی ذات اس پر بے ارادہ، اپنی ہی تخلیق کے ذریعہ منکشف ہوتی ہے۔
میں اپنی اس بات کو آنند نرائن ملا کے پیش لفظ کے ایک طویل اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

"۔۔۔آج زندگی کا ہر فنکار سے خالی یہی تقاضہ نہیں کہ زندگی کی ناانصافیوں اور غلط نظریوں کی وجہ سے جو ان کی مشکلیں اور محرومیاں ہیں ان کو سمجھے بلکہ ان کے خلاف آواز بھی اٹھائے اور جہد بھی کرے۔ صحیح مفہوم میں آج کے شاعر کو مجاہد ہونا بھی ضروری ہے لیکن شاعر کا جہد میدان جنگ میں نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شاعر بھی تلوار اٹھالے لیکن اسکا یہ فعل بہ حیثیت ایک شہری کے ہوگا ـــــ بہ حیثیت ایک فنکار کے نہیں کیونکہ اصل لڑائی تو دلوں اور ذہنوں میں لڑی جارہی ہے اور تلوار اس نزاع میں کام نہیں دیتی۔ سردار کی زندگی میں ایک ایسا مقام آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردار کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار نہ اٹھالے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی۔۔۔۔ "پیراہن شرر" تک پہونچتے پہونچتے یہ قلم کی تلوار اب اس کے ہاتھ میں شاخِ گل بن چکی ہے۔"

مولانا آزاد سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا "زندہ رہا" ـــــ سردار جعفری کا یہ کارنامہ کیا کم ہے کہ پچاس برس سے وہ ادب میں سرگرم و فعال ہیں جبکہ ان کے ساتھی، ان کے بیش تر ہم عمر ہم عصر یا تو وقت کی بھول بھلیوں میں گم ہو گئے یا چپ ہو گئے اور گنج ہائے گراں مایہ خاکِ لئیم میں روپوش ہو گئے ہیں۔ شکر ہے کہ سردار جعفری ہم میں ہیں اور دلِ زندہ کے ساتھ زندہ ہیں۔ اور اتنے ہی سرگرم و فعال ہیں جتنے نوجوان ہوتے ہیں اور ان کے بعد کئی آنے والے بھی آشفتہ خیالی اور کم نگہی کی دھند میں گم ہیں۔ ان کی شاعری سیزموگراف کی طرح آج بھی بین الاقوامی اور قومی واقعات، حادثات کو جذباتی اور شعری ارتعاشات میں ریکارڈ کر رہی ہے۔

خلیق ابراہیم خلیق

چند معروضات

برادرم صہبا صاحب، معذرت خواہ ہوں کہ آپ کے اصرار کے باوجود، بعض ناگزیر مصروفیات کے باعث "افکار" کے "علی سردار جعفری نمبر" کے لئے کوئی سیر حاصل مضمون نہیں لکھ سکا۔ تاہم ان کے حوالے سے، ذاتی تاثرات پر مبنی مختصراً چند گذارشات قلم بند کر رہا ہوں۔ یہ کسی مبسوط و مدلل تنقیدی جائزے کا بدل تو نہیں ہو سکیں۔ اور انتقاد میرا منصب بھی نہیں ہے، لیکن قارئین کو سردار جعفری کے قد و قامت کا صحیح اندازہ لگانے کے سلسلے میں شاید ان سے کچھ مدد ملے۔

میں سمجھتا ہوں کہ علی سردار جعفری کی کثیر الجہات فنی شخصیت اور ان کے شاعرانہ اور علمی مرتبے کے اعتراف کا قرار واقعی حق ۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کے باوجود، ابھی تک ادا نہیں ہو سکا ہے۔ اس ضمن میں ایک بڑی رکاوٹ ہمارے نقادانِ شعر و ادب کی وہ سہل انگاری ہے جس کے تحت عام قارئینِ ادب میں سطحی اور گھسے پٹے انداز کے فقرے یا کلیشے (CLICHES) رواج پا جاتے ہیں۔ آج کل ایک کلیشے کا بڑا زور ہے۔ "غالب، اقبال، فیض" یہ مختلف ادوار کے تین شعرائے اعظم کو معنوی ارتقا کی ایک تثلیث میں پرونے کی ریت بھی ہمارے ہاں فارسی سے آئی ہے۔ فارسی کے کسی پرانے شاعر نے کبھی کہا تھا ؎

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبیَّ بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

اس کے اتباع میں ہمارے ایک شاعر نے کہا ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے	جن کے فیضِ طبع نے اردو کو گنجِ زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا، اک رفعتِ تخیل میں	تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا

یعنی میر، غالب اور اقبال۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ فارسی اور اردو شاعری نیز ہند مسلم تہذیب کے تناظر میں جب خسرو، غالب اور اقبال کو یا اردو شاعری اور اردو کلچر کے تناظر میں میر، غالب اور اقبال کو ایک معنوی تثلیث میں ہم رشتہ کیا جاتا ہے تو یہ ژرف نگاہی اور بالغ نظری پر مبنی ایک حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، مگر جب غالب اور اقبال کے ساتھ فیض کو منسلک کیا جاتا ہے تو کچھ عجیب سی بات لگتی ہے۔ اسے نہ تو مدرسے والے (یعنی SCHOLASTIC

رویّے پر محمول کیا جا سکتا ہے جس نے "میر کا کلام آہ ہے تو سودا کا واہ" جیسے کلیشوں کو جنم دیا ہے اور نہ کوئی اور جواز سمجھ میں آتا ہے۔ کہیں یہ اس گٹ بندی اور بددیانتی کا مظہر تو نہیں جو ہمارے زوال پذیر معاشرے میں مختلف النوع عصبیتوں نے پیدا کر دی ہیں۔ اقبال اور فیض کے درمیان جو دو بہت بڑے شاعر کھڑے ہیں یعنی جوش اور فراق یہ دونوں کہاں گئے؟ فراق اور جوش کو خود فیض نے "عصرِ حاضر کے میر اور سودا" کہہ کر خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ فیض گزر مدہ ہوتے تو اپنی اس تحسین ناشناس سے سخت آزردہ ہوتے۔ غالب اور اقبال اپنے اپنے عہد میں شعرائے اعظم تھے جبکہ فیض اپنے عہد کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ سچ پوچھیے تو ابھی وہ شاعرِ اعظم پیدا ہی نہیں ہوا جسے غالب اور اقبال کے ساتھ ایک نئی تثلیث میں شامل کیا جا سکے۔ میں اپنا شمار فیض کے مدّاحوں میں ہی نہیں ان کے پرستاروں میں کرتا ہوں۔ حقائق کے ادراک پر مبنی فیض کی فکری نہج، ان کے تخیّل کی نادرہ کاری، اُن کی لفظیات، تشبیہات و استعارات اور رموز و علائم کی ندرت اور لطافت اور اسلوب کی دلکشا نغمگی انھیں اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رکھے گی۔ انھیں اپنے بعض ہم عصروں پر فوقیت دے کر غالب اور اقبال کا ہمسر ثابت کیے بغیر بھی ان کے مرتبے کی بلندی قائم و دائم ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اقبال آفاقی شاعرِ اعظم ہیں، اُن کی تو بات ہی کیا۔ اُن کے بعد جوش اور فراق سے بڑا یا ان دونوں کا ہم پلہ شاعر بھی ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ جوش و فراق اور ان کے قدآور ہمعصروں کے بعد مختلف سماجی و سیاسی عوامل کے نتیجے میں "نئے ادب" کا جو رجحان پیدا ہوا، وہ بہت جلد دو متوازی دھاروں میں بٹ گیا۔ ایک دھارا جدیدیت پسندوں کا جو فن برائے فن کے قائل تھے اور سماجی عوامل سے لاتعلق ہو کر اپنی ذات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں تھے اور دوسرا ترقی پسندوں کا جو فن برائے زندگی کے علمبردار تھے اور ادبی تخلیق کو ایک بامقصد سماجی عمل سمجھتے تھے۔ یہ اپنی ذات کی شناخت اجتماعی تناظر میں کرتے تھے اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے سماجی عوامل کی چھان پھٹک ضروری سمجھتے تھے۔ جدیدیت اپنی خلقی کمزوریوں اور زندگی سے آنکھیں چار نہ کر سکنے کے باعث کسی منظم تحریک کی شکل اختیار نہیں کر سکی جبکہ ترقی پسندی ایک زبردست انسانیت نواز تحریک کی صورت میں دنیائے ادب پر چھا گئی۔ گذشتہ نصف صدی کے دوران خاصے اُتار چڑھاؤ آنے کے بعد بھی یہ تحریک زندہ رہی اور حالات کے جبر کے باعث اس کی تنظیم میں دراڑیں پڑ جانے کے باوجود حقائق شناسی اور انسانیت دوستی کا جو راستہ اس نے دکھایا تھا اس پر آج بھی ترقی پسندوں کا کارواں پورے خلوص اور لگن کے ساتھ رواں دواں ہے۔ پچھلے چند برسوں میں تو ترقی پسندانہ افکار نے بعض جدیدیت پسندوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی اور بہت سے باذوق قارئین کی اس رائے کا اظہار کرتا چلوں کہ جدیدیت کے دو بانی شعراء میرا جی اور راشد ترقی پسندوں سے نظریاتی اختلافات رکھنے کے باوجود بڑے شاعروں کے زمرے میں آتے ہیں۔ میرا جی کسی حد تک اور راشد خاصی حد تک حقائقِ حیات سے نظریں نہیں چرا سکے ہیں۔ اختر الایمان، میرے نزدیک، جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان پُل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا کلام ان تمام اقدار کا آئینہ دار ہے جو ترقی پسندوں کو عزیز ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ بعض سربرآوردہ ترقی پسند شعراء اختر الایمان کی شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اختر الایمان اُن کو ناظم (VERSIFIER) سے زیادہ درجہ دینے

پر تیار نہیں ہیں)

بہرکیف، کہنا یہ تھا کہ جوشؔ و فراقؔ اور ان کے ہم عصروں کے بعد ترقی پسند شعراء کی جو کہکشاں نمودار ہوئی اُس کے چھوٹے بڑے سارے ہی ستارے، بہ کہکشاں کی طرح، روشن اور تابناک تھے۔ اس کہکشاں میں شامل صفِ اوّل کے شعراء میں مجازؔ، فیضؔ، سردار جعفری، مخدومؔ، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، اختر الایمان، مجروحؔ، کیفیؔ، ساحرؔ، وامقؔ اور ظہیر کاشمیری نمایاں ہیں۔ ان سب کی بھری پُری شاعری میں بڑی دل رُبائی ہے۔ پھر اُن میں بھی اوّل الذکر سات شعراء یعنی مجازؔ، فیضؔ، سردار جعفری، مخدومؔ، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی اور اختر الایمان ممتاز نظر آتے ہیں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کی بات دوسری ہے۔ ورنہ معروضی اندازِ نظر اختیار کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نواز فکری رویّے کے اشتراک اور اپنے الگ الگ رنگ و آہنگ کی دل کشی کے ساتھ یہ ساتوں شعراء یکساں بلندیوں پر کھڑے ہیں اور اگرچہ ہم پلہ شاعروں میں درجہ بندی کا مسئلہ بہت نازک اور اکثر لاطائل ثابت ہوتا ہے لیکن آج ۱۹۹۱ء کے اواخر میں ہم ترقی پسند شعراء کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو موضوعات کے تنوّع، تخیّل کی ندرت، فکر کی سلامت روی اور تہہ داری اور لفظیات اور اسالیب کی تازہ کاری کے لحاظ سے فیضؔ، سردار جعفری، اور اختر الایمان اپنے ہم پلہ معاصرین سے آگے نظر آتے ہیں۔ مجازؔ اور مخدومؔ کی زندگی نے وفا کی ہوتی اور مجازؔ شراب میں نہ ڈوبے ہوتے اور مخدومؔ کو عملی سیاست سے کچھ فرصت ملتی تو ان دونوں میں بھی مزید بلندیاں سر کرنے کے امکانات تھے۔ بہرکیف، اب صورتِ حال یہ ہے کہ علمی فضیلت کے بھاری بھرکم پن، بصیرت افروز دانشوری کی گمبھیرتا اور تجربات کی بوقلمونی کے باعث فیضؔ، سردار جعفری، اور اختر الایمان کا فنی کینوس خاصا وسیع ہے۔ تینوں نے اپنے اپنے کینوس پر اپنی پسند کے رنگوں سے اپنی اپنی طبعِ رسا کے تقاضوں کے مطابق حقائقِ حیات کی نقش گری کی ہے۔ اور تینوں کی تصاویر ایسی ہیں کہ بس دیکھتے رہیے۔

علی سردار جعفری اور فیضؔ کثیر الجہات فنی شخصیتوں کے حامل ہیں۔ شعر و ادب کے علاوہ دیگر فنون کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی ان کی تخلیقی اور ترغیباتی سرگرمیاں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ادب و فن کے ساتھ ساتھ یہ دونوں صحافت اور سیاست کے میدانوں میں بھی سرگرمِ عمل رہے ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں ان کا ادبی اثاثہ اور عملی زندگی میں ان کا کام بہت گراں مایہ ہے۔ رہے اختر الایمان تو وہ ترقی پسندوں کے ساتھ بھی رہے اور ان سے الگ بھی۔ اُن کی اُٹھان تو جدیدیت پسندوں ہی میں ہوئی مگر وہ کبھی اپنی ذات کے گنبد میں بند نہیں ہوتے۔ انہوں نے اجتماعی تناظر میں ہی اپنی ذات کی شناخت کی اور عام انسانوں کے دُکھ سکھ سے لاتعلق نہیں رہے۔ سماجی عوامل اور معروضی حقائق پر ہمیشہ اُن کی نظر رہی۔ یہی سبب ہے کہ خواہ وہ ترقی پسندوں کے فنی نظریات سے ایکڈمک طور پر پوری طرح متفق نہ ہوں، مگر ان کی شاعری ترقی پسندی کے اعلیٰ معیار پر پوری اُترتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ فیضؔ اور علی سردار جعفری میں کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے یا اختر الایمان کو ان دونوں سے کمتر یا بہتر شاعر گردانے اور ان تینوں یا ان میں سے کسی ایک کو جوشؔ اور فراقؔ کا ہم پلہ یا ان سے بڑا شاعر قرار دینے کی کوششوں سے ادب کی کوئی خدمت نہیں ہوگی۔

فیضؔ اور احمد ندیم قاسمی پر آپ نمبر نکال چکے ہیں "علی سردار جعفری نمبر" کی اشاعت پر میری دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

احمد ہمدانی

نئی دُنیا کو سلام۔ ہیئت کا ایک نیا تجربہ

"نئی دنیا کو سلام" سردار جعفری کی ایک تمثیلی نظم ہے جس میں ان کے تصورِ حقیقت اور تصورِ فن دونوں پوری طرح ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ یہ تمثیلی نظم ہماری شاعری میں ہیئت کا ایک نیا اور کامیاب تجربہ تھا جس میں بحور کا تنوع اور مثنوی، مکالمے اور ڈرامے کے عناصر بڑی خوب صورتی سے یک جا کیے گئے تھے۔ اس کے بعد کئی دوسرے شعرا نے اس انداز کی نظمیں لکھی ہیں۔ ساختیات کے علمبرداروں کے نظریات سے قطع نظر ہر فن پارہ اپنے خالق کے تصورِ حقیقت اور طرزِ احساس سے مل کر وجود میں آتا ہے بلکہ خود طرزِ احساس بھی ایک بڑی حد تک فن کار کے اپنے تصورِ حقیقت ہی کی مطابقت میں تشکیل پاتا ہے۔ اس طرح تخلیقی عمل میں سب سے زیادہ اہمیت فن پارہ کے خالق کے اپنے تصورِ حقیقت کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ تصورِ حقیقت کی تشکیل و تعبیر میں اب تک دو نمایاں فکری میلانات یعنی عینیت پسندی (IDEALISM) اور مادیت پسندی (MATERIALISM) کارفرما نظر آتے رہے ہیں۔ ان میں اوّل الذکر میلانات کے حامل دانشور خیال کو اور آخر الذکر میلانات کے مفکر اشیا و مظاہر کو اوّلیت کا درجہ دیتے ہیں۔ عینیت پسندوں اور مادیت پسندوں کے کئی مختلف فکری نظام ہیں مثلاً موضوعی عینیت پسندی (SUBJECTIVE IDEALISM) اور معروضی عینیت پسندی (OBJECTIVE IDEALISM) افلاطون اور ہیگل وغیرہ معروضی عینیت پسندی کے اور بارکلے جیسے مفکرین موضوعی عینیت پسندی کے نمایاں ترجمان ہیں۔ عینیت پسندی کے مختلف فکری نظاموں کی طرح مادیت پسندی کے بھی مختلف نظام ہیں۔ ان میں میکانکی مادیت اور تاریخی مادیت کے دبستان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سردار جعفری ان تمام فکری نظاموں میں تاریخی مادیت پسندی کے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن انھوں نے اس فکری نظام کو تقلیدی طور پر نہیں اپنایا ہے بلکہ اسے تخلیقی سطح پر قبول کیا ہے۔ وہ کائنات کی مادّی تعبیر پر اکتفا کر کے خود کو فلسفیانہ موشگافیوں تک محدود رکھنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کائنات کی مادّی تعبیر کا معیشی و معاشرتی، سیاسی و تاریخی، اور تہذیبی و اخلاقی نظریات پر اس طرح اطلاق کریں کہ یہ سب مل کر حیات و کائنات کی کلّیت و سالمیت کو ابھار سکیں نظریۂ کائنات، نظریۂ حیات اور سیاسی و معاشرتی نظریات میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر سکیں کہ ان میں سے ہر نظریہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتا نظر آئے۔ ان کی نظم "نئی دنیا کو سلام" ان کے اس اندازِ فکر کی بھرپور ترجمانی کرتی ہے جس کی مزید وضاحت

ہم انشاء اللہ آئندہ سطور میں کریں گے۔

سردار جعفری کا تصوّرِ فن بھی ان کے تصورِ حقیقت ہی سے ماخوذ ہے جس کی ایک شہادت تو خود ان کی نظم "نئی دنیا کو سلام" کی ہیئت ہے۔ جس میں شاعری کی مختلف اصناف اور سانچوں کو یکجا کر کے ایک کلیت کو ابھارا گیا ہے۔ سردار جعفری کائنات کی مادّی تعبیر کے قائل ہونے کے ناتے اس نکتے سے بخوبی واقف ہیں کہ اس کائنات کا اصل اصول حرکت و تغیّر ہے۔ بقول علامہ اقبال "سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں" ہر لمحہ بدلتی ہوئی کائنات نوعِ انسانی سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلسل تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سردار جعفری کا تصوّرِ فن یکسر حرکی ہے جس میں تقلیدِ محض اور جمود کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ تاریخی تسلسل میں روایت کے صحت مند اجزا کو اس طرح قبول کرنا کہ وہ تازہ تر حسیّت کا ساتھ دے سکیں، حرکی تصوّر کا لازمی حصّہ ہے۔ زیرِ نظر نظم میں ان کا یہ حرکی تصوّر دو سطحوں پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔ پہلی سطح خیال کی اور دوسری اسلوب کی ہے خیال کی سطح پر وہ بتلاتے ہیں کہ "زندگی کا کارواں کہیں ٹھٹکتا نہیں اور اسلوب کی سطح پر وہ ایسی رواں بحور استعمال کرتے ہیں کہ پوری کائنات حرکت کرتی اور رقص کرتی نظر آتی ہے مثلاً

اُبھرتے ہیں جلوے، بکھرتے ہیں جلوے　　　　نکھرتے ہیں جلوے سنورتے ہیں جلوے

اوّل تو یہاں جو بحر استعمال کی گئی ہے وہ خود بہت رواں ہے لیکن سردار جعفری نے الفاظ کا انتخاب اور ان کی ترتیب کچھ اس انداز سے کی ہے کہ بحر کی اپنی روانی میں نہایت حسین اضافہ ہو گیا ہے۔ ایسا حسین اضافہ کہ پوری کائنات جھومتی اور رقص کرتی نظر آنے لگتی ہے۔

سردار جعفری نے اپنی اس نظم کو منظوم تمثیل نہیں بلکہ تمثیلی نظم ٹھہرایا ہے لہٰذا اس نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ڈرامے یا تمثیل کے معیارات کے بجائے نظم ہی کے معیارات کو مدّ نظر رکھنا چاہیے اور اس میں صرف اس قدر ڈرامائی کیفیت تلاش کرنی چاہیے جتنی شعریت کو نمایاں کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ نظم میں جو کردار نظر آتے ہیں وہ ڈراما یا ناول کے کردار نہیں بلکہ صرف علامتیں ہیں۔ اسی طرح اس میں کوئی پلاٹ بھی نہیں ہے بلکہ اس کی جگہ برِّصغیر میں برطانوی سامراج کی پیدا کردہ صورتِ حال کی ایک حسّی تصویر ہے جسے شاعرانہ آہنگ اور علامتی انداز سے ابھارا گیا ہے۔

نظم کے ابتدائی حصّے "حرفِ اوّل" میں برطانوی استبداد کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ملک کی مجموعی صورت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال کو تاریک دور سے تعبیر کرتے ہوئے تمام اشیاء، مناظر، تمام احوال و کوائف اور تمام افعال و اعمال کو سیاہی میں لپٹا اور ٹھٹھرا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہاں سیاہی ایک طرف ظلم و استبداد تو دوسری طرف نکبت و پریشاں حالی کا استعارہ ہے۔ شاعر نے لفظ "سیاہ" کی تکرار سے ظلم و جبر اور آلام و مصائب کی شدّت کو اجاگر تو ضرور کیا ہے لیکن اپنے لہجے میں توانائی کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے یہ بھی واضح کیا ہے کہ وہ شدّتِ آلام سے شکست کھا کر مایوس نہیں ہوتا بلکہ اسے یقین ہے کہ اس جہانِ تغیّر میں کوئی صورت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی۔ ایک دن یہ دورِ ابتلا ضرور ختم ہو گا اور "ضمیرِ حضرتِ انسان کا آفتاب" طلوع ہو کر ہر طرف "انقلاب کی روشنی" بکھیر دے گا۔ روشنی کے اس منظر کو اپنے ذہن میں بسائے ہوئے انسانی ضمیر کے آفتاب کی تلاش میں سرگرداں وہ کہتے ہیں ؎

کہاں ہے روشنیٔ صبحِ انقلاب کہاں؟
ضمیرِ حضرتِ انسان کا آفتاب کہاں؟

حرف اوّل کے بعد اصل نظم شروع ہوتی ہے جس میں پہلے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت اور مرد دونوں مل کر ایک کُل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ دونوں محبّت کے مضبوط رشتے میں منسلک ہوں تو زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل حل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں باہمی مغائرت پیدا ہو جائے یا یہ ایک دوسرے پر فوقیت جتلانے کو اپنا شیوہ بنالیں تو پھر ناکامی اور نامرادی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ یوں بھی تسلسلِ حیات کے لیے عورت اور مرد کا اتحاد لازمی ہے۔ سردار جعفری نے نظم کا آغاز کرتے ہوئے شخصیت کی تکمیل کے عمل کو اُبھارا ہے جس میں عورت کی علامت "مریم" اور مرد کی علامت "جاوید" کے درمیان محبّت کے جذبے کو بھی پیش کیا ہے اور ان دونوں کو میاں بیوی کے رشتے میں منسلک کر کے ایک "کُل" کی صورت گری بھی کی ہے۔ یہی کُل فردائے امید اور انقلاب کا نقیب ہے۔ نظم میں "جاوید" ایک انقلابی اور "مریم" اس کی شریکِ حیات کی صورت اختیار کر کے زندگی کو آگے بڑھانے اور اسے نکھارنے سنوارنے کا عمل شروع کرتے ہیں۔ اس سلسلے کا یہ شعر خاص طور پر قابلِ غور ہے ؎

تو شرما کی جاتی ہے میری نظر سے
حجاب اور گُل کو نسیمِ سحر سے

وجودِ گُل کے لیے نسیم سحری کے جھونکوں سے ربط ایک لازمی شرط ہے چنانچہ گُل کا نسیمِ سحری سے حجاب ایک حیرت کی بات ہے بالکل اسی طرح محبوبہ (عورت) کا اپنے محب (مرد) سے گریزاں رہنا تعجب خیز امر ہے۔ اب ذرا مصرع کی ساخت دیکھیے "حجاب اور گُل کو نسیمِ سحر سے" یہاں فرطِ حیرت کو صرف ایک لفظ "اور" یا پھر لہجے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر کیا گیا ہے جو تحیّر کا احساس ابھارنے کا نہایت فطری اور موثر انداز بن گیا ہے۔ آگے چل کر محبوبہ کے رُخ پہ حسن و محبّت کے ہالے کو زندگی کا اجالا کہا گیا ہے اور محبوبہ کی نیچی نظر سے پھوٹتی ہوئی آنچ کو فکر کی روشنی بتایا گیا ہے جو تکمیلِ شخصیت اور تسلسلِ حیات کے بہت بلیغ اشارے ہیں۔ اب ذرا پہلی شبِ عروسی کی بھی تصویر ملاحظہ ہو ؎

پھسل کر سیہ زلف شانوں پہ آئی | ترے رُخ پہ ایک شمع سی جھلملائی
مجھے تو نے دیکھا نگاہیں اٹھا کر | کہا پھر اشاروں میں کچھ مسکرا کر
سمجھ کر نگاہوں کا پیغام ہم نے | محبّت کا پہلا پیا جام ہم نے

یہ تینوں شعر عورت اور مرد کے فطری تعلق کو اجاگر کرتے ہیں ان میں جنسی آلودگی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے لیکن کچھ اس سے ملتے جلتے ایک جنسی عمل کو مجاز نے ایک نرس کے حوالے سے کچھ اس طرح پیش کیا ہے

اٹھا اور اٹھ کر کے گردن جھکائی | لبِ لعل افشاں سے اک شے چرائی
سمجھتا تھا مجھ سے بگڑ جائے گی وہ | ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
مگر وہ ہنسی اس طرح کھلکھلا کر | کہ شمعِ حیا رہ گئی جھلملا کر

سردار اور مجاز نے تقریباً ایک ہی طرح کے عمل کی تصویر کشی کی ہے لیکن سردار کے یہاں یہ عمل جنس کی اصل حقیقت کو نہایت نفاست کے ساتھ واضح کرتا ہے جب کہ مجاز کے یہاں نرس کا رویہ جنسی جذبے کی نفاست کو پامال کرتا اور عورت کی نسائیت کو مجروح کرتا نظر آتا ہے "کہ شمعِ حیا رہ گئی جھلملا کر" البتہ مجاز نے جس عمل کو "لبِ لعل افشاں سے اک شے چرانے" سے

بر کیا ہے۔ سردار نے اس جیسے یا اس سے بڑھے ہوئے جنسی عمل کو "محبت کا پہلا جام" پینے سے تشبیہ دی ہے۔ شعریت کے
نبار سے مجاز کا مصرعہ زیادہ شاعرانہ ہے لیکن سردار کے پیش نظر جس عمل کی وضاحت تھی وہ یقیناً مجاز کے مقابلے میں زیادہ
سنجیدگی کا طالب تھا۔ سردار نے اس سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے شعری تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی ہے

نظم آگے بڑھتی ہے اور مریم ماں بننے کے مرحلے سے گزرتی ہے جو تسلسل حیات کا نہایت جامع استعارہ ہے۔
مریم ماں بننے کے مرحلے میں اپنے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے لذت آفریں احساسات کو کچھ اس
طرح بیان کرتی ہے

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہے جیسے　　　　مری سانس میں دل دھڑکنے لگا ہے
بگولی ہیں بنتی ہیں شکلیں فضا میں　　　　مہکتے ہیں لاکھوں شگوفے ہوا میں
لہو ناچتا ہے رگیں لوٹتی ہیں　　　　مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

تسلسل حیات کے اسی اشارے کو جاوید اس طرح واضح کرتا ہے۔

یونہی اڑ رہا ہے نشاں زندگی کا　　　　ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت تسلسل فسانہ　　　　تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
کرن سے کرن اس طرح پھوٹتی ہے　　　　کہ جس طرح سے پھلجھڑی چھوٹتی ہے

تسلسل حیات کا یہ تصور ان جدیدیت کے مدعی افراد سے بالکل مختلف ہے جو انسانی تاریخ کو حقیقت انسان
سے الگ کرنے پر مصر ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسلسل سماجی ارتقا کے مراحل سے گزر کر اس مقام تک
پہنچا ہے جس پر وہ آج نظر آتا ہے۔ یہ مسلسل سماجی ارتقا کی داستان ہی انسانی تاریخ ہے۔ آج کا انسان پتھر
در دیہات کے زمانوں سے جو مختلف نظر آتا ہے اس کے اسباب ہمیں سماجی ارتقا کی داستان یعنی انسانی تاریخ ہی
سے ملیں گے۔ آج کا انسان اپنی تاریخ کی پیداوار ہے اور تاریخ ایک مسلسل عمل ہے جو تسلسل حیات کے شانہ بہ شانہ
جاری و ساری ہے۔ تاریخ کو مسترد کرنے کا مطلب انسانیت کو مسترد کرنے سے کم نہیں۔

تسلسل حیات زندگی کا اصول ہے لیکن یہ اصول جبر محض ہرگز نہیں ہے۔ زندگی کا تسلسل کسی ایک صورت حال
کا تسلسل نہیں ہے بلکہ زندگی کے تسلسل میں انسان نت نئی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور حالات کی مطابقت
میں خود اور سماج کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ خود کو اور سماج کو بدلنے کی اسے آزادی ہے بشرطیکہ وہ آزادی کا یہ حق
مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرے اور ایسی تبدیلیاں لائے جن سے زندگی آگے بڑھے اور اس میں زیادہ سے زیادہ
نکھار اور سنوار پیدا ہو۔ اگر کوئی معاشرہ انسان سے اس کی یہ آزادی چھین لیتا ہے تو اسے غلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے
برصغیر میں برطانوی سامراج ایسی ہی غلامی کا زمانہ تھا جس میں ہر طرح کا ظلم روا رکھا گیا تھا۔ یہاں کے اصل باشندوں
کو حد درجہ مفلسی کا سامنا تھا۔ جب کہ برطانوی حکمراں یہاں کی دولت پر عیش کر رہے تھے۔ سردار جعفری نے اپنی نظم میں
برصغیر کی افلاس و نکبت کی صورت کو بڑے مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔ نکبت و افلاس کی فضا زیادہ مؤثر بنانے کے لیے
انھوں نے پابند نظم کے بجائے آزاد نظم کی تکنیک برتی ہے جو موضوع کے ساتھ پوری طرح انصاف کرتی نظر آتی ہے۔ جاوید

اپنی بیوی مریم سے کہتا ہے کہ بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح وہ بھی ایک دن بھوک سے بے چین ہو کر اپنے بچے کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہ مصرع ملاحظہ ہو۔

مری مریم
مرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جلتی
ہوئی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی ان قحبہ خانوں میں
جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں۔

اور پھر جاوید اپنی بیوی مریم کے کپڑوں کو دیکھ کر اس سے کہتا ہے

دیکھ اپنے برہنہ بدن کو
نوجوانی کے دل کش چمن کو
جس پہ افلاس رنگ خزاں کی طرح چھا گیا ہے
تیرا پیوند اور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنس رہا ہے
اور تو مجھ کو ایسی نظر آ رہی ہے
جیسے پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی روتی ہوئی ڈالیاں ہوں

مندرجہ بالا اقتباسات میں برصغیر کی آبادی کو زندگی کی بنیادی ضرورتوں یعنی روٹی اور کپڑے سے محروم دکھایا گیا ہے۔ جب کہ روٹی اور کپڑے کی اس ملک میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ تمام آفت صرف اس لیے تھی کہ انگریز نے یہاں کے لوگوں کی آزادی سلب کر لی تھی۔ وہ غلام قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ سردار جعفری نے اپنی نظم کے اس حصے میں کوشش کی ہے کہ یہاں کے لوگوں کا جذبۂ آزادی بیدار ہو اور وہ غیر ملکی حکمرانوں سے چھٹکارا حاصل کریں۔

نظم کا یہ حصہ ان مصرعوں پر ختم ہوتا ہے ۔

اور صناع و معمار اپنی سبک انگلیاں مانگتے ہیں
جنگ آزادی میں لڑنے والے سپاہی
کارخانوں کے مزدور کھیتوں کے دہقاں
اپنے دریا و دشت اپنا ملک و وطن مانگتے ہیں
یہ حسیں بوستاں ہے ہمارا
سارا ہندوستاں ہے ہمارا

ہم اس اپنے وطن، اپنے گلزار میں، اور کچھ بھی نہیں، صرف
جینے کا حق مانگتے ہیں

آپ نے دیکھا کہ ان اقتباسات میں سردار جعفری نے ملک میں موجود آلام و مصائب کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس وضاحت کے لیے پابند نظم شاید مناسب ثابت نہ ہوتی لہذا آزاد نظم کی تکنیک برتی گئی ہے۔ جس سے نظم میں وضاحت، تاثر اور روانی پوری طرح کارفرما نظر آتی ہے۔ ان اقتباسات میں واقعات کی واقعیت کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان میں شعریت پیدا کر دینا نہایت مشکل کام تھا لیکن سردار جعفری نے اس مشکل کو نہایت آسانی سے کر دکھایا ہے جس سے فن پر ان کی قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعیت میں شعریت پیدا کرنے کے لیے سردار جعفری نے نئی نہایت اچھوتی اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں مثلاً "تیرا پیوند اور چیتھڑوں کا یہ ملبوس سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنس رہا ہے" میں ملبوس کا سوکھی ہوئی پتیوں کی طرح ہنسنا یا پھر بجھ رہا ہے ایسی لگتی ہے جیسے" پت جھڑ کے موسم میں پھولوں کی زرد ہوتی ڈالیاں وغیرہ وغیرہ۔ ان نادر تشبیہات سے سردار جعفری کے تخیل کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

یہاں جس طرح کے حالات کو ابھار کر غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا جذبہ پیدا کیا گیا تھا اس کا تقاضا یہی تھا کہ انگریز کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکے۔ نظم کے اگلے حصے میں یہ آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی گئی ہے جس کی سزا میں جاوید کو موت کی سزا کا حکم سنایا گیا ہے جب کہ مریم کو ساری عمر رونے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں مریم جو فردا کی امین ہے اور اپنے وجود میں ایسی امانت چھپائے ہوئے ہے جو انقلاب کی ضمانت بھی ہے اور آزادی کے اجالوں کی نقیب بھی ہے زندہ رکھی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ مستقبل تاریک نہیں روشن ہے۔ تاہم موت کی سزا کے حکم کے بعد جاوید کو پھانسی دی جاتی ہے۔ چنانچہ نظم کے اس حصے کا آغاز موت کے راگ سے ہوتا ہے۔

ہر چیز آنی، ہر چیز جانی
ہر رنگ فانی، ہر نقش فانی
دنیا پریشاں خوابوں کی بستی
رنگیں فسانہ غمگیں کہانی
سازِ ازل کا نغمہ اجل ہے
شمعِ جہاں کا جلوہ اجل ہے
رقصاں اجل کی پرچھائیاں ہیں
پنہاں اجل ہے پیدا اجل ہے

اور پھر آخر میں زندگی سے رخصت ہوتے ہوئے جاوید نے زندگی کو کچھ اس طرح مخاطب کیا ہے۔

رخصت اے زندگی کی بہارو
رخصت اے جاودانی شرارو
رخصت اے صبح اے شام رخصت

رخصت اے انقلابی جوانو
رخصت اے ہند کے باغیانو
جبینِ فنا کے میں رنگ بھرنا
ہم شہیدوں کو بھی یاد کرنا

جاوید کی موت کے بعد زندگی ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ بقول علامہ اقبال ؎

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

تسلسل حیات کے اس نکتے کو سردار جعفری نے نہایت مؤثر اور دل نشین انداز سے ایک مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے جو مریم اور نامہ بند کے درمیان ہوتا ہے اور جس میں جاوید کا پیغام اپنے ہونے والے بیٹے کے نام سنایا جاتا ہے یہاں مرتے وقت ایک انقلابی کی زبردست ہمت و حوصلہ کو اجاگر کرتے ہوئے زندگی کے مثبت فلسفہ اور تسلسل حیات کو جس خوبی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ۔ ان اشعار میں سردار کی شاعری اس کی ذات کی پوری طرح مظہر نظر آتی ہے اور اس کے ذہن و دل میں بسے ہوئے وہ تمام خیالات جو اس کی شخصیت میں ڈھل گئے ہیں ان اشعار میں صاف دیکھے اور پڑھے جا سکتے ہیں سا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم کا یہ حصّہ خود سردار جعفری کے ذہنی و جذباتی وجود کی ایک تصویر ہے ۔ مریم کے ہونے والے بچے کے نام جو پیغام ہے وہ دراصل آنے والی نسل اور فردا میں ظہور کرنے والے انقلاب کے نام سلام ہے ۔ نظم ختم ہونے پر حرف آخر میں "آدمی کی گزرگاہ یعنی شاہراہ حیات" کی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے وہی بحر اور وہی ردیف و قوافی استعمال کیے ہیں جو حرف اوّل میں کیے تھے ۔ اس سے ایک خوش گوار یک رنگی و ہم آہنگی کا تاثر بھی پیدا ہوتا ہے اور تسلسل حیات اور تاریخ کے مسلسل عمل کی حقیقت بھی روشن ہوتی ہے ۔

یہ آدمی کی گزرگاہ ۔ شاہراہ حیات
ہزاروں سال کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
گزرتے وقت کے گرد و غبار کے نیچے
حسین جسم کی تابندگی چھپائے ہوئے
گزشتہ دور کی تہذیب کی منازل کو
جوان ماں کی طرح گود میں سلائے ہوئے
نئے افق سے نئے قافلوں کی آمد ہے
چراغ وقت کی رنگین لو بڑھائے ہوئے
بغاوتوں کی سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے

الغرض یہ پوری نظم زندگی اور کائنات کے مثبت نظریے کی عکاسی اور شاعرانہ لطافتوں کا ایک قابلِ قدر نمونہ ہے ۔ ۔۔

ادیب سہیل

نئی دُنیا کو سلام

سردار جعفری سے میرا کبھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ انھیں "کراچی پریس کلب" کے جلسوں میں کئی بار دیکھنے کا اتفاق ضرور ہوا، لیکن سردار جعفری کا احترام میرے دل میں "نئی دنیا کو سلام" کے زمانے سے ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" اردو شاعری کے جدید سفر میں پہلے سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، چنانچہ اس اعتبار سے اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے اردو میں طویل نظم کہنے کا راستہ ہموار کیا ہے، سردار جعفری کی یہ نظم اُس وقت منظوم ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے کی سی کیفیت رکھتی تھی، ہر شخص کی نگاہ اس جانب اسی طرح اٹھ رہی تھی جیسے کسی نئی چیز کو دیکھ کر اٹھا کرتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ "نئی دنیا کو سلام" طرزِ بیان، ڈکشن اور متخیلہ کا ایک دلکش امتزاج پیش کرتی اور ایک نئے پن کا احساس دلاتی تھی جو بالآخر سردار جعفری کی پہچان بن گئی۔

جس وقت یہ نظم معرضِ وجود میں آئی یا آیا چاہتی تھی یہ آزادی کے آس پاس کے ماہ و سال تھے، اخبار و رسائل میں موضوع کے اعتبار سے اسی قبیل کی نظمیں ان کے دوسرے معاصر شعراء مجاز لکھنوی، فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین وامق جونپوری، کیفی اعظمی، پرویز شاہدی، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، نظر حیدرآبادی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ بھی لکھ رہے تھے، لیکن سردار جعفری کی آواز نکلتی ہوئی سی تھی (فیض احمد فیض کو یہ اعزاز بعد میں ملا جو ان کی مخصوص شاعرانہ انفرادیت کی صورت میں منتج ہوا) اسے آپ میری خوش گمانی کہہ لیں یا کچھ اور، لیکن میں نے "نئی دنیا کو سلام" کو اسی طور محسوس کیا تھا۔ (ویسے ۱۹۴۳ء کے قحطِ بنگال، تحریکِ آزادی اور انسانی عظمت کے حوالے سے اس وقت بنگال میں تین شعراء جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور وامق جونپوری کو خاصی مقبولیت حاصل تھی۔)

سردار جعفری کی شاعری، توانائی کی شاعری ہے، ان کا ترقی پسند تحریک سے اس وقت زیست و موت کا رشتہ تھا۔ نظریہ ان کے لیے ہر شے پر مقدم تھا، جدوجہدِ آزادی میں ان کا قلم ہراول بنا ہوا تھا اور بلاشبہ ان کی شاعری کی ایک سمت مقرر ہو گئی تھی۔ وہ کوئی نظم کہیں، کسی عنوان سے کہیں، نظریے سے وابستگی اظہار پر غالب آ جاتی تھی۔ الغرض آزادی کے آس پاس کے ماہ و سال میں ان کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب اسی نظریے کے حوالے سے تھا جسے عرفِ عام میں ترقی پسند تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسے میں فکر و خیال پر اس صورتِ حال کا غالب آنا فطرت کے عین مطابق قرار پاتا تھا، کائنات کا سایہ ذات پر پڑ رہا تھا، غم کائنات کا دائرہ ایک وسیع تر دائرہ تھا جس میں سیکڑوں چھوٹے چھوٹے دائرے آسمان پر ستاروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ یہیں کہیں اگرچہ سردار جعفری کی ذات کا دائرہ بھی موجود تھا، لیکن

کم صورتِ حال میں۔ اس وسیع تر دائرے کا تعلق حصولِ آزادی کے جذبوں سے تھا، آزادی بس آیا چاہتی تھی اور اس کے کارواں کی دھمک بھی سنائی دینے لگی تھی اور ہر فرد و بشر کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی ذات کی قیمت پر بھی آزادی حاصل ہوسکے تو اُسے یہ سودا منظور تھا۔ ایسے میں آپ ہی سوچیں کہ ایک شاعر کا فرض کیا بنتا ہے جبکہ وہ معاشرے کا حساس ترین فرد بھی ہے سردار جعفری بھی ایک شاعر تھے، تحریک آزادی کے جذبے سے ان کا دل بھی سرشار تھا، بھلا وہ کیسے اس آزمائشی لمحے میں محض تماشائی ہو سکتے تھے، وہ سامنے آتے۔ اگر حصولِ آزادی کی راہ میں ان کی آواز اپنے معاصرین سے نمایاں ظاہر ہوتی اور نعرے کے قریب چلی گئی یا اس پر نعرے کا شبہ ہونے لگا تو اس میں کسی کو پشیمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سردار جعفری کی شاعرانہ کل کا ایک حصہ تھا اور انسانی جسم کا ہر عضو اپنی جگہ اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا کوئی اور۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آزادی سے پہلے کے قریبی لمحات میں وقت کا یہ تقاضا تھا کہ اپنے سامنے "وسیع تر دائرے" کی اہمیت کو مقدم رکھا جائے، چنانچہ سردار جعفری کی بیشتر شاعری اسی دائرے میں سفر کرتی رہی۔ ذات کا اظہار جو وسیع دائرے کے مقابلے میں ایک چھوٹے دائرے کی حیثیت رکھتا تھا، اقتضائے وقت کی ترجیحات کے تحت اس طرف کم تر دھیان دیا گیا۔ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ایسا وقت بھی آتا ہے، لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سردار جعفری کی شاعری میں چھوٹا دائرہ یکسر نظرانداز ہوا یا اس کی نمائندگی نہیں ہوئی۔ ایک شاعر کے لئے یہ ممکن بھی نہیں کہ دل و دنیا میں سے کسی ایک کو اپنے اطراف سے یکسر خارج کر دے اور کسی دوسرے کا ہو کر رہ جائے۔ دل و دنیا کی حیثیت انسانی ذات اور اس کی سرشت میں لازم و ملزوم کی سی ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ "وسیع دائرے" کی چادر میں ذات کے رنگوں کی ٹکیاں کہیں شوخ اور کہیں مدھم اور کہیں کہکشانی جھومر کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ "نئی دنیا کو سلام" میں دونوں دائروں کی رفاقت اور اظہار کی دل آویز صورتیں جا بجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ بلکہ بند کے بند ان محاسن کا آئینہ ہیں۔

سردار جعفری کا شعری سفر اسی توانائی کے ساتھ جاری ہے، لیکن زمانے کے ساتھ موضوعات میں تبدیلی آئی ہے۔ اور ان کا سفر بڑے دائرے سے چھوٹے دائرے کی طرف آیا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ اب ان کے ہاں دنیا کا دباؤ کم ہوا ہے اور دل کی طرف مراجعت ہوئی ہے۔ ایک بڑے اور متنوع ذہن کے ساتھ دیکھا جائے تو ہر شاعر کے ہاں اس دوطرفہ ٹریفک کا سلسلہ تاحیات جاری رہتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو تنوع کا دم گھٹ جائے گا۔ یہاں بات اہم یہ نہیں کہ وہ شاعر کتنی دیر کس رُخ پر کھڑا رہا بلکہ اہم یہ ہے کہ اس کے ہاں شاعرانہ سمت بدلتی رہی کہ نہیں۔

۱۹۴۷ء کی آزادی کے قریبی دو سال میرے لیے شاعری کی الف بے کے دو سال تھے، اس وقت مجھے جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کی شاعری میں زیادہ لطف ملتا تھا "نئی دنیا کو سلام" کی تفہیم کا معاملہ بہت بعد کا ہے جب میرے مطالعے میں غیر ملکی شعراء کی کتابیں آئیں اور لورکا، ناظم حکمت اور پابلو نرودا کو باضابطہ پڑھنا شروع کیا۔ اس مطالعے کا فائدہ یہ ہوا کہ سردار جعفری کے تخلیقی جوہر مجھ پر واضح ہونے لگے اور تب میں نے محسوس کیا کہ سردار کی شاعری باعتبار اسلوب چلی کے شاعر پابلو نرودا کے قریب تر ہے اور جب میں نے نرودا کی نظمیں "مغرور، لینن گراڈ"، اسٹالن گراڈ، عزت کے لیے ایک نغمہ" اور لینن انعام یافتہ "LET THE R AIL SPLITERS, AWAKE" اور اس کی دوسری تصانیف پڑھیں تو مجھے اپنی اس رائے پر یقین کرنے کو جی چاہا۔ اس یقین کو تقویت اس بات سے بھی ملتی

ہے کہ پبلو نرودا اور سردار جعفری دو دنیاؤں میں رہتے ہوئے بھی نظریاتی سطح پر ایک ہی قبیلے کے شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے اور انسان کی سربلندی کے لیے ایک ہی انداز سے دونوں کے دل دھڑکتے رہے۔

پبلو نرودا اور اس کی شاعری ۱۹۲۹ء میں بہ نفسِ نفیس ہندوستانی شعراء اور ادبا سے روشناس ہوئی تھی جب وہ اسی سال کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نرودا کے دوسرے شعری مجموعے "TWENTY LOVE POEMS AND A SONG OF DESPAIR" کو منظرِ عام پر آئے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے اور انٹرنیشنل فورم تک اس کی شہرت جا پہنچی تھی تب سے ۱۹۵۰ء تک سردار جعفری کی متعدد بار پبلو نرودا سے انٹرنیشنل فورم میں ملاقاتیں ہوئیں اور انھیں نرودا کی شاعری کو سننے اور ان سے تبادلۂ خیال کرنے کے مواقع فراہم ہوئے۔

"نئی دنیا کو سلام" کتابی صورت میں ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی ۱۹۴۹ء میں اس پر جناب اثر لکھنوی کا تبصرہ "جدید شاعری اور نئی دنیا کو سلام" کے عنوان سے ماہنامہ مدیر لکھنؤ کے شمارہ اپریل ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ میرا خیال ہے کہ "نئی دنیا کو سلام" پر اس سے بہتر تبصرہ آج تک نہیں لکھا گیا اور یہ بھی کہتا چلوں کہ یہ تبصرہ بڑے شوق اور جذبے سے لکھا گیا ہے جس کی بنیاد بے ساختہ پسندیدگی ہے، اس میں جہاں کہیں کسی شاعرانہ سقم کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بھی اسی پسندیدگی کا ایک حصہ ہے اور جب یہ تحسین، کلاسیکی، ثقہ، نستعلیق اور ترقی پسندی کے کٹر مخالف شاعر جناب اثر لکھنوی کی طرف سے آتی ہے تو میری نظر میں سردار جعفری کی اس طویل نظم کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور سوچنا پڑتا ہے کہ یہ نظم ایسی نہیں کہ آدمی اس سے سرسری گذر جائے، یہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اس کے قریب رکا جائے، اسے بغور دیکھا جائے اور اس کے محاسن سے محظوظ ہونے کی ہر نوع سبیل نکالی جائے۔

اثر صاحب نے "نئی دنیا کو سلام" کو جس طرح موسیقی کی اصطلاحات کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے وہ بھی ان کے اسی اشتیاق پر دلالت کرتی ہے جو اس نظم کے لیے ان کے دل میں پیدا ہوتی۔ نیز یہ کام کوئی اس فن کا جان کار ہی کر سکتا ہے۔ انہوں نے نظم کے آغاز سے اختتام تک کے مراحل کو سم سے سم تک کا سفر کہا ہے اور اس کی بتدریج بڑھت اور اس کے لچکتے ڈولتے اور گنگناتے گاتے ہوتے مصرعوں کو کسی راگ کے آرائشی ٹکڑوں یعنی تان پلٹوں پر محمول کیا ہے۔ صرف یہی نہیں مصرعوں کی رفتار میں انھیں کہیں بلمپت، کہیں دُرت، کہیں پنچم اور کہیں مدھم لے کا لطف حاصل ہوتا ہے، جناب اثر لکھنوی کی اس تفہیم نے قاری کو نظم کے ایک نئے رُخ سے متعارف کرایا ہے۔ "نئی دنیا کو سلام" کی پہلی تصویر سے لے کر چھٹی تصویر تک ایسے مقام جا بجا دیکھنے میں آتے ہیں لیکن اس کی مؤثر صورت تیسری تصویر میں ملتی ہے۔ آپ بھی تیسری تصویر کے ایک منظر سے محظوظ ہو لیں جس میں جاوید اپنی بیوی مریم سے مخاطب ہے۔ مجھے یہ منظر اس لیے اچھا لگا کہ اس میں شاعری، موسیقی اور مصوری یکجا نظر آتی ہے۔

جاوید :- (اپنی بیوی مریم سے مخاطب ہے)

".... تو کہ رنگین خوابوں میں کھوئی ہوتی ہے
اتنی غافل ہے گویا کہ سوئی ہوتی ہے
دیکھ اس ننھی مُنّی سی جاں کو

جو ترے دل کے نیچے ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں
بے خبر سو رہی ہے
جس کے جسم اور جاں کی ترے خون سے
پرورش ہو رہی ہے

جب وہ دنیا میں آئے گا تو ماما کی محبت
تیرے شفاف سینے سے اک دودھ کی نہر بن کر بہے گی
تیرے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں
جو محبت کی راتوں میں کھل اٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگاتے تھے
اور شرما کے چاند ابر میں منہ چھپا لیتا تھا
اب انھیں چھاتیوں میں تری ماما کلبلائے گی اور تو محبت
سے بچے کو آغوش میں کھینچ لے گی
اور وہ فرطِ مسرت سے ننھی سی باہیں اٹھا کر
ڈال دے گا ترے چاند سے اس گلے میں کہ جس سے مرے گرم
بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں ... "

جاوید اور مریم کی شکل میں سرسنگم پر راگ اور راگنی کے ملاپ سے نظم کی تیسری تصویر کے اس اقتباس میں جس پُتر کی بشارت دی جا رہی ہے وہی تو بطنِ گیتی سے طلوع ہونے والا آفتابِ آزادی ہے۔

آخر میں میں اپنی گفتگو کو سردار جعفری کی ان معروضات پر ختم کرتا ہوں جو "نئی دنیا کو سلام" کے تحریر کردہ دیباچے کے آخر میں درج ہیں۔ میں ان معروضات کو سردار جعفری کی شاعری کا منشور سمجھتا ہوں اور اگر اسے انسان کے برابر پھیلا کر دیکھیں تو ہر زمانے کے لیے یہ انسانیت کا منشور بھی بن جاتا ہے۔

"دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسان کو شکست ہوئی ہو۔ افراد اور طبقات کو شکست ہوتی رہی ہے اور ہوگی، لیکن "انسان" ناقابلِ شکست ہے کیوں کہ اس کی محنت، عمل اور جد و جہد اس کے اپنے شعور ہی کی نہیں بلکہ بڑی حد تک اس کے ماحول کی بھی خالق ہے، اس لئے وہ ہمیشہ فتح مند اور کامران رہے گا۔ یہ عقیدہ جو اندھا عقیدہ نہیں ہے میرا سب سے بڑا انسپریشن ہے، میں اس کو ادب و فن کا ابدی موضوع سمجھتا ہوں۔ سب سے زیادہ شاندار، سب سے زیادہ عظیم المرتبت، سب سے زیادہ حسین "انسان" ہے۔"

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

سردار جعفری کی شاعری میں پیکر تراشی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی پسندوں نے اُردو شاعری کو جو نیا موڑ دیا جس نئے آہنگ سے روشناس کروایا، جو نئے عنوانات و موضوعات دیے۔ خیالات کی جدت کے جو نمونے پیش کیے اور جو نیا لہجہ عطا کیا، اس نے اُردو شاعری کو بہت حد تک بین الاقوامی ادبی سطح پر لا کھڑا کیا۔ گو ابتدائی دور میں ان میں سے اکثر شعراء نے اقبال اور جوش کی تقلید میں خطیبانہ، بیانیہ اور فلسفیانہ اندازِ بیاں کو اہمیت دی۔ سیاسی اور سماجی نظام سے بغاوت کی۔ مروجہ اخلاقی قدروں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اشتراکیت اور انقلاب کو اپنا بنیادی مقصد بلکہ مسلک قرار دیا لیکن اس کے باوجود بھی (سوائے ایک دو کے مثلاً میرا جی اور ن۔ م۔ راشد جو بعد میں جدید شاعروں کے امام بنے) اکثر شعراء رائج اسالیب سے روگردانی نہ کر سکے مگر آزادی کے آتے آتے ان کے خیالات کے گلشن صد رنگ میں بھی نئے تجربوں کی بہار آ ہی گئی نتیجتاً روایتوں میں تبدیلیاں ہوئیں اور جذبوں نے راہ پائی نئے اسالیب، نئی تکنیک اور نئی نئی ہیئتوں کے تجربے عمل میں آئے۔

سردار جعفری کے ہاں بھی جو ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم کارکن تھے بہت دنوں تک جوش کا خطیبانہ لہجہ اور اقبال کا فکری اندازِ بیان نظر آتا ہے۔ لیکن بہت جلد انہوں نے بھی فیضؔ اور مخدومؔ کی طرح ہیئت کی تبدیلی کے عملی تجربے کئے اور نظم معریٰ کے علاوہ آزاد نظمیں بھی کہنا شروع کیں۔

گو بقول خلیل الرحمان اعظمی۔۔۔۔۔

"ابتدا میں وہ بھی آزاد نظم کے مخالف تھے۔ مگر آزادی کے بعد انہوں نے اس فارم کو قبول کر لیا۔ اور اس طرز میں مائکا فسکی لوئی آراگاں اور پابلو نرودا وغیرہ کے اثرات کو ملا کر آزاد نظم کو ایک نئی سمت دینے کی کوشش کی۔"

(نئی نظم کا سفر)

لیکن اعظمی صاحب کا یہ بیان بہت حد تک غلط ہے۔ کیونکہ آزادی سے قبل ہی جعفری صاحب نے آزاد اور معریٰ نظم کے تجربے شروع کر دیئے تھے ۱۹۴۳ء میں لکھنؤ ریڈیو سے نوواردشعراء کا مشاعرہ ہوا تھا۔ جس میں فیضؔ، مجازؔ

جذبی، مخدوم، جاں نثار اختر کے علاوہ سردار جعفری بھی شریک تھے اور وہاں انہوں نے جو نظم سنائی تھی وہ پابند نہیں تھی۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے جو اپنی مشہور تمثیلی نظم نئی دنیا کو سلام ۱۹۴۶-۱۹۴۵ کے دوران لکھی ہے۔ جس کا پیش لفظ دسمبر ۱۹۴۶ء کا لکھا ہوا اور پہلا ایڈیشن مئی ۱۹۴۷ء یعنی آزادی سے قبل ہی شائع ہوا اور اس میں آزاد نظم کے بیشتر ٹکڑے موجود ہیں۔ نیز یہ بھی درست نہیں کہ پابلو نرودا اور دیگر حضرات کے اثرات کو ملا کر ایسی نظمیں کہیں۔ کیونکہ پابلو نرودا سے ان کی ملاقات ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور اس سے قبل ہی وہ نظمیں کہہ رہے تھے۔ بہرحال جس نئی سمت کی طرف اعظمی صاحب نے اشارہ کیا۔ ان کے متعلق آگے چل کر وہ جو وضاحت کرتے ہیں۔ البتہ وہ قابلِ قبول ہے۔

یعنی ...... انہوں نے (جعفری) نئی امیجری استعمال کر کے ....

...... اور اپنی نظم کے منظر نامے کو پرانی نظم کے منظر نامے سے الگ کر کے اپنی ایک انفرادیت پیدا کر لی ہے۔ جو دور سے پہچانی جاتی ہے۔ ؎۱

ڈاکٹر وحید اختر بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "ترقی پسند آزاد نظم میں بیانیہ کے امکانات کو سب سے زیادہ سردار جعفری نے نمایاں کیا۔ اس ہیئت میں "پتھر کی دیوار" کی نظمیں منفرد مقام کے ساتھ آزاد نظم کے ارتقاء میں تاریخی اہمیت رکھتی ہیں" ؎۲

وہ منفرد مقام کیا تھا؟ اعظمی صاحب کی طرح وحید اختر نے بھی اس کی تشریح کر دی ہے۔

وہ "انہوں نے امیجری کو بھی ٹھوس مرئی پیکروں سے آشنا کیا۔"

آزاد نظموں کے تجربے نے سردار جعفری کی نظموں میں رمزیت، علامت نگاری، استعارہ سازی اور پیکر تراشی کے خوبصورت نمونوں کے لیے بے شمار گنجائشیں پیدا کر لیں۔ یہاں تک کہ آج اگر سردار جعفری کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کی شاعری میں جو سب سے نمایاں خصوصیت نظر آتی ہے۔ وہ امیجری یا پیکر تراشی کا استعمال ہے۔ پیکر تراشی حالانکہ اردو شاعری میں نئی نہیں ہے اردو کے قدیم شعراء بھی غیر شعوری طور پر پیکر تراشی کے ایسے نمونے پیش کرتے رہے ہیں۔ مثلاً

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
سودا

آنکھ ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ
میر

نوکِ مژہ پہ اشکِ صباحت نظام ہے
سونے پہ آبنوس کے چاندی کی شام ہے
یقین

؎۱ نئی نظم کا سفر۔ خلیل الرحمن اعظمی

برنگِ سبزہ رندتا ہوں رہِ معشوق گلرو میں
یہ پامالی ہے بہتر دو جہاں کی سرفرازی سے

آتش

میں وہ فتادہ پا ہوں کہ بعد از فنا مجھے
مانندِ نقشِ نعل نہ کوئی اٹھا سکے

درد

پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

انیس

صبا نے دی ترے وحشی کی قبر پر جا رب
پئے طواف بگولے ہزار بار آئے

مصحفی

کل ہم آئینے میں رخ کی جھریاں دیکھا کئے
کاروانِ عمرِ رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

مصحفی

لیکن انگریزی ادب کے مطالعہ نے اور مغربی شاعری کے اثرات نے اس خصوصیت کو اُردو شاعری میں زیادہ سے زیادہ اہمیت دی۔ اور ہمارے شعراء خاص طور پر پیکر تراشی کی فنی خوبی کا استعمال کرنے لگے۔ جہاں تک پیکر تراشی کا سوال ہے، مغربی نقادوں اور ادیبوں نے مختلف انداز میں شاعری میں اس کی اہمیت کا احساس دلایا ہے اور ایزرا پاؤنڈ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ....

"ضخیم ضخیم کتابوں کی تصنیف کے مقابلے میں ساری زندگی صرف ایک پیکر کی تخلیق اہم کام ہے۔"

مگر ایلم ہاؤ کا نظریہ ہے۔

"شعری پیکر اور علائم ہی پیچیدہ جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ہیں۔"

ڈے لیوس اپنی مشہور کتاب THE POETIC IMAGE میں کہتا ہے "شعری پیکر دراصل وہ لفظی تصویریں ہیں جنھیں حروف بناتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی تلمیح یا تشبیہ یا استعارہ کے ذریعے بھی شاعر شعری پیکر کی تخلیق کرتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض اوقات شعری پیکر کی تشکیل ایسے فقروں یا جملوں سے بھی ہوتی ہے جو بظاہر تو بیانیہ معلوم ہوتے ہیں لیکن جو معنی کے اعتبار سے ہمارے تخیل کو زیادہ گہری معنویت اور دور رس اثرات سے دوچار کرتے ہیں۔"[1]

یونگ اس بات کو زیادہ تشریحی انداز میں بیان کرتا ہے۔

"وہ فنکار اپنے لاشعور کے تاریک سمندر کی غواصی کرتا ہے اور نسلی اور انسانی تجربات کے دُرِ شہوار نکالتا ہے۔"

---

[1] شاعر۔ غالب نمبر۔ فضیل جعفری۔ غالب اور پیکر تراشی

گویا روزِ ازل سے جو تجربات و حادثات اس خراب آباد میں انسان کا مقدر بنے ہوئے ہیں۔ وہ وقت گزرنے کے باوجود لاشعور میں حسّی پیکروں کی صورت میں خوابیدہ یا بیدار رہتے ہیں۔ اور نسل بعد نسل لوگوں کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کوئی دیدہ ور شاعر اپنے اندرون کی سیاحت کرکے ان کی شناخت کرتا ہے۔ اور جواہر و لعل بدخشاں سے ڈھیر ہمارا آنکھوں کو چکا چوند کرتے ہیں۔ ان تمام وضاحتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ پیکر دراصل وہ ذہنی تصویریں ہیں جو ہمارے تحت الشعور میں بس جاتی ہیں۔ اور یہ مختلف پرچھائیاں یا جانی پہچانی اشیاء کے عکس ہمارے ذہن کے گوشے میں محفوظ رہتے ہیں۔ اور جب کبھی ہمارا ذہن کسی نئے احساس سے دوچار ہوتا ہے تو یہ تمام عکس ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے باہمی اختلاط سے ایک نیا عکس یا نئی شکل پردۂ ذہن پر ابھرتی ہے۔ شاعر اس "نقشِ فریادی" (ذہنی تصویر) کو لفظوں کا پیراہن پہناتا ہے۔ تو وہ پیکر کہلاتا ہے۔ پردۂ ذہن پر بننے والی یہ تصویریں رنگین بھی ہو سکتی ہیں، دلکش بھی، روح کو گھلا دینے والی بھی، نغمگی سے بھرپور بھی، ملائم بھی اور روشنی سے مملو بھی، اس لحاظ سے پیکر کی مختلف قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

جہاں تک پیکر کی ابتدائی شکل کا تعلق ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب انسانی ذہن کسی شے کے بصری احساس سے آشنا ہوتا ہے تو اس سے ایک اثر قبول کرتا ہے اور اس اثر کے نتیجہ میں اس شے کا ایک مخصوص تاثر یا عکس ذہن میں بنتا ہے۔ گویا یہ نفسیاتی یا ذہنی پیکر ہے۔ لیکن جب ذہنی یا نفسیاتی پیکر لفظوں میں ڈھل جاتا ہے۔ تو لفظی پیکر کہلاتا ہے۔

نفسیاتی پیکر کے لیے حواس خمسہ کا شے مخصوص سے متاثر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ کوئی امیج یا عکس ذہن پر بن ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے ہمارے حواسِ خمسہ نفسیاتی پیکروں کی تشکیل میں ایک زبردست رول ادا کرتے ہیں اور چونکہ ہر انسان کی حسّی قوتوں کی استعداد مختلف درجے کی ہوتی ہیں لہذا ان کے ذہن میں بننے والے پیکر بھی مختلف ہوتے ہیں مثلاً بعض لوگوں کی بصری قوت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ لہذا ان کے ذہن میں جو عکس محفوظ ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ تر قوت بصارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے رنگ، روشنی، حُسن، شباب وغیرہ۔ بعض لوگوں کی قوتِ سامعہ زیادہ طاقت ور ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے ذہن میں جو تصویریں بنتی ہیں۔ ان کا تعلق زیادہ تر سماعت سے ہوتا ہے۔ جیسے مختلف قسم کی آوازیں، سرسراہٹ، گنگناہٹ، کھنکھناہٹ، آہٹ، چیخ، راگ، سُر تال، نغمہ، گیت، موسیقی وغیرہ بعض لوگوں کی قوتِ لامسہ تیز ہوتی ہے۔ لہذا ان کے تحت الشعور میں جو امیج بنتے ہیں۔ وہ زیادہ تر لمسی ہوتے ہیں جیسے نرمی، ملائمت، نزاکت، گداز پن، خشکی، حرارت وغیرہ، مختصر یہ کہ جو پیکر جس حس قوت کے زیر اثر ذہن میں ابھرتا ہے۔ اسی کے نام سے منسوب ہو جاتا ہے۔ مثلاً بصری پیکر، سماعی پیکر اور لمسی پیکر وغیرہ

سردار جعفری کے ہاں ایسے ذہنی اور نفسیاتی پیکروں کی کمی نہیں لیکن سب سے زیادہ ان کی شاعری میں جن پیکروں کے نمونے ملتے ہیں وہ بصری پیکر ہیں عام لوگوں کے مقابلے میں یوں بھی ہر شاعر کی قوت مشاہدہ زیادہ تیز ہوتی ہے۔ لہذا ایک اچھے شاعر کے ہاں بصری پیکر کی زیادتی لازمی ہے۔ اپنی مشہور اور طویل تمثیلی نظم نئی دنیا کو سلام کی ابتداء میں برطانوی حکومت کی سیاہ کاریوں سے پیدا شدہ غلامی کے تاریک دور کی عکاسی جس منظر کے ذریعے سردار جعفری نے کی ہے۔ وہ بصری پیکر کی

خوبصورت مثال ہے

سیاہ رنگ پھریرے ہوا میں اڑتے ہیں
کھڑی ہوئی ہے سیہ رات سر اٹھائے ہوئے
سیاہ زلفوں سے لپٹے ہوئے ہیں مارِ سیہ
سیاہ پھن ہیں سیہ پھول مسکرائے ہوئے

اس سلسلے میں مرزا جعفر علی اثر فرماتے ہیں ـــــ

"زلف اور سانپ کی تشبیہ ابتذال کی حد تک عام ہے۔ مگر سانپ کے پھن کو سیاہ پھول کہتے ہیں جدت اور ندرت ہے۔ مسکرانے کا ثبوت ادھر سیاہ بالوں کی چمک۔ ادھر سانپ کے پھن کی چتیاں اور چکر مکر کرتی انکھیں۔ بالوں کی طرح سانپ کی کینچلی کی چمک بھی ہوتی ہے۔ چونکہ منظر پر ظلمت چھائی ہوئی ہے۔ بالوں کی چمک دھندلی ہو کر تلملوں کی طرح نظر آ رہی ہے۔ اور سانپ کے پھن کی سفید چتیاں تڑپ رہے ہیں۔ جنھیں شاعر نے سیاہ پھولوں میں تبسم کی جھلک سے تعبیر کیا ہے۔ ــــ"

اسی طرح شام کے مختلف رنگ بصری پیکروں کے روپ میں ان کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں اور لفظی تصویریں بن کر بلا متحرک ہو جاتے ہیں۔

شفق کے رنگ میں ہے قتلِ آفتاب کا رنگ
افق کے دل میں ہے خنجر لہولہان ہے شام
وہ پہنا شمع نے پھر خونِ آفتاب کا جام
پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
لویں چمکتی ہیں یا بجلیاں چمکتی ہیں
تمام پیرہنِ شب میں بھر گئے ہیں شرار

(قتلِ آفتاب)

شفق کی سرخی کو آفتاب کے قتل کے موسوم کرنا اور پھر افق کے دل میں خنجر کا بھونکا جانا، شام کا لہولہان ہو جانا۔ بصری تصویریں ہیں۔ پھر سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ جب قتل ہوا ہے تو قاتل کون ہے۔ ؟ لہذا شاعر نے شمع کے سر پر خونِ آفتاب کا تاج دکھا کر اس پیکر کو مزید حسن بخشا ہے۔ اس قتل کی خوشی میں ظالم اور سفاک قاتل کی محفل میں عیش و عشرت کی خاطر مے و مینا کا اہتمام ضروری ہے اس لیے ستارے نورِ آفتاب کا جام لے کر اٹھے ہیں چونکہ ماحول خونیں ہو گیا ہے لہذا خوف و ہراس اور حزن و یاس کا پھیل جانا بھی یقینی ہے ــــ شاید اسی لیے شمع کی چمکتی ہوئی لویں ایسی نظر آ رہی ہیں جیسے بجلیاں چمک رہی ہوں۔ (یا قہرِ خداوندی نازل ہو رہا ہو۔ ماحول خون، سسپنس اور ایڈونچر اور ٹریجڈی سے بھرا ہوا ہے۔)

ستاروں کی جھلملاہٹ کو یہ کہنا کہ "پلک پلک پہ فروزاں ہیں آنسوؤں کے چراغ"

بصری سنگ آمیزی کی خوبصورت مثال ہے۔ بے گناہ کے قتل یا خونِ مظلوم نے ساری فضا میں گویا آگ لگادی ہے اس لیے تمام پیرہنِ شب میں شرارے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یوں بھی رات میں حدِ نظر تک لاتعداد ستاروں اور سیاروں کا جگمگانا شراروں سے کم نہیں۔ بصری پیکر تراشی کا یہ بہت ہی اچھوتا نمونہ ہے۔

موسموں کے لمسی احساس کو سردار جعفری نے بصری پیکروں میں یوں ڈھالا ہے۔

گزرتی برسات، آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کے مانند اُڑ رہے ہیں
(اودھ کی خاکِ حسیں)

ڈاکٹر عنوان چشتی ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"اگر کوئی شخص کسی رنگین چیز کو دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں شے مذکور کا پیکر محفوظ ہو جاتا ہے چونکہ ناظر نے رنگین چیز کو داخلی طور پر محسوس کیا تھا۔ اس لیے ذہنی پیکر اس رنگ یا رنگین چیز کی ثانوی اور داخلی نقل ہے۔"

رنگوں کے احساس سے بننے والے ایسے ہی کچھ رنگین پیکر سردار جعفری کے ہاں بھی نظر آتے ہیں۔

ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں۔
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجادیا ہے۔

....

سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے۔
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں۔
دھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں

....

اودھ کی خاکِ حسیں کے ذرّے بگولے بن کر چل رہے ہیں
اب آنسوؤں کی پرانی جھیلوں سے سرخ شعلے ابل رہے ہیں
(اودھ کی خاکِ حسیں)

سات رنگوں کی کلغیاں، سفید آٹا، سیاہ چکی، سنہرے چولہے، کالے توے، سرخ شعلے ــــ یہ تمام رنگیں تصویریں ہیں جو مل کر قوسِ قزح کا سا ماحول پیدا کرتی ہیں۔ جو بڑا رومان پرور اور حسین، راحت فزا اور خوشگوار ہے۔ شاعرانہ پیکروں میں اودھ کی خاکِ حسیں کی دھندلی پرچھائیاں دیکھ رہا ہے۔ جو ماضی کے اندھیرے میں گم ہوتی جارہی ہیں۔

وصل کی رات کے گزرتے لمحوں کا خوبصورت منظر لفظی تصویروں میں ڈھل کر ایک بصری پیکر کی تکمیل اس طرح کرتا ہے کہ منظر کے ساتھ قاری خود بھی اس ماحول میں کھو جاتا ہے۔

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے۔
اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح
فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے
نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل
ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول کھلائے ہوئے

(نئی دنیا کو سلام)

عام طور پر پلکوں کے جھک جانے سے رخساروں پر ایک سایہ سا پڑ جاتا ہے اس عکس سے شاعر ایک پیکر بناتا ہے کہ جب رات کی پلکیں جھپکتی ہیں۔ تو اس کی چھاؤں زمین پر پڑتی ہے۔ پلکوں کا جھپکنا بند ہو جانا نیند کے بوجھل پن کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی رات کافی گزر چکی ہے اور ہر طرف سخت خاموشی طاری ہے۔ ایسے میں لمحات کے جگنو اڑتے ہیں یعنی آخر شب وقت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دھیرے دھیرے پردے سرکنے لگتے ہیں۔ یہاں شاعر اندھیروں کی مخملیں پردوں کو سرکتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور ایسے میں کوئی جسم کو چرائے ہوئے آنکھوں میں نیم شبی کے خمار کا کاجل لئے ہتھیلیوں پر حنا کے پھول کھلائے ہوئے نکل رہا ہے۔ وصال کی شب کی اس سے بہتر عکاسی نہیں ہو سکتی۔

غروبِ آفتاب کے منظر کو بھی جعفری صاحب ایسے ہی بصری پیکروں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دن آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا
فضاؤں میں سونا پگھلنے لگا تھا
کرنوں پہ کرن خواب سا بن رہی تھی
دوپٹے کو اپنے شفق چن رہی تھی

(نئی دنیا کو سلام)

ڈوبتے سورج کی روشنی کے بکھر جانے کو سونا پگھلنے سے اور اس کی کرنوں کو آہستہ آہستہ دھندلا ہونے کو خواب کے بننے سے اور آفتاب کے بعد شفق کی سرخی کے دھیرے دھیرے سمٹ کر غائب ہو جانے کو دوپٹہ چننے سے منسوب کر کے سردار جعفری نے تخیل کا ایک رنگین پیکر سجایا ہے۔

فیض کے متعلق ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں۔ (ہم عصر اردو نظم فنی و لسانی مزاج)

"فیض کے زیادہ پیکروں کی نوعیت بصری اور متحرک ہے۔ وہ بے رنگ پیکروں کی جگہ رنگین پیکریت کا نگار

خانہ سجاتے ہیں ان کے یہاں رنگوں کے احساس کے ساتھ رنگینی، سائے، آتش، سحر اور دل نواز شفاف فضا کے پیکروں کی بہتات ہے۔"

ذرا سے فرق کے ساتھ یہی بات سردار جعفری کی پیکر تراشی کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ فیض کے ہاں شفاف فضا ہے۔ لیکن سردار جعفری کے ہاں حزن آلود ماحول ہے اور ماحول کا یہ حزن اس نظام زر و سیم کا پروردہ ہے جو سماج کو غیر متوازی تقسیم کا شکار بنائے ہوئے ہے۔ جس کی وجہ سے ظالم سرمایہ دار، غریب اور مظلوم مزدوروں اور کسانوں کا خون پی رہے ہیں۔ لیکن جعفری صاحب ایک ایسی انسانیت نواز دنیا کے خواب دیکھتے ہیں۔ جہاں تمام انسان بلا امتیاز رنگ و نسل و مذہب و مسلک اور دولت و ثروت ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لہٰذا حال کی تاریکی کے پس پردہ آنے والی سحر کا احساس ان کے یہاں بھی موجود ہے۔ ایک ایسی سحر جو محبتوں سے لبریز ساغر چھلکائے گی اور ایک ایسی محفل سجائے گی جہاں فرنگی، فرانسیسی، امریکی، روسی اور ہندوستانی ایک دوسرے کا جام محبت پئیں گے۔ ان کی نظم "تین شرابی" اسی احساس کے زیر اثر پیکر تراشی ہے۔

رت نے اپنی کالی زباں سے
خون شفق کے دل کا چاٹا

....

گہرے کہروں کی لہروں میں
سارا لندن ڈوب گیا تھا
لمپوں کی روشن آنکھوں میں
شام کا کاجل پھیل چکا تھا
رات کی نیلی دیوی جاگی
دن کے دیوتا کو نیند آئی
ڈسنے لگی مجھ کو تنہائی

جب تنہائی ڈسنے لگی تو شاعر میخانے میں چلا آیا جہاں کے منظر کو دیکھ کر بھی سردار جعفری کے ہاں بصری اور سماجی پیکر سے ایک حسین امتزاج کا احساس ہوتا ہے۔

نغموں کے بے تاب بھنور کو
لب کے ٹکڑے چوم رہے تھے
رقص کے بے کل گردابوں میں
جسم کے طوفاں گھوم رہے تھے
چہروں کی روشن قندیلیں
پیراہنوں کی دلکش محرابیں
رنگ نظر کی خاموشی سے

جنبشِ مژگاں کی منتظر آہیں
اس گردش میں درہم برہم
سارا نظامِ شمس و قمر تھا
پگھل گئے تھے چاند اور سورج
محفلِ گل میں رقصِ شرر تھا

رات، رنگ، روشنی، سائے، رقص، جام، راگ، نغمے ـــــ یہ تمام مل کر ایک خواب آور رومانی منظر پیش کرتے ہیں جو ایک متحرک اور رنگیں پیکر سے کم نہیں۔ نظم کا آخری ٹکڑا وہ محبت بھری دلنواز فضا بھی قائم کر لیتا ہے۔ جو عالمی اتحاد کی ضامن ہے۔ اس وقت جب دور سے بیٹھے بیٹھے ایک روسی شرابی ہندوستانی شاعر کی طرف ایک ہوائی بوسہ پھینکتا ہے۔ اور شاعر بصری پیکروں کے گرداب میں کھو کر محسوس کرتا ہے۔

اک تتلی سی اڑاتی آئی
میرے دل کے پھول کے اوپر
کچھ کانپی اور کچھ منڈلائی
بیٹھ گئی پر جوڑ کے دونوں
پیار کے رس کو چوس کے اٹھی
اور میری جانب سے ہوا میں
بوسہ بن کر پھر لہرائی

ہوائی بوسے کے لیے تتلی کے ایکشن سے بہتر اور کوئی پیکر نہیں ہو سکتا تھا اور پھر جواب میں واپسی بوسہ ایسا ہی ہے جیسے وہ دل کے پھول پر سے پیار کا رس چوس کر دوبارہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔

اس کے علاوہ بے شمار بصری پیکر مثلاً خشک لہو کے ملبے صحرا، خون کی بارش، سناٹوں کے بھاری پتھر، گیت کے دل میں چبھتے ہوئے خنجر، سربریدہ الفاظ، عشق کے بیچے، مہربان نظروں کے تیر، زلفوں کی تیغ آبدار، ہاتھوں کی سنہری تتلیاں تبسم کی پھوار، گرد معیبت، ایوانوں کی گردن میں پڑے ہوئے شمعوں کے ہار، رخسار کی مشعلیں اور خنجروں کی روشنی وغیرہ سردار جعفری کے ہاں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ذیل کا ٹکڑا بھی ایسا ہی ہے۔

تیرگی کی سازشیں، بدبختیوں کا ازدحام
کوچۂ احساس میں ہنگامۂ شور نشور
ہر طرف پھیلی ہوئی ہے خنجروں کی روشنی
ہر طرف بکھرا ہوا ہے ایک خونِ آلودہ نور
رنگِ رخ کے آئینے، آنکھوں کے ساغر چور چور
پھر بھی دھڑکے ہی چلا جاتا ہے قلبِ ناصبور　　　(خنجروں کی روشنی)

اس قسم کا ایک اور پیکر آمیز ٹکڑا ہے۔

جشنِ ستم ہے، ناچ رہے ہیں خنجر، تیغیں گاتی ہیں
خون آلودہ شامِ گیسو، زخم رسیدہ صبحِ بدن
خون کی نہریں سینچ رہی ہیں انسانی لاشوں کے کھیت
بھر کے پیٹ کے کام نہ آئیں گے یہ زخموں کے خرمن

بصری پیکریت کی مثالیں صرف ان کی نظموں ہی میں نہیں غزلوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل غزل تو ساری کی ساری بصری پیکر تراشی کا نمونہ ہے۔

کتنی آشاؤں کی لاشیں سوکھیں دل کے آنگن میں
کتنے سورج ڈوب گئے ہیں چہروں کے پیلے پن میں
بچوں کے میٹھے ہونٹوں پر پیاس کی سوکھی ریت جمی
دودھ کی دھاریں گائے کے تھن سے گر گئیں ناگوں کے پھن میں
چکنا چور ہوا خوابوں کا دلکش، دلچسپ آئینہ
ٹیڑھی ترچھی تصویریں ہیں ٹوٹے پھوٹے درپن میں
پائے جنوں میں پڑی ہوئی ہیں حرص و ہوا کی زنجیریں
قید ہے اب تک ہاتھ سحر کا تاریکی کے کنگن میں

دل کے آنگن میں سوکھی ہوئی آشاؤں کی لاشیں، چہروں کے پیلے پن میں ڈوبے ہوئے سورج، بچوں کے میٹھے ہونٹ (جو ان کی شیر خوارگی کا ثبوت ہیں) سوکھی ریت کی طرح پیاسے ہونٹوں پر جمی پپڑیاں، ظلم کا ملاحتی اظہار کرتے ہوئے ناگوں کے پھن گائے کی تھنوں کی طرح بزدل اور خوف زدہ ماؤں کی دودھ سے بھری چھاتیاں، دلکش خوابوں کا چکنا چور آئینہ، پائے جنوں حرص و ہوا کی زنجیریں سحر کا ہاتھ اور تاریکی کے کنگن ــــــ سب پیکریت کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ غزل میں شروع سے آخر تک پیکر تراشی کا استعمال جعفری صاحب کی قادر الکلامی کا مظہر ہے۔

سماعی پیکر کی مثالیں بھی ان کے ہاں کچھ کم نہیں۔ وجدانی بصریت کے ساتھ ساتھ انھیں ایک عارفانہ سماعت بھی حاصل ہے۔ ویسے بھی شاعر کے گوش دو نوائے سروش سننے کے عادی ہوتے ہیں شاید اسی لئے جس طرح دکھائی نہ دینے والے منظر جعفری صاحب کی بصریت کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اَن سُنے نغمے اور اَن کہی باتیں بھی سن لیتے ہیں۔ یوں بصیرت اور سماعت مل کر ایک دلکش پیکر کو وجود میں لاتے ہیں۔

ابھی ابھی مری بے خوابیوں نے دیکھی ہے
فضائے شب میں ستاروں کی آخری پرواز
....

خبر نہیں کہ اندھیرے کے دل کی دھڑکن ہے
کہ آرہی ہے اجالوں کے پاؤں کی آواز
بتاؤں کیا تجھے نغموں کے کرب کا عالم
لہولہان ہوا جا رہا ہے سینۂ ساز

(تخلیق کا کرب)

ستاروں کی پرواز، اندھیرے کے دل کی دھڑکن، اجالوں کے پاؤں کی آواز، لہولہان سینۂ ساز، یہ وہ پیکر ہیں جو جعفری صاحب کی تخلیقی خلاقی کے غماز ہیں

اس طرح مندرجہ ذیل بند میں زمین کا قصۂ درد کہنا، گوش جنوں کا سننا، تیرگی کی دیواروں کا چٹکنا، شاخ گل کی تلواروں کا لچکنا اور دست سرکشی میں ہواؤں کا سنکنا سمعی احساس کا پیکری اظہار ہے۔

ہزار لب سے زمیں کہہ رہی ہے قصۂ درد
ہزار گوش جنوں سن رہے ہیں افسانہ
چٹک رہی ہے کہیں تیرگی کی دیواریں
لچک رہی ہے کہیں شاخِ گل کی تلواریں
سنک رہی ہے کہیں دشت سرکشی میں ہوا

(قتلِ آفتاب)

سماعی اور بصری پیکر کی ایک ملی جلی مثال یہ بھی ہے

یہ عید وصال یاراں ہے
ہیں وجد میں ذرے گیتی کے، گردوں کے ستارے گاتے ہیں
نغمات کے گیسو کھلتے ہیں، بل کھاتے ہیں
لہراتے ہیں

. . . .

مینا میں شفق لہراتی ہے یا جام میں سورج ڈھلتا ہے
پیمانوں اور پیالوں کے آغوش سے چاند نکلتا ہے
ہر قطرۂ مے کے سینے سے اک سیل نور ابلتا ہے۔

(جشن بادہ گساراں)

"نئی دنیا کو سلام" کا ہیرو جاوید جب انقلاب کی حسین خواب آلود سرزمین پر قدم رکھتا ہے۔ تو جعفری صاحب وہاں سماعی پیکروں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔

کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں

اک عجب رقص تھا، اک عجب زمزمہ تھا
ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے ہواؤں کی
سرگوشیاں
دوب کے فرش پر شبنم آلود ملبوس کی سرسراہٹ
وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ

....

سب کے سب ایک پر کیف نغمے میں حل ہوگئے تھے

خاموشی کے ساز سے آوازوں کا پھوٹنا، ساغروں کی کھنک، بانسری کی پگھلتی ہوئی لے، ہواؤں کی سرگوشیاں، شبنم آلود ملبوس کی سرسراہٹ اور وقت کے پاؤں کی نرم آہٹ اور پر کیف نغمے ۔ سب کے سب سماعی پیکر تشکیل کرتے ہیں۔ لیکن یہ پیکر سرتاسر سماعی نہیں ہیں۔ ان میں شاعر کی لمسی حس کو بھی دخل ہے ۔ اس نے ساغر چھوئے ہیں۔ بانسری سے نغمہ پیدا کیا ہے۔ ہواؤں کو محسوس کیا ہے ۔ دوب کے فرش پر چل کے دیکھا ہے۔ لہٰذا نظم کے اس ٹکڑے میں سماعی و لمسی دونوں احساسات اس حسین انداز میں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ کہ رنگین پیکریت کا سلسلہ دور تک پھیل گیا ہے۔

نفسیاتی یا ذہنی پیکروں کی تیسری قسم لمسی پیکر ہیں۔ لمسی پیکر کا تعلق چونکہ قوتِ لامسہ سے ہے۔ لہٰذا ان میں ان ہی ذہنی تصویروں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جو لمس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور یہ ذہنی تصویریں ان اشیاء کے احساس سے بنتی ہیں جنھیں چھوا جا سکتا ہے۔ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دو لمسی احساسات مل کر بھی ایک لمسی پیکر بناتے ہیں۔ یا پھر بصری احساس اور لمسی احساس کے امتزاج سے، یا سماجی احساس اور لمسی احساس کے ملاپ سے بھی لمسی پیکر تخلیق ہو سکتے ہیں۔ جعفری صاحب کے یہاں ہر قسم کے لمسی پیکروں کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں ـــ مثلاً

تمہارا جسم اک مہکتا شعلہ ہے
جیسے آتش کدہ کی لو ہے
تمہارے آنچل کے آفتابوں کی روشنی ہے
جو اس طرح چھن رہی ہے جیسے
نئی سحر کی جوان ضو ہو۔

("تم ۔ نظم نمبر ۱")

شاعر محبوب کے جسم کے لمس سے واقف ہے جس میں جذبوں کی حرارت اور ایک قسم کی مدہوش کن خوشبو کا احساس شامل ہے۔ اس نے شعلوں کو بھی چھوا ہے۔ جو حرارت کا احساس دلاتے ہیں۔ اور چونکہ آتش کدے سے اٹھتے ہوئے شعلوں میں مہک بھی ہوتی ہے کہ اس میں عود وعنبر جلایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں لمسی احساسات مل کر شاعر کے ذہن میں ایک لمسی پیکر بناتے ہیں۔ اور وہ محسوس کرتا ہے۔ کہ محبوب کا جسم ایک مہکتا ہوا شعلہ ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور نظم میں کہتے ہیں ـــــ

....

مگر تم اس خواب کی جھلک ہو۔
کہ جس کی نس نس میں
سیب، انگور اور گیہوں کی فصل کا خون
رواں دواں ہے
سحر کا سورج تمہارے ماتھے کو چومتا ہے
بدن میں شبنم کی روشنی ہے

رقم ——— نظم نمبر ۲

روشنی دنیا کو سلام،، میں اس قسم کے لمسی پیکر جا بجا نظر آتے ہیں۔ جاوید اور مریم جو انقلاب کے نقیب کی حیثیت سے نظم کے پس منظر سے جلوہ گر ہوتے ہیں انھیں لمسی پیکروں کے مظہر ہیں۔ ابتدا ہی میں رشتۂ ازدواج میں منسلک دونوں کے باہمی ارتباط کے نتیجے میں سردار جعفری عورت کی عظمت اور تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے جاوید کی زبان سے اپنے ہونے والے بچے کی ماں کے لیے جو رنگین خوابوں میں کھوئی ہوئی بے خبر سو رہی ہے۔
اس قسم کے مکالمے ادا کرواتے ہیں

دیکھو اس ننھی منی سی جان کو
جو تیرے دل کے نیچے، ترے نرم اور گرم پہلو کے گہوارے میں بے خبر سو رہی ہے۔

....

تیرے شفاف سینے کی نوخیز کلیاں
جو محبت کی راتوں میں کھل اٹھتی تھیں پھول بن کر
نور سے جن کے دیوار و در جگمگا جاتے تھے
اب انھیں چھاتیوں میں تری مامتا کلبلائے گی اور تو محبت
سے بچے کو آغوش میں بھینچ لے گی

اور وہ فرط مسرت سے ننھی سی باہیں اٹھا کر
ڈال دے گا تیرے چاند سے اس گلے میں کہ جس نے مرے گرم
بوسے گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے ہیں

مریم بھی کچھ ایسے ہی لمسی احساسات کی دنیا میں کھوئی ہے۔ ظالم فرنگی نے اس کے انقلابی شوہر کو بغاوت کے الزام میں زنداں میں قید کر رکھا ہے۔ فراق محبوب میں گزرنے والی سیاہ راتیں نہ جانے ذہن میں کتنے لمسی پیکروں کو ابھارتی ہیں۔

مریم جاوید سے دور لمسی پیکروں کی دنیا میں کھو جاتی ہے۔ جس میں حسن بھی ہے اور حزن بھی ———

محبت کا خمار بھی ہے۔ اور وقت کی گردش پیکار بھی۔ رات کی تیرگی میں
پھول شبنم کے بوسوں سے مدہوش ہوتے ہیں۔ کھلتے نہیں ہیں
چاند کی کرنیں جب اپنی نرم اور نازک سیم گوں انگلیوں سے
رات کے الجھے الجھے ہوئے ریشمی بال سلجھانے لگتی ہیں تو اس کی نیلی رگوں میں
چاندنی خون کی طرح سے دوڑ جاتی ہے لیکن پھر بھی اس کی جبیں سے اندھیرے کی پرچھائیں ہٹتی نہیں ہے۔

لمسی احساس کی پیکری تصویر مندرجہ ذیل ٹکڑا بھی ہے۔ جو ایک رومانی ماحول کو پیش کرتا ہے۔

تمہارے نرم احسین ، دلنواز ہاتھ نہیں
مہک رہے ہیں مرے ہاتھ میں بہار کے ہاتھ
مچل رہی ہیں ہتھیلی میں انگلیوں کی لویں
تڑپتی نبض کہے جا رہی ہے پیار کی بات
پگھل رہی ہے رخ آتشیں پہ ہجر کی شام
نکل رہی ہے سیہ زلف سے وصال کی رات

بصری سماعی اور لمسی پیکروں کے علاوہ جعفری صاحب کی شاعری میں ایسے پیکر بھی ملتے ہیں جنھیں حرکی یا متحرک پیکر کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً "نئی دنیا کو سلام" میں جاوید فرنگی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ہم کو اپنی غلامی گوارا نہیں
ایک بھی ذرہ اس ملک میں اب تمہارا نہیں
آج پیڑوں کے پیروں میں جنبش ہے کہسار چلنے لگے ہیں
ریگ زاروں کے سوکھے ہوئے زرد سینوں سے سیلاب
ابلنے لگے ہیں

ندیاں غیظ میں پیچ و خم کھا رہی تھیں
سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں
بجلیاں کالی کالی گھٹاؤں میں اپنی
آتش افشاں زبانوں سے پھنکارتی تھیں

دھان کی بالیاں مسکرائیں گی گیہوں کے خوشوں میں تارے چھپیں گے۔
اور دھرتی کے سینے سے پھولوں کے فوارے ابلیں گے۔
ہجر کی لمبی راتوں کے آنسو محبت کے ہلکے تبسم میں شہد و شکر
بن کے گھل جائیں گے۔

اور ماؤں کی گودوں سے ہنستے ہوئے ننھے ننھے فرشتے اتر کر زمین پر چلیں گے۔؟

یہ پیڑوں کے پتوں کا جنبش میں آنا، کہسار کا چلنا، ریگ زاروں کے سینوں سے سیلاب کا ابلنا ندیوں کا سانپ کی طرح لہرانا، بجلیوں کا آتش فشاں زبانوں سے پھنکارنا، دھان کی بالیوں کا مسکرانا، ننھے فرشتوں کا زمین پر اترنا ——— سب کے سب حرکی پیکر ہیں۔ اور متحرک زندگی سے بھرپور، رواں دواں ماحول کے پروردہ ہیں۔ یہاں ہر شے حرکت کرتی نظر آتی ہے۔ لہذا جو پیکر بنتے ہیں وہ بھی متحرک پیکر ہیں۔

اسی طرح اس نظم میں ———

بیتے لمحات کے سوئے ہوئے طوفانوں میں
تیرتے پھرتے ہیں پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حباب
تابش رنگِ شفق، آتش روئے خورشید
مل کے چہرے پہ سحر آتی ہے خونِ احباب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب

(ایک خواب اور)

پھوٹی ہوئی آنکھوں کے حبابوں کا تیرنا، سحر کا خونِ احباب مل کر آنا، آنسوؤں کا آستینوں کو آواز دینا، لہو کے گردابوں کا دامن تو پکڑ لینا، سوالوں کا در بدر ٹھوکریں کھانا اور جوابوں کا مجرموں کی طرح سر جھکا لینا ——— حرکات و سکنات کے غماز ہیں۔ اور ایسے پیکروں کی تشکیل کرتے ہیں جو متحرک ہیں۔

انسانی قوتِ تسخیر و تعمیر کا احساس دلاتے ہوئے جعفری صاحب نے جو پیکر تراشے ہیں۔ وہ سرتا سر حرکی ہیں۔ قوت بجائے خود ایک تحریک کا حرکت کا نام ہے۔ اور انسانی قوت عمل میں آتی ہے۔ تو ساری کائنات مسخر ہو جاتی ہے۔ اقبال کے کے بعد جعفری صاحب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انسانی قوتوں کی عظمت کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ ان ہاتھوں کی تعظیم و تکریم کرنے کا پیغام دیتے ہیں۔ جو دنیا کو سنوارتے ہیں، سجاتے ہیں اور تعمیر کرتے ہیں ——— ساری کائنات اور کائنات کی ساری اشیاء ان ہاتھوں کی قوتوں کی منتظر ہیں۔ انھیں کے لیے حرکت کر رہی ہیں جنبش میں ہیں۔

اور دھرتی کے سینے میں کانوں کے اندر
کتنی دھاتیں ہیں جو کروٹیں لے رہی ہیں
ان کے جوہر میں جنبش ہے اور دل میں ارمان یہ ہے۔
وہ کوئی اگر ہمیں قیدِ فطرت سے آزاد کر دے
ہم مشینوں کی صورت میں انساں کی خدمت کریں گے
ان کی آنکھوں میں ایک خواب لہرا رہا ہے۔

ریشم اور سوت کے کارخانے
ابر کی طرح دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے
ناچتی جھرجھاں اگنگ آتی ہوئی تکلیاں ، سیکڑوں رنگ
کے تانے بانے
جیسے سورج کی رنگین کرنیں
اپنی لاکھوں لچکتی ہوئی انگلیوں سے
آسمانوں پہ قوس قزح کی حسیں چادریں بن رہی ہوں
ملک کے سنگ اور خشت میں
سرخ پتھر کی اونچی چٹانوں کے دل میں
کتنی محرابیں انگڑائیاں لے رہی ہیں
کتنے دیوار و در، کتنے مینار جو سنگِ مرمر کے سینے میں سوئے
ہوئے ہیں

- - - - - - - - - - - - - -

آج انسان کے دستِ تعمیر کے منتظر ہیں

مندرجہ بالا ٹکڑے میں ایک متحرک دنیا کا نقشہ بڑے خوبصورت پیکروں میں کھینچا گیا ہے۔

نفسیاتی پیکروں کی ایک اور قسم بھی ہے۔ جو ذہنی پیکر کہلائی جا سکتی ہے حالانکہ نفسیات کا تعلق بذاتِ خود حس سے ہے۔ اور حسی قوت میں تمام حواسِ خمسہ شامل ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود بھی ذہنی پیکر کی اپنی ایک الگ زمین ہے۔ حواسِ خمسہ کی بجائے محض جذبات و احساسات یعنی FEELING یا وارداتِ قلبی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں ذہن و قلب کی داخلی کیفیات اور خارجی احساسات دونوں کو دخل حاصل ہے۔ کسی شے کو دیکھ کر، کسی آواز کو سن کر یا کسی چیز کو چھو کر جو احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ بالترتیب بصری، سمعی یا لمسی کہلا سکتا ہے۔ لیکن بعض احساسات معروضی ہوتے ہیں بعض اشیاء غیر مرئی ہوتی ہیں۔ انھیں نہ چھوا جا سکتا ہے۔ نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ سنا جا سکتا ہے۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جیسے ہواؤں کی خنکی۔ اس کو نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ سنا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ ہاں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ خنکی کا یہ احساس جب ذہن سے ٹکراتا ہے۔ تو اپنا ایک مخصوص امیج بناتا ہے۔ اور جب ہم دوبارہ کہیں اس قسم کی خنکی سے دوچار ہوتے ہیں تو تحت الشعور میں بسے پچھلے احساس کی مدد سے ایک نیا پیکر ہمارے ذہن میں بنتا ہے۔ وہ حسی پیکر ہوتا ہے۔ اس میں صرف ہمارے جذبے یا احساس کو دخل ہوتا ہے۔ جب کسی خارجی شئے سے ہمارا اعصابی نظام متاثر ہوتا ہے۔ تو اعصاب متحرک ہو جاتے ہیں اور دماغ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ اس کا اثر دل تک بھی پہنچتا ہے۔ لہذا اس کے نتیجے میں جذبہ یا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جذبہ یا احساس ذہن میں کوئی پیکر بناتا ہے۔ مثال کے طور پر نیند کی کیفیت بھی دراصل اعصاب ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ نیند کا دھیرے دھیرے ہمارے اعصاب پر چھا جانا اور پھر آدمی کا مکمل طور پر غافل ہو جانا محض ایک اعصابی عمل ہے۔ نیند کو نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ نہ سنا جا سکتا ہے۔ نہ چھوا جا سکتا ہے۔ نیند کی اس کیفیت کی عکاسی کرتے ہوئے سردار جعفری ایک ایسا ذہنی پیکر تخلیق کرتے

ہیں۔ جیسے خالص حسی پیکر کہا جا سکتا ہے۔ نیند کے آنے کی کیفیت ملاحظہ ہو۔ اور وہ بھی جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں۔

جیل کے پاسبانوں سے بچتی ہوئی
ہر قدم پر دولہن کی طرح سے ٹھٹکتی ہوئی
آہنی سن کے دیوار کی آڑ سے کر دبکتی ہوئی
چپکے سے کوٹھری میں چلی آئی اور میرے سینے پر سر رکھ دیا
اپنی کالی گھنی زلف کو میرے شانوں پہ پھیلا دیا
آسماں کی بلندی سے "نیلی گھٹائیں" اترنے لگیں
اور پرچھائیاں سی بکھرنے لگیں
ہر طرف تیرگی چھا گئی

- - - - - - - - - - - - - - - -

نیند کا چپکے چپکے، دھیرے دھیرے، بچتے، بچاتے، ٹھٹکتے، دبکتے ہوئے کوٹھری میں داخل ہونا اور بکھر جاتے ہوئے انسان کے سینے پر سر رکھ کر اپنی زلفوں کو اس کے شانوں پر یوں پھیلا دینا کہ ایسے محسوس ہونے لگے جیسے آسمان کی بلندی سے نیلی گھٹائیں اتر رہی ہیں اور چاروں طرف پرچھائیاں سی بکھر گئی ہیں اور اس کے بعد ـــــ ہر طرف تیرگی کا چھا جانا۔ بیک وقت کئی پیکروں کو حسی لباس پہنا دیتا ہے۔۔۔

نیند کا بھرپور لطف اٹھانے کے بعد جو احساس ہوتا ہے۔۔ وہ یہ ہے نیند ہے اک حسینہ
سرمئی آنکھیں ہیں، نیلگوں اس کا سینہ
اس کی پلکوں کے سائے میں خوابوں کی مدہوش پرچھائیاں کھیلتی ہیں

- - - - - - - - - - - - - - - -

رات وہ مجھ کو اپنے مُشک بازوؤں میں اٹھا کر جیل سے لے گئی
دور ـــــ احساس و ادراک کی سرحدوں سے بھی دور
ایک افسانوی سرزمیں تھی
ماضی و حال کی سوتی اور جاگتی وادیوں میں
خواب آلود اپنے دھندلکے کے ایواں
چاندنی کے ستوں اور شفق رنگ محرابیں، پیشانیاں
جن کے عقدِ ثریا سے آراستہ تھیں
(نئی دنیا کو سلام)

نیند کے ماحول کو پیدا کرنے کے لیے افسانوی سرزمیں، سوتی جاگتی وادیاں خواب آلود دھندلکوں کے ایواں، چاندنی

چاندی کے ستون اور شفق رنگ محرابوں کے پیکر مزدوری تھے۔ ورنہ نیند کا احساس اجاگر نہ ہو سکتا۔

رات کا سراپا بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ جو ایک خواب آلودہ فضا کو پیدا کرتا ہے۔ "پتھر کی دیوار" کی ایک نظم "نیند" جو جعفری صاحب نے اپنے بچے کی پہلی سالگرہ کے موقع پر ناسک جیل میں لکھی تھی۔ واقعی ایک اچھی عالمی لوری ہے۔ رات بذات خود ایک خواب آلودہ پیکر نظر آتی ہے۔

نیلگوں جواں سینہ
نیلگوں جواں بانہیں
کہکشاں کی پیشانی
نیم چاند کا جوڑا
سانولی اندھیرے کا
پیرہن سنتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
اور زمیں کے ہونٹوں پر
نرم شبنمی بوسے
موتیوں کے دانتوں سے
کھلکھلا کے ہنستے ہیں

اس جدید لوری میں "آجا ری نندیا" والی کیفیت موجود ہے۔ اور بچے کے تصوراتی ذہن کے لیے خوش رنگ پیکروں کی خواب آلود دنیا بھی سجاتی ہے

حسی پیکر کی ایک اور مثال مریم کے کردار میں ملتی ہے جب وہ ماں بننے والی ہے۔ دوران حمل میں عورتوں کے دل و دماغ پر کس قسم کے تاثرات غلبہ کئے رہتے ہیں اور وہ کس قسم کے جذبات و احساسات کا شکار ہوتی ہیں ان کو جعفری صاحب نے پیکروں کی شکل میں یوں نمایاں کیا ہے۔

کوئی پہلوؤں میں پھڑکتا ہو جیسے
مری سانس میں دل دھڑکتا ہو جیسے
بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ
رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ
لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں
مرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں

خواب میں مجھ کو آواز دیتا ہے کوئی
کروٹیں میرے پہلو میں لیتا ہے کوئی
جیسے بجلی سی لہراتی ہو بادلوں میں
جیسے جھنکار ہو نقرئی چھاگلوں میں
یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی
جیسے بیتاب رگ رگ میں ہو نوجوانی
سنسنی جسم میں چیونٹیاں جیسے رینگیں
درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں

(نئی دنیا کو سلام)

بدن میں ستاروں کی ہے سنسناہٹ " " رگوں میں ہے ہلکی سی اک گنگناہٹ " لہو ناچتا ہے رگیں ٹوٹتی ہیں " میرے جسم سے کونپلیں پھوٹتی ہیں " جیسے جھنکار ہو " نقرئی چھاگلوں میں " یوں مچلتا ہے وہ جیسے سوتوں میں پانی " سنسنی جسم میں چیونٹیاں جیسے رینگیں " اور " درد پیڑو میں رہ رہ کے لیتا ہے پینگیں " یہ وہ پیکر ہیں جن کی صحیح داد صرف ایک عورت اور وہ بھی صرف اور صرف ایک "ماں" ہی دے سکتی ہے۔ یوں بھی اردو میں اس سے پہلے اس موضوع کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کیونکہ شاعروں کا رومانی انداز عورت کو صرف محبوبہ کے روپ میں دیکھنے کا عادی تھا۔ درد اور غم کے احساس کو پیکری لباس یوں پہنایا ہے۔

درد اک چاند ہے
ہوتا ہے جو سینے میں طلوع
غم ہے اک نشترِ نور
جو دل و جاں کے اندھیرے میں اتر جاتا ہے۔ (درد اک چاند ہے)

جنس کے فطری تقاضے کو پیاس کے پیکر میں اس طرح واضح کیا ہے۔

پیاس بھی ایک سمندر ہے، سمندر کی طرح
جس میں ہر درد کی دھار
جس میں ہر غم کی ندی ملتی ہے۔
اور ہر موج
لپکتی ہے کسی چاند سے چہرے کی طرف (پیاس بھی ایک سمندر ہے)

غزل کا ایک شعر بھی کچھ اسی قسم کے احساس کا حامل ہے

پیاس کی شدت سے جب گھبرا کے چیخ اٹھتی ہے روح
بجلیاں حل کر کے پی جاتے ہیں پیمانوں میں ہم

جرعہ جرعہ کرکے ذوقِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کرکے پیمانوں میں ڈھل جائیگی رات

مختصر یہ کہ نفسیاتی پیکروں کی مختلف قسمیں مثلاً بصری، سماعی، لمسی، جسی اور حرکی تمام پیکروں کا ایک امتزاج اس بند میں دیکھئے۔

رواں ہیں وقت کے پُر ہول رہ گزاروں پر
ہزاروں سال کے درماندہ رہ روانِ حیات
نہ کوئی منزلِ آسودگی نہ ..... راہِ نجات
طویل ظلم کا صحرا، طویل جبر کا دشت
یہ آفتاب اسی آسماں پہ آگ کا طشت
اُفق سے تابہ اُفق ہے ہوائے گرم کا گشت
نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پرچھائیں
شجر ہوا میں اڑے جاتے ہیں دھواں ہوکر
ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سناٹے
خموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہو کر

نفسیاتی پیکروں کے علاوہ پیکر سازی کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جسے لسانیاتی پہلو کہا جاتا ہے۔ اس پہلو سے پیکر کے ضمن میں تشبیہات، استعارات، علامات اور تلمیحات وغیرہ آجاتے ہیں۔

حالانکہ استعارہ اپنی جگہ پر ایک الگ صفت کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن پھر بھی پیکر تراشی سے اس کا بہت ہی گہرا قریبی تعلق ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں۔

وہ استعارہ بھی مجازی زبان کی ایک شکل ہے اور پیکر بھی لیکن پیکر استعارے سے زیادہ پیچیدہ اور وسیع ہے۔ اگر استعارہ تجربے کی ایک سطح کو سامنے لاتا ہے تو پیکر ایک سے زیادہ سطحوں کو نمایاں کرتا ہے استعارے میں تصویر ہوتی ہے۔ گویا پیکریت ایک قسم کی SYNTHESIS ہے۔"

استعارہ یقیناً کسی بھی طرح پیکر کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بغیر استعاروں کے پیکر کا تشکیل پانا بھی بہت حد تک ناممکن ہے۔ لہٰذا اس قسم کے پیکر جو خالصتاً استعاروں سے تشکیل پاتے ہیں استعاراتی پیکر کہلاتے ہیں۔ سردار جعفری کے یہاں اس قسم کے استعاراتی پیکروں کی کمی نہیں ہے مثلاً جدید سائنٹفک دور کی زندگی کی جھلک اس طرح دکھاتے۔

کارخانوں کے دل سے دھواں اٹھ رہا ہے
اور مشینوں کے اعصاب جکڑے ہوئے ہیں
نعمت لرہے کی نبضوں میں بجلی کا خوں جم گیا ہے   (نئی دنیا کو سلام)

سائنس کی ترقی ، عقل انسانی کی بلندی ، عالمگیر بھائی چارہ اور انسان کی عظمت کا اعتراف جس طرح میں کیا ہے وہ [illegible]

[illegible] سے آرہا ہے [illegible]

عقل [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے [illegible] جواب میں
منتظر ہیں نگارانِ آتش [illegible]
[illegible] کی [illegible] میں
سینۂ دانش میں [illegible] بیدار ہیں
[illegible] کی چشم لیے خواب [illegible]
کھینچ پھر زلف معشوقۂ نیلگوں
[illegible] شعلے کو پھر دستِ بیتاب میں (مرطوب - آسماں پر داروں کے نام)

نظام سرمایہ داری جو غریبوں کا استحصال اور حق تلفی کرتی آئی ہے ۔ اس کا ننگا ناچ جو رہا ہے جعفری صاحب کے استعارتی پیرایہ میں اس کی شکل یوں ابھرتی ہے ۔

"آج سرمایہ داری" وہ چنچل حسینہ نہیں جس کی بے باکی پر بوڑھی
وہ جاگیرداری [illegible] تھی
جو ہواؤں سے لڑتی تھی ، طوفان سے کھیلتی تھی
جو سمندر میں دھوتی تھی زلفیں
گو [illegible] ان میں سورج کی کرنیں
صبح سے شام تک ناچتی تھیں
اجنبی دیس کے اجنبی ساحلوں پر
قہقہے مارتی تھی
آج سرمایہ داری
بوڑھی قحبہ ہے [illegible] ہے پیسہ اس کا
اب وہ اک سانس لیتی ہوئی لاش [illegible] ہے

فرنگی قانون جس نے ہمیشہ انصاف کا روپ دھار کر انسان کشی کا عمل دہرایا ہے سردار جعفری استعاراتی پیکروں کے ذریعہ اسے یوں سمجھاتے ہیں۔

یہ ہے وہ سانپ جو سینکڑوں سال سے ایشیا اور افریقہ کو ڈس رہا ہے۔
جس کو لندن کے شاہی مدار
اپنی مکاریوں کی پٹاری میں لے کر
ایک اک ملک میں ، ایک اک دیس میں پھر رہے ہیں ۔

یہ دنیا دوزخ ہیں کے [illegible] تماشا [illegible]
[illegible] بنا مر رہے ہیں
[illegible] جیتے جی [illegible] بیٹھے [illegible]

انسانیت دوزخ کا جدید تر حصہ ہے اور جب کی شاعری کا مرکزی تصور نظر آتا ہے۔

استعاراتی انداز میں بیدل خواب تن کر بجھتا ہے
ساری انسانیت ایک تڑپتا ہوا شعلہ ہے۔
اور اس چنگاریاں ہیں
جن سے سینوں میں [illegible] تاب شعلے
برادرس [illegible] تھا
اس تڑپتے ہوئے شعلے سے
جتنی چنگاریاں ٹوٹی ہیں
اتنی ہی اور چنگاریاں چھوٹتی ہیں
گرمی بزم صرف ایک نفس تر تک نہیں ہے

سردار جعفری کا خیال ہے کہ جب انسان نے دنیا میں قدم رکھا تو ساری فطرت ساری کائنات اس سے آمادۂ پیکار ہو گئی لہٰذا کائنات کی مختلف طاقتوں اور اشیاء کی مختلف شکلوں سے انہوں نے پیکر تراشے ہیں۔ جو اس عمرانی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ انسان نے فطرت کو کیسے دھیرے دھیرے مسخر کر لیا

دیو کی طرح سے سانس لیتے سمندر
اپنے سیال جسموں کو جھاگ اور طوفان کی چادروں میں لپیٹے ہوئے تھے اپنے تاریک سینوں میں جنگل
اپنے اسرار اور بھید سب کچھ چھپائے کھڑے تھے۔

- -

اس کی راہوں میں دونوں طرف ڈھیر تھے ہڈیوں کے اور ہر ہر قدم پر
خون میں تھڑے بربریت سروں کے فلک بوس ٹیلے کھڑے تھے۔
جن کی چوٹی پر راتوں کو بھوت اور جنات
اپنی محفل سجاتے تھے اور آتشیں حلقوں میں ناچتے تھے۔
اور تاریخ کے سبزہ زاروں میں بہتے ہوئے خون کی تیز بو سے
ہواؤں کا دم گھٹ رہا تھا

''پتھر کی دیوار'' کی اکثر نظمیں استعاراتی پیکر سازی کا بہترین نمونہ ہیں۔ استعاروں کی دلکشی اور پیکریت کا حسن دیکھنا ہو تو خود پتھر کی دیوار ہی کافی ہے۔ جس میں زخم خوردہ طائروں کی طرح چیختی گھڑیاں ہیں منجمد ستاروں کے مانند سنگ رولے ہیں۔ روز و شب کی راہوں پر رینگتی ہوئی تاریکیں ہیں۔ طاق نسیاں پر رکھے ہوئے زندگی کے گلدستے ہیں پیتوں کی پلکوں پر جگمگاتی ہوئی اوس ہے۔ اطلیوں کے پیڑوں پر مسکراتی ہوئی دھوپ ہے۔ روشنی کے گالوں پر تیرگی کی پرچھائیاں ہیں اور چاند کی جوان نظریں ہیں۔ دھوپ کی سنہری زلف ہے اور منزلوں کے زخموں سے ٹپکتی ہوئی پیپ ہے۔

استعاراتی پیکر کی ایک اور مثال "ورثہ" کی دو نظمیں ہیں

شکنتلا ہے یہاں نہ ہیلن
نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ ہے
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن چکا ہے۔
تمہارے شہر جمال میں،
میرے دل کا کاسہ
چھلک رہا ہے
تم اپنے ہونٹوں کا شہد
آنکھوں کے پھول
ہاتھوں کے چاند دے دو

استعاراتی پیکر کی حیثیت سے یہ شعر بھی کافی خوبصورت ہے۔

تمام رات اندھیرے کا جسم جلتا رہا
تمام رات چھنا رہا سیاہ بو۔

عورت کے شباب کے تذکرے سے اردو شاعری بھری پڑی ہے۔ لیکن کسی شاعر نے عورت کے بڑھاپے سے محبت نہیں کی۔ اور نہ اس روپ کو سراہا ہے۔ سردار جعفری نے جہاں عورت کے تخلیقی روپ کو پیکر کی صورت دی ہے وہیں اس کے بڑھاپے کی تیرگی میں بھی اپنی محبت کی شمع روشن کی ہے۔ اور اس دور کو حسن کا بہترین دور خیال کیا ہے۔ حسن اور عشق دونوں ہی اس مقام پر پہنچ کر "حسین تر" ہو جاتے ہیں۔ اور اگر اسے استعاراتی پیکر کا حسن دے دیا جائے تو پھر حسین ترین کی منزل آ جاتی ہے۔

ہماری عمر رواں کی شبنم
تری سیہ کاکلوں کی راتوں
میں تار چاندی کے گوندھ دے گی
ترے حسیں عارضوں کے رنگیں
گلاب بیلے کے پھول ہوں گے
شفق کا ہر رنگ غرق ہوگا
لطیف پرکیف چاندنی میں
تری کتاب رخ جوان پر
کہ جو غزل کی کتاب ہے اب

زمانہ لکھے گا اک کہانی
وہ ان گنت جھریوں کے اندر
مری محبت کے سارے بوسے
ہزار لب بن کے ہنس پڑیں گے

آخری تین مصرعے کا نئی خوبصورت ہیں جس کی داد نہ دینا بے دادی ہوگی سردار جعفری کا ایک اور نظم وہ میرا سفر ہے، ابھی استعاراتی پیکر تراشی کی ایسی ہی مثال ہے۔ جس میں جعفری کی ذات انسانی زندگی کے لا متناہی سلسلے کو جو روز ازل سے جاری ہے۔ اور ابد تک جاری رہے گا۔ جعفری صاحب نے استعاروں کے ذریعہ بہت خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔ افراد پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے۔ لیکن انسان ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کائنات کبھی انسان کے وجود سے خالی نہیں ہو سکتی

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلا جائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہ میں
کلیوں کی طرح سے ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی

- - - - - - - - - - -

جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی تہوں کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا

آنکھوں کے دیئے، ہاتھوں کے کنول، برگ زباں اور نطق و صدا کی تتلی خوبصورت استعارے ہیں۔ موت کو کالے سمندر سے تشبیہ دینا اور تخلیق انسان کو بیجوں کے ہنسنے اور کونپلوں کا اپنی انگلیوں سے مٹی کی تہوں کو چھیڑنے سے منسوب کرنا ایک اچھوتا خیال ہے۔

جس طرح استعارات پیکروں کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح تشبیہات بھی ذہن میں پیکر در پیکر ایک سلسلہ بناتی ہیں۔ لہذا پیکر تراشی کے ضمن میں تشبیہات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ تشبیہ کے چار لوازمات ہیں (۱) مشبہ جس سے تشبیہ دی جائے (۲) مشبہ بہ جس کو تشبیہ دی جائے (۳) وجہ شبہ (۴) حرف تشبیہ مشبہ اور مشبہ بہ کی لازمی شرط اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تک دو اشیا میں مماثلت نہ ہو یا یہ کہ جب تک شاعر کا ذہن دونوں اشیا سے اثر قبول نہ کرے مشابہت کا احساس پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً محبوب کے چہرے کو چاند سے

تشبیہ دیتے وقت شاعر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پہلے چاند کے وجود سے متاثر ہوا ہو۔ اور پھر اس کا ایک امیج اس کے ذہن میں موجود ہو کہ وہ کتنا حسین اور کتنا روشن ہوتا ہے اور اس کے بعد جب وہ محبوب کا چہرہ دیکھے تو تحت الشعور میں بسا ہوا چاند کا وہ عکس بیدار ہوکر محبوب کے عکس میں گڈمڈ ہو جائے اور تب شاعر سوچے کہ واقعی محبوب چاند کی طرح ہے۔

میر آنا نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

یہ شعر یقیناً تشبیہ کی بہترین مثال ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پہلے میر کے ذہن نے شراب کا نشہ کے احساس سے شرابور ہوا تھا اور یہ احساس ان کے تحت الشعور میں کہیں چھپا بیٹھا تھا کہ شراب انسان کے حواس معطل کر دیتی ہے۔ اور خمار پیدا کرتی ہے۔ جب انہوں نے محبوب کی نیم باز آنکھیں دیکھیں تب ان میں وہی خمار اور مستی تھی۔ جو شراب کے پینے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان ہوش ربا آنکھوں کو دیکھ کر میر کے حواس جاتے رہے۔ لہذا شراب و مستی کا چھپا ہوا عکس تحت الشعور سے نکل کر شعور کی حد میں آیا اور محبوب کی مستی بھری آنکھوں کے عکس میں گڈمڈ ہوگیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ تشبیہ بھی دراصل پیکر ہی کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا ایسے پیکر جو تشبیہوں کے سہارے ذہن میں بنتے ہیں۔ تشبیہی پیکر کہلائے جا سکتے ہیں سردار جعفری کے ہاں کہیں کہیں اس قسم کے پیکر بھی نظر آتے ہیں۔

شب کو جلتے ہیں کنول صبح کو بجھتے ہیں چراغ
مسکراتے ہیں شبستاں میں جوانی کے ایاغ
صبح در کھلتے ہیں محبوب کی باہوں کی طرح
راہ رو چلتے ہیں راہوں میں نگاہوں کی طرح
راستے دوڑ کے اسکولوں میں مل جاتے ہیں
بچے پھولوں کی طرح گھاس پر کھل جاتے ہیں

دروازوں کے کھلنے کو محبوب کی باہوں سے تشبیہ دینے کی وجہ محض یہی ہے۔ کہ شاعر نے محبوب کی باہوں کا کھلنا دیکھا ہے جب محبوب اپنی باہیں وا کرتا ہے۔ تو اس کے دو ہی مطلب ہوتے ہیں۔ یا تو وہ عاشق کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتا ہے یا یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے۔ کہ آغوش میں سمٹا ہوا عاشق واپس لوٹ جائے پہلو سے الگ ہو جائے۔ دروازے کے دونوں کواڑوں کا کھلنا بھی بالکل اسی طرح ہے۔ جب صبح دروازے کے دونوں پٹ کھلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یا تو اندر والا باہر نکل رہا ہے۔ شب گزاری کے بعد۔ یا باہر والا رات بھر کی آوارہ گردی کے بعد گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ جعفری صاحب کے ذہن میں محبوب کی باہوں کا جو امیج تھا اس نے دروازوں کے امیج کے ساتھ مل کر ایک پیکر بنایا جو تشبیہی پیکر ہے۔ اسی طرح گھاس پر چلتے ہوئے ننھے ننھے معصوم شگفتہ چہروں والے بچے اسکول کی جانب روانہ ہوتے ہیں تو بالکل ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ جیسے گھاس میں پھول کھلے ہوں۔ اس منظر کو اگر فوٹو گرافی کی مدد سے کیمرے میں قید کر لیا جائے تو واقعی پھولوں کا تصور پیش کرے گا۔ ایک اور نظم ہے۔

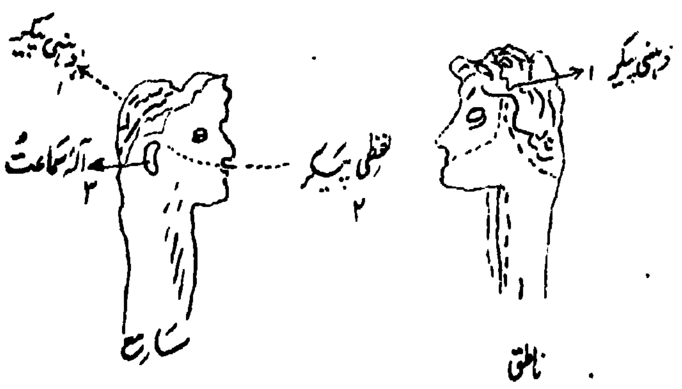
مرے تصور کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسماں سے

چمکتے تاروں سے مسکراتے ہجوم گزریں

"درتم" کے سلسلہ کی ایک اور نظم بھی تشبیہی پیکر سے آراستہ ہے

ہوائیں جو میری رازداں ہیں
وہ میرے ہونٹوں سے لفظ لے کر
تمہارے کانوں کی سیپیوں میں
گہر کی مانند ڈالتی ہیں۔

علم لسانیات کے نقطۂ نظر سے اگر زبان کی ترسیل کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس عمل میں سامع، ناطق، قوتِ سامعہ، قوتِ گویائی اور ذہنی و صوتی علامات اور آلۂ جات کو دخل حاصل ہے۔ خاکہ کچھ اس طرح ہوگا۔



یعنی پہلے ناطق کے ذہن میں کسی شے کا ذہنی پیکر بنتا ہے۔ پھر وہ اسے صوتی یا لفظی پیکر میں ڈھالتا ہے اس میں اس کی قوتِ گویائی مدد کرتی ہے۔ جب یہ لفظی پیکر سامع کی قوتِ سامعہ سے ٹکراتا ہے۔ تو اعصاب متاثر ہو کر ذہن کو خبر کرتے ہیں اور پھر یہ لفظی پیکر سامع کے ذہن میں جا کر پھر سے ذہنی پیکر بن جاتا ہے۔ یوں سامع جان لیتا ہے کہ ناطق کیا کہنا چاہتا ہے۔ جعفری صاحب نے اسی بات کو تشبیہ کی مدد سے پیکری لباس پہنایا ہے۔ شاعر کے ہونٹوں سے جو لفظ نکلے وہ صوتی یا لفظی پیکر ہیں۔ ہوائیں ان لفظوں کو محبوب کے کانوں تک پہنچاتی ہیں۔ یہ کان بالکل اسی طرح کھلے ہیں اور لفظوں کے منتظر ہیں۔ جس طرح سیپیاں منہ کھولے موتیوں کی منتظر ہوتی ہیں۔ ہوائیں اس ترسیل میں مدد دیتی ہیں اور شاعر کے الفاظ کو موتیوں کی مانند محبوب کے سیپ جیسے کانوں میں ڈالتی ہیں۔

کبھی کبھی تو ایک شے سے کئی تشبیہی پیکر تراشے ہیں۔ مثلاً

تیرا خیال کچھ اس طرح دل میں آتا ہے
کہ جیسے ساز کے تاروں پہ راگنی کا خرام
کہ جیسے غنچۂ نورس پہ قطرۂ شبنم
کہ جیسے سینۂ شاعر پہ بارشِ الہام

کہ جیسے سرخ لبوں پر کرن تبسم کی

کہ جیسے دیدۂ تر [illegible]

کبھی اس کے برعکس حسی چیزوں کو سمیٹ کر تجریدی پیکر میں سمویا ہے۔

وہ نیند کی طرح نرم سبزہ
خوابوں کی طرح رمیدہ شبنم
پھولوں کی طرح شگفتہ چہرے
خوشبو کی طرح لطیف باتیں
کرنوں کی طرح جواں تبسم
شعلے کی طرح دہکتی خواہش
تاروں کی طرح چمکتی آغوش
ساغر کی طرح چھلکتے سینے
سب قافلۂ عدم کے راہی
وادیٔ عدم میں چل رہے ہیں (محور کے چراغ)

کہیں تشبیہ در تشبیہ، پیکر در پیکر یا دوہری تشبیہ اور دوہرے پیکر سے کام لیا ہے مثلاً

اس محفلِ صد رنگ میں سو رنگ ہیں میرے
ہر رنگ میں رقصاں ہوں کہ تابانِ جہاں ہوں
خوشبو کی طرح کاکلِ پیچاں کی گلی میں
شعلے کی طرح انجمنِ شعلہ رخاں میں
تلوار کے آغوش میں فولاد کے مانند
تیشے کی طرح کارگہِ شیشہ گراں میں
نشتر کی طرح تیز دلِ اہلِ ہوس میں
مانندِ شرر گرم رگِ سنگِ گراں میں
کانٹے کی طرح دیدۂ اربابِ ستم میں
سرمے کی طرح چشمِ حسینانِ جہاں میں (سو رنگ)

تم نہیں آئے تھے جب تب بھی تو تم آئے تھے
رات کے سینے میں مہتاب کے خنجر کی طرح
صبح کے ہاتھ میں خورشید کے ساغر کی طرح

شاخِ نور رنگِ صبا میں گلِ تر کی طرح

لسانیاتی پیکر کی ایک اور شکل علامتی پیکر ہے ۔ یوں تو علامت نگاری کو یک الگ خصوصیت سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن در حقیقت یہ پیکر سازی ہی کی توسیعی شکل ہے ۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری اسی حیثیت ، ور عصری اُردو شاعری میں [illegible] لکھتے ہیں ۔

پیکر سازی کا عمل خود کشتی ہونے کے باوصف اپنے اندر توسیعی امکانات رکھتا ہے ۔ یہ امکانات بھرپور انداز میں علامت میں ظاہر ہوتے ہیں ۔ الفاظ اور پیکر دراصل زبان کے علامتی نظام کے بنیادی پتھر ہیں ۔ زبان خود اشیاء کے لیے آوازوں کی علامتوں کا ایک مجموعہ ہے ۔ اس لیے ہر لفظ اپنے اندر علامتی پہلو رکھتا ہے ۔ لیکن الفاظ شعریات میں مسلسل استعمال سے مفہوم کی گہرائی اور پر اسراریت کھو بیٹھتے ہیں ۔ اور ان کے محض اوپری معنی متعین ہو جاتے ہیں ۔ شاعر الفاظ کو ان کے سطحی معانی سے پاک کر کے ان کی جبلی قوتوں کے نادیدہ امکانات کا سراغ لگاتا ہے ۔ پس علامت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ پیکر یا لفظ اپنے ظاہری معنوں کے علاوہ عمیق تر اور پیچیدہ تر معانی پر محیط ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔"

فرائڈ نے اس نکتے کی صراحت یوں کی ہے ۔

" فنکار اپنی تشنہ تکمیل آرزوؤں (جو بنیادی جبلتوں کی زائیدہ ہوتی ہیں) کی تکمیل کے لیے بے چین رہتا ہے ۔ یہ آرزوئیں لاشعور کی نچلی سطح سے شعوری سطح پر آنے کی جدوجہد کرتی ہیں اور آخر کار اپنا روپ بدل کر آرٹ کی علامتی صورت میں ظاہر ہوتی ہے ۔"

اور جب یہ علامتی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں تو علامتی پیکر کا روپ دھار لیتی ہیں ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں ۔

" علامت کوئی متعین لفظی صورت نہیں ہوتی ہر لفظ ترکیب ، استعارہ تشبیہ ، دیومالائی اشارہ یا پیکر علامت کا درجہ اختیار کر سکتا ہے ۔ علامت کا اپنا مخصوص مزاج اور مقصد اور عمل ہوتا ہے ہر شاعر تشبیہ استعارہ ، کنایہ و مجازِ مرسل اور پیکروں کے ذریعہ اپنے فکر و خیال کی نقش گری کرتا ہے ۔ مگر جب اس کے خیال اور افکار کی تخصیص کا میدان وسیع اور روشن ہونے لگتا ہے ۔ تو وہ بعض استعاروں یا لفظی شکلوں کو مسلسل برتنے لگتا ہے یہی علامت کی ابتدا ہے ۔"

اُردو شاعری میں علامتوں کی کمی نہیں ۔ ابتدا میں گل و بلبل ، شمع و پروانہ ، ساغر و مینا ، بادہ و جام ، موسیٰ و طور ، فرہاد و بیستون ، مجنوں و صحرا ، علامتوں کی صورت میں استعمال ہوتے رہے ۔ پھر اقبال نے نئی علامتیں ۔ مثلاً بانگِ درا ، رحیلِ کارواں شاہین ، فقر قلندر ، مردِ کامل ، مردِ مومن ، آتشِ نمرود ، خیمہ ، شبنم وغیرہ وضع کیں ۔ اس کے بعد ترقی پسندوں کے ہاں ایک بار علامتوں کی تبدیلی نظر آتی ہے اور سحر ، سورج ، سرخ سویرا ، کدال ، پھاوڑے ، ہتھوڑے ، پرچم ، قمقمہ وغیرہ جیسی علامتیں شاعری میں در آتی ہیں ۔ سردار جعفری کے ہاں بھی اشتراکی علامتیں پیکروں میں ڈھل گئی ہیں ۔

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر

آج کی طرح کل بھی زمیں
چشمۂ نور میں غسل کر کے

سرخ سورج کے آئینے میں اپنی زلفیں سنوارا کرے گی (نئی دنیا کو سلام)

زمین کا چشمۂ نور میں غسل کرنا دراصل ایک انقلابی سحر اور خوشحال مستقبل کی طرف اشارہ ہے۔ جو سرخ سورج کے طلوع ہونے سے پیدا ہوگی اور سرخ سورج اشتراکی نظامِ زندگی کی علامت ہے۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

دیکھو افق پر اندھیرا مچلنے لگا۔
دن شفق کی سنہری پہاڑی سے ڈھلنے لگا
اب تلک شام کا چمپئی رنگ آنچل فضاؤں میں لہرا رہا تھا
آسماں پھول برسا رہا تھا۔
لیکن اب ایک ایک سرخ پھولوں کی ہر پنکھڑی سُرمئی ہو چکی ہے۔
روشنی تیرگی کے سیہ غار میں کھو چکی ہے۔

یہ اس وقت کا منظر ہے جب انقلابی جاوید (نئی دنیا کو سلام) ظالم فرنگی کے سامنے اپنی انقلاب آور بغاوت کا اقرار کرتا ہے اور فرنگی اسے اس جرم کی پاداش میں سزائے موت سناتا ہے۔ تختۂ دار پر جانے سے پہلے جاوید کا احساس علامتی پیکروں میں ڈھل گیا ہے۔ انقلاب کی شکست اور جبر و استبداد کی فتح کو سرخ پھولوں کی پنکھڑی کے سرمئی ہو جانے اور روشنی کا تیرگی کے سیہ غار میں کھو جانے جیسے پیکروں سے واضح کیا گیا ہے۔

ایک اور موقع پر جاوید مزدوروں کی طاقت کا اظہار علامتی انداز میں یوں کرتا ہے۔

کھیتیاں خاک کی گود سے اٹھ رہی ہیں۔
اب کے سال ان کی شاخوں میں ہنسیئے پھلے ہیں۔
کارخانے ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں، کروڑوں ہتھوڑے اٹھائے ہوئے ہیں۔

ہتھوڑے اور ہنسیئے مزدوروں کی طاقت کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ انقلاب اور خونِ شہیداں سے شاداب سرزمین کے خوش آئند مستقبل کی طرف سردار جعفری یوں اشارہ کرتے ہیں

لیکن اب وہ گھڑی آگئی ہے کہ ہر زخم سے ہونگی پیدا
ہزاروں زبانیں جو دریا کو، وادی کو، کوہسار کو، دشت
کو، در کو، میدان کو ایک ایک اینٹ ایک ایک پتھر کو، ایک ایک ذرے
کو پیغام دیں گی۔۔۔ ـــــــ بغاوت

اور ان پھانسیوں اور جیلوں کے پیچھے دہکتے افق پر مچلتے ہوئے سرخ خوں کے سمندر سے موجوں کے بیتاب سینے کو یوں
چیر کر آسماں پر ابھر آئے گا سرخ آزاد
دنیا کا آزاد سورج
جس طرح ماں کی گودی میں بچہ

سرخ رنگ سے سردار جعفری نے کئی علامتی پیکر بنائے ہیں۔ مثلاً

بزم احباب ہے پیمانۂ گلرنگ اٹھائیں
شکوۂ جور و جفا غرقِ مئے ناب کریں
بادۂ سرخ سے خورشید درخشاں کو جگائیں
آج ہر ساغرِ بلور کو مہتاب کریں

اِشتراکی انقلاب کی کامیابی پر کہتے ہیں۔

آ تیرے ہونٹ چوم لوں اے مژدۂ نجات
صدیوں کے بعد ختم پہ آئی ستم کی رات
ہر شاخ پر کھلے ہوئے رنگِ شفق کے پھول
ہر نخل کی کمر میں نسیمِ سحر کا ہات

• •

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب اُبلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

علامتیں اکثر تلمیحات سے جنم لیتی ہیں اور تلمیحات کسی خاص واقعہ پر مبنی ہوتی ہیں کبھی کبھی خالص تلمیحات کی مدد سے بھی پیکر تشکیل دیئے جاتے ہیں۔ ایسے پیکر تلمیحی پیکر کہے جا سکتے ہیں۔ کوئی خاص تاریخی، سیاسی، سماجی، یا مذہبی واقعے کی طرف بلیغ اشارہ تلمیح کہلاتا ہے۔ سردار جعفری کے ہاں تلمیحات کی مدد سے بڑی خوبصورت پیکر نظر آتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اہلِ حق نے سچائی کے پرستاروں نے سدا ظلم اٹھائے ہیں پتھر کھائے ہیں۔ لہولہان ہوئے ہیں صلیب و دار کی منزلوں سے گزرے ہیں، زہر پیا ہے، خنجر سر رکھ دیا ہے۔ طوق و سلاسل کا بوجھ اٹھایا ہے۔ اور خود پیاسا رہ کر تیغوں اور خنجروں کی پیاس بجھائی ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت محمدؐ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسین علیہ السلام جیسے صاحبانِ حق کے واقعات سے استفادہ کر کے سردار جعفری کہتے ہیں

کوئی مقام نہیں اہلِ درد کے قابل
کوئی بہشت نہیں اہلِ آرزو کے لیے
تمام صحنِ چمن مقتلِ تمنا ہے
کفن لہو کا ملا ذوقِ جستجو کے لیے
لیا ہے ہنس کے کبھی سنگِ محتسب سر پر
بھرے ہوئے ہیں کبھی ساغر و سبو کے لیے

نشیبِ خاک کبھی شوقِ خاکساری ہے
فرازِ دار کبھی عظمتِ گلو کے لیے
دفائے عشق سے کوئی خفا نہیں لیکن
بس ایک تیغ کہ پیاسی ہے جو لہو کے لیے (اہلِ درد)

حضرت عیسیٰ اور امام حسینؑ یہ دو کردار وہ ہیں جو سردار جعفری کے ہاں اکثر تلمیحی پیکروں میں استعمال ہوئے ہیں۔ واقعۂ کربلا کی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ خیر و شر اور حق و باطل کا جو تصادم اس میدان کارزار میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ تمام عالم انسانیت کے لیے مشعلِ راہ کا کام کر رہا ہے۔ صداقت کی شمعوں کی روشنی سے دنیائے انسانیت کو منور کیے ہوئے ہے۔ شہیدوں کے لہو نے جو پھول کھلائے، جو چراغ روشن کیے ان سے سردار جعفری نے اپنی شاعری میں تلمیحی پیکر تراشے ہیں۔

ہر ایک خوشی درد کے دامن میں پلی ہے
نسبت ہے ہر اک نغمے کو بسمل کے گلو سے
پیراہنِ گل، دستِ حنا، پنجۂ گلچیں
رنگیں ہے ہر اک چیز شہیدوں کے لہو سے

ایک اور جگہ پیکریت اور واضح طریقے سے سامنے آتی ہے۔

کس قدر سفاک ہیں ان قاتلوں کے خط و خال
کتنی تابندہ شہیدانِ وفا کی ہے جبیں
شوخ اور بے باک کتنا بے گناہوں کا لہو (خنجروں کی روشنی میں)

قتلِ حسینؑ کے بعد بھی رات کے سناٹوں میں نشیبِ خاکِ کربلا سے کسی کے رونے کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ اور ماحول دردناک ہو جاتا تھا۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر سردار جعفری تلمیحی پیکر کی تشکیل کرتے ہیں۔

شب کے سناٹے میں یہ کس کا لہو گاتا ہے
سرحدِ درد سے یہ کس کی صدا آتی ہے

حضرت عیسیٰ بھی سچائی کے نشان کی حیثیت سے آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اور جب جب دنیا گناہوں سے بھر جائے گی، برائیاں عام ہو جائیں گی۔ وہ حق کے اظہار کے لیے پھر دنیا میں ظاہر ہوں گے، صلیب پر چڑھیں گے اور صبح نو طلوع ہوگی۔ سردار جعفری اسی پیغمبر مسیحا دستؑ کا کب سے انتظار کر رہے ہیں

سنا ہے آئے گا پیغمبر مسیحا دست

- - - - - - - - - - - - - - -

نشیبِ خاک بھرے گا قمار خانوں میں
فرازِ دار پہ ہوگا پیمبری کا مقام

- - - - - - - - - - -

گھٹا کی طرح سے جھومیں گے تیرگی کے نشان
سیاہ رو نظر آئے گا آفتاب کا جام

اس میں انجیل کے حوالوں سے مدد لی گئی ہے۔ شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب حضرت عیسٰی کو صلیب پر چڑھایا گیا۔ تو صلیب کے نیچے بیٹھے ہوئے سپاہی حضرت عیسٰی کے کپڑوں کے لیے قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ دوسرے شعر میں حضرت عیسٰی کی شہادت کے وقت جو اندھیرا چھا گیا تھا۔ اور آفتاب سیاہ رنگ ہو گیا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آفتاب کے جام کا سیاہ رو ہونا شہادتِ عیسٰی پر ماحول کے سوگوار ہو جانے کے مترادف ہے۔

پھر جعفری صاحب انجیل کے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ایک دن وہ آئے گا۔ جب عیسٰی دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں آئیں گے اور ماحول پُر تنویر ہو جائے گا۔ اندھوں کی آنکھوں کو بینائی اور کوڑھیوں کے تندرست ہو جانے کا جو اعجاز، اس مسیح کے ہاتھوں میں تھا، پھر سے دہرایا جائے گا۔ اور مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مسرّت کی ابتدا ہو گی۔

سنا ہے نکلے گی میلادِ نو کے جشن کی بات
صلیبِ ظلم سے اترے گی پھر مسیح کی لاش

....

وفورِ نور سے معمور ہوگا دیدۂ کور
کرن کی طرح سے بالیدہ انگلیاں ہوں گی
سروں پہ سایۂ رحمت بنیں گے دستِ شفیق
جبیں درد سے پیدا تجلیاں ہوں گی

....

وہ ہاتھ جن کو پہنائی گئی ہیں زنجیریں
وہ ہاتھ چھید چکی ہے جنہیں صلیب کی کیل
وہ ہاتھ شعلہ حق بن کے ہو رہے ہیں بلند
اندھیری رات میں روشن ہے صبحِ نو کی دلیل		(پیغمبر مسیحا دست)

انگلیوں کا کرن کی طرح بالیدہ ہونا، دستِ شفیق کا سروں پر سایۂ رحمت بن کر چھا جانا، جبینِ درد سے تجلیاں پیدا ہونا اور ہاتھوں کا شعلۂ حق بن کر بلند ہونا ـــــ حالانکہ یہ سب تلمیحات ہیں۔ لیکن پیکروں کی حسین شکل ہیں۔

حضرتِ موسٰی اور کوہِ طور کے واقعے سے کون واقف نہیں۔ لیکن انسان کے خلاء کے پہلے سفر کے موقع پر سردار جعفری اس حقیقت کو تلمیحی پیکر کا جامہ یوں پہناتے ہیں۔ کہ عظمتِ انسان واضح ہو جاتی ہے اور کائنات سے اس کا گہرا رشتہ صاف پہچانا جا سکتا ہے۔

آج دستِ جنوں پر ہے شمعِ..... خرد
دو جہاں جس کے شعلے سے معمور ہیں

جتنے سورج خلاؤں میں مستور ہیں
کہہ دو برق تجلی سے ہوں جلوہ گر
آج موسیٰ نہیں ہم سرطور ہیں (سرطور)

زبان و بیان کی ایک خوبی حقیقت نگاری اور منظر نگاری بھی ہے جو نثر و نظم دونوں کے لیے ضروری ہے۔ اور ایک قادر الکلام شاعر کی سب سے بڑی خصوصیت بھی! ــــ میر انیسؔ اس ضمن میں سرفہرست نظر آتے ہیں۔ میر انیسؔ نے میدان جنگ ہو یا خیام حسینی کا منظر، حقیقت نگاری کے ذریعے وہ وہ تصویریں کھینچی ہیں کہ قاری خود بھی اس رزمیہ میں ایک کردار کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ آنکھوں کے سامنے تیر چلتے ہوئے نیزے پھینکتے ہوئے تلواریں چلتی ہوئیں گھوڑے دوڑتے ہوئے علم لپکتے ہوئے سنیں چلتی ہوئی، نقارے بجتے ہوئے اور خیمے جلتے ہوئے دیکھتا ہے یہ وہ ذہنی تصویریں ہیں جنھیں صفحہ قرطاس میں بآسانی قید کیا جاسکتا ہے غالب کے اکثر اشعار بھی ایسی ہی مصوری سے مزین ہیں۔ جس کی وجہ سے چغتائی اتنا جاذب مرقع بنا سکے کہ مصور دیوان غالب وجود میں آگیا جعفری کے ہاں بھی ایسے مرقعوں کی کمی نہیں۔ یہ وہ تصویریں ہیں جنھیں مصور بآسانی کینوس پر اتار سکتا ہے۔ شاید اسی لیے اپنے وقت کا مشہور مصور حسین، جعفری صاحب کے پیراہن شعر کو کاغذ پر پھیلا دینے میں کامیاب ہے۔ ایسے پیکر جو باقاعدہ مصوری یا تصویر کشی کے خوبصورت نمونے پیش کرتے ہیں۔ تصویری یا عکسی پیکر کہے جاسکتے ہیں۔ جعفری صاحب کی بعض نظمیں تو خالص PAINTINGS کے نمونے ہیں۔ خاص طور پر تجریدی آرٹ کے شعری نمونے ان کے ہاں بے شمار ہیں۔

ان کی نظم "نسیم تیری قبا" NUDE PAINTING کی بہترین مثال ہے۔ عورت کے برہنگی کو جو پیکری حسن انہوں نے بخشا ہے اس نے اس نظم کو اجنتا اور ایلورا کی طرح ایک فنی شہپارہ بنا دیا ہے۔

نسیم تیری قبا بوٹے گل ہے پیراہن
صباء کا رنگ ردائے بہار اوڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیل سحر، جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے

رومانی شکست خوردگی، فراق کے جذبات اور حسین یادوں کی کیفیت کا تصویری پیکر یوں بنایا ہے۔

دل پہ جب ہوتی ہے یادوں کی سنہری بارش
سارے بیتے ہوئے لمحوں کے کنول کھلتے ہیں
پھیل جاتی ہے تری حرف وفا کی خوشبو
کوئی کہتا ہے مگر روح کی گہرائی سے

شدت تشنہ لبی بھی ہے ترے پیار کا نام ۔ ۔ ۔ ۔ سیاسی احساس کے ساتھ ساتھ وحدت نام ہے کشمیر تک کے خون آلودہ اُفق کو اپنی آنکھ کے کیمرے میں قید کر کے لفظوں سے جو تصویر بناتے ہیں وہ آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ اور وہ بھی جدید مصوری کا ــــ

پھر چلا جنگ کا دیوتا
سرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے
خون کی پیاس سے
گوشت کی بھوک سے
چیختا اور چنگھاڑتا
آسمانوں پہ عفریت کی طرح اڑتا ہوا
موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا

- - - - - - - - -

فصلیں سہمی ہوئی
کھیت گھبرائے گھبرائے سے
جو فضائیں نئی کونپلوں کی مہک سے معطر تھیں وہ
گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں
خون کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں پر
مندروں، مسجدوں، اور کلیساؤں کے دامنوں پر　　(دعا)

میں آرٹسٹ نہیں لیکن پھر بھی یقین ہے کہ اگر اس نظم کو تصویر کا جامہ پہنایا جائے تو تجریدی تصویر کشی کا ایک خوبصورت نمونہ تشکیل پا سکتا ہے۔

ایک اور خوبصورت پینٹنگ "نئی دنیا کو سلام" کے اختتام پر ہے۔ جس میں آدمی کی گزرگاہ، شاہراہِ حیات کا نقشہ کھینچا ہے۔

ادھر سے گزرے ہیں چنگیز و نادر و تیمور
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلیں جلائے ہوئے
غلاموں اور کنیزوں کے کارواں آئے
خود اپنے خون میں ڈوبے ہوئے نہائے ہوئے
شکستہ دوش پہ دیوارِ چین کو لادے
سروں پہ مصر کے اہرام کو اٹھائے ہوئے

- - - - - - - - -

بغاوتوں کا سپہ انقلاب کے لشکر
زمیں پہ پاؤں فلک پر نظر جمائے ہوئے
غرورِ فتح کے پرچم ہوا میں لہرائے

ثبات و عزم کے اونچے علم اٹھائے ہوئے
ہتھیلیوں پہ لئے آفتاب اور مہتاب
بغل میں کرۂ ارض حسین دبائے ہوئے

تصویری پیکر کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو

جب ترا نام لیا دل نے تو دل سے میرے
جگمگاتی ہوئی کچھ وصل کی راتیں نکلیں
اپنی پلکوں پہ سجائے ہوئے اشکوں کے چراغ
سر جھکائے ہوئے کچھ ہجر کی شامیں گزریں
قافلے کھو گئے پھر درد کے صحراؤں میں (جب ترا نام لیا)

پیکروں کے سلسلے میں ایک عجیب بات یہ ہے۔ کہ جب بھی پیکر تراشی کا تذکرہ ہوتا ہے محض ان پیکروں کو مد نظر رکھا جاتا ہے جن میں لفظی و لسانیاتی حسن ہوتا ہے۔ ایسے پیکر جو سماجی یا سیاسی شعور کا اظہار کرتے ہیں اکثر و بیشتر نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ ایسے پیکر بھی قابلِ اعتنا ہیں جن میں شاعر کسی مخصوص نظریۂ حیات یا سماجی یا سیاسی نظریہ کا اظہار کرتا ہے سردار جعفری کے ہاں ایسے پیکروں کی کمی نہیں۔ ان پیکروں کو آپ نظریاتی یا تصوراتی پیکر کہہ سکتے ہیں۔ جعفری صاحب چونکہ اشتراکی نظامِ حیات کے حامی ہیں لہٰذا ان کے ہاں جو سماجی نظریہ ملتا ہے۔ وہ نظامِ زر و سیم کے خلاف ہے وہ ظالم سے نفرت اور مظلوم کی حمایت کرتے ہیں اور جہاں کہیں کسی پر ظلم ہوتا دیکھتے ہیں۔ اسے اپنے لفظی پیکروں میں قید کر دیتے ہیں۔ ان کی نظم "دور مرے عزیز و مرے رفیقو" ایسے ہی نظریاتی پیکروں میں غرق ہے۔

....

میں اپنے سینے کو چاک کر کے
اگر تمہیں اپنا دل دکھاؤں
تو تم کو ہر زخم کے چمن میں
ہزار سروِ رواں ملیں گے

....

مگر کوئی توڑنے دے رہا ہے
لرزتی مژگاں کے نشتروں کو
دلوں کے اندر اتارتا ہے
کوئی سیاست کے خنجروں کو
کسی کے زہریلے تیز ناخن
عقاب کے پنجہائے ـــــ خونیں

کی طرح آنکھوں پہ آ رہے ہیں
گلاب سے تن مثالِ بسمل
زمیں پہ تلملا رہے ہیں
جو پیاس پانی کی منتظر تھی
وہ سولیوں پر ٹنگی ہوئی ہے
وہ بھوک روٹی جو مانگتی تھی
صلیب زر پر چڑھی ہوئی ہے
سیاہ بارود کی لکیریں......
کٹیلے کاجل، سجیلے سرمے
کے بانکپن سے الجھ گئی ہیں
خزاں کے کانٹوں کی انگلیاں کیوں
ہر اک چمن سے الجھ گئی ہیں
مجھے بتاؤ ہوئے کیسے
حنا کے چادر کو دھو دیا ہے
حیات کے پیرہن کو انساں
کے آنسوؤں نے بھگو دیا ہے

تاریخ اور وقت کا انقلابی تصور سردار جعفری نے جن پیکروں میں پیش کیا ہے وہ مظلوموں کو انقلاب کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں

تم اپنے تیشے اٹھا کے لاؤ
میں لے کے اپنی کدال نکلوں
ہزار ہا سال کے مصائب
ہزار ہا سال کے مظالم
جو روح و دل پر پہاڑ بن کر
ہزار ہا سال سے دھرے ہیں
ہم اپنے تیشوں کی ضرب کاری
سے ان کے سینوں کو چھید ڈالیں
یہ صرف ہے ایک شب کی محنت
جو عہد کر لیں تو ہم سحر تک

حیاتِ نو کے نئے اجنتا
نئے ایلورا تراش ڈالیں

ایک اور جگہ طبقاتی استحصال کا تصور پیکروں میں یوں پیش کرتے ہیں۔

دیکھو کس طرح مزدور جو جسم پر پیرہن کی جگہ اپنی تھکاں پہنے
ہوئے پھر رہے ہیں
صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹتے وقت اپنے دڑبے بلوں
سے نکلتے ہیں اور کارخانوں میں جاکر
اپنا اور اپنے بچوں کے دل کا لہو بادۂ ارغوانی میں تبدیل کرکے
خون آشام سرمایہ کے جام میں ڈالتے ہیں
شام کو کارخانے اگل دیتے ہیں ان کو جھلسی ہوئی راکھ کا ڈھیر
کرکے
اور پھر رات کے وقت طاعون، دق اور سل کے یہ بھوت
موت کے بھیڑیوں کی طرح آتے ہیں اور بھوک کے دیوں اور سوکھی
ہوئی ہڈیوں کو چبا ڈالتے ہیں۔

ان تمام پیکروں کے علاوہ اور بھی بے شمار پیکر مثلاً آنکھ کے ہیرے، ماہتو دریا، من کا سونا، تن کی چاندی، آرزو کی ہتھیلی پر جلتے ہوئے چراغ۔ رنگِ حنا کے پھول، تمنا کے ساغر، ہجر کے درد کا چاند، وصلِ محبوب کا سرخ خورشید، تصور کا پری خانہ، درد کی شمع، یادوں کی کہکشاں، تمناؤں کا گل چہرہ کنیزوں کا ہجوم وغیرہ وغیرہ جعفری صاحب کے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ سردار جعفری نے پیکر سازی کی مختلف شکلوں کو نئے نئے انداز میں یوں برتا ہے کہ ان کی شاعری ایک آئینہ خانہ بن گئی ہے جس نے نہ صرف ان کے فن کو شگفتہ بنادیا ہے بلکہ اس خصوصیت کی بنا پر انھوں نے ترقی پسند گروپ سے منسلک ہونے کے باوجود جدید شاعروں کے لیے ایک ذہنی و ادبی شاہراہ کھول دی ہے۔ ●

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

سردار جعفری کی شاعری

اُردو ادب میں کسی بھی تحریک سے زیادہ ترقی پسند تحریک کا عوام سے گہرا اور قریبی رشتہ رہا ہے۔ شعر و ادب کو درباروں و محلوں سے نکال کر عوامی زندگی اور کوچوں بازاروں سے ہم آہنگ کرنے کی جو مساعی کی جا رہی تھیں، ترقی پسند تحریک اُن کا نقطۂ عروج ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس تحریک میں جوش جیسے شاعر بھی ہیں، جنہوں نے تحریک کو کامیاب اور موثر بنانے میں بھرپور اور لائق تحسین کردار ادا کرنے کے باوصف اپنی نظموں میں آبائی امارت کے خمار پر اظہارِ افتخار کیا ہے۔ بعض شاعر ایسے بھی ہیں، جنہوں نے عوام مزدوروں اور کاشتکاروں کا ذکر محض منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لیے کیا ہے، یا صرف نعرہ بازی کی حد تک یا ایسے شاعر جنہوں نے عوام کے لیے شاعری کی، اور عوامی فلاح و بہبود، مسرت اور خوشحالی کو اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا، سردار جعفری اُن میں سے ایک ہیں اور ترقی پسند تحریک میں ایسے شاعروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔

سردار جعفری کی شاعری کا اہم وصف، اُس کا مقصدی ہونا ہے۔ جو چیز اُن کو اپنے ہم عصر شاعروں میں ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ اُنھوں نے ترقی پسند تحریک کے امیج کو بھرپور اور صحیح طریقہ پر پیش کیا ہے۔ لوگ چاہے ترقی پسند تحریک کے مقصد اور امیج سے اختلاف کریں، لیکن شاعر کے خلوص پر ایمان لانے پر مجبور ہوں گے ــــــ سردار جعفری اُردو ہی کے نہیں اِس عہد کے، کسی بھی زبان کے اُن چند شاعروں میں شمار کیے جا سکتے ہیں جن کی شاعری کا مقصد و محور عوام ہیں موضوعات، زبان اور اسلوب، ہر پہلو سے ــــــ اِس کو ترقی پسند تحریک کی دین بھی کہہ لیجیے، لیکن اس میں سردار جعفری کی شخصیت، اُن کے ذاتی مذاق اور مزاج کو بڑا دخل ہے۔ ترقی پسند تحریک کا وجود نہ ہوتا تب بھی سردار جعفری کی شاعری انہی موضوعات کا احاطہ کرتی، عوامی دلوں کی دھڑکن ہوتی، کاشتکاروں کے جذبات کی تصویر ہوتی، مزدوروں کے احساسات کا عکس ہوتی، مظلوموں اور بے کسوں کے حقوق کی کی ترجمان ہوتی ــــــ اِس کا محرک ابتدائی عمر کا اُن کا ماحول ہے۔ اُن کے مشاہدات اور تجربات ہیں، جن کا تفصیلی ذکر اُنھوں نے اپنی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں کیا ہے۔ مزدوروں کو برہنہ کر دینا۔ عورتوں کو درختوں پر لٹکا دینا غرض ظلم و ستم، بہیمیت اور استبداد کی نہایت لرزہ خیز داستانیں! بلرام پور کے یہی وہ حالات ہیں جن میں سردار جعفری کے شعور کی تہذیب ہوتی ہے، اتفاق ہی سمجھیے یہاں اُن کو انیس، غالب اور اقبال کے کلام کے مطالعہ کا موقعہ ملا۔ جو بربریت اور سفاکی اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ ان شاعروں کے مطالعہ سے اُنہوں نے اِس کے خلاف آواز بلند کرنا سیکھا۔ اور یہ بھی کہ آواز بلند نہ کرنا ایک المیہ، بد دیانتی اور جرم ہے جس کو انسانیت کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک سے باضابطہ طور پر وابستہ ہونے

سے قبل ہی اُن کی شاعری میں وہ جوہر نمایاں ہو چکے تھے جن سے انسانیت کی آبرو اور اعتبار قائم ہے اور جن کے باعث ترقی پسند تحریک بھی سرخرو رہی ہے۔

سردار جعفری کی شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو ایک عام انسان کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ حُسن و عشق کے معاملات سے لے کر زندگی کی معمولی ضرورتوں کے مسائل، اس عہد کا داخلی کرب بھی، لیکن کہیں بھی افراط و تفریط نہیں۔ یہی توازن اُن کی شاعری کو توانائی بخشتا ہے۔

زندگی کے گھناؤنے اور مسخ شدہ پہلوؤں پر سردار جعفری کی نگاہ ہے۔ زندگی جن قیود اور پابندیوں سے دوچار ہے اُن کو محسوس کرتے ہیں۔ زندگی کو جن پُرپیچ راہوں کا سامنا ہے اُس کا انہیں اندازہ ہے۔ وہ تخریبی قوتیں جو زندگی کے درپے آزار ہیں اُن کی سازباز سے وہ باخبر ہیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی کی برگزیدگی کے قائل ہیں۔ حیات بخش توانائیوں اور عظمتِ انسانی پہ یقین رکھتے ہیں۔ اس کی کامیابی و کامرانی کو اٹل سمجھتے ہیں۔ اُن کی شاعری میں جگہ جگہ اِس خصوص میں اشارے ملتے ہیں۔ اِس موضوع کو اُنہوں نے اپنی مختلف نظموں میں پیش کیا ہے۔ اُن کی طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" کا تو موضوع ہی یہ ہے۔ مزید برآں "ایک خواب اور" کی وہ نظم جس کا عنوان ہی "زندگی" ہے، میں، زندگی پر اُن کے بھرپور عزم و ایقان کا اظہار ہوتا ہے۔ ؎

مالکِ خشک و تر بھی ہے، فاتحِ بحر و بر بھی ہے
صاحبِ تاج و زر بھی ہے، خالقِ خیر و شر بھی ہے
اشک بھی ہے، گہر بھی ہے، سنگ بھی ہے شرر بھی ہے
شاہِ شہاں ہے زندگی، میرِ جہاں ہے زندگی

گاہ غرورِ تاجدار، گاہ شکستِ شہریار
گاہ سرورِ اہلِ دل، گاہ شعورِ دستکار
گاہ طلسمِ رنگ و بُو، گاہ فریبِ چشم کار
گاہ فروغِ جلوۂ ماہ وشاں ہے زندگی

زندگی پر اِس شدت کے ساتھ اعتماد اور افتخار نے سردار جعفری کی شاعری میں ایک وقار اور بانکپن پیدا کر دیا ہے۔ اسی کے ساتھ اُن کے لب و لہجہ میں ایک طرح کی تلخی پیدا ہو جاتی ہے جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کی حق تلفی کی جا رہی ہے۔ آزادی سلب کی جا رہی ہے۔ اُس کو پھلنے پھولنے سے روکا جا رہا ہے۔ احتسابات اور قیود عائد کیے جا رہے ہیں۔ اسی تلخی سے اُن کے کلام میں احتجاجی Millitant کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو اُردو شاعری میں اُن کے لیے مخصوص ہے۔ یہ احتجاجی کیفیت اُن کی کئی نظموں میں ہے لیکن اُن کے ہاں نہ تو پوری طرح "انقلابیت" ہے اور نہ باغی میلان (یوں بھی انقلابی اور باغی ہونا کوئی کارنامہ نہیں) ــــــــ احتجاج، ہر انسان دوست، ہر دردمند دل، ہر حق پسند اور پُرخلوص انسان کرتا ہے۔ جب کہ باغی یا انقلابی کچھ اور ہی مزاج کا حامل ہوتا ہے، اُس کی ساخت پرداخت کچھ اور ہی حالات میں ہوتی ہے۔ سردار جعفری انسان دوست ہیں، دردمند دل رکھتے ہیں، حق پسند ہیں اور مخلص بھی، لیکن اُن کو وہ ماحول نہ مل سکا جس میں باغیوں اور انقلابیوں کی نشوونما کے لیے جراثیم پائے جاتے ہیں؛ سردار جعفری پر ہی کیا منحصر، اُردو کے کسی بھی شاعر کو ایسا ماحول نہیں ملا [illegible]

سردار جعفری کا کلام نہ ٹھیٹ انقلابی ہے نہ باغیانہ ——— ہاں چند انقلابی اور باغیانہ عناصر اور جھلکیاں اِس دَور کے چند اور شاعروں کی طرح اُن کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔

سردار جعفری اُردو شاعری کے اُس دَور کی پیداوار ہیں جو رُومان اور انقلاب کے امتزاج کا دَور تھا۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی اور ترقی پسند تحریک کے باعث اُردو شاعری نے چولا ضرور بدلا تھا، لیکن کسی بھی شاعر کو رومانیت سے دامن چھڑانے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سردار جعفری اور اُن کے رفقاء فیضؔ، مخدومؔ، ساحرؔ، جاں نثار اخترؔ، مجازؔ، جذبیؔ، کیفیؔ اعظمی، اِن سب کی شاعرانہ زندگی کا آغاز رُومانیت ہی سے ہوا ہے۔ اُن کے پیش رَو شاعروں میں حتّٰی کہ جوشؔ بھی، جو انقلاب و انقلاب کا نعرہ بلند کرتے ہیں اور بعض حلقوں میں شاعرِ انقلاب کہے جاتے ہیں، بُنیادی طور پر رُومانیت پسند شاعر ہیں۔ اور نو اور سردار جعفری بھی جوشؔ کے انقلابی ہونے پر معترض ہیں۔ سردار جعفری نے جوشؔ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے کم و بیش وہی خیالات سردار جعفری کے بارے میں درست کہے جا سکتے ہیں؛

"جوشؔ کی رُومانیت جو وطن کی محبت اور آزادی کی خواہش سے پیدا ہوئی، صحت مند اور انقلابی عناصر کی حامل ہے اور دُنیا کو تبدیل کر دینے کے جذبے سے سرشار ہے۔ اس لیے وہ حقیقت سے گریز نہیں کرتی بلکہ حقیقت کی بدصورتی اور حُسن کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ سماج کے ظلم، فریب اور ریا کا پردہ چاک کرتی ہے اور عدل انصاف اور محبت کی ترغیب دیتی ہے"۔ [1]

مگر جوشؔ اور سردار جعفری کی رُومانیت میں کچھ فرق بھی ہے۔ جوشؔ کی رُومانیت حد درجہ جذباتی ہے، سردار جعفری کے ہاں جذباتیت کم ہے اور حقیقت پسندی کا عنصر کسی حد تک زیادہ۔ اسی جذباتیت کا رّدِعمل ہے کہ جوشؔ کا تصوّرِ آزادی بھی جذباتی ہے۔ اُن کے ہاں جوش و جذبہ اور ہمہمہ و ولولہ کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ حقیقت نگاری کم۔ سردار جعفری کی بات قدرے مختلف ہے۔ جوشؔ نے عوام کے لیے شاعری ضرور کی ہے۔ مزدوروں اور کسانوں کو اپنی منظومات کا ہیرو بھی بنایا ہے، لیکن وہ مزدوروں اور کسانوں میں گھُل مِل نہ سکے۔ عوام اور اُن کے مابین ایک دیوار سی حائل رہی۔ برخلاف اس کے سردار جعفری نے عوام کے لیے شاعری کی ہے اور عوام میں رہ کر شاعری کی ہے۔ وہ اِس سلسلہ میں مخدومؔ سے زیادہ نزدیک ہیں۔ اُنہوں نے جہاں قومی اور بین قومی سیاسی زندگی سے موضوعات حاصل کیے ہیں۔ وہیں عوامی زندگی سے بھی راست اکتساب کیا ہے۔ اِسی لیے اپنی رُومانیت اور جذباتیت کے باوجود اُن کے ہاں حقیقت نگاری کا پلّہ جوشؔ کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ ممکن ہے جوشؔ کے تعلق سے سردار جعفری کی درج ذیل رائے سے اتفاق نہ کیا جائے۔ لیکن رُومانیت اور حقیقت کے ارتباط کے بارے میں اُن کے خیالات سے اتفاق کیا جا سکتا ہے؛

"پریم چند کی حقیقت نگاری میں رُومانیت کی چاشنی ہے، ورنہ اُن کے ادب میں بھونڈا پن پیدا ہو جاتا اور جوشؔ کی رُومانیت میں حقیقت کی آمیزش ہے، ورنہ اُن کا ادب فراری حیثیت اختیار کر لیتا"۔ [2]

پریم چند اور جوشؔ کے ہاں رُومانیت اور حقیقت کی آمیزش کس تناسب سے ہے، اس سے قطعِ نظر سردار جعفری کی شاعری کا ایک بڑا حصہ رومانیت اور حقیقت کے خوبصورت اور دلنواز امتزاج کی تصویر ہے۔ اِسی کے ساتھ اُنہوں نے جہاں نری حقیقت نگاری کی ہے، خود اُن کے یہاں بھی بھونڈا پن پیدا ہو گیا ہے۔ یہ کیفیت اُن کی چند ایک نظموں کے علاوہ خاص طور پر

---

[1] سردار جعفری، "ترقی پسند ادب" انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء صـ ۱۵۳

[2] "ترقی پسند ادب" صـ ۱۲۶

" سوویت یونین اور جنگ باز " اور " استالن کی کتھا " میں پائی جاتی ہے ۔

سردار جعفری نے خود کو کہیں کہیں انقلابی شاعر قرار دیا ہے ۔ جیسا کہ ایک غزل میں انھوں نے کہا ہے ؎

یہ شاعری عصرِ نو کی پیغمبری ، زمانے کی داوری ہے
لبوں پہ میرے صحیفۂ انقلاب کی شرح آیتیں ہیں

یہ محض " شاعری " ہے ، سردار جعفری کا مزاج نہیں ۔ اُن کا مزاج تو وہاں حقیقی خدوخال میں نمایاں ہوتا ہے ، جہاں رومان اور انقلاب شیر و شکر ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً اِن اشعار میں ؎

عشق کا نغمہ جنوں کے ساز پر گاتے ہیں ہم
اپنے غم کی آنچ سے پتھر کو پگھلاتے ہیں ہم

تاریکیوں نے گھیر لیا ہے حیات کو
لیکن کسی کا رُوئے حسیں درمیاں ہے آج

حکایت دل کی کیا دار و رسن کی اک کہانی ہے
قد و گیسو کی لیکن داستاں معلوم ہوتی ہے

رومان انقلاب کے امتزاج کی یہ کیفیت " شادی کا دن " ، " جیل کی رات " ، " تمہاری آنکھیں " کے علاوہ خصوصاً " ایک خواب اور " اور " پیراہن شرر " کی کئی نظموں میں ملتی ہے ۔ ایک جان دو قالب کی صورت میں ۔

سردار جعفری کے رومانیت پسند ہونے کا ایک اور ثبوت بھی ہے ! ——— خواب ! ——— " خواب " اُن کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے ۔ انقلابی ہو کر باغی ، نہ تو خواب و خیال کی دنیا میں رہتا ہے اور نہ خواب و خیال کی باتیں کرتا ہے ، لیکن سردار جعفری کو خواب بے حد عزیز ہیں ۔ انھوں نے اِس عنوان کو بار بار دہرایا ہے ، نثر میں بھی اور شاعری میں بھی ——— نظموں میں بھی غزلوں میں بھی ۔ کہیں تو یہ لفظ علانیہ ملتا ہے اور کہیں خواب کی سی کیفیت کے ساتھ ۔ اپنی کئی نظموں کے عنوان میں اُنھوں نے لفظِ " خواب " استعمال کیا ہے اور " ایک خواب اور " تو اُن کی نظم کا عنوان ہونے کے علاوہ اُن کے مجموعۂ کلام کا نام بھی ہے ۔ جو اِس لفظ سے اُن کی شدید ذہنی وابستگی کا اظہار ہے ۔ " ایک خواب اور " کے " حرفِ اوّل " میں اُنھوں نے لکھا ہے :

" خواب اور شکستِ خواب اِس دَور کا مقدّر ہے اور نئے خواب دیکھنا انسان کا ایک ایسا حق ہے جس سے کوئی طاقت ، کوئی اقتدار اُسے محروم نہیں کر سکتا ، اور شاید یہی انسان اور انسانیت کے مستقبل کی ضمانت ہے ۔ " [1]

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ آج جب کہ انسان کے ذہن و فکر پر بھی پہرے بٹھانے کی سعیٔ نامسعود کی جا رہی ہے ۔ آرزوئیں سر برہنہ ہیں اور تمنائیں زخمی ——— حال غیر یقینی ہے اور مستقبل ایک سوالیہ نشان ؛ خواب بھی دیکھنا بڑی جرأت کی بات ہے ۔ لیکن آج کے انسان کے خوابوں کا انجام کیا ہے ؟ تعبیر کے تپتے ہوئے صحراؤں میں تشنگی آبلہ پا ہے اور موجِ سراب ، شعلہ بکف ! نظم " ایک خواب اور " ہی کے چند شعر ہیں ؎

خواب ، اب حُسنِ تصوّر کے اُفق سے ہیں پرے
دل کے اک جذبۂ معصوم نے دیکھے تھے جو خواب
اور تعبیر کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
تشنگی آبلہ پا ، شعلہ بکف موجِ سراب

---

[1] سردار جعفری : " ایک خواب اور " ۔ پہلی اشاعت ۔ مارچ ۱۹۶۵ء ۔ حلقۂ ادب ، بمبئی ۲۶ ۔ صفحہ ۱۵

....

جانے کس موڑ پہ کس راہ پہ کیا بیتی ہے
کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا مُنہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ ہے اندازِ خطاب

دربدر ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال؟
اور مجرم کی طرح اُن سے گریزاں ہے جواب!

یہ ہے آج کے انسان کے خواب اور شکستِ خواب کی داستان! یہ داستان اُنہوں نے کہاں نہیں سنائی ہے! کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی شاعری اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ کہیں یہ خواب واضح ہیں، کہیں دھندلے دھندلے، مدھم مدھم سے ——— لیکن بہرحال ہیں خواب ہی۔ مگر اردو شاعری کے کس دور کے شاعر نے اپنے اپنے خوابوں اور اُن کے ٹوٹنے کی داستاں بیان نہیں کی ہے ——؟ "پیراہنِ شرر" سردار جعفری کے مجموعۂ کلام کا عنوان بھی ہے اور ایک نظم کا بھی۔ عنوان ہی سے خواب کی شکستگی نمایاں ہے۔ خصوصاً یہ مصرعے ؎

کھڑا ہے کون یہ پیراہنِ شرر پہنے
بدن ہے چور تو ماتھے سے خون جاری ہے

نظم "ذوقِ طلب" کا یہ شعر ؎

بجاتی ہیں ہوائیں شب کے خوابوں میں ستار اپنا
نشیمن شاخِ دل پر سبزہ زاروں نے بنائے ہیں

اُن کی نظم "دُعا" میں بھی یہی فضا ملتی ہے۔ اور غزل جیسی صنف میں بھی اُنہوں نے خوابوں اور خوابوں کی شکست کو اس طرح سمو دیا ہے کہ اِن موضوعات کی حامل غزلیں، ہئیت کو نظرانداز کر دیں تو عصرِ حاضر کا مرثیہ بن گئی ہیں۔ جیسے ؎

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا　　راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

اِس غزل کی ساری فضا ہی ایسی ہے۔ اور دیگر غزلوں کے یہ اشعار ؎

طلوعِ آدمیّت ہے بہت آہستہ آہستہ　　ابھی انسان کو کرنا ہے صدیوں انتظار اپنا
یہ فقط طرزِ ادا، رنگِ قبا کا ہے فریب　　قدِ ستم کا ہے وہی، ظلم کا قامت ہے وہی
قصر و ایواں میں نیا جشن ہو یہ ممکن ہے　　رہگزاروں میں مگر شورِ قیامت ہے وہی
زخمی سرحد، زخمی قومیں، زخمی انساں، زخمی ملک　　حرفِ حق کی صلیب اُٹھائے کوئی مسیح تو آئے اب

خواب کو اپنی شاعری کا عزیز موضوع بنانے کے تعلق سے سردار جعفری کے میلانات کا تجزیہ کریں تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے قبل جد و جہدِ آزادی میں شریک ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں نے ہندوستان مابعدِ آزادی کے کئی خواب دیکھے تھے ——— اپنی حقیقت نگاری کے باوصف ترقی پسند بھی خواب دیکھنے والوں میں شامل رہے۔

سردار جعفری نے نئے ہندوستان کے اپنے خواب کو "نئی دُنیا کو سلام" میں پیش کیا ہے۔ لیکن اُن کی سیاسی مثنوی "جمہور" میں یہ خواب مکمل، بھرپور اور واضح ہے۔ وہاں صرف نقوش ہیں یہاں خاکہ رنگین ہے۔ وہاں امکانات کا اظہار ہے یہاں ایقان مُحکم ہے۔ یوں بھی "جمہور" میں سردار جعفری کا سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی شعور کہیں زیادہ بیدار ہے۔ اعتماد اور اعتبار کی فضا ہے۔ جیسے اِن اشعار میں ؎

یہ اِفلاس کی رات ڈھل جائے گی — کسانوں کی دُنیا بدل جائے گی
نہ ہوگا مشینوں کا اِنسان غلام — مشینوں پہ قبضہ کریں گے عوام
سجا دیں گے چیزوں سے بازار ہم — لگا دیں گے دولت کے انبار ہم
پھلے اور پھولے گا بھارت کا باغ — جلیں گے ہر اک گھر میں گھی کے چراغ
کریں گے یہاں رقص حُسن و شباب — زمیں پر اُتر آئے گا آفتاب
وہ شاداب چہروں پہ ہوگا نکھار — کہ جھک جائیں ابتدا کے نقش و نگار
نئی دیں گے ماتھوں کو تنویر ہم — بدل دیں گے انساں کی تقدیر ہم

لیکن یہ سارے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے پھر ایک خواب دیکھا، ایک کیا کئی خواب۔ "ایک آزاد نظم "موت" میں تو شکستِ خواب کی یہ داستاں اپنے نقطۂ عروج سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ یہ نظم اُن کے دورِ اسیری کی یادگار ہے۔ یہ چند مصرعے ہیں، کاری طنز، نشتر کی طرح تیز :

"ملک میں اب پولس راج ہرگز نہیں
وہ تو انگریز کے وقت تھا
آج کل موت کا راج ہے
موت جو سب کی ہمدرد ہے
سب کی غمخوار ہے

آج ہم قیدیوں سے ملاقات کے واسطے آئی تھی

احساس کس قدر شدید ہے اور اسلوب کس قدر بانکا !

نظم "میرے خواب" کا یہ مصرعہ : شکستِ خواب کی ایک طویل داستان ہے کہ ان چند الفاظ میں پوشیدہ ہے خواب ٹوٹتے ہیں اور ٹوٹتے جاتے ہیں، بکھرتے ہیں اور بکھرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ؎

ساقی خاموش ہے اور پیرِ مغاں شرمندہ

سردار جعفری کا شعری نقطۂ نظر واضح ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف عوام کے لیے شاعری کی ہے، بلکہ اپنی شاعری کو جدّوجہد کے کام بھی لائے ہیں۔ عوامی فلاح، بہبودی، مسرّت اور خوشحالی کے لیے ایک وسیلہ کے طور پر استعمال بھی کیا ہے۔ انسان دوستی اور انسانیت کے خوش گوار مُستقبل کی تعمیر اُن کی شاعری کا مقصد ہے۔ جو رنگ و نسل، مذہب و ملّت ملک و قوم اور علاقہ واریت، غرض تمام تعصّبات سے بالاتر ہے۔ اُنہوں نے ہندوستان کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔

حُبّ الوطنی اُن کا شعار ہے، لیکن یہ وطن دوستی اُن کی عالمی اُخوت کی راہ میں حائل نہیں، بلکہ اُس کو تقویت پہنچاتی ہے۔ وہ صرف ہندوستانیوں کی بہبودی کے خواہاں نہیں، مجموعی طور پر پوری انسانیت کے مسرت بخش مستقبل کے مُتلاشی ہیں۔ خواہ رنگ نسل اور علاقہ کے امتیازات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ کبھی کبھی تو وہ پیکرِ سوال بن جاتے ہیں ؎

کہاں ہے روشنیٔ صبحِ انقلاب کہاں
ضمیرِ حضرتِ انساں کا آفتاب کہاں

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات وقتاً فوقتاً خواہ کوئی صورت اختیار کریں، برِّ صغیر میں امن کی برقراری اور یہاں کے عوام کی معاشی و معاشرتی خوشحالی کا خواہاں ہر فرد متمنّی ہوگا کہ یہ دونوں ممالک ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوں۔ اپنے اختلافات کو فراموش کریں اور تعاون و اشتراکِ باہمی کے میدان کو زیادہ سے زیادہ وسیع کریں۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ ایک رُوح فرسا واقعہ تھا، ایک بھیانک رات! لیکن اُس کے بعد ہی "معاہدۂ تاشقند" مُتبسّم سویرے کے رُوپ میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان کے اختلافات سے بالاتر ہو کر سردار جعفری نے معاہدۂ تاشقند کا جشن منایا گویا جنگ کبھی ہوئی ہی نہیں تھی۔ کتنا دل آویز انداز ہے ؎

مناؤ جشنِ محبت کہ خوں کی بُو نہ رہی
برس کے کھُل گئے بارُود کے سیہ بادل
بجھی بجھی سی ہے جنگوں کی آخری بجلی
مہک رہی ہے گُلابوں سے تاشقند کی شام

- - - - - - - - - - - -

جگاؤ گیسوئے جاناں کی عنبریں راتیں
جلاؤ ساعدِ سیمیں کی شمعِ کافوری
طویل بوسوں کے گُل رنگ جام چھلکاؤ

بین قومیت، عالمگیریت اور آفاقیت کے تصوّرات، ترقی پسند شاعری میں عام ہیں۔ فیضؔ، مخدومؔ، جذبیؔ اور ساحرؔ سب کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں ملتے ہیں، جس کی بُنیاد آدمیت کے احترام اور اِس کُرّۂ ارض کو جنگوں اور بلاؤں سے محفوظ رکھنے کی خواہش ہے۔ یہ تصوّر کہ ساری دُنیا کے عوام ایک ہیں، خواہ علاقائی سیاستدانوں کے اختلافات کچھ ہوں، ہر دَور کی اچھی تحریک کا حاصلِ ایمان رہا ہے۔ سردار جعفری کے ہاں اُن کی اور کئی نظموں کے علاوہ "تین شرابی" اور "مشرق و مغرب" میں یہ تصوّر کہیں زیادہ پُر اثر اور منوّر ہے۔ "مشرق و مغرب" کے دو شعر ہیں ؎

اصلیت نکہتِ گُل کی نہیں گُل دانوں سے　مَے بدلتی نہیں بدلے ہوئے پیمانوں سے
بُوئے گُل ایک سی ہے، بُوئے وفا ایک سی ہے　میرے اور تیرے غزالوں کی ادا ایک سی ہے

آدمیت کا احترام اور انسان دوستی کا یہ تصوّر، بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک مادّی تصوّر ہے۔ انسان کی مادّی زندگی کو سجانے سنوارنے کا تصوّر، اُس کے مستقبل کو خوش گوار اور خوش اقبال بنانے کا تصوّر! یہ تصوّر اپنی عملی صورت گری کے لیے

انسانی ہاتھوں کا مرہونِ منت ہے۔ ہاتھ، محنت اور مشقت کا عادی ہاتھ ـــــــ سردار جعفری کی شاعری کا ایک اور اہم موضوع ہے۔ اُردو شاعری میں ہاتھ کا تصوّر نیا نہیں لیکن محنت کش ہاتھ کا تصور ضرور نیا ہے۔ اقبال ہی کا دیا ہوا جنھوں نے اپنے ایک شعر میں " دستِ دولت آفریں " کا تذکرہ کیا ہے، لیکن محنت کش ہاتھ کے اس تصور کو سردار جعفری نے قوی اور مؤثر بنا دیا ہے۔ لکھنؤ کی پانچ راتیں، میں اُنھوں نے اِس سلسلہ میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ چند جملے یہ ہیں :

" مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ اِن کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرشِ بریں سے وحی والہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اُس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔" [1]

ہاتھ کا یہ تصور " پیغمبرِ سیاہ دست " میں اُبھرا ہوا ملتا ہے تو " ہاتھوں کا ترانہ " میں گنگناتا، گاتا، جھومتا اور جھمکتا ہے، بڑا البیلا اور دلربا ہے

اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو
اِن ہاتھوں کی تکریم کرو
دُنیا کے چلانے والے ہیں
اِن ہاتھوں کو تسلیم کرو

تاریخ کے اور مشینوں کے پہیوں کی روانی اِن سے ہے
دُنیا کا فسانہ اِن سے ہے انسان کی کہانی اِن سے ہے
تہذیب کی اور تمدّن کی بھرپور جوانی اِن سے ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

اعجاز ہے یہ اِن ہاتھوں کا ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بُت کر دیں، کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹّی کو چھوئیں تو سونا ہے، چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
اِن ہاتھوں کی تعظیم کرو

انسانی ہاتھوں کو، محنت کش ہاتھوں کو کس قدر پُرعقیدت خراج ہے۔ اِن کے تقدّس کے آگے شاعر گویا، اپنا سرِ تسلیم خم کرتا ہے!

ہاتھ کی طرح اُردو شاعری میں عورت کا تصوّر بھی ترقی پسند شاعری میں بالکل بدلا ہوا ملتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل عورت زینتِ بزم تھی۔ ترقی پسند تحریک نے اُس کو رزم میں بھی مرد کی رفیق بنا دیا۔ عورت کا یہ کردار کُلّی طور پر ترقی پسند شاعری کی دین ہے۔ کیونکہ اقبال نے جہاں اپنی " ترقی پسندی " کے باوجود عورت کا کوئی نیا تصوّر نہیں دیا اور جوشؔ نے اپنی ساری ترقی پسندی کے باوصف عورت سے انصاف نہیں کیا، اس کا گِلہ ترقی پسندوں کو ہے ہی۔ ترقی پسند شاعروں نے فیضؔ کے ہاں کسی قدر لیکن مجازؔ، کیفیؔ اعظمی اور سردار جعفری کے ہاں عورت کا تصوّر کچھ اور ہی ہے، قطعی نیا ـــــــ

1۔ سردار جعفری۔ " لکھنؤ کی پانچ راتیں " صفحہ 9

سردار جعفری کا عورت کا تصوّر اُن کی طویل نظم "نئی دُنیا کو سلام" میں نکھرے ستھرے رُوپ میں ہے۔ مریم کے کردار میں، یہ ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ وہ جاوید کی صرف خلوت کی نہیں جلوت کی بھی ساتھی ہے۔ وہ محبت کی مسند پر حُسن و جوانی ہے اور انگریز سامراج کے خلاف مرد کی ہم آواز ہو کر احتجاج کرنے والی۔ وہ اپنے محبوب کی جدائی کے باوجود اُس کی قربانیوں پر فخر کرتی ہے کہ وہ وطن کے حق میں انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کرکے پھانسی کی سزا پاتا ہے۔ بہت سے ترقی پسند شاعروں کے قدم جہاں ڈگمگاتے رہے، سردار جعفری نے اپنی رومانیت کے باوجود اُردو شاعری میں عورت کے تصوّر کو یوں پیش کیا ؎

وہ بس چند لمحوں کی ہمدم نہیں ہے	کہ عورت فقط شہد و شبنم نہیں ہے
تبسّم نہیں صرف، تلوار بھی ہے	وہ نغمہ نہیں صرف جھنکار بھی ہے
محبّت کی مسند پہ حُسن و جوانی	شجاعت کے میداں میں جھانسی کی رانی
وہ شمعِ شبستان ہے نورِ سحر ہے	وہ ہر گام پر مرد کی ہم سفر ہے

سردار جعفری نے "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں لکھا ہے کہ وہ انیسؔ، غالبؔ اور اقبالؔ سے متاثر ہیں۔ انیسؔ اور اُن کے مراثی کا سردار جعفری کی شاعری پر جو اثر آج بھی ہے تو بس شعر کی ظاہری تشکیل میں ـــ اُن کے کلام میں پائی جانے والی بے پناہ روانی، تشبیہات، استعارات، منظر نگاری اور الفاظ کے خزینہ وغیرہ کی حد تک۔ لیکن معنوی اور فکری طور پر غالبؔ اور اقبالؔ (اقبالؔ کے عورت کے تصوّر اور مذہبیت سے قطعِ نظر) سے زیادہ متاثر ہیں۔ انسان دوستی، وسیع المشربی اور غزل میں معنی آفرینی کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے غالبؔ کا اثر قبول کیا ہے۔ "شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو کہیے" والی غزل کا تذکرہ اِس سلسلہ میں بہتر ہوگا، اور ؎

تجھے بتاؤں بڑی شئے ہے جرأتِ انکار	اِسی سے تیغِ نگہ آبدار ہوتی ہے

جیسے اشعار اقبالؔ کے اثر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے "دستِ محنت کش" کا تصوّر لیا تو اقبالؔ ہی سے ہے، لیکن اُنھوں نے اس کو کہیں آگے بڑھا دیا ہے، جب کہ اُن کے ہاں "تصوّرِ وقت" بھی اقبالؔ ہی سے حاصل کیا ہوا ہے۔ لیکن اس راہ میں وہ اقبالؔ سے پیچھے ہیں۔ اِس خصوص میں وہ معنویت اور گہرائی بھی پیدا نہ کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ وہ جو نظمیں لکھیں اُن میں اِس طرف توجّہ دیں۔ "نئی دُنیا کو سلام" میں وہ اپنے تصوّرِ وقت کو یوں پیش کرتے ہیں ؎

یوں ہی اُڑ رہا ہے نشاں زندگی کا
ٹھٹکتا نہیں کارواں زندگی کا
تسلسل حقیقت، تسلسل فسانہ
تسلسل ہی ہے زندگی کا ترانہ
تسلسل ہے دریائے جاں کی روانی
تسلسل سے انسان ہے جاودانی

یا "لمحوں کے چراغ" کے یہ اشعار ؎

سب قافلۂ عدم کے راہی

وادیٔ عدم میں چل رہے ہیں
تاریکیوں کے کھُلے ہیں پرچم
لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں
ہر لمحہ حسین اور جواں ہے
ہر لمحہ فروغِ جسم و جاں ہے
ہر لمحہ عظیم و جاوداں ہے

غزل اُردو شاعری کی محبوب صنف ہے۔ زماں و مکاں کے قیود سے بالاتر، آزاد۔ ترقی پسند تحریک کے بعض شاعروں نے ایک عرصہ تک غزل کی منزل کوئی میں سراُٹھا نہ رکھی، لیکن اُنہوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کی آبرو تو کم نہیں ہو رہی ہے، وہ خود بے آبرو ہو رہے ہیں، تو اُن کو یہ رویّہ مجبوراً ترک کرنا پڑا اور پھر ایسے شاعروں کی بھی محبوب بن گئی۔ سردار جعفری نے ابتدا غزلیں کم کہیں، لیکن غزل کے تعلق سے اُن کا موقف ہمیشہ حقیقت پسندانہ رہا۔ اپنے مرتبہ " دیوانِ غالب " کے دیباچہ میں اُنہوں نے لکھا ہے :

• غزل، رعنائی اور داخلی شاعری کی معراج ہے۔ اس لیے اس کے اشعار میں ذاتی جذبے اور سماجی اضطراب کے درمیان حد کھینچنا مشکل ہے[1]

اچھی غزل کی پہچان بھی یہی ہے اور ہونی چاہیے کہ غمِ عشق اور غمِ روزگار ہم آہنگ ہو جائیں۔ سردار جعفری کے ہاں غزل نہ غمِ عشق کے لیے مخصوص ہے اور نہ غمِ روزگار تک محدود! ان کے ہاں غزل ہر رنگ، ہر رُوپ میں ملتی ہے۔ تغزل سے بھرپور بھی! مَیں یہاں اُن کی مختلف غزلوں کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو مختلف رنگ رکھتے ہیں ؎

سو ملیں زندگی سے سوغاتیں　　　ہم کو آوارگی ہی راس آئی
رُوٹھنے والا کوئی نہیں ہے کوئی منانے والا نہیں　　　ایسا تو اے دل نہ پڑا تھا اس سے پہلے غم کا کال
اِسی دُنیا میں دِکھا دیں تمہیں جنّت کی بہار　　　شیخ جی تم بھی کبھی کوُئے بُتاں تک آؤ
قتل ہوئے ہیں اب تک کتنے　　　کوُئے ستم کو یاد نہیں ہے
یہ کیسا ظلم ہے پھر سایۂ دیوارِ زنداں میں　　　وطن کے سایۂ سرو سمن کی یاد آتی ہے

اُردو شاعری میں " جدیدیت " کے موجودہ رجحانات کو ترقی پسند تحریک کا اِسترداد کہیے یا ارتقاء، سردار جعفری اِن رجحانات سے قطعی بے تعلق نہیں رہے۔ امیجری اور اشاریت وغیرہ نئی باتیں نہیں، لیکن جدیدیت میں اِن کا رُوپ بدلا ہوا ضرور ہے۔ سردار جعفری کے ہاں اشاریت نہیں ملتی۔ اُن کی شاعری مقصدی ہے اور اُن کے مخاطب عوام ہیں۔ اشاریت اور ابہام ایسی مقصدی شاعری کے لیے مناسب نہیں۔ لیکن " ایک ثوابِ اندر " اور اُس کے بعد کی چند نظموں میں وہ اشاریت سے پہلو تہی نہ کر سکے ہیں۔ مگر ابہام کی سرحدوں سے دُور ہی ہیں۔ نظم " اناج " میں اشارات نہ سہی، اشاریتی فضا ضرور ہے۔ ہندوستانی کاشتکار کی بے بسی، افلاس اور بھوک کی تصویر اشاریتی انداز میں ملتی ہے (اناج کی زبان

---

[1] سردار جعفری (مرتبہ) دیوانِ غالب، ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی ۱۹۵۸۔ دیباچہ صفحہ ۲۷

وہ ترستے ہیں مجھے اور میں ترستا ہوں انھیں   جن کے ہاتھوں کی حرارت نے اُگایا مجھ کو

کیا ہوئے آج مرے ناز اٹھانے والے   ہیں کہاں قیدِ غلامی سے چھڑانے والے

"میرا سفر" اور "قتلِ آفتاب" اُن کی خاصی معروف نظمیں ہیں۔ جن میں "ایک کالے سمندر کی تہہ میں" اور "نیلی فضا کی مخمل پر" جیسے مصرعے مل جاتے ہیں جن میں اشاریت جدید رُوپ دھارے ہوئے ہے ____________ اُن کے ہاں امیجری کے کئی نمونے ملتے، دلکش اور دل نواز! "نسیم تری قبا" پانچ مصرعوں پر مشتمل نظم سہی، لیکن امیجری کا شاہکار ہے۔ اسی طرح "ادھ کی خاک حسیں" میں بھی کامیاب امیجری ملتی ہے۔ اپنی ہندوستانیت کے باعث یہ بڑی مؤثر لگتی ہے۔ سیدھی سادی بھی بانکی بھی ____ ایسا معلوم ہوتا ہے عام ہندوستانی کی زندگی، اس کا مشاہدہ، اس کا تجربہ، غرض سب کچھ شاعر نے اپنی شخصیت میں جذب کر لیا ہے۔ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن ناگزیر ؎

یہ سیدھے سادے غریب انسان نیکیوں کے مجسّمے ہیں
یہ محنتوں کے خدا، یہ تخلیق کے پیمبر
جو اپنے ہاتھوں کے کھُردرے پن سے زندگی کو سنوارتے ہیں
لوہار کے گھَن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صُراحیاں رقص کر رہی ہیں
سفید آٹا سیاہ چکّی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سُنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دُھوئیں سے کالے توے بھی چنگاریوں کے ہونٹوں سے
ہنس رہے ہیں
دوپٹّے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور اُن کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سُنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سُرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

نثری شاعری (Prose Poetry) جس کو پوئے سے متاثر ہو کر بودلیئر نے فرانسیسی میں رواج دیا تھا۔ اب اُردو میں بھی عام ہوتی جا رہی ہے۔ اختر الایمان کے ہاں اس کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ سردار جعفری نے اس کی کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ویسے "یہ زندگی حسین ہے"، "حسین تر"، "میرا سفر" اور "مرے عزیزو مرے رفیقو" جیسی نظموں میں چند ایک نثری شاعری کے ٹکڑے مل جاتے ہیں، بہر حال ایسے نہیں کہ مثالوں کے طور پیش کیے جائیں۔

ترقی پسند تحریک نے شعر و ادب کے لیے جو اصول وضع کئے جو راہیں متعین کیں، جو قاعدے ترتیب دیے اُن کو رُو بہ عمل لانے میں کسی بھی ترقی پسند شاعر سے زیادہ سردار جعفری نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اُن کے موضوعات، اسالیب اور زبان غرض سب کچھ ترقی پسند تحریک سے ہم آہنگ ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس (لکھنؤ اپریل ۱۹۳۶ء) کے اعلان میں کہا گیا تھا:

"ہم ادب کو عوام کے قریب لانا چاہتے ہیں اور اُسے زندگی کی عکاسی اور مستقبل کی تعمیر کا مؤثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔" ؎۱

اس مقصد کے حصول کے لیے موضوعات کی اہمیت کو کون رد کر سکتا ہے۔ لیکن موضوعات سے اہم زبان ہے۔ تا آنکہ وسیلہ ہی واضح اور عوامی نہ ہو مقصد کا حصول سوالیہ نشان بن جائے گا۔ زبان کے استعمال کے تعلق سے سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کی من و عن ترجمانی کی ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کی زبان کو عوامی سرچشموں سے اخذ کیا ہے۔ اس لیے اُن کی شاعری عوام سے قریب ہو گئی ہے۔ اُنہوں نے ارادتاً اس کی کوشش کی ہے اور اس احساس کے ساتھ کہ اُن کو عوام کے لیے شاعری کرنا ہے، خواص کے لیے نہیں۔ اُنہوں نے اپنے کلام کے مختلف مجموعوں کے دیباچوں میں شاعری کی زبان کو آسان بنانے پر زور دیا ہے۔ "امن کا ستارہ" کے "پیش لفظ" میں تحریر کرتے ہیں:

"میری شاعری خواص کے لیے نہیں ہے بلکہ عوام کے لیے ہے اور میری خواہش اور کوشش ہے کہ زیادہ سے لوگ اسے سمجھ سکیں۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور کھیتوں میں ہل جوتنے والے کسان۔ اس لیے میں نے بول چال کی بنیاد کو بنیاد بنایا ہے، اور کہیں کہیں بازاری، محاورے اور الفاظ (SLANG) بھی استعمال کر لیے ہیں۔" ؎۲

کم و بیش یہی بات اُنہوں نے غزل کے ایک شعر میں بھی کہی ہے ؎

جو سب کی سمجھ میں آنہ سکیں بیکار ہیں وہ سب شعر و غزل
جنتا کی زباں میں کہنا ہے جنتا کو سُنانا ہے ساتھی

یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں عام فہم، سیدھے اور سلیس الفاظ کی بہتات ہے۔ اُن کے تشبیہات، استعارے، اشارے، محاورے، تلمیحات اور امیجری کے ماخذ مزدوروں، کسانوں اور کلرکوں کی روزانہ زندگی ہے، گاؤں ہے چوپال ہے، کارخانہ ہے، میلے تماشے ہیں، عورتوں کے جھگڑے ہیں وغیرہ وغیرہ ——— اور وہ اتنی آسانی اور روانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ یہی عام الفاظ جو اپنے طور پر بے جان یا کم از کم غیر شاعرانہ ہوتے ہیں، اُن کے کلام میں زندگی دوست اور شعریت سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ ایک نہیں ایسی کئی مثالیں مل جائیں گی ؎

بھوک کا بھیانک رُوپ
چکیوں کے بھدّے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں

؎۱ بحوالہ "ترقی پسند ادب" صفحہ ۲۴

؎۲ سردار جعفری۔ "امن کا ستارہ"۔ کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔ پہلی اشاعت۔ صفحہ ۱

دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے ———— (پتھر کی دیوار)

ملوں میں، کھیتیوں میں محنتوں کی حکمرانیاں
ٹرکٹروں کے گرد ناچتی ہوئی جوانیاں
سرود، کیف، شعر، نغمہ، داستاں کہانیاں
خزاں کا نام بھی نہیں، بہار ہی بہار ہے ———— (سوویت یونین اور جنگ باز)

سردار جعفری کے ہاں جوش و جذبہ، ولولہ اور ہمہمہ بے حد زیادہ ہے۔ بعض اوقات تو جذبات کی روانی صورتِ سیل اس قدر تیز رہتی ہے کہ اُن کا قلم بھی اُن کا ساتھ نہیں دیتا۔ آزاد نظموں میں تو یہ کیفیت بے اندازہ، بے پناہ اور بیکراں ہوتی ہے۔ "امن کا ستارہ" ———— "ایک شاعرانہ تقریر" میں جذبات کا سیلاب اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن جہاں کہیں خطابت اپنے حدود سے تجاوز کر جاتی ہے، شعریت مجروح ہوئی ہے۔ اگرچہ اُنھوں نے کہا ہے کہ:

"خطابت کی بھی شاعری میں جگہ ہے بشرطیکہ وہ شاعرانہ حدود کے اندر ہو" [1]

لیکن سردار جعفری نے خطابت کے تعلق سے شاعرانہ حدود کو کئی جگہ نظر انداز کیا ہے۔ یہی کیفیت خصوصاً "امن کا ستارہ" کی تمام نظموں میں ملتی ہے۔

احتجاجی شاعری کی حد تک اُردو شاعری میں سردار جعفری کی حیثیت نہ صرف منفرد ہے، بلکہ وہ اس میدان میں ممتاز ترین شاعر ہیں۔ لیکن جا و بے جا خطابت اور کہیں کہیں پروپیگنڈہ بازی نے اُن کے شاعرانہ موقف کو مجروح و متاثر کر دیا ہے، اور شاعری، شاعری کم اور "زندہ باد"، "مردہ باد" کی طرح کی نعرہ بازی بن گئی ہے۔ ہر چند اِس کی بھی افادیت سے اِنکار نہیں، لیکن یہی تو سب کچھ نہیں: اور تو اور اس طرح شاعری میں ایک طرح کی کم مائیگی اور ناپائیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ غالبًا سردار جعفری کو بھی اِس کا احساس ہے۔ کیونکہ "پتھر کی دیوار" کے "صفحۂ اوّل" میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

"میری شاعری وقتی ہے۔ مجھے یہ تسلیم کر لینے میں ذرا سی بھی جھجک نہیں ہے۔" [2]

لیکن اُن کا یہ احساس اُن کے ابتدائی دورِ شاعری کا ہے۔ ایسی سطحی اور معمولی خامیوں سے کس شاعر کا دامن خالی ہے۔ مجموعی طور پر سردار جعفری کی شاعری آفاقیت، گہرائی اور اُن دائمی قدروں کی حامل ہے جو ہر دَور میں انسانیت کو عزیز رہی ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن ہیں، لیکن اُن کا شاعرانہ منصب و مقام ترقی پسند تحریک کے حدود سے ماورا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث کئی شعراء کو ادب میں مقام ملے گا، لیکن سردار جعفری کی انفرادیت اور شخصیت کے باعث ترقی پسند تحریک ہمیشہ یاد رکھی جائے گی!

★ ★

---

[1] ترقی پسند ادب۔ صفحہ ۱۴۶

[2] سردار جعفری، "پتھر کی دیوار"، مکتبہ "شاہراہ" دہلی، اگست ۱۹۵۳ء، بار اول، صفحہ ۹

ریوتی لال شاہ

علی سردار جعفری

اس دن زمین صد رشکِ آسمان تھی جب زحل برجِ ثور سے اور راہو برجِ دلو سے سرزمین اودھ کو بصد ناز دیکھ رہے تھے۔ وہ لمحہ لمحۂ میلادِ آدم تھا جب ماہ برجِ قوس میں قرینِ مشتری ہو رہا تھا اور حافظ شیرازی کا شعر بے ساختہ زبان پر آتا تھا۔

گفتم کہ خواجہ کے بسر حجلہ می رود
گفت آن زماں کہ مشتری یا ماہ قرین کنند

گیتا[1] کے ماہِ منور کی اس حسین شام کو ہلالِ نو اور مشتری مغرب کے افق سے طلوع ہو رہے تھے ہندوستان کے ایک نوزائیدہ کو دیکھنے کے لیئے۔ وہ دن تھا ۲۹ نومبر ۱۹۱۲ء کا اور وہ نومولود تھا آسمانِ اردو ادب کا درخشاں ستارہ علی سردار جعفری۔

کسی بھی شخص کی تخلیقات کے مقابل اس کے لمحۂ میلاد کی خاص اہمیت کیوں ہو؟ اس کی اہمیت یہ ہے کہ حقیقتاً اس ایک لمحے میں پوری پوشیدہ شخصیت صفۂ گیتی پر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اسی لیے سردار نے اپنی پیدائش کو "لمحۂ میلادِ آدم" کہا ہے۔ لیکن کوئی لمحہ قائم بالذات نہیں ہوتا۔ اس کا وجود حرکت اور تغیر سے ہے۔ ؎

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں

(میرا سفر)

لمحات کا یہ حسین رقص علی سردار جعفری کے دل میں اتنا گہرا اتر گیا ہے کہ وہ جگہ جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح

(نئی دنیا کو سلام)

گزری برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
فضاؤں میں تتلیوں کے مانند اڑ رہے ہیں

(اودھ کی خاکِ حسین)

تاریکیوں کے کھلے ہیں پرچم
لمحوں کے چراغ جل رہے ہیں

---

[1] یہ بتلانے کے لئے کہ میں ہر شے کی حقیقت ہوں گیتا میں کرشن ایک جگہ کہتے ہیں "میں حیوانوں میں شیر ہوں۔ موسموں میں موسم بہار ہوں۔ مہینوں میں مارگشیرش"۔ مارگشیرش اور نومبر تقریباً ایک ہی ہیں۔

ایک ایک کرکے پلٹ آئے گریزاں لمحے
ایک ایک کرکے ہوئے سارے ستارے روشن

(آرزو کے صنم خانے)

لمحے تو وقت کی وسعت بیکراں سے ابھرتے ہیں
اور ڈوب جاتے ہیں پھر وقت کی وسعت بیکراں میں

(نئی دنیا کو سلام)

زماں و مکاں کو سمجھ لینا رموز کائنات کو جان لینا ہے۔ زماں و مکاں ہی گیسوئے فطرت کے وہ پیچ و خم ہیں جو سلجھ نہیں پاتے۔ یہی وہ معمہ ہے جو نہایت دشوار ہے۔ جس دن سے انسانی فکر نے فطرت کی لٹوں میں کنگھی کرنی شروع کی البرٹ آئنسٹائن (ALBERT EINSTEIN) کی طرح ان خم دار گیسوؤں کو کسی نے نہیں سلجھایا۔ دنیائے سائنس (SCIENCE) کو سب سے پہلے اسی نے بتایا کہ زماں و مکاں ایک ہے زماں دراصل مکاں کا چوتھا حصہ ہے (TIM IS THE FOURTH DIMENSION OF SPACE) ویدانت کی مایا بھی زماں و مکاں کا جال ہے (NETWORK OF SPACE AND TIME) لہٰذا اس جہان رنگ و بو میں جس نے زماں و مکاں کو جان لیا گویا اس نے کائنات کے ایک اہم راز کو پہچان لیا۔ انسان ہزاروں سال سے اس راز کی طرف بڑھ رہا ہے۔

علی سردار جعفری سائنس دان نہیں ہیں۔ انہوں نے ان مسائل کو ریاضیات کا جامہ نہیں پہنایا صرف الفاظ کے تازہ بتازہ و خوب صورت لباس میں ان حقائق کو پیش کیا ہے

علی سردار جعفری کی شخصیت کی انفرادیت یہ ہے کہ ترقی پسند اور انقلابی شاعر ہوتے ہوئے بھی ان کی آواز میں غصہ اور نعرے بازی کے ساتھ ایک آہستگی اور لطافت کا عالم بھی ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جو لبریز ہو کر بھی چھلکتا نہیں ہے۔ یہ انداز بیان دشوار تو ہے لیکن اس کا اثر گہرا اور پائیدار ہے ایک نظم میں کہتے ہیں ؎

خود ہی سوچو کہ ستم گاروں پہ کیا گزرے گی

اس مصرعے میں کچھ نہیں کہا ہے لیکن سبھی ممکنہ تاریخ اس میں پوشیدہ ہیں اس مصرع میں مزید کچھ بھی کہہ دیا محدود ہو جاتا تھا ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کوئی دوانہ ہے لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک
ہے بات صاف سزا اس کی سنگ ساری ہے

اپنی تازہ منظوم آپ بیتی "نومبر میرا گہوارہ" میں کہتے ہیں ؎

کتنے دل قتل کروگے آخر
کتنے جلتے ہوئے تاروں کو بجھا سکتے ہو
کتنے خورشیدوں کو نیزوں پہ اُٹھا سکتے ہو
قتل کرتے کرتے خود تم کو جنون ہو جائے گا

لب و لہجہ کی یہ نرمی سردار جعفری کی اپنی پہچان ہے

علامہ اقبال کو صرف اردو ہی کا نہیں بلکہ ہندوستان کا پہلا ترقی پسند شاعر ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے بعد کے سبھی ترقی پسند شاعروں نے انکے خیالات کو آگے بڑھایا ہے اس نقطۂ نظر سے علی سردار جعفری اور علامہ اقبال ایک ہی قبیلے کے نظر آتے ہیں

لیکن بیان کی سادگی، لہجہ کی نرمی اور فلسفہ کی پیوستگی ... کی وجہ سے ہیں ... غالب ... کا ... بھی سمجھا ہوا ... فلسفوں کو غالب نے رنگ غزل میں بخوبی پیش کیا ہے لیکن نظم کا میدان ان سے محروم رہا۔ علی سردار جعفری کی بدولت یہ محرومی ختم ہو سکی لیکن ... کا یہ کہنا ہے کہ غالب کے فارسی ذخائر کا شمار نظم میں کرنا چاہئے جن کے اردو ترجمے بہت ... ہیں

میدان عمل میں انسان ہمیشہ محو سفر رہتا ہے اور یقیناً منزل کی طرف بڑھتا ہے ترقی کے ... آتے رہتے ہیں لیکن کبھی کبھار ایک ... آتا ہے جو رفتار کو تیز سے تیز تر کرتی ہے اور دور نو کا آغاز کرتی ہے

اردو شاعری کی تحریکوں میں اور خاص طور سے نظم کے میدان میں علی سردار جعفری ایسی ہی ... وہ ایک امتیازی شخصیت کے مالک ہیں جو آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی ۔

علی سردار جعفری زندگی کو کسی لمبے سلسلے کی ایک کڑی مانتے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ موت کے ہاتھوں ہستی ... نہیں سکتی بلکہ شکل بدل کر وسعت پذیر ہو جاتی ہے۔ یہ نظریہ ہندو تاریخ کے فلسفے سے الگ ہے یہ تصوف سے نزدیک تر ہے

"میرا سفر" میں کہتے ہیں ــ

لیکن میں یہاں پھر آؤں گا
بچوں کے ذہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

دھرتی کی سنہری سب ندیاں
آکاش کی نیلی سب جھیلیں
ہستی سے مری بھر جائیں گی

"لیکن میں یہاں پھر آؤں گا" یہ تو دیدانت بھی ہے تصوف بھی اگر موت کے بعد ہستی کا ... تو ... نہیں بلکہ تصوف کا نقطۂ نظر ہے اس نظم میں آگے کہتے ہیں : ۔

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروف سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں

میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں۔

صدیوں کے اس پرانے کھیل نے جو مر کے امر ہو جانے کا نہ ختم ہونے والا تماشا ہے دنیا کے دانش وروں کو کسی بھی اور مذہب سے زیادہ لبھایا ہے۔ الگ الگ ملکوں میں اس کے نام ضرور الگ الگ ہو گئے ہیں۔ مغرب میں مسٹی سزم، عرب ممالک میں تصوف، ہندوستان میں ویدانت چین میں تاؤازم، جاپان میں زین دھرم۔ بظاہر ان سب میں بہت تھوڑا فرق ہو سکتا ہے لیکن بنیادی فلسفہ ایک ہی ہے فطرت کے ساتھ انسانی تعلقات کئی طرح کے ہو سکتے ہیں محبت کے، خوف کے، حیرت کے، معبود کے، مسجود کے،

علی سردار جعفری فطرت کے ساتھ ایک ہمدردی کا محسوس کرتے ہیں۔ لگتا ہے عالم طفلی میں سرزمین اودھ کے بھرپور قدرتی نظاروں سے حاصل کئے ہوئے تجربات ان کے حافظے میں جیون کے تیوہار کی سہیج کر رکھے ہوئے ہیں ؎

ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں
حسین جھیلیں کنول کے پھولوں کی چادروں میں ڈھکی ہوئی ہیں
فضاؤں میں میگھ دوت پرواز کر رہے ہیں
نہ جانے کتنی محبتوں کے پیام لے کر
گھٹاؤں کی اپسرائیں اپنی
گھنیری زلفوں میں آخری بار مسکرا کر
خلیج بنگال اور بحر عرب کے موتی پرو رہی ہیں
ہرے پروں اور نیلے پھولوں کے مور خوش ہو کے ناچتے ہیں
قدیم گنگا کا پاک پانی زمین کے دامن کو دھو رہا ہے
وہ کھیتیاں دھان سے بھری ہیں۔
جہاں ہوائیں ازل کے دن سے ستار اپنے بجا رہی ہیں
ہمالیہ کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہیں
ان آسماں بوس چوٹیوں کو
سحر کے سورج نے سات رنگوں کی کلغیوں سے سجا دیا ہے

"لنو مبر مرا گہوارہ" میں کہتے ہیں ؎

ہر ایک شے جیسے مری ذات تھی مری حقیقت تھی

انا الحق کی صداقت تھی
میں خود فطرت تھا فطرت میری ہستی تھی

فطرت کی بھی مختلف تعریفیں ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے عالم وجود کی ہر شے ماورا انسانی فطرت میں شمار ہے اور علی سردار جعفری کا تصور فطرت یہی "فطرت" ہے میانی منکروں کا جو احساس۔ تھا وہ فطرت کے اس تصور سے پرے تھا ان کا تصور فطرت اور اپنے وجود یات ہے فطرت ہے حافظ شیرازی کا سرشتہ بھی جھلکتا ہے ؎

از ہر طرفے کہ گوش کردم
آواز سوال حیرت آمد

یہ حیرت فراق گورکھپوری کی شاعری میں بھی ہے۔
جیسے اس عالم رنگ و بو سے شدید لگاؤ نہیں ہے اس کا فکر غیب تمام اور نہ پیدا ہے غیب کا راستہ وجود یات سے ہو کر جاتا ہے اسے لا محدود کر اسے پانا ناممکن ہے۔ سردار جعفری جگہ جگہ اس بات کو بخوبی کہتے ہیں ؎

اور نیلی فضا کی لگن پر
ہنستی ہوئی ہیرے کی دیکھی
یہ میری جنت میری زمین
(میرا سفر)
مشام روح میں مٹی کی خوشبو
پھول کر مسکرا اٹھی
(لکھنؤ میرا گہوارہ)

اس سے پہلے کہتے ہیں ؎

لکھنؤ میرا گہوارہ ہے یہ میرا مدینہ ہے
اسی ماہ منور میں
میری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
میرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
میرے تار نفس میں جنبش باد صبا آئی

"میری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی" اس مصرعے میں بڑی معنویت ہے۔ سورج کی سنہری روشنی دیکھنا اپنے آپ میں ایک حاصل ہے اور یہ تفصیل بغیر اس جہان رنگ و بو میں ظہور پذیر ہوئے ناممکن ہے ان سیدھے سادے لفظوں میں اس حقیقت کی جھنکار سنائی دیتی ہے کہ انسان کو فرشتوں پر بھی جستجو کا حاصل نہیں ہے اور وہ مسجود ملائک ہے۔

"پہلی بار" کی تکرار سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی پا لینا محض ایک حاصل ہی نہیں بلکہ ایک اعزاز د　　ہے۔ دیکھا جائے تو پس پردہ تاریخ کے فلسفے کی یہاں مخالفت بھی ہے۔

دنیا میں ماں کا رشتہ، ماں کا درجہ اتنا بلند اتنا مقدس ہے کہ اس کے بیان میں انسانی زبان کی تنگ دامانی اور قوت اظہار کی ناتوانی پر ہنسی آتی ہے۔

ماں کے بارے میں سردار صاحب کس خوبی اور معنویت سے کہتے ہیں ؎

مری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینہ میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا

بچہ اپنی شکل اور انسانی شکل ماں کی شکل کی صورت میں پہچاننا شروع کرتا ہے۔ ماں کا چہرہ بچے کے لئے آئینہ ہوتا ہے۔ اس بات میں کتنی معنویت ہے اور کس خوب صورتی کے ساتھ کہی گئی ہے۔

انیس کے مرثیوں کے سوا اردو شاعری میں عورت محض محبوبہ رہی ہے۔ اقبال کی مشہور نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اس کمی کی تلافی نہیں کرتی۔ سردار کی شاعری میں ماں بار بار آتی ہے۔ کبھی حاملہ ماں، کبھی دودھ پلاتی ہوئی ماں، کبھی لوری دیتی ہوئی ماں، کبھی مکمل ماں جو بچے کی تربیت کرتی ہے ؎

وہ چہرہ کیا تھا
سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا
وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوب صورت
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا
جو اپنے دل کے خوابِ پیار کی کرنوں سے روشن تھا

لیکن یہ بند خود خوب صورتی کی تعریف کرتا ہے اور حسن نظر کو بھی سنوارتا ہے نکھارتا ہے۔ وہ شاعری اچھی مانی جاتی ہے جو لفظوں کی معنویت کو خط میں رکھ کر چلتی ہے۔

سردار کے یہاں ماں ایک فرد، ایک ذات سے زیادہ ہے۔ ماں کا دودھ حرف بنتا ہے پھر شعر و سخن بنتا ہے اور پھر زمین کی گردشوں اور تاریخ کی آواز یا لے میں ڈھل جاتا ہے۔ دونوں کا ایک دوسرے میں تبدیل ہونا کس طرح خیال میں رکھا گیا ہے۔

جواب میری زباں سے
میرے بچپن میں وہ میری ماں کی لوری تھی

ایک آواز کا دوسری آواز میں ڈھل جانا پیڑھی در پیڑھی ایک ورثے کو سہیج کر رکھ دیتا ہے۔ رشتوں کی بوالعجبی اس دنیا کی ایک خاص خوبی ہے۔ ایک طرف ماں کا دل، محبت کی مورت، تو دوسری طرف بغض و نفرت سے بھرے ہوئے حاسدوں کے سینے۔

اگر احساسات کا اظہار اتنا خوب صورت نہیں ہے کہ وہ دل کے اندر اتر جائے تو اسے شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن صرف احساسات کے سہارے بھی بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ معلومات اور فکر بھی اس کے ضروری لوازمات ہیں۔

فکر و معلومات سے بے نیاز لوگ ابہام کو علم کی انتہا سمجھتے ہیں ان کی بے بنیاد تمناؤں کا حاصل محض مایوسی اور بغض و حسد ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں تلسی داس نے بھی لکھا ہے اور حافظ شیرازی نے بھی۔ علی سردار جعفری نے اس سے بچنے کا خوب صورت طریقہ بتایا ہے کہتے ہیں ؎

حسد کی آنکھوں کا رنگ دیکھو
جو دل کے اندر بھرے ہوئے ہیں
وہ زہر آلودہ شک دیکھو
وہ اپنی نفرت کا زہر لے کر
خود اپنے قول میں زہر بانٹ
خدا کرے اس کا دل کہیں سے
سکوں کی دولت تلاش کر لے
یہی طریقہ ہے بس حریف حسد سے بچنے کا
کہ اپنی ذات کو اتنی بلندیاں دے دو
کسی کا سنگ ملامت وہاں تک نہ آ سکے
صدا رہے کہ سلامت [illegible] رہے
مگر ہوائے بہار آشنا کو پا نہ سکے
چراغ علم و ہنر کو کوئی بجھا نہ سکے

بڑی شاعری کی خوبی یہ ہے کہ وہ ناچیز ذروں سے لے کر افلاک بیکراں کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہے۔ دھرتی سے اوپر نہ ابھر پانا یا وسعت افلاک میں گم ہو جانا دونوں ہی کم مائیگی کی علامت ہیں۔ بات تو تب ہے کہ خاک چھانتے رہیں اور ستاروں کے ساز کو چھیڑتے رہیں ۔ سردار صاحب کی یہ خوبی دیکھتے بنتی ہے ؎

گرچہ بادلوں سے دوستی تھی
خاک پر چلتے ہوئے پیروں پہ بے حد پیار آتا تھا
قلم ہی شاخ طوبیٰ بھی ہے، انگشت حنائی بھی

جوانی سے طفلی کے گلے ملنے کے ماہ و سال پو پھٹنے کی گھڑیوں کی طرح ہوتے ہیں سب دھندلے اندھیرے دودھیا ہوتے نظر آتے ہیں۔ دبے دبے جذبات ابھرنے کو بے تاب ہوتے ہیں، ساری کائنات نکھار پر ہوتی ہے۔ لگتا ہے ہر کلی پھول بننے پر آمادہ ہے۔ تغزل انہیں جذبات کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ لیکن قیمت اسی دل کی ہے جو عقل سے پختہ ہو۔ بات تو تب ہے کہ آئینہ ٹوٹ کر چکنا چور نہ ہو۔ بس ایک بال آ جائے۔

غالب اور فراق کی عشقیہ شاعری کو پختگی عطا کرنے والے عناصر ان کے عقل سے پختہ دل ہی کی دین ہیں ۔

روز ازل سے شناسا لگنے والے اجنبی کو دیکھ کر جو احساس حیرت ہوتا ہے اس کا اظہار سردار جعفری کے الفاظ میں دیکھتے بنتا ہے ؎

کہاں سے آئی ہو
کون ہو تم

نہ گل نہ خوشبو
مگر تمہارا وجود خود روحِ گلستاں ہے
وہ کائنات بسر دو جس کا
خود اپنا سورج ہے چاند اپنا
میں کائنات سرور میں سانس لے رہا ہوں
شگفتہ ہے یہاں نہ ہیلن
نہ ہیر ہے اور نہ جولیٹ
فقط تمہارے بدن کا موسم
جو میری نظروں کی نرم بارش میں
رنگ اور نور بن گیا ہے

آگے آنے والوں مصرعوں میں تغزل کے ساتھ ایسا اظہارِ خودی ہے کہ وجودیت کو چھوتا نظر آتا ہے

کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیا ئے دلبری میں
کوئی نہیں مجھ سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں
ہر ایک سے تم حسین تر ہو
ہر ایک سے میں عظیم تر ہوں

لاے ہی ساری کائنات کی پیدائش ہے۔ اس فلسفے کو عشقیہ شاعری میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے اور نظم میں رنگِ تغزل کس خوب صورتی سے بھرا جا سکتا ہے، جعفری صاحب کے بند میں دیکھئے

تمہاری "ہاں" اک گلاب ہے تازہ و شگفتہ
"نہیں" بھی ننھی سی اک کلی ہے
جو دل کی نازک سی شاخ میں سو رہی ہے
خواب بہار بن کر
یہ خواب تعبیر کے گلستاں کا منتظر ہے
تمہارے دلکش بدن کے رنگوں میں مضطرب ہے
تمہاری آنکھوں سے جھانکتا ہے
تمہارے سانسوں میں کانپتا ہے
مجھے "نہیں" کی کلی عطا ہو
کہ جس سے "ہاں" کا گلاب مہکے

ویسے بھی انکار کے بعد کا اقرار پختہ تر ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کی طاقت و قوت کا ایک حصہ ہی اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہو پاتا

ہے۔ حقیقتاً ہر بوند اپنے آپ میں بحرِ بیکراں ہے۔ علی سردار جعفری کے الفاظ میں ؎

میں ایک ورق ہوں
لکھا ہے کسی نے
پڑھا ہے کس نے
تمام احساسِ ناتمامی
مگر مکمل کتاب جیسے
جو پڑھ سکو تو مجھے بتانا
کہ اس صحیفے میں کیا لکھا ہے۔

گردشِ زمان و مکاں علی سردار جعفری کی نس نس میں یوں رچ بس گئی ہے کہ بغیر اس کے ذکر کے ان کی شاعری آگے نہیں بڑھتی ہے ؎

جو کل کلی تھی
وہ آج گل ہے
جو آج گل ہے
وہ کل ثمر ہے
ہر ایک شے وقت کی ہواؤں کی زد پہ
ایک شمعِ رہگزر ہے
جو جل رہی ہے
جو بجھ رہی ہے
وجود پر ناز کر رہی ہے

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ ہمارا یہ عظیم شاعر تخریب نہیں تعمیری قوتوں کا حامی ہے۔

ہواؤں کے تند و تیز جھونکے
جب آندھیوں کا لباس پہنے
اترتے ہیں غارتِ چمن پہ
تو شاخِ گل اپنا سر جھکا کر سلام کرتی ہے
اور پھر سر اٹھا کر ہنستی ہے
اور کہتی ہے مجھ کو دیکھو
میں فطرتِ لازوال کا رنگِ شاعری ہوں۔
وجود کا رقصِ دلبری ہوں

جسے مٹانے کی کوششیں ہیں
وہ مٹ سکا ہے نہ مٹ سکے گا
یہ رنگ صحنِ چمن سے ابلے گا
مقتلوں سے طلوع ہوگا

یہ شاعری اس شاعری سے کتنی مختلف ہے ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

یہاں موت تغیر ہے۔ تغیر جو نباتی تسلسل ہے اور اس لئے ابلنے کا لفظ رنگ کو خون میں تبدیل کر دیتا ہے اور طلوع کا لفظ خون کو آفتاب بنا دیتا ہے۔ یہ کائنات اور انسان کا سفر ہے۔

میں نے علی سردار جعفری کی شخصیت کے چند پہلوؤں پر ہی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون کی اپنی پابندیاں ہیں۔ کبھی وقت ملا تو تفصیل سے لکھنا چاہوں گا۔

سردار صاحب ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ہندوستان میں ان کا نام ترقی پسندی کا مترادف ہو گیا ہے۔ کئی بار ان کا خیال ذاتی ہوتے ہوئے بھی پوری تحریک کا خیال مان لیا جاتا ہے اور غلط فہمی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ان کی محویت کامل اور محنت و مشقت کا قابلِ رشک ثبوت ہے۔
ان کی تحریر، ان کی تخلیق، ان کے نثر و نظم، ان کی شخصیت سب ترقی پسندوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنی اس بات کی تائید میں میں ان کی لائن پیش کرنا غیر ضروری سا سمجھتا ہوں۔ ویسے کام کئی لوگ کر بھی چکے ہوں گے۔
مشرق کا کوئی بھی مفکر کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو۔ اس کی فکر عالمِ وجود تک محدود نہیں رہ سکتی۔ مرحلۂ غیب تک اس کے تخیل کے نقشِ پا صاف نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک ہاتھ ہر ایک پیٹ کی آگ بجھا دینے کا متمنی ہوتا ہے تو دوسرا ہاتھ اسرارِ فطرت کے چہرے سے نقاب اٹھا دینے کو بیتاب۔ علی سردار جعفری بیسویں صدی کی ایسی ہی شخصیت ہے۔
یہ فیصلہ کرنا کہ علی سردار جعفری کی تحریر زیادہ پراثر ہے یا تقریر اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ یہ بتانا کہ ان کی تصانیف زیادہ ہیں یا تالیف۔ ہاں یہ کہنا بھی اتنا ہی مشکل ہے کہ ان کی نثر میں معنویت زیادہ ہے ——— یا نظم میں۔ چلو یہ فیصلے علم کی بنا پر ہو بھی جائیں تو یقیناً گتھی تو نہیں سلجھ پائے گی کہ ان کا قلمکار انسان سے بڑا ہے یا انسان قلمکار سے۔ ★

عتیق احمد

سردار جعفری کے افسانے

ایک امریکی نقاد جوئیل اسپنگارن ہو گزرے ہیں (۱۹۳۹ - ۱۸۷۵) جن کا شمار اکثریت میں نہ ہونے والے امریکی ادب کے خاص اور صالح ادب بنانے والوں میں کیا جاتا ہے۔ یعنی ادیب کو ہر حال میں غیر جانبدار رہ کر "سب خیریت ہے" کا ادب تخلیق کرتے رہنا چاہیے۔ موصوف نے اس ضمن میں ادبی نقادوں کا بھی لائحہ عمل تجویز فرمایا تھا۔ یعنی یہ کہ اسے صرف واقعات کی صحت اور سچائی اور لکھنے والے کے افکار اور خیالات کی صحت اور عدم صحت سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ کام تاریخ نویسوں اور فلسفیوں کا ہے۔

موصوف نے اپنے تنقیدی منشور میں امریکی نقادوں سے خطاب فرمایا ہے: "امریکی نقادو! یہ تمہارا فرض اولین ہے کہ نراجیت اور مادیت پسندوں کے خلاف مورچہ بند ہو جاؤ جو اخلاقیات بگاڑنے والے عیش پسندی کی تعلیم دینے والے ہیں ان کے خلاف مورچہ بند ہو کر امریکی ادیبوں کی خالص فن پسندی کے حق کا دفاع کرو۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی تمہارا ہی فرض ہے کہ عوام کی خوش بسری کی خاطر خالص جمالیات کے معنی اور مفاہیم کی تشہیر کا بیڑا اٹھاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ روحانی زندگی کی رفعتوں میں فن، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کے خمیر (نہ کہ علاحدہ علاحدہ ان کی اپنی اہمیت) کی اہمیت بنیادی ہے۔ جو ادیب زندگی میں متذکرہ تمام علوم اور فن کو روحانی ارتفاع میں اکائی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور پراگندہ خیالی کو اس کا متبادل بتلاتے ہیں، وہ ایک بامعنی انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دشمنوں کی مانند ہیں" اسپنگارن کا یہ ادبی منشور بذات خود لکھنے والوں پر اخلاقی بندشیں عائد کرنے کے مترادف ہے جس سے وہ ادب میں غیر جانبداری کی ضمانت طلب کر کے انہیں "آزاد اور روشن خیال" ایسے ادیب بنانا چاہتے تھے جو معاشرے کی جامد تصویر پیش کرتا رہے اور حالات حاضرہ پر لب کشائی اپنے ٹیکنوکریٹس اور بیوروکریٹس کی ذمہ داری سمجھ کر ان سے دور رہے۔

اسپنگارن صاحب کے اس منشور کے باوجود تیسری دہائی کے امریکی لکھنے والوں میں بدلتا ہوا ادب تخلیق کرنے والے ادیبوں کی تخلیقات کا ایسا ریلا آیا کہ وہ ان ساری بندشوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ ظاہر ہے کہ جب دولت اور زندگی کی آسائش وال اسٹریٹ کے سیٹھ ساہوکاروں اور ان کے گماشتوں تک محدود ہو کر رہ گئیں اور آبادی کا باقی حصہ افلاس اور جرائم کا شکار ہو کر رہ جائے تو "باقی سب خیریت ہے" لکھنے کی تلقین کرنے والی زر پرستانہ پارٹی لائن "دولت پیدا کرنے اور فاقہ کشی کا شکار رہنے والوں کے دوست ادیبوں کی تخلیقات کے سامنے کہاں اور کتنی دیر ٹھہر سکتی ہے۔

یہ اتفاق یا "پیروی مغربی" نہیں تھی کہ متحدہ ہندوستان میں تیسری دہائی میں سیاسی اور سماجی استحصال پسندوں کی مغربی اور مشرقی

حکومت بھی ایسے ہی حالات پیدا کر چکی تھی جس میں ہمہ سمت سماجی بے چینی جنم لے رہی تھی، اور اس بے چینی کی کھلی اور واضح نادہی یہاں بھی ادب میں "سرپھروں" اور "باغیوں" کی وہ نسل جنم لے رہی تھی جنہوں نے ہندوستان کے "غیرت طلب" اسپنگاروں ادبی منشور کو اپنی انحرافیوں سے شکست دے کر سماجی افادیت پسندی کو اپنا منشور بنا لیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں آج بھی سماجی افادیت در انقلاب آفرینی کے آرزومند ادب کا یہ نیا منشور ادب کو خوشبویات اور عطریات میں بسا ہوا عجلۂ عروسی سمجھنے والوں کے لئے لِ روح بنا ہوا ہے۔ یہ وال اسٹریٹ پارٹی لائن" سے ان کی اٹوٹ وفاداری کا مسئلہ ہے۔ ایسی وابستگیوں میں کھنڈت ڈالنا؟ ظاہر ناخوشگوار عمل ہے۔

سردار جعفری کا ادبی شعور اسی تیسری دہائی کی "انحرافی" کا پروردہ ہے کہ جب اس دور کے نوجوانوں کی باشعور اور باخبر حالات حاضرہ کے پس پشت غیر ملکی چیرہ دست حکمرانوں کی خفیہ اور باریک چالوں کو سمجھنے لگی تھی۔ انہوں نے اپنی یادداشتوں پر مختصر سی کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں اپنے ذہنی تغیرات کی مرحلہ وار روداد بڑی سچائی کے ساتھ قلم بند کی ہے کہ وہ طرح ادبی ابہام و ایہام کی سکون بخش اور مخملی راہوں پر چلتے چلتے اعزا کی طعن و تشنیع اور حکومت کی وفادار قوتوں کی نگاہوں میں تعزیر بن جانے کی پرخار راہوں کے مسافر بن گئے۔ یہاں ان کی اس ادبی زندگی کی تفصیلات کو دہرانا بے موقع سی بات ہے سے گزر کر وہ حریت پسند قافلے کے شریک سفر ہو گئے تھے۔ یہاں اتنا ہی حوالہ کافی ہے کہ وہ بیک وقت جنبش مامیٰ کی ادبی یں کو قلم زد کر کے ایک نئے اور مشکل راستے پر گامزن ہو گئے۔ جوان دنوں جسم و جان کی سلامتی کے اعتبار سے خطرات کو جان بوجھ کر مول لینا رہ آگے چل کر سردار جعفری کو ان خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

متذکرہ بالا احوال و کوائف کے حوالے سے اگر سردار جعفری کے ادبی سفر کے اولین مستحکم اور نظریاتی تخلیقات کو حوالہ بنانا مقصود ہو تو غالباً افسانہ نگاری ہی پر نظر ٹھہرے گی۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ آج ان کی افسانہ نگاری کا حوالہ ہی طاقِ نسیاں کی زینت بن گیا ہے۔ ادھر رسوں میں آنے والی ادبی نسلوں کے سامنے سردار جعفری کی افسانہ نگاری کی نشان دہی کرنا ان کے لئے بڑی انہونی سی بات بن جاتی یہ ہماری ادبی یادداشت کا واحد المیہ نہیں ہے۔ اور بھی کئی ایک ایسی مثالیں موجود ہیں۔ یہ بات المیہ ان معنیٰ میں راقم الحروف ریک بن جاتی ہے کہ جب کسی ایک صنف میں مقام شہرت پا جانے کی بنا پر ہم کسی ادیب کی ان تحریروں کو فراموش کر ڈالتے ہیں یروں میں اس کے اولین نقوش ہی اس کے بعد کی تخلیقات کا جاندار پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

سردار جعفری نے جن دنوں افسانہ نگاری شروع کی تو ان کے پیش روؤں میں اس ہی "طرز فغان" کے بانیوں میں احمد علی، سجاد رشید جہاں اور محمود الظفر ہماری سماجی اور ادبی زندگی میں بھونچال لا چکے تھے۔ اسی انداز نگارش (کہ جس کی بنیاد سماجی ظلم و جبر عتاب کرنے کی روایت پر رکھی گئی تھی) کے بعد کے متبعین میں جن نوجوانوں کے ناموں کا اضافہ ہوا ان میں سردار جعفری اور اختر الایمان خاصے نمایاں ہو کر ابھرے۔ اختر الایمان کے افسانے بھی تعداد میں اتنے ہی قلیل تھے جتنے کہ سردار جعفری کے ہیں لیکن وہ صرف دہلی) کے صفحات میں مقید ہو کر رہ گئے اور اب شاید تقسیم ہندوستان کے بعد کی نسل اختر الایمان کے اس ادبی پہلو سے بالعموم با نہیں۔ سردار جعفری کے افسانوں کی قسمت اچھی تھی کہ وہ حلقۂ ادب لکھنؤ کی توجہ سے (۱۹۴۰ یا ۱۹۴۱ء میں) کتابی شکل یا کے نام سے محفوظ ہو گئی ہیں۔

منزل میں سردار جعفری کے پانچ افسانے اور ایک یک بابی ڈرامہ (One-Act Play) شامل ہیں۔

افسانوں کے نام (۱) منزل (۲) بارہ آنے (۳) باپ (۴) مسجد کے زیرِ سایہ۔ اور (۵) آدم زاد، ہیں۔ ڈرامے کا نام (۶) "سپاہی کی موت" ہے۔ بڑی اہم بات اس ضمن میں یہ ہے کہ ان ساری تحریروں کے اختتام پر ان کا سنہ تحریر بھی درج ہے۔ جس سے نہ صرف ان کے محرکات کی فضا کا تعین آسان ہوجاتا ہے بلکہ موضوعات کی تفہیم اور ان کی فنی کیفیات کی بات بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ سب سے پہلے آخرالذکر (یعنی فنی نوعیت) پر دو ایک باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں۔ موضوعات پر بعد میں کچھ عرض کیا جائے گا۔

باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں ہی میں ہوگیا تھا۔ سجاد حیدر یلدرم اردو میں اس صنف کے محرکِ اول تھے اور پریم چند اسکو مستحکم کرنے اور بروج پر لے جانے والے تھے۔ یلدرم کا سورس آف انسپریشن (SOURCE OF INSPIRATION) ترکی افسانہ تھا، پریم چند کا یہ منطقہ خالص ہندوستانی فضا سے تعلق رکھتا تھا۔ یہاں دو باتیں اردو افسانہ کی ابتدائی فنی نوعیت کا مسئلہ خاص بن جاتی ہیں یعنی ابتدائی مفروض بالکل قصے کہانیوں کی طرح سیدھے سادے بیانیہ کی حدود میں مقید۔ تکنیکی اعتبار سے اس دور میں ترقی کی کمیابی تو عذر نہیں بنائی جا سکتی اس لئے کہ انگریزی زبان میں اس دور کی کہانی ایڈگر ایلن پو، ہنری جیمز، جیمز جوائس اور ورجینیا وولف کے ہاتھوں کئی ایک خوبصورت تجربات سے گزر چکی تھی۔ مگر اصل مسئلہ اس طرف توجہ دینے کا تھا۔ یلدرم اور پریم چند دونوں ہی انگریزی داں بھی تھے اور پڑھنے پڑھانے کے شوقین بھی، لیکن متحدہ ہندوستان کی فضا سرسید احمد خان اور ڈپٹی نذیر احمد (مع چند رفقاء) کی نثری کوششوں اور محمد حسین آزاد اور حالی کی طرف سے روایتی اور برائے شعر گفتن کی لایعنی یلغار کی صف شکنی کے باوجود شاعری کے سہل انگار روش کی گونج فضا پر مسلط تھی۔ یلدرم کی رومانیت سے لبریز تحریروں نے ایک بڑا کام کیا جس کو ہمارے نقادوں نے کبھی لائقِ اعتنا نہ سمجھا، یعنی نثر کی زبان کو شاعری سے قریب تر کر کے لکھنے والوں کے دلوں سے شاعری کی طرف نکل جانے کی راہیں افسانہ نگاری کی طرف موڑ دیں۔ بلاشبہ وہ افسانوی ادب کے بڑے محسن ہیں، لیکن بحیثیتِ مجموعی شاعری کی راہیں نئی نسل کے لئے مسدود کرنے کے اولین امام مولانا ابوالکلام آزاد ہی تھے، جن کی ادق تحریروں میں بھی حسنِ بیان کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ بہت کچھ معانی و مطالب ss/m کر جانے کے باوجود قاری جنبش نہیں کر سکتا اور یوں بھی کچھ کہانیاں مولانا ابوالکلام آزاد کی بھی لکھی ہوئی ہیں، جن کے موضوعات کا تعلق صرف جذباتی منطقہ میں سفر کرتا ہے۔ مگر ان کی نثری دین اردو کی جدید فکشن کی ابتدائی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یلدرم کی رومانوی افسانہ نگاری کی معنوی نسل کا قبیلہ بیسویں صدی کے ابتدائی تیس برسوں میں بڑا پھلا پھولا۔ اردو میں یہ نسل مجنوں گورکھپوری، نیاز فتحپوری، راشدالخیری، حکیم احمد شجاع، سدرشن، سلطان حیدر جوش، مولانا حسن نظامی ایسے معروف مشاہیر سے لے کر بہت سے (آج کے گمنام افسانہ نویس مثلاً عبدالمجید سالک، راز چاندپوری، مولانا حامد علی خان، مولانا ظفر علی خان، ضیاءالدین شمسی، ل۔ احمد، عطاءالرحمن۔ اثر صہبائی، شیخ ہادی حسین (ایڈیٹر ہزار داستان)، حکیم یوسف حسن، ناصر نذیر فراق دہلوی، محمد حسین پلی بھیتی، منشی بدرالدین، حافظ امام الدین، اکبرآبادی، وغیرہ سینکڑوں نہیں تو ساٹھ ستر افسانہ نگاروں پر تو ضرور مشتمل ہے۔ دوسری طرف پریم چند کا معنوی قبیلہ تو آج بھی عمودی اور افقی ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔

اس قدرے طویل اور بے موقع حوالہ جاتی گفتگو سے اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ ابتدائی دور کے حوالے سے تکنیکی رنگ کی طرف بھرپور توجہ دلانا۔ اصل مقصد اس لئے کہ اس دور کے بعد بھی کسی نئے افسانہ نگار کی تحریریں اس دھڑے سے باہر نکلتی نظر نہیں آتی۔ خاص طور سے اس امر کی نشاندہی اس بنا پر بھی ضروری تھی کہ نیا قاری اگر سردار جعفری کے افسانوں میں کسی

جب تکنیکی تجربہ کی تلاش میں آج کے تجریدی افسانوں سے تقابل کرنے لگے تو اس کے ذہن میں سردار جعفری کی افسانہ نگاری سے پہلے کے تیس پینتیس برسوں کی صورت حال واضح ہونی چاہیے۔

سردار جعفری کی ادبی زندگی کا ابتدائی دور اور اس کا عام ادبی رویہ ـــ شاعری میں استثنا کے ساتھ کہ جب تکنیکی اجتہاد بھی عروج پر تھا ـــ افسانوں کی حد تک تکنیک کا نہیں بلکہ مواد کے تنوع کا دور تھا۔ اس دور میں پہلی بار ادب کو بالراست انداز میں زندگی کے ساتھ ساتھ گھسکر چلنے کی راہوں پر ڈالا گیا تھا۔ چنانچہ اس دور کی شاعری، ناول نویسی، افسانہ نگاری، رپورتاژ وغیرہ وغیرہ تمام اصناف ادب و شعر کے مواد کا تنوع دراصل زندگی کے تنوع کا سچا اور زندہ احاطہ تھا۔ حسن بیان کی خاطر "بڑھا بھی لیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے" تو بالکل ہی الگ بات ہے البتہ یہ ادب صرف اور محض "زیب داستان" کی خاطر سرائیاں چھوڑنے والا شعر و ادب نہیں تھا۔ یہ نظریاتی ادب تھا جو آج بھی ہے۔ سردار جعفری کے افسانوں میں اگر حسن، دلکشی اور رعنائیاں تلاش کرنی ہیں تو اس دور میں کی جانے والی زندگی کے انحلال اور اضطراب کی عکاسی میں دیکھئے۔

'منزل' کے مندرجات کی فہرست میں سرِاوّل یک بابی ڈرامہ "سپاہی کی موت" ہے جو ۱۹۳۷ء کی تحریر ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ڈرامہ دائرۂ اظہارِ رائے سے خارج ہے، لیکن مشمولات 'منزل' کے لحاظ سے اسکو خارج از موضوع نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دوسری اہم وجہ سردار جعفری کے چنے ہوئے اس موضوع کی SEQUENCE کا احاطہ ہے جو ان کے دورِ افسانہ نگاری اور دوسری اصنافِ شعر و ادب کا اہم ترین موضوع ہے۔ یعنی برطانوی استعمار کا اپنی حکومتوں اور اقتدار کے استحکام کی خاطر افریقہ سے لے کر مشرقِ بعید تک جگہ جگہ جنگوئی کی بساطیں بچھانا۔ منزل میں یہ سلسلہ SEQUENCE "سپاہی کی موت" سے بالراست انداز میں شروع ہو کر ماہنامہ "ادب لطیف" لاہور کے نومبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہونے والے رگنیس سمڈلے کے افسانہ "ٹوٹی ہوئی بانسری" کے ترجمہ سے اپنا دائرہ مکمل کرتا ہے۔ درمیان میں اس مجموعہ کا افسانہ "آدم زاد" بھی جنگ ہی سے متعلق ہے لیکن میدانِ کارزار سے بالراست جڑا ہوا نہیں بلکہ جنگ سے پیدا شدہ مسائل میں سے ایک مسئلہ کا عکاس ہے ـــ آئیے پہلے ان ہی تین تخلیقات پر ایک موضوعاتی بات چیت کر لیں۔

"سپاہی کی موت" کا منظر نامہ

"اکتوبر ۱۹۱۶ء کی ایک شام"

"فرانس کی مشرقی سرحد پر ایک چھوٹے سے اسکول کی عمارت جو اب ایک فوجی ہسپتال میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ایک کمرہ جو زخمی سپاہیوں سے بھرا ہوا ہے۔ دروازہ کے قریب ایک ہندوستانی سپاہی جس کے سر میں گولی لگی ہے نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ ایک فرانسیسی نرس اس کے سرہانے خاموش کھڑی ہے۔"

یہ سپاہی بے ہوشی میں بڑبڑا رہا ہے۔ اس بڑبڑاہٹ میں وہ بتاتا ہے کہ وہ گنگا کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہے جہاں اس کی بیوی اور چھوٹا سا بچہ ہے۔ بیوی زندگی گزارنے کے لئے اپنے بھائیوں کے گھر ان کا کام کاج کرتی ہے۔ وہ کافی دنوں سے فرنٹ لائن پر ہونے کی وجہ سے خط بھی نہیں لکھ سکا اس لئے اس کی بیوی سوچتی ہوگی کہ "میں بے وفا نکلا" اس دوران اس کے سر میں سے گولی نکالنے کے لئے آپریشن کی تیاری کی جاتی ہے لیکن عین موقع پر ایک انگریز سارجنٹ زخمی ہو کر اس ہی اسپتال میں لایا جاتا ہے۔ اس پورے وارڈ میں جو صرف گورے فوجیوں کے لئے مخصوص ہے اب کوئی بستر خالی نہیں ہے۔ چنانچہ گورے فوجی کے لئے بستر خالی کرانے کی غرض سے اس "کالے" سپاہی کو زہر پلا کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور گورے فوجی کو لٹا دیا جاتا ہے۔ چوں کہ گولی اس کے عین دل کے قریب لگی ہے اس لئے خون چشمے

کی طرح ابل رہا ہے۔ اور وہ چند ہی لمحوں کے بعد مر جاتا ہے۔

"ٹوٹی ہوئی بانسری" چین اور جاپان کی لڑائی سے متعلق ہے۔ جاپانیوں سے لڑنے کے لئے جب چین میں عام بھرتی کا اعلان ہوتا ہے تو گیارہ بارہ برس کی عمر کے بچے بھی بڑے نوجوں کی مدد کے لئے میدان جنگ میں اتر پڑتے ہیں۔ ان ہی کم سن بچوں میں بچپن کے دو دوست لی کوائی اور یو گنگ بھی شامل ہیں۔ لی کوائی بانسری بجانے کا اتنا شوقین ہے کہ وہ میدانِ جنگ جاتے ہوئے بھی اپنی بانسری ساتھ لے جاتا ہے اور رات کو فرصت کے وقت میں دیر تک بانسری بجاتا رہتا ہے۔ ایک روز شدید لڑائی کے بعد جاپانی سپاہی پسپا ہو کر فرار ہوتے ہوتے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتے ہیں۔ لی کوائی اس وقت برف پگھلنے کے بعد گیلی زمین سے پتھر اکھاڑ اکھاڑ کر لال سپاہیوں کو دے رہا تھا جو وہ جاپانیوں پر پھینک رہے تھے۔ ایک مضبوطی سے گڑے ہوئے پتھر کو لی کوائی نے اپنی بانسری زمین میں گاڑ کر اکھاڑا تو بانسری ٹوٹ گئی اور عین اسی وقت جاپانیوں کی اندھا دھند فائرنگ سے کسی سپاہی کی گولی لی کوائی کے سینہ میں پیوست ہو گئی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میدانِ جنگ سے براست متعلق مذکرہ بالا دونوں افسانوں کے ساتھ ساتھ "آدم زاد" جنگ کے دوران میں پیدا ہو جانے والے ایک اہم معاشرتی مسئلہ کا اظہار کرتا ہے۔ جب کوئی ملک جنگ میں ملوث ہو جاتا ہے تو بوڑھے، جوان، شادی شدہ اور غیر شدہ سب ہی افراد سرحدوں پر بھیج دیئے جاتے ہیں۔ جنگ اگر دو چار سال بھی چلتی ہے تو سرحدوں پر ان شادی شدہ اور کنوارے افراد کی گھروں سے دوری اور بیویوں سے جدائی لمبے عرصے تک جاری رہنے کے سبب جنسی تشنگی کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف شوہروں سے کٹی ہوئی بیویوں اور گاؤں میں نوجوانوں کی قلت کے سبب کنواری لڑکیوں کے لئے غیر شادی شدہ رہنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ نتیجتاً میدانِ جنگ اور گاؤں اور شہروں میں جنسی بے راہ روی اور کرپشن کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

"آدم زاد" میں یہی مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ جما ایک نو بیاہتا عورت ہے جس کے خاوند کو شادی کے فوراً بعد میدانِ جنگ میں دھکیل دیا جاتا ہے اور جنگ ختم ہو جانے کے باوجود وہ لاپتہ ہے۔ اس ہی طرح آٹھ سال کا عرصہ گزر جاتا ہے۔ جما اس دوران میں گمراہ ہو کر ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ دوسری طرف گاؤں کا کوئی نوجوان اس بچے کو اپنا کہنے کے لئے تیار نہیں ہوتا نہ چودھری کا بیٹا نہ عیدو اور نہ گھسیٹا۔ جما کے سامنے اب ایک بے یار و مددگار اور بدنامی کی طویل زندگی ہے۔

جنگ سے بالراست اور براہِ راست پیدا ہونے والے موضوعات پر مبنی ان افسانوں میں بظاہر کوئی معرکتہ الآرا مسئلہ نہیں ہے جنگ کے دوران یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ بے قصور جوان بے مقصد زندگیاں گنواتے ہیں۔ میدان جنگ میں اخلاقی بے راہ رویاں پھیلتی ہیں۔ معاشروں میں مہنگائی اور جنگ کی تباہ کاریاں بھری پری بستیوں کو کھنڈر بناتی ہیں۔ شوہروں کی طویل عدم موجودگی عورتوں میں جنسی فرسٹریشن اور کرپشن کو جنم دیتی ہے اور وہ خود گمنام باپوں کی اولادوں کو جنم دیتی ہیں۔ یہ سب واقعاتی کھتونی ہے جس میں اور بھی بے شمار واقعات درج کرنے کی گنجائش ہے لیکن ان ہی واقعات سے ایسے اخلاقی مسائل سر ابھارتے ہیں جو متعلقہ گاؤں اور شہروں ہی کو نہیں پوری عالم انسانیت کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں۔ مثلاً "سپاہی کی موت" میں ایک لڑتے ہوئے گورے سارجنٹ کو صرف چند لمحات کے لئے بستر مہیا کرنے کی خاطر ایک کالے سپاہی کو زہر دے دیا جاتا ہے حالانکہ آپریشن کے بعد اس کی زندگی بچائی جا سکتی ہے طرف داری اور تعصب کے اس موازناتی عمل کی گرفت نے اس افسانے کو پوری عالم انسانیت کی ایک چیخ بنا دیا ہے۔ نسلی برتری کا یہ خود ساختہ اور جھوٹا تفوق دو عالمی جنگوں کے میدانوں سے ہوتا ہوا ہماری رواں صدی میں افریقہ سے لے کر مشرقِ بعید میں چین تک اس جھوٹے تفوق کو سربلندی کے لئے کرہ ارض کے تین چوتھائی حصے کو ظلم، جور، تشدد اور سماجی ذلتوں کی فصلوں کی آبیاری کے لئے کتے

ہزاروں من خون ان ظالموں نے لیا ہے؟ اس کے ایک ایک قطرہ کا حساب ڈیڑھ دو صدیوں کی تاریخ میں "ذرا ذرا" درج ہے۔ خود برصغیر پاک و ہند میں ملا سو برسوں تک جو کچھ ہوتا رہا اور گذشتہ ساٹھ ستر برسوں میں امریکہ اور افریقہ میں نسلی تفوق اور برتری کا جو ننگا کھیل جاری ہے وہ سب جنگِ عظیم اول کے اس فرانسیسی گاؤں کے اس اسکول کے چھوٹے سے کمرے سے دست بزیر ہوا ہے جس کو اسپتال بنا کر وہاں یقینی موت کے بدلے ایک یقینی زندگی کو زہر پلا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی عمل ذرا دوسرے انداز میں "ٹوٹی ہوئی بانسری" میں بھی استعماری قوتوں کے با معاوضہ کارندے اندھا دھند فائرنگ کر کے ایک معصوم نوجوان کی زندگی کے ہاتھوں اور ہونٹوں سے اس بانسری کو بے روح کر جاتے ہیں جس سے زندگی بخش اور دل کو ملی سُر اور نغمے چھوٹتے تھے۔

اس خون آشام استعماریت کا اصل روپ سردار جعفری نے اس مجموعے میں شامل افسانہ "منزل" میں دکھایا ہے۔ یہ خونریزی اپنے قول، عمل اور کردار میں جتنی بے رحم تھی اس کی اتنی ہی جیتی جاگتی بلکہ کچھ زیادہ ہی بے رحم مرقع کشی اس افسانے میں ملتی ہے۔ یہ ایک اونچے جاگیردار خاندان کی لڑکی فاطمہ کی کہانی ہے، جو پڑھی لکھی بھی ہے، خوبصورت بھی اور اپنے خالہ زاد انقلابی بھائی عظمت کی خیالوں اور دوستی کی وجہ سے انقلابی شعور کی منزل سے گزرنے والی بھی۔ عظمت خود کٹر کانگرسی اور انگریز دشمن نوجوان ہے جو فاطمہ کے خاندان کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کی ان انقلابی سرگرمیوں اور فاطمہ پر اپنے خیالات کی اثر انگیزی کی بنا پر فاطمہ کے والد خان بہادر حامد علی خان اسے گھر سے نکال دیتے ہیں۔ لیکن اس کی روانگی اس وقت تک فاطمہ کے اندر بھی انقلابی سوچ کے جراثیم پیدا کر چکی ہے۔ فاطمہ کی شادی ایک نئے نئے آئی سی ایس نوجوان اشفاق سے ہوتی ہے۔ وہ ضلع کا ڈپٹی کمشنر بھی ہے۔ ان کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے جس کی پرورش کے لئے وہ ایک دودھ پلانے والی عورت دلاری کو رکھتے ہیں۔ بچے کو سونے کے کپڑے پہنائے جاتے ہیں تو دلاری اسے لے کر غائب ہو جاتی ہے بھلا ڈپٹی کمشنر سے بچ کر دلاری کہاں جا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ پکڑی جاتی ہے۔ اور اشفاق اسے جیل بھجوا دیتا ہے۔ اس ہی دوران میں اس شہر میں ایک مسجد پر ہندو مسلم تنازعہ شروع ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف سے سخت ایجی ٹیشن ہوتا ہے۔ عظمت بھی گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایک رات کو بغیر خاوند کو اطلاع دیئے اپنی نوکرانی کے ساتھ فاطمہ بھی ایجی ٹیشن دیکھنے جاتی ہے۔ جہاں اسی وقت جھگڑا ہو جاتا ہے اور اشفاق بحیثیت ڈپٹی کمشنر فائرنگ کرا دیتا ہے۔ فاطمہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر خود بھی ایجی ٹیشن میں شریک ہو جاتی ہے۔ فائرنگ سے سینکڑوں لوگ زخمی ہوتے ہیں۔ اور جلوہ ختم ہو جانے پر گرفتاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ زخمی فاطمہ بھی کچھ خواتین کے ساتھ گرفتار ہو جاتی ہے۔ گھر جا کر اشفاق کو ملازمہ کی زبانی اس کی ایجی ٹیشن میں شرکت اور گرفتاری کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ جب زخمی اور گرفتار عورتیں اس کے سامنے تماشے کے لئے پیش ہوتی ہیں تو وہ سب کو (بشمول فاطمہ) چھ چھ مہینے کی سزا سنا دیتا ہے۔ اس مرحلہ پر اشفاق کو اپنے عہدہ سے نفرت ہو جاتی ہے۔ جیل میں دلاری بھی ہے۔ جب فاطمہ وہاں پہنچتی ہے تو دلاری اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ڈپٹی صاحب نے اسے چھڑانے کی کوشش نہیں کی (تب ساری قیدی عورتوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے) فاطمہ جواب دیتی ہے کہ "یہ ان کے اختیار سے باہر تھا" فاطمہ کا یہ مختصر سا جواب ساری قیدی عورتوں کے اندر عجیب سا شعور پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سب بیک زبان کہتی ہیں "ظلم تو حکومت کرتی ہے حاکم بیچارے کیا کریں" فاطمہ فوراً ہی تنک کر جواب دیتی ہے "پھر وہ حاکم بنتے ہی کیوں ہیں؟"

سپاہی کی موت، منزل، آدم زاد اور رنگین سمٹلے کے افسانے کے ترجمے "ٹوٹی ہوئی بانسری" کے موضوعات کے ایک سرسری جائزے سے ہمیں افسانہ نگار کے سیاسی اور سماجی شعور کی ان صد رنگ بوقلمونی کا پتہ ملتا ہے جو تخلیق شعر و ادب میں ان کی راہیں متعین کرتی رہی ہیں۔ ان افسانوں کا مخصوص اور محدود موضوع ہونے کے باوجود غور طلب امر یہ ہے کہ ان کے مصنف نے زندگی کے کتنے مختلف

پہلوؤں کو اپنی تخلیقی گرفت میں لیا ہے۔ مثلاً ان افسانوں میں میدانِ جنگ میں خود غرضی، نفسا نفسی اور معمولی معمولی باتوں پر ہم پیشہ افراد کو غلط طریقہ سے موت کی نیند سلا دینا (سپاہی کی موت) اور میدانِ جنگ ہی میں ہمدردی، رفاقت اور انسانی جانوں کے بے مصرف اور بے مقصد زیاں پر بیک وقت ترحم اور بغاوت کے جذبات کا انگیخت ہونا، چاروں طرف آگ اور خون کی بارش کے باوجود باسری کے کومل اور زندگی بخش سُر چھیڑنا (ٹوٹی ہوئی بانسری) یا پھر اس جنگ و جدال اور خونریزی کو بچوں کا کھیل سمجھ کر کھیلنے والے پس پشت تو ہیں جب خاردارِ عوام (سول سروس) کا روپ دھار کر عدل و انصاف کی گدّیوں پر براجمان ہوتی ہیں تو ان کے چہروں پر چڑھے ہوئے خونخوار جیڑیوں اور ہر لمحہ آدم بو آدم بو کا نعرہ لگانے والے دیوزادوں کے مصنوعی چہرے بات بات پر نہتے عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ کراتے ہیں اور زخمیوں کو جیلوں میں ٹھونس دیتے ہیں۔ یا پھر میدانِ جنگ کے باہر انسانی آبادیوں میں روزمرہ کی اشیائے ضرورت کا قحط پڑتا ہے، بیٹیاں، بہنیں اور گھروں کی عزت بہو بیٹیاں دو دو چار چھٹانک اناج اور چاولوں کے عوض بکتی اور لٹتی ہیں یا اپنی جنسی تشنگی بجھانے کی خاطر ایسے بچوں کو جنم دیتی ہیں جن کو اس دنیا میں لانے والے باپ نہ صرف انہیں اپنانے سے گریز کرتے ہیں بلکہ اپنی آغوش گرم کرنے والی خواتین کو اسقاطِ حمل پر آمادہ قرار دے کر ان کو بچا پتوں سے سزائیں دلواتے ہیں اور ان کے لواحقین کا حقہ پانی بند کرا دیتے ہیں۔ (آدم زاد)

ان افسانوں میں نہ عشق و عاشقی کی چاشنی ہے نہ ہجر کی نہ کٹنے والی تاریک راتیں نہ وصال کے لمحات کے لئے اضطراب اور تڑپ کی مرقع کشی۔ نہ رومانوی فضا ہے نہ کہانی کہنے سے پہلے کی طولانی تمہید، نہ کردار نگاری کے لئے زباندانی کے مظاہرے اور شعبدے۔ یہ افسانے سیدھے سادے بیانیہ انداز کے ہیں لیکن ان کی سادگی اور الفاظ کی صنعت کاری سے محروم اندازِ نگارش میں جھلکتی لہکتی اور ہزار زاویے اور ہزار رنگ دکھاتی زندگی ہے۔ ان زاویوں اور رنگوں میں مایوسیاں بھی ہیں، نامرادیاں بھی۔ اضمحلال بھی اور شکست رفیقت بھی۔ لیکن ان ہی زاویوں میں نفی سے اثبات کی تراوش بھی پھوٹتی ہے۔ سر کے معمولی زخم کا مریض اپنی تمام محرومیوں اور مایوسیوں کا مداوا ہونے والے آپریشن کی آس میں موت سے پنجہ آزمائی کی سکت تو رکھتا ہے لیکن دوسرے شدید زخمی اور چند لمحات کے مہمان فوجی افسر کے لئے اپنا بستر زہر کا گلاس پی کر خالی کر دیتا ہے (سپاہی کی موت) اچھی زندگی کی خواہاں خاطر اپنے والدین کے فیصلہ پر سر جھکا کر ایک نوجوان آئی سی ایس سے شادی کر کے ڈپٹی کمشنر کی بیوی تو بن جاتی ہے لیکن مسجد کے قضیہ پر بیرونی استعمار کے کارندوں اور گماشتوں کے ذریعہ کرائے گئے ہندو مسلم فساد پر عالم کے اندر کا انقلابی ولولہ جاگ اٹھتا ہے اور اپنے ڈپٹی کمشنر خاوند سے چھپ کر خود میدانِ کارزار کو دیکھنے پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس میں شریک ہو جاتی ہے، زخمی ہو کر تھانے پہنچ جاتی ہے اور اپنے خاوند کے اختیارات ہی سے چھ مہینہ کی سزا (بلوہ میں حصہ لینے کی پاداش میں) پا کر جیل میں پہنچ جاتی ہے پھر اس کا مکالمہ کہ اگر بیرونی حکومت ظالم ہی ہے تو لوگ ظلم کرنے والے حاکم کیوں بنا پسند کرتے ہیں: زندگی کے اس رخ کے حُسن پر پڑھنے والے ہی اس کی داد دے سکتے ہیں، شعر و ادب کی جان اور آن صرف اور صرف سخن سازی اور بقول مولانا آزاد لفظوں کے طوطا مینا اڑانے والوں میں اس کی داد کا حوصلہ کہاں؟ یا پھر "آدم زاد" کی حوصلہ مند جھنا جو حوادث اور سماجی طوفانوں سے الجھ جانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ جو چودھری کے لڑکے کو ترنت کر جواب دیتی ہے "بھیا چلو رہا حکمت ہے ڈگریا نا ہیں تھکتی" اس افسانے میں بھی کہیں عشق و عاشقی کی چاشنی نہیں البتہ اس چاشنی پر مکھیوں کی طرح بھنبھنانے والے اوباش اور رنگے تن ساز ہیں۔ چودھریوں اور بلیک مارکیٹوں کی بزدل اولادیں جو جنگ کی سرحدوں پر باہمت نوجوانوں کی گاؤں سے عدم موجودگی پر بے سہارا عورتوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر گویا قلعے سر کر رہے ہیں۔

اس مجموعے کے باقی تین افسانے 'بارہ آنے'، 'باپ'، اور مسجد کے زیر سایہ' ان عام معاشرتی کوائف کو موضوع بنایا گیا ہے جن کو جنم دینے میں کرداروں کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن وہ ان ہی حالات کی زنجیروں کے اسیر ہیں۔ مثلاً یہ دیکھئے کہ 'بارہ آنے' کا بوڑھا کباڑیہ جو دن بھر تو اپنے کباڑخانہ

میں بیٹھا مکھیاں مارتا ہے، لیکن رات کو اس ہی کباڑ خانے کے عقبی کمرہ میں تاڑی خانہ اور اوپر کے کمرہ میں قحبہ خانہ چلاتا ہے۔ شراب خانہ میں جوا بھی ہوتا ہے، جہاں دن بھر کی محنت سے تھکے ہوئے تانگے والے اور مزدور اپنی دل بستگی کی خاطر دن بھر کی کمائی بڈھے کے کیسہ میں انڈیل جاتے ہیں اور قحبہ خانے میں محنت مزدوری نہ پانے والی فاقہ کش گھروں اور کسانوں کی بیٹیاں عاجز آکر بارہ بارہ آنے میں جسم فروشی پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ افسانہ باپ کی اندرا جس کی ماں بھی مرچکی ہے تنہا اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ یتیمی کی بے رنگ و بو زندگی گزارتی ہے۔ بے حد شریف اور سوتیلے باپ کی خدمت گزار لڑکی ہے لیکن ایک رات اپنے شرابی باپ کی ہوس کا شکار ہو کر ایک بیٹی کی ماں بن جاتی ہے۔ اور اس کے بعد قحبے کے نوجوانوں کے لئے نرم چارہ بن جاتی ہے۔ تسبیح روز و شب کے دانوں کی طرح اسی الٹ پھیر میں وہ ایک مسلمان لڑکے سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ اس لڑکے پر اندرا کو بڑا مان تھا کہ وہ اس سے شادی کرے گا لیکن جب وہ لڑکا اپنے اور اس کے درمیان مذہبی فرق کا حوالہ دیتا ہے تو وہ لڑکی جیسے اپنے پورے وجود سے ڈھیر ہو کر انتہائی بے بسی سے کہتی ہے — "تمہارا مذہب میری جان بچانے سے روکتا ہے — اچھا!"

"مسجد کے زیر سایہ" میں ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جسے کئی دنوں سے نہ کام ملا ہے اور نہ کہیں سے بھیک۔ وہ اور اس کا چھوٹا سا بچہ گلیوں گلیوں اور سڑکوں سڑکوں ہاتھ پسارے پھرتے ہیں۔ مگر نتیجہ صفر رہتا ہے۔ وہ ایک ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوتی ہے جہاں سامنے ہی چند فیشن ایبل لڑکے معاشرہ کے مسائل اور بے روزگاری اور بھوک پر دھواں دھار تقریریں کر رہے ہیں لیکن یہ عورت ہاتھ پھیلاتی ہے نفرت بھرے الفاظ اور جھڑکیاں بھیک میں ملتی ہیں۔ مسجد کے پیش امام فلاح، نیکی، بھائی چارے اور غریب غربا کی مدد کی تبلیغ تو سرِ عام کرتے ہیں مگر اس عمر کی عورت اور معصوم بچے کو ان سے بھی وہی فیشن ایبل نوجوانوں والا تحفہ ملتا ہے۔ ایک جگہ وہ ایک دہی بڑے والے کا خوانچہ فٹ پاتھ پر رکھا دیکھتی ہے تو اس کے قدم جم کر رہ جاتے ہیں۔ بالآخر وہ اس خوانچہ کے اوپر گر پڑتی ہے۔ سارے بڑے مٹی میں گر جاتے ہیں۔ یہ عورت گرے ہوئے ہی ریت بھرے بڑے خود بھی کھانا شروع کر دیتی ہے اور اپنے بچے کے منہ میں بھی جلدی جلدی ٹھونس دیتی ہے۔ دونوں ماں بیٹوں پر چاروں طرف سے مار پڑتی رہتی ہے مگر وہ ریت میں بھرے ہوئے بڑے بغیر چبائے جلدی جلدی نگلتی رہتی ہے۔

سردار جعفری کے اس افسانوی مجموعہ سے باہر ایک اور بڑا اہم افسانہ ان کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "لکھنؤ کی پانچ راتیں" میں شامل ہے۔ سردار نے اس کہانی کو بھی بطور یادداشت رقم کیا ہے لیکن یہ بھی ایک ہر طرح سے مکمل افسانہ ہے جس موضوع سے متعلق ان کے تین افسانوں کا اوپر کی سطور میں جائزہ لیا گیا ہے، اس ہی موضوع سے متعلق اور حامل یہ افسانہ / کہانی / یادداشت "چہرو مانجھی" اس سلسلہ کا تکملہ بھی ہے۔

یہ کہانی بنگال کے ساحلی علاقوں میں سے ایک علاقہ کی بستی کی بیٹی (چہرو مانجھی) کی کہانی ہے۔ جو بقول بوڑھے ماہی گیر اس فضا سے جنم لیتی ہے :- "جب سے لڑائی یعنی (دوسری جنگ عظیم) شروع ہوئی ہے مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے قحط پڑا، پھر وبائیں پھیلیں اور ایسی وبائیں ایسا قحط تو میں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ ہیضہ اور پھر کالا آزار پھر بد چلنی ۔۔۔ لڑکے آوارہ ہو گئے۔ لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں ۔۔۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انہیں روپے دیتے ہیں اور وہ سپاہیوں کو؟ اب کیا کہوں کیا دیتی ہیں ۔۔۔ بچہ ۔۔۔"

ان حالات نے بستی کی بستیوں کے لڑکے اور لڑکیوں کو بے شرمی کی ڈگر پر ڈال دیا۔ ان ہی سینکڑوں میں سے ایک چہرو

ناممکن ہے۔ جو انگریز فوجی افسروں کی منہ چڑھی بن چکی ہے۔ اور نہایت عیش کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی کہانی اس ہی کی زبانی سنیئے وہ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اسے بیچتی ہوں۔۔۔۔ تم سمجھے ہوگے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں میں کسان کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اجڑ گیا اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ اکیلی رہ گئی۔۔۔۔ تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد میں اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی۔۔۔۔ میں نے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اس نے پوچھا کیا قیمت دوگی؟ میں نے کہا خیرات دے دو۔۔۔۔ اس نے کہا تمہارے پاس جوانی ہے۔ خوب صورت چہرہ ہے۔ بھرا ہوا جسم ہے اسے کہیں جاکر بیچ آؤ۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔۔۔۔ دو دن بعد جب میں تیرہ دن کی بھوکی تھی پھر زمیندار کے پاس گئی۔ میں نے کہا اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں۔ زمیندار ناراض ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔۔۔ اس کا بیٹا مجھے گھسیٹ کر باہر لایا۔ سیر بھر چاول میں میرا جسم خرید کر لے گیا۔ تب سے میں محسوس کرتی ہوں میرے پاس میرا جسم نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ یہ سب تو کچھ سیر بھر چاول میں بک چکی۔ اور اب تو کس بازار میں میری حکومت ہے۔" مگر یہ اوپری روپ کی کہانی ہے۔ "چہرے کی یہ تکرانی" ایسے حالات کی دلدل میں پھنسنے کی تکرانی ہے جس دلدل سے اب وہ نکل نہیں سکتی۔ اور اسے اپنے ظاہری روپ کی بہرات ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

سردار جعفری کے افسانہ نگاری کے دور کی دین ابھی تک یہی چھ سات افسانے سامنے آئے ہیں۔ اس کے امکانات ہیں کہ ابھی کچھ اور بھی افسانے (منزل کے افسانوں کے بعد) لکھے ہوں۔ جو استداد روز و شب کی بنا پر اس دور کے رسائل میں ابھی تک محفوظ ہوں۔ ایسا ہے تب بھی سردار جعفری کے آج کے مسلمہ ادبی مرتبہ کے ASSESMENT میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ بقول احتشام حسین "وہ اس انسان دوست اور انقلابی کارواں میں شامل ہیں جس میں گورکی، مایاکاوسکی، ہیلو نرودا، ناظم حکمت اور لوئی آراگان کے نام لئے جاتے ہیں۔"

ہر چند کہ سردار جعفری کی ادبی تحقیقات میں ان افسانوں اور ان کی افسانہ نویسی کا کوئی ذکر کہیں سنائی نہیں دیتا۔ خود سردار جعفری بھی اب شاید ہی ان افسانوں کو یاد کرتے ہوں۔ اور اس کے باوجود کہ ان افسانوں کے ذکر اذکار یا حوالوں کے بغیر سردار جعفری کی تخلیقی دستار کی فضیلت اور افضلیت کا کوئی پر کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی شعر و ادب کی تخلیق میں سماجی شعور اور انقلاب آفرینی کی راہوں کے شعوری انتخاب کی خبر ان کی شاعری سے پہلے بھی یہی افسانے دیتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور کے زمانہ سے متعلق موضوع اور مواد کے انتخاب اور سماجی انقلاب پسندی کے فلسفے کو مشعل راہ بنا کر ان موضوعات اور مواد میں تاثر پیدا کرنا جو سماجی جدوجہد اور عوامی شعور کو بیدار کرنے میں تخلیقات کو آلہ کار بنانے کا قائل ہو جائے، ان ہی افسانوں کی وساطت سے آج سے نصف صدی پہلے کے اس نوجوان سردار جعفری سے پہلے پہل متعارف ہوتے ہیں جو انقلابی ادب کے قافلے میں نئے نئے شامل ہوئے تھے۔

سردار جعفری کے متذکرہ بالا سات آٹھ افسانوں کے متعلق جو مختصر سی باتیں اوپر کہی گئی ہیں ان میں تشنگی کا احساس مجھے خود بھی ہے اور اس کمی کو میں خود سردار جعفری کا ایک شعر قارئین کی خدمت میں پیش کرکے دور کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی افسانہ نگاری کے موضوعات اور مواد پر اس شعر سے بہتر کوئی طویل تحریر بھی نہیں ہو سکتی۔

ؔ جھی لیے ہیں باغ انسانی سے ارمانوں کے پھول　　　　جو مہکتے ہی رہیں گے میں نے گوندھے ہیں وہ ہار

●—

اکرام بریلوی

ڈراما اور علی سردار جعفری کی ڈرامانگاری

ڈرامانگاری کا فن سنسکرت ڈرامے کے زوال کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ اردو اور ہندی، کالی داس تو کیا؟ چندر بردھائی اور بھوبھوتی کی مثال بھی نہ لاسکے اور رفتہ رفتہ رہس اور امانت کی "اندرسبھا" کے بعد، یہ پارسی تھیٹر کے طالع آزماؤں کے طفیل آغا حشر کاشمیری اور ان کے معاصرین کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس منزل پر یہ حقیقت سب سے پہلے آغا حشر پر ہی آشکارا ہوئی کہ ڈراما، ادب کی ایک مہتم بالشان صنف ہے اور اسٹیج کا وجود ملک اور معاشرے کی ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کے لیے ناگزیر ہے۔ تاریخ اور ثقافت کے تابندہ پہلو اور معاشرے کے قابلِ اصلاح گوشے ڈراما اور اسٹیج کی بدولت جس طرح زندہ و پائندہ کیے جاسکتے ہیں، وہ فنونِ لطیفہ کی کسی اور صنعت کے ذریعے ممکن نہیں۔ تہذیب و ترقی بلکہ حکمت و تفکر کی دعوت ایک عمدہ ڈرامے کے چلتے پھرتے اور بولتے کردار اسٹیج کی فٹ لائٹ (FOOT-LIGHT) کے پیچھے جس خلوصِ جذبات، جس اثر انگیزی سے زندہ ہوتی ہے وہ غالباً کسی اور طرح ممکن نہیں ہے اور اس طرح آج یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ یونان کے علاوہ ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے اور جاپان میں "نو" ڈرامے نے اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی حد تک ملک کی تہذیب اور معاشرے کی کسی طرح اور کس قدر فطری طور پر تزئین و آرائش کی ہے۔

اس کے برعکس اردو میں ڈرامے کا آغاز و ارتقا ہی ایسے ماحول میں ہوا جس میں سیاسی اور معاشرتی طور پر زوال پذیری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سیاسی اعتبار سے اردو ڈرامے کا باقاعدہ آغاز اور اس کی تدریج و ترقی کا بیشتر ابتدائی دور ہماری محکومی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس دور میں ہمتوں کی پستی، تہذیب کے مردہ عناصر کو ثقافت کا جزو اعظم قرار دے کر سینے سے لگائے ہوئے تھی ــــ معاشرہ چند رسوم اور بندھے ٹکے آداب و آئین کی ظاہری ملمع کاریوں کا ہیولیٰ بنا ہوا تھا۔ زندگی کا مقصد موقع پرستی اور موقع پرستی کا مفہوم یہ تھا کہ چند تفریحات، چند تعصبات اور اپنی نام نہاد فوقیت کے توہمات میں قلعہ بند رہو۔ زندگی کے بدلے ہوئے ماحول سے آنکھیں بند رکھو۔ نئے تقاضوں سے بے خبر رہو۔ ایک مدت اور ایک منزل و مقام تک، اس خودساختہ بے خبری کا عالم قائم رہا مگر رفتہ رفتہ غبار چھٹنے لگا اور دوسری عالمگیر جنگ کے آس پاس حالات نے اتنی شدت اور تیزی کے ساتھ کروٹ لی کہ اس خودساختہ بے خبری کا حصار ٹوٹ گیا۔

ذہن و فکر نے کروٹ کرائی۔ زندگی نے بھرپور انگڑائی لی۔ نئے خیالات کا سیلاب امڈ آیا۔ سائنسی اور تکنیکی ایجادات عام ہونے لگیں جس نے زندگی، زندگی کے غموں، مسرتوں اور اخلاقی معیار و اعتبار کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی اس سے متاثر ہوا اور عوام و خواص کے اندر یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ ڈراما محض ڈھول دھپّے ہی کا نام نہیں بلکہ ادب کی ایک باقاعدہ صنف ہے اور اس کی طرف پوری سنجیدگی اور متانت سے توجہ دی جانا چاہیے۔ چنانچہ نئے افسانے کی تخلیق و ترویج کی طرح اس کی طرف بھی سب سے پہلے ترقی پسند مصنفین نے توجہ دی، شاید اس لیے کہ ڈراما "ماس کانٹکٹ" (MASS CONTACT) کا موثر ذریعہ تھا۔ یہ بات اپنی جگہ منطقی بھی معلوم دیتی ہے کیوں کہ ترقی پسند تحریک کا نقطۂ نظر اصلاحی سے بڑھ کر انقلابی تھا۔ تمام تر مآل انقلابی تھا۔ چنانچہ نئے اسالیب کے ساتھ ایسے موضوعات اور مسائل پر توجہ دی جانے لگی جو ذہنی انقلاب لاسکیں اور غور و فکر کی دعوت دیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب شکست و ریخت کا عالم ہو اور سماج سماجی بحران سے گزر رہی ہو تو ڈراما دوسری اصنافِ ادب کی طرح تنقیدِ حیات سے زیادہ تنقیدِ معاشرت کو موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ اس دور کے ڈراما نگاروں سے زیادہ ترقی پسند ڈراما نگاروں نے اسے اپنا فرض سمجھ کر انجام دینا شروع کیا۔ چونکہ یہ ایک شعوری کوشش تھی لہٰذا ادب میں گہرائی تو پیدا نہ ہو سکی مگر طنز کا دھار تیز اور تیز ہو گیا۔ افادی ادب کی اس دوڑ میں ادبی رکھ رکھاؤ اور فنی قدروں کا خیال کیے بغیر جہاں بھی کوئی ظلم کا نشان ملا، استحصال کی صورت یا سماجی بے انصافی نظر آئی اس پر وار کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی۔ اس دور کے دوسرے ڈراما نگاروں کی طرح سردار جعفری میں بھی ڈراما لکھنے کی تحریک ہوئی۔ ہر چند کہ وہ بنیادی طور پر ڈراما نگار نہیں تھے اور ابھی تک انھوں نے شاعری، مضمون نگاری اور ادبی تنقید کے علاوہ افسانے ہی لکھے تھے۔ ڈرامے کا میدان ان کے لیے بالکل نیا تھا، لیکن اتنا نیا بھی نہیں، کیوں کہ ان کی طویل نظموں میں "ڈرامیٹک مونولاگ" (DRAMATIC MONOLOGUE) "پوئٹک ڈراما" (POETIC DRAMA) اور "کلوزٹ ڈراما" (CLOSET DRAMA) کے عناصر موجود تھے۔ مگر ڈراما تو ایک علٰحدہ اور باقاعدہ فن ہے جس کے اپنے فنی تقاضے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ جانتے تھے اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے انھوں نے ڈراما لکھا۔ اس اکلوتے ڈرامے کا نام تھا "یہ کس کا خون ہے؟" علی سردار جعفری کا یہ اکلوتا ڈراما اپنے موضوع و فکر اور عصری واقعیت کے اعتبار سے نہ صرف چونکا دینے کی صلاحیت کے ساتھ ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا بلکہ اسے اہمیت بھی دی گئی۔

علی سردار جعفری کا ڈراما "یہ کس کا خون ہے؟" جنگی محاذ کے ایک ملٹری ہسپتال میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈرامے میں، ڈرامے کی تینوں اکائیاں (UNITIES) یعنی ساعت (TIME) مقام (PLACE) اور خیال (THOUGHT) موجود ہیں جو ڈرامے کے جمالیاتی حسن کی دلیل ہیں اور اس کا طنزیہ موضوع اپنے جلو میں ایسی کشش اور کشمکش رکھتا ہے کہ ڈرامے کے تاثر میں تیزی و شدت در آئی ہے۔ ڈرامے کا تھیم (THEME) یہ ہے کہ ایک ہندوستانی سپاہی (کالا آدمی) زخمی حالت میں ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ انڈین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں۔ اس کی جان بچانے اور فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے ایمرجنسی کے پیش نظر اسے مجبوراً برٹش (گوروں) کے ہسپتال میں جگہ دے دی جاتی ہے بستر پر لٹا دیے جانے کے بعد، جب نیم روشنی میں ہسپتال کی گوری نرس کا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی مس کرتا ہے تو سپاہی

آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ خواب گوں خیالوں میں گم ہوکر اپنے گاؤں کی مٹی کی مہک میں گھلنے لگتا ہے۔ ہرے بھرے کھیت، اس کی بیوی اور اس کا ہمکتا ہوا ننھا منا بیٹا، دور اور قریب کے عزیز اور رشتے دار اور ان سے متعلق یادیں آتے ہی وہ NOSTALGIC لمحوں میں حل ہونے لگتا ہے یہ NOSTALGIC GLIMPSES طرح طرح کے اشکال، مرئی صورتوں اور واضح صورتوں میں چلتی ہوئی فلم کی طرح اس کے ذہن پر اترنے لگتی ہیں۔ وہ اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی چنچل البیلی بیوی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ابھی ہندوستانی سپاہی کا علاج شروع بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک یوروپین (گورا) شدید زخمی حالت میں اسی برٹش ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ یوروپین سپاہی کا انڈین ہسپتال میں بھیجا جانا تو خیر ناممکن تھا۔ یوروپین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں رہا تھا لہٰذا اس مرتے ہوئے گورے کو یوروپین ہسپتال میں جگہ دینے کی خاطر ایک ایسے ہندوستانی سپاہی کو ہٹا دیا جاتا ہے جس کی جان بچائی جا سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی مر گئے، وہ بھی جس کی جان بچ سکتی تھی!

جن فکری عناصر نے اس ڈرامے میں اپنے بے پناہ افادی پہلو کے باعث اثر انگیزی اور تاثیر کی شدت پیدا کر دی ہے، وہ بھی ڈرامے کی تین اکائیوں (THREE UNITIES) کی طرح تین ہی نظر آتی ہیں اور یہ تین فکری عناصر یہ ہیں۔

(۱) تمیز بندہ و آقا (۲) فسادِ آدمیت اور (۳) قومی تفاخر رنگ و نسل کی بنیاد پر

ان تینوں فکری عناصر کی فطری کشمکش کے ساتھ ڈرامے کی بنت میں جا بجا جو PASTORAL TOUCHES کی کہیں ہلکی اور کہیں تیز رنگ آمیزی کی گئی ہے، وہ ڈرامے میں وفورِ جذبات سے ایسی کسک اور چبھن پیدا کر دیتے ہیں جس سے فوجی ناسٹلزم کی جلا دینے والی گرمی لو دینے لگتی ہے۔ "جدید ڈراما اور اس کے بعض مسائل" میں احتشام حسین نے علی سردار جعفری کے اس اکلوتے ڈرامے کو میلو ڈراما (MELO DRAMA) قرار دیا ہے کیوں کہ اس میں عصری واقعیت کا جذباتی پہلو غالب آگیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ PASTORAL TOUCHES اور NOSTALGIC GLIMPSES کی رنگ آمیزی اور غیر ضروری جزئیات نگاری کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے تصویریں (IMAGES) شوخ اور بھڑکیلی ہو گئی ہیں اور یہ اظہار کا ایک ایسا فطری عمل ہے جو ان کی شاعری کے حوالے سے ان کے ڈرامے میں در آیا ہے۔ علی سردار جعفری کے شاعر ہونے کی حیثیت کے پیش نظر ایسا عمل غیر فطری محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ شاعری میں تھوڑے بہت غلو کو روا رکھا ہی جاتا ہے۔ احتشام حسین کا ایک خیال یہ بھی ہے "یہ کس کا خون ہے؟" میں عمل کے مقابلے میں مکالموں سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور کردار بھی کچھ بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں۔" میری ناقص رائے میں احتشام صاحب کو اس اہم ڈرامے میں، یہ خامی یا کمزوری اس لیے محسوس ہوئی کہ اس میں فنی تقاضوں سے زیادہ مقصدیت اور افادیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو اس وقت کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہر ادیب و دانشور کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عصمت کا "دھانی بانکپن" اور خواجہ احمد عباس کا "زبیدہ"۔ حرفِ آخر کے طور پر، یہ بات اپنی جگہ کیا کم ہے کہ علی سردار جعفری نے ڈراما لکھا اور ایسا کہ احتشام حسین جیسے ناقد نے اسے "بہت اہم" قرار دیا۔ ●—

سحر انصاری

سردار جعفری کی نثری تحریریں

روس کے مشہور ناول نگار، مفکر اور دانشور لیو ٹالسٹائے نے بڑی سادگی سے ایک بہت گہری بات کہہ دی ہے "اگر آپ لکھے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو نہ لکھیے" گویا تصنیف و تخلیق کا عمل اگر زندگی کی حرارت اور نفس کی آمد و شد سے مشروط اور مربوط ہو جائے تو لکھنے کا جواز بھی ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت بھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے کم معیار تصنیف پر ادبی تاریخ کے لیے ناگزیر بن جانا ممکن ہی نہیں۔

جدید اردو ادب کے معماروں میں ایسے ناموں کی کمی نہیں جنھوں نے پوری لگن اور تندہی کے ساتھ ادب کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے رکھا اور ہر قیمت پر انسانیت اور اس کی فلاح و بقا سے متعلق اپنے کمٹ منٹ کو ادب کے ذریعے عام لوگوں تک اس طرح پہنچایا کہ ادب کے مزاج و منہاج میں بھی تبدیلی ہوئی اور پڑھنے والوں اور نئے لکھنے والوں کی ایک خاص انداز سے ذہنی تربیت بھی ہوئی۔

اس ضمن میں پوری ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ مصنفین کی تحریریں اب تاریخ ادب کا حصہ بن چکی ہیں، خود ترقی پسند معیارات نے وہ معروضی رخ اختیار کیا کہ اپنی ہی صفوں میں احتساب، تجزیے اور تنقید کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ کس تحریر کو فن پارہ کہا جا سکتا ہے اور کون سی تحریر محض واقعات و حادثات کا گوشوارہ ہے۔

پریم چند، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور ان کے معاصرین نے ادب کو نئے شعور اور نئی آگہی سے ہم کنار کرنے میں خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا انہی میں جن شعراء نے اپنا اعتبار قائم کیا ان میں مجاز، جذبی، سردار جعفری، فیض، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی وغیرہ کے نام ایک طویل سفر طے کر کے وقت کی کسوٹی پر پورے اتر چکے ہیں۔

علی سردار جعفری شاعر اور وہ بھی باغیانہ لب و لہجے کی خطابت سے بھرپور شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ وہ دور جس میں اس بغاوت اور بلند آہنگی کی ضرورت تھی برصغیر کے لیے خاصا نازک دور تھا۔ برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنا اور عالمی سطح پر ہٹلر اور مسولینی کے ہاتھوں فسطائیت کا جو خطرہ بڑھ رہا تھا اس کے لیے بھی ذہنوں کو تیار کرنا ایک بہت اہم مسئلہ تھا۔

ترقی پسند تحریک کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے ذریعے سماجی شعور اور سیاسی آگہی انسانی حقوق کے معاملات

اور زندگی کی معنویت جیسے خیالات عام آدمی کی زندگی کا حصہ بننے لگے۔ یہاں ترقی پسند تحریک کے تاریخی کردار کا صرف حوالہ کافی ہے، اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

علی سردار جعفری نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر سے بھی گہرا تعلق برقرار رکھا۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انہوں نے ایک منفرد تجزیاتی ذہن پایا ہے۔ وہ ادب اور زندگی کے حقائق کو مربوط کرکے جب اپنی تحریر یا تقریر سے کام لیتے ہیں تو ان کی ناقدانہ بصیرت اور قوتِ اظہار نے اختیار دا دھاصل کرنے لگتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے دو گروہ واضح طور پر سامنے آگئے تھے جیسا اس سے قبل سرسیّد احمد خان کی تحریک اور اقبال کی نظریاتی شاعری کے باب میں ہو چکا تھا، لیکن اقبال جانتے تھے کہ ؎

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

اگر یہ کہا جائے کہ انقلابی اور سیاسی نظریات کے سائے میں پروان چڑھنے والی تحریکوں نے ہمارے ادب کو "عقلِ خود بیں" کی حدوں سے نکال کر "عقلِ جہاں بیں" کے دائرے میں پہنچا دیا تو یہ بات ایک تاریخی حقیقت کا اعتراف ہی ہوگی۔ اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کے اہم کردار کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ابتدا میں ہر نئی چیز کو ترقی پسندی سے تعبیر کیا گیا۔ دانستہ یا نادانستہ ذہنوں میں الجھنیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ نیا ادب، افادی ادب، جدید ادب، جنسی ادب، آزاد نظم، ادب کے نئے تجربے جن میں شعور کی رو اور ہیئت کے تجربے بھی شامل تھے سب پر ایک ہی لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس میں ترقی پسند تحریک کے مخالفین پیش پیش تھے جنہوں نے اسے ادب خبیث اور ادب کثیف تک کہنے سے گریز نہیں کیا۔ اس ماحول میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، عزیز احمد، اور علی سردار جعفری کے علاوہ سید احتشام حسین، ممتاز حسین ظہیر کاشمیری جیسے اہلِ قلم نے اپنے مضامین کے ذریعے یہ واضح کیا کہ ترقی پسند ادب سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں ترقی پسند ادب کے نام سے دو کتابیں شائع ہوئیں ایک عزیز احمد کی تھی اور دوسری علی سردار جعفری کی۔

عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ نظریاتی اور تنظیمی زاویوں سے ہٹ کر ایک ایسے ذہن کی نمائندگی کرتا تھا جو مغرب کے جدید ادب کو ترقی پسند ادب سمجھتا تھا۔ انھیں اس مطالعے کے دوران اس بات سے زیادہ دلچسپی رہی کہ وہ منتخب لکھنے والوں پر برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے ادیبوں اور شاعروں کے اثرات کی نشاندہی کریں۔

اس فضا میں علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادب ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اسے مشہور نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے نام معنون کیا۔ سردار جعفری کی یہ کتاب کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ سجاد ظہیر کے طویل مضمون "یادیں" (مطبوعہ ۱۹۴۰ء نیا ادب اور کلیم۔ لکھنؤ) اور ان کی کتاب "روشنائی" کے ساتھ سردار جعفری کی اس کتاب کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ جعفری نے کس طرح ادب کے ترقی پسند معیارات کو تنقید کے حوالے سے پیش کیا اور اقبال سے لے کر ہم عصر ادیبوں تک کس طرح سب کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب اقبال کے بارے میں بعض ترقی پسندوں نے منفی رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اسی طرح ماضی کی قدروں اور کلاسیکی ادب کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر نامناسب تھا۔ علی سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں

اور سجاد ظہیر نے "ذکرِ حافظ" میں جو توقف اختیار کیا ہے اس نے متعدد غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بڑی مدد دی۔ بلکہ علی سردار جعفری نے تو اقبال کے بارے میں اس قدر لکھا ہے کہ ان کی ایک کتاب اقبال شناسی کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور وہ خود اقبال شناسوں کی معتبر صف میں شامل ہیں۔

کلاسیکی ادب کے ضمن میں علی سردار جعفری نے کبیر، میرا اور غالب کے جو مطالعے کیے ہیں ان میں بہت سے تازہ زاویے ہیں جن سے ترقی پسند تنقید کے اعتبار میں اضافہ ہوا ہے۔

مستقل کتابوں کے علاوہ علی سردار جعفری کے مضامین ایک بڑی تعداد میں اردو انگریزی کے رسالوں اور جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی ترتیب سے کئی جلدیں تیار کی جا سکتی ہیں اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے تاکہ جعفری کے تنقیدی قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" علی سردار جعفری کی ایک انتہائی دلچسپ کتاب ہے جو پاکستان اور ہندوستان میں یکساں طور پر مقبول ہوئی ہے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے کہ۔

"یہ کتاب کسی اسکیم کے تحت نہیں لکھی گئی ہے۔ نہ تو اس کا مطلب اپنی آپ بیتی لکھنا ہے اور نہ بکھری ہوئی یادوں کو مرتب کرنا ہے۔ یہ اس افسانے کے چند پریشان نکتے ہیں جسے زندگی کہتے ہیں"

اس مختصر سے اقتباس ہی سے علی سردار جعفری کے اسلوبِ بیان کی نمائندگی ہو جاتی ہے، اس کا پہلا حصہ کتنا صاف، واضح اور دوٹوک ہے اور آخری حصے میں شاعر بول رہا ہے۔ شاعر و ناقد، دل اور عقل کا یہی امتزاج سردار جعفری کی تنقید اور دوسری نثری تحریروں کا خاص وصف ہے۔ ترقی پسند تنقید کی تاریخ سردار جعفری کی نثری تحریروں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

▼

مظہر جمیل

سردار جعفری اور اقبال شناسی

اقبالیات کا موضوع اب ہماری ادبیات میں ایک مستقل شعبے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اقبال شناسی موضوعی اور معنیاتی لحاظ سے دائرہ در دائرہ وسعت پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ اقبال اردو ادب کے وہ واحد خوش قسمت شاعر ہیں جن کی شاعری اور افکار پر محض پچاس ساٹھ سال کی مختصر مدت میں ایسا ہمہ گیر کام ہو چکا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اب اقبالیات صرف پاک و ہند کے اردو دان حلقوں ہی کے لیے دلچسپی کا موضوع نہیں رہا ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس موضوع سخن پر ایسی ہی توجہ دی جا رہی ہے ایک اندازے کے مطابق مختلف زبانوں میں لگ بھگ پچاس ہزار مضامین اور تین ہزار سے زائد کتب اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جا چکی ہیں، پاکستان اور ہندوستان میں بالخصوص اور دنیا بھر میں بالعموم بڑے بڑے علمی و ادبی ادارے سرکاری اور نیم سرکاری سطح پر اقبال شناسی کے عمل میں مصروف ہیں۔ مختلف ممالک میں اقبال سے متعلق متعدد کانفرنسیں، سیمینار اور مذاکرے منعقد ہوتے رہتے ہیں جو اقبال شناسی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، لیکن ان تمام سرگرمیوں کے باوجود اقبال شناسی پر ہونے والے کام میں ایک طرح کی بے ربطی اور انتشار کا احساس ہوتا ہے۔ اقبالیات پر کام کرنے والے اکثر اداروں اور شخصیتوں کے رویوں، طریقۂ کار اور نکتۂ نظر میں بین اختلاف بلکہ تضاد نظر آتا ہے بعض معاملات میں غیر علمی مصلحتوں کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، پاکستان میں تو خیر شروع ہی سے اقبال کو اسٹابلشمنٹ سے منسلک کر دیا گیا اور جہاں ایک طرف کلام اقبال قوالوں کے دست تصرف سے محفوظ نہ رہ سکا وہیں فکر اقبال کی توضیح و تشریح کا قبالہ بحق سرکار لکھ دیا گیا یعنی جو نکتۂ نظر اسلام آباد کے حکمرانوں کا رہا اسی رنگ کی عینک تنخواہ دار دانشوروں اور نشر و اشاعت کے اداروں نے شعر اقبال کی توضیح اور فکر اقبال کی توسیع کے سلسلے میں پہن لی یہاں تک کہ اقبال کی شاعری کو غاصب حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی مدافعت تک کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، سرکاری لابی کے باہر بھی مفسرین اقبال تضاد کا شکار رہے ہیں، پاکستان میں اقبال کے اسلامی تشخص پر ضرورت سے زیادہ اصرار اور دو قومی نظریے کی خواب گری پر شدت سے تکرار نے اقبال کو محض پاکستان کا شاعر اعظم بنا کر رکھ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ہم عصری عالمی نظریات، خیالات اور تحاریک

مانگتی ہے۔ جو انگریزی فوجی افسروں کی منہ چڑھی بن چکی ہے۔ اور نہایت عیش کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی کہانی اسی کی زبانی سنیئے "وہ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت خوب صورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے۔ میں اسے بیچتی ہوں۔۔۔۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں میں کسان کی بیٹی ہوں۔۔۔۔ جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اجڑ گیا اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ اکیلی رہ گئی۔۔۔۔۔۔ تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد میں اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی۔۔۔۔ میں نے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اس نے پوچھا کیا قیمت دوگی؟ میں نے کہا خیرات دے دو۔۔۔۔ اس نے کہا تمہارے پاس جوانی ہے۔ خوب صورت چہرہ ہے۔ بھرا ہوا جسم ہے اسے کہیں جاکر بیچ آؤ۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔۔۔۔ دو دن بعد جب میں تیرہ دن کی بھوکی تھی پھر زمیندار کے پاس گئی۔ میں نے کہا اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں۔ زمیندار ناراض ہوگیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کا بیٹا مجھے گھسیٹ کر باہر لایا۔ سیر بھر چاول میں میرا جسم خرید کر لے گیا۔ تب سے میں محسوس کرتی ہوں میرے پاس میرا جسم نہیں ہے۔ میری خوبصورتی نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ یہ سب تو کچھ سیر بھر چاول میں بک چکی۔ اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے۔" گر یہ اوپری روپ کی کہانی ہے۔ چہرے کی یہ "حکمرانی" ایسے حالات کی دلدل میں پھنسنے کی "حکمرانی" ہے جس دلدل سے اب وہ نکل نہیں سکتی۔ اور اسے اپنے ظاہری روپ کی بدولت ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

سردار جعفری کے افسانہ نگاری کے دور کی دین ابھی تک یہی چھ سات افسانے سامنے آئے ہیں۔ اس کے امکانات ہیں کہ ابھی کچھ اور بھی افسانے (منزل کے افسانوں کے بعد) لکھے ہوں۔ جو استداد روز و شب کی بنا پر اس دور کے رسائل میں ابھی تک محفوظ ہوں۔ ایسا ہے تب بھی سردار جعفری کے آج کے مسلمہ ادبی مرتبہ کے ASSESSMENT میں کوئی کمی نہیں آتی۔ وہ بقول احتشام حسین "وہ اس انسان دوست اور انقلابی کارواں میں شامل ہیں جس میں گورکی، مایاکاوسکی، پبلو نرودا، ناظم حکمت اور لوئی آراگان کے نام لئے جاتے ہیں۔"

ہر چند کہ سردار جعفری کی ادبی تخلیقات میں ان افسانوں اور ان کی افسانہ نویسی کا کوئی ذکر کہیں سنائی نہیں دیتا۔ خود سردار جعفری بھی اب شاید ہی ان افسانوں کو کبھی یاد کرتے ہوں۔ اور اس کے باوجود کہ ان افسانوں کے ذکر اذکار یا حوالوں کے بغیر سردار جعفری کی تخلیقی دستار کی فضیلت اور افضلیت کا کوئی پر کم نہیں ہوتا۔ پھر بھی شعور ادب کی تخلیق میں سماجی شعور اور انقلاب آفرینی کی راہوں کے شعوری انتخاب کی خبر ان کی شاعری سے پہلے ہمیں یہی افسانے دیتے ہیں۔ اپنے ابتدائی دور کے زمانہ سے متعلق موضوع اور مواد کے انتخاب اور سماجی انقلاب پسندی کے فلسفے کو مشعل راہ بنا کر ان موضوعات اور مواد میں تاثر پیدا کرنا جو سماجی جدوجہد اور عوامی شعور کو بیدار کر کے ان تخلیقات کو آلہ کار بنانے کا فن بن جائے، ان ہی افسانوں کی وساطت سے آج سے نصف صدی پہلے کے اس نوجوان سردار جعفری سے پہلے پہل متعارف ہوتے ہیں جو انقلابی ادب کے قافلے میں نئے نئے شامل ہوئے تھے۔

سردار جعفری کے متذکرہ بالا سات آٹھ افسانوں کے متعلق جو مختصر سی باتیں اوپر کہی گئی ہیں ان میں تشنگی کا احساس مجھے خود بھی ہے اور اس کمی کو میں خود سردار جعفری کا ایک شعر قارئین کی خدمت میں پیش کر کے دور کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی افسانہ نگاری کے موضوعات اور مواد پر اس شعر سے بہتر کوئی طویل تحریر بھی نہیں ہو سکتی۔

ؔ چن لیے ہیں باغ انسانی سے ارمانوں کے پھول　　جو مہکتے ہی رہیں گے میں نے گوندھے ہیں وہ ہار

اکرام بریلوی

ڈراما اور علی سردار جعفری کی ڈرامانگاری

ڈرامانگاری کا فن سنسکرت ڈرامے کے زوال کے ساتھ ختم ہو چکا تھا۔ اردو اور ہندی، کالی داس تو کیا؟ چندر بردھائی اور بھوبھوتی کی مثال بھی نہ لاسکے اور رفتہ رفتہ رہس اور امانت کی "اندرسبھا" کے بعد یہ پارسی تھیٹر کے طابع آزماؤں کے طفیل آغا حشر کاشمیری اور ان کے معاصرین کے ہاتھوں میں آگیا۔ اس منزل پر یہ حقیقت سب سے پہلے آغا حشر پر ہی آشکارا ہوئی کہ ڈراما، ادب کی ایک اہم باشان صنف ہے اور اسٹیج کا وجود ملک اور معاشرے کی ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کے لیے ناگزیر ہے۔ تاریخ اور ثقافت کے تابندہ پہلو اور معاشرے کے قابل اصلاح گوشے ڈراما اور اسٹیج کی بدولت جس طرح زندہ و پائندہ کیے جاسکتے ہیں، وہ فنون لطیفہ کی کسی اور صنف کے ذریعے ممکن نہیں۔ تہذیب و ترقی بلکہ حکمت و تفکر کی دعوت ایک عمدہ ڈرامے کے چلتے پھرتے اور بولتے کردار اسٹیج کی فٹ لائٹ (FOOT-LIGHT) کے پیچھے جس خلوص جذبات، جس اثر انگیزی سے زندہ ہوتی ہے وہ غالباً کسی اور طرح ممکن نہیں ہے اور اس طرح آج یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں کہ یونان کے علاوہ ہندوستان میں سنسکرت ڈرامے اور جاپان میں "نو" ڈرامے نے اپنے اپنے انداز اور اپنی اپنی حد تک ملک کی تہذیب اور معاشرے کی کسی طرح اور کس قدر فطری طور پر تزئین و آرائش کی ہے۔

اس کے برعکس اردو میں ڈرامے کا آغاز و ارتقا ہی ایسے ماحول میں ہوا جس میں سیاسی اور معاشرتی طور پر زوال پذیری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ سیاسی اعتبار سے اردو ڈرامے کا باقاعدہ آغاز اور اس کی تدریج و ترقی کا بیشتر ابتدائی دور ہماری محکومی کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس دور میں ہمتوں کی پستی، تہذیب کے مردہ عناصر کو ثقافت کا جزو اعظم قرار دے کر سینے سے لگائے ہوئے تھی ـــ معاشرہ چند رسوم اور بندھے ٹکے آداب و آئین کی ظاہری منت کاریوں کا ہیولیٰ بنا ہوا تھا۔ زندگی کا مقصد موقع پرستی اور موقع پرستی کا مفہوم یہ تھا کہ چند تفریحات، چند تعصبات اور اپنی نام نہاد فوقیت کے توہمات میں قلعہ بند رہو۔ زندگی کے بدلے ہوئے ماحول سے آنکھیں بند رکھو۔ نئے تقاضوں سے بے خبر رہو۔ ایک مدت اور ایک منزل و مقام تک، اس خودساختہ بے خبری کا عالم قائم رہا مگر رفتہ رفتہ غبار چھٹنے لگا اور دوسری عالمگیر جنگ کے آس پاس حالات نے اتنی شدت اور تیزی کے ساتھ کروٹ لی کہ اس خودساختہ بے خبری کا حصار ٹوٹ گیا۔

ذہن و فکر نے کروٹ لی، نئی زندگی سے بھرپور انگڑائی لی۔ نئے خیالات کا سیلاب امڈ آیا۔ سائنسی اور تکنیکی ایجادات عام ہونے لگیں جس نے زندگی، زندگی کے غموں، مسرتوں اور اخلاقی معیار و اعتبار کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی اس سے متاثر ہوا اور عوام و خواص کے اندر یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ ڈراما محض ڈھول دھپّے ہی کا نام نہیں بلکہ ادب کی ایک باقاعدہ صنف ہے اور اس کی طرف پوری سنجیدگی اور متانت سے توجہ دی جانا چاہیے۔ چنانچہ نئے افسانے کی تخلیق و ترویج کی طرح اس کی طرف بھی سب سے پہلے ترقی پسند مصنفین نے توجہ دی۔ شاید اس لیے کہ ڈراما 'ماس کانٹکٹ' (MASS CONTACT) کا مؤثر ذریعہ تھا۔ یہ بات اپنی جگہ منطقی بھی معلوم دیتی ہے کیوں کہ ترقی پسند تحریک کا نقطۂ نظر اصلاحی سے زیادہ انقلابی بلکہ تمام و کمال انقلابی تھا۔ چنانچہ نئے اسالیب کے ساتھ ایسے موضوعات اور مسائل پر توجہ دی جانے لگی جو ذہنی انقلاب لا سکیں اور غور و فکر کی تحریک دیں۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جب شکست و ریخت کا عالم ہو اور سوسائٹی بحران سے گزر رہی ہو تو ڈراما دوسری اصنافِ ادب کی طرح تنقیدِ حیات سے زیادہ تنقیدِ معاشرت کو موضوع بناتا ہے۔ چنانچہ دوسرے ڈراما نگاروں سے زیادہ ترقی پسند ڈراما نگاروں نے اسے اپنا فرض سمجھ کر انجام دینا شروع کیا۔ چونکہ یہ ایک شعوری کوشش تھی، لہٰذا ادب میں گہرائی تو پیدا نہ ہو سکی مگر طنز کا وار جاندار اور تیز ہو گیا۔ افادی ادب کی اس دوڑ میں ادبی ارتفاع اور فنی قدروں کا خیال کیے بغیر جہاں بھی کوئی ظلم کا نشان ملا، استحصال کی صورت یا سماجی بے انصافی نظر آئی اس پر وار کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی۔ اس دور کے دوسرے ڈراما نگاروں کی طرح سردار جعفری میں بھی ڈراما لکھنے کی تحریک ہوئی۔ ہر چند کہ وہ بنیادی طور پر ڈراما نگار نہیں تھے اور ابھی تک انھوں نے شاعری، مضمون نگاری اور ادبی تنقید کے علاوہ افسانے ہی لکھے تھے۔ ڈرامے کا میدان ان کے لیے بالکل نیا تھا، لیکن اتنا نیا بھی نہیں، کیوں کہ ان کی طویل نظموں میں ڈرامیٹک مونولاگ (DRAMATIC MONOLOGUE) پوئٹک ڈراما (POETIC DRAMA) اور کلوزٹ ڈراما (CLOSET DRAMA) کے عناصر موجود تھے۔ مگر ڈراما تو ایک علیحدہ اور باقاعدہ فن ہے جس کے اپنے فنی تقاضے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ جانتے تھے اور یہ سب کچھ جانتے ہوئے انھوں نے ڈراما لکھا۔ اس اکلوتے ڈرامے کا نام تھا "یہ کس کا خون ہے؟" علی سردار جعفری کا یہ اکلوتا ڈراما اپنے موضوع و فکر اور عصری واقعیت کے اعتبار سے نہ صرف چونکا دینے کی صلاحیت کے ساتھ ادبی حلقوں کی توجہ کا مرکز بنا بلکہ اسے اہمیت بھی دی گئی۔

علی سردار جعفری کا ڈراما "یہ کس کا خون ہے؟" جنگی محاذ کے ایک ملٹری ہسپتال میں شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ڈرامے میں، ڈرامے کی تینوں اکائیاں (UNITIES) یعنی ساعت (TIME) مقام (PLACE) اور خیال (THOUGHT) موجود ہیں جو ڈرامے کے جمالیاتی حسن کی دلیل ہیں اور اس کا طنزیہ موضوع اپنے جلو میں ایک کشش اور کش مکش رکھتا ہے کہ ڈرامے کے تاثر میں تیزی و شدت در آئی ہے۔ ڈرامے کا تھیم (THEME) یہ ہے کہ ایک ہندوستانی سپاہی (کالا آدمی) زخمی حالت میں ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ انڈین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں۔ اس کی جان بچانے اور فوری طبی امداد پہنچانے کے لیے ایمرجنسی کے پیشِ نظر اسے مجبوراً برٹش (گوروں) کے ہسپتال میں جگہ دے دی جاتی ہے بستر پر لٹا دیے جانے کے بعد، جب مدھم روشنی میں ہسپتال کی گوری نرس کا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی مس کرتا ہے تو سپاہی

آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ خواب گروں خیالوں میں گم ہو کر اپنے گاؤں کی مٹی کی مہک میں گھلنے لگتا ہے۔ ہرے بھرے کھیت، اس کی بیوی اور اس کا ہمکتا ہوا ننھا منا بیٹا، دور اور قریب کے عزیز اور رشتے دار اور ان سے متعلقہ یادیں آتے ہی وہ NOSTALGIC لمحوں میں حل ہونے لگتا ہے یہ NOSTALGIC GLIMPSES طرح طرح کے اشکال، مری صورتوں اور واضح صورتوں میں چلتی ہوئی فلم کی طرح اس کے ذہن پر اترنے لگتی ہیں۔ وہ اچانک ہرے بھرے کھیتوں میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس کی چنچل البیلی بیوی اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ ابھی ہندوستانی سپاہی کا علاج شروع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ ایک یوروپین (گورا) شدید زخمی حالت میں اسی برٹش ہسپتال میں لایا جاتا ہے۔ یوروپین سپاہی کا انڈین ہسپتال میں بھیجا جانا تو خیر ناممکن تھا۔ یوروپین ہسپتال میں کوئی بستر خالی نہیں رہا تھا لہٰذا اس مرتے ہوئے گورے کو یوروپین ہسپتال میں جگہ دینے کی خاطر ایک ایسے ہندوستانی سپاہی کو ہٹا دیا جاتا ہے جس کی جان بچائی جا سکتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی مر گئے، وہ بھی جس کی جان بچ سکتی تھی!

جن فکری عناصر نے اس ڈرامے میں اپنے بے پناہ افادی پہلو کے باعث اثر انگیزی اور تاثیر کی شدت پیدا کر دی ہے، وہ بھی ڈرامے کی تین اکائیوں (THREE UNITIES) کی طرح تین ہی نظر آتی ہیں اور یہ تین فکری عناصر یہ ہیں۔

(۱) تمیز بندہ و آقا　(۲) فساد آدمیت اور　(۳) قومی تفاخر رنگ و نسل کی بنیاد پر

ان تینوں فکری عناصر کی فطری کشمکش کے ساتھ ڈرامے کی بنت میں جا بجا PASTORAL TOUCHES کی کہیں ہلکی اور کہیں تیز رنگ آمیزی کی گئی ہے، وہ ڈرامے میں وفور جذبات سے ایسی کسک اور چبھن پیدا کر دیتے ہیں جس سے فوجی نامسترم کی جلا دینے والی گرمی لو دینے لگتی ہے۔ "جدید ڈراما اور اس کے بعض مسائل" میں احتشام حسین نے علی سردار جعفری کے اس اکلوتے ڈرامے کو میلو ڈراما (MELO DRAMA) قرار دیا ہے کیوں کہ اس میں عصری واقعیت کا جذباتی پہلو غالب آ گیا ہے۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ PASTORAL TOUCHES اور NOSTALGIC GLIMPSES کی رنگ آمیزی اور غیر ضروری جزئیات نگاری کی بھرمار ہے جس کی وجہ سے تصویریں (IMAGES) شوخ اور بھڑکیلی ہو گئی ہیں اور یہ اظہار کا ایک ایسا فطری عمل ہے جو ان کی شاعری کے حوالے سے ان کے ڈرامے میں در آیا ہے۔ علی سردار جعفری کے شاعر ہونے کی حیثیت کے پیش نظر ایسا عمل غیر فطری محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ شاعری میں تھوڑے بہت غلو کو روا رکھا ہی جاتا ہے۔ احتشام حسین کا ایک خیال یہ بھی ہے "یہ کس کا خون ہے؟" میں عمل کے مقابلے میں مکالموں سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور کردار بھی کچھ بجھے بجھے سے نظر آتے ہیں۔" میری ناقص رائے میں احتشام صاحب کو اس اہم ڈرامے میں، یہ خامی یا کمزوری اس لیے محسوس ہوئی کہ اس میں فنی تقاضوں سے زیادہ مقصدیت اور افادیت کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو اس وقت کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہر ادیب و دانشور کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عصمت کا "دیہاتی بانکپن" اور خواجہ احمد عباس کا "زبیدہ" حرف آخر کے طور پر، یہ بات اپنی جگہ کیا کم ہے کہ علی سردار جعفری نے ڈراما لکھا اور ایسا کہ احتشام حسین جیسے ناقد نے اسے "بہت اہم" قرار دیا۔

سحر انصاری

سردار جعفری کی نثری تحریریں

روس کے مشہور ناول نگار، مفکر اور دانشور لیو ٹالسٹائے نے بڑی سادگی سے ایک بہت گہری بات کہہ دی ہے "اگر آپ لکھے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں تو نہ لکھیے" گویا تصنیف و تخلیق کا عمل اگر زندگی کی حرارت اور نفس کی آمد و شد سے مشروط اور مربوط ہو جائے تو لکھنے کا جواز بھی ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت بھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس سے کم معیار تصنیف پر ادبی تاریخ کے لیے ناگزیر بن جانا ممکن ہی نہیں۔

جدید اُردو ادب کے معماروں میں ایسے ناموں کی کمی نہیں جنھوں نے پوری لگن اور تندہی کے ساتھ ادب کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ بنائے رکھا اور ہر قیمت پر انسانیت اور اس کی فلاح و بہبود سے متعلق اپنے کمٹ منٹ کو ادب کے ذریعے عام لوگوں تک اس طرح پہنچایا کہ ادب کے مزاج و منہاج میں بھی تبدیلی ہوئی اور پڑھنے والوں اور نئے لکھنے والوں کی ایک خاص انداز سے ذہنی تربیت بھی ہوئی۔

اس ضمن میں پوری ترقی پسند تحریک اور اس سے وابستہ مصنفین کی تحریریں تاریخ ادب کا حصہ بن چکی ہیں، خود ترقی پسند ادیبوں نے وہ معروضی رخ اختیار کیا کہ اپنی ہی صفوں کا احتساب، تجزیے اور تنقید کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ کس تحریر کو فن پارہ کہا جا سکتا ہے اور کون سی تحریر محض واقعات و حادثات کا گوشوارہ ہے۔

پریم چند، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، مجنوں گورکھپوری اور ان کے معاصرین نے ادب کو نئے شعور اور نئی آگہی سے ہم کنار کرنے میں خصوصیت کے ساتھ حصہ لیا انہی میں جن شعراء نے اپنا اعتبار قائم کیا ان میں مجاز، جذبی، سردار جعفری، فیض، مخدوم، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی وغیرہ کے نام ایک طویل سفر طے کر کے وقت کی کسوٹی پر پورے اتر چکے ہیں۔

علی سردار جعفری شاعر اور وہ بھی باغیانہ لب و لہجے کی خطابت سے بھرپور شاعر کی حیثیت سے اُبھرے۔ وہ دور جس میں اس بغاوت اور بلند آہنگی کی ضرورت تھی برصغیر کے لیے خاصا نازک دور تھا۔ برطانوی سامراج سے نجات حاصل کرنا اور عالمی سطح پر ہٹلر اور مسولینی کے ہاتھوں فسطائیت کا جو خطرہ بڑھ رہا تھا اس کے لیے بھی ذہنوں کو تیار کرنا ایک بہت اہم مسئلہ تھا۔

ترقی پسند تحریک کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ اس کے ذریعے سماجی شعور اور سیاسی آگہی انسانی حقوق کے معاملات

اور زندگی کی معنویت جیسے خیالات عام آدمی کی زندگی کا حصہ بننے لگے۔ یہاں ترقی پسند تحریک کے تاریخی کردار کا صرف حوالہ کافی ہے، اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں۔

علی سردار جعفری نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر سے بھی گہرا تعلق برقرار رکھا۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور انہوں نے ایک منفرد تجزیاتی ذہن پایا ہے۔ وہ ادب اور زندگی کے حقائق کو مربوط کر کے جب اپنی تحریر یا تقریر سے کام لیتے ہیں تو ان کی ناقدانہ بصیرت اور قوتِ اظہار سے اعتبار حاصل کرنے لگتی ہے۔

ترقی پسند تحریک کے آغاز ہی سے دو گروہ واضح طور پر سامنے آ گئے تھے جیسا اس سے قبل سرسید احمد خان کی تحریک، اور اقبال کی نظریاتی شاعری کے باب میں ہو چکا تھا لیکن اقبال جانتے تھے کہ ؎

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

اگر یہ کہا جائے کہ انقلابی اور سیاسی تغیرات کے سائے میں پروان چڑھنے والی تحریکوں نے ہمارے ادب کو "عقل خود بیں" کی حدود سے نکال کر "عقل جہاں بیں" کے دائرے میں پہنچا دیا تو یہ بات ایک تاریخی حقیقت کا اعتراف ہی ہوگی۔ اس ضمن میں ترقی پسند تحریک کے اہم کردار کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

ابتدا میں ہر نئی چیز کو ترقی پسندی سے تعبیر کیا گیا۔ دانستہ یا نادانستہ ذہنوں میں الجھنیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی نیا ادب، انقلابی ادب، جدید ادب، جنسی ادب، آزاد نظم، ادب کے نئے تجربے جن میں شعور کی رو اور ہیئت کے تجربے شامل تھے سب پر ایک ہی لیبل چسپاں کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور اس میں ترقی پسند تحریک کے مخالفین پیش پیش تھے جنہوں نے ایسے ادب "خبیث ادب" اور "ادب کثیف" تک کہنے سے گریز نہیں کیا۔ اس ماحول میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروفیسر احمد علی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، سجاد ظہیر، عزیز احمد، اور علی سردار جعفری کے علاوہ سید احتشام حسین، ممتاز حسین ظہیر کاشمیری جیسے اہل قلم نے اپنے مضامین کے ذریعے یہ واضح کیا کہ ترقی پسند ادب سے کیا مراد ہے! اس سلسلے میں ترقی پسند ادب کے نام سے دو کتابیں شائع ہوئیں ایک عزیز احمد کی تھی اور دوسری علی سردار جعفری کی۔

عزیز احمد نے ترقی پسند تحریک کے بارے میں جو موقف اختیار کیا وہ نظریاتی اور تنظیمی زاویوں سے ہٹ کر ایک ایسے ذہن کی نمائندگی کرتا تھا جو مغرب کے جدید ادب کو ترقی پسند ادب سمجھتا تھا۔ انھیں اس مطالعے کے دوران اس بات سے زیادہ دلچسپی رہی کہ وہ نئے لکھنے والوں پر برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے ادیبوں اور شاعروں کے اثرات کی نشاندہی

اس فضا میں علی سردار جعفری نے ترقی پسند ادب ہی کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اسے مشہور نقاد پروفیسر مجنوں گورکھپوری کے نام معنون کیا۔ سردار جعفری کی یہ کتاب کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ سجاد ظہیر کے طویل مضمون "یادیں" (مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ء نیا ادب اور کلیم۔ لکھنؤ) اور ان کی کتاب "روشنائی" کے ساتھ سردار جعفری کی اس کتاب کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ جعفری نے کس طرح ادب کے ترقی پسند معیارات کو تنقید کے حوالے سے پیش کیا اور اقبال سے لے کر ہم عصر ادیبوں تک کس طرح سب کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب اقبال کے بارے میں بعض ترقی پسندوں نے منفی رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اسی طرح ماضی کی قدروں اور کلاسیکی ادب کے بارے میں بھی ان کا نقطۂ نظر نامناسب تھا۔ علی سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں

...سید سجاد ظہیر نے "ذکرِ حافظ" میں جو موقف اختیار کیا ہے اس سے متعدد غلط فہمیوں کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ بلکہ علی سردار جعفری نے تو اقبال کے بارے میں اس قدر لکھا ہے کہ ان کی ایک کتاب "اقبال شناسی" کے نام سے شائع ہو چکی ہے اور وہ خود اقبال شناسوں کی معتبر صف میں شامل ہیں۔

کلاسیکی ادب کے ضمن میں علی سردار جعفری نے کبیر، میرا اور غالب کے جو مطالعے کیے ہیں ان میں بہت سے تازہ زاویے ہیں جن سے ترقی پسند تنقید کے اعتبار میں اضافہ ہوا ہے۔

مستقل کتابوں کے علاوہ علی سردار جعفری کے مضامین ایک بڑی تعداد میں اردو انگریزی کے رسالوں اور جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن کی ترتیب سے کئی جلدیں تیار کی جا سکتی ہیں اور یہ کام جلد ہو جانا چاہیے تاکہ جعفری کے تنقیدی قد و قامت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" علی سردار جعفری کی ایک انتہائی دلچسپ کتاب ہے جو پاکستان اور ہندوستان میں یکساں طور پر مقبول ہوئی ہے۔ انہوں نے ابتدا ہی میں لکھ دیا ہے کہ۔

"یہ کتاب کسی اسکیم کے تحت نہیں لکھی گئی ہے۔ نہ تو اس کا مطلب اپنی آپ بیتی لکھنا ہے اور نہ بکھری ہوئی یادوں کو مرتب کرنا ہے۔ یہ اس افسانے کے چند پریشان ٹکڑے ہیں جسے زندگی کہتے ہیں۔"

اس مختصر سے اقتباس ہی سے علی سردار جعفری کے اسلوبِ بیان کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ اس کا پہلا حصہ کتنا صاف، واضح اور دو ٹوک ہے اور آخری حصے میں شاعر بول رہا ہے۔ شاعر و ناقد، دل اور عقل کا یہی امتزاج سردار جعفری کی تنقید اور دوسری نثری تحریروں کا خاص وصف ہے۔ ترقی پسند تنقید کی تاریخ سردار جعفری کی نثری تحریروں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

▼

اہلِ قلم رفیقوں سے درخواست

- افکار تین تین ماہ کے شمارے ایک ساتھ مرتب کرتا ہے اس لیے کسی تخلیق کی فوری اشاعت ممکن نہیں۔
- براہ کرم قلمی مسودات کی فوٹو کاپیاں ارسال نہ فرمائیں بلکہ اپنے پاس محفوظ رکھیں
- مسودات کی واپسی کے لیے ٹکٹ یا جوابی لفافہ ارسال فرمائیں۔
- افکار ہر ماہ کے آخری ہفتے میں پوسٹ کیا جاتا ہے۔ نئے سالانہ ممبر رجسٹری سے افکار طلب فرمائیں تاکہ ڈاک میں رسالہ گم ہونے کا امکان نہ رہے۔
- نئے سالانہ ممبر:۔ دو سو بیس روپے ذریعے منی آرڈر بھیج کر "جعفری نمبر" اور سال بھر تک افکار حاصل کر سکتے ہیں۔

مظہر جمیل

سردار جعفری اور اقبال شناسی

اقبالیات کا موضوع اب ہماری ادبیات میں ایک مستقل شعبے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور اقبال شناسی موضوعی اور معنیاتی لحاظ سے دائرہ در دائرہ وسعت پذیر ہوتی جا رہی ہے۔ اقبال اردو ادب کے وہ واحد خوش قسمت شاعر ہیں جن کی شاعری اور افکار پر محض پچاس ساٹھ سال کی مختصر مدت میں ایسا ہمہ گیر کام ہو چکا ہے اور مسلسل ہو رہا ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اب اقبالیات صرف پاک و ہند کے اردو داں حلقوں ہی کے لیے دلچسپی کا موضوع نہیں رہا ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی اس موضوع سخن پر ایسی ہی توجہ دی جا رہی ہے ایک اندازے کے مطابق مختلف زبانوں میں لگ بھگ پچاس ہزار مضامین اور تین ہزار سے زائد کتب اقبال کے فکر و فن کے مختلف پہلوؤں پر لکھی جا چکی ہیں، پاکستان اور ہندوستان میں بالخصوص اور دنیا بھر میں بالعموم بڑے بڑے علمی و ادبی ادارے سرکاری اور نیم سرکاری سطح پر اقبال شناسی کے عمل میں مصروف ہیں۔ مختلف ممالک میں اقبال سے متعلق متعدد کانفرنسیں، سیمینار اور مذاکرے منعقد ہوتے رہتے ہیں جو اقبال شناسی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں، لیکن ان تمام سرگرمیوں کے باوجود اقبال شناسی پر ہونے والے کام میں ایک طرح کی بے ربطی اور انتشار کا احساس ہوتا ہے، اقبالیات پر کام کرنے والے اکثر اداروں اور شخصیتوں کے رویوں، طریقۂ کار اور نکتۂ نظر میں بیّن اختلاف بلکہ تضاد نظر آتا ہے بعض معاملات میں غیر علمی مصلحتوں کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں، پاکستان میں تو خیر شروع ہی سے اقبال کو اسٹابلشمنٹ سے منتھی کر دیا گیا اور جہاں ایک طرف کلام اقبال قوالوں کے دستِ تصرّف سے محفوظ نہ رہ سکا وہیں فکرِ اقبال کی توضیح و تشریح کا قبالہ بحقِ سرکار لکھ دیا گیا یعنی جو نکتۂ نظر اسلام آباد کے حکمرانوں کا رہا اسی رنگ کی عینک تنخواہ دار دانشوروں اور نشر و اشاعت کے اداروں نے شعرِ اقبال کی توضیح اور فکرِ اقبال کی توسیع کے سلسلے میں پہن لی یہاں تک کہ اقبال کی شاعری کو غاصب حکمرانوں اور ڈکٹیٹروں کی مدافعت تک کے لیے استعمال کیا جاتا رہا، سرکاری لابی کے باہر بھی مفسرینِ اقبال تضاد کا شکار رہے ہیں، پاکستان میں اقبال کے اسلامی تشخص پر ضرورت سے زیادہ اصرار اور دو قومی نظریے کی خواب گری پر شدّت سے تکرار نے اقبال کو محض پاکستان کا شاعرِ اعظم بنا کر رکھ دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں ہم عصری عالمی نظریات، خیالات اور تحاریک

کے باب میں موجود انجذابی کیفیت سے صرف نگاہ کی جاتی رہی اور اس طرح ان کی شاعری کے امکانات کو عالمی تناظر میں ابھرنے سے روک دیا گیا۔ اسی طرح بھارت میں اقبال کی وطن پرستی اور ہندوستانی قومیت کے مسلسل پرچار کے ذریعے انھیں نیشنلسٹ کانگریس کا نیتا بنا دینے کے عزم بالجزم کا اظہار ہوتا رہا ہے، اس طرح فکر اقبال کی تفہیم ایک اکائی کے بجائے پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ہے اور لوگوں نے کلام اقبال کے ذخیرے سے اپنی پسند کا اقبال برآمد کر لیا اور باقی ماندہ اقبال کو دوسروں کے تحسین ذوق کے لیے چھوڑ دیا، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ فکر اقبال کو اس کی ارتقائی منزلوں کے ساتھ سمجھا جاتا اور اس کے کسی ایسے گوشے یا پہلو سے جس سے آپ اختلاف رکھتے ہوں معذرت خواہانہ استدلال اختیار نہ کیا جاتا، لیکن ہوا یہ ہے کہ دائیں بازو کے دانشوروں نے اقبال کے بین الاقوامی وسیع تناظر اور تہہ در تہہ گہرائیوں سے اغماض برتا اور بائیں بازو کے دانشوروں کو اقبال کے اسلامی تشخص میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے ساتھ فسطائی عناصر بھی پریشان کرتے ہیں۔ ان دونوں حلقوں کے درمیان ایک گروہ وہ بھی ہے جو اقبال کی شاعری کو محض تدریسی انداز میں سمجھنے، سمجھانے کا کام کر رہا ہے۔ اس صورت حال کے پس منظر دیکھیے تو سردار جعفری کی اقبال شناسی ایک ایسے علمی رویے کی مظہر بن کر سامنے آتی ہے جس کی بنیاد سائنسی اور منطقی استدلال پر استوار ہے، انھوں نے فکر اقبال کی ارتقائی منازل کو تاریخی تسلسل کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ شروع شروع جہاں بعض قدامت پسند گروہ اقبال کے خلاف غیر علمی متعصبانہ رویوں بلکہ کسی حد تک تنگ نظر علاقہ داریت کے شکار رہے ہیں، وہیں بعض ترقی پسند دانشور بھی بڑی حد تک سہل انگاری سے کام لیتے رہے ہیں کہ انھوں نے اقبال کی شاعری اور نظریات کی وسیع و عمیق گہرائیوں میں جھانکنے کی بجائے شعر اقبال کے بعض اسلامی مظاہر اور علامتی پیکروں کی بنا پر انھیں بنیاد پرست شاعر گردانتے اور ان کی شاعری کو محدود قومیت کی تبلیغ و اشاعت کے مترادف سمجھنے کی مہلک غلطی کی تھی ان کے نزدیک گویا اقبال کی شاعرانہ اساس گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑانے کے سوا اور کچھ نہ تھی، اس طرح وہ اقبال کو نہ صرف ہندوستان کی جنگ آزادی سے خارج قرار دیتے رہے ہیں بلکہ ان پر جمہوریت دشمن اور فاشزم جیسے بے بنیاد الزامات تک لگاتے رہے ہیں، لیکن ایسے دانشوروں کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں رہی، سردار جعفری نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں اقبال کی شاعری کو نئے دور کی شاعری قرار دیا ہے، نئی آرزوؤں اور تمناؤں سے سرشار، پُر امید اور حوصلہ مند، متحرک، مترنم اور رقصاں، انھوں نے لکھا ہے "اردو زبان نے اقبال سے بڑا شاعر پیدا نہیں کیا ہے وہ ہمہ گیری اور وسعت ابھی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی جو اقبال کی شاعری کو نصیب ہے۔" انھیں اقبال کی شاعری میں سرسید، حالی، شبلی اور اکبر وغیرہ کی روایات کا امتزاج نظر آتا ہے، لیکن علم و فن کی زیادہ بلند سطح پر، اقبال "کانٹ"، کار لائل وغیرہ سے گزر کر ہیگل، نطشے اور برگساں تک پہنچ گئے بعض تصورات اقبال نے ڈارون، مارکس اور لینن سے بھی مستعار لیے اور انھیں اپنے مخصوص تصورات کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اصلاح پسندی اور ماضی پرستی دونوں رجحانات اقبال کے ہاں بہت واضح ہیں پھر بھی اقبال کی شاعری کیفیاتی اعتبار سے ان سب کی شاعری سے الگ ہے، اقبال کا پیغام بڑا تھا لیکن اپنے عہد کے الجھاؤ سے آزاد نہ ہو سکا اس لیے اس شاعری میں زندگی بخش رجحانات

زہریلے رجحانات کے ساتھ اس طرح پیوست ہوگئے ہیں جیسے دودھ میں پانی ملا دیا گیا ہو، ایک خوب صورت کپڑے کے تانے بانے کی طرح جس میں ریشم اور سوت کے تار ایک ساتھ بُن دیے گئے ہوں۔ اقبال کی شاعری میں دونوں قسم کے رجحانات ایسے گُتھے ہوئے ہیں، یہ اندیشہ ہمیشہ رہتا ہے کہ تجزیہ کرتے وقت ریشم کے تار کے ساتھ سوت کا بھی کوئی تار کھنچ آئے۔

اقبال کی شاعری کے زندگی بخش رجحانات کیا ہیں اور زہریلے رجحانات سے سردار جعفری کیا مراد لیتے ہیں، اسے سمجھنے کے لیے ہمیں "ترقی پسند ادب" ہی میں اقبال پر کیے گئے تجزیے سے رجوع کرنا ہوگا، دس بارہ صفحات پر مشتمل اس سرسری تجزیے میں بھی انھوں نے اقبال کے نظریۂ فن سامراج دشمنی اور انسان دوستی کو عظیم ورثہ قرار دیا ہے، وہ اقبال سے محبت کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شاعری سے آزادی کا شعور پیدا کیا۔

وہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد عینیت کے فلسفے اور ہیگل کی جدلیت پر بتاتے ہیں جس کو اقبال نے اسلامی فلسفے اور روایات سے تقویت پہنچائی لیکن وہ اقبال کی عینیت کو خالص عینیت نہیں سمجھتے بلکہ اس میں ایک طرح کی مادیت کی آمیزش بھی بتاتے ہیں۔

"اقبال نے دنیا کی حقیقت کے مادّی وجود کو ایک حقیقت کی طرح تسلیم کیا ہے اس لیے دنیا سے گریز کا سوال نہیں پیدا ہوتا، بلکہ پانی سے بجلی، ستاروں سے روشنی اور زمین سے رزق اور دولت حاصل کرنا خودی کا حق ہے۔ (عمل وجد وجہد کا فلسفہ) لیکن اس خودی کی جولانگاہ زیرِ آسمان ہی نہیں بلکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں۔

"اقبال نے ایک بڑے فن کار کی طرح اس خودی کی روح کو کائنات کے ذرّے ذرّے میں پھونک دیا چنانچہ چاند سورج، ستارے، دریا، پہاڑ، پھول، ہوائیں، سمندر، بیاباں، چیونٹیاں، جانور، انسان سب اس جذبے سے سرشار ہیں، رائی زورِ خودی سے پربت بن رہی ہے، بلبل ذوق نوا سے منقار حاصل کر رہی ہے، انسان کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے، خودی کمزور ہے تو کوئلہ ہے مضبوط ہے تو ہیرا، قطرۂ شبنم سے چڑیاں پیاس بجھاتی ہیں، ہیرے کی کنی کو کوئی نہیں نگل سکتا۔"

سردار جعفری اقبال کے فلسفۂ خودی کو انتہائی مہلک ہتھیاروں سے مسلح سامراج کے مقابلے میں محکوم قوم کی ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی داخلی اور جذباتی طور سے اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی کوشش اور عملی جدوجہد کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں

"یہ نکتہ بہت اہم ہے اگر کسی نے ماحول اور سماجی حالات سے الگ ہو کر اس خودی کا صرف تصوّراتی تجزیہ شروع کیا تو اقبال کا تو کچھ نہیں بگڑے گا خود نقاد بھٹک جائے گا اور اپنی تنقید کی بھول بھلیوں میں گم ہو جائے گا۔"

اقبال کے ہاں تغیر، حرکت وحرارت کے لیے جو پرجوش اظہار اور رجزیہ ماہیت ہے وہی ان کی شاعری میں نیا ترنم اختیار کر لیتی ہے۔ اسی طرح سردار جعفری اقبال کے "مردِ قلندر" اور "شاہین" کو خودی کا پیکرِ محسوس قرار دیتے ہیں کہ اقبال نے ابھرتی ہوئی تحریک آزادی کی ساری خصوصیات ان علامتوں میں بھر دی ہیں اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"ان دونوں علامتوں کی تخلیق کے لیے اقبال نے ماضی کے کتنے ہی تصوّرات اور اسلامی فلسفے سے کتنے ہی نکات مستعار لیے کیوں کہ پرانے سے پرانے تصوّرات بھی نئے پیکر میں آ کر نئے ہو جاتے ہیں اور "قلندر" اور "شاہین" دونوں اقبال کے عہد اور زمانے سے وابستہ ہیں، لیکن یہ بات ضرور اہم ہے کہ فلسفۂ خودی کی تکمیل اقبال نے ۱۹۱۲ء تک کر لی تھی، لیکن شاہین کی علامت ۱۹۲۱ء کے بعد ابھرتی ہے (اس کے خدوخال پہلے سے موجود تھے) جب ایک طرف تو قومی تحریک آزادی میں بڑے زور کا ابال آ رہا تھا اور دوسری طرف ہندوستانی بورژوازی خود اعتمادی پیدا کر رہی تھی جو برطانوی سرمایہ دار کو ہٹا کر خود اختیارات حاصل کرنا چاہتا تھا یا ان سے حصّہ بٹانے کی فکر میں تھا، شاعرانہ علامت میں ڈھل جانے کے بعد یہ نکتہ بے معنی ہو جاتا ہے کہ اقبال کا شاہین ہندو ہے یا مسلمان / یہی وجہ ہے کہ اقبال کا شاہین بہادر بھی ہے اور خونخوار بھی، درویش بھی ہے اور بے گانۂ بھی ہے"

اقبال کی فکر و شاعری کے زہریلے رجحانات کیا ہیں؟ انھیں اگر ہم سردار جعفری کے نکتۂ نظر سے سمجھنا چاہیں تو وہ وہی نکلتے ہیں جنھیں ترقی پسند دانش قبول کرتے ہوئے ہچکچاتی ہے، یعنی اقبال کی ماضی پرستی، مابعد الطبیعاتی خیالات، حرکت و عمل کے تصوّرات کا درویشی و قلندری سے متصادم ہونا اور فلسفۂ خودی کی ہمہ گیریت کے باوصف کہیں کہیں سپرمین اور ڈکٹیٹرانہ تصوّرات کے لیے نرم گوشے رکھنا اور سب سے ناقابلِ برداشت حصّہ وہ ہے جہاں اقبال نے عورت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور جہاں انھوں نے عوام کو (دو صد خر) سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال کے ان تضادات کو بیشتر ترقی پسند ناقدین نے رد کیا ہے سوائے عزیز احمد کے جنھوں نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں مذکورہ بالا تصوّرات کی حمایت میں پُرجوش تاویلات پیش کی ہیں اور اقبال کے اسلامی و انقلابی امتزاج کو سمجھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے اور کہا ہے کہ اقبال کی پان اسلام تحریک کبھی غیر اسلامی علاقوں پر حکومت کرنے یا انھیں سیاسی یا معاشی غلام بنانے کی تلقین نہیں کرتی، وہ اقبال پر غیر جمہوری طرزِ حکومت کی طرفداری کے الزام کو بھی رد کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اقبال کسی اسلامی سلطنت یا شہنشاہیت کے داعی نہیں تھے بلکہ وہ اسلامی روحِ تمدّن کے داعی تھے۔ یہ روحِ تمدّن دنیاوی معاشی اصولوں کی حد تک تقریباً بالکل وہی ہے جو اشتراکی جمہوریت کے نام سے موجود ہے۔ اس اسلامی روحِ تمدّن اس مملکت الٰہیہ اور اشتمالیت میں فرق محض روحانی اور وجدانی تصوّرات کا ہے جو اسلام میں اس لیے ہیں کہ اسلام ایک مذہب ہے اور جو اشتمالیت میں اس لیے نہیں کہ اشتمالیت ایک مذہب نہیں (عزیز احمد ترقی پسند ادب ص۴۲) اس کے برعکس سردار جعفری نے اقبال کے تضادات کو پوری قومی تحریک کا تضاد بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "ہم قومی تحریک کو مجموعی حیثیت سے رجعت پرست اور جمہوریت دشمن تحریک نہیں سمجھتے اور نہ اقبال کی شاعری کے بارے میں یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تضاد اور بہت سے کمزور پہلوؤں کے باوجود اقبال کی شاعری کی عظمت کا راز کیا ہے، وہ کون سا جادو ہے جس کا اثر اردو شاعری پر موجود ہے، وہ کون سے عناصر ہیں جو ہمارا جمہوری ورثہ ہیں، ظاہر ہے یہ درویشی اور قلندری، شاہی اور انفرادیت پرستی "الہیات" اور تصوّف ہمارے کام کی چیزیں نہیں ہیں کیوں کہ ان سے آج عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، لیکن ہمارا رویّہ یہ بھی نہیں کہ ان پہلوؤں کی وجہ سے اقبال کے ترقی پسند پہلوؤں کو نظر انداز کر دیں، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ جب زمانے کی چھلنی ان تمام تصوّرات کو چھانے گی تو صرف

ترقی پسندانہ مفید عناصر باقی رہ جائیں گے باقی تاریخ اور وقت کے طاق نسیاں میں رکھ دیے جائیں گے؟"

سردار جعفری کی کتاب "ترقی پسند ادب" میں شامل اقبال کی فکر و شعر پر تبصرہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ اس میں تجزیاتی عنصر کی کمی بھی محسوس ہوتی ہے، یہ صورت حال غالبًا اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ یہاں فکرِ اقبال کا تفصیلی مطالعہ مقصود نہ تھا بلکہ اقبال کے ان ترقی پسندانہ نظریات کا جائزہ پیش نظر تھا جن کے اثرات نے اردو شاعری اور نظریات کو نئے امکانات سے روشناس کرایا تھا اور جس کے بغیر ہم اپنی موجودہ شاعری کا تصور ہی نہیں کرسکتے، انھوں نے جس والہانہ انداز میں اقبال کو خراج تحسین پیش کیا ہے وہ ترقی پسند دانشوروں کے اس رویے کا عکاس ہے جو وہ اقبال سے رکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی انھوں نے اقبال کے فلسفیانہ انداز فکر کے بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی روا رکھا ہے اور کہا ہے کہ "اقبال کی شاعرانہ شخصیت کو ان کی فلسفیانہ شخصیت سے علیحدہ کرکے کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعر بڑے اور فلسفی چھوٹے ہیں"

دراصل اقبال جیسے وسیع و ہمہ گیر موضوع کو کسی ایک مضمون کے کوزے میں بند کرنا یوں بھی ممکن نہیں، بلکہ ان کے روشن فکری و فنی پہلوؤں پر کتابوں کے سلسلے کی ضرورت اور تشنگی اب بھی محسوس ہوتی ہے تاکہ عالمی تناظر کی روشنی میں جدید اور ترقی پسندانہ خطوط پر تفہیم اقبال کو ممکن بنایا جاسکے، چنانچہ اس سلسلے میں سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" (جو انھوں نے ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے سلسلے میں تحریر کی تھی) ایک اہم کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے "اقبال شناسی" تین تفصیلی مقالات پر مشتمل ہے "جن میں اقبال کے ان ترقی پسند پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی ہے جن کے بغیر اقبال کی عظمت کا پورا راز سمجھ میں نہیں آسکتا"

ان مقالات میں سردار جعفری نسبتًا زیادہ متوازن تجزیاتی عمل سے گزرے ہیں اور فکر اقبال کے ارتقائی منازل کو تاریخی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان تحفظات اور کلیشوں سے اجتناب کیا گیا ہے جو عمومًا ترقی پسند ناقدین اقبال کے بارے میں روا رکھتے آئے ہیں۔ ان مقالات میں اقبال کے مطالعے کے ایسے گوشوں کو ابھارا گیا ہے جن کی جانب پہلے توجہ دی ہی نہیں گئی تھی اور اگر دی بھی گئی تھی تو محض سرسری طور پر۔

اقبال شناسی کے پہلے مقالے "شاعر مشرق" میں اقبال کے ارتقائی عمل کو تحریک آزادی کے پس منظر میں سمجھا گیا ہے، عمومًا اقبال کو مسلم نشاۃ ثانیہ کا شاعر قرار دے کر ان کی شاعری کے عالمی دائرۂ اثر کو محدود کیا جاتا رہا ہے[۱] انھیں یا تو مشرق میں جاری جدوجہد آزادی کے دھارے سے کاٹنے کی شعوری کوشش کی جاتی رہی ہے یا محض ہندوستانی مسلمانوں میں پائے جانے والے اضطراب اور بے چینی کا نمائندہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال جیسا بیدار مغز، کثیر المطالعہ اور عالمی تبدیلیوں سے آگاہ شاعر ہندوستان اور آس پاس کی مسلم دنیا میں جاری سیاسی بیداری سے غافل کیسے رہ سکتا تھا اس نے تو بہت چھوٹے چھوٹے سیاسی واقعات کو بھی اپنا آہنگ دے کر زندہ کردیا ہے۔ سردار جعفری "اقبال شناسی" کے دیباچے کی ابتدائی سطروں ہی میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ "اقبال مسلم بیداری کے شاعر تھے اس میں ایشیائی بیداری شامل ہے، اقبال ہندوستان کی بیداری کے شاعر تھے اس میں پوری تحریک

---

[۱] مضامین خلیفہ عبدالحکیم۔ جنگ آزادی کے اردو شعرا (میں اقبال کی شاعری کا معائنہ) از ڈاکٹر محمود الرحمٰن

آزادی شامل ہے اور اقبال عالم انسانیت کی بیداری کے شاعر تھے اس میں اشتراکیت کی فتح، کارل مارکس اور لینن کے افکار کی عظمت شامل ہے۔ اقبال کی دوسری اور تیسری حیثیت ان کی پہلی حیثیت کی تردید نہیں کرتی، بلکہ میرے نزدیک اس کی توثیق اور توسیع کرتی ہے کیوں کہ ہندوستان اور ایشیا کی مسلم بیداری، عالم انسانیت کی بیداری کا ایک حصّہ ہے۔ اقبال صحیح معنوں میں عالمی شاعر تھے۔ چونکہ اقبال نے اپنی شاعری میں اسلامی فکری روایات اور استعارات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور قوم پرستی (نیشنلزم) کو سیاسی سطح پر قبول نہیں کیا اس لیے بعض لوگوں نے ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگا دیا جو اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔" فرقہ پرستی کے الزام کو تقویت پہنچانے میں اس تنگ نظری کو بھی دخل ہے جس نے اس عالمی شاعر کو صرف مسلمانوں کا شاعر کہہ کر محدود کرنے کی کوشش کی، مزید یہ کہ "اقبال کی فکر کا محور اسلام ہے، لیکن اقبال نے اسلامی افکار کو دوسری کسوٹیوں پر بھی کسا ہے اور ان کی تعمیر نو بھی کی ہے"

اس پہلے مقالے (شاعر مشرق تحریک آزادی کی روشنی میں) گزشتہ تین صدیوں میں ہندوستانی معاشرے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیت کا مدلل جائزہ لیا گیا ہے اور ان تاریخی وجوہ کی نشان دہی کی گئی ہے جن کے زیر اثر ہندو احیاء پرستی اور مسلم احیاء پرستی کے رجحانات نے ساتھ ساتھ سر اٹھانا شروع کیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متوازی ذہنی کیفیتوں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی محرکات کی نشان دہی کرتے ہوئے سردار جعفری لکھتے ہیں کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ متوازی ذہنی کیفیتوں کو ایک مشترک شعور میں تبدیل کرنے کے لیے ایک ایسی انقلابی تحریک آزادی کی ضرورت تھی جس میں بیری کیڈ پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک ساتھ بہا ہوتا اور دونوں کے اس اتحاد سے ایک نئے شعور کا آفتاب پیدا ہوتا یہ احیاء پرستی کے دو متوازی دھاروں کا نقطۂ اتصال ہو سکتا تھا، لیکن ملک کے مخصوص حالات میں ہماری تحریک آزادی اصلاح پسند تھی جو درخواستوں، تجویزوں اور سمجھوتوں کو زیادہ اہمیت دیتی تھی، ہماری تحریک آزادی اور نیشنلزم نے ان دونوں رجحانات کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں جذباتی اپیل زیادہ تھی، حقیقت سے دست و گریباں ہونے کی صلاحیت ذرا کم یہی وجہ ہے کہ اتحاد کی کوشش کو ٹیگور نے ناکامی کی شکل میں دیکھا اور اس علیحدگی کو فطری سمجھ کر اس کی تائید کی۔"

اس تاریخی صورت حال کا اثر اقبال کی ذہنی کیفیت پر ناگزیر تھا جس طرح سوامی دویکا نند اور آربندو گھوش کی حب الوطنی میں ہندو روحانیت کی آمیزش تھی، اسی طرح اقبال کی حب الوطنی میں اسلامی روحانیت کی آمیزش تھی۔" اس کے برعکس عمل ممکن نہیں تھا، اس لیے ان کے سامنے ہندوستان کی غلامی اور آزادی کے سوال کے ساتھ سب سے اہم مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی بیداری اور احیائے اسلام کی نئی صورت تھی، لیکن اہم بات یہ ہے کہ یہ بیداری تحریک آزادی کا حصّہ تھی اور اقبال کا ذہن فرقہ پرستی سے بلند تھا اور انھوں نے کبھی ہندوؤں کے خلاف ایک حرف نہیں لکھا اور مسلمانوں کے روحانی نشاۃ ثانیہ کو ہندوستان کی آزادی سے الگ نہیں کیا، اقبال کے ہاں اسلامی استعاروں کے استعمال کے جواز میں سردار جعفری کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ اقبال نے اسلامی استعاروں میں آفاقی حقیقتیں پیش کی ہیں جنھیں کسی ایک قوم یا گروہ تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی سامراج دشمنی دراصل ان کی حب الوطنی کا پرتو ہے۔ اس مضمون کا سب سے مؤثر حصّہ وہ ہے جہاں سردار جعفری کلام اقبال کی روشنی میں اقبال کی شخصیت کا اسلامی

تشخص کے ساتھ ان کی تعمیر میں کشمیری برہمن کے دماغ، مسلمان کے دل، قرآن کریم کی تعلیمات، مغربی علوم جلال الدین رومی، غالب کی شاعری، مارکس اور لینن کے انقلابی تصورات کی بھی نشان دہی کرتے ہیں خود اقبال کو اپنی برہمن زادگی پر جو ناز تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے جلال الدین رومی کو سمجھنے کے لیے بھی اپنی برہمن زادگی کو وجہِ خصوص قرار دیا ہے، گویا اس طرح سردار جعفری نے اقبال کے ذہنِ ہندی کی خصوصیت کو بھی ان کی شخصیت کا ایک اہم عنوان قرار دیا ہے جو اقبالیات میں ایک جداگانہ اسلوبِ مطالعہ کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس انداز نظر سے اقبال کی شاعری کا مطالعہ کم ہی کیا گیا ہے۔ یہ بات یقیناً دلچسپی کا باعث ہے کہ اقبال نے پیغمبروں، مسلم بزرگوں، دانشوروں اور مشاہیر کے علاوہ جن لوگوں کا تذکرہ اپنی شاعری اور نثر میں تحسینی انداز میں پیش کیا ہے ان میں طالسطائی، شیکسپیئر، ہیگل، ملٹن، گوئٹے، نطشے، برگساں، بائرن، براؤننگ، لانگ فیلو، ٹینی سن، مارکس، لینن، آئن سٹائن اور انگلز وغیرہ کے علاوہ رام چندر جی، سری کرشن، گوتم بدھ، شیو، بھرتری ہری، شنکر اچاریہ، گرو نانک وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اقبال نے بھگوت گیتا اور ویدوں کی مرعوب کن عظمت کا نہایت والہانہ انداز میں اعتراف کیا ہے بلکہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے وہ اقبال کے وسیع المشرب ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے" سردار جعفری نے نہ صرف اقبال کے کلام سے موزوں مثالیں دے کر اقبال کے اس فکری مزاج کو نمایاں کیا ہے بلکہ اس کے تناظر میں اقبال کی شاعری کی وسیع تر تفہیم کو بھی ممکن بنا دیا ہے۔

اقبال شناسی کا دوسرا مضمون (اقبال اور انقلاب) دراصل اقبال کے تصورِ انقلاب سے بحث کرتا ہے، وہ بتاتے ہیں کہ اقبال ہماری شاعری کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انقلاب کی اصطلاح کو اس وسیع تر معاشی، سماجی سیاسی تبدیلی کے معنی میں استعمال کیا ہے جو بین الاقوامی استحصالی نظام کے خلاف قوموں کی جد و جہد آزادی اور ظالمانہ طبقاتی جبر کے مقابل مجبور لوگوں کے جہاد سے معنون ہے۔ ٹھہرے ہوئے قدیم تصورات کے مقابلے میں جدید سائنسی علوم اور تحریکوں کی کامیابی حاصل الاصل سبھی کو اقبال نے "انقلاب" بہ کنار دیکھا اور لکھا ہے۔ بقول سردار جعفری "یہ لفظ اقبال کے یہاں پہلی بار ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد آیا" اس مضمون کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کا تصورِ انقلاب بیشتر مغربی دنیا کے تناظر ہی میں ابھرتا ہے اور اقبال مغرب کے آئینہ خانے کی تصویریں دکھا کر مشرق کو اس کی زبوں حالی سے نجات دلانے کے لیے بیدار کرنے کی سعی کرتے ہیں چنانچہ سردار جعفری بتاتے ہیں کہ مغرب کی طرف اقبال دو رویوں کے حامل تھے ایک عقیدت اور دوسرا مخاصمت کا، پہلے رویّے کے تحت وہ حکیمانِ فرنگ کی دانائی، تحرک پذیری، عمل آفرینی اور تخلیقی تلاش و جستجو پر وارفتگی کا اظہار کرتے ہیں اس ضمن میں سردار جعفری نے اقبال کی نظموں سے ایسے اقتباسات پیش کیے ہیں جن میں مغربی دانشوروں، شاعروں، سائنس دانوں اور مفکروں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اور ان کے انقلاب آفریں تصورات کا خیر مقدم کیا ہے، ان میں مارکس، لینن بھی شامل رہے ہیں اور کانٹ و ہیگل بھی، نطشے اور گوئٹے بھی اور ایمرسن و ٹینی سن بھی، لیکن فلسفیانہ سطح پر اقبال جرمن مفکروں کے اثرات سے کم ہی باہر نکل سکے چنانچہ سردار جعفری لکھتے ہیں کہ "میرے خیال میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ اقبال جرمن تہذیب اور ادب کے گرویدہ تھے بلکہ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان کی

تربیت میں اسلامی علوم اور روایات کے ساتھ ساتھ جرمن فکر و ادب کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔" سردار جعفری نے اقبال پر مغربی دنیا اور مفکّرین کے اثرات کا جائزہ لینے میں ان کی نظموں کے ساتھ ساتھ بعض نثری تحریروں سے بھی استفادہ کیا ہے خاص طور پر پیامِ مشرق کے دیباچے سے، جس طرح اسرارِ خودی کا دیباچہ اقبال کے ذہنی بندی کو سمجھنے میں رہنمائی کرتا ہے بالکل اسی طرح پیامِ مشرق کا دیباچہ اقبال پر مغرب خصوصاً جرمن فکریات کے اثرات کی نشان دہی کرتا ہے اور تفہیمِ اقبال میں ان دونوں نثری تحریروں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی دنیا کی طرف اقبال کا دوسرا رویّہ ناقدانہ ہے جس کے تحت وہ مغرب کے سرمایہ داری نظام کی چیرہ دستیوں کو برہنہ دیکھتے ہیں۔ پیامِ مشرق جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی تھی اقبال کے دونوں رویّوں کو پیش کرتی ہے۔ اقبال کا تنقیدی رویّہ جہاں مغربی نظامِ معیشت و سیاست، اس سے پیدا ہونے والی تہذیب، سرمایہ داری اور شہنشاہیت کی خامیوں کی نشان دہی اور اس نظام کے زوال کی پیش گوئی کرتا ہے وہیں مشرق کی آزادی کے ساتھ نئے نظام کی بشارت بھی دیتا ہے، جہاں اشتراکی انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہے وہیں اشتراکی مادّیت کی نکتہ چینی بھی کرتا ہے۔ سردار جعفری کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اقبال کے ان دونوں رویّوں کو اس صراحت کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ فکرِ اقبال کا یہ اہم گوشہ بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے اس طرح "اقبال شناسی" کے یہ دونوں مضامین اقبال کے فکری تشخص کے دو اہم پہلوؤں کی تفہیم کے لیے نئے امکانات کے در کھولتے ہیں جب کہ اس کتاب کا تیسرا مضمون "اقبال کا تصوّرِ وقت" اقبال کی شاعری میں وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا نظری تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں وقت کا تصوّر یوں بھی ترقی پسند دانشوروں کے لیے خصوصی دلچسپی کا حامل رہا ہے، لیکن سردار جعفری نے اس تجزیے میں ہندوستانی تصوّرِ وقت، مغربی تصوّرِ وقت اور اسلامی تصوّرِ وقت کی تکوین کے حوالے سے اقبال کے تصوّرِ وقت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو مطالعۂ اقبال میں ایک نیا، اہم اور زیادہ مؤثر طریق کار ثابت ہوا ہے۔

ہندو تصوّر کے مطابق وقت، تسلسلِ کائنات سے عبارت ہے، چنانچہ سردار جعفری لکھتے ہیں "ایک برہما کے بعد دوسرا برہما آتا ہے۔ ایک آدم کے بعد دوسرا آدم پیدا ہوتا ہے، یہی وشنو کا خواب ہے، یہی مایا ہے یہی وقت ہے اور تمام انسان اس کے دائرے میں اسیر ہیں۔ اپنے آخری تجزیے میں یہ مادے کی حرکت ہے جو تخلیق اور تخلیقِ نو کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے، تخیّل اور شاعری میں یہ خواب، شکستِ خواب اور نئے خواب کی شکل اختیار کرتی ہے، اسی سے آرزو، شکستِ آرزو اور نئی آرزو پیدا ہوتی ہے اس ابتدائی فلسفیانہ تصوّر میں دنیا کے مایا ہونے کا غیر حقیقی اور خواب و خیال ہونے کا تصوّر بھی پنہاں ہے جو فلسفۂ خودی کی نفی کرتا ہے اس لیے یہ تصوّر اقبال کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔" اس مرحلے پر سردار جعفری تصوّف اور وحدت الوجود کے مختلف تصوّرات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان عناصر کی نشان دہی کرتے ہیں جن سے اقبال نے اجتناب بھی کیا ہے اور استفادہ بھی؛ جعفری صاحب نے اقبال کے تصوّرِ وقت کے تین بنیادی عناصر قرار دیے ہیں، پہلا اسلامی جس کی بنیاد امام شافعی کے مقولے یعنی وقت تلوار ہے اور رسولِ اکرمؐ کی دو حدیثوں یعنی لی مع الوقت اور لاتسبوا الدھر پر استوار ہے۔ دوسرا عنصر قدیم ایرانی تصوّرِ وقت زروح زمان مکان سے عبارت ہے جس کا ذکر جاوید نامہ میں ہوا ہے جو بقول سردار جعفری سرمدی وقت ہے، تیسرا عنصر پیمائشی وقت سے ماورا

ترکستان کے "دوران خالص" سے جا ملتا ہے۔ اقبال نے "اسرار خودی" میں وقت کو جاودانی صفات کا حامل قرار دیا ہے جو خدائی صفات ہیں اسی بنا پر بعض حلقوں سے اقبال پر الحاد کے الزام بھی لگتے رہے ہیں، لیکن سردار جعفری واضح طور پر بتاتے ہیں کہ "اقبال نے وقت کے سارے فلسفیانہ اور شاعرانہ استعمال کے بعد یہ اعلان کر دیا کہ خدا وقت سے باہر ہے" اس مضمون میں آگے چل کر جعفری صاحب نے وقت اور انسان کے مابین رشتے کی معنویت پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور لکھا ہے کہ "اقبال کے شعر و فکر میں تین خالق ہمارے سامنے آتے ہیں ایک خدا جو خالق کائنات ہے، دوسرا خالق وقت ہے اور تیسرا خالق انسان۔ بعض مقامات پر مجھے شبہ ہوا ہے کہ وقت اور زندگی ایک ہو جاتے ہیں کیوں کہ دونوں متحرک ہیں، دونوں جولاں ہیں، دونوں تخلیق کار ہیں، اس نامکمل کائنات کو وقت اور انسان دونوں مل کر تکمیل کی منزل کی طرف لے جا رہے ہیں یہ منزل کبھی نہیں آئے گی کیوں کہ ناتمامی فطرت کا ازلی قانون ہے، لیکن اس منزل کا تصور شوق کو مہمیز ضرور کرتا رہے گا اور انسان کو آداب خداوندی سکھاتا رہے گا۔"

سردار جعفری کے ان تینوں مضامین سے اقبال شناسی کی جو ایک راہ نکلتی ہے وہ اقبال کے موضوعات کے اردگرد تشریح و توضیح تک محدود نہیں رہتی بلکہ فکر اقبال کے تدریجی مراحل کا تعین کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ماہنامہ کتاب نما دہلی میں اقبال پر مختلف زاویوں سے چار ادارئیے (دیکھو تو کس منزل طوفاں سے آتی ہے حیات) بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جس کی چوتھی قسط میں "جاوید نامہ" پر سیر حاصل تبصرہ موجود ہے۔ اسی طرح ایک اور مقالہ "چراغ لالہ" کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔ سردار جعفری کی تمام تحریریں تفہیم اقبال کے سلسلے میں ایک نکتہ نظر فراہم کرتی ہیں جو اقبال کو بے پناہ صلاحیتوں کا حامل، وسیع النظر تاریخی شعور و ادراک کا مالک دانشور ثابت کرتی ہیں۔ ▬

راشد آذر

سردار جعفری کی آزاد نظم

ادبی دنیا میں سردار جعفری کا قد اتنا اونچا ہے کہ دیکھنے والے کی ناک آسمان کی طرف اٹھے تو سر سے ٹوپی گر جائے۔ اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ باشعور شاعر ہونے کے علاوہ سردار جعفری کا علم کئی سمتوں میں وسیع ہے۔ اس علم کی گہرائی اور گیرائی ایک سمندر کی طرح ہے جس کا کوئی کنارا نظر نہیں آتا۔ نظم، نثر، تنقید، تقریر کوئی میدان ہو، کسی دیانتدار نقاد کو اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ سردار جعفری صف اول میں امتیازی مقام پر کھڑے ہوئے ہیں۔ شاعری، تنقید اور تقریر کو انہوں نے اتنا کچھ دیا ہے کہ آنے والی نسلیں اس کا جائزہ لیتے لیتے تھک جائیں گی۔ ان کے کسی ہم عصر نے اتنا تخلیقی ذخیرہ ہم کو نہیں دیا۔ ادب اور شاعری، تنقید اور تقریر کی تاریخ میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جائے گا۔

سردار جعفری نے جس صنف کو چھوا اس کو تخلیقی جہت عطا کی۔ انہوں نے تحریر ہو یا تقریر، تنقید ہو یا نظم، ہر صنف اظہار کو تخلیقی سطح پر پہنچا دیا۔ ان کی تقریر خود تخلیقی اظہار معلوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ علم کا دریا امڈ رہا ہے۔ ان کے خیالات سے بھلے اختلاف کیا جائے لیکن ادب میں ان کے دم خم سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ خود میں ان کے بعض خیالات سے اتفاق نہیں کرتا لیکن میری دیانتداری میں فرق آئے گا اگر میں ان کے ادبی مقام سے انکار کروں۔

افسانہ، تصویر کشی اور خطابت سے سردار جعفری کو فطری لگاؤ ہے۔ جس سے میں آگے چل کر بحث کروں گا کہ کس طرح یہ عوامل ان کے شعور و ادراک تاریخ سے جلا پا کر تیری شاعری کی منزل پر ان کی آزاد شاعری کو پہنچاتے ہیں اور ان عوامل کے امتزاج کی جولان کی شاعری کا خاص وصف ہے، مثالیں پیش کروں گا۔ ان کی شاعری کے اس پہلو پر شاید ان کے کسی نقاد یا محقق نے غور نہیں کیا۔ دراصل یہی پہلو ان کے انداز بیان کو دوسروں کی خطیبانہ شاعری سے الگ کرتا ہے اور یہی پہلو ان کی خطیبانہ شاعری کا امتیازی نکتہ اور اس کی پہچان ہے۔

افسانے کی مخصوص صنف میں سردار جعفری کا ایک مجموعہ 'لکھنؤ کی پانچ راتیں' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں سوانحی افسانے ہیں۔ یہ افسانے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ ان کی اٹھان، ان کے ماحول اور ان کے ذہن کی تربیت کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان افسانوں سے نہ صرف ان کی شاعری کے پس منظر، محرکات اور عوامل کو سمجھنے میں، بلکہ ان کے انداز بیان اور مخصوص طرز سخن کے بنیادی اجزا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

میں اس مضمون میں سردار جعفری کی صرف آزاد نظم ــــــ کا جائزہ لوں گا۔ ان کی شاعری پر ان کی آزاد نظم

کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود سردار جعفری اپنی شاعری کے اس پہلو سے متاثر ہیں۔ آزاد شاعری کے خطیبانہ بہاؤ —— کا اثر ان کی اکثر نظموں میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

آزاد نظم کی بعض خصوصیات ہیں جو اس کو نظم کی اور ہیئتوں سے مشکل بھی بناتی ہیں اور پر اثر بھی۔ چونکہ آزاد نظم میں مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے شاعر کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ ایک مصرعہ کہاں ختم کرے اور دوسرا کہاں سے شروع کرے تاکہ نظم کا بہاؤ، جو اس کی جان ہے، رکنے نہ پائے۔ اگر بہاؤ رک جائے تو نظم کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے۔ علیحدہ علیحدہ مصرعوں میں کتنا ہی بہاؤ ہو، اگر مصرعے ایک دوسرے سے اس طرح نہ جڑے ہوئے ہوں جس طرح موج سے موج جڑی ہوتی ہے تو نظم ہیئت کے اعتبار سے کمزور ہو جاتی ہے۔ یہ ہیئت خطیبانہ انداز بیان کی متقاضی ہے۔ اس میں مصرعوں کو بہتے ہوئے دریا کی موجوں کی طرح آنا چاہیے۔ اس میں شوکتِ الفاظ اور شکوہ جذبات کی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک اس میں شعریت کی جلا رجز اور خطابت سے نہیں ہوتی تب تک اس ہیئت کی خوبی پوری طرح نہیں ابھرتی۔ اگر اس ہیئت سے خطابت کا پہلو نکال دیا جائے تو اس کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

آزاد شاعری کا سب سے پہلا تجربہ جو شاید کسی کے علم میں نہیں ہے وہ سید حسین بلگرامی، عماد الملک کے بڑے صاحب زادے سید عابد حسین بلگرامی، عابد نواز جنگ نے ۱۹۲۰ء میں کیا۔ انہوں نے شیکسپیر —— کے ڈرامے ہیملیٹ —— کی خود کلامی —— کے ترجمے آزاد نظم میں کیے اور یہ ترجمے اس قدر خوب صورت تجربے تھے کہ آج بھی پڑھیے تو لگتا ہے کہ کسی ماہر جدید ترقی پسند شاعر نے کیے ہیں۔ میں یہاں ایک خود کلامی کا ترجمہ مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن طوالت کے خوف سے اس کا صرف ایک حصہ پیش کروں گا۔ ہیملیٹ میں ایک مشہور خود کلامی ہے۔
اس کا ترجمہ دیکھیے ؎

نہیں معلوم کیا بہتر ہے جینا یا کہ مر جانا
شرافت کا ہماری اقتضا کیا ہے
سہیں آما جگاہ تیر اس کمبخت قسمت کے
کہ لیں تلوار دریائے مصائب کے مقابل میں
اور ان کا خاتمہ کر دیں
وہلے یہ موت ہے کیا شے؟ فقط اک نیند کا عالم
مگر یہ آرزو دل کی کہ ہم اس نیند سے سو کر
مٹا دیں گے وہ ساری کلفتیں جو ورثۂ تقدیر آدم ہیں
تمنا ہی تمنا ہے۔ زہے قسمت جو پوری ہو
مریں، لیں نیند، سو جائیں، مبادا خواب آ گھیریں
یہی تو دل میں کھٹکا ہے
خدا جانے نظر آئیں ہمیں یہ خواب وحشت
ناک اس مرقد کے سونے میں

جدا ہو جائے جب روحِ رواں اس جسمِ فانی سے
یہی جائے تامل ہے، یہی خفقان تو بھی
لئے دیتے ہیں پوری زندگی اپنی
دگرنہ ہے غرض کس کو کرے برداشت دنیا کی
صعوبت، تازیانے بھی سہے اس کے
کہیں تو طعن و طعن خود پسنداں اور
کہیں پہ ظلم ظالم کا

لیکن اس ترجمے کی نوعیت تجربے کی تھی اور اس لیے اس کو آزاد نظم کے آزاد شاعرانہ ترجمے کی حیثیت سے سراہا گیا۔ ایک اور بات یہ تھی کہ یہ صرف عابد نواز جنگ کے چند احباب اور باذوق رشتہ داروں کی حد تک محدود رہا اور سب سے بڑی بات یہ کہ آزاد نظم کے اس تجربے کو اس کی ہیئت کے اعتبار سے شاعری کا معتبر طرزِ اظہار نہیں سمجھا گیا ہوا یہ کہ یہ محدود تجربہ تھا اس ہیئت کو مخدوم، ن م راشد اور میراجی نے مسلمہ حیثیت دی اور سردار جعفری نے اس کو عروج پر پہنچایا۔

اگر ہم سردار جعفری کی آزاد نظم کے ارتقا کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ اس کا آہنگ شروع میں ہچکولے لیتی ہوئی موسیقی کی طرح ہر مصرعے کے ساتھ ٹوٹتا اور دوسرے مصرعے کے ساتھ اس طرح آگے بڑھتا ہے جیسے پہلے مصرعے اور دوسرے مصرعے میں ایک وقفہ ہے جو دونوں مصرعوں کو ایک دوسرے سے اس طرح الگ کرتا ہے جیسے دونوں مصرعوں کے درمیان ایک لمحے کا سناٹا ہو۔ ان کے مجموعے 'خون کی لکیر' کی پہلی آزاد نظم 'خواب' سے میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ یہ پوری نظم اسی طرح علیحدہ علیحدہ اپنی جگہ مکمل مصرعوں سے آگے بڑھتی ہے جن کی کڑیاں آہنگ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جڑتی نہیں۔ ہر مصرعے کے بعد ایک وقفہ ہے۔ جس سے مصرعے کے اختتام پر ایک جھٹکا سا محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

میں کہ صدیوں کی سرگوشیاں سن چکا ہوں
کتنے سربستہ رازوں کو سینے کے اندر چھپائے ہوئے ہوں
کتنے پرہول افسانوں کو اپنے دل میں دبائے ہوئے ہوں
کتنے ہی جشن کتنی ہی عیدیں
میری یادوں کے دامن میں محفوظ ہیں
ظلم اور جبر کی خوں بھری داستانیں
بادشاہوں کی جنگی حکایات
دیو اور پریوں کے قصے کہانی
انقلاب اور بغاوت کے دلکش ترانے
میرے ہونٹوں پہ سوئے ہوئے ہیں
میں انہیں جب بھی چاہوں جگا لوں

(خون کی لکیر ۔ "خواب")

اس نظم میں بھی سردار جعفری کی اور نظموں کی طرح وہ تین پہلو نمایاں ہیں، جن کا ذکر میں آگے کر چکا ہوں۔ افسانہ، تصویر کشی اور خطابت اس نظم میں بھی جگہ جگہ مل کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً ؎

نذرِ دلی

میری محبوب دلی
غالب و میر کی سرزمیں
اب تو غاصب شہنشاہوں کی داشتہ
اور خودکام جاگیرداروں کی لونڈی نہیں ہے
غیر ملکی بدیسی سرمایہ داروں کی منڈی نہیں ہے
تو ہماری امیدوں کا مرکز ہے خوابوں کی تعبیر ہے
آرزوؤں کی تصویر ہے۔
تیرے چہرے پہ میں آج اک نور سا دیکھتا ہوں
جیسے تیری جبیں پر کروڑوں ستارے ابھر آئے ہیں
یہ اشوک اور اکبر کے عہدِ حکومت کی تنویر ہرگز نہیں ہے
بلکہ جمہور کی مشعلوں کی ضیا ہے
دیکھ ہندوستان کے کروڑوں سپوتوں کی نظریں
آج تیری طرف اٹھ رہی ہیں
یہ ہماری نگاہوں کی کرنیں ہیں جو تیرے رخسار پر نور کا جال سا بن رہی ہیں
روٹیوں کے لیے کتنے سوکھے ہوئے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
کتنے ننگے بدن ایک کپڑے کی خاطر کھڑے ہیں
ان کو نفرت سے ان کو حقارت سے مت دیکھ
یہ فقیر اور بھکاری نہیں ہیں
تیرے ہندوستان کے بہادر سپاہی ہیں جو
انقلاب اور بغاوت کی پگھلی ہوئی آگ میں جل چکے ہیں

یہ افسانوی انداز، یہ تصویر کشی اور یہ خطابت سردار جعفری کی شاعری کی پہچان ہے لیکن جو ان کے یہاں تاریخ کا ادراک ملتا ہے وہ ان کے کلام کو جگہ جگہ ان تینوں اجزا کی آمیزش سے بڑی شاعری کی حدوں تک پہنچاتا ہے۔

'خواب' سردار جعفری کی شروع کی آزاد نظموں میں سے ہے۔ اس لیے اس کے بعض مصرعوں میں الفاظ کے دبنے سے خطابت کے بہاؤ میں رکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور پھر اس کا آہنگ ——— بھی ہچکولے ——— کھاتا ہے۔ دراصل اس

کو جیسے ارکان ہی ایسی تعداد میں کم اور زیادہ ہوتے ہیں کہ مصرعہ جب پورا ہوتا ہے تو ایک ہچکولے کے ساتھ رک جاتا ہے۔ ان کی بعد کی نظموں میں خطابت کا ریلا اس تیزی کے ساتھ بہتا ہے کہ وہ جوں ہی بہتے ہوئے دریا کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جن شاعروں نے سردار جعفری کی آزاد نظمیں سرسری طور پر پڑھیں ان پر ہچکولے کھاتے ہوئے آہنگ اور ٹوٹتے ہوئے مصرعوں کا بڑا برا اثر پڑا اور جنہوں نے ان نظموں کو انہماک کے ساتھ پڑھا ان پر بہتے ہوئے دریا جیسے آہنگ کا بہت اچھا اثر ہوا۔ آزاد نظم کو ان کے علاوہ اپنا انوکھا طرزِ سخن دینے والوں میں مخدوم اور فیض بھی ہیں لیکن سردار جعفری کے بعد کی نسل کے شاعروں کے لیے آزاد نظم کو ان کے اثر سے آزاد کرانا بڑا مشکل کام ہے۔ ان کے طرزِ سخن کا اثر شعوری طور پر احساسات اور الفاظ سے بے اختیار ہو کر چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے۔

خون کی لکیر بھی دوسری آزاد نظم کی طرح ہے۔ اس نظم کی ساخت اور اس کا آہنگ خواب سے زیادہ مختلف ہے بلکہ اس میں انہوں نے ہم آواز اور ہم قافیہ الفاظ جگہ جگہ مصرعے ختم کر کے صوتی جھنکار پیدا کی ہے۔ اس نظم میں مصرعے موجوں کی طرح ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ نظم کا بہاؤ کہیں رکتا نہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم قافیہ الفاظ کا استعمال بغیر کسی تکلف اور کاوش کے کیا گیا ہے اور ایسے الفاظ نظم کے بنیادی خیال کا حصہ بن جاتے ہیں، کوشش کر کے خواہ مخواہ نہیں لگائے گئے ہیں۔ مثلاً

ہم نے آزردگیٔ شوق کو منزل جانا
اپنی ہی گردِ سرِ راہ کو محمل جانا
گردشِ حلقۂ گرداب کو ساحل جانا

- - - - - - - - -

اپنی صد سالہ تمناؤں کا حاصل ہے یہی
موجِ پایاب کا ساحل ہے یہی

- - - - - - - - -

تم نے ناموسِ شہیدانِ وطن بیچ دیا (حالاں کہ ناموس مونث ہے)
باغباں بن کے اٹھے اور چمن بیچ دیا

اب اس نظم میں افسانہ، تصویر کشی اور خطابت کے امتزاج کی مثال دیکھیے ؎

بالیاں دھان کی، گیہوں کے سنہرے خوشے
مصر و یونان کے مجبور غلاموں کی طرح
اجنبی دیس کے بازاروں میں بک جاتے ہیں
اور بدبخت کسانوں کی بلکتی ہوئی روح
اپنے افلاس میں منہ ڈھانپ کے سو جاتی ہے

یہ طرزِ سخن آہستہ آہستہ نکھرتا جاتا ہے۔ "آنسوؤں کے چراغ" بڑی دردناک نظم ہے جو ہندوستان اور

پاکستان کے بے خانماں مزیب الوطنوں پر لکھی گئی ہے۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے ؎

میں سُن رہا ہوں
وہ سسکیاں جو زمیں کے سینے میں داغِ غم بن کے رہ گئی ہیں
وہ ہچکیاں جن کے سخت پھندے
رباب و بربط کی گردنوں میں پڑے ہوئے ہیں
وہ آہیں جو ظالموں کے ڈر سے
دلوں میں محبوس ہو گئی ہیں
وہ چیخیں جو بانیِ وطن کی
جراحتوں کے ہجوم میں جا کے کھو گئی ہیں
وہ گیت جو نوحہ و فغاں کے
سیاہ خانوں میں چھپ گئے ہیں
وہ بھیے جو فریب کاری کے سبز باغوں میں سو گئے ہیں
وہ سازشیں جن کا زہر کام و دہن کو بے کار کر چکا ہے
وہ عہدے جن کا نکیلا نشتر رگوں کے اندر اُتر چکا ہے
وہ عہد و پیماں
کہ جن کے حرفوں سے وقت و تاریخ کی جبیں پر
سیاہ دھبے پڑے ہوئے ہیں

سردار جعفری کی سب سے طویل نظم "نئی دنیا کو سلام" تمثیل ہے جو اردو شاعری میں بڑا اہم تجربہ ہے۔ اس میں کردار بہ یک وقت کردار بھی ہیں اور علامتیں بھی۔ واقعات نہ صرف واقعات ہیں بلکہ تاثرات اور احساسات کا مبدا بھی، اور خصوصاً بچہ اس نئی دنیا کی علامت بن کر ابھرتا ہے جس کا خواب سردار جعفری نے کئی بار دیکھا ہے لیکن اس کے ٹوٹنے سے مایوس کبھی نہیں ہوئے ایک خواب اور دیکھا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور یہی خواب دیکھنے کی صلاحیت ان کی شاعری کی جان ہے، ان کے شاعر کی حیثیت سے زندہ رہنے کی ضمانت ہے۔

نئی دنیا کو سلام کا کینوس (CANVAS) اتنا وسیع ہے کہ شاعر کے بہکنے کا خدشہ تھا اور نظم کے بنیادی خیال سے ہٹ کر ضمنی تجزیات اور تجربات میں بھٹکنے کا امکان تھا لیکن سردار جعفری کا سلجھا ہوا منطقی ذہن ان کے قلم کو بہکنے اور بھٹکنے سے روکتا رہا اور اس تجربے کی کامیابی کا سہرا ان کے منطقی ذہن کے سر رہا۔

اس طویل تمثیل میں دو باتیں اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں سردار جعفری کا رویّہ اتنی وسیع النسان دوستی سے متاثر ہے کہ دنیا کے کسی ملک، کسی شہر، کسی گاؤں، کسی قصبے میں ظلم ہو، اس نظم کے بیشتر حصے ہندوستان کے پس منظر میں لکھے جانے کے باوجود ہر جگہ کئے جانے والے ظلم کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض

مصرعے بے حد طویل ہونے کے باوجود قاری کی دل چسپی کو اپنی گرفت میں لیے ہوتے ہیں۔ مثلاً ؎

میری مریم
میرے بچے کی ماں
تو بھی بنگال کی سیکڑوں عورتوں کی طرح اپنے روتے ہوئے
لال کو، دل کے ٹکڑے کو، سنسان راہوں کی جانب
ہولی خاک پر ڈال کر بھاگ جائے گی؟ ان قحبہ خانوں
میں، جن میں کہ روٹی کے سوکھے ہوئے ایک ٹکڑے
کی خاطر جواں عصمتیں گوشت کے لوتھڑوں کی طرح
بک رہی ہیں
تیرے مظلوم بچے کی چیخیں
دور تک تیری پرچھائیوں کا تعاقب کریں گی

اس نظم میں سردار جعفری کا تاریخی ادراک اس کی گہرائی اور گیرائی کو دوبالا کر دیتا ہے مثلاً ؎

روٹیاں شاخِ طوبیٰ پہ پھلتی نہیں ہیں
روٹیاں بادلوں سے برستی نہیں ہیں
وحی والہام بن کر اترتی نہیں ہیں
یہ ہیں انساں کے ہاتھوں کی تخلیق
لیکن اس وقت انساں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیوں کے لیے
عصمتیں بک رہی ہیں
عزتیں بک رہی ہیں
گولیاں چل رہی ہیں
خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں

- - - - - - - - - -

کھیت کٹتے ہیں اب بھی
اور کھلیان لگتے ہیں اب بھی
لیکن اب گاؤں ویران ہیں
چھ بازار کی رونقیں بڑھ رہی ہیں
چکیاں چپ ہیں
خاموش ہیں گاؤں کی لڑکیاں چوڑیاں گنگناتی نہیں

دیکھ تو ظالم انگریز کے راج میں
بھوک اور موت کے سائے ہیں
کتنے آزاد ہیں ہم

آئیے دیکھیے تاریخی ادراک کس طرح اس نظم کو اوپر اٹھاتا ہے اور آہ و فغاں کو سنگلاخ تاریخی منطق میں ڈھال کر جذبات کا لپکتا ہوا شعلہ بنا دیتا ہے ؎

دیو ہیکل مشینوں کو انسان نے سیکڑوں سال کی کشمکش اور مشقت
سے پیدا کیا ہے
تب کہیں جا کے یہ ہاتھ حاصل کیے ہیں
آج انسان کی ان کنیزوں، مشینوں، کی طاقت پہ
'سرمایہ داری'
کتنی اترا رہی ہے
وہ مشینوں سے انسان کے دل کو برما رہی ہے
اور فراغت نہیں بلکہ بے کاری پھیلا رہی ہے
کالے کالے دھوئیں کے گھنے بادلوں سے وہ دولت کے موتی
نہیں مفلسی کے جراثیم برسا رہی ہے

یہاں شاعری فکر انگیز جذباتیت کے سہارے بڑی شاعری کی حدوں کو چھوتی نظر آتی ہے لیکن اس نظم کا پھیلاؤ اور خیال کی گہرائی اور گیرائی مصرعوں کی ساخت پر حاوی ہے۔ نظرثانی اور تراش کی متقاضی تھی، بعض حصوں میں اس کی محتاج نظر آتی ہے۔ مصرعوں میں الفاظ دبتے ہیں تو ایک جھٹکا سا لگتا ہے مثلاً

رات کو آتی ہے
تھپکیاں دے کے سارے جہاں کو سلا جاتی ہے
بچوں کو لوریاں دیتی ہے، پھولوں کو پیار کرتی ہے
کتنی آوازیں خاموشی کے ساز سے پھوٹتی تھیں
کتنے بھولے ہوئے چہرے، بسری ہوئی آنکھیں
چاند تاروں کے گیت اور سیاروں کی گنگناہٹ
بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچوں کی سسکیاں
نعروں، جیکاروں، للکاروں میں ڈھل گئی تھیں

جیل کی زندگی کو سردار جعفری نے تخلیقی اعتبار سے بھرپور بنایا اور ایک اور طویل نظم "ایشیا جاگ اٹھا" لکھی۔ یہ سردار جعفری کی بہت خوب صورت نظموں میں سے ہے۔ یہ نہ صرف فنی اعتبار سے حسین ہے بلکہ صوتی اعتبار سے اس کا آہنگ ایسا ہے کہ

رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی رفتار کو تیز کر دیتا ہے۔ کوئی بیمار بھی بستر علالت پر یہ نظم پڑھے تو اُٹھ بیٹھے۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے۔ "ایشیا جاگ اٹھا" نہ صرف فکری بلندی کا حامل ہے بلکہ بڑی شاعری کی ایک خوب صورت مثال ہے جس میں تاریخ کا ادراک فکر کی بلندی میں اضافہ کرتا ہے اور افسانہ۔ تصویر کشی اور خطابت کے امتزاج سے جذبات ہی کو نہیں اُبھارتا بلکہ سنجیدگی سے زندگی کے نشیب و فراز کے اسباب کے تعلق سے سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے لیکن اگر ان سارے عوامل کا اثر اسی حد تک محدود ہوتا تو یہ بڑی شاعری نہیں ہوتی۔ "ایشیا جاگ اٹھا" بڑی شاعری اس لیے ہے کہ یہ نظم ان ساری باتوں کے علاوہ ہم کو تخلیقی عمل پر اکساتی ہے اور حالات کو بدلنے اور بہتر دنیا کی تعمیر اور بہتر زندگی کی تحصیل کی طرف مائل اور راغب بھی کرتی ہے اور حوصلہ بھی دیتی ہے۔ اس نظم کی اٹھان دیکھیے ؎

یہ ایشیا کی زمین تمدن کی کوکھ تہذیب کا وطن ہے
یہیں پہ سورج نے آنکھ کھولی
یہیں، یہ انسانیت کی پہلی سحر نے رُخ سے نقاب اُلٹی
یہیں سے لگے، دلوں کی شمعوں نے علم و حکمت کا نور پایا
اسی بلندی سے وید نے زمزمے سنائے
یہیں سے گوتم نے آدمی کی سمانتا کا سبق سکھایا!
یہیں سے مزدک نے عدل، انصاف اور محبت کے راگ چھیڑے
ہماری تاریخ کی ہوائیں مسیح کے بول سن چکی ہیں
ہمارا سورج محمد مصطفیٰ ؐ کے سر پر چمک چکا ہے
قدیم آنکھوں سے ایشیا کی نئی جوانی کو دیکھتے ہیں

یہ تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کوئی ایشیا کی عظمت کو نہیں جھٹلا سکتا۔ کوئی ماؤ کی سرخ فوج کی شان کو نہیں جھٹلا سکتا۔ ماؤ اور سرخ فوج نے انقلابِ چین کو جتنا کچھ دیا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے؟

"ایشیا جاگ اٹھا" کئی صدیوں کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے اور منطقی جذباتیت کے ذریعے واقعات کو نظم کے خوب صورت پیرائے میں صوتی آہنگ کی جھنکار کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اس میں تاریخی حقائق تصویری پیکروں میں ڈھل کر جگہ جگہ نظم کا جنرل لائننگ بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فراغت سے اپنے دیوان خانوں میں بیٹھ کر اس نظم کی افادیت پر تنقید و تبصرہ کرنے والوں کو جنوبی افریقہ میں آج سیاہ فام عوام کی فرنگی حکمرانوں کے خلاف آزادی کی جد و جہد کے پس منظر میں اس نظم کو دیکھنا چاہیے۔ یہ نظم ایک طرف دلیرانہ احتجاج ہے اس درندگی کے خلاف جس نے انسان پر انسان کے ظلم کو نہ صرف روا رکھا ہے بلکہ اس کا اخلاقی جواز ڈھونڈنے کی شرمناک کوشش کر رہی ہے اور اس کو تہذیب اور تمدن کا نام دیتی ہے اور دوسری طرف یہ نظم اس درندگی کو ختم کرنے اور ایک پرامن حسین اور آزاد دنیا کو تعمیر کرنے پر ہم کو اکساتی ہے۔ جس سماج نے انسان کو درندہ بنا دیا ہے اور جس تہذیب نے اس درندگی کی پشت پناہی کی ہے۔ اس کی تصویر ایسی کھینچی ہے کہ اس کو اس کی برہنہ شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی ہم اس نظم کی افادیت سے انکار کریں تو اپنے آپ کو ــــــ دنیا کی نظروں میں حقیر کر لیں گے۔ اس تہذیب کی تصویر دیکھیے

؎ تمہاری تہذیب سڑ چکی ہے

تمہارا جھوٹا "تمدن" اپنے فریب میں دفن ہو گیا ہے
تمہاری "تہذیب" قتل و غارت کا ناچ کوڑھوں کی راگنی ہے
تمہاری "تہذیب" بھوکے بچوں کی موت ماؤں کی خودکشی ہے
تمہاری "تہذیب" دست کاروں کے خون آلود ہاتھ ٹوٹے ہوئے انگوٹھے
تمہاری "تہذیب" دھوپ میں سوکھتی ہوئی ہڈیوں کے پربت
تمہاری "تہذیب" قصرِ پیکنگ کی جلی راکھ کا ہے غازہ
تمہاری "تہذیب" زہر دافیون کی تجارت
تمہاری "تہذیب" ایشیا کی زمیں پہ ننگی پڑی ہوئی ہے

اور آگے سنیئے ؎

کہاں ہو "تہذیب اور تمدن" کی روشنی لے کے آنے والو!
تمہاری "تہذیب" کی نمائش ہے ایشیا میں
نظر اٹھاؤ قریب آؤ
یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو
یہ دیکھو ہیضے کی قے ہے طاعون کی ہے گلٹی
یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی
جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی سبا ہیوں سے
یہ پیٹھ دیکھو، یہ پیٹھ کتنی حسین ہے جس پر
تمہارے کوڑوں کی بدّیاں ہیں
یہ پھانسیوں پر لٹکتی لاشیں
یہ جیل خانوں میں بند انساں
یہ ہاتھ لکڑی کی طرح سوکھے
یہ پیٹ مشکوں کی طرح پھولے
دہکتے ناسور، چیختے زخم، رینگتے جسم جیسے کیڑے
تمہاری سرمایہ دار "تہذیب" کی کہانی سنا رہے ہیں

یہ سب کچھ ہم میں سے بہت ہیں جو اپنی آنکھوں سے ہمارے ملک میں دیکھ چکے ہیں۔ جنہوں نے خود نہیں دیکھا انہوں نے سنا ضرور ہے۔ اس تصویر کا حقیقی بھیانک پن اب تک ہماری نظروں میں ہے۔ اگر کوئی شاعر اس دحشت انگیز اور درد ناک حقیقت کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے تو کیا ہم اس کی شاعرانہ جرأت کی داد دیں گے یا اس کی اس جرأت کو نعرہ بازی کہہ کر نظر انداز کریں گے؟ اس سوال کے جواب پر ہماری ادبی دیانت یا بد دیانتی کے تعین کا دارومدار ہے اور ہماری طبقاتی

ہمدردی اسی میزان میں تولی جائے گی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اگر یہ نظم کسی اور ملک کی کسی زبان کا شاعر لکھتا تو اسے بڑی شاعری کہنے میں کسی کو تامل نہیں ہوتا لیکن چونکہ یہ نظم ایک بدبخت ملک کی بدنصیب زبان میں لکھی گئی ہے جس کے نقاد مینڈک کے کنویں سے باہر نہیں نکلے۔ اس لیے اس کو سراہنے والے کم اور نظرانداز کرنے والے زیادہ ہیں اور تنقید کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔

سردار جعفری کی آزاد نظموں میں 'اودھ کی خاکِ حسین' نہ صرف بڑی خوب صورت نظم ہے بلکہ بڑی اہم بھی ہے۔ اس میں حسین پیکر تراشی کے ساتھ گریز دار خطابت اور صوتی آہنگ کی جھنکار ماضی اور حال، یاد اور وجود کے راستوں سے قاری کو امکان کی منزل تک لے جاتی ہے۔ اس نظم کو پڑھتے وقت ہر ایسی جدوجہد یاد آتی ہے جو مظلوم نے ظالم کے خلاف اپنی جان کی بازی لگا کر کی، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ویت نام میں، چلی میں، کیوبا میں، جنوبی افریقہ میں اور دوسرے ملکوں میں۔ اس نظم کے تصویری پیکر حقیقت سے اتنے قریب ہیں کہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود ہم بھی اس منظر کا حصہ ہیں۔ نظم یاد کے پیکروں کے ساتھ آگے بڑھتی ہے اور انتہائی خوب صورت لفظی تصویریں پیش کرتی ہے۔

گزرتی برسات آتے جاڑوں کے نرم لمحے
ہواؤں میں تتلیوں کی مانند اڑ رہے ہیں
میں اپنے سینے میں دل کی آواز سن رہا ہوں
رگوں کے اندر لہو کی بوندیں مچل رہی ہیں
مرے تصور کے زخم خوردہ
افق سے یادوں کے کارواں یوں گزر رہے ہیں
کہ جیسے تاریک شب کے تاریک آسمان سے
چمکتے تاروں کے مسکراتے ہجوم گزریں
میں قید خانے میں عشق پیچاں کی سبز بیلوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو پھیل جاتی ہیں اپنے پھولوں کے ننھے ننھے چراغ لے کر
میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں
مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں ابھی تک نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوئے ہیں
ابھی وہ اپنی سریلی آواز سے دلوں کو لبھا رہے ہیں
مرے تصور میں ساقیوں کا خرامِ رنگیں نہ جام و مینا کی گردشیں ہیں
نہ مے کدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے کھیلتے ہیں

کسانوں کے جھونپڑوں پہ ترکاریوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں
پرانے پیپل کی جڑ میں پتھر کے دیوتا بے خبر پڑے ہیں
لوہار کے گھن کے نیچے لوہے کی شکل تبدیل ہو رہی ہے
کمہار کا چاک چل رہا ہے
صراحیاں رقص کر رہی ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر لٹکے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں

یہ اور ایسی بہت سی خوب صورت تصویریں اس نظم میں ہیں لیکن اگر صرف اسی قسم کی تصویریں ہوتیں تو یہ نظم ہلکی پھلکی رومانی نظم ہو کر رہ جاتی۔ اس نظم کے اور بھی رخ ہیں جو اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتے ہیں اور حقیقت کے ایک بڑے اہم پہلو سے ہم کو آشنا کرتے ہیں۔ مثلاً ؎

میں اپنے بچپن کے ساتھیوں کی گرجتی آواز سن رہا ہوں
وہ کارخانوں کے سامنے انقلاب بن کر کھڑے ہوئے ہیں
زمیں کے سینے پہ کاشتکاروں کی لاٹھیوں کے
ہزاروں جنگل اُگے ہوئے ہیں
کدالیں کھیتوں کی پاسباں ہیں
درانتیاں جگمگا رہی ہیں
زمیں کے غاصبوں کے چہرے کا رنگ کافور ہو رہا ہے
ملوں کے مالک لرز رہے ہیں

اور جیسے جیسے یہ نظم آگے بڑھتی ہے صوتی آہنگ کی جھنکار بڑھتی جاتی ہے اور مصرعوں کی بندش چست ہوتی جاتی ہے

اودھ کی خاکِ حسین کے ذرّے بگولے بن کر مچل رہے ہیں
جھکے ہوئے سر ابھرتے سورج کی شان و شوکت سے اُٹھ رہے ہیں
یہ سورماؤں کی سرزمیں ہے

اور یہ بولتا ہوا، بجتا ہوا مصرعہ دیکھیے ؎

یہ آسمانِ غرش طوفانِ برق و باراں کا آسماں ہے

اب اس نظم کا اختتام دیکھیے جو جیل کی بندشوں کے باوجود بلکہ شاید ان بندشوں کی وجہ سے ان کے خلاف ان کے فطری ردِ عمل کے سبب ولولہ انگیز ہے ؎

اودھ کی خاکِ حسین کے فرزند
جو سیکڑوں میل دور سے اُڑ کے میرے خوابوں میں آ گئے ہو
مرے وطن کی زمین سے میرا سلام کہنا
اُسے بتانا
کہ میرے ہونٹوں پہ سنگ و آہن کی سرد مہریں لگی ہوئی ہیں
میں آج مجبور ہوں تو کیا ہے
وطن سے کچھ دور ہوں تو کیا ہے
مگر میں اس کے مجاہدوں کی صفوں سے باہر نہیں گیا ہوں

ان نظموں کو نعرہ بازی نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی یہ نظمیں خالص سیاسی بیان بازی کی تعریف میں آتی ہیں۔ یہ نظمیں زندگی کو حیوانیت کا شکار بنانے والوں کے خلاف پوری انسانیت کا ایک احتجاج ہیں۔ دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونکنے والوں کے خلاف امن پسندوں کی صف آرائی ہے۔ انسان سے جانور کا سا برتاؤ کرنے والوں کے خلاف آزادیٔ انسان کے پرستاروں کا جہاد ہے۔ سب سے دردناک حقیقت جس کی طرف سردار جعفری نے اپنی نظم 'بمبئی' میں اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ فرنگی سرمایہ داروں کے علاوہ ہمارے عوام ہندوستانی سرمایہ داروں کے مظالم سہہ رہے ہیں۔ اگر صرف فرنگی ظالم ہوتا تو اس کو پہچاننا آسان تھا لیکن یہاں تو ظالم کی پہچان بھی مشکل ہے کیوں کہ وہ اپنوں میں سے ہے۔ آج سماجی اور معاشی رشتے اتنے پُر فریب اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ظالم اور مظلوم کی صفیں مشکوک اور صف آرائی مفاہمت کی پردہ پوشی کے لیے کیا جانے والا تماشہ بن کر رہ گئی ہے۔ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ فن میں آزادیٔ اظہار کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں اور دوسرے ملکوں کے عوام پر کیے جانے والے ظلم اور درندگی کے خلاف آواز اٹھانے والوں کی کاوش کو سیاسی نعرہ بازی کہہ کر صدائے احتجاج کو دبا دینا چاہتے ہیں۔ کیا یہی فن کی آزادی ہے کہ سینہ فگار انسانیت کی طرف داری اور مظلوم کی حمایت کو نعرہ بازی کہہ کر نظر انداز کیا جائے اور شاعر کو گل و گرفتہ رہنے پر مجبور کیا جائے اور اس سازش کو جدیدیت کا نام دیا جائے؟

سردار جعفری نے خوب صورت رومانی آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں اور دردناک آزاد نظمیں بھی۔ 'تمہاری آنکھیں' بڑی خوب صورت رومانی آزاد نظم ہے اور "بھوکی ماں، بھوکا بچہ" بڑی دردناک آزاد نظم کی بڑی خوب صورت مثال ہے۔ ان نظموں کے علاوہ سردار جعفری آج کل آزاد نظم کی ہیئت میں سوانحی نظم لکھ رہے ہیں۔ جس کا عنوان ہے "میرا گہوارہ"۔ شاید یہ ان کی سب سے طویل آزاد نظم ہو۔ بہت ممکن ہے کہ یہ اُردو کی سب سے طویل نظم ہو اور اس کی اٹھان اس بات کی ضامن ہے کہ یہ بہت اہم نظم ہوگی۔ اپنی خود نوشت سوانح عمری کو ایک ایسی نظم کی شکل میں پیش کرنا جو بیک وقت آپ بیتی بھی لگے اور جگ بیتی بھی، بڑی جاں کاوی کا کام ہے۔ یہ نظم نامکمل ہے لیکن اس نظم کا جتنا حصہ لکھا گیا ہے اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے زندگی کی وہ چھوٹی چھوٹی باریکیاں اپنے مشاہدے کے خزانے سے نکال کر شعری سانچے میں ڈھال دیں جن کو اکثر یا تو عام طور پر کم تر صلاحیت رکھنے والے شعرا نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان کو شعری سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس میں بچے پر منکشف ہونے والے حقائق کا ذکر اسی نرمی سے کیا گیا ہے جس نرمی سے یہ حقائق

بچے پر منکشف ہوتے ہیں مثلاً ؎

مری آنکھوں نے پہلی بار سورج کی سنہری روشنی دیکھی
مرے کانوں میں پہلی بار انسانی صدا آئی
مرے تارِ نفس میں جنبشِ بادِ صبا آئی
مشامِ روح میں
مٹی کی خوشبو پھول بن کر مسکرا اٹھی
ہوا نے گیت گایا
شمعِ ہستی جگمگا اٹھی

اور جب ستر سال پہلے اس تماشہ گاہِ عالم میں ایک آفاقی کھلونا آیا تو ؎

ہوا کے ہاتھ سہلاتے تھے میرے نرم بالوں کو
مری آنکھوں میں راتیں نیند کا کاجل لگاتی تھیں
سحر کی پہلی کرنیں چومتی تھیں میری پلکوں کو
مجھے چاند اور تارے مسکرا کر دیکھتے تھے
موسموں کی گردشیں جھولا جھلاتی تھیں

یہاں سردار جعفری نے بچے کو موسم کی خنکی اور گرمی سے بچانے کے لیے ماں کے فطری جذبے اور محبت کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے مصرعے دیے ہیں کہ اس جذبے کی پاکیزہ شدت سے آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں ؎

بھری برسات میں بارش کے چھینٹے
گرمیوں میں لو کے جھونکے
مجھ سے ملنے کے لیے آتے
وہ کہتے تھے ہمارے ساتھ آؤ
چل کے کھیلیں باغ و صحرا میں
میری ماں اپنے آنچل میں چھپا لیتی تھی ننھے سے کھلونے کو
مری حیرت کی آنکھیں
اس محبت سے بھرے چہرے کو تکتی تھیں
جس آئینے میں پہلی بار میں نے
اپنا چہرہ آپ دیکھا تھا
وہ چہرہ کیا تھا
سورج تھا، خدا تھا یا پیمبر تھا

وہ چہرہ جس سے بڑھ کر خوب صورت
کوئی چہرہ ہو نہیں سکتا
کہ وہ اک ماں کا چہرہ تھا
جو اپنے دل کے خوابوں، پیار کی کرنوں سے روشن تھا

اس کے بعد کے بند میں ماں کے دودھ کا اعجاز اور اس کی دین شاعر کے قلم اور زبان و بیان کی قوت بن کر ابھرتا ہے اور شاعر اس زبان کو ایک امانت کی طرح سنبھالے ہوئے آج تک ایک وقار کے ساتھ اپنے فن کو زندہ رکھے ہوئے ہے ؎

جو اب میری زباں ہے
میرے بچپن میں وہ میری ماں کی لوری تھی
یہ لوری اک امانت ہے
مرا ہر شعر اب اس کی حفاظت کی ضمانت ہے

اس نظم میں جہاں بچے کو عشق
خاک پہ چلتے ہوئے کیڑوں پہ بے حد پیار آتا تھا
وہیں جوانی کی آمد آمد ہوئی تو عشق
مستیں بھیگیں رگ رگ میں جنوں کا بانکپن آیا

اور زندگی کے تجربات اور مشاہدات نے استاد کا کام کیا اور شاعر نے دیکھا کہ ؎

ہواؤں کے تند و تیز جھونکے
جب آندھیوں کا لباس پہنے
اتر تے ہیں غارت چمن پہ
تو شاخِ گل اپنا سر جھکا کر سلام کرتی ہے
اور پھر سر اٹھا کے ہنستی ہے
اور کہتی ہے مجھ کو دیکھو
میں فطرتِ لازوال کا رنگِ شاعری ہوں
وجود کا رقصِ دلبری ہوں
جسے مٹانے کی کوششیں ہیں
وہ مٹ سکا ہے نہ مٹ سکے گا
یہ رنگ صحن چمن سے ابلے گا
مقتلوں سے طلوع ہوگا

یہ بات صرف ایک صحت مند ذہن اور ترقی پسند نقطۂ نظر کی دین ہے، کوئی مریضانہ ذہنیت کا حامل جدید یہ، جسکو صرف

تہذیب، اندھیرا، موت اور خودکشی پر ابھارنے والی تنہائی اور شکست خوردگی کا احساس گھیرے ہوتے ہے، یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ شاید اس وجہ سے بعض لوگوں کو تاریکی نظر آتی ہے کہ وہ روشنی کی طرف دیکھنا نہیں چاہتے اور اس کا نتیجہ احساسِ کمتری ہے جو حرص، بغض اور حسد کی شکل میں اُبھرتے ہیں جس پر اس نظم میں بڑا سخت طنز کیا گیا ہے۔

وجود ظاہر میں ہے مکمل
مگر وہ اندر بکھر رہا ہے
وہ اپنی نفرت کا زہر لے کر
خود اپنے خون میں اتر رہا ہے
وہ تنگ دل بھی ہے تنگ جاں بھی
تنگِ ضمیر اور تنگ زباں بھی
خبر نہیں اس کو وہ کہاں ہے
کہ ہر طرف ایک شخص ایسا نظر کے اندر بسا ہوا ہے
کہ جس کے سائے سے کانپتا ہے
جب اپنا قد اس سے ناپتا ہے
تو اپنے خنجر کو تولتا ہے
حسد کا مارا ہوا یہ بندہ غریبِ شہر دیارِ خود ہے
شرافتِ نفس مر چکی ہے، بچارا خویش آشنا نہیں ہے

لیکن اس کے باوجود شاعر کا ظرف دیکھیے ؎

مگر اسی دوست کی بدولت
میں خود کو پہچاننے لگا ہوں
میں اس کا احسان مانتا ہوں
خدا کرے اس کا دل کہیں سے
سکون کی دولت تلاش کر لے

سردار جعفری کے مجموعے ایک خواب اور میں ایک نظم ہے "تن کی چاندی، من کا سونا" جس کو پڑھ کر ایک بات کھٹکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی پکارتا ہے میں بعض نظمیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر اسی طرح کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں بظاہر اس بات کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ جس شاعر نے آزاد شاعری میں طرزِ اظہار کو ایک نیا رنگ، ایک نیا آہنگ دیا اور اپنے طرزِ سخن کی مہر دوسروں پر لگائی وہ بعض نظموں میں دوسرے ہم عصر شاعروں کے رنگِ سخن کو اپنے کلام میں سرایت کر جانے سے کیسے نہ روک سکا۔ مثلاً "تن کی چاندی، من کا سونا" پڑھیے تو عنوان سے لے کر نظم تک ایسا لگتا ہے کہ فیض کی یاد آ رہی ہے۔ اسی طرح "گفتگو" مخدوم کی یاد دلاتی ہے اور "تمہارا شہر" پر کیفی کے رنگ کا گمان ہوتا ہے لیکن پھر فوراً ان نظموں کے بعد

ان کی نظم "پھول، چاند، پرچم" میں ان کا اپنا رنگ ابھر آتا ہے جس کا حسن اسی بانکپن اور لطافت کے ساتھ ہم کو متاثر کرتا ہے۔ یہ نظم جبرِ حالات اور ضرورتِ اتحاد پر خوب صورت اور پراثر شاعرانہ اظہار ہے۔

مجموعی طور پر سردار جعفری کی شاعری اور خصوصاً ان کی آزاد شاعری بالغ شاعری کی بہترین اور خوب صورت مثال ہے۔ اس میں "تازہ وار دانِ بساطِ ہوائے دل" کی رومان پروری شاید نہ ملے لیکن بالغ ذہن اور زخمی دل کا، ناانصافی، جبر اور استبداد کے خلاف سخت ردِ عمل ضرور ملتا ہے جس کی بنیاد کل کی محبت اور انسان دوستی کی اکائی ہے۔ ان جذبات کی وجہ ہیں، اس لیے جہاں شاعر یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہے ؎

کوئی نہیں تم سے بڑھ کے دنیائے دلبری میں
کوئی نہیں مجھ سے بڑھ کے دنیائے عاشقی میں
ہر ایک سے تم حسین تر ہو
ہر ایک سے میں عظیم تر ہوں　　(نومبر میرا گہوارہ)

وہیں یہ کہنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے ؎

وہ کسی دیس کا دل ہو کہ کسی قوم کا دل
وہ کسی فردِ بشر کا دل ہو
زخم خوردہ ہو کہ نغموں سے بھرا
میرے سینے میں دھڑکتا ہے مرا دل بن کر
کتنے دل قتل کر دئے آخر　　(نومبر میرا گہوارہ)

اس نظم کی تکنیک اس طرح کی ہے کہ ہر باب کے ساتھ بحر بدلتی ہے جس سے ایک باب دوسرے باب سے الگ ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی نظم کا بہاؤ سست نہیں پڑتا۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔

سردار جعفری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود وہ اپنے خواب اپنے بعد کی نسلوں پر مسلط نہیں کرتے بلکہ آنے والی نسلوں کو اپنے سے زیادہ حسین خواب دیکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور ان سے ان خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ کاش آنے والی نسلیں اس اعتماد کی اہل ہوں۔

محمد حفظ الکبیر قریشی

علی سردار جعفری

ترقی پسند ادب کی یہ خوش قسمتی رہی کہ اسے سردار جعفری جیسا ادیب اور نقاد میسر آیا۔ سردار جعفری نے جس یکسوئی اور خوش اسلوبی سے ترقی پسند ادب کی وکالت کی ہے اس میں ان کا ہم پلہ اور کوئی نہ ہو سکا۔ یہی نہیں کہ وہ ترقی پسند نقطہ نظر کی تشریح و تعبیر کرتے رہے بلکہ ایک اچھے نثر نگار اور شاعر کی حیثیت سے بھی انہوں نے تخلیقی جوہر دکھائے۔ صحت مند ادب بھی پیش کیا۔ سردار جعفری کی ہمہ جہتی شخصیت تقریر و تحریر کے علاوہ عملی طور سے سیاسی میدان میں نبرد آزما ہوئی اور اس کی پاداش میں جیل یاترا بھی کرائی۔ یہاں ان کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بحث مقصود نہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی ہنگامہ آرائیوں میں سردار جعفری ایک طویل عرصہ تک آماجگاہ تنقید ذہن بنے رہے ہیں۔

آزادی کے بعد نئی نسل عقل و شعور کے میدان میں قدم رکھ رہی تھی اور آگاہی کی جس سطح سے دوچار تھی اس میں سیاسی شعور تو تیز تھا ہی لیکن پہلی مرتبہ اس کا بھی احساس عام ہو رہا تھا کہ آزادی محض بیرونی تسلط سے نجات پانے ہی کا نام نہیں ہے۔ معاشی ناہمواریاں دور کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے اور طبقاتی نظام کے شکنجہ سے بھی نکلنا اہم ہے۔ یہی نہیں بلکہ جہالت، تعصب اور رسم پرستی کی لعنتوں سے بھی نجات پانا ایک اہم ملی فریضہ ہے۔ نئی تعلیم یافتہ نسلوں کو ترقی پسند ادب نے یہ گرانقدر احساس عطا کیا اور یہی ترقی پسند ادب کا سب سے اہم عطیہ بھی ہے۔ ترقی پسند تحریک ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک ایک فعال تحریک تھی جس نے ادبی رویوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے جو شاعر و ادیب لکھ رہے تھے ان میں حضرت اکبر الہ آبادی سے لیکر حسرت، ثاقب، عزیز لکھنوی تک اور ان کے فوراً بعد کی نسلوں میں فراق، سیماب، جوش اور احسان دانش کے نام سامنے آتے ہیں۔

یہ شعراء کرام جس طرح کی نظمیں، غزلیں کہہ رہے تھے اور اردو شاعری کے مزاج کی جو نہج تھی اور اردو داں طبقہ کا جو مزاج تھا اسے ترقی پسند ادب نے ایک نئی شاہراہ پہ ڈال دیا۔ صرف اقبال ایسے شاعر تھے جو اپنی راہ کے واحد مسافر تھے۔ تنقید میں مولانا حالی کی واحد شخصیت سامنے آتی ہے۔ باقی احباب محض ہیئتی نقاد تھے۔ اور صرف زبان و محاورہ کے رموز و علائم سے وابستہ۔ یہی حال افسانہ کا تھا کہ وہ سوائے مختصر داستان گوئی کے اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ شرر اور ڈپٹی نذیر احمد اور رسوا وغیرہ نے اچھے ناول لکھے لیکن ان کا اصرار معاشرتی اصلاح پہ تھا لیکن معاشرہ کو جو اسباب و علل دیمک بن کر چاٹ رہے تھے اس کو دیکھنے یا سمجھنے کی صلاحیت غالباً ان بزرگوں میں نہیں تھی۔ معاشرتی اسباب کے تجزیہ سے وہ قاصر تھے اور معیشت اور اخلاق کے رشتہ کو سمجھنے سے معذور۔

ہندوستانی سماج خود آگہی اور شعور کی جس سطح پہ گامزن تھا وہ نیم فیوڈل، نیم سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ تھا۔ یہ ایسا سماج

رہتا ہوا ہم تک صنعتی حقیقتوں سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ انگریزوں کی آمد اور عروج کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ہندوستانی معاشرہ میں عقل پہلے آئی اور تجربہ بعد میں۔ تجربہ اور عملی صورت حال کی کوکھ سے نکل کر شعور کی تربیت نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ سے ہمارے اس دور کے بیشتر نظریات صرف کتابی اہمیت رکھتے ہیں۔ پھر ہمارے ادب کا یہ حال تھا کہ وہ فنی اعتبار سے اپنے ہی پاؤں پہ کھڑا تھا۔ فنون لطیفہ کے دوسرے شعبے مثلاً موسیقی، نقاشی، عمارت سازی وغیرہ سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا اور نہ یہ ایک دوسرے سے متاثر انداز ہوئے۔ بیشتر ادبی تحریکیں جو یورپ میں اٹھیں انہیں ہمارے تعلیم یافتہ افراد نے صرف کتابوں ہی میں پڑھا اور اگر ان کی اسپرٹ کی رعایت کبھی بھی تو ان عوامل اور تاریخی ارتقاء سے نابلد ہی رہے جو ان ادبی یا فنون لطیفہ کی تحریکوں کا باعث تھی۔ ہمارے عام شاعر و ادیب اور علم و فن کے ذہین طلباء ان تحریکوں کے ہیئتی نظام سے واقف تو ہوئے اور متاثر بھی لیکن روح پکڑ نہ سکے۔ غالباً وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے اس لئے کہ وہ خود ہندوستان کے جس معاشرہ میں سانس لے رہے تھے اور ان کی ارد گرد کی جو دنیا تھی اس میں یہ ساری چیزیں مفقود تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں ہیئت پسندی عام تھی اور ہمارے ادبی مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔

یہاں یہ باتیں لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ترقی پسند تحریک بھی اسی صورت حال سے دوچار تھی۔ ان کے ہاں نظریاتی بحثیں محض باپدہ ہوا قسم کی ہوتی ہیں۔ طبقاتی کشمکش ہیئتی استحصال وغیرہ قسم کی اصطلاحیں سطحی طور پہ استعمال ہوتی تھیں۔ ترقی پسند تحریک نے صحیح معنوں میں مارکسی نقطۂ نظر کی روشنی میں ہندوستانی معاشرہ اور اس کے اخلاقی نظام کا جائزہ لیا ہی نہیں بس کتابی کلیے منطبق کرتے چلے گئے پروست لوئی ارگان و سارتر اور اس قبیل کے لوگوں کے ہاں جو نظریاتی تبدیلیاں آئیں اور ایلیٹ اور آڈن کے جو اصلی مسلک تھے ان سے ترقی پسند ادب جان بوجھ کر بھی ناآشنا ہی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں بار بار ترقی پسند ادیبوں کی فہرست میں تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ شروع شروع میں اس تحریک میں شعور کی ناپختگی کے ساتھ ساتھ جوش اور جذبہ کی فراوانی تھی۔ اور ایک طرح کی رومانیت تھی۔ (وہ ابھی تک ہے) پھر ہمارے شاعروں کا مزاج غزل اور اس کے آہنگ کا تربیت یافتہ تھا۔ صنائع، شوکت لفظی، تلازمات، قافیہ اور ردیف اور خوبصورت ترکیبوں سے ذہن کا چھڑانا بہت مشکل تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ہر وہ شاعر اور ادیب جو روایت سے پیوستہ رہتا ہوا، اپنی راہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا ترقی پسند تحریک کا لالہ صحرائی بنتا گیا۔

پریم چند، کرشن چندر، بیدی کے ساتھ ساتھ فراق، جوش بھی آگئے البتہ راشد اور میراجی جو کسی طرح روایت سے پیوستہ نہیں تھے اور ایسی نظمیں کہہ رہے تھے جو مارکسی ڈھانچے کے مبہم انداز میں سمجھے گئے تصور پہ فیٹ نہیں آتی تھیں، نظر انداز کر دیئے گئے۔ فراق نے جب اپنی جنسی عشقیہ شاعری کی تاویل میں کچھ پر پرزے نکالے اور امرد پرستی کو خالص عشقیہ شاعری کے جواز میں پیش کرنے لگے تو ترقی پسندوں میں اور تو کسی کی ہمت نہیں ہوئی لیکن سردار جعفری کو ٹوکنا پڑا۔ انہوں نے ایک بصیرت افروز مضمون غالباً شاہراہ میں لکھا تھا جس کا عنوان تھا "یہ ترقی پسندی نہیں ہے" اسی طرح انہوں نے ساحر لدھیانوی کو بھی تاج محل کو "کہنہ ناسور" کہنے کی بنا پر برملا ٹوکا تھا۔ منٹو اور عصمت چغتائی کو بھی جنسی بے راہ روی پہ خشمناک نگاہوں سے دیکھا تھا۔ یہی نہیں بلکہ فیض کے بھی شاکی ہوئے تھے کہ "یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر" والی نظم میں انہوں نے بات واضح اور دو ٹوک کیوں نہیں کہی! ترقی پسند ادب کے شاعر اور مفکر کی حیثیت سے سردار جعفری نے ہمیشہ ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کی بعض باتوں پہ لے دے ہوئی اور بعد میں مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی کتاب اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک میں ان کے خلاف جا و بے جا لکھا بھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سردار جعفری نے جن ادبی رویوں پہ یا انداز بیاں کے جن طریقوں پہ حرف زنی کی وہ ان کی صوابدید پہ دال ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے

کہ رومانی رویوں اور نئی بات کو نئے انداز سے کہنے کے پس منظر میں جو رجعت پسندانہ مسلک ترقی پسند تحریک میں در آئے تھے انہیں سردار جعفری نے بلبر نکال پھینکا ۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے صحیح spokesman ثابت ہوتے ۔

سردار جعفری کی تنقید نگاری نثر کا اعلیٰ نمونہ ہوتی ہے ۔ ان کے ہاں خطابت ، تکرار اور زور بیان کے ساتھ ساتھ سلاست اور بلا کی روانی ملتی ہے اور بے سبب افکار یا غیر باتی الجھنیں کہیں نظر نہیں آتیں ۔ ان کا ذہن اپنی بات کہنے میں واضح اور روشن ہوتا ہے ۔ ایک جگہ اقبال کے متعلق لکھتے ہیں " اس منزل پر پہنچ کر اقبال کی شاعری بے انتہا حسین اور زوردار ہو جاتی ہے ۔ یہ حسن اور زور اردو شاعری میں پہلے نہیں تھا ۔ اس میں سیلاب کا چڑھاؤ اور آبشاروں کی روانی آجاتی ہے اس کے سامنے کوئی منزل منزل نہیں ، کوئی حد حد نہیں بیقراری اور تڑپ ، آگے بڑھ جانے کا بے پناہ جذبہ ۔ جب کسی حسین چہرے پر نظر پڑتی ہے تو دل اس سے بھی زیادہ خوبصورت محبوب کیلئے تڑپ اٹھتا ہے ۔ شرر سے ستارے ، ستاروں سے آفتاب فقط ذوق پرواز ہے زندگی ، سکون اور قرار موت کا دوسرا نام ہے ۔"

اچھی تنقید نگاری کے باوجود سردار جعفری بنیادی طور سے نقاد نہیں کہے جا سکتے ۔ اس لئے بھی کہ ان کے ہاں تنقید کے لئے جس فلسفیانہ اور مفکرانہ مواد کی ضرورت ہوتی ہے وہ بہت کم ہے ۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے نقادوں میں احتشام حسین اور ممتاز حسین کو تو شامل کیا جا سکتا ہے اور ایک حد تک آل احمد سرور کو بھی لیکن سردار جعفری ایک معبر ، مفسر نظر آتے ہیں ۔ انہوں نے کوئی ایسی کتاب یا مضامین سپرد قلم نہیں کئے جو صحیح معنوں میں مارکسی فلسفیانہ نظام کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتے ، یا ان کی روشنی میں ہندوستانی سماج کا کوئی تجزیاتی یا تحلیلی نقشہ پیش کرتے ۔ میری دانست میں ایم ۔ این رائے کی واحد شخصیت اس کی اہل تھی ۔

سردار جعفری نے اپنا ادبی سفر غالباً افسانہ سے شروع کیا تھا لیکن وہ جلد ہی تقریر و تنقید کے میدان میں اتر آئے جہاں انہوں نے اپنی ایک منفرد جگہ بنالی ہے ۔ اردو ادب کی تاریخ میں انیسویں صدی میں حالی کو جو مقام ملا تھا وہی مقام سردار جعفری کے لئے بیسویں صدی میں طے ہے ۔ حالی ہی کی طرح سردار کی بھی شخصیت ہمہ جہتی اور پہلو دار رہی ہے ۔ دونوں ہی نثر و نظم کے روشن منارہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

سردار جعفری سے میرا تعارف ان کی ایک نظم سے ہوا تھا جس کا اثر آج بھی اسی طرح باقی ہے ۔ یہ زمانہ آزادی کے فوراً بعد کا تھا جب آزادی کا جوش اور ولولہ اور خطابت اور طمطراق کا زور کم ہوا اور زندگی کے مسائل اپنے اصلی شکل و صورت میں سامنے آنے لگے تو آزادی گویا ایک طعنہ بن گئی تھی ۔ ہندوستان میں سیاسی لیڈر شپ جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی ان میں سے معدودے چند کو چھوڑ کر بیشتر رہبران قوم عصبیت اور تنگ نظری کے علاوہ ذاتی مفاد پرستی کے جویا نظر آئے ۔ اس زمانے میں فیض ، نیاز حیدر ، ساحر ، مخدوم ، ظہیر کاشمیری ، کیفی ، وامق جونپوری ، جوش ، جگر ، اور گوپال متل ، ریاض احمد ، غرض کہ کتنے ہی شاعروں نے بڑی زوردار اور ہلا دینے والی احتجاجی نظمیں کہیں ۔ یہ لوگ وطن پرستی اور قوم پروری کے جذبے سے سرشار تھے اور انسانیت کی جو درگت سیاسی استحصال کی شکل میں ہو رہی تھی اس کے خلاف نبرد آزما نظموں کے اس سیلاب میں مندرجہ نظم بھی شائع ہوئی تھی جس کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ کیجئے ۔

فریب

ناگہاں شور ہوا
لو شبِ تارِ غلامی کی سحر آ پہنچی
انگلیاں جاگ اٹھیں
بربط و طاؤس نے انگڑائی لی
اور مطرب کی ہتھیلی سے شعاعیں پھوٹیں
کھِل گئے ساز میں نغموں کے مہکتے ہوئے پھول
لوگ چلائے کہ فریاد کے دن بیت گئے۔
راہزن ہار گئے
راہرو جیت گئے

(اور پھر دو بند کے بعد کہتے ہیں)

کون آزاد ہوا
کس کے ماتھے سے غلامی کی سیاہی چھوٹی
میرے سینے میں ابھی درد ہے محکومی کا
مادرِ ہند کے چہرے پہ اداسی ہے وہی
خنجر آزاد ہیں سینوں میں اترنے کے لئے
موت آزاد ہے لاشوں پہ گزرنے کے لئے
ہم کہاں جائیں، کہیں کس سے کہ نادار ہیں ہم
کس کو سمجھائیں، غلامی کے گنہگار ہیں ہم
طوق خود ہم نے پہنا رکھا ہے ارمانوں کو
اپنے سینے میں جکڑ رکھا ہے ارمانوں کو

یہ نظم سنہ ۴۷ء تک جو حالات پیدا ہوئے تھے اس کے پس منظر میں ایک کامیاب نظم تھی اور اس دور کی جذباتی زندگی کی بہترین عکاسی۔ سردار نے طویل نظمیں کہی ہیں، جن میں نئی دنیا کو سلام ایک جدید ایپک کا درجہ رکھتی ہے۔ سردار کی نظموں میں اقبال اور جوش کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ اس لئے ان کی نظموں کو مزاجوں کے طبعی اختلافات اور ذوقِ شعری کے نجی معیاروں پہ نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ موضوع کی اہمیت کس درجہ کی ہے اور شاعر نے انھیں کن انسانی رویوں سے کام لیا ہے اور انہیں کس طرح پیش کیا ہے۔ ان بنیادوں پہ سردار کی نظمیں کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔

سردار کی شاعری بعض حلقوں میں اپنی بلند آہنگی کی وجہ سے متنازعہ فیہہ رہی ہے بعض لوگ سردار کی شخصیت سے تنازع رکھتے ہیں اور جب عام قاری کو کسی طرح مطمئن نہیں کر سکتے تو اس کا بخار سردار کی شاعری پہ نکالتے ہیں۔ سردار صحیح معنوں میں انقلاب کے

شاعر ہیں۔ ان کا انفرادی وجدان، اجتماعی عافیت کا متلاشی رہتا ہے اور ان کے خلوص اور دیانت پر کسی طرح شک نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان و پاکستان میں جب اختلافات جنگ کی صورت میں رونما ہوئے تو سردار نے بڑی بصیرت افروز نظم کہی تھی۔

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا
مزا تو جب تھا کہ مل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمہارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

اور اس کے بعد درمیان ذری ہے کہ سے

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے ؟

سردار کی بعض نظمیں مثلاً اودھ کی خاکِ حسین آنکھیں، آبلہ پا، کربلا، پتھر کی دیوار، نیند وغیرہ کئی اعتبار سے بے حد اہم نظمیں ہیں۔ اس قسم کی نظمیں اردو ادب میں کم ہی لکھی گئی ہیں۔ یہ نظمیں دراصل انسانی سرشت کی تابناکی اور خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں کہ انسان کی معجز نمائی پر یقین آنے لگتا ہے۔ ان نظموں میں رومان ہے، بغاوت ہے، انسانی فتح پہ اعتماد ہے۔ ان میں ایسی رجائیت پائی جاتی ہے جو اقبال کی خودی کا بالآخر جواز بن جاتی ہیں۔

سردار جعفری شخصی اعتبار سے نہایت مرنجان مرنج، شگفتہ اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ وہ دو مرتبہ انجمن اردو کینیڈا کی دعوت پہ کینیڈا تشریف لائے اور ان سے تفصیلی گفتگو کے مواقع بھی ملے۔ ان کی شخصیت تحریر و تقریر میں بڑا اچھا تاثر چھوڑتی ہے اور ان کی عالمانہ حیثیت قائم کرتی ہے۔ انہوں نے غالبؔ اور میرؔ کے دیوان مرتب کر کے حسنِ خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کے ادبی خلوص پہ دال ہے۔ ۷۰ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی وہ جس طرح علم و ادب کی خدمت میں ہمہ تن لگے ہوئے ہیں اس کی داد تو کشمیر سے کنیا کماری تک آزادی دے سکتے ہیں کہ ابھی ابھی انہوں نے کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسری کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اقبال اور جوش سے انہیں والہانہ عشق ہے۔ جوش کی عظمت کو وہ مسلّم گردانتے ہیں اور جوش کی کمزوریوں، داخلی تضادات اور فکری و فلسفیانہ مغالطوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جوش کی لفظیات اور جذباتی یورش سے وہ متاثر ہیں اور ان کی بے راہ روی، انانیت اور غیر سنجیدگی کا نوٹس نہیں لیتے۔ خود بھی جوش ہی کی مشہور کردہ روایت کے پابند نظر آتے ہیں کہ شام ہوتے ہی باقاعدگی سے ایک دو پیگ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔

ان کی حب الوطنی میں بھی کوئی کلام نہیں۔ مارکسٹ اور غالباً غیر مذہبی ہونے کے باوجود مذہبی شخصیتوں کو مذہبی عقیدے کی راہ سے مانتے ہیں۔ کربلا کے واقعہ کا اثر ان کی لفظیات کا حصہ بن گیا ہے۔ ان کی فکر ضرور انقلابی ہے لیکن تہذیبی اعتبار سے وہ خود بورژوائی ہیں جو غالباً ہندوستانی معاشرہ میں رہنے اور بچپن کی تعلیم و تہذیب کا اثر ہے۔

محمد عطاالکبیر قریشی

جعفری ممبر

علی سردار جعفری

آج سے میں پچیس سال پہلے افواہیں سنی تھیں کہ وہ بڑے عاشق مزاج ہوا کرتے تھے مگر ان کی بوڑھا البیت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ آج تک برسوں سے ایک ہی سلطانہ کی درباری کرتے گزری اور آج بھی یہ عالم ہے کہ اس کی روشنی سے آنکھیں خیرہ ہیں۔ ہمارے ہاں کئی بزرگ شاعر آئے اور دائیں بائیں اپنے ہاتھ دل کش حسیناؤں کو کھینچ کھینچتے ہیں لیکن سردار ان موش فعلوں سے [illegible] ہے یا کم از کم ہمیں ایسے ہی نظر آئے۔ ہم بدگمانی میں کیوں مبتلا ہوں۔

سردار کی عظمت کا اعتراف کرنا اردو زبان کے بولنے والوں کا ایک خوشگوار عمل ہے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ لکھا نہیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے [illegible] ایسی ادبی کارواں کو تیز رفتار پر رکھا جو آسانی سے بھٹک سکتا تھا۔ جس راہ کے رہ گیر فراق، فیض، مخدوم، ساحر، عصمت، کرشن، بیدی جیسی شخصیتیں ہوں ان کی کامیابی حرف بحرف [illegible] نہیں رکھتی صبح [illegible] کا نوجوان اور گھنٹے آفتاب تازہ نکل آئے۔ جن ترقی پسند ادبی تحریک ہندوستان میں آفتاب کی طرح نمودار ہوئی۔ جس کی روشنی میں آج بھی کئی کارواں اپنی اپنی راہوں پہ گامزن ہیں۔

باصد ہزار دیدہ [illegible] جہاں ہے
جویائے آدمی [illegible] والے آدمی کی

(غالب)

(ٹورنٹو، کینیڈا سے)۔

ڈاکٹر عبدالقیوم ابدالی

ترقی پسند ادبی تحریک اور سردار جعفری

آج سے کوئی پچاس سال پہلے ۱۹۳۵ء میں پیرس میں ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانگریس ہوئی تھی۔ اس کانگریس میں دنیا کی مختلف زبانوں قوموں اور ممالک کے ادیبوں نے مندرجہ ذیل مسائل پر تبادلۂ خیال کیا تھا۔

(تہذیبی ورثہ)

روایت اور اختراع

تہذیبی اقدار کی بازیافت اور تحفظ

تہذیب کا مستقبل

(انسان دوستی)

انسان دوستی اور قومیت،

انسان دوستی اور فرد

پرولتاری انسان دوستی

انسان اور مشینیں

انسان اور فرصت

ادیب اور مزدور

(قوم اور تہذیب)

قومی تہذیبوں کے باہمی رشتے

قومی تہذیبیں اور انسان دوستی

قومی تہذیبیں اور سماجی طبقات

طبقات اور تہذیبیں

قومی اقلیتوں کا ادبی اظہار

قومیت قومی حقائق کی مخالف کی حیثیت سے
جنگ اور تہذیب
نوآبادیاتی عوام کا ادب
عوامی اکثریت اور پہل کرنے والے
سماج سے کٹے ہوئے لوگ اور مستقبل
کے رہنما
ترجمہ

(فرد)

سماج اور ادیب کا رشتہ۔ مخالفت یا مفاہمت

فرد اپنے طبقے کے ترجمان کی حیثیت سے

(سوچ کی عظمت)
فن کار کی آزادی کی نوعیت
اظہار کی آزادی
سنسر شپ کی بلاواسطہ و بالواسطہ شکلیں
ادیب جلاوطنی میں
غیر قانونی ادب
(سماج میں ادیب کا کردار)
عوام سے اس کا تعلق
سوویت ادب کی تعلیم
ادب اور پرولتاری
ادیب اور نوجوان
ادب کی تنقیدی قدر و قیمت
ادب معاشرے کے آئینے اور تنقید کی حیثیت سے

(ادبی تخلیق؛
سماجی تبدیلیوں کا ادبی ہیئتوں پہ اثر

تسلسل و عدم تسلسل کی اہمیت

ادب کی مختلف ہیئتیں
نعالی اور شمالیت کی تخلیق
ادب کا سماجی کردار
ہیروؤں کی تخلیق
جدید ٹیکنیکی ذرائع اظہار

(ادبا اور تہذیب کا تحفظ)
ان کی کاوشوں میں تعلق کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے؟

سجاد ظہیرؔ — جنہوں نے ہندوستان میں مرتی ہوئی جاگیردارانہ تہذیب کے بطن سے نئی نیم سرمایہ دارانہ تہذیب کو جنم لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ ہندوستانیوں کو اور ان کی ہزار سال پرانی تہذیب کو جھوٹے نام و نمود اور غلط اخلاقی ضابطوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ جہالت، تعیش پسندی اور کاہلی کو سماج کا گہنا بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ سرسیدؔ کی اصلاحی تحریک، حالیؔ کی مقدمۂ شعر و شاعری، شبلی کی 'شعرالعجم'، اکبر کی مزاحیہ و طنزیہ شاعری، نشترؔ کی ابن الوقت، اور توبت النصوح، سرشارؔ کی فسانۂ آزاد، رسوا کی امراؤ جان ادا، نیاز و یگانہ کی سنگلاخ، اردو ادب کے رومانی ادیبوں کی بے باکی اور پھر ہندوستان میں آزادی کی زبردست لہر، پریم چند، جوشؔ، اقبالؔ کے بلند بانگ لہجے، تلک، مولانا محمد علی، مولانا حسرت موہانی، سبھاش چندر بوس، پنڈت نہرو، ابھرتی ہوئی مزدور تحریک، بھارت نوجوان سبھا کے نوجوانوں کی رومانی انقلابیت کو نہ صرف قریب سے دیکھ اور پڑھ چکے تھے بلکہ متاثر بھی ہوتے تھے اور خود اپنے چند دوستوں کی مدد سے "انگارے" ترتیب دے چکے تھے جو نوجوان افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا ایسا مجموعہ تھا جس میں موضوع و مواد ہی نہیں کئی نئی ہیئتی تبدیلیوں کو بھی راہ دی گئی تھی۔ جب ادیبوں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ دنیا کی دوسری زبانوں اور ممالک کے ادیب بھی انہیں مسائل سے نبرد آزما ہیں جن سے خود وہ اور ان کی زبان و ملک کے ادیب دوچار ہیں اور ان مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ملک کے ادیبوں کو بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اسے محض اتفاق نہیں کہا جاسکتا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "سیاست سے دور" میں نہ صرف اس کانگریس کی مختصر رپورٹ شائع کی بلکہ 'ادب کی بنیاد' کے عنوان سے ایک مضمون بھی سپرد قلم کیا۔ اسی مضمون میں

انہوں نے لکھا تھا ـــــ

"کسی ملک کی اصل بیداری اس کے لیے ادب سے معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں عوام کے نئے خیالات اور امنگیں شامل ہوتی ہیں۔ جو قوم فقط قدیم ادب پر انحصار کرتی ہے وہ چاہے کتنی اونچی کیوں نہ ہو، مکمل طور پر زندہ کہلا سکتی ہے اور نہ ہی ترقی کر سکتی ہے۔"

بہرحال سجاد ظہیر اس وقت تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن میں مقیم تھے اور وہاں چند ہم خیال ادیبوں کا ایک حلقہ بھی قائم کر رکھا تھا جس کی ہر مہینہ باقاعدگی سے نشستیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ نوجوان ادیب و شاعر ادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی اور خود اپنے ملک کے حالات کا تجزیہ کرتے تھے۔ ان مسائل پر غور و فکر کرتے تھے اور ایک خوشگوار تبدیلی کے خواہش مند تھے بلکہ اس کا خواب دیکھتے تھے۔ کانگریس میں شرکت کے بعد سجاد ظہیر نے اسی حلقے کو "انجمن ترقی پسند مصنفین" میں تبدیل کر دیا اور اس کی باقاعدہ تنظیم کی۔ اس کا ایک دستور بھی ترتیب دیا۔ دستور کی ترتیب میں ڈاکٹر گھوش، محمد دین تاثیر، پرمود سین گپتا اور ملک راج آنند بھی شریک ہوئے۔ اسی دستور کو انجمن کی ایک نشست میں منظوری دی گئی جو لندن میں چیرنگ کراس روڈ سے متصل "نان کنگ ریسٹوران" کے زیریں کمرے میں منعقد ہوئی تھی اور پھر آگے چل کر لکھنؤ میں منعقدہ پہلی کانفرنس میں بھی یہی دستور منظور کیا گیا۔ دستور کا متن اس لیے بھی درج کرنا ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک کے مخالفین اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ اس وقت کے نوجوان ادیبوں کو اپنے ملک، حالات اور مسائل کا کتنا سنجیدہ شعور حاصل تھا اور وہ اپنے ملک کے حالات کو تبدیل کرنے اور اس کے مسائل کو حل کرنے کے کتنی سنجیدگی سے خواہش مند تھے ـــــ متن حاضر ہے۔

"ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مسلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبے میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔

اس لیے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ جو نئے ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور اُن کی نشو و نما میں پورا حصہ لیں۔

ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی بین اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے۔ حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر و قویٰ مضمحل ہو گئے ہیں۔ اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔

ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دُکھ سُکھ اور جد و جہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اس لیے زندگی کے جس شعبے میں رد عمل کے آثار پائیں گے۔ انہیں اختیار کریں گے۔ ہم اس انجمن کے ذریعے ہر اس جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکوں کی تہذیب اور تمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو ابھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں، تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔"

دستور کا مسودہ سائیکلو اسٹائل کروا کر اس کی کاپیاں ہندوستان میں ڈاکٹر محمد اشرف (علی گڑھ)، محمود الظفر اور ان کی بیوی رشید جہاں (امرتسر)، ہیرن مکرجی (کلکتہ)، یوسف حسین خان (حیدرآباد)، ہتھی سنگھ (بمبئی) وغیرہ کو بھیجی گئیں تاکہ وہ اس کی بنیاد پر ہندوستان میں انجمن کی شاخیں قائم کر سکیں۔ اسی درمیان سجاد ظہیر خود بھی ہندوستان واپس آ گئے اور اپنے والد کے ساتھ الہ آباد میں رہنے لگے اور اس طرح ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کا پہلا ہندوستانی دفتر الہ آباد میں احمد علی صاحب کے گھر پر قائم ہوا۔ سجاد ظہیر نے ایک طرف تو پریم چند، جوش، عبدالحق جیسے معتبر ادیبوں کو انجمن کا مسودہ دکھا کر ان کی تائید اور ہمدردی حاصل کی وہیں نوجوان ادیبوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ ان میں فراق اور اعجاز حسین بھی تھے جو الہ آباد یونیورسٹی میں بالترتیب انگریزی اور اردو کے استاد تھے۔ احتشام حسین اور وقار عظیم بھی تھے جو الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔ علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، حیات اللہ انصاری، مجاز، اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، شاہد لطیف اور سبط حسن تھے جن کی بدولت علی گڑھ میں نئے ادبی رجحانات کا فروغ ہو رہا تھا۔ فیض، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، میاں افتخار الدین، فیروز الدین منصور، سہیل عظیم آبادی، تمنائی اور اختر اورینوی بھی تھے جن کی وجہ سے پنجاب و بہار میں ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے زمین ہموار ہوئی۔

بہر حال علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا جو پہلا جلسہ ۱۹۳۶ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ سردار جعفری اس میں نہ صرف شریک تھے بلکہ "جدید ادب اور نوجوانوں کے رجحانات" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا یہ ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا لیکن تب سے اب تک سردار کا جو تعلق ترقی پسند ادیبوں کی تحریک اور اس کی تنظیم سے رہا ہے اس کے ذکر کے بغیر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کی تاریخ ہی ادھوری رہ جائے گی۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ تحریک کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ ان دنوں بہت ساری نظریاتی اختلافات کے باوجود اس تحریک میں شامل ادیبوں میں غضب کی یکجہتی تھی۔ ایک دوسرے کی سخت سے سخت تنقید کے باوجود جب کسی موقع پر یہ تمام ادیب یکجا ہوتے تھے۔ عجیب والہیت کا نظارہ دیکھنے میں آتا تھا۔ اسی دور میں سردار جعفری کے ذمہ زیادہ تر تعمیری ذمہ داریاں رہیں۔ اپریل ۱۹۳۹ء میں جب انجمن کا اپنا رسالہ 'نیا ادب' شائع ہوا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری سبط حسن، مجاز اور علی سردار کو سونپی گئی۔ 'نیا ادب' نے نہ صرف ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے فرائض انجام دیئے بلکہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کو ترقی پسند تحریک اور

اس کے مقاصد سے آگاہ بھی کرایا اور اس طرح ترقی پسند تخلیق و تنقید میں اُن کی رہنمائی کی۔ اس کے اداریے تو نوجوان ادیبوں کے لیے مشعلِ راہ ہوتے تھے۔ پہلے اداریے کے کچھ حصے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ ترقی پسند ادب ہر پرانی چیز کے خلاف بغاوت و احتجاج کا نام ہے۔ ترقی پسند ادب ہر چیز کو اس کے ماحول اور تاریخی پس منظر میں دیکھتا ہے اور ادبی کارناموں کی بھی کسوٹی یہی ہے۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب سے ناتا نہیں توڑتا، وہ پرانے ادب کی بہترین روایت کا حامل ہوتا ہے اور انہیں روایتوں کی بنیاد پر نئی عمارتیں کھڑی کرتا ہے۔ ترقی پسند ادب ہی دراصل قدیم ادب کا سب سے معتبر امین اور وارث ہے۔

ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ادب ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے اور جو پیدا ہو ان کی حمایت میں کرتا ہوا ایک نئی اور بہتر زندگی کا راہبر ہو لیکن وہ صرف زندگی کی بنیاد اور ہیجان کا ہی نقیب اور نبض شناس نہیں ہوتا، وہ صرف سطح پر کروٹیں لینے والی موجوں ہی کے ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر ان خاموش اور میٹھے دھاروں سے بھی سیراب ہوتا ہے جو سطح سے نیچے بہتے ہیں۔"

'نیا ادب' کے پہلے ہی شمارے میں سردار کا ایک مضمون بھی شامل تھا "ترقی پسند تحریک"۔ اس مضمون میں نئے ادبی رجحانات، سماجی تبدیلیوں، نوجوان نسل کا رجحان اور ان کی ذمہ داریوں کے پس منظر میں اس ابھرتی ہوئی تحریک کا ذکر تھا۔ سردار کی کتاب "ترقی پسند ادب" پر حملہ کرنے والے پتہ نہیں کیوں ان کے ان مضامین کا مطالعہ نہیں کرتے۔ بہرحال 'نیا ادب' کی ادارت اور اس کے لیے مضامین اور نظمیں وغیرہ تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ انجمن کی مختلف نشستوں، جلسوں اور کانفرنسوں میں بھی شرکت کا سلسلہ چلتا رہا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۸ء میں الٰہ آباد کی دوسری کانفرنس اور دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں ہونے والی دوسری کل ہند کانفرنس میں بھی سردار شریک ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں دہلی میں جو کانفرنس ہوئی اس میں بھی شریک ہوئے اور جنگِ عظیم کے خلاف جو اعلان ادیبوں نے جاری کیا اس پر بھی دستخط کیے۔ جنگ کے خلاف سردار کا ڈرامہ "یہ کس کا خون ہے" بھی کافی متاثر کن تھا۔ اس کا علم شاید بہت کم لوگوں کو ہو کہ سردار نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور ان کا ایک مجموعہ "منزل" کے نام سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں حیدرآباد میں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی جو پہلی کل ہند کانفرنس ہوئی۔ اس میں سردار نے "اقبال کی شاعری" پر اپنا مقالہ پڑھا۔

میں نے قبل ہی کہیں لکھا ہے کہ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کا زمانہ ترقی پسند ادیبوں کے لیے اُن کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔ مخالفین کے حملوں اور انجمن کے اندر کی نظریاتی بحثوں کے باوجود ان برسوں میں ترقی پسندی ہندوستانی ادب کا غالب رجحان رہی اور ہندوستان کے بیشتر نامی گرامی ادیب اور نوجوانوں کا ایک غالب حصہ اس تحریک کے جلو میں آگے بڑھتا رہا۔ دراصل یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہر ہندوستانی وہ چاہے دانشور ہو یا مزدور، سیاستداں ہو یا کسان، طالب علم ہو یا جاگیردار جذباتی طور پر ایک اکائی تھا اور ہر کی منزل بس آزادی تھی۔ ہر کا خواب بس آزادی تھا۔ جیسے آزادی ملتے ہی سب مسائل خود بہ خود حل ہو جائیں گے لیکن آزادی آئی تو پرانے مسائل حل کیا ہوتے اور نئے نئے مسائل سامنے آنے لگے۔ دو

بڑے مسئلے جن کا سامنا ترقی پسند ادیبوں کو کرنا پڑا وہ تھے شمالی ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ اور مسلسل بے زمینی اور عدولی؛ ہندوستان میں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے تئیں حکومت کا رویہ۔ ان سب مسائل نے مل کر یہ احساس دلایا کہ جو آزادی ہمیں ملی ہے یہ وہ آزادی نہیں ہے جس کے لیے ہم لوگوں نے کوششیں کی تھیں۔ اسی افراتفری کے دور میں لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۴۷ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس کے پہلے اجلاس کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں تقسیم ہند، فرقہ وارانہ فسادات اور نئے سیاسی حالات میں ترقی پسند ادیبوں کی ذمہ داری کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اسی کانفرنس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ انجمن کا مرکزی دفتر بمبئی میں قائم کیا جائے اور سردار کو عارضی طور پر سیکریٹری چنا جائے۔

سردار نے انجمن کے جنرل سیکریٹری کی ذمہ داری ایک ایسے وقت میں قبول کی جب ملک اور اس کا دانشور طبقہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش سے گزر رہا تھا۔ دانشوروں کا ایک گروہ موجودہ حکومت کو قومی حکومت سمجھ کر اس سے تعاون کرنا چاہ رہا تھا تو دوسرا گروہ اسے چند مفاد پرست نودولتیوں کی حکومت گردان رہا تھا۔ بنگال ابھی قحط کے اثرات سے پوری طرح چھٹکارا بھی نہیں پا سکا تھا کہ حکومت کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو گیا۔ اُدھر تلنگانہ کے کسانوں اور ان کے رہنماؤں کے ساتھ بھی حکومت کا رویہ ظالمانہ ہی رہا۔ اردو ہندی کا مسئلہ الگ پھن کاڑھے کھڑا تھا۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ گو کہ سرد ہونے لگی تھی لیکن بے یقینی اور خوف کی فضا ہنوز باقی تھی۔ قید و بند کا سلسلہ الگ جاری تھا۔ خود ان کے حالات بے انتہا پریشان کن تھے۔ ان کی کتاب "ترقی پسند ادب" کے حرفِ آخر سے یہ اقتباس آپ بھی دیکھیں تاکہ آپ ان حالات کا خود بھی کچھ اندازہ کر سکیں۔

"جب میں اپنی کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔ میرا کرائے کا مکان مجھ سے اس لیے چھین لیا گیا کہ اس میں کبھی سجاد ظہیر رہا کرتے تھے اور اب وہ پاکستان چلے گئے ہیں جس کی وجہ سے حقِ کرایہ داری متروکہ جائیداد قرار دے دیا گیا۔ بمبئی میں مکان تلاش کرنا اور حاصل کرنا آسان کام نہیں ہے یہاں جب تک مالکِ مکان کو دو چار ہزار، پانچ سات ہزار، بیس پچیس ہزار کا نذرانہ پیش نہ کیا جائے، جسے یہاں کی زبان میں پگڑی کہتے ہیں۔ تب تک کوئی مکان کرائے پر نہیں ملتا اور یہ نذرانہ یا پگڑی پیش کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ کئی مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد بہ مشکل تمام مجھے ایک کمرے کا مکان مل گیا جہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہو گیا اور اب تک اسی کمرے میں رہ رہا ہوں۔

جس کمرے میں بچے ہوں اس میں لکھنے پڑھنے کا کام ممکن نہیں ہے کیوں کہ بچے پڑھنے سے زیادہ کتاب پھاڑنے اور لکھنے سے زیادہ قلم توڑنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ چار چھ مہینے کی مزید کوشش کے بعد مجھے اسی گھر میں ایک اور چھوٹا سا کمرہ مل گیا اور مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں اس بے ہوا بے نور کمرے میں بیٹھ کر لکھ پڑھ سکتا ہوں۔ لیکن اطمینان پھر بھی نصیب نہ ہوا۔ میرے ایک اور ادیب دوست جو ہندی کے شاعر ہیں آ گئے، وہ بھی میری طرح بے گھر تھے اور انہوں نے اس کمرے میں آ کر پناہ لی۔ اب یہ چھوٹا سا کمرہ میرا کتب خانہ بھی ہے، میرے شاعر دوست کا ٹھکانہ بھی اور میرے گھر کا مہمان

خانہ بھی۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب میں اپنے بچوں سے بھاگ کر اس کمرے میں آتا ہوں تو یہاں مجھے بڑی عمر کے بہت سے بچے بیٹھے ہوئے مل جاتے ہیں۔ میرے بچے کتاب پھاڑتے ہیں۔ یہ بڑی عمر کے بچے کتاب پڑھنے کے شوقین ہیں اور ان کا شوق اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض اوقات وہ میری کوئی ایسی کتاب اٹھا لے جاتے ہیں جسے میں حوالے کے لئے استعمال کر رہا ہوں اور ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ کتاب کہاں گئی ہے اور شاعر کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ شعر کہتا ہی نہیں ہے سناتا بھی ہے۔ یہ اس کا حق ہے جو چھینا نہیں جا سکتا، اس لئے اکثر جب مجھے کچھ سوچنے یا لکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے اپنے شاعر دوست کی کوئی طویل طویل نظم سننی پڑتی ہے یا میں نہیں دو دن یا ہفتوں تک انہیں نے داد کیوں نہ دی۔

پھر اکثر مکان کے گرد و پیش سے ہنگامہ بھی میرے سوچنے پڑھنے کا کام اور بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میں جس مکان کی پہلی منزل کے دو کمروں میں رہتا ہوں وہ ایک اسپتال کی پشت پر ہے اور آج اسپتال کی ملکیت ہے۔ میرے کمرے کے نیچے کا کمرہ مردہ خانہ ہے۔ جہاں سے اسپتال میں مرنے والوں کی لاشیں ان کے عزیز و اقارب کو دی جاتی ہیں۔ اسپتال بڑا ہے۔ کبھی کبھی دو تین مرنے والے ایک ہی دن کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ان کے عزیز و اقارب جمع ہوتے ہیں۔ لاش کفنائی جاتی ہے پھر ماتم کے ساتھ جنازہ اٹھتا ہے اور یہ شور ماتم کبھی دن میں بلند ہوتا ہے کبھی رات میں۔"

انہی نامساعد حالات میں مئی ۱۹۴۹ء میں بھیونڈی (علاقہ بمبئی) میں ترقی پسند ادیبوں کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ۱۹۳۶ء کے مینی فسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فسٹو منظور کیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ یہ مینی فسٹو ادبی سے زیادہ سیاسی تھا اور اس میں ملکی و بین الاقوامی ادبی صورتحال کے بجائے ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورتحال کے حوالے سے ترقی پسند ادیبوں کو کھل کر ترقی پسند قوتوں کا ساتھ دینے پر زور دیا گیا تھا۔ آزادی کی طویل جدوجہد، تحفظ بنگال، مختلف عوامی تحریکوں میں ترقی پسند ادیبوں نے جو رہنمایانہ رول ادا کیا تھا اس کو ناکافی سمجھ کر یہ کہا گیا کہ۔

"عمومی طور پر اس زمانے کے ترقی پسند ادب کی خاص کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے پوری طرح عام جنتا سے اپنا رشتہ نہیں جوڑا جس کی رہنمائی ہندوستان کا مزدور طبقہ کر رہا ہے۔ آج بھی ایسے تخلیقی ادب کی کمی محسوس ہوتی ہے جس میں مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی جھلک ہو۔ اسی لئے ادبی تنقید ان مختلف رجعت پرست رجحانات کو ختم نہ کر سکی جنہوں نے صحت مند عوامی ادب کی ترقی میں رکاوٹ کا کام کیا۔ ترقی پسند ادیبوں نے کبھی کبھی رومانی اور رجعت پسند ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتہ بازی کی ہے اور ابھی تک خود ترقی پسند ادب پر کافی تنقید کو فروغ نہیں دیا جا سکا ہے۔"

دراصل یہ مینی فسٹو ان سیاسی حالات کی پیداوار تھا جس سے جنوبی ہند میں بائیں بازو کی تحریکوں کو دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے باوجود زیادہ تر ترقی پسند ادیب چونکہ اسی پارٹی سے

سے وابستہ تھے اور نتیجتہً "اسٹالن" کی انتہا پسندی کے اسیر تھے۔ انجمن کو بھی انتہا پسندیوں میں الجھا دیا۔ ایک طرف تو ملکی سیاسی صورتِ حال تھی تو دوسری طرف بین الاقوامی سیاسی صورتحال۔ ہندوستان میں مینی فسٹو ترتیب دینے والوں سے یہ غلطی بھی ہوئی کہ انہوں نے شمالی ہندوستان، اس کے ادیبوں خصوصاً اردو ادیبوں کے حالات، ان کے جذبات کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ بدقسمتی سے ان تمام کمزوریوں، کوتاہیوں یا انتہا پسندیوں کی ذمہ داری سردار کے سر عائد کر دی گئی یا احتشام صاحب پر سچی بات تو یہ ہے کہ انجمن سے وفاداری نے ان دونوں حضرات کو وہ ذلیل و خوار کیا ہے کہ کچھ نہ پوچھیے۔ ورنہ ایسا کچھ نہ تھا کہ سردار کو ان انتہا پسندیوں کی خبر نہ تھی۔ میں مثال کے طور پر ان کی کتاب 'ترقی پسند ادب' ہی سے ایک طویل اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ ملاحظہ ہو۔

> "اسی دوران میں جہاں ترقی پسند تحریک نے ترقی کی وہاں اس کی ایک کمزوری بھی بڑی شدت سے ابھری۔ سنہ ۱۹۴۸ء - ۴۹ء تک تحریک میں ایک طرح کی انتہا پسندی اور تنگ نظری آ گئی۔ یہ ابتدا سے ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی لیکن اس نے اتنی شدت اس سے پہلے کبھی اختیار نہیں کی تھی۔ ہر اس تحریک یا فلسفہ میں تنگ نظری اور انتہا پسندی پیدا ہو چکنے کا امکان رہتا ہے جسے مشکل حالات میں جدوجہد کرتے آگے بڑھنا پڑتا ہے (اس سے حالی اور سر سیدؒ کی تحریک بھی پاک نہیں تھی) ایک ایک قدم پر صحیح اور غلط نظریات کا جائزہ لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور ذرا سی لغزش تنگ نظری اور انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ترقی پسند تحریک کی ابتدا میں ایسے ماضی پرستوں کا مقابلہ کرنا پڑا جو ماضی کی تمام سڑی روایات کو گلے سے لگائے ہوئے تھے اور کھوکھلی قسم کی ہیئت پرستی میں مبتلا تھے جس کا اظہار وہ 'خوش مضامین' یا غزل کی صنف میں کرتے تھے۔ اس کے ردعمل نے بعض ترقی پسند ادیبوں میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دی اور اس جھنجھلاہٹ میں انہوں نے ماضی کی غیر جمہوری اور بیمار روایات ہی سے نہیں بلکہ بعض صحت مند روایات سے بھی بغاوت کا اعلان کر دیا اور اسے انقلاب اور ترقی کا نام دے دیا۔ مثلاً اختر رائے پوری اور احمد علی نے ٹیگور، اقبالؒ کے تمام کارناموں کو مسترد کر دیا حالانکہ اختر رائے پوری ان ادیبوں میں ہیں جنہوں نے اردو تنقید کو عملی اور سائنٹیفک بنیادیں عطا کرنے میں پہل کی۔ لطف یہ ہے کہ مجنوں گورکھپوری بھی جنہوں نے ترقی پسندوں کو اس غلطی سے بچانے کی کوشش کی خود اس غلطی سے نہ بچ سکے۔

> ایک طرف تو انہوں نے یہ لکھا کہ "دوسری بات جو بعض غلط اندیش ترقی پسندوں میں ہم کو ملتی ہے یہ ہے کہ وہ ترقی کا غلط تصور رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ماضی یک قلم حرفِ غلط ہے اور اسلاف کے اکتسابات ہمارے کسی کام کے نہیں۔ یہ دھوکہ ہے، روایات یعنی ماضی کے اکتسابات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کو انہیں کو لے کر آگے بڑھنا ہے ورنہ تاریخی تسلسل باقی نہیں رہ جائے گا۔ لیکن دوسری طرف انہوں نے ٹیگور اور طالسطائی کو فراری ادیب قرار دے دیا اور یہ دعویٰ کر دیا کہ "روحِ عصر نظیر اکبرآبادی کے علاوہ کسی قدیم اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔

ادب اور زندگی' پر تبصرہ کرتے ہوئے سنہ [illegible] میں 'نیا ادب' نے مجنوں کو ان کی اس غلطی سے آگاہ کیا حالانکہ خود 'نیا ادب' کے صفحات پر دوسری روایات کے سلسلے میں اس قسم کی غلطیاں ہوئی ہیں۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے اور ترقی پسند ادیبوں نے ماضی کے تمام کارناموں اور روایات سے کبھی انکار نہیں کیا ہے۔ البتہ ان کے سمجھنے میں ان سے اس قسم کی غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔ کبھی انہوں نے اپنے جوش میں صحت مند روایات سے انکار کیا اور کبھی اپنی وسعت النظری کے نام پر غیر جمہوری اور بیمار روایات کو بھی اپنا لیا۔ ترقی پسند ادب کی پندرہ برس کی تحریروں اور ترقی پسند رسائل کے صفحات سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن دلچسپ اور قابل غور بات یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کے معترضین اس کا ذکر تو ہمیشہ کرتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں نے ماضی کی اچھی روایات کو ٹھکرایا لیکن اس کا ذکر کبھی نہیں کرتے کہ بری روایات کو انہوں نے اپنایا بھی ہے اور یہ بھی اتنی ہی بڑی غلطی ہے جتنی پہلی ہے۔"

سنہ ١٩٤٨-٤٩ء کی تنگ نظری اور انتہا پسندی بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں کہ تحریک کے ابتدائی زمانے میں جب ایک طرح کا رومانی ابال تھا اس میں مختلف قسم کے رجحانات اور نظریات شامل ہو گئے جن میں بعض قطعاً رجعت پرست اور غیر صحت مند تھے۔ لیکن دس بارہ برس کے دوران میں سماجی حالات کی پیچیدگی، عوامی تحریکوں کی وسعت اور انقلابی ابال کے ساتھ ساتھ رومانیت کی جگہ حقیقت نگاری آنے لگی تھی اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تحریک میں نظریاتی صفائی پیدا ہو اور غیر ترقی پسند رجحانات اس سے خارج کیے جائیں۔ سنہ ١٩٤٧ء میں ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات سے حالات کچھ ایسے بگڑے کہ بعض ترقی پسند ادیب بھی اپنی ترقی پسندی کی راہ سے ہٹ گئے۔ مثلاً ابراہیم جلیس اور حیدرآباد کے کئی اور ادیب و شاعر رضاکار سیاست کا شکار ہو کر فرقہ پرستی پر آمادہ ہو گئے۔ کچھ تو ایسے بھی تھے۔ جنہوں نے شریفوں کے کپڑے اتار کر وردیاں پہن لیں، انہوں نے اپنے دستخطوں سے ایک بیان شائع کیا جس میں نظام حیدرآباد کی حکومت کے ساتھ اظہار وفاداری کیا گیا تھا۔ لاہور میں بھی ڈاکٹر تاثیر کی رہنمائی میں کئی ادیب اس مرض میں مبتلا ہو گئے۔ ممتاز شیریں اور صمد شاہین جو پہلے سے انحطاط کے گڑھوں میں گر رہے تھے اور جن کی مخلوط ترقی پسندی پر سجاد ظہیر نے بہت پہلے اعتراض کیا تھا۔ ایک دم سے مسلمان ہو گئے۔ ایک طرف یہ ہوا اور دوسری طرف ترقی پسند تحریک اور ادیبوں پر نئی نئی سمتوں سے حملے شروع ہوئے۔ اس دوران اس کی ضرورت پیش آئی کہ ترقی پسند اقدار کا جائزہ لے کر کھرے کھوٹے میں تمیز کی جائے۔ تحریک کے عوامی کردار کو تقویت پہنچائی جائے اور غیر جمہوری رجحانات، اقدار اور طرز فکر کو شکست دی جائے۔ یہ کام بڑی ذمہ داری اور سنجیدگی کا تھا جس میں علمی، ادبی گہرائی کے ساتھ ساتھ زندگی، سماج، طبقاتی کشمکش اور سیاست کی پوری سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی جس سے ایک قسم کا جذباتی ٹھہراؤ پیدا ہوتا۔ اس منزل پر پہنچ کر بعض ترقی پسندوں

کی تنقید نے احتساب کی صورت اختیار کرلی۔ رجحانات کا جائزہ لینے اور تنقید کے ذریعے سے نظریاتی صفائی پیدا کرنے اور اس طرح ترقی پسند ادب کو فروغ دینے کے بجائے انھوں نے یہ رویہ اختیار کیا کہ جو ادیب سو فی صد ترقی پسند نہیں ہیں۔ ان کے لیے تحریک میں جگہ نہیں ہے۔ بعض ادبی رسائل کی موقع پرستی اور رجعت پرستی پر تنقید کرنے کے بجائے انھوں نے ان کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔ اس غلطی سے ترقی پسند تحریک اور انجمن کو بہت نقصان پہنچا اور بہت سے ادیب اس سے کٹ کر الگ ہو گئے۔"

اقتباس اور بھی طویل ہو جاتا اگر میں نے درمیان سے غزل کے سلسلے کے بیانات نہ نکال دیے ہوتے۔ اس اقتباس سے میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس زمانہ میں ترقی پسند تحریک اور خود اُن پر جو الزامات عائد کیے گئے وہ خود بھی اُن سے اچھی طرح واقف تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر انھوں نے خود ایسے مضامین کیوں لکھے جس سے ترقی پسند تحریک پر ادعائیت کے الزامات عائد کیے جا سکیں۔ سچی بات تو یہی ہے کہ وہ زمانہ ترقی پسند تحریک اور اس کے رہنماؤں کے لیے بڑا ہی سخت تھا۔ ایک طرف حکومت کی چیرہ دستیاں دوسری طرف معترضین کا چو طرفہ حملہ۔ دشمن تو دشمن تھے دوستوں نے بھی تیور بدل لیے تھے۔ بس گنے چنے چند ہی لوگ تھے جنھیں ایک طرف تو تحریک کی حمایت کرنی تھی تحریک سے وابستہ اچھے اور برے ادیبوں کی پشت پناہی کرنی تھی۔ ترقی پسند نظریات کو واضح کرنا تھا، نوجوان ترقی پسند ادیبوں کی تربیت کرنی تھی اور اپنے حقوق کے لیے جھوجھتی عوام کے زخموں پر پھاہا رکھنا تھا اور جب تک کوئی دوسری کانفرنس نہیں ہو جاتی تھی اس وقت تک بھمڑی کانفرنس میں کیے جانے والے فیصلوں اور منظور کیے جانے والے دستور کی حمایت کرنی تھی۔ ذرا غور کیجیے کہ ایک یا دو آدمی پر اگر یہ تمام ذمہ داریاں عائد کر دی جائیں تو اس کی حالت کیا ہوگی۔ بھمڑی کانفرنس کے بعد سے مارچ ۱۹۵۳ء میں دہلی میں ترقی پسند ادیبوں کی چھٹی کل ہند کانفرنس کے منعقد ہونے کے درمیانی سالوں میں سردار یا احتشام حسین کی تحریروں میں پائی جانے والی اس طرح کی تمام کج رویاں دراصل انجمن سے وفاداری بشرط استواری کا نتیجہ تھیں اور ان کو انہی حالات کے پس منظر میں پڑھنا چاہیے۔ سردار جعفری کی کتاب دسمبر ۱۹۵۰ء اور ستمبر ۱۹۵۱ء کے درمیان لکھی گئی اور اس طرح ترقی پسند ادب اور تحریک پر ایک بہت اچھی کتاب وقتی مصلحتوں کی نذر ہو گئی۔

بہرحال تب سے اب تک ترقی پسند ادیبوں کی تحریک بہت سارے نشیب و فراز سے گزر رہی ہے۔ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ہم ادیبوں کو ہمیشہ ان کا ساتھ اور ان کی رہنمائی ملتی رہی ہے۔ اس وقت اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی جو کل ہند انجمن ہے، سردار اس کے صدر ہیں۔ ان کے پرچہ "گفتگو" نے سخت سے سخت دنوں میں بھی ترقی پسند نظریات وادب کی ترویج کا کام بخوبی انجام دیا ہے۔ جو متفرق مضامین انھوں نے ادب کے مختلف موضوعات، کلاسیکی اور جدید شعرا پر لکھے ہیں اس سے ان کے عمیق مطالعے اور دروں بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں آخیر میں ان کے انگریزی مضمون سے ایک اقتباس پیش کر کے اس مضمون کو یہیں ختم کرنا چاہوں گا۔

مشرّف عالم ذوقی

بھیڑ میں تنہا تنہا کوئی......

وہ بڑا قدآور شخص ہے

وہ باغی ہے ۔

وہ انقلابی ہے ۔

بار ہا اس کی مٹھیوں میں لفظوں کے ایسے پتھر قید دیکھے ہیں جو رہائی پائے تو لال قلعہ سے نکل کر جیل کی سلاخوں میں قید ہو گئے ۔ وہ انقلابی ہے مگر سلجھا ہوا ہے کہ آنکھیں فرعون کی طرح پتھر نہیں ہیں بلکہ ماں کا سا معصوم دل رکھتی ہیں ۔ ..... جذبات میں بچوں کی سی نرمی ہے ...... خیالات میں ایسی تمازت کہ پتھروں کا لہو بھی بند توڑ کر بہہ جائے ۔ معاشرے کی نارسائیوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے بارہا اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو دیکھے ہیں ...... جو لہو بہے تو ہمالیہ کا دل بھی سسکیوں سے گونج اٹھا ...... اور ڈسکو انڈیا کی میوزک ماتمی دھنوں میں تبدیل ہو گئی ...... کہ ٹھہرو ...... ٹھہرو ...... غفلت کی گونگی سانسیں نہ لو ...... آرام کے بستر پر چبھ رہے کانٹوں کو بغور دیکھو اور ہوش کی دوا کرو ...... وہ سارے سازنگی چلا آتا ہے ...... ہونٹوں پر بلا کی معصومیت لئے ...... درد، کرب کا مشترکہ چہرہ لئے ...... جذبات کی ابلتی ہوئی بھٹی کی طرح تمہارے درمیان آکر بیٹھ جائے گا ۔ تمہاری تبدیلیوں کے خمار کو محسوس کرے گا ...... پھر رو دے گا ...... بچوں کی طرح ...... آؤ ...... آؤ ...... اسے تسلی دو ......

وہ بڑا قدآور ہے ۔

وہ باغی ہے ۔

وہ انقلابی ہے ۔

مگر ...... وہ ہمارا ہے ...... وہ ہمارے درمیان کا ہے ......

اور پھر آنکھیں بس اسی پر مرکوز ہو گئی ہیں ۔ اپنے بالوں میں انگلی پھیرتا ...... آواز کی گرمی کے ساتھ ...... قبیل والوں کے پیروں سے ٹپکتے ہوئے لہو دیکھتا ہے ...... لمبی سانس کھینچتا ہے ...... آہ ...... دوستو! فرق کچھ بھی نہیں ...... کچھ بھی نہیں ......

زندگانی ہے کہ شمشیر برہنہ جس کی
دھار پر چلتے ہیں ہم
اور ہر قطرۂ خوں دل میں
اپنے قدموں کے نشاں چھوڑتے ہیں۔
دوڑ تک جاتا ہے قطروں کا جلوس
خواب گل رنگ بہاروں کی ردا اوڑھے ہوئے
(سردار جعفری کی ایک نظم)

میں خاموش ہو گیا ہوں۔۔۔۔

ایک فرشتہ زمین پر آتا ہے۔۔۔۔ ہمارا درد بانٹنے۔۔۔۔ ہمارے دکھوں کو سمجھنے۔۔۔ ہماری مرہم پٹی کرنے۔۔۔۔ اور پھر کوئی اندر لمبی سانس لیتا ہے۔۔۔۔ ایک آہ بھر کر سوال کرتا ہے۔

"میرے پیارے دوست ذوقی! تم نے کبھی حادثوں کو آدمی کی شکل میں دیکھا ہے؟"

سوال سن کر کچھ دیر کے لئے میں چپ لگا گیا ہوں۔ کیا بولوں؟ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ محلے میں روز روز ہونے والے ہنگاموں کو کون سا نام دوں؟ ۔ شہر میں ہر روز ہو رہے فساد کو کس نام سے پکاروں؟ بس چپ لگا بیٹھا ہوں کہ حادثوں کی یورش نے زخمی کر دیا ہے دوست! بولوں تو کیا بولوں۔۔۔۔ دل زخمی ہے۔۔۔۔ اندر کے سارے زخم مواد بن کر باہر تو آنا چاہتے ہیں۔۔۔ پر ڈر لگتا ہے، شارع عام پر ہو رہے پتھراؤ سے۔۔۔۔

آؤ پیارے دوست۔ باقی ماندہ زندگی کے نام پر تشنہ لب سہی ہی۔۔۔۔ حادثے میری زندگی میں طوفان بن کر داخل تو ہو سکتے ہیں مگر شارع عام پر ہو رہے پتھراؤ سے ڈرا نہیں سکتے۔۔۔۔ ہو سکے تو میرا ہاتھ بن جاؤ۔۔۔۔ اور میری آنکھ کی سرنگ میں داخل ہو جاؤ ۔۔۔۔ جہاں ظلم کے نام پر ہونے والی عبادت کو۔۔۔ اپاہج چہرے بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔۔۔۔

ساری باتیں معمہ ہیں نا!
اور ہم تو خود معمہ ہیں۔۔۔۔
جب تک حل نہ ملے، معمہ کہہ ڈالو۔۔۔ آنے والی ساعت کا انتظار ہے۔۔۔۔۔

اگرچہ دست جنوں شی بہت ہے تیرہ و تار
لباس نور میں صبح نو آئے گی۔۔۔
(سردار جعفری کی نظم)

ہاں ہاں۔۔۔۔ میں اس نئی ساعت کا منتظر ہوں۔۔۔۔
میں نے اسے دیکھا نہیں مگر جانا ہے۔۔۔
میں اس میں گم ہو کر مکمل آدمی کی پہچان کر رہا ہوں۔

اور وہ دیر سے ایک ہی منظر دیکھے چلے جا رہا ہے۔ بالوں کی لٹ ایک جھٹکے سے پیچھے چلی جاتی۔۔۔ پھر گھنے گھنے بالوں میں

مشرف عالم ذوقی

صبح نو کو آنا ہے ...
انگلی پھیرتا ..... لہو رنگ مناظر میں گم ہوتا ہے آنکھوں کی چمک کبھی ماند پڑتی ہے ... پھر لہراتی ہے ...
صبح نو کو آنا ہے ... گھنگھرالے بالوں میں گمبھیرتا کے باوجود چہرہ تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح معطر لگتا ہے۔ شکستہ سی مسکراہٹ کے
درمیان پاؤں سے ٹپکتے لہو کو دیکھتا ہے ... پھر رفیقان کے ظلم و ستم پر نگاہ جاتی ہے ... جنہوں نے پیروں کے نیچے کانٹے بچھا رکھے
ہیں پھر وہی اپنے بالوں میں انگلی ڈالنے کا عمل ... آہستہ سے لب ہلتے ہیں ...

عدو کی تیغ ستم سے مقابلہ ہے ابھی
بھلائے ظلم رفیقانِ کم عیار بھی

گر جاؤ گے کہاں ----؟

تم نے حادثہ دیکھا ہے ---؟ محسوس کیا ہے ---؟

حادثوں کو آدمی کی شکل میں دیکھا ہے ---؟

آدمی تو حادثے کی شکل میں سرزد بھی ہو سکتا ہے جہاں دنیا بھر کی معصومیت کے اندر کمزور
اور میں محسوس کر رہا ہوں .....
ستائے لوگوں پر نظر اٹھے تو وجود خود بھی مزدور بن جائے ... پھر چہرے پر یاس بھری لکیریں روشن ہو جائیں۔ جسم گھائل محسوس ہو ...
سہمے ہوئے جسم کے دوار پر ظلم کے نام پر چند سکے بے رحمی سے سنے ہوں ... پھر سردار کی آنکھیں ان کے وجود میں اترتی چلی جائیں ...

انہیں سے پھول کھلیں گے لہو لہان ہیں پاؤں
ابھی تو راہِ طلب میں بہت ہیں خار چلو ....

آنکھیں بلاوجہ نم نہیں ہوتیں .... اندر کے جذبات آدمی کو لوٹ لیتے ہیں۔ مجھے یاد آیا۔ دو سال پہلے میں ایک خوبصورت کہانی
"پردیسی کیمپ" لکھ رہا تھا ..... اس کے ایک دن پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے سامنے اس کیمپ کے کچھ لوگ آکر کھڑے ہو گئے۔ ایک
بچہ تھا۔ ایک جوان لڑکی تھی۔ ایک جوان لڑکا تھا۔ اور ایک بوڑھا تھا۔ چیتھڑے، پھٹے لوگوں کی جماعت بے منزلی کا نوحہ کر رہی
تھی۔ کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

یہ سر پھرے ہوئے لوگ کہاں جائیں گے
کچھ بن پائے گا ان کا ؟
یہ حقارت، نفرت شاید ہمیشہ باقی رہے گی ؟ —

ان کے کرب، درد کو محسوس تو ضرور کیا ...
میں ہمیشہ　رہا ہوں۔ ان کے مواد کے اندر داخل تو نہ ہو .....
مگر صبح نو کا خیال نہ رہا ..... کہ میں کہہ سکوں ..... میرے دوستو اپنے سڑے ہوئے اعضا کے ساتھ گھبراؤ نہیں۔ کچھ عادتوں میں ڈھلو
..... کچھ عادتوں کو توڑ کر آگے بڑھو ..... اس لیے کہ مذہب سے بلند قد کا آدمی تمہارے درمیان ہے ... جس سے آدمی کی شناخت کی
جاتی ہے .... آدمیت کا وہ پہلو تمہارے اندر ہے ... پہچانو ... جاگو ... اور پھر لگا ... نیند میں لیٹا ہوا ہوں ..... سر دلبر مجھے
جگا رہے ہیں .....

سوادِ منزلِ جاناں قریب ہے شاید
مثالِ بادِ صبا ہو کے بے قرار چلو

کارواں گزر گیا ہے ..... دور دور تک دھول ہی دھول بکھر گئی ہے۔ ایک فلسفی کا چہرہ ان دھواں دھواں مناظر سے یوں روشن ہوتا ہے —

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

سردار!
سچ ہے ..... بڑھتی ہوئی ایجادوں نے اپنے قد مختصر کر دیئے .....
کتنے کارواں گزر گئے ..... ہمیں کتنے کے نام ذہن میں یاد رہے .....؟
یہ کیسی بے حسی ہے کہ ہر شخص بھولنا چاہ رہا ہے ..... ہر شخص گزرے ہوؤں کو بھولتا جا رہا ہے ..... یاد کا کوئی باب اب دل کے زینے میں نظر آتا ہے ......

سردار!.. خلا میں جلتی بجھتی روشنی کے درمیان "ماں، انسان" کے خالق کا چہرہ دیکھ رہا ہوں ... آہ دل ایک بار پھر کرب سے پھٹ گیا ہے ... کیا پُر کیف شخص ہے ... اور کیا گا رہا ہے ..... ؎

"لب اگر نہیں ہلتے ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشان بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں صبح کی اذان بن کر..."
اور میں دیکھ رہا ہوں.....
سردار کا چہرہ فکر سے سلگ رہا ہے ...

کارواں خاموشی سے آہستہ آہستہ پھر آگے بڑھ رہا ہے ... کتنے سوال ہیں جو کارواں کی پھٹی ہوئی قنات کے درمیان روشن ہیں ...... آمارد ...... امارد .. یہ بے حسی کا ملبوس ...... جہاں آدمی کے نام آدمی کی آنکھیں گیلی نہ ہو سکیں ...... یادوں کو اپنی زندگی کا جز بناؤ ..... ایک اہم حصہ دو ..... گویائی سے محروم ہونٹوں کو شریکِ سفر بناؤ ...... کہ صبح کبھی تو آئے گی ......

فرازِ شوق سے اترے گی آبجوئے کلام
لبوں پہ پھیلے ہوئے زنگِ آرزو مندی
نہ جانے کتنے خداوندگانِ دودِ سیاہ
پناہ مانگیں گے لفظوں کی تیز کرنوں سے
سحر کی زد میں ہے ایوانِ شب خداوندی
اگرچہ دشتِ خموشی بہت ہے تیرہ و تار
لباسِ نور میں صبحِ نوا اب آئے گی ۔　　　(سردار جعفری کی ایک نظم سے)

مشرف عالم ذوقی — جعفری — بھیڑ میں تنہا تنہا کوئی...

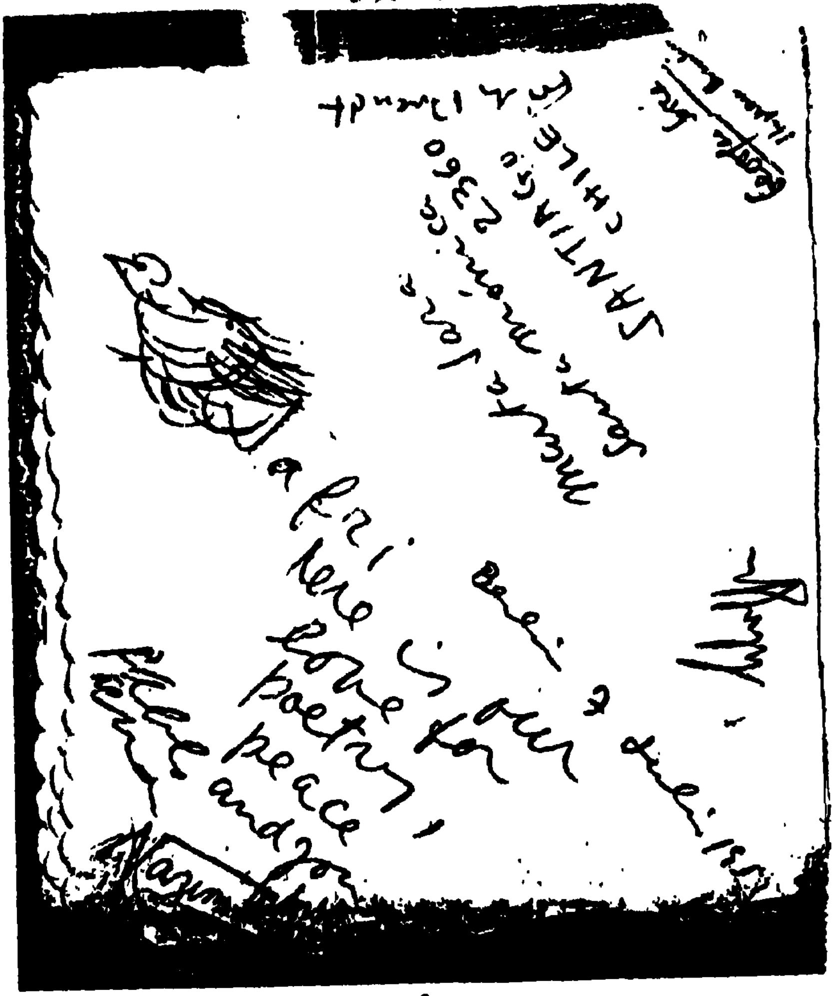
کارواں کے ہونٹوں پر اچانک ایک شکستہ مسکراہٹ طلوع ہوئی ہے...... آسمان پر شفق کی سرخی بکھر گئی ہے ----
گھبرائیے نہیں..... سورج جلد طلوع ہوگا...... بھیڑ میں تنہا تنہا کسی چہرے پر سب کی نگاہیں رک گئی ہیں ----
اور وہ شخص ان سب سے الگ دیر سے اپنے گھنے بالوں پر انگلی پھیرتا چلا جا رہا ہے ۔

کوئی سردار کب تھا اس سے پہلے تیری محفل میں
بہت اہل سخن اٹھے بہت اہل کلام آئے

پابلو نرودا اور ناظم حکمت کا پیام محبت

سردار جعفری کے نام

برلن سے جولائی ۱۹۵۲ء



افضال احمد

ترقی پسند ادب اور سردار جعفری

ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں جو صدق دل سے سمجھتے ہیں کہ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی وہ تحریک جس کا آزادی سے پہلے پورے برصغیر میں طوطی بول رہا تھا اب یکسر ختم ہو چکی ہے۔ بھارت میں ترقی پسند ادب کے مخالفوں کے امیر الامراء جناب گوپی چند نارنگ پاکستان آتے تھے تو وہ بھی یہ خوشخبری بڑی دھوم دھام سے سناتے گئے تھے۔

مگر کیا وہ تحریک جس کا ٹنٹ اشرنو دنارنگ جی آج بھی مانتے ہیں واقعی ختم ہو چکی ہے؟

ترقی پسند ادب کے ان چند سرکردہ گروہوں میں سے جو ماشاءاللہ آج بھی زندہ و سلامت ہیں ایک علی سردار جعفری ہیں۔ وہ بھی کئی بار پاکستان آ چکے ہیں۔ ایک بار جب میں نے ان سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اس مناقبی کی بابت پوچھا تو انہوں نے اس کی صاف تردید کر دی اور نہایت مضبوط اور معتبر لہجے میں کہا کہ نہیں۔ ترقی پسندی کی وہ تحریک آج بھی موجود ہے فقط اتنا ہے کہ بدلے ہوئے وقت کے لحاظ سے اس نے اپنی رفتار بدل لی ہے اور اسی کی مطابقت سے اپنا ایک نیا لہجہ بھی پیدا کر لیا ہے۔ سچ پوچھیے تو وہ آج پہلے سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔

نہ صرف یہ کہ بے شمار نئے نئے ادیب و شاعر ہر طرف بکھری ہوئی پسماندگی، بدصورتی اور غلاظت کے خلاف اور اس بدحالی، قبح اور گندگی کو انسانیت پر مسلط کیے رکھنے کی سازش کے خلاف ڈٹ کر لکھ رہے ہیں بلکہ تحریک کے بزرگ رہنما بھی ہر طرف دورے کرتے رہتے ہیں اور نئے ساتھیوں کا دل بڑھاتے اور نئے ولولے پیدا کرتے رہتے ہیں۔

آج کی زندگی سے میل کھانے والی اقدار اور ان اقدار کے صحت افزا سانچوں کی تلاش ہر وقت جاری ہے نتیجتاً ایک طرف تو ادب مقامی سطحوں پر وابستگی اور پیوستگی میں اور گہرا ہو گیا ہے تو دوسری طرف ہر جانب پھیلے آفاقی اور بین الاقوامی منظر پر انقلابی رجحانات سے ہم آہنگ ہوتا چلا گیا ہے اور وہ یہ صرف اردو ادب کے بارے میں نہیں کہہ رہے تھے۔

علی سردار بتلاتے ہیں کہ تحریک کو جہاں سے انجمن ترقی پسند مصنفین نے چھوڑا تھا وہیں سے افریشیائی مصنفوں کی انجمن نے سنبھال لیا ہے اس طرح اس تحریک کو کچھ لو کچھ دو کی ہمہ جہت دولت آفرینیوں نے اچھی طرح نوازنا شروع کر دیا ہے۔ علی سردار کا خیال ہے کہ آزادی کے بعد یہ تحریک کمزور ہو جانے کے بجائے اپنی اپیل میں اور بھی طاقتور ہو گئی ہے اور اس کا دائرۂ تاثیر بھی بڑھ گیا ہے۔

ویسے عام طور پر خیال تو یہ کیا جا رہا تھا کہ آزادی کے فوراً بعد اس تحریک کو ایک زوال سا آ گیا تھا کیونکہ اس وقت تک

کے سارے جانے پہچانے حوالے خبط اور غت بود ہو کر رہ گئے تھے اور ترقی پسندوں کی سمجھ میں یہ آنا بند ہو گیا تھا کہ اب کدھر کو جائیں منزل سر ہو چکی تھی اور مقصد حاصل، آزادی مل چکی تھی اور یہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اب کیا کریں۔

ان کی قطب نمائی تو شاید اب بھی ان کے پاس ہی تھی لیکن جس بند گلی میں یہ آ پہنچے تھے وہاں تمام مقناطیسی سوئیاں بے سمت ہو کر ڈانوا ڈول ہونے لگی تھیں۔ اگلی منزل کا احساس تو درکنار اب تو ان کو سمت کا بھی اندازہ نہیں رہ گیا تھا۔ شاید صرف فیض کے پاس ایک نگاہِ بصیرت بچی تھی "کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں۔"

کم سے کم مجھ جیسوں کا تو یہی خیال تھا۔

لیکن اگر جیسا سردار کہہ رہے ہیں ان ترقی پسندوں نے اب اپنے آپ کو بہتر بنا لیا ہے اور ان میں خود سردار جیسے جید ادیب اور شاعر بھی شامل ہیں تو یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ پھر بھی اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ بحالی کے اس عمل میں جتنا وقت لگا اس میں اس زوال پرستی کی بن آئی جس کو اس وقت تک بارہ پتھر باہر کیا ہوا تھا اس نے میدان خالی پایا تو بڑی جشن سامانیوں کے ساتھ ہر طرف گھس پڑی۔ اب کے اس نے یہ بھیس بدلا ہوا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں جدیدیت اور اسی قماش کے دوسرے رجحانات کا علم تھا۔

لیکن جدیدیت کی اس گھن گرج والی یورش میں بات ایسی گئی بیتی بھی ہو کر نہیں رہ گئی تھی اور شاید سردار کا خیال ٹھیک ہی ہے، خود ہمارے پاکستان میں بھی جہاں ان کے بھارت جیسے سازگار حالات نہیں ہیں تبدیلی کے دو ایک جھونکے آتے تو محسوس ہوئے ہیں، سمجھداری کی آوازیں بھی بعض بعض اطراف سے اٹھتی سنائی دینے لگی ہیں خود جدیدیت کی تحریک میں بھی اصلاح کا ایک عمل سا ہوتا نظر آتا ہے، گو اس کو کسی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا کم سے کم ابھی تو نہیں۔ دانشوروں اور ادیبوں، شاعروں کو ایک بار پھر اپنے آس پاس برپا معاشرہ نظر آنے لگا ہے اور یہ بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ اس معاشرے کو انسانوں کے لیے پوری طرح خوشگوار نہ سہی تو کم از کم قابلِ برداشت ہی بنا لینا ضروری ہے، وفا نا آشنا انفرادیت پسندی اور معاشرے سے قول ہاری ہوئی بے لوثی کے درمیان ایک ٹکراؤ بس ہوتا ہی نظر آتا ہے۔

مگر سردار کہتے ہیں کہ یہ ٹکراؤ ختم ہی کب ہوا تھا، یہ تو سلسلہ ہے، انہوں نے وضاحت کی کہ تاریخ کے ہر موڑ پر ایسی قوتیں ہوتی ہیں جو زندگی کو واپس گھسیٹ لے جانا چاہتی ہیں، لیکن زندگی ہر لحہ ارتقا پذیر اور آگے کو رواں دواں ہے اور گو رجعت اس پیش قدمی کو جس قدر ہو سکے ملتوی کرانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتی ہے، زندگی کے کارواں کو کوئی روک نہیں پاتا جو لوگ حق آشنا ہوتے ہیں ان کی مستعدیاں اس رجعت قہقری کو ہراتی رہتی ہیں۔ ترقی پسند تحریریں بھی اسی قسم کی مستعد کاوشیں ہیں، یہ تحریریں زندگی کو خود تاریخ کے ارتقائی دھارے سے پرے ٹلے رکھنے میں مدد ہوتی ہیں۔

میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا تو اس پرانے شاعر، ادیب اور نقاد نے بڑی شد و مد سے تردید کی کہ ترقی پسند ہونے کے لیے کسی طرح بھی مارکسی ہونا ضروری ہے، انہوں نے کہا کہ یہ ترقی پسندوں کے خلاف ایک رکیک پروپیگنڈا ہے۔

تمام ترقی پسند جن میں ترقی پسند ادیب، شاعر اور دانشور بھی شامل ہیں ساری دنیا کے لیے ایک چین اور پر سکون زندگی کا خواب دیکھتے ہیں، وہ سب ہی کے لیے مادی اور روحانی دولتوں اور مسرتوں اور جمہوریت اور جمہوری آزادیوں کی تمنا میں مرمٹنے کو تیار ہیں، وہ سامراج، جاگیرداریت آمریت اور ہر طرح کی پس ماندگی کے خلاف ہیں۔ وہ ہر طرح کے ظلم، استحصال اور محرومیوں

کے خلاف علم جہاد بلند کیے ہوتے ہیں۔

سردار نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ مارکسی بھی یہی سب چاہتے ہیں لیکن ان قدروں پر ان کا کوئی اجارہ نہیں۔ معاشرے کے دوسرے ارکان بھی ان حیات بخش اقدار کے حصول کے متمنی ہیں بلکہ سچ پوچھیے تو یہ دوسرے عناصر ہی اکثریت میں ہیں۔

آج کل جو افسردگی اور شکستہ دلی کے جدیدیت پسند رجحانات ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے سردار جعفری نے کہا کہ ترقی پسندی کے لیے حضرت انسان کے روشن مستقبل پر ایمان لانا لازمی ہے اور جدیدیت پسند افسردگی فروشوں کا موضوع انسانی تہذیب کا ایک مفروضہ زوال ہے۔

علی سردار جعفری ایک اردو ماہنامے سے بات کرتے ہوئے اس معاملے میں ذرا گہرائی تک اترے انہوں نے کہا کہ ادب میں یہ نام نہاد جدیدیت پسندی دراصل نتیجہ ہے ایک خاص قسم کے احساس بے گانگی کا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بے گانگی کوئی نئی چیز نہیں پرانے اساتذہ بھی اس کیفیت سے گذرے ہیں۔ سردار نے استاد ذوق اور مرزا غالب کے کئی اشعار مثال میں سنائے۔ ان میں سے کم سے کم غالب تو کسی طرف سے زوال پرست نہیں تھے۔

بے گانگی کا یہ مظہر اسی وقت نمودار ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنے آس پاس کے معاشرے سے کٹنے لگتا ہے۔ یہ بے گانگی کی ایک قسم ہے، بے گانگی کا ایک درجہ اور بھی ہوتا ہے، وہ ہے اپنی ذات سے کٹ جانا۔ یہ بڑی خطرناک بات ہوتی ہے۔ اس بے گانگی کے خلاف جدوجہد ضروری ہے۔

اس دوسری بے گانگی کے جڑ پکڑنے کا ایک سبب تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس کوئی بنیادی عقائد نہ رہیں اور وہ بے آدرش رہ جاتے۔ جب کسی کے پاس زندگی ناپنے کے لیے کوئی آدرش نہیں رہتا تو وہ خود زندگی ہی سے مایوس ہو جاتا ہے اسے وہ لایعنی لگنے لگتی ہے۔

آزادی بھی ایک آدرش ہے جب وہ حاصل ہو گئی تو ایک خلا چھوڑ گئی اور پھر یہ بھی ہوا کہ لوگوں نے عام طور پر یہ محسوس کیا کہ یہ وہ سحر تو نہیں جس کا وعدہ کیا گیا تھا، انہیں ایسا لگا جیسے کسی نے ان کو نیچ منجدھار دغا دے دی ہے، ان کے ذہن و دماغ پر شدید حزن اور مایوسی نے قبضہ کر لیا اور وہ مجموعی اس بے درد ماحول ہی سے کٹ کر قطعی بے گانہ ہو گئے اور جب بھارت میں گاندھی اور نہرو جیسے مہاپرش اور پاکستان میں جناح جیسے عظیم قائد رخصت ہو گئے اور ان کی جگہوں کو پر کرنے والے کوئی سامنے نہ آئے تو فضا کچھ اس سے زیادہ ہی تاریک نظر آنے لگی جتنی سچ مچ تھی۔

اس نازک مرحلے پر دساور سے درآمد کیا ہوا ایک زہر دیدہ و دانستہ ہمارے ذہنوں میں پیوست کیا جانے لگا اور یہ زہر تھا زندگی اور ادب سے وفا ناشناسی اور ناوابستگی کا۔ یہ بات نہایت منظم طریقے پر فروغ پا گئی کہ ادب کا کوئی مقصد ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے وفا نبھائی جائے۔

اگر سردار چاہتے تو وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ یہ نیا زہر " ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی " کی پرانی اور نہایت معروف شکل میں نہیں آیا۔ اب تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بھئی ادب اور زندگی کی یہ بحث تو کبھی کی باسی ہو چکی۔ یہ آج کا موضوع نہیں چنانچہ اب یہ لوگ کھل کر ادب برائے آرٹ کی تبلیغ بھی نہیں کرتے یہ تو صرف اتنا کہہ کر اپنا الو نکالنا چاہتے ہیں کہ آپ زندگی سے حاشا و کلا کبھی سنجیدہ نہ ہوں بلکہ آرٹ اور ادب وغیرہ سے بھی وفا نبھانے کی کوئی بات نہ کریں۔

بے گانگی کی بات کرتے ہوئے سردار جعفری نے اسے تین اقسام یا تین درجوں میں پایا۔ پہلا تو انہوں نے کہا کہ بے گانگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ادب اسی احساس کی پیداوار ہے۔ یہ ہر عہد میں موجود رہا ہے، تقریباً ہر شاعر اور ادیب اس سے کبھی نہ کبھی دوچار ہوتا ہے، سردار جعفری جیسا شاعر بھی۔

دوسری قسم کی بے گانگی وہ ہے جس میں آدمی ڈوب کر رہ جاتے، یہاں انسان خود اپنے آپ سے بھی کٹ کر رہ جاتا ہے۔ اس قسم کی بے گانگی میں آدمی کیڑے مکوڑوں سے بہت نیچا ہوتا، بلکہ وہ کہتا بھی یہی پھرتا ہے کہ "جناب والا انسان کی نجات کا کوئی دروازہ کھلا نہیں۔ انسان اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، وہ ایک گندی دلدل میں بے حس پڑا ہے اور خود اپنا قاتل ہے، اور اپنا مقتول بھی آپ ہی ہے۔ وہ اب بے نام و نشان ہے۔ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے۔

لیکن بے گانگی کی ایک تیسری قسم بھی ہے اور یہ خود بے گانگی کے احساس اور اس کی پہچان کے بعد آتی ہے، دراصل یہ خود اس مرض کے خلاف ایک عظیم جہاد ہے۔

بے گانگی کے خلاف اس عظیم جد و جہد مسلسل سے عظیم ادب پیدا ہوتا ہے یہیں آدمی اس رشتے کو دریافت کرنے کی سعی کرتا ہے جو ایک طرف تو انسان اور کائنات کے درمیان تھا اور دوسری طرف فرد اور معاشرے کے مابین ہے، اسی رشتے کی تلاش ادیب اور شاعر کا منصب بھی ہے اور فریضہ بھی۔

القصہ سردار جعفری کا پیغام ہمت اور امید اور روشنی کا پیغام ہے۔

انہوں نے ایک مرتبہ "بلوچی دنیا" ملتان کے مدیر چاکر خان بلوچ کے بیٹے مہران خان بلوچ کو ایک آٹوگراف دیا تو یہ شعر بھی لکھ دیا۔ مہران خان اس وقت صرف ساتویں جماعت کا طالب علم تھا، لیکن علی سردار جعفری کا شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

"نگاہیں منتظر ہیں اک خورشیدِ تمنّا کی
ابھی تک جتنے مہر و ماہ آئے ناتمام آئے"

یہ نہ صرف آنے والی نسلوں کی ایک عمدہ ہمت افزائی ہے کہ وہ اپنے ایام کا سورج بنیں۔ بلکہ شاعر کا جو مضبوط اعتماد، مستقبل کی نسلوں پر ہے وہ بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ بات جدیدیت کے افسردگی فروشوں سے کتنی مختلف ہے، مگر سردار جعفری تو مستقبل کے بارے میں سدا کے خوش فہم ہیں۔ ظلم و استبداد کے خلاف ہمیشہ شمشیر برہنہ رہنے والے مجاہد۔ وہ پہلی جنگ عظیم سے دو ہی برس پہلے یعنی ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے گویا ان کی اٹھان ہی ایک پرشور سیاسی دور میں ہوئی تھی۔ چنانچہ ان کو انگریزی حکومت سے بالخصوص اور سامراج سے بالعموم نفرت ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں یہ نفرت ان کی گھٹی میں شامل رہی ہے۔

انہوں نے ایک نہایت ناقابلِ یقین زندگی گذاری وہ بلرام پور میں پیدا ہوئے۔ بلرام پور لکھنؤ کے قریب ایک ننھا سا جاگیری تعلقہ تھا۔ پہلے پہل ان کو تعلیم کے لیے ایک دینی مدرسے سلطان المدارس میں بھیجا گیا لیکن جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ موصوف کو اس قسم کی سے کوئی لگاؤ نہیں چنانچہ جلد ہی ان کو ایک انگلش اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ ہائی اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کو دلی بھیج دیا گیا۔ وہاں انہوں نے اینگلو عربک کالج سے بی اے کیا، یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ پھر ۱۹۳۶ء میں سبط حسن اور مجاز کے ساتھ مل کر مشہور ادبی مجلہ "نیا ادب" لکھنؤ سے جاری کیا۔

ادب کے محاذ پر جہاد کرنے کے علاوہ وہ آزادی کے جہاد میں بھی بے حد سرگرم تھے، چنانچہ ۱۹۴۰ء میں گرفتار کر لیے گئے۔ یہ ان کی پہلی گرفتاری تھی۔

پتہ نہیں کہ انہوں نے جو اپنا بچپن ملرام پور کی فضاؤں میں گزارا تو وہی ان کی جاگیری قدروں سے نفرت کا سبب بنا پھر شاید یہی نفرت انہیں ترقی پسند تحریک تک لے آئی اور شاید اسی طرح جو تعلق ان کا آزادی کی تحریک سے تھا تو وہی ان کو سامراج کے خلاف ایک باشعور جدوجہد سے مضبوط رشتہ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ ▼

نسیم سیّد

لکھنؤ کی پانچ راتیں

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور پندرہ بیس ہزار کی آبادی پر مشتمل قصبہ بلرام پور کی ایک سڑک کے ساتھ سرخ اینٹوں کی قدِ آدم دیوار کا ایک احاطہ ہے جس کے دونوں طرف لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک مستعد اور چوکنے کھڑے پہرہ دے رہے ہیں۔ مہندی کی باڑھ میں سمٹی، سرخ بجری کی روش ان دونوں پھاٹکوں کو ملاتی، لہراتی بل کھاتی دور تک چلی گئی ہے۔ احاطے کے اندر گل مہر کے جھومتے درخت، ہری ہری دوب سے سجی ٹینس کورٹ، عشق پیچاں کی بیلوں سے سجا ماحول، گلاب، بیلا، چنبیلی اور موتیے سے مہکی فضا، اور ساتھ ہی سرخ بجری کی روش کے موڑ پر اس حویلی کا پھاٹک جس میں بلرام پور کی خوش قسمتی اور اردو ادب کی نیک نامی کی نوید لیے دو چھوٹے چھوٹے قدم حویلی کے صحن میں جہاں جہاں پڑتے ہیں ستارے سے ٹانکتے چلے جاتے ہیں۔ محبت سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آتے جاتے لوگوں میں وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ بھی شامل ہیں جو تتلیاں پکڑتے اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے بالی نکالتے جب قلم پکڑنے کے قابل ہوئے تو یہ

"قلم گوید کہ من شاہِ جہانم" اتنی بار تختی پر لکھا کہ ذہن پر منقش ہو گیا اور پھر ذہن نے قلم کے علاوہ کسی بڑائی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ماں باپ کی آنکھوں میں تو کوئی اور ہی خواب ہوں گے جب انہوں نے بڑے چاؤ سے "سردار" نام رکھا ہوگا، لیکن شاید تختی کی مشق کا نتیجہ تھا یا نام ہی کا اثر ہوگا کہ ننھی سی عمر سے ہی اپنے فیصلے خود کرنے کی ٹھانی۔ اور جب مذہبی اعتقادات کے پابند گھرانے نے مولویت کی تعلیم کے لیے لکھنؤ کے اسکول سلطان المدارس کا انتخاب کیا تو ان کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں اور "علی سردار" نے تین مرتبہ اسکول سے بھاگ کے گھر والوں کو یقین دلا دیا کہ اس شخصیت اور مولویت میں کوئی میل نہیں۔ اس ننھے سے ذہن کو منبر پہ بیٹھ کے وعظ دینے کے بجائے اپنی ذہانت اور یادداشت سے لوگوں کو حیران کر دینا زیادہ اچھا لگا۔ لہٰذا جب محرّم کا فرشِ عزا بچھتا اور مشہور و معروف ذاکر سبطِ حسن منبر پہ بیٹھ کے فصاحت و بلاغت کے موتی لٹاتے تو دو ذہانت سے چمکتی آنکھیں سبطِ حسن کی جگہ خود کو منبر پہ بیٹھا دیکھتیں۔ پانچ چھ سال کی عمر اور یادداشت کا یہ عالم کہ انیس کے پورے پورے مرثیے یاد ہیں۔ باپ اور چچا کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ ماں علم کے پٹکے پکڑ کے زندگی کی دعائیں مانگتیں، بہنیں نظر اتارتیں اور علی سردار

نسیم سید

... ابتدا ہی کی جڑیں اور گھنی ہو کے پھیلتی گئیں۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں شخصیت کے دو پہلو نمایاں ہوئے ... ظاہر ہیں ... اور دو اشارے فکر میں گو اب بھی انیس کے لہجے کی گونج ہے۔ لیکن موزونیٔ طبع کا یہ عالم کہ ساتھ ساتھ ... ترتیب ... ختم نہیں ہوتا گویا جذبے کی قوت اور فکر کی شاعری کا خمیر تیار ہو رہا ہے،

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے
اللہ رے حُسن فاطمہؓ کے ماہتاب کا
ذرّوں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

"علی سردار" کے اندر کا شاعر اپنی تلاش میں ہے۔ تخیّل اور تحرک مرثیے میں اپنا رنگ دکھا رہے ہیں ۔

آتا ہے ابنِ فاتحِ خیبر جلال میں...
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑوں کی ٹاپوں کی ضرب سے

بچپن کی مذہبی تربیت اور ذاکری سے رغبت نے بھی علی سردار کے اندر کے نڈر اور بے چین لڑکے کو مولوی نہیں بننے دیا، بلکہ "نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادتِ حسین تک کے واقعات نے خون میں ایک تازہ حرارت پیدا کر دی" کوئی اندر سے آواز دیتا تھا کہ حق و صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا ہی انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اردگرد پھیلی ناانصافیوں سے نفرت بڑھتی گئی۔ صدیوں سے حق کے نام پہ ہونے والے مظالم ان کے گرد سوالات کا ڈھیر لگاتے گئے۔ حالانکہ حویلی کے حسن میں دل کی انجانی دھڑکنوں کے رنگ بھی گھل گئے تھے۔ کبھی آپ ہی آپ مسکراتے، اور کبھی اس مسکراہٹ میں ہزار غم شامل ہو جاتے تباہ حال مخلوق کا غم، ہرواہوں اور ہرواہیوں کی بے زمینی کا غم، بیڑیوں سے لٹکی ہوئی، دہائی دیتی اور مار کھاتی عورتوں کا غم" یہ دنیا ایسی کیوں ہے یہ سوالات۔ دل و دماغ کی الجھن، پریشانی، دل کی وحشت بڑھتی گئی۔ اس نوجوانی کے عالم میں جبکہ عموماً جاگیرداروں کے لڑکے اپنی طاقت اور امارت کے سبب وقت سے پورا پورا اخراج وصول کرتے ہیں" علی سردار" کا دل حق و صداقت کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ کبھی مہاتما گاندھی کی "تلاشِ حق" میں سچائی نے اپنی جھلک دکھائی اور کبھی پلوٹارک کی "مشاہیرِ یونان و روما" نے سوچوں کو راستہ دکھایا۔ اسی اُدھیڑ بن میں پہلی مرتبہ نظم کی صورت میں اپنے احساسات رقم کیے۔

"خدا نہ تو غرناطہ و بغداد کے ایوانوں میں ہے، نہ امیروں کے محلوں میں، خدا جو کی روٹی میں ہے، پیوند کی چادر میں ہے۔ اور کربلا میں چمکنے والی حسینؓ ابنِ علیؓ کی تلوار میں ہے۔"

کوئی اضطراب تھا، کوئی بیتابی تھی۔ جیسے اپنے میں سانس لیتا محسوس کر رہے ہیں۔ اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دیں، ٹینس کھیلنا چھوڑ دیا، شکار ترک کر دیا، اب صرف کتابوں میں وقت گزرتا حق کے راستے اور فن کی منزلیں آسانی

...اس کے لئے بڑے دکھ ہو گئے پڑتے ہیں. علی سردار جعفری نے بھی اپنے پورے وجود کو اس اضطراب
...ل کی بانگ درا اتنی مرتبہ پڑھی کہ زبانی یاد ہو گئی۔ اسی دوران "نگار" کے کچھ پرچے کہیں مل گئے اور
...تذکرہ اس پرچے میں پڑھ کے چونکے اور ایسا لگا جیسے اچانک اندھیرے میں ایک چراغ جل اٹھا ہو...
...ار اپنے ذہن میں خوابوں کی دنیا سجاتے، الجھے، کچھ تھکے، سوالات میں گھرے، بیس برس کی عمر میں
...اس وقت علی گڑھ میں ترقی پسند تحریک کے اولین نقوش ابھر رہے تھے۔ سبط حسن، اختر حسین
...یات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور۔ نوعمر ترقی پسندوں کی ٹولی
...ہے آگ بھی، جنکے پاس خواب بھی تھے اور ان کا سلیقہ اظہار بھی، دل تھا دماغ کی دھڑکنوں میں یقین
...اور انہیں یوں لگا جیسے دل کی تنہائی میں ایک دنیا آباد ہو گئی ہو۔ علی سردار تنہا جس منزل کی تلاش میں نکلے تھے
...ب سفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ ہم خیال دوست اور رہنما کتابیں۔ دن رات انہی دو میں تقسیم ہو گئے کتابیں
...ی کوئی فہرست ذہن میں تھی اور نہ ترتیب بس جو کتاب ہاتھ لگ جاتی پڑھ ڈالتے۔ کبھی آسکر وائلڈ نے متاثر کیا
تو کبھی گوئٹے دل کو بھا گیا۔ کبھی بھگت سنگھ خون میں حرارت پیدا کرتا تو کبھی وکٹر ہیوگو اور گورکی کی انقلابی سوچ
کو اپنے اندر جذب ہوتا محسوس کرتے۔ اسی زمانے میں گوئٹے کا شاہکار "فاؤسٹ" پڑھا اور اب علی سردار جعفری
کے دل میں فکر کی حقیقی عظمت کا احساس جاگا۔ انسان اپنی ذات میں کائنات ہونے کے باوجود کچھ نہیں اگر اس
عالم موجودات سے اس کا کوئی ذہنی اور جذباتی تعلق نہ ہو۔ انسانی برادری کے دکھ درد کے رشتے مشترک ہیں۔ لہٰذا
گر غم جاناں کے سلسلے غم دوراں اور غم زمانہ سے نہ ملتے ہوں تو بات نہیں بنتی۔ بچپن میں علی سردار جعفری نے دیکھا تھا کہ ایک
برداہی نے چاول صاف کرتے ہوئے ایک مٹھی چاول اپنے منہ میں ڈال لیے تو اس کے منہ پر ایسا مکا پڑا کہ اُسے
خون کی کلی کے ساتھ چاول تھوکنے پڑے۔ اس وقت بھی ہندوستان کے تباہ حال کسان اور مزدور کے بچے ایک مٹھی
اناج کے لئے خون تھوک رہے تھے۔ یورپ میں فاشزم خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ ہٹلر نے جرمنی میں ان ادیبوں
مفکروں اور سیاست دانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا جن کی آوازیں جمہوریت کی پکار تھیں۔ عالمگیر کساد بازاری
کے سبب پوری دنیا اقتصادی بحران میں گرفتار تھی۔ ہندوستان کی معیشت اس بحران کے اثرات زیادہ گہرے تھے۔
ایک طرف معاشی بحران، دوسری طرف آزادی گفتار پر پابندی کے خطرات، ادیبوں میں اپنی سماجی ذمے داری کا احساس
شدید تر ہو گیا۔ اور سردار جعفری کی بھی انقلابی سوچ کا آتش فشاں لاوا اگلنے لگا۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

یہ نوعمر ترقی پسندوں کی آنکھوں میں صبح کے اجالے اور آوازیں زندگی کی بشارت تھی جدھر سے گذرتے
لوگ ان پر محبت کے پھول نچھاور کرتے۔ یہ طالبعلم بھی تھے اور ان کا عمل دخل سیاست میں بھی تھا۔ شاعر و ادیب

بھی تھے اور آوارہ گرد، فاقہ مست بھی۔ نطق و لب کی بخیہ گری پر فضا میں ان کے نغموں کی گونج اور بڑھ جاتی۔ کبھی سب مجاز کی آواز میں آواز ملا کے گاتے ؎

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول

تو کبھی علی سردار کے دل کی آنچ میں احساسات تپنے لگتے ؎

وہ زیرِ اُفق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیِ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اُٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

تعلیم، ادب، سیاست، شاعری، احباب، کوچۂ جاناں کا طواف، لیلیِ وطن کی آزادی کے خواب، فاقہ مستی کے دن، جیل کی مغرور دیواروں میں قید، ہیجان و اُداس دن رات... سردار جعفری کے ان تمام لمحات، تمام اوقات کی جھلکیاں ان کی تصویریں ہیں جیسے جیسے "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کے اوراق الٹیں رنگ بھرتے جاتے ہیں اور ہم پہ ان کی شخصیت کے رنگ واضح ہوتے جاتے ہیں۔

اکثر خیال آتا تھا کہ سردار جعفری نے اپنی آپ بیتی کیوں نہیں لکھی۔ ان سے ملاقات ہمیشہ اتنی مختصر رہی کہ اس سوال کا موقع ہی نہیں ملا۔ دہلی میں۔ عالمی اردو کانفرنس کے موقع پر گویا انہوں نے میرے ذہن کو پڑھ لیا اور "لکھنؤ کی پانچ راتیں" چند جملے اس کے پہلے صفحے پر لکھ کے میرے ہاتھ پہ رکھ دی، کانفرنس کی مصروفیات، دوستوں کا ساتھ کوئی گھڑی کی فرصت کی نہ تھی۔ اور کتاب کو جلد از جلد پڑھنے کی خواہش بھی بے چین کیے تھی۔ میرا ذہن قیاس آرائی کر رہا تھا۔ شاید سجاد ظہیر کی "لندن کی ایک رات" یا "شام اودھ" جیسی طلسماتی کتاب ہو، لیکن ایسا نہیں ہے۔ دراصل اس البم میں بہت سی تصویریں ایسی ہیں جن کو یکجا کر دیں تو علی سردار جعفری کی شخصیت کی تصویر مکمل ہو جاتی ہے اور قلم پکڑنے سے قلم کی سرداری تک سب کڑیاں زنجیر ہو جاتی ہیں۔

"لکھنؤ کی پانچ راتیں" کے علاوہ اگر ہم ان کی دیگر تخلیقات کا جائزہ لیں تو ان کی قلبی و ذہنی کیفیات، شاعری کی قوت، فکر کا بہاؤ، نثر کی شگفتگی و بلاغت، ان سب سے واقفیت کے باوجود یہ معلوم نہیں ہوتا کہ زندگی کے کونسے واقعات، حادثات یا نشیب و فراز نے اس ذہنی رجحان کی پرورش کی۔

سردار صاحب کی شخصیت کے یوں تو کئی پہلو ہیں لیکن بحیثیت شاعر، نقاد اور مقرر ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس شاعر اس نقاد اور اس مقرر کو جاننے کے لئے ان کی یادوں کے ان کھنڈرات میں ہی انہیں تلاش کرنا پڑے گا۔ جس کا نقشہ "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کے علاوہ ان کی کسی کتاب میں درج نہیں۔

سردار جعفری کا پہلا مجموعۂ کلام "پرواز" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ جس کا تذکرہ اب کم ہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے اب تک سردار صاحب کے نو مجموعے شائع ہو چکے ہیں "امن کا ستارہ" "نئی دنیا کو سلام" "ایشیا جاگ

اٹھا، ان کی تین طویل نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ "خون کی لکیر" "پتھر کی دیوار" "ایک خواب اور" "پیراہنِ شرر" "لہو پکارتا ہے" پانچ نظموں کے مجموعے ہیں۔

سردار صاحب کی طویل نظموں میں سب سے زیادہ مقبول اور اہم نظم "نئی دنیا کو سلام" ہے۔ یہ ایک تمثیلی نظم ہے۔ اور اس میں علامتی کرداروں کے حوالے سے عالمی پس منظر میں "عالمی امن" کی بات کی گئی ہے اور ان قوتوں اور تحریکوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جو استحصالی قوتوں کے خلاف برسرپیکار رہیں۔ اسی کتاب میں ایک مثنوی بھی "جمہور" کے نام سے شامل ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہ مثنوی کی تاریخ میں ایک نئی فکر اور نئے موڑ کا سراغ دیتی ہے۔ ہمارے ہاں عشقیہ مثنویاں تو بہت لکھی گئیں، لیکن "جمہور" سے پہلے سیاسی موضوعات پر مثنوی نہیں لکھی گئی تھی۔ اقبال نے جو سیاسی مثنویاں لکھیں وہ بلاشبہ سیاسی فکر و آگہی عطا کرتی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ فارسی زبان میں ہیں لہٰذا ان سے صرف فارسی سے واقفیت رکھنے والے ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن سردار صاحب کی "جمہور" اپنے عہد کی وہ تخلیق ہے جو مثنوی کو نئی فکر عطا کرتی ہے۔ کیفی اعظمی کی سیاسی مثنوی "خانہ جنگی" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"ایشیا جاگ اٹھا" بھی ایک طویل نظم ہے۔ یہ ایشیا کی بیداری کا رزمیہ ہے جو بہت بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔ اس نظم میں سردار جعفری کا انداز کہیں کہیں پبلو نرودا سے ملتا ہے۔ ہسپانوی زبان کے اس عظیم شاعر کے ہاں الفاظ کے ترنم میں انقلابی احساسات کی جو آنچ ہے "ایشیا جاگ اٹھا" میں بھی وہی موسیقی میں گھلی ہوئی انقلاب کی بجلیاں کوندتی نظر آتی ہیں۔ بہرحال ..... یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہے اس کی تفصیلات میں تو کوئی تنقید نگار ہی جا سکتا ہے۔ میرے قلم کو یہ مجال کہاں۔؟

سردار جعفری نے طویل نظم "امن کا ستارہ" کتھا کے انداز میں لکھی ہے اور "سنو سنو اے دنیا والو کتھا استالن کی" کہہ کے امن نظم کا آغاز کیا ہے۔ سردار صاحب نے اس نظم میں عالمی سیاست اور عالمی مزدور تحریکوں کا مطالعہ شعری انداز میں کیا ہے۔ سردار صاحب کے تمام شعری مجموعے جو کتابی صورت میں ہمارے سامنے ہیں، ان کی شاعرانہ شخصیت اور بصیرت کی تو نمائندگی کرتے ہی ہیں، لیکن ان کے اس رجحان کی کن عوامل نے تربیت کی اس کا پتہ نہیں چلتا۔

سردار صاحب کی تنقیدی بصیرت اور سیاسی شعور کے حوالے سے "ترقی پسند ادب" ان کی وہ اہم کتاب ہے جس نے ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کو نئے زاویوں سے سوچنے پر متوجہ کیا۔ ترقی پسند تحریک نے ادب اور زندگی کے گہرے تعلق پر زور دیا۔ پرانے نظریات کی زمین پر نئے تصورات، نئی فکر اور نئی حقیقتوں کی عمارت تعمیر کی سردار جعفری اس عمارت کی تعمیر میں شریک کار رہے۔ "ترقی پسند ادب" ان کے گہرے سیاسی شعور کی آئینہ دار ہے۔ انتہائی مقبول ہونے کے باوجود اس کتاب کی مخالفت بھی ہوئی۔ ادب میں اختلافات کی اپنی ایک اہمیت ہے جس کے بہت سے فائدے پہلو بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں اختلاف مخالفت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور نوبت ذاتیات تک پہنچتی ہے، حالانکہ ہر سوچنے والا ذہن اختلافی رائے رکھ سکتا ہے.... بہرحال .. اعتراض کے باوجود اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت میں کمی نہیں آئی۔

علامہ اقبال پر سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" میں جو تین مضامین ہیں۔ وہ اقبال کی شاعری کو نئے

زاویوں سے سمجھنے میں ہماری راہ نمائی کرتے ہیں۔ "پیغمبرانِ سخن" میں اردو ادب کی تین عظیم شخصیتوں یعنی کبیر داس میر تقی میر اور غالب پر مضامین ہیں جو تاریخی، تنقیدی اور تجزیاتی حوالے سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعراء کے مطالعے کا ادب میں جو ایک روایتی انداز تھا سردار صاحب نے اس سے ہٹ کر دیکھا۔ دراصل یہ منفرد اندازِ فکر ہی سردار جعفری کی تحریر کا حُسن اور ان کی پہچان ہے۔

سردار جعفری کی ان تمام تخلیقات کے ایک نظر اور مختصر جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار شناسی میں تو یہ کتابیں معاون و مددگار ہیں، لیکن یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس بڑی شخصیت کی پرورش اور اس منفرد فکر کی تعمیر میں کون سا ماحول کون سے حالات اور کیسے عوامل کار فرما تھے؟ جنھوں نے روایت کی سرتاسے اٹھاکے اس فنکار کو ادب کی سرداری کا تاج پہنا دیا۔ یہ جاننے کے لئے ہمیں "لکھنؤ کی پانچ راتیں" کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ اس کتاب کی تمہید میں سردار جعفری نے خود کہا ہے "یہ اس افسانے کے چند پریشان ٹکڑے ہیں جسے زندگی کہتے ہیں۔" ان اوراق میں بچپن، لڑکپن، جوانی، تربیت، محبت، بغاوت جیسے... زندگی کے بہت سے عنوانات کے تحت وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں جنہیں زنجیر کر دیا جائے تو "سردار کتھا" بن جاتی ہے۔

لکھنؤ کی پانچ راتیں "یوں تو سات مضامین کا مجموعہ ہے، لیکن مضمون "لکھنؤ کی پانچ راتیں" پانچ مضامین یا پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس طرح اس کتاب میں کل نو مضامین شامل ہیں۔ "جہرو ماجھی" سردار جعفری کا مشہور رپورتاژ جو کہ افسانوی انداز میں کمال خوبصورتی سے لکھا گیا ہے اور جس کا دنیا کی آٹھ دس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں شامل ہے۔ "ہم پہ ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ" ان کے ہمدم ان کے دوست مجاز کی دردناک موت کی حدیث ہے "ذوقِ تعمیر"، "گلینا" اور "خالِ محبوب اور امنِ عالم" دوسرے ممالک کے سفر کی خوشگوار یادوں کے نگار خانے ہیں۔ غرض ہر مضمون اور ہر ورق اپنے اندر وہ داستان لیے ہوئے ہے جس کے تانے بانے سردار جعفری نے اپنے بیتے ہوئے ایام سے بُنے ہیں... اس طرح جب تک سردار صاحب اپنی سوانح حیات تحریر نہ کریں "لکھنؤ کی پانچ راتیں" ہی ان تک رسائی کا واحد معتبر ذریعہ ہے۔

(کینڈا سے) ▼

اشاریے

اردو کے ممتاز نقاد **محمد علی صدیقی**

کے فکر انگیز "اشاریے"، جو کئی سال سے بطور مہمان مدیر افکار میں شائع ہو کر پسند کیے گئے۔ عنقریب کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

سردار جعفری جموں یونیورسٹی میں

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی جموں کے لیے وہ تین ماہ کی مدت ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں شعبے کی دعوت پر ملک کے نامور ادیب اور شاعر علی سردار جعفری وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں رہے۔ انھوں نے اپنے افکار سے صرف شعبۂ اُردو ہی کو نہیں بلکہ ساری یونیورسٹی اور سارے جموں کے علمی اور ادبی حلقوں کو مستفید فرمایا۔

علی سردار جعفری یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء کو جموں تشریف لائے اور ۳۱ دسمبر تک یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر مقیم رہے۔

اس تین ماہ کی مدت میں جعفری صاحب نے طلبہ کے لیے لیکچر بھی دیے اور تحقیق کا کام کرانے والے ایم فل پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے اسکالروں کو مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ لیکن ان کے جس کام کی وجہ سے تمام یونیورسٹی اور اہل جموں [illegible] ان کے وہ لیکچر ہیں جنھیں ہم پبلک لیکچر کہہ سکتے ہیں۔ یعنی وہ لیکچر جن میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ شہر اور ریاست کے اہل علم اور دانشور بھی شریک ہوئے۔

اس سلسلے میں سردار جعفری کا پہلا لیکچر جو یونیورسٹی کے پرانے کیمپس میں ہوا۔ "اُردو کی عالمی حیثیت" کے موضوع پر تھا۔ دوسرا لیکچر نئے کیمپس میں ہوا جس کا عنوان تھا۔ "فلم آرٹ" یہ موضوع ہم یونیورسٹی والوں کے لیے بڑی حد تک ایک نیا موضوع تھا۔ اور اس پر ایک گھنٹے کے لیکچر میں جعفری صاحب نے فلم اور فلم سازی کی باریکیوں پر نہایت تفصیل سے بات کی۔ آپ نے مشکل سے مشکل پہلو کو بڑی خوبصورتی اور نفاست سے بیان کیا۔

اور معاشرے میں فلم کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ایم آر پوری نے جنھوں نے اس لیکچر کی صدارت کی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ لیکچر سننے کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ یونیورسٹی میں ہمیں ایک فلم سوسائٹی کی بنیاد رکھنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے جعفری صاحب سے فرمائش کی کہ وہ اس مجوزہ فلم سوسائٹی کے بارے میں ایک جامع نوٹ بنا کے انھیں دیں۔ جعفری صاحب کا تیار کیا ہوا یہ نوٹ اس وقت وائس چانسلر کے زیر غور ہے۔

پروفیسر جعفری کا تیسرا لیکچر یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے زیر اہتمام ہوا۔ اور لیکچر کا عنوان تھا۔ "اُردو کی ترقی پسند شاعری" یہ لیکچر انگریزی میں تھا۔ جس میں فاضل مقرر نے ادب کی ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند شاعری پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ لیکچر کے دوران میں علی سردار جعفری نے انگریزی شاعری سے متعدد مثالیں پیش کرتے ہوئے۔ اردو اور انگریزی شاعری کی مماثلت اور عدم

ناگفتہ بہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس دوران قیام میں سردار جعفری کو مختلف علمی اور ادبی انجمنوں کی جانب سے متعدد استقبالیے دیئے گئے۔ جن میں ڈوگری سنستھا کی طرف سے کلچرل اکیڈیمی میں دیا ہوا استقبالیہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جموں یونیورسٹی کی صدر شعبۂ ڈوگری ڈاکٹر چمپا شرما نے اپنی تقریر میں سردار جعفری کے علمی کاموں کو سراہا۔ اس موقع پر سردار جعفری نے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے باہمی تعاون کو اپنا موضوعِ تقریر بنایا اور کہا کہ زبانوں اور ادب کو صحیح جادے پر ڈالنے ہی سے ملک میں قومی اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا

ان چاروں لیکچروں کی صدارت پروفیسر ایم آر پوری وائس چانسلر جموں یونیورسٹی نے کی۔ اور اپنی صدارتی تقریروں میں انھوں نے سردار جعفری کے علم و فضل، ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور ملک و قوم کے لیے ان کی خدمات کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا۔

جموں کے دانشور اور انگریزی کے اہلِ قلم بلراج پوری کی دعوت پر جعفری صاحب نے ایک لیکچر بھارتیہ ودیا بھون کالج آف کمیونیکیشنز اینڈ مینجمنٹ میں ہندوستان کے تہذیبی ورثے کے موضوع پر دیا۔

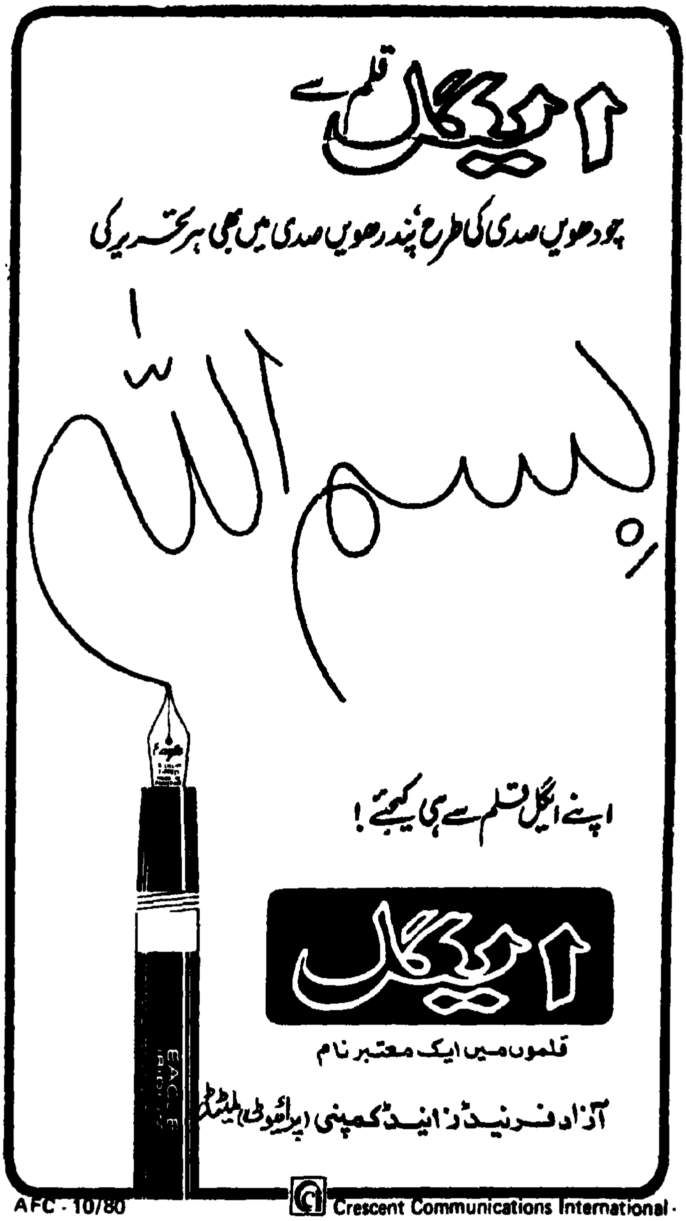
اس سلسلے کا آخری لیکچر جو ڈاکٹر فاروق عبداللہ چیف منسٹر جموں و کشمیر و پرو چانسلر جموں یونیورسٹی کی زیرِ صدارت ابھینو تھیٹر میں ہوا سردار جعفری کی یادوں سے متعلق تھا۔ اس کا عنوان تھا "میری یادیں"۔ یہ لیکچر جو کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہا۔ سردار جعفری کی علمی ادبی اور سیاسی یادوں پر مبنی تھا۔ اور اس میں جعفری صاحب نے مشرق و مغرب کی نامور شخصیتوں کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی روداد بڑے دلکش انداز میں بیان کی۔ اس لیکچر میں سردار جعفری نے جن ہستیوں کا ذکر کیا ان میں رابندر ناتھ ٹیگور، پابلو نرودا، لوئی آراگاں، ناظم حکمت، جگر مراد آبادی اور شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر فاروق عبداللہ نے سردار جعفری کی جموں یونیورسٹی میں آمد پر خوشنودی کا اظہار کیا۔

اس لیکچر کے بعد سردار جعفری کی بنائی ہوئی ڈاکومنٹری فلم "اقبال" دکھائی گئی جس کا انتظام ڈائرکٹریٹ جنرل انفارمیشن حکومتِ جموں و کشمیر نے کیا۔ اس فلم کی تشکیل و تکمیل میں سردار جعفری پروڈیوسر کے طور پر خواجہ احمد عباس ڈائرکٹر کے طور پر اور راقم التحریر ایڈوائزر کے طور پر شریک رہے۔

بمبئی کو روانگی سے قبل شعبۂ اردو کی طرف سے جعفری صاحب کے اعزاز میں ایک الوداعی دعوت دی گئی جس میں وائس چانسلر اور رجسٹرار پروفیسر ایم آر ٹھاکر بھی شریک ہوئے۔ پروفیسر ایم آر پوری وائس چانسلر نے یونیورسٹی کی طرف سے ایک الوداعی ڈنر دیا اور ۳۱ دسمبر کی سہ پہر کو جب ہم شعبۂ اردو کے اساتذہ علی سردار جعفری کو جموں ائرپورٹ تک پہنچانے گئے۔ تو راقم التحریر کو یہ شعر بار بار یاد آ رہا تھا۔

بزیرِ سایۂ گل خواستم کہ مے نوشم
ز شیشہ تا بہ قدح ریختم بہار گذشت


Protect Yourself by
Delta Insurance Co.
Delta Insurance Co. Limited.
Baghpatee Building, Altaf Hussain Road, Karachi.
Tel 2427910-2423978, Fax (9221) 2414554, Telex 24649 SHAFI PK
BUSINESS CHANNEL


ایگل قلم سے
چودھویں صدی کی طرح پندرھویں صدی میں بھی ہر تحریر کی
بسم اللہ
اپنے ایگل قلم سے ہی کیجئے!
ایگل
قلموں میں ایک معتبر نام
آزاد فرینڈز اینڈ کمپنی (پرائیوٹ) لمیٹڈ
AFC - 10/80
Crescent Communications International

His Caring Carries On



Dr Wallace C. Abbott and Family, 1904

One hundred years ago, Dr. Wallace C. Abbott made a commitment to provide his community with the finest in quality health care products.

Now, in our centennial year, Abbott Laboratories carries on Dr. Abbott's tradition of caring in over 130 countries worldwide. As we enter our second century, we are committed even more strongly to serving health care needs around the globe.

100

1888 - 1988

Abbott Laboratories
100 Years of Commitment to Health Care


شیم کی طر
ملائم سراپا
این فرینچ
ان خواتین کیلئے جوحسن ونفاست کی تحسین چاہتی ہیں۔
اور اپنے آپ کو ریشم کی طرح نرم وملائم
محسوس کرنا چاہتی ہیں۔
این فرینچ - آپکے سراپا کے لئے ریشم سا احساس
Anne French
lotion
hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE LEGS ARMS AND UNDERARMS
cream
hair remover
CREAMS AWAY HAIR FROM FACE LEGS ARMS AND UNDERARMS

چند منتخب تحریریں

سردار جعفری

خود نوشت

(بچپن اور جوانی)

یہ مجھے انسانی ہاتھ بڑے خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی جنبش میں ترنم ہے اور خاموشی میں شاعری۔ ان کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہتی ہے۔ یہ وہ فرشتے ہیں جو دل و دماغ کے عرش بریں سے وحی و الہام لے کر کاغذ کی حقیر سطح پر نازل ہوتے ہیں اور اس پر اپنے لافانی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ ان کاغذوں کو دنیا نظم اور افسانہ، مقالہ اور کتاب کہہ کر آنکھوں سے لگاتی ہے اور ان سے روحانی تسکین حاصل کرتی ہے۔

انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے۔ یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے۔ لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن محبت ممکن ہے نہ نفرت۔ یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ ساز میں سوئے ہوئے نغمے ان ہاتھوں سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ہم آغوش کے لیے پہلے یہی آگے بڑھتے ہیں اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ یہ وصال و فراق کی حسین علامتیں ہیں جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اور وہ خیال ذہن انسانی سے بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار، مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انہیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقتور اور خلاق بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ قلم کو ہاتھوں کا تقدس، ذہن کی عظمت، اور قلب انسانی کی وسعت سمجھا ہے اور قلم کے بنائے ہوئے ہر نقش کو سجدہ کیا ہے، اس لیے جب قلم جھوٹ بولتا ہے یا چوری کرتا ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میرے ہاتھ گندے ہو گئے ہیں۔ میں ہر ادیب سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے قلم کا احترام کرے گا۔ کیونکہ اس کے نفس کی عزت اور شرافت اسی طرح برقرار رہ سکتی ہے

میں اپنے بچپن میں ایک تختی لکھا کرتا تھا، جس پر ہزاروں بار نہیں تو سیکڑوں بار اس شعر کی مشق کی ہے۔

قلم گوید کہ من شاہ جہانم   قلم کش را بدولت می رسانم

ممکن ہے کسی کے لیے یہ دولت چاندی سونا ہو، کیونکہ دنیا میں ضمیر فروشوں کی طرح قلم فروشوں کی بھی کمی کبھی نہیں رہی ہے لیکن میرے لئے یہ علم، ہنر، خلوص اور صداقت کی دولت ہے، اور قلم کے احترام کے معنی اس دولت کا احترام ہے اور احترام کا جذبہ ہی بار بار میرے قلم کو روک رہا ہے۔

کیا میرا قلم صداقت کو پیش کر سکے گا۔ صداقت کوئی سپاٹ حقیقت نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا ہیرا ہے جو برابر تراشا جا رہا ہے اور

...ی اور عمل کی جلا اس میں نیا نور اور نیا رنگ پیدا کر رہی ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ صداقت بدل جاتی ہے۔ دراصل اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جیسے شعر اور اعلیٰ فن کی طرح صداقت تہہ دار ہوتی ہے۔ اس لیے کبھی کوئی تنہا انسان کوئی تنہا قوم، کوئی تنہا نسل اس کا احاطہ نہیں کر سکی ہے اور نہ کوئی تنہا نظریہ اس پر حاوی ہو سکا ہے۔ لامحدودیت اس کی خصوصیت ہے، اور اس نامحدودیت میں اس کا حسن ہے۔

اس سے بھی زیادہ مشکل اس صداقت کو پیش کرنا ہے جس کا تعلق اپنی ذات سے ہو۔ انسان اپنے دل سے سب سے زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ جو جھوٹ دنیا کے سامنے نہیں بولتا، وہ اپنے جھوٹ کو سچ کی جھلک دینے کے لیے وہ کبھی جادوگری سے کام لیتا ہے اور کبھی ... کاری۔ دنیا سے جھوٹ بولنے کے لیے پہلے اپنے دل سے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ اس لیے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ میری زندگی میں کن شخصیات اور واقعات نے متاثر کیا ہے۔

وقت کے ساتھ بیتی ہوئی یادوں کے نقوش بدل جاتے ہیں۔ ایک نقش دوسرے نقش میں مل جاتا ہے اور تصویریں مسخ ہو جاتی ہیں۔ جیسے تپتے ہوئے میدان سے خوابوں کی ٹھنڈی اور سکون بخش چھاؤں دکھائی نہیں دیتی۔ وہ ہم اکثر نئے خواب تخلیق کرتے ہیں اور اپنے خوابوں کا نام دے دیتے ہیں۔ عمر کے چالیس سالوں میں ہزاروں دن اور ہزاروں راتوں کی شکنیں پڑی ہیں۔ ذہن کی ہر شکن میں لاکھوں لمحے سو رہے ہیں۔ ان کو جگانے کی ہمت کس میں ہے۔ قہقہوں کے مرجھائے ہوئے پھول، آنسوؤں کے جمے ہوئے موتی، ابر دلی کی ٹوٹی ہوئی کمانیں، رخساروں کی بجھی ہوئی ... کتابوں کے پھٹے ہوئے ورق، علم شعور، رشک، حسد، محبت، نفرت، حماقت، ذہانت سب ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہیں۔ آج یہ بتانا مشکل ہے کہ کس نے کیا سکھایا ہے، کس نے کیا اثر ڈالا ہے، شعوری اثرات اور غیر شعوری اثرات کے درمیان لکیر کھینچنا مشکل ہے۔

میری یادوں میں ایک کھنڈر ابھر رہا ہے۔

کھنڈر کبھی کسی کھوئی ہوئی عظمت کا پتہ دیتے ہیں اور کبھی عظمت کے بغیر بھی الفاظ کی داستان سناتے ہیں۔ ہر کھنڈر کے لیے قدیم ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسے کھنڈر بھی ہوتے ہیں جن کی ہر اینٹ سلامت ہوتی ہے، ہر دروازہ کھلتا ہے، اور ہر دیوار کھڑی ہوتی ہے۔ پھر بھی عمارت کو دیکھ کر اس پر کھنڈر کا گمان گزرتا ہے۔ دیواروں پر بغیر حروف کی ایک کہانی لکھی ہوئی ہے۔ دروازے بغیر زبان کا ایک افسانہ سنا رہے ہیں اور اردگرد کی ہواؤں سے بوسیدگی کی بارش آ رہی ہے۔ میں جس کھنڈر کا ذکر کر رہا ہوں، وہ ایسا ہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی دل میں ویرانگی کا احساس ہوتا ہے۔

بمبئی سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور شمال میں ہمالیہ کی ترائی کا دامن جہاں سے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پندرہ بیس ہزار کی آبادی کا ایک چھوٹا سا قصبہ بلرام پور ایک تعلقہ داری کی راجدھانی۔ تعلقہ داری کو ریاست کہتے ہیں، اور تعلقہ دار کو مہاراجہ۔ اس قصبے کی ایک پتلی سی گرد آلود سڑک کے کنارے ایک اصطبل جس میں گھوڑوں کے لیے چھ تھان ہیں۔ سائیسوں کے لیے دو کوٹھریاں، اور موٹروں اور گاڑیوں کے لیے تین گیرج۔ میرے بچپن میں ہر تھان پر گھوڑے تھے، ہر کوٹھری میں سائیس، اور ہر گیرج میں موٹر یا بگھی۔ اب ایک گیرج میں ایک پرانا تانگا ہے اور دوسرے میں ایک بوسیدہ ٹم ٹم اور دو تھانوں پر دو مریل سے گھوڑے جنہیں دیکھ کر ان کے مالکوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اصطبل کے باقی حصے میں لینڈی کتے رہتے ہیں۔ محلے کی کتیاں بچے جنتی ہیں اور قصبے بھر کے جانور گرمی، برسات اور جاڑوں کی صعوبتوں سے بچنے کے لیے آ کر پناہ لیتے ہیں۔

اصطبل کے برابر ہاتھی کا کھلا ہوا تھان ہے جہاں رام پیاری ہتھنی کھڑی رہا کرتی تھی۔ جب وہ مر گئی ہے تو اس کی لاش کلہاڑیوں سے

سجائی گئی تھی، اور گوشت اور ہڈیاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اٹھائی گئی تھیں، پرانے سماجوں کا جنازہ بھی اسی شان سے نکلتا ہے۔

اور تھان کے سامنے جو تلپٹ کے ہرے پتوں اور نیلے پھولوں سے ڈھکا ہوا تالاب ہے اس کا پانی کبھی بڑا صاف شفاف تھا اور اپنی بڑی بڑی رہو مچھلیوں کے لئے مشہور تھا۔ اس کے کنارے امرودوں کا ایک باغ تھا اور ایک کبڑی پیٹھ کا بوڑھا اور اس کی بیوہ بیٹی امرود بیچا کرتی تھی، پکنے سے پہلے گدرا امرود بک جاتے تھے۔ اب باغ اجڑ چکا ہے اور ہاتھی کا تھان گھوڑے کے نیچے دب چکا ہے اور اکثر سبزی مائل نیلے کانٹے دار پودوں کے زرد زرد پھولوں میں دو چار گدھے کھڑے نظر آتے ہیں۔

تھان کے پاس لگا ہوا برگد کا بوڑھا درخت اب بھی پھیلتا ہے، اور چڑیاں اس کے سرخ رنگ کے پھلوں کو کتر کتر کر زمین پر پھینکتی رہتی ہیں اور اس کی ٹہنیوں پر لال چونچ کے طوطے ٹائیں ٹائیں کرتے رہتے ہیں۔ پریاں برگد کے پھول اب بھی چرا لے جاتی ہیں، لیکن اب اس بات میں کوئی رومانی کیفیت باقی نہیں ہے۔ اس خیال میں کوئی حیرت کا لطف نہیں ہے میں اپنے بچپن میں جب کبھی ان پریوں کا تصور کرتا تھا تو میری بڑی آپا اور ماں کے چہرے مسکرانے لگتے تھے اور میں اس بات کا کوئی جواب نہیں سوچ پاتا تھا کہ وہ برگد کے پھول کیوں چرا لے جاتی ہیں میری ماں اور بڑی آپا اب منوں خاک کے نیچے سو رہی ہیں اور برگد کے پیڑ کی موٹی موٹی لمبی لمبی جٹائیں زمین میں اپنے لیے جڑیں تلاش کرنے شاخوں سے نیچے اتر آئی ہیں۔ بچپن کی پریاں کھو گئیں اور جن شاخوں سے پھولوں کا تصور وابستہ تھا وہ ہیبت ناک ہو گئی ہیں۔

سڑک کی دوسری طرف، سرخ اینٹوں کی قد آدم دیوار کا ایک چوکور احاطہ ہے، اس کے دو کونوں پر لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں جن کو کبھی سرخ بجری کی لہراتی ہوئی روش نے ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا۔ اب چولوں میں اتنا زنگ لگ چکا ہے کہ پھاٹکوں کا بند کرنا مشکل ہے احاطے کے اندر ایک ٹینس کورٹ تھا اور اس کے چاروں طرف ہری ہری دوب بچھی ہوئی تھی۔ عشق پیچاں کی بیلیں باریک تار در پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے لگے ہوئے تھے اور مہندی کی باڑھ لگی ہوئی تھی، جو بجری کی لال روش کے کنارے کنارے دوڑتی تھی۔ دو کونوں پر گل مہر کے دو پیڑ تھے جو اپنے پھولوں سے لد کر لال بھبھوکا ہو جاتے تھے۔ ان سب کی حفاظت کے لیے دو مالی تھے جو ذرا سی کوتاہی پر پیٹ دیئے جاتے تھے، اگر غلطی سے اس باغ میں کوئی گائے، بیل گھس آئے تو اسے پکڑ کر میونسپلٹی کے "کانجی ہوز" میں بند کر دیا جاتا تھا اور مالیوں پر اتنی گالیاں پڑتی تھیں کہ خدا کی پناہ۔ میں نے اپنے بچپن میں اس باغ سے بے شمار تتلیاں پکڑی ہیں اور گل مہر کی ہری ہری کلیوں سے فالیں نکالی ہیں۔

اب مہندی کی باڑھ، گلاب، بیلے اور چمپا کے پودے، عشق پیچاں کی سرخ پھولوں سے بھری ہوئی سبز بیلیں اور ہری ہری دوب سب سوکھ چکی ہے، باغ ایک میدان میں تبدیل ہو چکا ہے اور اب سانڈ وہاں آپس میں لڑتے ہیں اور گدھے رینکتے ہیں اور کھجلے کتے اپنی پچھلی ٹانگوں میں اپنی دم دبائے ہوئے ٹہلتے رہتے ہیں۔ گل مہر کے پیڑ اب بھی ہیں لیکن وہ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان میں پھول نہیں آتے۔ کبھی کبھی کوئی بھولی بھٹکی کلی جھانکتی ہے، ورنہ بس شاخوں کے سوکھے ہوئے ہاتھ ہوا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بھوکے بھکاریوں کے ہاتھوں کی طرح جنہیں کوئی بھیک نہیں دیتا۔ یہ خشک ہاتھ ٹھنڈی اور گرم ہواؤں سے خشک اور تر موسموں سے اپنی پتیوں اور پھولوں کی بھیک مانگتے مانگتے تھک جائیں گے اور پھر ایک ایک کر کے گرتے جائیں گے۔ انہوں نے شکست کھا جانے کے بعد بھی اب تک شکست کا اعتراف نہیں کیا۔ انہیں یہ خبر نہیں کہ جب جڑیں سوکھ جاتی ہیں تو شاخوں میں برگ و بار نہیں آتے۔ موسم بہار بھی ان کے لیے بہار کا پیغام نہیں لائے گا یہی ضد سماجی نظاموں میں تشدد کی پرورش کرتی ہے۔

احاطے کے اندر بجری کی لال روش کے موڑ پر ایک اور بڑا پھاٹک ہے اس کی محراب اتنی بلند ہے کہ اس کے نیچے سے ہاتھی گذر سکتا ہے

ہمارے گھر کے اندر مٹی کا بنا ہوا ایک بڑا صحن ہے اور بیچ میں ایک چبوترہ۔ پرانی نیم کا سب سے اونچا درخت کھڑا ہوا ہے اس کی عمر کوئی سو برس کے قریب ہوگی۔ اس کا سایہ اب بھی ٹھنڈا اور صحت بخش ہے۔ لیکن چمگادڑوں، چیلوں اور کووّں نے گھونسلے بنا لیے ہیں اور ان کی بیٹ پیڑ کے نیچے کسی کو نہیں بیٹھنے دیتی۔ پکی ہوئی خوشبودار نمولیاں سال میں ایک بار ٹپکتی ہیں۔ نیم کی ہری پتیاں سوکھ کر سال میں ایک بار چاروں طرف سونا بکھیرتی ہیں۔ لیکن چیلوں اور کووّں کی بیٹ بارہ مہینے ٹپکتی رہتی ہے۔

اس کے چاروں طرف کچے مکانات ہیں ہر مکان میں ایک گھرانہ آباد تھا انہیں میں ایک میرا گھر بھی تھا۔ بڑے سے صحن، دو بیچ دالان۔ دو کوٹھے کی دو کھلی ہوئی چھتوں کا گھر۔ اس کی پورب کی دیوار کی طرف سے ایک نہایت خوبصورت کلس اور شلشم کا ایک بلند قامت درخت اندر جھانکتا تھا اور پیڑ کے پیچھے سے صبح کا سورج اور چودھویں کا چاند نکلتا تھا۔ گرمیوں کی راتوں میں جب پلنگ بچھ جاتے تھے تو یہ آنگن چھوٹا معلوم ہوتا تھا اور چاندنی کی راتوں میں اتنا بڑا کہ میں اکثر دوڑ دوڑ کر اس آنگن سے گذرا کرتا تھا۔ اسی آنگن میں میں نے پہلی بار اپنی گود میں جوانی کا فسوں محسوس کیا۔ گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں دیوار کے سائے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کا پسینے سے بھیگا ہوا چہرہ کندن کی طرح دمک رہا تھا وہ غافل سو رہی تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے اس سے زیادہ حسین چیز نہیں دیکھی ہے۔ وہ چہرہ آج نظروں سے اوجھل ہو کر اور زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے۔

اس سارے سازوسامان میں جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ہمارے چھوٹے سے گھر کے سوا اپنا اور کچھ نہیں تھا۔ ہر چیز ریاست کی تھی جو میرے والد اور چچا کو ملازمت کے سلسلے میں استعمال کے لیے ملی تھی۔ میرے چچا بڑے عہدے پر تھے اور والد چھوٹے عہدے پر لیکن رعب پورے خاندان کا تھا۔ چچا سید صاحب کہلاتے تھے اور والد بڑے بھیا کے نام سے مشہور تھے۔ میری ماں کو سارا قصبہ بڑی بہو کہتا تھا۔

خاندان میں بڑا اطمینان تھا۔ بلرام پور سے باہر کی دنیا ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ یہیں بچے پیدا ہوتے تھے، جوان ہوتے تھے بلرام پور اسکول کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر شادی ہو جاتی تھی اور ریاست میں ملازمت مل جاتی تھی۔

خاندان کی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کبھی کبھی ہوتی تھیں ورنہ دن ہنسی خوشی گذر جاتا تھا اور رات کو سب بہن بھائی بستروں پر لیٹ جاتے تھے کوئی ایک بہن شرلک ہومز کی کہانیاں، راشد الخیری کے ناول یا عظیم بیگ چغتائی کی کوئی کتاب پڑھ کر سناتی، اس سے تھک جانے کے بعد جنوں کے قصے شروع ہوتے جو انتہائی دلچسپ ہونے کے بعد بھی دل میں دہشت پیدا کر دیتے۔ میری ایک پھوپھو کو اصرار تھا کہ گھر میں جو کالا کتا آتا ہے وہ جن ہے اور اسے انہوں نے بلی اور گدھے میں تبدیل ہوتے دیکھا ہے۔

یہ بڑا ایماندار، مذہب کا پابند اور پرہیزگار خاندان تھا اسی لیے مجھے چھوٹی عمر میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کر دیا گیا کہ مولوی بن جاؤں گا تو خاندان کی عاقبت سدھر جائے گی لیکن طبیعت کی آزادہ روی نے اس سعادت سے محروم کر دیا اور میں لکھنؤ سے تین بار بھاگا۔ میرے والد اور چچا نے کبھی رشوت نہیں لی اور دولت مندی کی شہرت کے باوجود صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گذار دی۔ میری ماں کے سارے زیور بک گئے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ گھر میں افلاس ہے۔ وہ بڑے خلوص سے ملازمت کرتے تھے اور ہر موقع پر نمک حلال ہونے کا ثبوت دیتے تھے عام طور سے کالی ٹوپیاں پہنتے تھے جو نہ جانے کیوں ایرانی ٹوپیاں کہلاتی تھیں لیکن دسہرے کے موقع پر جو ریاست میں بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا رنگین صافے باندھ کر جلوس کے ہاتھیوں پر بیٹھتے تھے اور مہاراج اور مہارانی کو نذر دینے جاتے تھے عید، بقرعید، ۱۲ رجب اور عید غدیر بڑی شان سے مناتے تھے اور دیوالی پر ریاست کے ملے ہوئے تیل کے دیوں سے گھر کی دیواریں سجاتے تھے۔ ریاست کے کام کے علاوہ ہمارے خاندان کو اخراجات کے لیے جو گاؤں ٹھیکے پر ملے تھے ان کا انتظام کرتے تھے اور سال بھر نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، شعبان کے مہینے میں بارہویں امام کی ولادت مناتے اور عریضے ڈالنے جاتے تھے اور محرم

بڑے جوش و خروش سے مناتے تھے۔ اپنے انتقال سے کچھ پہلے جب میرے والد بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے تو ان کی چارپائی محرم کی مجلسوں کے لیے عزاخانے میں لاکر رکھ دی جاتی تھی اور وہ لیٹے لیٹے مجلس سنتے تھے۔

چاند رات کو عورتیں چوڑیاں توڑ دیتی تھیں اور زیور اتار کر رکھ دیتی تھیں اور سب لوگ کالے کپڑے پہن لیتے تھے اور باہر کوٹھی کے سب سے بڑے کمرے میں فرش رکھی جاتی تھی اور علم کھڑے کیے جاتے تھے۔ چھتوں میں جھاڑ فانوس لگائے جاتے تھے، چاندی اور سونے کے علم کے پنجے اور طرح طرح کے سبز، زرد، سرخ اور عنابی پٹکے مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو مہندی اٹھتی تھی اور مجھے علی بند پہنایا جاتا تھا آٹھویں کو حضرت عباس کا علم نکلتا تھا اور شب عاشور عزاخانہ سجایا جاتا تھا اور فانوس جگمگا اٹھتے تھے۔ قصبے اور گرد و نواح کے گاؤں کے لوگ زیارت کرنے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے عورتیں ٹولیاں بنا کر دیہاتی مرثیے گاتی ہوئی آتی تھیں اور حضرت صغریٰ کے قاصد کے نام پر جوان لڑکے پیک بن کر آتے تھے۔ ان کی کمر میں ایک پٹکے کے ساتھ ایک گھنٹا بندھا ہوتا تھا۔ سر پر پگڑیوں میں مور کے پر لگے ہوتے تھے اور ہاتھوں میں مورچھل رہتے تھے۔ پیکوں کی ٹولیاں اپنے گھنٹے بجاتی ہوئی آتیں اور عزاخانے میں مرثیے گا گا کر ناچتی تھیں۔ ان کے قدم "حامی اللہ" کے بول پر اٹھتے۔ دس دن مسلسل مجلسیں ہوتی تھیں اور پڑھنے کے لیے لکھنؤ سے ذاکر آتے تھے۔ عشرے کے دن سارے قصبے کی فاقہ کشائی ہمارے گھر ہوتی تھی۔

سال کے اور مہینوں میں بھی مجلسیں اور محفلیں ہوتی تھیں جن کی بدولت میں نے اس عہد کے تمام بڑے ذاکروں کو سنا ہے اور تمام بڑے علماء اور مجتہدین کے ہاتھوں کو بوسے دیئے ہیں۔ مولانا سبط حسن کی خطابت بے پناہ تھی۔ فصاحت اور بلاغت کا دریا موجیں مارتا تھا اور اشاروں اور کنایوں کا تیکھا پن تڑپا دیتا تھا۔ دولہا صاحب کو میں نے اس عالم میں دیکھا کہ وہ منبر کے نیچے تقریباً دوہرے ہو کر بیٹھتے تھے، دو آدمیوں نے سہارا دے کر منبر پر بٹھایا۔ مرثیہ انہوں نے ہاتھ میں لیا۔ ایک بار سنبھلے اور پڑھنا شروع کر دیا تو دوسرا ہی چہرہ ہو گئے۔

نام مردوں کا رقم باڑھ پر تلوار کی ہے۔

اس کے علاوہ انیس کے مرثیوں کا چرچا بھی تھا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کلمہ اور تکبیر کے بعد شاید میرے کانوں نے پہلی آواز انیس کی سنی ہے۔ میں شاید پانچ چھ برس کی عمر سے منبر پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا تھا۔ سلام اور مرثیوں کے علاوہ ویسے بھی مجھے بے شمار اشعار یاد تھے۔

شاید اسی کا اثر تھا کہ میں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں خود مرثیے کہنے شروع کر دیئے تھے اور مرثیوں کا اثر آج بھی میری شاعری پر باقی ہے ان کی زبان، تشبیہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔ میرا اپنا کچھ نہیں تھا۔ میں ساٹھ ساٹھ، ستر ستر بند لکھ جاتا تھا لیکن مرثیہ ختم نہیں کر پاتا تھا۔ ویسے مجلس میں پڑھنے کے لیے یہ بند کافی تھے۔

جب میں نے پہلا مرثیہ کہا ؎

آتا ہے کون شمع امامت لئے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لئے ہوئے

- - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - -

اللہ رے حسن فاطمہ کے ماہتاب کا
ذروں میں چھپتا پھرتا ہے نور آفتاب کا

اور اسے منبر پر بیٹھ کر پڑھا تو والد اور چچا نے بہت گلے لگایا اور ماں نے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔ میرے چچا بار بار مرثیے کے آخری دو

مرثیوں کو پڑھتے تھے اور روتے تھے۔

اکبر کو اپنے ہاتھ سے گھوڑے پہ بٹھاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی اور میں نے پندرہ برس کی عمر میں ایک مرثیہ کہہ لیا۔ وہ اس طرح شروع ہوتا تھا ؎

آتا ہے ابن فاتح خیبر جدال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
کانپا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
گردش بدل رہی ہے زمیں زیر و زبر ہے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

مجھے اب تک یاد ہے کہ آخری مصرعے کے قافیے کی بے ادبی لیکن مجھ کو اور لوگ بھی کہتے سنا کہ میں کسی سے لکھوا کر پڑھتا ہوں یہ بات مجھے ناگوار گزری کہ میں نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا ؎

اے بلبل ریاض بیاں نغمہ بار ہو
اے نوعروس طبع جواں ہم کنار ہو
اے خامہ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسد دریدہ دہاں شرمسار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچمداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمت رب غفور ہے

اس میں میں نے یہ بھی لکھا تھا۔

اک خوشہ چیں ہوں باغ جناب انیس کا

پھر ایک اور مرثیہ کہا جس کے صرف دو مصرعے یاد رہ گئے ہیں ؎

عرش تک اوس کے قطروں کی چمک جانے لگی
چلی ٹھنڈی جو ہوا تاروں کو نیند آنے لگی

یہ مرثیے اب تک بلرام پور میں محفوظ ہیں اور محرم کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ کربلا کے قافلے میں مجھے امام حسین کے بعد سب سے زیادہ عقیدت حضرت عباس اور حضرت زینب سے تھی اور انیس کے مرثیوں نے اس عقیدت پر جلا کر دی تھی۔

میرے والد کے پاس مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ قرآن بچپن میں بہار کے ایک مولوی صاحب سے پڑھا تھا وہ دن میں بیدوں سے مارتے تھے اور رات میں پیغمبروں کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ والد کی کتابوں سے میں نے تمام پیغمبروں اور چودہ معصومین کے حالات پڑھ لئے تھے اور

چونکہ میں اس عمر میں مرثیہ خوانی کے علاوہ حدیث خوانی بھی کرنے لگا تھا اس لئے وہ حالات اور قرآن کی بہت سی آیتیں زبانی یاد تھیں اور ان سب کا مجموعی اثر مجھ پر یہ تھا کہ حق اور صداقت کے لیے جان کی بازی لگا دینا انسانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ میں نے حق اور صداقت کو ہمیشہ زمین کی چیز سمجھا۔ نمرود و خلیل کی داستان سے لے کر شہادت حسین تک کے واقعات نے میرے خون میں حرارت پیدا کر دی تھی اور میں اقبال کے یہ اشعار لہک لہک کر پڑھا کرتا تھا

آن امام عاشقان پور بتول
سرو آزادے ز بستان رسولؐ
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر
دشمنان چون ریگ صحرا لاتعد
دوستان با لفظ یزدان ہم عدد
رمز قرآن از حسین آموختیم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
این دو قوت از حیات آمد پدید
موسیٰؑ و فرعون و شبیر و یزید
شوکت شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزان ہنوز
تازہ از تکبیر او ایمان ہنوز

اس زمانے میں چند سوالات نے مجھے بے چین کر دیا اور چند واقعات نے میری زندگی میں بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ مجھے اس سوال نے کبھی پریشان نہیں کیا کہ یہ دنیا کیوں ہے اور کہاں سے آئی ہے لیکن اس سوال نے ہمیشہ پریشان رکھا کہ یہ دنیا ایسی کیوں ہے اور اس کی ابتدا میرے بچپن ہی میں ہو گئی تھی۔

میں نے ایشیائی افلاس کے بدترین نمونے دیکھے ہیں۔ ریاست کے گاؤں میں پہلے اور اپنے گھر میں بعد کو، مجھے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بے انتہا شوق تھا اور میں بندوق لیے گاؤں گاؤں اور جنگل جنگل پھرتا تھا اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیلداروں میں ٹھہرتا تھا اس طرح میں اودھ کے دیہات کی زندگی سے آشنا ہوا یہ خوبصورت گیہوں، دھان اور گیہوں کے کھیتوں اور انتہائی افلاس کی سرزمین ہے اس میں اتنی پگڈنڈیاں نہیں ہوں گی جتنے خون کے دھارے اس کے جسم میں جذب ہو چکے ہیں۔ میری یاد میں اس کی انتہائی بھیانک تصویریں محفوظ ہیں گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹھیں لدی ہوئی ہیں، پیڑوں کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگیں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں کے بچے بڑی بڑی سیاہ مگر بجھی ہوئی آنکھیں۔ ایک بار میرے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار تصویریں ہیں جو اگر کوئی مصور پردے پر بنا دے تو دنیا چیخ اٹھے۔ ان دیہاتوں میں جا کر مجھے پہلی بار

معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں ۔

اودھ کی دوسری تعلقہ داریوں کی طرح خرام پور میں بھی ہرواہی کا رواج تھا ۔

خود ہمارے گھر میں ہرواہے اور ہرواہیاں تھیں، ان کے پاس اپنی زمین اور اپنا گھر نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ ادھیا یا ٹھیکہ پر نہیں بلکہ بیگار کرتے تھے اور فصل کٹنے کے بعد صرف اناج کی شکل میں انہیں مزدوری دی جاتی تھی جس سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا اور یہ قرض لے کر مجبور ہوتے تھے جیسے وہ خود زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی آنے والی نسلیں بھی انہی زنجیروں میں ان کے پیچھے بندھی ہوتی تھیں۔ وہ ایک طرح سے قدیم غلام تھے اور ان کی جان و مال اور عزت آبرو زمیندار کی ملکیت ہوتی تھی۔ میں نے ان سے بدتر حال مخلوق میں نے کبھی نہیں دیکھی ہے۔ مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس ہرواہی کے عذاب سے بچنے کے لیے یہ لوگ [illegible] کی طرف بھاگ جاتے ہیں۔ کیوں کہ اودھ کے کسی ضلع یا گاؤں میں ان کے لیے پناہ نہیں ہوتی تھی۔ قدیم عہد کے غلاموں کی طرح یہ مالک کی ملکیت تھے اور دوسرا مالک انہیں زبردستی پکڑ کر واپس کر دیتا تھا ۔

ایک بار ایک ہرواہی ہمارے گھر میں اناج صاف کرنے آئی تھی۔ وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی اور ایک تھوڑا سا اپنے منہ میں ڈالتی جاتی تھی۔ یکایک میرے بہنوئی کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ منہ میں کیا ہے۔ وہ گھبرا کر جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی۔ بہنوئی نے لپک کر اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ ہرواہی نے خون کی ایک کلی کی اور کچے چاول اگل دیے۔ وہ غریب کئی دن کی بھوکی تھی

افلاس کچھ مضحکہ خیز تصویریں بھی بناتا ہے لیکن وہ حقیقتاً بڑی دردناک ہوتی ہیں۔ مجھے اپنے اسکول ماسٹر صاحب کی یاد اسی طرح آتی ہے۔ ان میں ایک منشی بدری پرشاد چھوٹے سے قد کے بوڑھے آدمی تھے۔ دھوتی باندھتے تھے اور ایک میلا سا کوٹ پہنے رہتے تھے جس میں سے کٹے ہوئے خشخشی بالوں کے سر پر فیلٹ کی کالے رنگ کی میلی چیکٹ ٹوپی چھوٹے سے تنگ۔ سینے پر جھکی رہتی تھی گردن کوتاہ تھی اور کندھے ابھرے ہوئے تھے اور وہ چلتے بھی تھے ذرا جھک کے۔ تیسرے سے چھٹے درجے تک حساب پڑھاتے تھے اور بیچ بیچ میں کھنکارتے جاتے تھے۔ منشی جی اپنا معمولی سی پرانے فریم کی عینک لگا کر حاضری لیتے اور پھر پڑھانے کھڑے ہو جاتے پھر سوال پوچھتے۔ جو بچہ سوال کا ٹھیک جواب نہ دے پاتا اس کی شامت آجاتی۔ تین چار بید مارنے کے بعد منشی جی کھنکارتے اور طالب علم کے دماغ کو کمزور قرار دے کر اسے تیل لگانے کی ہدایت دیتے تاکہ دماغ روشن ہو جائے اور حافظہ تیز ہو جائے اور حساب سیکھنے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔ کبھی کبھی وہ بستہ سے تیل کی شیشی نکال لیتے اور طالب علم کے ہاتھ بیچ دیتے معلوم نہیں وہ یہ تیل خود بناتے تھے یا خرید کر لاتے تھے۔ ایک بار میں نے بھی ان سے تیل خرید لیا اور اس یقین کے ساتھ سر میں لگایا کہ اس کی ہر بوند سے دماغ اسی طرح روشن ہو جائے گا جیسے مٹی کے تیل سے لالٹین جل اٹھتی ہے لیکن بجائے روشن دماغی کے سلسلے میں اپنی ماں کا یہ فقرہ سنا کہ چھچھوندر کی بو کہاں سے آ رہی ہے ۔

آج منشی بدری پرشاد کا خیال آتا ہے تو مجھے ان پر بے انتہا پیار آنے لگتا ہے حالاں کہ بچپن میں ان کے بید کھا کر میں نے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح درختوں کے پیچھے چھپ کر ان پر آوازیں لگائی ہیں۔ لیکن منشی جی نے کبھی لڑکوں کے فقروں پر مڑ کر نہیں دیکھا۔ گردن جھکائے آتے تھے اور گردن جھکائے چلے جاتے تھے۔ میں کبھی ان کے گھر نہیں گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی زندگی میں کیسی کیسی ناکامیاں اور حسرتیں تھیں۔ شاید خواہشوں کا گلا وہ بہت پہلے گھونٹ چکے ہوں گے اور تیل صرف اس لیے بیچتے ہوں گے کہ ان کی قلیل سی تنخواہ ان کے لیے ناکافی ہوگی اور ان کی سالی گھی سے محروم رہتی ہوگی۔ اب اگر مجھے منشی بدری پرشاد مل جائیں تو میں ان کے پیر چھو کر اپنی گستاخیوں کی معافی مانگوں جن کا غالباً انہیں علم بھی نہ ہوگا اور ان کی تیل کی شیشیاں خریدنے کے لیے تمام عمر ان سے بید کھاتا رہوں اور اف بھی نہ کروں ۔

ایک میرلق جوں جوں تھے جنہیں ہاتھ پیر کو لقوے نے بے کار کر دیا تھا۔ لوگ انہیں چونی چپت کہہ کر چڑھاتے تھے۔ ان کا منہ کالا کیا گیا انہیں گدھے پر بٹھایا گیا اور ایک بوڑھی مہترانی سے ان کی فرضی شادی رچادی گئی اور یہ سب صرف اس جرم میں کہ وہ بے بس اور اپاہج تھے اور یہ قسم کے درجنوں کردار ہیں سب ٹوٹے پھوٹے چہرے والے لوگ لیکن دکھی دلوں کے مالک۔

میں سوچتا تھا یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے۔ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں ان پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔ میرا خاندان اس پر قانع تھا۔ سب کچھ خدا کی دین ہے۔ امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں۔ ظلم و استبداد ہمیشہ سے ہے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں تھا اور میں نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقائد کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے اور جو سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ میں نے قرآن اور حدیث کی مدد سے استدلال کرنے کی کوشش کی "خدا کے دئیے ہوئے رزق سے کھاؤ، پیو اور زمین پر فتنہ و فساد برپا نہ کرو" اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ فتنہ و فساد برپا کرنے والے صاحبان اقتدار ہیں، جن کے ملازم میرے والد اور چچا ہیں۔ جنہیں اس کا اندازہ نہیں کہ وہ خود کتنے پسے ہوئے اور دبے ہوئے ہیں۔ لیکن عام تصور یہ تھا کہ فتنہ و فساد کے ذمے دار کسان ہیں اگر وہ بیگار سے انکار نہ کریں اور لگان ادا کریں اور موٹا جھوٹا پہن کر اور آدھے پیٹ کھا کر خدا کا شکر کیا کریں تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوگا۔

مجھے یاد نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں سارے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اخباروں میں خبریں چھپیں اور کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملے کی تحقیقات کرنے آئے۔ ریاست کے عملے نے ان کو گاؤں تک جانے سے روک دیا اور راستے کی کچی سڑک میں جابجا گڑھے کھود دئیے گئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

غالباً عید غدیر کا دن تھا یا یوں ہی ہمارے گھر میں کوئی محفل تھی۔ میں اس محفل میں قصیدہ پڑھنے کے بجائے اس عام جلسے میں چلا گیا جہاں پنڈت نہرو نے جاگیرداری ظلم و استبداد کے خلاف تقریر کی۔ جلسے کے بعد میں واپس آیا تو گھر کے لوگ مجھ سے خفا تھے اور میں ساری کائنات سے بیزار۔ ظلم اور افلاس کے سماجی اسباب کے پہلے علم نے میرے دل میں چراغ جلا دئیے تھے۔

اسی زمانے میں میں نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں جنہوں نے میری زندگی بالکل پلٹ کر رکھ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب "تلاشِ حق" اور دوسری پلوٹارک کی کتابیں "مشاہیر یونان و روما"۔ گاندھی جی کی کتاب میں پوری طرح نہ سمجھ سکا، اس لئے کہ وہ انگریزی میں تھی اور میری انگریزی کی استعداد اتنی نہیں تھی۔ کتاب میرے چچا کی تھی جنہوں نے خود اسے بڑے شوق سے پڑھا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان سے اس کے مطالب دریافت کروں، خود ہی اس کی سیاہ چھپی ہوئی سطروں میں نور اور روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ پلوٹارک کی کتاب انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے چھاپی تھی اور غالباً اس کا اردو ترجمہ ہاشمی فرید آبادی نے کیا تھا۔ اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا کیونکہ میں اسے آسانی سے سمجھ سکتا تھا خاص طور سے لے کرگس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی کون سی ادا مجھے بھا گئی تھی۔

لیکن ان کتابوں نے میرے سوالات حل کرنے کے بجائے میرے دل میں اور آگ لگا دی اس آگ کو کون بجھائے، نہ گھر میں کوئی میرا جواب دینے والا ہے اور نہ اسکول میں۔ نہ کتابیں، نہ رسالے، نہ اخبار۔ میرے والد اور چچا مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، اس لیے ان کو میرے سوالات دیوانگی معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شفقت میرے دل کی آگ کو نہیں بجھا سکی۔ ایک واقعے نے اس آگ کو اور بھڑکا دیا۔ ایک اور گاؤں میں بغاوت

تھے، اور کسانوں نے ریاست کے تحصیلدار کو جان سے مار دیا۔ میرے بہنوئی جو ذیلدار تھے بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ سب کی ہمدردیاں میرے بہنوئی اور مرے ہوئے تحصیلدار کے ساتھ تھیں۔ میری ہمدردیاں کسانوں کے ساتھ۔

اب مجھے ہر اسی چیز سے نفرت ہو گئی جس سے امارت کی خدا کی بھی بو آتی ہو۔ میرا ردعمل صرف جذباتی تھا اور عقل کو جذبات کی تنظیم دور سے بھی نہ ملا چاہتا تھا۔ اس عالم میں میں نے ایک نظم کہی کہ خدا نہ تو بغداد کے ایوانوں میں ہے نہ امیروں کے محلوں میں، خواجوں کی بہت سی بیواؤں کی چادر میں ہے، اور کربلا میں چمکنے والی حسین ابن علی کی تلوار میں ہے۔ اس کا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں ہے۔ یہ نظم میں نے ایک محفل میں پڑھی اور اس کی داد بھی ملی اور لوگوں نے اس نظم کو نہیں سمجھا، لیکن والد کے ملنے والے ایک گورنمنٹ کے تحصیلدار التماحسین تھے، وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے، ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے نظم کی تعریف کی اور پھر مجھ سے پوچھا "تم خدا کو مانتے ہو؟" وہ مجھے اس پر جانا چاہتے تھے کہ امیر و غریب سب خدا کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن گفتگو میں بات یہاں تک آ پہنچی کہ میں نے یہ کہا کہ "میں خدا کو اس لیے مانتا ہوں کہ رسول نے مانا ہے" بزرگوں کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور میری طرف گھور کر دیکھا لیکن میں اس وقت ان کے سامنے گستاخ ہو گیا تھا۔ میں یہاں تک کہہ گیا کہ "آپ کے پاس خدا کے ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے، لیکن میرے پاس ثبوت ہے اور وہ یہ کہ رسول نے کہا ہے کہ خدا ہے" تب مجھے اسلام کا علم آیا اور دیر تک بانگِ درا پڑھتا رہا اور جب شکوہ کے اس بند پر پہنچا

تھی تو موجود ازل ہی سے تری ذاتِ قدیم
پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم
بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

تو خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں کہ میں اپنے بزرگوں کے سامنے اقبال کی دلیل کو پیش کر کے آیا ہوں۔

اب خاندان میں میرا تھوڑا سا احترام بھی کیا جاتا تھا اور لوگ میرے نام پر زیرِ لب مسکرا بھی دیتے تھے۔

میں نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ زیادہ تر کتابیں پڑھنے میں وقت گذرتا تھا، لیکن اسلام کی کتابیں کم تھیں، سب سے اچھی کتاب بانگِ درا تھی جو زبانی یاد ہو گئی تھی۔ اسی دوران میں نگار کے کچھ پرانے پرچے کہیں سے مل گئے غالباً سنہ ۱۹۲۰ء کی فائلیں تھیں ان میں پہلی بار غالباً نیاز فتحپوری کی کسی تحریر میں انقلابِ روس کا ذکر مل گیا اور میں نے اقبال کی خضرِ راہ کو اس کے ساتھ ملا کر اپنے خوابوں کی نئی دنیا تعمیر کرنا شروع کر دی۔

ماں باپ میری حالت پر کڑھتے تھے اور بہنیں مجھے حیرت سے دیکھتی تھیں۔ ایک رشتہ کی بہن تھی اس کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ پسندیدگی کی چمک تھی اور یہ چمک مجھے اس پر آمادہ کرتی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کروں، میں اس سے ہمیشہ مظلوموں اور امارت، ظلم اور انصاف کی باتیں کرتا رہتا تھا لیکن کچھ عرصے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں اور میرے دل میں ایک نور سا بکھر گیا۔ برسوں بعد جب میری شادی کا سوال اٹھا تو میں نے اپنے والدین کو اس لڑکی کا نام بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا، نہ رہنے کا ٹھکانہ ہو گا نہ کھانے کا، لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کے آس پاس کی بات ہے کہ میں نے طے کر لیا کہ میں بلرام پور سے نکل جاؤں گا۔ اتفاق سے یہ خبر معلوم ہوئی کہ جہازرانی کی ٹریننگ کے لیے اب ہندوستانی بھی لیے جائیں گے۔ کچھ ذوق آوارہ گردی کچھ بلرام پور سے نکل جانے کا شوق، میں نے اپنے والد سے جہازرانی میں جانے کی خواہش ظاہر کی، انہوں نے اجازت دے دی۔ میں مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا اور پھر لکھنؤ جا کر امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا بمبئی سے بلاوا آ گیا۔ میں بے انتہا خوش تھا اور سفر کی تیاریاں کرنے لگا تھا کہ یکایک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سارے خوابوں کو خاک میں ملا دیا۔

ایک مجتہد صاحب ہر سال تشریف لاتے تھے، میں جانے کی تیاری میں تھا کہ وہ آ گئے۔ جب میرے والد نے ان کے سامنے ذکر کیا تو کچھ شبہات کا اظہار بھی ہوا۔ کس طرف سے؟ یہ مجھے نہیں معلوم بس اتنا معلوم ہے کہ مجھے ان کے سامنے بلایا گیا اور پھر میرے سامنے استخارہ دیکھا گیا اور استخارہ منع ہو گیا۔ میں نے اس وقت ذرا سی جھنجھلاہٹ محسوس کی۔ پھر یہ تاویل کی۔ چلو اچھا ہوا۔ میں خواہ مخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۶ء میں میری آنکھوں کے سامنے بمبئی کے جہازیوں نے بغاوت کی تو میرا دل اس خیال سے تڑپ اٹھا کہ میں اس بغاوت میں شریک نہ ہو سکا اسے ایک طرح کی رومانیت کہہ لیجئے لیکن یہی رومانیت تو زندگی میں رس پیدا کرتی ہے۔

اب پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور میں۔ عمل کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ میں بے بس تھا اور اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

اس ذہنی کیفیت میں میں ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ پہنچا۔ اس وقت میری عمر بیس برس کی تھی چونکہ میں نے ابتدائی چند سال عربی اور فارسی کی تعلیم میں گنوا دیے تھے اور تب انگریزی اسکول میں داخلہ لیا تھا اس لیے میں اپنی عمر کے اعتبار سے تعلیم میں پچھڑا ہوا تھا۔ جب انٹرمیڈیٹ میں پہنچا تو میرے ہم عمر بی اے اور ایم اے کے طالب علم تھے۔

یہ زمانہ جتنا ہندوستان کی تاریخ میں اہم ہے اتنا ہی اردو ادب اور علی گڑھ کی تاریخ میں بھی۔ علی گڑھ تحریک نے انیسویں صدی میں اردو ادب کے دھارے کو موڑا تھا۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں غزل کی اصلاح کا سہرا بھی علی گڑھ ہی کے ایک سپوت مولانا حسرت موہانی کے سر رہا۔ اور دوسری دہائی میں وہاں کی رومانی تحریک میں علی گڑھ کا اچھا خاصا حصہ ہے اور تیسری دہائی میں جب ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو نیا رخ دیا تو یہاں بھی علی گڑھ پیچھے نہیں رہا۔

جس زمانے میں میں وہاں پہنچا نئی تحریک کے اولین نقوش بن رہے تھے اور ادب اور سیاست مل کر ایک ہوئے جا رہے تھے اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، مجاز، جاں نثار اختر، آل احمد سرور سب وہاں کے طالب علم تھے۔ ڈاکٹر اشرف اور ڈاکٹر عبدالعلیم استادوں میں تھے۔ بعد کو عصمت چغتائی بھی وہاں پہنچ گئیں اور جذبی بھی۔ اور یہ سب جدید اردو ادب کے نہایت اہم اور ہوش مند معمار ہیں۔

میں جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ میں سیدھا لائبریری کا رخ کروں۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ علی گڑھ میں کون ہے اور کس قسم کے طوفان پرورش پا رہے ہیں۔ میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لئے علم بہت ضروری ہے جس سے میں اب تک بری طرح محروم تھا۔

بغیر کسی ترتیب کے میرا ہاتھ جس کتاب پر پڑا اسے پڑھ ڈالا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا ہاتھ کسی سیاسی کتاب پر نہیں پڑا۔ عام طور سے میں ادبی کتابیں پڑھتا تھا۔ ان کے زیر اثر بلرام پور میں پیدا ہونے والے سوالات کچھ عرصے کے لیے دب گئے اور میں آسکر وائلڈ میں کھو گیا، جس کی سالومی کے زیر اثر میں نے نہایت بے سروپا ڈرامہ لکھا۔ غالباً اس کا نام "دیوانے" تھا اور وہ علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا تھا اس کی نہ جانے کیوں میرے

خوشی۔ استاد رشید صدیقی صاحب نے تعریف کی اور بھی کچھ لوگوں نے اسے سراہا۔ میں اس وقت تو خوش ہوا لیکن جب ذرا ہوش آیا تو خود اپنے آپ پر بھی حیران ہوں۔ کیونکہ اس پر کسی قسم کے سیاسی اور سماجی شعور کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ صرف لفظی ہے اور وہ بھی انتہائی مصنوعی۔ [illegible] حیرت ہوئی کہ چند سال بعد رشید صاحب نے اپنی کتاب مجھے دستخط کرکے بھیجی اور اس پر میرے لیے لکھا کہ جن کے بارے میں [illegible] جانتے ہیں جو میرکی غالب کے بارے میں تھی۔ اس پر میں چونکا اور مجھے "دیوانہ" کے [illegible] ہونے کا یقین آ گیا غالب [illegible] نہیں ہوا لیکن ہوش ضرور آ گیا۔

لیکن میں آسکر وائیلڈ کی گرفت سے بہت پہلے نکل چکا تھا۔ جس زمانے میں اس کا سوانح عمری پڑھ رہا تھا [illegible] کا [illegible] میرے ہاتھ لگ گیا۔ اس سے میں گورکی کی طرف مائل ہوا اور جب میں نے اس کا شاہکار ناول "ماں" پڑھا تو مجھے ادب کی حقیقی بلندی اور عظمت کا احساس ہوا۔

دل میں سوئے ہوئے سوالات پھر جاگنے لگے اور ایک روز محض اتفاقات سے ایک واقعے نے مجھے ایک نئی راہ پر ڈال دیا۔ تقریر کرنے کا مجھے بھی شوق تھا اور میرے دوست فرحت اللہ انصاری کو بھی۔ ہم دونوں انگریزی میں تقریریں کرتے تھے۔ وہ زمانہ یورپ میں [illegible] کے عروج کا زمانہ تھا اور ہندوستان میں تحریک آزادی کی لہریں اونچی اٹھ رہی تھیں اس لیے اس کی تقریروں کی طرح ان کی تقریروں میں بھی سیاسی الفاظ کی بہتات ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے فرحت کی زبان سے بورژوا کا لفظ سنا اور ان سے اس کے معنی پوچھے۔ جواب دینے کے بجائے وہ ہنسنے لگے۔ میں پھر لائبریری کی طرف بھاگا اور اس بار جب میں واپس آیا تو میری جیب میں لینن کی سوانح عمری تھی۔ مجھے اب یہ بالکل یاد نہیں ہے کہ وہ کس کی لکھی ہوئی تھی لیکن اتنا یاد ہے کہ جو دروازے گاندھی جی کی کتاب پڑھ کر اور نہرو کی تقریریں کر ذرا ذرا سے کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اس بار پورے کھل گئے تھے۔ اور مجھے پٹڑیوں پر لٹکی ہوئی کسانوں کی لاشوں کو دیکھ کر ان کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا تھا۔ میں فرحت کا شکرگزار ہوں کہ ان کی ایک ہنسی نے کتنے ہونٹوں کی کھوئی ہوئی ہنسی واپس دلا دی۔

اسی زمانے میں مجاز سے ملاقات ہوئی وہ ہنس مکھ اور تندرست تھا اور اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ دہانہ تب بھی بہت کم کھلتا تھا۔ لیکن ترنم کا جادو اپنے شباب پر تھا۔ مجھے یاد ہے ۱۹۳۶ء کی ایک شام مجاز رشید جہاں کے گھر پر اپنی کوئی نظم سنا رہا تھا۔ محمود الظفر اور شوکت عمر اور خواجہ منظور حسین بھی وہاں تھے۔ دو بچیاں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بچی نے کچھ کہا تو دوسری بچی نے یہ کہہ کر اسے خاموش کر دیا "چپ رہو باجا بج رہا ہے"۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ مجاز شاعر ہیں۔ ہم دونوں ایک ہی کورٹ پر ٹینس کھیلتے تھے۔ ایک روز مجاز ٹینس کھیل کر واپس جا رہا تھا کہ اس کی پتلون تار میں الجھ کر پھٹ گئی۔ عزت محمد نے ہنس کر کہا شاعر صاحب کی پتلون پھٹ گئی۔ اور میں نے مڑ کر دیکھا کہ یہ کون شاعر ہے۔ اسی رات کو یونین کے مشاعرے میں مجاز سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اس کی نظم اور ترنم دونوں میں جادو تھا۔ نظم "انقلاب" تھی اور اس کے ہر مصرعے میں مجھے اپنے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ اس دن سے ہم دونوں دوست ہو گئے۔ یہ دوستی بائیس سال تک اتنی ہی بے لوث اور خوبصورت رہی جتنی پہلے دن تھی۔

اس مشاعرے میں میں نے اپنی نظم سماج (?) پڑھی تھی جو ان شعروں پر ختم ہوتی تھی ؎

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائے جائے گی

کھلونے دے کے کب تک مفلسی بہلائی جائے گی

نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

جب میں شاعرے کے بعد باہر نکلا تو ایک ذہین آنکھوں اور بیمار چہرے کا طالب علم مجھے اپنے کمرے میں یہ کہہ کر لے گیا کہ "میں بھی انقلابی ہوں" اس کے کمرے میں زرٹہ بسیو گورکی کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر چند دوستوں کے ساتھ اس کی اپنی تصویر تھی جس کی پشت پر گورکی کا ایک اقتباس لکھا ہوا تھا۔ یہ سعادت حسن منٹو تھا اس نے مجھے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کے لیے دیے، وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا۔ میں جب اپنی تعلیم ختم کر کے لکھنؤ چلا گیا اور منٹو بمبئی تو اس نے مجھے کئی بار بمبئی بلایا۔ جب میں کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار اخبار میں کام کرنے کے لیے ۱۹۴۲ء میں بمبئی پہنچا تو میرے اور منٹو کے درمیان ادبی اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی۔ لیکن ہماری ذاتی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ ویسے تلخ لمحات بھی آئے اور تیز و تند کیفیت بھی پیدا ہوئی۔ اس رات منٹو بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا اور ہم دونوں نے مل کر ایک رسالہ نکالنے کی اسکیم تیار کی۔ شاہد لطیف نے اس کا نام "نیا ادب" تجویز کیا۔ یہ رسالہ پانچ چھ برس بعد لکھنؤ سے نکلا لیکن منٹو اور شاہد لطیف کے بجائے مجاز اور سبط حسن میرے ساتھ تھے۔ ■

سردار جعفری

چراغِ لالہ

میں نے اقبال پر جو ڈاکومنٹری فلم بنائی ہے اس میں آبجو کو، پیڑ، اور شاعری کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لالے کا پھول خودی کا مظہرِ جمال ہے اور شاہین خودی کا مظہرِ جلال۔ یہ تینوں علامتیں نئی نہیں ہیں۔ دوسرے مفاہیم کے شاعرانہ ابلاغ کے لیے استعمال ہوئی ہیں۔ پہلی علامت جوئے آب کی شکل میں گوئٹے کے یہاں سے آئی ہے اور پیامِ مشرق کی نظم نغمۂ محمد کے ترجمے میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس علامت کو اقبال نے دوبارہ استعمال نہیں کیا لیکن اس نے شاعر کے لیے علامت پیدا کر لی اور جاوید نامے میں اپنے لیے زندہ رود کا نام اختیار کیا۔

خودی کا مظہرِ جمال بننے کے لیے لالے کے پھول کو شاعرانہ عمل کی ایک طویل مدت سے گزرنا پڑا ہے اور خودی کا مظہرِ جلال بننے کے لیے شاہین نے بھی ایک شاعرانہ سفر طے کیا ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ خودی کے مکمل اظہار کے لیے شاعر نے ایک پھول اور ایک طائر سے کام لیا ہے۔ ہندو صنمیات (ICONO GRAPHY) میں بھی روح کے اظہار کے لیے ایک پھول اور ایک طائر کی علامت موجود ہے اور شاعری کی ایرانی روایت میں بھی حسن و عشق کے اسرار کے لیے ایک پھول اور ایک طائر کو اہمیت دی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اقبال کے لاشعور میں دونوں روایتوں کا پرتو ہو۔

ہندو صنمیات میں کنول کا پھول انسانی وجود کے اس نکتے کی وضاحت ہے کہ اس کا مادّی وجود روحانی بالیدگی حاصل کر سکتا ہے۔ جس طرح کنول کا پھول کیچڑ اور پانی میں پیدا ہوتا ہے لیکن ان سے بلند ہو کر ہوا میں کھلتا ہے اور اس کی پتیاں اور پنکھڑیاں پانی سے تر اور کیچڑ سے آلودہ نہیں ہوتیں۔ اسی طرح ہنس روح کی علامت ہے۔ وہ پانی میں پیدا ہوتا ہے، پانی میں پرورش پاتا ہے لیکن یہاں سے بے نیاز ہو کر آسمان کی پہنائیوں میں پرواز کرتا ہے اور ہر سمت میں جا سکتا ہے۔ اس کا نیلگوں آسمان اقبال کے شاہین کے آسمان کی طرح بے پایاں ہے۔ اسی لیے ہندو بھگت اپنی روحانی ریاضت کے لیے ہنسا کا ورد کرتے ہیں۔ سنسکرت اور ہندی میں آخری حرف مکمل طور پر ساکن نہیں ہوتا۔ اس میں اک سی حرکت شامل ہوتی ہے اور ہنس کو ہنسا بنا دیتی ہے۔ یہ ہنسا ورد کے دوران بار بار کی تکرار سے "سوہم" بن جاتا ہے۔ اس کا مفہوم ہے کہ "جو وہ ہے وہ میں ہوں" اس لیے "سوہم" اور اس کا مذکر "سوہنگ" انا الحق کے ہم معنی ہیں۔ اندر جاتی ہوئی سانس "ہم" یا "اہم" ہے اور باہر آتی ہوئی سانس "سا" اور سانس کی یہ ریاضت تکمیلِ ذات کا عمل ہے۔ اس تکمیلِ ذات کو کبیر داس نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے

نرگن آگے سرگن ناچے
باجے سوہنگ تورا

یعنی ذات کے سامنے صفات رقص کر رہی ہیں اور انا الحق کا ساز بج رہا ہے۔ اس سے ملتا ہوا خیال لیکن ایک شانِ جلال کے ساتھ اقبال کے یہاں اس طرح آیا ہے ؎

میری صدائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

کنول اور ہنس اور نور کی جمالیاتی دنیا ہے اور دونوں کی پاکیزگی کی دنیا ساتھ شفاف فضا۔ اس میں مادی اور روحانی کیفیات کا توازن ہے۔

شاعری کی ایرانی روایت میں گلاب کا پھول حسن ہے اور بلبل عشق۔ محبوب، باغ اور پھول کی صفات سے آراستہ ہے اور عاشق بلبل کے دل کی بے تابی اور اداس کے نغمہ و فریاد کا پیکر۔ پھول میں ایک شان بے نیازی ہے اور تمکنت و سطوت اور بلبل میں انداز نیاز مندی ہے اور مسلسل ترنم۔ یہاں لذتِ وصل خواب و خیال ہے اور لذتِ فراق حقیقت ——— فراق جو جلا اور آرزو کو زندہ رکھتا ہے، نغمے کو سوز عطا کرتا ہے اور عشق کو یکتائی بخشتا ہے۔ اقبال لذتِ وصال سے زیادہ لذتِ فراق کا شاعر ہے اور عالمِ فراق میں اس کے نغمے کا تلاطم بڑھ جاتا ہے۔

انا ماری شمل کا خیال ہے جس کی میں کسی طرح تصدیق نہیں کر سکا کہ صوفیا کے یہاں گلاب کا پھول زندگی کے حسنِ کامل کا مظہر ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ اقبال نے گلاب کے مقابلے میں لالے کے پھول کو کیوں ترجیح دی ہے۔ سرو صنوبر کے ساتھ قمری ہے، گلاب کے ساتھ بلبل ہے، لیکن لالے کا پھول تنہا ہے۔ اگر کوئی اس کے ساتھ ہے تو انسان۔ لالے کی طرح تنہا اور لالے کی طرح جذبۂ شیدائی اور لذتِ یکتائی سے سرشار۔ دونوں کو اقبال نے شعلۂ سینائی کہا ہے۔ گویا دونوں کا یہ مظہرِ جمال انسان کی علامت بھی ہے۔ یعنی یہ انسان کے حسن کا مظہر ہے۔ شاہین جو مظہرِ جمال کے مقابلے میں مظہرِ جلال ہے لالے سے اس طرح کا کوئی رشتہ نہیں رکھتا جیسا رشتہ کنول اور ہنس میں ہے، گلاب اور بلبل میں ہے۔ اس طرح مظہرِ جمال اور مظہرِ جلال ہم آہنگ نہیں ہو پاتے۔ ان میں ایک طرح کی دوئی ہے۔ ایک طرح کی DICHOTOMY ہے۔ یہ دو مختلف تصورات بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اقبال کے بہت سے پرستاروں کو شاہین کے تصور نے پریشان کیا ہے۔

اب اس سے پہلے کہ میں لالے کے شعری سفر کا ذکر کروں اس سوال پر کچھ کہنا چاہتا ہوں کہ استعارے اور علامت کا ظہور تخلیقِ شعر میں کس طرح ہوتا ہے۔ میں اس کی مثال خود اپنے اشعار سے دے رہا ہوں۔ معذرت کے ساتھ۔ میں کسی دوسرے شاعر کے شعری عمل کے بارے میں اس یقین اور وثوق سے بات نہیں کر سکتا جس طرح اپنے شعری عمل کے بارے میں کر سکتا ہوں۔

ایک بار علی گڑھ سے ایک خاتون نے مجھے لکھا کہ "میری بیٹی نے آپ کی نظم "میرا سفر" ریڈیو پر سنی۔ اس میں آپ نے کہا ہے کہ جاڑوں کی ہوائیں دامن میں / جب فصلِ خزاں کو لائیں گی / رہرو کے جواں قدموں کے تلے / سوکھے ہوئے پتوں سے میرے / ہنسنے کی صدائیں آئیں گی / دھرتی کی سنہری سب ندیاں / آکاش کی نیلی سب جھیلیں / ہستی سے مری بھر جائیں گی / اور سارا زمانہ

دیکھیے گا، یہ قصہ مرا افسانہ ہے / ہر عاشق ہے سردار یہاں / ہر معشوقہ سلطانہ ہے۔ اس بند میں آپ نے ندی کو سنہری کہا ہے۔ میری بیٹی نے آپ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ندی کا رنگ سفید ہوتا ہے۔

میں نے خاتون محترم کو رسمی سا جواب دے دیا لیکن آج اس واقعے کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ شعر فہمی کے لیے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی۔ زبان کا علم بھی کافی نہیں ہوتا۔ یہ راز صرف شعری تربیت سے کھلتا ہے۔ لفظ علامت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سنہری رنگ دراصل زندگی، رنگینی اور ابدیت کی علامت ہے۔ یہ سنہرا رنگ مختلف زبانوں میں استعمال ہوتا رہا ہے اور یہاں میری نظم میں بھی یہ لفظ علامتی طور سے استعمال ہوا ہے۔ میری نظم کا موضوع بظاہر موت ہے لیکن دراصل موضوع زندگی ہے۔ ندی وقت اور زندگی دونوں کی علامت ہے اس لیے سنہری ندی لازوال زندگی کی علامت ہے۔ اس نظم کے سیاق و سباق میں خزاں کے زرد پتے جو آنے والی نسلوں کے جوان قدموں کے نیچے پس رہے ہیں تجدیدِ بہار کی علامت ہیں اور آکاش کی جھیلوں کا نیلا رنگ ہندو نغمیات کے مطابق روحانیت اور ابدیت کی علامت ہے۔ ان دونوں کی مناسبت نے سفید پانی کو سنہری بنا دیا ہے۔ زرد پتوں نے رنگ کی مناسبت سے اور آکاش کی نیلی جھیلوں نے اپنی معنویت کے اعتبار سے۔ اس طرح سلطانہ کے لفظ کے شاہانہ کردار نے بھی اثر ڈالا ہے۔ سنہری رنگ کا انتخاب شعوری طور سے نہیں کیا گیا ہے۔ شعر کے تخلیقی عمل کی طلسماتی کیفیت کے زیرِ اثر الفاظ خود بخود آگئے ہیں اور لغوی معنی سے گزر کر علامتی معنوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ عمل میری ذاتی خصوصیت نہیں ہے۔ ہر شاعر اسی قسم کے تخلیقی، طلسماتی اور پُراسرار روحانی عمل سے گزرتا ہے۔ جب ہم اقبال کی شاعری میں لالے کی علامت سے بحث کریں گے تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی اسی عمل کی کارفرمائی ہے۔ انھوں نے اس عمل کو خود اس شعر میں بیان کر دیا ہے ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

شعر کی آرائش باہر سے نہیں کی جا سکتی۔ تمام تشبیہیں، استعارے، علامتیں حسنِ معنی سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے لفظ اور مفہوم، صورت اور معنی ایک ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی حسنِ معنی وہ عروسِ لالہ ہے جس کی نقاب کشائی شاعر نسیمِ سحر کی طرح کرتا ہے ؎

عروسِ لالہ مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیمِ سحر کے سوا کچھ اور نہیں

کسی انگریز نے اقبال سے پوچھا تھا کہ کیا رسول اللہؐ پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا جس کو وہ لفظوں کا پیراہن دے دیتے تھے یا الفاظ نازل ہوتے تھے۔ اقبال نے جواب میں کہا کہ الفاظ نازل ہوتے تھے اور ثبوت میں اپنے شاعرانہ الہام (INSPIRATION) کا ذکر کیا اور بتایا کہ پورے پورے مصرعے اور اشعار ڈھلے ڈھلائے نازل ہوتے ہیں۔ یہ تخلیق کی الہامی (INSPIRED) کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات شاید آئن سٹائن نے کہی ہے کہ الہام پیغمبر کو بھی ہوتا ہے اور شاعر اور سائنس دان کو بھی، لیکن ہر الہام کی شدت مختلف ہوتی ہے۔ پیغمبر کا الہام شدید تر ہوتا ہے۔ شاعرانہ الہام جتنا شدید ہوگا استعارہ اور علامت کا حسن اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ اس کو غالب نے نوائے سروش کہا ہے۔

یہ علم اب تک کسی کو نہیں بڑے سے بڑے شاعر اور ماہر نفسیات کو بھی نہیں کہ تخلیقِ شعر کا کارخانہ اندرونِ ذات کس طرح کام کرتا ہے۔ شعور اور احساس میں وہ کیفیاتی تبدیلی کس طرح ہوتی ہے جس کو شاعرانہ الہام کہتے ہیں۔ کوئی شاعر تخلیقِ شعر کے آخری لمحے تک۔ اس سے واقف نہیں ہوتا کہ کس طرح کا مصرعہ کن الفاظ اور کن استعاروں کے پیراہن پہن کر نازل ہونے والا ہے اور جب وہ ذہن و دل سے زبان اور کاغذ پر منتقل ہوتا ہے تو ایک عجیب حیرت ناک مسرت کے ساتھ اس کی ملاقات کی جاتی ہے جو کم تر درجے کے شاعر مشقِ سخن کے زور پر محض تک بندی کر کے شعر کہتے ہیں وہ اس لذتِ تخلیق سے محروم ہیں۔ کبھی کبھی بڑے شاعر بھی الہام کے کمزور لمحوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان لمحوں میں معمولی قسم کا شعر کہتے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی عظیم تخلیق کے دوران شدید لمحے اور کمزور لمحے یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ طویل نظموں میں یہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی تخلیق میں شاعر ترمیم اور اصلاح کرتا ہے گویا الہام کے ساتھ ریاض بھی ضروری ہے۔ طالسطائی کے عظیم ناول جنگ اور امن کے متعدد مسودے اور ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی مشہور نظم ویسٹ لینڈ (WASTE LAND) کے دو ورژن (VERSION) اس پر شاہد ہیں۔

شاعرانہ الہام غیر مشروط اور لامحدود نہیں ہوتا۔ اس میں اکتسابی علوم کا پرتو ہوتا ہے اور معاشرتی حالات اور ذاتی تجربات کی پرچھائیاں۔ الہام اسی زبان میں ہوتا ہے جس سے شاعر واقف ہے اور انھیں علوم کے دائرے میں جو شاعر نے حاصل کیے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال پر چینی یا لاطینی زبان میں الہام ممکن نہیں تھا اور نہ کوئی فزکس (PHYSICS) کا فارمولا نازل ہو سکتا تھا جیسے آئن سٹائن پر نازل ہوا تھا جو اضافیت کے نظریے کی بنیاد بنا (اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی تمام ذہنی اور روحانی کیفیات اور باطنی طاقت کے باوجود الہام ماحول اور تاریخ سے بے نیاز نہیں ہوتا) وقت حقیقت ہو یا احساس بہرحال الہام وقت کے دائرے میں اسیر ہوتا ہے۔ اس کے اثرات وقت کے دائرے کو توڑ دیتے ہیں اور تاریخ کی حد بندیوں سے گزر جاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک شاعر کا الہام دوسرے شاعر کے الہام سے مختلف شکل اختیار کرتا ہے۔ ایک ہی وقت میں دو بڑے شاعر دو مختلف معاشروں میں رہ کر دو بالکل مختلف اور بعض اوقات متضاد کیفیات کا اظہار کرتے ہیں اور ایک ہی واقعے کے زیرِ اثر ایک دوسرے کے برعکس استعارے اور علامتیں تراشتے ہیں کیوں کہ دونوں کی نفسیاتی کیفیات اپنے اپنے معاشرے کے زیرِ اثر ہوتی ہیں۔ (ایک ہی معاشرے میں دو اور دو سے زیادہ نفسیاتی کیفیات ممکن ہیں)، اگر ہم اقبال اور ٹی۔ ایس ایلیٹ کے شعری عمل پر ایک نظر ڈالیں تو اس نکتے کی وضاحت میں مدد ملے گی۔

دونوں بڑے شاعر ہیں اور ہم عصر ہیں۔ دونوں اعلیٰ درجے کے خلّاق ہیں۔ دونوں اپنے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے عہد کے علوم پر حاوی ہیں۔ دونوں مغرب کی مادیت پرستی[1] سے نالاں ہیں۔ دونوں کے پاس مذہبی اقدار اور روحانی علاج ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے اتنے الگ ہیں کہ میرے خیال میں اقبال نے کبھی ایلیٹ کو گوئٹے کی طرح اپنا ہمنوا نہ سمجھا ہوگا۔ جب ۱۹۳۲ء میں اقبال لندن گئے ہیں تو ایلیٹ اچھی خاصی شہرت کا مالک تھا۔ اس کی نظم ویسٹ لینڈ (WASTE LAND) جدید

---

[1] سرمایہ دارانہ نظام کی مادیت پرستی جس کی بنیاد نفع اندوزی کی ہوس پر ہے فلسفیانہ مادیت سے مختلف چیز ہے۔ بعض لوگ ان دونوں کو خلط ملط کرتے ہیں۔

[illegible] کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ اگر اقبال نے یہ نظم پڑھی ہوگی تو اپنے مخصوص انداز میں یہی کہا ہوگا کہ ان کا یہ قوم ذوقِ تماشا [illegible] کے سر میں پہنچ چکی ہے۔ اقبال ورڈز ورتھ اور ولیم بلیک کی اقدار سے زیادہ قریب تھے۔

ایلیٹ کی ۱۹۱۵ء کی نظم THE LOVE SONG شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے ابتدائی تین مصرعے ایک نہایت اوریجنل اور حیرت انگیز پیکر کے حامل ہیں۔

LET US GO, THEN, YOU AND I,
WHEN THE EVENING IS SPREAD OUT
AGAINST THE SKY,
LIKE A PATIENT ETHERISED
UPON A TABLE

تقریباً اسی زمانے میں اقبال نے ایک نظم 'بزم انجم' کہی۔ وہ بھی شام کی ایک تصویر سے شروع ہوتی ہے لیکن اس میں شام کا رنگ کچھ اور ہے ؎

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو
طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے
پہنا دیا شفق نے سونے کا سارا زیور
قدرت نے اپنے گہنے چاندی کے سب اتارے

اقبال کے یہاں شام دلہن کی طرح سجی ہوئی ہے اور ایلیٹ کے یہاں اس پر موت کی پرچھائیں ہے۔ وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک بے ہوش مریض کی طرح لیٹی ہوئی ہے۔ THE LOVE SONG کو پانچ سال بعد آنے والی نظم ویسٹ لینڈ (WASTE LAND) کی ذہنی تیاری میں ایک خاص مقام دیا جا سکتا ہے اور ویسٹ لینڈ یورپ کی بورژوا تہذیب کی موت کا اعلان ہے۔ وہ تہذیب جو پہلی جنگ عظیم کی قیامت سے دوچار ہو کر پاش پاش ہو گئی۔ اسی پر اقبال نے دانائے فرنگ کو مخاطب کر کے یہ تبصرہ کیا تھا ؎

عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است

اب موسمِ بہار کی بارش سے مردہ پتھروں کے سینے میں تو لائیلک کے پھول کھل سکتے ہیں لیکن انسان کے مردہ دلوں میں کوئی کونپل نہیں پھوٹ سکتی۔ جذبات کے سارے چشمے خشک ہو چکے ہیں۔ اگر کچھ باقی ہے تو STONY RUBBISH اور FEAR IN HANDFUL OF DUST باقی ہے۔ یہ جس تہذیب کا زوال ہے اس کی روح کو انیسویں صدی کے فرانسیسی مصور گوگاں (GAU GUIN) نے ان لفظوں میں سمیٹ لیا تھا۔

A TERRIBLE EPOCH IS BEING PREPARED IN EUROPE
FOR THE COMING GENERATION ; THE REIGN OF GOLD ,

یہ الفاظ لکھنے کے بعد گوگاں فرانس کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ایلیٹ اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ سرمایہ داری شہنشاہیت کے تہذیبی بحران کا اس کے معاشی اور سیاسی بحران سے کیا رشتہ ہے جب کہ غلام آباد ہندوستان کے اقبال کی نگاہ میں یہ رشتہ واضح تھا اس لیے اقبال عالم پیر کو مشرق میں دوبارہ جواں ہوتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ اقبال کی نظم کی لالہ رنگ شام صبح عیش کی تمہید ہے۔ ایلیٹ کی نظم کی شام اس کیفیت سے محروم ہے۔

اقبال کے چاروں طرف ہندوستان کی تحریک آزادی کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور یہ تحریک طرزِ کہن کو چھوڑ کر آئینِ نو کا استقبال کر رہی تھی لیکن مغرب آئینِ نو سے خوفزدہ تھا۔ "منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں" THE LOVE SONG اور WASTE LAND کو پڑھ کر عہدِ رفتہ کی بہادر یا دانوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جنھوں نے بابل جیسے زوال پذیر اور بدکار شہر کو ناحشہ کہہ کر یاد کیا تھا۔ چونکہ ایلیٹ کی شاعری کا موضوع مغرب کی تہذیب کا زوال ہے اور اقبال کی شاعری کا موضوع مشرق کی تہذیب کا نشاۃ ثانیہ اس لیے جس وقت ایلیٹ ویسٹ لینڈ لکھ رہا تھا اس وقت اقبال کے قلم سے اس طرح کے اشعار کی تراوش ہو رہی تھی:

رہزنی را کہ بنا کرد جہاں بانی گفت　　تیغ او جز بسر و سینۂ یاراں نشکست
بے حجابانہ بہ بانگ دف و نے می رقصد　　جامے از خون عزیزاں تنک مایہ بدست

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست　　عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت
یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند　　ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت

اقبال کے الفاظ میں بطونِ عالم میں جو انقلاب پرورش پا رہا تھا اس کے عرفان نے کوہکن اور یوسف کے تلمیحی کردار دل کے معنی بدل دیے۔ کوہکن ایک شکست خوردہ عاشق تھا جس کا مقدر خودکشی تھا۔ اقبال کے یہاں وہ آج کے فاتح انسان کا استعارہ ہے اسی طرح یوسف اب زلیخا کے افسوں کا شکار نہیں بلکہ عہدِ نو کا نیا حکمراں ہے۔ مغرب کا زوال مشرق کا عروج تھا۔ ایک کا سمبل میز پر پڑا ہوا بے ہوش مریض ہے۔ دوسرے کا سمبل لالہ کا خوبصورت پھول۔ یہ پھول جو یہاں نور اور رنگ کی علامت ہے اپنے سینے میں آزادی اور قربانی کی علامت چھپائے ہوئے ہے۔ بانگِ درا کی نظم "بزمِ انجم" میں ظاہر ہونے سے پہلے یہ اسرارِ خودی میں خونِ حسین کا سمبل بن کر ابھرا تھا جب ابرِ شہادت سے

بر زمینِ کربلا بارید و رفت
در بیاباں لالہ ہا کارید و رفت

اسی کے ساتھ ہی اگر ہم پیامِ مشرق میں قطعات کے باب پر لکھے ہوئے لالۂ طور کے عنوان پر غور کریں اور اس مصرعے کو بھی یاد کر لیں کہ "لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز"، تو خودی کے مظہر جمال کی پوری تصویر بن جاتی ہے۔ لالہ نور کی علامت ہے، رنگ کی علامت ہے، الہامی کیفیت کی علامت ہے، شہادت اور قربانی کی علامت ہے، آزادی کی علامت ہے اور اس انسان کامل کی علامت ہے جس میں خدائی صفات ہوں۔

اپنی نظم "طلوعِ اسلام" میں جو ترکوں کی فتح اور برطانیہ کی شکست پر کہی گئی ہے، اقبال نے لالے کے پھولوں کا بہت

خوب صورت استعمال کیا ہے ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

اسی زمانے کی ایک فارسی غزل میں جو "پیامِ مشرق" میں شامل ہے حافظ کے ایک شعر کو اسی تبدیلی کے ساتھ یوں کہا گیا ہے ؎

در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمدہ اند این ہمہ خونیں کفناں

اس کا غالب کے مشہور شعر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ لالہ و گل کی شکل میں خاک سے نمایاں ہونے والی گزشتہ صورتیں نہیں ہیں بلکہ مجاہدانِ آزادی ہیں جنھیں "طلوعِ اسلام" کے ایک شعر میں "اطلس قبایانِ تاتاری" کا خوبصورت نام دیا گیا ہے۔ انھیں کے خون سے تہذیب نکھرتی ہے، لالہ سیراب ہوتا ہے اور اپنا رنگ حاصل کرتا ہے۔ لالہ کی سیرابی کھوکھلی اور زوال پذیر تہذیبوں کی موت اور نئی تہذیب کی آرائش ہے۔ اس کا اشارہ "طارق کی دعا" میں ملتا ہے ؎

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

اقبال کا یہ عقیدہ تھا کہ عربوں نے قیصر و کسریٰ کے ملکوں کو اپنی تہذیب سے نئی زندگی عطا کی اور یورپ کو قرونِ وسطیٰ میں علوم کے خزانے عطا کیے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ کے نشاۃِ ثانیہ میں عربوں کی دی ہوئی سائنس اور علوم شامل ہیں۔ اس شعر کا اشارہ فلسطینی عربوں کی طرف بھی ہو سکتا ہے جو اس وقت برطانوی استعمار کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو رہے تھے۔ صیہونیت اور مغربی استعمار کے خلاف آخری جنگ کو جو اب لڑی جا رہی ہے اقبال نے آج سے پینتالیس سال پہلے دیکھ لیا تھا۔ یہ بات میں وثوق کے ساتھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ضربِ کلیم میں "فلسطینی عرب سے" ان برجستہ لفظوں میں خطاب کیا گیا ہے ؎

ترا علاج جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے زمانے میں امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

میرا خیال ہے کہ لالے کی مناسبت سے اقبال نے تبدیلی اور انقلاب کے لیے سرخ رنگ کی علامت استعمال کی ہے۔ یہ شہادت کا رنگ ہے جس کی گواہی وہ سرخ پرچم بھی دیتا ہے جو کربلائے معلیٰ میں روضے کے گنبد پر لہراتا ہے۔ "مسجد قرطبہ" میں روحِ مسلماں کے اضطراب کا ذکر کرنے کے بعد نئی تبدیلی کی بشارت ایک ایسی شفق رنگ شام سے دی گئی ہے جس میں میرے نزدیک "بزمِ انجم" میں ظاہر ہونے والے لالے کے پھول لعلِ بدخشاں کے ڈھیر بن گئے ہیں۔ ایک استعارے سے دوسرے ملتے جلتے استعارے تک جانے کا شاعرانہ عمل دونوں استعاروں کو ہم معنی کر دیتا ہے۔ وہ راہ جو لالے کے پھول سے لعلِ بدخشاں تک جاتی ہے، سرخی ہے اور وہ انقلاب، شہادت اور آزادی کا راستہ ہے۔ اقبال کی شاعری میں لالے کا پھول ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ بالِ جبریل کے ساقی نامے میں انھوں نے اس

کو تمام پھولوں سے الگ شمار کیا ہے ؎

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل، لالہ، خونیں کفن

یہاں تخصیص سے شاعر نے گل کو "گلاب" کے معنوں میں استعمال کیا ہے اور لالے کو ایک صفت سے متصف کر کے برتر بنا دیا ہے۔ یہاں میں اپنا میری سمجھ کی بات دہرانا چاہتا ہوں۔ اگر گلاب خدا کے حسن کامل کی علامت ہے تو وہ شہید ازل نہیں ہو سکتا اس لیے خونیں کفن لالہ انسان کا سمبل بن جاتا ہے۔ انسان جس سے ہنگامۂ عالم گرم ہے، وہ کوکب جس سے خدا کا جہاں روشن ہے اور جس کا زوال خود خدا کا زیاں ہے۔

اقبال نے یہ نکتہ کبھی کھل کر بیان نہیں کیا کہ جب انسان خود کو آشکار کرے گا تو خدا آشکار ہوگا لیکن یہ خیال ان کے افکار اور اشعار میں جھلکتا رہتا ہے۔ یہ بات انھوں نے کسی گریزاں لمحے میں بے سوچے سمجھے نہیں کہی تھی کہ "میرے آبا و اجداد برہمن تھے اور انھوں نے اپنی زندگی اس فکر میں گزاری کہ خدا کیا ہے۔ میں اپنی زندگی اس فکر میں گزار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے۔ یہ خیال ان کی فکر کا ایک اہم حصہ ہے کہ "خود خدا بھی تلاش آدم میں ہے"۔ انسان تکمیل خودی کی منزلوں میں جتنا آگے بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرتا ہے اور اس طرح خدا کو اپنی ذات کی تکمیل سے آشکار کرتا ہے۔ اقبال کے انسان کامل اور مارکس کے تصور کے مکمل انسان میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ جو چیز اقبال کے یہاں خدائی صفات کا درجہ رکھتی ہے وہ مارکس کے یہاں انسان کی تمام تخلیقی اور روحانی قوتوں کے بروئے کار آنے کا نام ہے اور لالہ جو انسان کا سمبل ہے اس راز کو یوں بیان کرتا ہے:۔

کہا لالۂ آتشیں پیرہن نے
کہ اسرار جاں کی ہوں میں بے حجابی

وجود کا آتشیں ہونا لذت تخلیق کو ظاہر کرتا ہے اور انسان اس لذت سے آشنا ہے۔ یہ شعر جو اقبال کی آخری عمر کا شعر ہے ہمیں نظم "لالۂ صحرا" سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

سردار جعفری

پابلو نرودا کی شخصیت

کتابوں کی دوکانوں پر جانا اور وہاں گھنٹوں نئی کتابوں کی ورق گردانی کرنا میری پرانی عادت ہے۔ کتابوں کی خریداری ایک ادیب اور شاعر کے لیے ضرورت بھی ہے اور عیاشی بھی اور دونوں کے لیے جیب میں روپیہ ہونا ضروری ہے۔ روپیہ کی کمی کی وجہ سے اپنے ذوق کی تسکین میں کتابوں کی دوکانوں میں مفت کتابیں پڑھ کر کرتا رہا ہوں۔

یہ غالباً ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے۔ بمبئی میں کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر راج بھون میں عوامی دارالاشاعت کی دوکان تھی۔ ایک دن میں اس میں داخل ہوا تو سیکڑوں کتابوں میں سے ایک انگریزی کتاب نے میری نظر کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کا نام "RESIDENCE ON EARTH" تھا۔ لکھنے والے کا نام بالکل نیا تھا "پابلو نرودا" — اور یہ نام میں نے پہلے نہیں سنا تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ عام روش سے ہٹ کر اس کتاب پر مصنف کا نام بڑے بڑے حرفوں میں پورے گرد پوش پر ترچھا لکھا تھا اور کتاب کا نام اوپر داہنی یا بائیں طرف ایک کونے میں چھوٹے چھوٹے حرفوں میں چھپا تھا۔ یہ نظموں کا ایک انتخاب تھا جس میں اصل نظمیں ہسپانوی زبان میں تھیں اور سامنے کے صفحے پر ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں تھا۔

پابلو نرودا کا نام اجنبی ہونے کے باوجود مجھے اجنبی نہیں لگا۔ کیوں کہ اس کا پہلا لفظ پکاسو کے نام کا حصہ تھا اور دوسرا لفظ چیکوسلواکیہ کے ایک پرانے ادیب کی یاد دلا رہا تھا۔ مجھے اب یاد نہیں کہ گرد پوش پر کچھ لکھا تھا یا نہیں، لیکن کتاب میں کوئی دیباچہ نہیں تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ شاعر اپنے چیک نام کے باوجود ہسپانوی ہے۔ یہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ چلی کا باشندہ ہے۔

اب میں نے کتاب بیچ سے کھولی تو سب سے پہلی نظم جس پر نگاہ پڑی اس کا عنوان تھا۔

"ODE TO FEDRICO GARCIA LORCA"

(نظم فیڈریکو گارسیا لورکا کے نام) لورکا میرا بڑا محبوب شاعر ہے۔ جس کی نظمیں میں نے نرودا کا نام سننے سے دس سال پہلے پڑھی تھیں۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی کے دوران فرانکو کے فاشسٹ سپاہیوں کے ہاتھوں غرناطہ میں قتل کیا گیا۔ اور میں نے اپنے احباب کے ساتھ اس کی موت کا ماتم کیا تھا۔ میں بارہا اس کا نام اپنے مضامین میں لکھ چکا تھا۔ جس طرح دو اجنبی ایک مشترک دوست کے واسطے سے دوست بن جاتے ہیں، اسی طرح لورکا پر نرودا کی نظم نے اس کی اجنبیت دور کردی اور نظم کے آخری مصرعوں میں میں نے اس نئے شاعر کو دیکھنے کی کوشش کی۔

THIS IS LIFE FEDERICO

THIS IS ALL

THE FRIENDSHIP A MELONCHOLY MANLY MAN CAN OFFE,

(ترجمہ:۔ یہ ہے زندگی فیڈریکو۔ یہی کچھ ہے جو ایک اداس لیکن مرد انسان کی محبت تمہیں پیش کر سکتی ہے۔)

لیکن اس کا چہرہ اب بھی نقاب میں چھپا رہا۔

میں نے ابھی تک کتاب خریدنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ بس اس کے ورق الٹ رہا تھا اور نظمیں پڑھ رہا تھا۔ شروع کی نظمیں اپنے حساس الفاظ اور خوبصورت امیجری کے باوجود کچھ ابھی ابھی لگیں۔ کئی نظموں میں موت اس طرح جھانکتی دکھائی دی جیسے وہ شاعر کی محبوبہ ہو۔ ایک نظم پڑھ کر گمان ہوا کہ شاعر ہندوستان یا اس کے قرب و جوار کے ممالک کی سیر کر چکا ہے لیکن جب میں نے کتاب کے درمیانی حصے کی نظمیں پڑھیں جو اسپین کی خانہ جنگی سے متعلق تھیں اور خاص طور سے :۔

"EXPLAINING A FEW THINGS"

"THE INTERNATIONAL BRIGADE ARRIVES AT MEDIRD"

(چند باتیں، بین الاقوامی بریگیڈ کی آمد میڈرڈ میں)

تو شاعر کی ساری شخصیت بے نقاب ہو کر سامنے آگئی اور وہ اپنے ہی قبیلے کا ایک انقلابی شاعر نکلا۔ اور جب میں نے اس کی کتاب کی آخری نظم کے آخری مصرعے پڑھے :۔

LOOK AT THIS NEW HEART THAT GREETS YOU

WITH ITS OVERFLOWING FLOWER DETERMINED AND GOLDEN.

(ترجمہ:۔ اس نئے دل کو دیکھو جو تمہیں تہنیت دے رہا ہے

تمہیں ایک خوبصورت پھول پیش کر رہا ہے، حوصلہ مندی اور سنہری)

تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ دیوانِ حافظ سے فال نکل آئی ہے۔ پابلو نرودا میرا نیا دوست ہے جو کسی نہ کسی دن کسی نہ کسی طرف سے ضرور آئے گا۔

لورکا اور پابلو نرودا ہسپانوی خانہ جنگی کے زمانے میں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے تھے۔ یہ آگ، بارود، خون اور شاعری کا رشتہ تھا۔ یہیں سے پابلو نرودا کی شاعری میں نیا موڑ آیا اور وہ انقلابی اور عوامی آہنگ پیدا ہوا جو نرودا کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی سے اسٹالن گراڈ کے مورچے تک اور وہاں سے ایٹم بم کی دہشت ناکی اور پھر عالمی امن تحریک کے شباب تک پابلو نرودا صرف ایک شاعر اور مغنی ہی نہیں تھا بلکہ ایک انقلابی سپاہی اور مجاہد بھی تھا۔ جو پورے امریکی خطے کا ضمیر بن چکا تھا اور انسانیت کے ضمیر کو بیدار کر رہا تھا۔

۱۹۴۲ء میں وہ میکسیکو میں چلّی کا سفیر تھا۔ ایک دن لوگوں نے کیا دیکھا کہ سارے شہر پر عجیب و غریب پوسٹر لگے ہوئے ہیں، جن پر نرودا کی نئی نظم "اسٹالن گراڈ" چھپی ہوئی تھی۔ ان میں امریکہ اور انگلستان کے رویے کے خلاف احتجاج کی آواز تھی جو اسٹالن گراڈ کے مورچے پر لڑنے والے بہادروں کی امداد کرنے سے گریز کر رہے تھے اور ہٹلر کے خلاف دوسرا جنگی محاذ کھولنے میں تاخیر سے کام لے رہے تھے۔

جب تیرا دل ہزاروں گولیوں سے زخمی ہے
جب اے اسٹالن گراڈ!
زہریلے بچھو تیرے دل پر ڈنک مارنے کو تیار ہیں
اس وقت نیویارک ناچ رہا ہے
لندن سوچ رہا ہے
لیکن میں صرف ایک لفظ کہتا ہوں
——— بدمعاش
اب میں اس دنیا کو زیادہ برداشت نہیں کرتا
اب ہم اس دنیا کو زیادہ برداشت نہیں کر سکتے
جہاں شُہدا تنہا جان دے رہے ہوں

یہ ایک شاندار نظم تھی ۔

رات کے وقت سویا ہوا مزدور اپنی نیند سے جاگتا ہے
اور اندھیرے کے دل میں اپنا ہاتھ ڈال دیتا ہے
وہ پوچھتا ہے
اے صبح ، اے صبح کے سورج ،
اے تھرتھراتی ہوئی ، جھلملاتی ہوئی روشنی
اپنے روشن ہونٹوں سے یہ بتا
کیا عوام کے بے داغ ہاتھ پہلے کی طرح
اپنی عزت اور مزدور کے قلعے کی حفاظت کر رہے ہیں؟
جواب دے اے صبح
کیا لوہا پہلے کی طرح اپنی طاقت کے شعلے کو تیرے چہرے کے سامنے لہرا رہا ہے ؟

اسٹالن گراڈ پر نرودا کی ایک اور نظم ہے جو اس زمانے کی یادگار ہے اور اتنی ہی شاندار ہے ۔
دیوانِ غالب ' دیوانِ حافظ کی طرح پابلو نرودا کی نظمیں برسوں میری رفیق رہیں اور ایک دن میں حیران رہ گیا جب میں نے چین کی آزادی کے مجاہدوں اور انقلابیوں کو تہنیت دیتے ہوئے بہت سے قدیم اور جدید شاعروں کے ساتھ پابلو نرودا کا نام بھی نظم کر دیا ۔ وہ میرے شعور کا حصہ بن چکا تھا اور خون میں تحلیل ہو کر نظموں اور شعروں میں ڈھلنے لگا تھا ۔
میرے اور پابلو نرودا کے قد و قامت میں فرق تھا ۔ وہ مجھ سے بہت بڑا شاعر تھا ۔ جو فرق اقبال نے اپنی ذات میں اور گوئٹے کی ذات میں محسوس کیا تھا ، وہی فرق میں نے اپنے اور نرودا کے درمیان پایا ۔ لیکن میری اور چلی کے اس دل نواز شاعر کی دھڑکنیں ایک تھیں ۔ اور میں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان مشترکہ قدر صرف اسپین اور چین کی تحریکِ آزادی اور فاشسٹ دشمنی ہی نہیں ہے ۔ جس کا بھرپور

احساس جواہر لال نہرو نے ہندوستان کو دلایا تھا، صرف سوویت یونین اور کمیونزم کی محبت ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان شاعری کی ایک مشترک روایت بھی ہے یعنی والٹ وھٹ مین[1] اور مایاکوفسکی[2] کی وراثت جس سے دونوں نے اپنے ظرف کے مطابق فیض حاصل کیا ہے۔

اب میں پابلو نرودا کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی فکر میں تھا اور ایک دن ۱۹۴۸ء میں خبر آئی کہ پولینڈ کے شہر ورلسلا (WROSLOW) میں فرانس کے مشہور نوبل انعام یافتہ سائنسداں جولیو کیوری کی رہنمائی میں ایک بین الاقوامی امن کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ جس میں پکاسو[3] نے اپنے پیارے دوست اور عظیم شاعر پابلو نرودا کو خراجِ تہنیت ادا کیا۔ اور ان لوگوں کی مذمت کی جن کے ظلم کی وجہ سے یہ شاعر ڈیڑھ سال سے روپوش ہے۔ پکاسو کی خواہش کے مطابق اس کانفرنس نے پابلو نرودا کو تہنیت بھیجی اور اس کے اعزاز میں کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔

اسی زمانے میں شاعر کی شاندار طویل نظم چھپی جس کا عنوان تھا "امن آنے والی شفق کے نام" اس نظم میں شاعر کی غنائی شخصیت ایک رزمیہ ہیرو کی شخصیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے فرانس کے انحطاط پسند شاعروں بودلیئر (BAUDLAIRE) اور آرتھر ریمبو (ARTHUR RIMBAUD) کی روایت اور سرریلزم (SURREALISM) سے والٹ وھٹ مین اور مایاکوفسکی کے انداز تک کا طویل سفر کیا ہے۔ نرودا کے اپنے بیان کے مطابق وہ نوجوانی میں ہی مایاکوفسکی کی آواز سے متاثر ہو چکا تھا۔ لیکن یہ آواز اس کے ساز سے تلوار کی دھار بن کر اس وقت نکلی جب شاعر نے اپنی شخصیت کو اپنے عوام کی تقدیر کے ساتھ ڈھال لیا۔ اور جگمگاتے ہوئے فانوس کی روشنی کو چھوڑ کر وہ تانبے کی کانوں کے اندھیرے میں اتر کر مزدوروں کے ساتھ ایک ہو گیا۔

یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی جب نرودا اپنے ملک سے جلا وطن تھا اور چلی کے ڈکٹیٹر گون زالیز وڈیلا کی فوج اور پولیس کی نگاہوں سے روپوش تھا۔ اور موت کی سزا اس کو تلاش کر رہی تھی۔ اس نے چلی کی سینٹ میں وڈیلا پر غدار ہونے کا الزام لگایا تھا۔ یہ بات موت کی سزا، روپوشی اور جلا وطنی کے لئے کافی تھی۔ نرودا کو پہلے میکسیکو نے پناہ دی اور پھر کئی اور ملکوں کے عوام نے۔ جن کا شکریہ اس نے اپنی متعدد نظموں میں ادا کیا ہے۔

اس طویل نظم نے ساری دنیا میں دھوم مچا دی۔ پولیس اور فوج سے روپوش شاعر اپنی نظم کی شکل میں چلی اور امریکہ کے عوام کے ساتھ گا رہا تھا ؎

امن، آنے والی ہر شفق کے لئے
امن، پلوں کے لئے، امن شراب کے لئے
امن، ان شعروں کے لئے جو میرا تعاقب کر رہے ہیں
جو میرے خون کی لہروں سے اٹھتے ہیں
اور میرے اگلے گیتوں کو
زمین اور محبت کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتے ہیں

اور یہ نغمہ ان مصرعوں پر ختم ہوتا ہے ؎

امن ان سب کے لئے جو زندہ ہیں
امن ہر سرزمین کے لئے، ہر بہتے ہوئے پانی کے لئے

---

[1] انیسویں صدی کا مشہور امریکی شاعر WALT WHITMAN [2] بیسویں صدی کا روسی شاعر MAYAKOVSKY
[3] فرانسیسی اور ہسپانوی مصور جو دنیا کا سب سے بڑا مصور سمجھا جاتا ہے۔

یہ نظم جو امن عالم کا ایک شاندار قصیدہ ہے، جلا وطن شاعر کی حب الوطنی سے سرشار ہے ۔

مگر مجھے اپنے چھوٹے سے سرسبز ملک کی زمین سے
اگنے والے پیڑوں کی جڑوں تک سے محبت ہے
اگر مجھے ہزار بار مرنا پڑے
تو میں اس سرزمین پہ مروں گا
اگر مجھے ہزار بار پیدا ہونا پڑے
تو میں اس سرزمین پر پیدا ہوں گا
بلند قامت صنوبروں کے قریب
وہاں جہاں جنوبی ہوائیں طوفان خیز ہیں
اور نئی خریدی ہوئی گھنٹیاں بج رہی ہیں

اور پھر یہ حب الوطنی ساری دنیا کی محبت کے سمندر کی ایک لہر بن جاتی ہے ۔

کسی کو میرے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے
ہمیں سارے کرۂ ارض کے بارے میں سوچنا ہے
آؤ سبزوں پر محبت کے ڈھیر لگا دیں
میں نہیں چاہتا کہ خون دوبارہ
روٹیوں کو اور اناج کو اور موسیقی کو شرابور کر دے
میری خواہش ہے کہ سب میرے ساتھ آئیں
کان کن، ننھی سی لڑکی
وکیل، ملاح، گھڑیاں بنانے والے
سب میرے ساتھ آئیں اور ہم مل کر سینما دیکھیں
اور سرخ سے سرخ تر شراب پئیں
میں کوئی مسئلہ حل کرنے نہیں آیا ہوں
میں تو یہاں گانے آیا ہوں
اور چاہتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ گاؤ ۔

اب میرا شوق ملاقات بہت بڑھ چکا تھا اور ایک دن ایسا آیا جس میں ملاقات کے امکانات پوشیدہ تھے ۔ ۱۹۴۹ء کا سال شروع ہو رہا تھا ۔ ہندوستان کے کئی ادیبوں کے ساتھ میرے پاس بھی بین الاقوامی امن تحریک کی طرف سے پیرس میں منعقد ہونے والی امن کانگریس کا دعوت نامہ آیا ۔ میں جانے کے منصوبے بنا رہا تھا کہ ۲۰ جنوری کو مرارجی ڈیسائی کی حکومت بمبئی نے مجھے بغیر کسی الزام کے گرفتار کر لیا اور بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند کر دیا ۔ وہ زمانہ ہندوستان میں افراتفری اور انتہا پسندی کا تھا کانگریس حکومت اور کمیونسٹ تحریک دونوں ایک دوسرے کو

میٹھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ میری گرفتاری پر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے ادیبوں اور شاعروں نے احتجاج کیا اور یکایک چار دن کے بعد میں رہا کر دیا گیا۔ اس فضا میں پاسپورٹ حاصل کرنے اور پیرس جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مجھے اپریل ۱۹۴۹ء میں دوبارہ گرفتار کر کے آرتھر روڈ جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں سے ڈیڑھ ماہ بعد میرا تبادلہ سنٹرل جیل ناسک ہو گیا۔ اس جیل یاترا میں جو کتابیں میری رفیق رہیں۔ ان میں نرودا کی RESIDENCE ON EARTH بھی تھی۔ جس پر آج تک آرتھر روڈ اور ناسک سنٹرل جیل کے جیلروں کے دستخط ہیں۔

پیرس کی امن کانفرنس آخر اپریل ۱۹۴۹ء میں منعقد ہوئی اور مئی میں یہ اطلاع ملی کہ پابلو نرودا اپنی روپوشی سے باہر نکل آیا ہے جس کا ذکر بعد کو سوویٹ ادیب ایلیا اہرن برگ نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:۔

"پیرس کی امن کانفرنس ختم ہو رہی تھی، یہ اس کا آخری اجلاس تھا ۲۵ اپریل ۱۹۴۹ء۔ یکایک ہال کے اندر ایک لہر سی دوڑ گئی۔ پابلو نرودا اسٹیج کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا۔ وہ امریکہ کی پولس کی نگرانی سے بچ کر نکل آیا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر اس طرح چڑھ رہا تھا جیسے سپاہی میدان جنگ میں آگے بڑھتا ہے۔ اسے احساس تھا کہ امن عالم کے لئے، انسانی وقار کے لئے اور شاعری کے حُسن کے لئے انسانیت کی عظیم جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اس نے اپنی ایک نئی نظم سنائی اور اسکاٹ لینڈ کے کان کنوں نے اور کوریا کی ایک استانی نے اور جیولیو کیوری نے اور پولینڈ کے ایک ریل مزدور نے اور سوویت یونین کے مشہور ہوا باز مرسالیو نے، غرض مختلف ملکوں اور مختلف پیشوں کے لوگوں نے بڑے شوق سے، کانوں کی سمجھ میں نہ آنے والی لیکن دل کی سمجھ میں آنے والی زبان سُنی، پھر فرانس کا ایک مزدور ضبط نہ کر سکا اور اس نے مسرت کا نعرہ بلند کیا ــــ پابلو نرودا ــــ یہ واقعی پابلو نرودا ہے۔"

جب میں پہلی بار ۱۹۴۰ء میں جیل گیا تو مجھے ایک حسین معشوقہ سے بچھڑنے کا غم تھا۔ یہ جیل کا آخری سفر تھا جس میں نرودا سے نہ مل سکنے کا افسوس رہا۔ اگر میں پیرس جانے میں کامیاب ہو جاتا تو اپنے ایک پسندیدہ شاعر کو دیکھ لیتا۔

میں جولائی ۱۹۵۰ء تک جیل میں رہا اور عید سے ایک دن پہلے رہائی کا پروانہ ملا۔ یہ رہائی اتنی اچانک تھی کہ میں گھر پر اطلاع بھی نہ دے سکا تھا۔ جب میں نے عید کے دن صبح ہی صبح دروازہ کھٹکھٹایا تو سلطانہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں اور سب سے پہلے جو چیز انہوں نے مجھے دی وہ ترکی کے شاعر ناظم حکمت کی نظمیں تھیں۔ جن کا ترجمہ ہماری ایک دوست صابرہ زیدی نے امریکہ سے بھیجا تھا۔

ناظم حکمت کا نام میں ۱۹۳۹ء سے جانتا تھا اور اس بار جیل کے زمانے میں میں نے اس کے نام ایک نظم 'زنداں بہ زنداں' کے عنوان سے لکھی تھی۔ وہ برسوں سے ترکی کی ایک جیل میں بند تھا اور دل کا مریض تھا۔ چوں کہ وہ آزادی کا مجاہد اور نہایت بانکا شاعر تھا۔ اس لئے ساری دنیا کے ترقی پسند حلقوں میں اس کی رہائی کی کوشش ہو رہی تھیں۔ یہ بات میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن ناظم حکمت سے میری ملاقات پابلو نرودا کے کمرے میں ہو گی اور پھر اس سے اتنی دوستی ہو جائے گی کہ اس کا نام میرے بیٹوں میں تقسیم ہو کر علی ناظم اور علی حکمت بن جائے گا۔

میری رہائی کے دو تین مہینوں بعد یکایک یہ اطلاع ملی کہ پابلو نرودا پیرس سے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام عالمی امن کونسل کے صدر جولیو کیوری کا خط لے کر آ رہا ہے، جب میں نے کئی احباب کے ساتھ سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر نرودا کا خیر مقدم کیا تو اُسے

پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کی تصویر چھپ چکی تھی اور اس کا حلیہ اہرن برگ نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا:

"مجھے پہلی بار نرودا سے اسپین کے شہر میڈرڈ میں ملا تھا جو ایک نادر شہر تھا، لیکن اس کے اوپر موت کا سایہ تھا۔ سب سے پہلے میری نظر نرودا کے خدوخال پر پڑی جو ایک اداس اور سوچتے ہوئے انڈین اور ایک مغرور اسپینی بت کے خدوخال تھے۔ اس کی حرکات و سکنات میں ہم آہنگی تھی۔ اس کی آواز نرم تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ آدمی مراقبہ اور شاعری کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں ایک آگ روشن تھی جس کا شعلہ کبھی مدھم دکھائی دیتا تھا اور کبھی تیز۔ وہ صرف عہد جدید کی بات کرتا تھا۔"[1]

لیکن مجھے نرودا کے چہرے میں ایک ایسی کیفیت نظر آئی جیسے وہ گوتم بدھ کا نیا اوتار ہو۔ چند سال بعد میں نے اپنے ایک مضمون میں اس کی شخصیت اور شاعری کے بارے میں یہ لکھا کہ:

"پابلو نرودا ایک کھوئی کھوئی سی دلآویز شخصیت کا مالک اور بہت خوبصورت زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے اور رنگا رنگ تصویروں: اپنے ملک کے پہاڑوں، سمندروں، پھولوں اور ہندوستانی حسن کا نقاش ہے۔ اس کی شاعری اسی طرح حسین اور مترنم ہے اور اتنی ہی انقلابی۔ چلی کے کان کھودنے والے مزدور سے لے کر سوویت یونین کے دور دراز تک ہر شخص اسے جانتا ہے۔ کسی زمانے میں اس کے سر پر موت کی تلوار لٹک رہی تھی اور وہ در بدر مارا مارا پھر رہا تھا۔ اب اس کے سر پر شہرت اور عظمت کا تاج ہے اور وہ خواب آلود لہجے میں بات کرتا ہے جیسے کہیں دور پانی برس رہا ہو یا صنوبر اور چیر کے درختوں سے ہوا آہستہ آہستہ گزر رہی ہو۔ وہ اسپین کی خانہ جنگی میں بارود کی بو سونگھ چکا ہے اور خون کا رنگ دیکھ چکا ہے لیکن اس کا سانس دنیا کے نہ جانے کتنے ملکوں کے پھولوں کی خوشبو سے بسا ہوا ہے اور یہ خوشبو اس کے نغموں میں منتقل ہوتی جا رہی ہے۔"

نرودا نے بمبئی میں کئی دن قیام کیا اور بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں اور اپنی نظمیں سنائیں۔ اس کو اپنے شعر زبانی یاد نہیں تھے۔ اس لیے اس کی بغل میں نظموں کا ایک بڑا سا مجموعہ رہتا تھا جو بہت خوبصورت چھپا ہوا تھا اور اس کی آرائش میکسیکو کے کسی بڑے مصور نے کی تھی جس کا نام اب مجھے یاد نہیں۔

نرودا کو محفل آرائی کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ رمیش تھاپر کے گھر پر اردو شاعروں کے ساتھ بیٹھا۔ وہ گھنٹوں شعر سنتا تھا اور سناتا تھا۔ ان محفلوں میں ترجمے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری میں ترنم آوازیں کافی ہیں اور اردو کی آوازیں بہت خوبصورت ہیں۔ میں نے کہا ہسپانوی زبان کی آوازیں شاید زیادہ خوبصورت ہیں۔ ایسی ہی ایک محفل میں میں نے اس کو اس کی نظموں کی کتاب "RESIDENCE ON EARTH" کا وہ نسخہ دکھایا جو جیل میں میرے ساتھ تھا، نرودا نے اس کتاب کی بعض غلطیاں اپنے ہاتھ

---

[1] اسپین میں ۱۹۳۶ء میں ایک خانہ جنگی ہوئی تھی جس میں ایک طرف وہاں کی جمہوری طاقت تھی اور دوسری طرف فرانکو کی فوجی طاقت۔ فوجی طاقت کے طرفدار جرمنی اور اٹلی کے نازی اور فاشسٹ تھے۔ جن کو سامراج کی پشت پناہی حاصل تھی اور جمہوری طاقت کے طرفدار دنیا کے ترقی پسند تھے جن میں جواہر لال نہرو کا نام سب سے نمایاں تھا۔ ساری دنیا کے ادیب اور شاعر اور دانش ور اسپین میں فاشزم کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان میں نرودا اور اہرن برگ بھی تھے۔

سے ٹھیک ہیں اور پھر اس نے پہلے صفحے پر یہ لکھ کر کتاب مجھے واپس کر دی۔

"SARDAR THIS BOOK WAS WITH YOU
IN PRISON I WANT YOU TO TAKE
IT WITH YOU TO FREEDOM"

(ترجمہ: "سردار! یہ کتاب قید خانے میں تمہارے ساتھ تھی۔
میں چاہتا ہوں کہ تم اسے آزادی کی منزل تک اپنے ساتھ لے جاؤ۔")

نرودا کے یہاں شاعری کا تصور جدوجہد سے الگ نہیں ہے۔ وہ کبھی اس کا ذکر امن اور آزادی کے نام سے بھی کرتا ہے۔ چنانچہ نرودا کی ایک اور کتاب میرے پاس ہے جس میں اس نے یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"TO SARDAR JAFRI,
YOUNG BROTHER IN POETRY AND STRUGGLE,
THE HOMAGE OF POBLO NERUDA"

(ترجمہ: "سردار جعفری کے لیے جو شاعری اور جدوجہد حیات
میں میرا چھوٹا بھائی ہے، پابلو نرودا کا خراجِ عقیدت۔")

نرودا نے کبھی اپنی محبت کا اظہار امن کی تحریک اور انقلابی جدوجہد سے الگ کر کے نہیں کیا ہے۔ ایک بار کسی ہوٹل کے کاغذی نیپکن پر لکھا ہوا برلن سے ایک خط آیا۔ اس پر نرودا کے ساتھ ناظم حکمت کے بھی دستخط تھے۔ اس پر لکھا تھا۔

"JAFRI HERE IS OUR LOVE FOR
POETRY, PEACE AND YOU"

(ترجمہ: "جعفری ہمیں شاعروں سے محبت ہے، امن سے محبت ہے
اور تم سے محبت ہے، یہ محبت ہم تمہیں بھیج رہے ہیں۔")

یہ خط سرخ روشنائی میں لکھا ہے۔ اس کی دوسری تحریریں سبز روشنائی میں ہیں۔ نرودا کو سیاہ یا معمولی نیلے رنگ کی روشنائی پسند نہیں تھی۔

بمبئی اور دہلی کے متعدد جلسوں اور مشاعروں میں نرودا نے بار بار اس خیال کا اظہار کیا کہ ہمیں چڑچڑی اور قنوطی شاعری کے ذریعے سے اس دنیا کو اور زیادہ زہر آلود کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جس میں عوام پہلے ہی سے مصائب میں مبتلا ہیں۔

میں دہلی کے سفر میں نرودا کے ساتھ تھا لیکن جواہر لال نہرو سے ان کی ملاقات تنہا ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ جیولیو کیوری کے خط میں کیا لکھا تھا اور نرودا نے نہرو سے کیا باتیں کیں لیکن اس ملاقات کے بعد وہ غلط فہمیاں آہستہ آہستہ دور ہونے لگیں، جو ہندوستان کی امن تحریک اور نہرو حکومت کے درمیان پھیلی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے اپنی ملاقات میں نرودا نے یہ کہا کہ غیر سوشلسٹ حکومتوں میں ہندوستان سب سے اہم ملک ہے جس میں حکومت اور عوام دونوں امن کے خواہش مند ہیں۔

دہلی میں ان کی ملاقات بہت سے ادیبوں سے ہوئی جن میں شام لال، امرتا پریتم، نوتیج سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔

ایک دن نرودا نے مجھ سے پوچھا کہ اردو کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ میں نے جوش ملیح آبادی کا نام بتایا تو اس نے ملنے کی تمنا ظاہر کی۔ دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔ نرودا نے نہایت بے تکلفانہ انداز سے پوچھا کہ آپ نے کوئی نئی نظم کہی ہے؟ اس پر جوش صاحب نے مسکرا کر مجھ سے کہا "گویا یہ میری پرانی نظمیں سن چکے ہیں"۔ پھر جوش صاحب نے ایک نظم سنائی اور جواب میں نرودا نے اپنی نظم سنائی۔

نرودا کے اعزاز میں ایک جلسہ اور مشاعرہ بھی ہوا جس میں [illegible] نے اپنی مشہور نظم [illegible] بہ خطاب [illegible] سنائی اور نرودا نے اپنی کتاب 'RESIDENCE ON EARTH' میں سے [illegible] زبان میں اپنی نظم [illegible] سنائی اور یہ کتاب [illegible] کے ہاتھ [illegible] اپنی نظم [illegible] یہ اب میری ملکیت تھی اور اس لیے آج بھی ایک قیمتی لمحے کی یادگار کی طرح میرے پاس ہے۔

ایک روز میں بیٹھا ہوا خط لکھ رہا تھا۔ نرودا نے [illegible] دیکھتا رہا۔ پھر چند منٹوں کے بعد [illegible] تصویروں کے پوسٹ کارڈ مجھے اردو میں دستخط کرنے کے لیے دیے۔ میں نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں تو جواب دیا کہ میں لوئی آراگوں[1] کو تحفہ بھیجوں گا کیونکہ اردو بہت بڑی خوبصورت ہے اور [illegible] دائیں طرف لکھی جاتی ہے۔ حالاں کہ میں [illegible] رہا ہوں۔

نرودا کو دہلی سے بہت دلچسپی نہیں تھی۔ وہ روزانہ جامع مسجد کے گرد کے محلے اور دریبے کی سیر کرتے تھے۔ ایک دن ہندوستانی ہوٹل میں کباب اور پلاؤ کھانے کی فرمائش کی لیکن مجھے افسوس ہے کہ جس ہوٹل میں میں نے کھانا کھلایا وہ اچھے کباب اور پلاؤ پکانا نہیں جانتا تھا۔

نرودا ایک نہایت سنجھا ہوا ڈپلومیٹ اور بہت سنجیدہ شاعر ہونے کے باوجود سینے میں ایک معصوم دل رکھتا تھا۔ ایک بار کناٹ پلیس کی ایک دوکان پر شیر کی کھال دیکھی اور اسے خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا کہ آپ کو دام زیادہ بتائے جائیں گے۔ اس لیے میں جا کر پوچھتا ہوں لیکن جب میں دوکاندار سے بات کر رہا تھا تو وہ یکایک مجھے چھوڑ کر نرودا سے مخاطب ہو گیا جو میرے پیچھے کھڑا ہوا شیر کی کھال کو چھو کر دیکھ رہا تھا۔ اور سوئی ہوئی سی نیم وا آنکھوں میں مسرت چمک رہی تھی۔

اس کو ہندوستان کے حسن نے بہت متاثر کیا۔ اس کا ذکر اس نے کئی بار بیان کیا اور جب چار سال بعد پھر سے ماسکو میں ملاقات ہوئی تو تمام ہندوستانی دوستوں کی خیریت پوچھی۔ اس کو سب نام یاد تھے اور پھر جنوبی امریکا کے ناول نگار امادو اور ترکی کے ناظم حکمت سے مخاطب ہو کر نہایت خواب آلود لہجے میں کہا:

"ہندوستان میں ہر قدم پر حسن ہی حسن ہے۔"

میں نے اس کی دل نواز شخصیت اور اتنی ہی دل نواز شاعری کے تاثرات کو ایک نظم میں محفوظ کر لیا ہے۔ یہ نظم ایک سلسلے کی کڑی ہے جس میں میں نے اپنے عہد کے چند مجاہد شاعروں اور دانش وروں کو خراج محبت پیش کیا ہے۔ اس میں جولیو کیوری، پال روبسن، لوئی آراگوں کی طرح کے کچھ محض شناسا ہیں اور پابلو نرودا، ناظم حکمت، فیض احمد فیض، کرشن چندر اور سجاد ظہیر کی طرح

---

[1] فرانسیسی زبان کا عظیم شاعر اور نرودا کا دوست۔

کے کچھ نہایت عزیز دوست ہیں۔

پابلو نرودا

ارضِ مشرق کا کنول، وادیٔ مغرب کا گلاب
سوز میں ڈوبا ہوا تارِ رگِ جاں کا رباب
دشتِ و کہسار کا شہزادہ گلستاں کا امیر
محفلِ انجم و مہتاب میں انساں کا سفیر
شبِ تاریک کے سینے سے ابھرنے والا
چاند کی طرح سے تابندہ گزرنے والا
اس کو معلوم ہے دریا کی روانی کیا ہے
عشق کیا چیز ہے مے کیا ہے، جوانی کیا ہے
آسماں پر کبھی بادل ہے، کبھی تارا ہے
سطحِ گیتی پہ نئی صبح کا نظارا ہے
ایک شمشیر بھی، اک جام بھی، اک ساز بھی ہے
اور پرستانوں میں کھوئی ہوئی آواز بھی ہے
بارِ غم سب کا اٹھاتا ہے سفینے کی طرح
دلِ انساں میں دمکتا ہے نگینے کی طرح
دوست روٹی کا چمکتے ہوئے پانی کا رفیق
اپنی نفرت میں عمیق اپنی محبت میں شفیق
روزِ گلچیں پہ جو طاری ہے وہ گلشن ہے یہی
بجلیوں سے جو بنا ہے وہ نشیمن ہے یہی

نرودا کی شہرت اور مقبولیت برابر بڑھتی گئی اور یہ بے پناہ تھی۔ وہ ۱۹۴۳ء میں چلی کی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بنا اور آخر دم تک پارٹی کا ممبر رہا۔ سامراجی ملکوں کے حکمراں اور امریکی لیڈر اس سے ڈرتے تھے لیکن اس کی شاعری کا معجزہ یہ تھا کہ ان ملکوں کے ادیب اور شاعر، نرودا سے انسپریشن حاصل کر رہے تھے اور ایک دن نرودا کو امریکہ کے ادیبوں نے مدعو کیا اور امریکی حکومت ایک کارڈ ہولڈر کو ویزا دینے پر مجبور ہو گئی۔ اس امریکی سفر پر دنیا کے بعض انقلابی حلقوں میں چہ می گوئیاں بھی ہوئیں لیکن نرودا کی روح پاکیزہ تھی اور اس کے دل و دماغ انقلاب کی آگ سے دہک رہے تھے۔ امریکی سفر بھی اس کی شاعری کی فتح کی علامت ہے۔

عمر کی ترقی اور بیماری کے باوجود اس کی تخلیقی قوتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ آخر تک شعر کہتا رہا ——— اور انقلاب کے لیے لڑتا رہا۔ چلی میں الندے کی صدارت ایک طرح سے نرودا کی شاعری کی جیت تھی اور وہ اپنی مرضی کے خلاف اپنے دوست الندے اور انقلاب کی خاطر پھر سے سفیر بن کر فرانس چلا گیا۔ اس زمانے میں نرودا کی شاعری اور اس کی عظمت کا سب سے بڑا اعتراف نوبل انعام کی شکل میں کیا گیا۔ (اس سے پہلے اسے بین الاقوامی امن انعام اور لینن انعام مل چکا تھا)۔ میں اس وقت لندن میں تھا اور میں نے نرودا کو مبارکباد کا تار بھیجا تو معلوم ہوا کہ وہ بہت بیمار ہے لیکن کچھ مشترک دوستوں نے مجھے بتایا کہ وہ فرانس سے چلی جانے کے لیے بے تاب ہے کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ صدر الندے کو اپنے رفیقوں کی بہت ضرورت ہے۔ اس کا شاعرانہ دل آنے والی قیامت کو محسوس کر رہا تھا اور دشمنوں کی سازش سے واقف تھا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۳ء میں وہ سازش کامیاب ہو گئی۔ مجھے الندے کے قتل کے ساتھ نہ جانے کیوں ایک دم سے پابلو نرودا کا خیال آیا ؎

چلی کے سرخ شہیدو! سلام لو میرا
مرے عزیز نرودا کے ہم وطن یارو
تمہارے خون کی سرخی میں وہ اجالا ہے
کہ قاتل اپنے اندھیرے میں چھپ نہیں سکتے

پابندی وقت اپنی عادت   جنوری ۱۹۷ء   سہ ماہی نقوش

ہزار جنگ کی سازش ہزار قتل کے وار
تمہارا خون مگر رائیگاں نہ جائے گا
زبانِ جسم سے ملبوسِ زخم اترے گا
حیات پیرہنِ گل کے انتظار میں ہے

لیکن ملبوسِ زخم سے پیرہنِ گل تک پہنچنے کے لئے اُسے خون کی ضرورت تھی اور یہ خون ضرور [illegible] کا تھا [illegible] وقت اس [illegible] کہ ملتی کی [illegible] کا لازمی حصہ ہے۔ ضرور [illegible] نہیں دیکھا تھا اسے مرجانے کے [illegible] زیادہ [illegible] دنیا بھر [illegible] اس کا جنازہ اٹھا یا تھا تو جلی کے [illegible] فوجی سپاہی ہے [illegible] عوام بے انقلابی [illegible] مجبور [illegible] ہوگا اپنے محبوب شاعر [illegible] کو خراجِ محبت و عقیدت کے ساتھ جلی نے انقلاب کو [illegible] عطا کر [illegible]

اردو کے ممتاز شاعر

حمایت علی شاعر

کی تمام مقبول عام کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوگئے

۱۔ ہارون کی آواز (ڈاکٹر علامہ اقبال ایوارڈ یافتہ)

۲۔ مٹی کا قرض (آدم جی انعام یافتہ)

۳۔ تشنگی کا سفر (طویل نظموں کا مجموعہ)

۴۔ آگ میں پھول (پہلا مجموعۂ کلام)

۵۔ شخص و عکس (مضامین کا مجموعہ)

۶۔ شیخ ایاز (شخصیت و شاعری)

۷۔ پسِ دیوارِ حرف (شاعری کے تمام مجموعوں کی کلیات)

ناشر: رہبر پبلشرز اردو بازار کراچی

سردار جعفری

ذوقِ جمال

جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے اور اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیتی ہے اس کی شعوری تخلیقی قوت ہے۔ وہ جانوروں کی طرح اپنے فطری قید خانے اور ماحول میں اسیر نہیں رہتا۔ وہ اپنے فطری قید خانوں کی دیواروں کو توڑ دیتا ہے اور ماحول کو تبدیل کرتا ہے۔ وہ اپنی محنت کے ذریعے سے فطرت اور عناصرِ فطرت پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح اپنے ماحول کو اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالتا ہے۔ خارجی فطرت اور ماحول کی تبدیلی خود انسان کو تبدیل کر دیتی ہے۔ اور یہ تبدیل شدہ انسان دونی تگنی قوت کے ساتھ پھر اپنے ماحول پر حملہ آور ہوتا ہے۔ عمل اور ردِ عمل کا یہ لامتناہی سلسلہ ابتدا سے جاری ہے۔ ادب اور آرٹ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اور ادب کا استعمال انسان نے ہمیشہ حقیقت کو بدلنے کے لیے کیا ہے۔ کبھی اس نے ادب کو جادو سمجھ کر استعمال کیا اور کبھی آرٹ سمجھ کر۔ کبھی شعوری طور سے استعمال کیا اور کبھی نیم شعوری طور سے۔ لیکن استعمال کیا ہمیشہ حقیقت کو بدلنے کے لیے۔ یہ ادب کا سماجی کردار ہے اور جب کبھی ادب سے اس کا یہ سماجی کردار چھیننے کی کوشش کی گئی، اس نے اپنا حسن اور زور کھو دیا۔

ادب حقیقت کو بدلتا ضرور ہے۔ لیکن خارجی فطرت اور ماحول پر براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ نہ تو کلہاڑی کی طرح درخت کو کاٹ سکتا ہے اور نہ انسانی ہاتھوں کی طرح مٹی سے پیالے بنا سکتا ہے۔ وہ پتھر سے بت نہیں تراشتا بلکہ جذبات و احساسات سے نئی نئی تصویریں بناتا ہے۔ وہ پہلے انسانوں کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس طرح انسان میں داخلی تبدیلی پیدا کرتا ہے اور پھر اس انسان کے ذریعے سے ماحول اور سماج کو تبدیل کرتا ہے۔ وہ انسان کو بہتر انسان بناتا ہے۔ اسے طاقت اور ہمت عطا کرتا ہے۔ وہ اس کے شعور کو تیزی اور شوق کو گرمی بخشتا ہے۔ اس طرح ادب کا براہِ راست تعلق انسان کے جذبات سے ہے۔ ادب کا سب سے بڑا کام انسان کے جذبات کو منظم کر کے نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور یہ کام کسی طرح سحر کاری سے کم نہیں بلکہ اپنے ابتدائی دور میں جب وہ شاعری تک محدود تھا اور رقص و نغمہ کی ہیئت اختیار کرتا تھا، اسے جادو اور منتر ہی کی طرح استعمال کیا جاتا تھا۔

جذبات کو دل سے منسوب کیا جاتا ہے اور شعور کو دماغ سے۔ دل اور دماغ کی یہ تقسیم ایک بہت ہی حسین اور انتہائی شاعرانہ جھوٹ ہے اور ہمیں شاعری کا طلسم باندھنے کے لیے اس حسین جھوٹ کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ اس جھوٹ کو بنیاد بنا کر ادب اور شاعری کو انسانی شعور سے محروم کر دیا جائے۔ شعور کے بغیر جذبہ محض جبلت رہ جاتا ہے اور انسانیت حیوانیت بن جاتی

یہی وجہ ہے کہ ہٹلری فاشزم نے شعور کو گندہ کرنے کی کوشش کی اور اس خیال کا اظہار کیا کہ ذہنی اور دماغی زندگی قوم کے لیے سم قاتل ہے۔ اس خیال کی ترقی یافتہ شکل یہ نعرہ ہے کہ "جب میں تہذیب کا نام سنتا ہوں تو اپنا ریوالور نکال لیتا ہوں۔" آج بھی سامراج کا یہ شدید حملہ انسانی شعور پر ہے جیسے طرح طرح کے فرقی نظریات کے ذریعے مسخ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لینن نے اپنی شاہکار تصنیف میں اس کا ایک بڑا اچھا مطالعہ پیش کیا ہے۔ شعر کا لفظ شعور سے بنا ہے۔ ادب اور شعر کا رشتہ صرف جذبات سے نہیں ہے۔ اس لیے ادب جذبات کی کمی نہیں انسانی شعور کی بھی تنظیم کرتا ہے اور اسے بدلتا ہے۔

جذبات اور شعور کا تعلق بہت اہم ہے۔ جذبے میں شعور سے بعض گہرائی پیدا ہوتی ہے اور جذبے کی ... خود شعور کی شدت سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی شعور کا ... جذبے کی شدت اور گہرائی میں شعور کی شدت اور گہرائی ... ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی رچا ہوا اور شدید کیوں نہ معلوم ہو۔ اس کی شدت جو جبلی شدت ہوتی ہے ... آرٹ اور ادب میں شعور کی یہ خاص جذبے کی گہرائی اور شدت کے ... ضروری ہے۔ شعور وہ کسوٹی ہے جس پر سچے جذبے اور جھوٹے جذبے کو پرکھا اور پہچانا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ قدیم یونانیوں کا شعور آج کے شعور کے مقابلے میں بہت پست تھا۔ پھر بھی ان کا آرٹ ... حسین اور دلکش ہے اور آج بھی ہم اسے دیکھ کر اور پڑھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ اس کی شہرت اتنا حسن کہاں سے پیدا ہوا۔ اس سوال کا جواب میں ایک اور سوال سے دوں گا۔ کیا آج یہ ممکن ہے کہ کوئی انسان قدیم یونانیوں کے شعور کی سطح پر رہ کر ... بھی پیدا کر سکے؟ وہ بہت بھونڈے قسم کی نقالی کر سکتا ہے۔ آرٹ ہرگز نہیں پیدا کر سکتا۔ قدیم یونانی شعور میں انسان کے ... معصومیت اور حیرت تھی۔ ہمارے شعور میں انسانیت کی جوانی کی پختگی ہے۔ اب ہم وہ معصومیت اور حیرت پیدا نہیں کر سکتے۔

کارل مارکس نے یونانی آرٹ کے سلسلے میں بڑی حسین بات کہی ہے کہ ہم بچوں کی معصوم اور تصنع سے خالی حرکتیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں لیکن خود بچے نہیں بن سکتے۔ دوبارہ بچہ بننے کی کوشش بچکانہ اور مضحکہ خیز حرکت ہے۔

پہلے گڑیوں کے ساتھ طلسم کا تصور وابستہ تھا۔ بوڑھی عورتیں ان سے کھیلتی تھیں اور جوان لڑکیاں اس تماشے سے زندگی کا سبق سیکھتی تھیں۔ لیکن آج بچے گڑیوں سے کھیلتے ہیں۔ کل چاند میں بیٹھ کر کوئی بڑھیا سوت کاتتی تھی۔ سمندر میں جل پریاں ناچتی تھیں ہواؤں میں پریوں کے اڑن کھٹولے اڑتے تھے۔ لیکن آج انسان برفستانوں میں کاشت کرنے کے لیے مریخ لے ... (ہو رہی ہیں) اور چاند کے سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ فطرت پر انسان کا اقتدار بڑھ گیا ہے اور انسانی شعور کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے جس کی جھلک اس دور کے ادب میں بھی نظر آ رہی ہے۔ آج کا ادب "گردش چرخ کہن" کی باتیں نہیں کرتا بلکہ زمین کی گردش کی باتیں کرتا ہے۔ دونوں بالکل دو الگ معنوں میں ہیں۔

شعور کو تاریخ اور ماحول سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تاریخی ارتقا ہوا ہے اور وہ تغیر کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہے اور گزر رہا ہے۔ ہر چیز کی طرح انسانی سماج کے ساتھ ساتھ شعور بھی بدلتا ہے اور جذبات بھی۔ انسانی فطرت ازلی اور ابدی نہیں ہے۔ شعور اور جذبات بھی ازلی اور ابدی نہیں ہیں۔ تغیر اور تبدیلی ناگزیر ہے۔ یہ ارتقا کا عمل ہے جس نے غاروں میں بسنے والے درندے کو انسان بنایا ہے۔ اس لیے شعور کی تبدیلی انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔ اگر شعور نا پختہ ہے تو اسے تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

شعور کی تبدیلی ہمارے احساس حسن اور ذوق جمال پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور جمالیاتی قدریں بدل جاتی ہیں۔ دراصل احساس

حسن اور ذوقِ جمال شعور کی ایک قسم ہے جو زمان و مکاں کی قیود سے آزاد نہیں ہے۔ سماجی کشمکش اور زندگی کی جدوجہد کے ساتھ اس کا تاریخی ارتقا ہوا ہے۔ کوئی انسان ماں کے پیٹ سے کوئی مخصوص ذوق لے کر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے اعصاب میں محسوس کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو خود صدیوں کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔ یہ صلاحیت ترقی کر کے ذوق اس وقت بنتی ہے جب وہ تاریخی حالات کے دائرے میں زندگی اور سماج کے حقائق سے دو چار ہوتی ہے۔

انسان اپنے حواسِ خمسہ کے بغیر حسن کا احساس نہیں کر سکتا۔ یہ حواس کسی حد تک جانوروں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن انسان جس طرح مختلف قسم کی خوشبوؤں میں فرق کرتا ہے، مختلف قسم کی آوازوں میں بہت لطیف تمیز کرتا ہے۔ انسانی انگلیاں جس طرح نرم سخت اور کھردری سطح کو محسوس کرتی ہیں، آنکھیں جس طرح رنگوں کے باریک فرق کو دیکھتی ہیں اور زبان لطیف سے لطیف ذائقے سے لطف اٹھاتی ہے۔ یہ جانوروں کے حواسِ خمسہ سے ممکن نہیں، حالانکہ بعض جانور انسان سے زیادہ تیز سنتے ہیں اور بہت دور سے بو سونگھ لیتے ہیں۔ وہ تمیز اور فرق اس طرح نہیں کر سکتے جو انسان کی خصوصیت ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انسان اپنے تصور میں چکھ سکتا ہے سونگھ سکتا ہے۔ سن سکتا ہے۔ محسوس کر سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے "بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے!" یہ انسانی خصوصیات خود انسانوں میں مختلف ہوتی ہیں۔ جس کے کان موسیقی سے آشنا نہیں ہیں "وہ بھیرویں" اور "شام کلیان" میں فرق نہیں کر سکتا۔ جن آنکھوں نے ہزاروں تصویروں کو نہیں دیکھا ہے وہ اجنتا اور چغتائی کی تصویروں کے خطوط اور رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتیں۔ یہ ذوق کی تربیت کا سوال ہے جو ہمیشہ مخصوص تاریخی حالات میں، مخصوص سماجی اثرات اور عناصر کے تحت ہوتی ہے۔

آج ہمارے لیے پھول حسین ہے۔ دریا کی روانی دلکش ہے۔ شفق اور قوسِ قزح کے رنگوں میں بلا کا جادو ہے۔ ہم انھیں دیکھتے ہیں اور ان سے لذت حاصل کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ اس لذت کے سرچشمے کہاں ہیں اور ان تمام مظاہر کا حسن ہماری خارجی زندگی اور شعور اور ان کی حرکت کے ساتھ کہاں تک وابستہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ملکہ الہامی نہیں بلکہ اکتسابی ہے جسے انسان نے صدیوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد حاصل کیا ہے۔ جس طرح ہم کھانا کھاتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ غذا کس محنت اور جانفشانی سے پیدا کی گئی ہے۔ کس کس جتن سے حاصل کی گئی ہے۔ اس کی قیمت کیا ہے۔ اور اس کے کیمیاوی عناصرِ ترکیبی کیا ہیں کیونکہ کھاتے وقت ہم صرف ذائقے کو اہمیت دیتے ہیں اسی طرح جمالیاتی تجربے کے وقت ہم اس کے سرچشموں اور تاریخی جڑوں کا پتہ لگانے کی کوشش نہیں کرتے اور صرف لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن جب تجزیہ اور تنقید کا وقت آتا ہے تاکہ ہم اپنے علم کو منظم کر کے نئی تخلیق کے لیے بہتر صلاحیت پیدا کریں تو ہم سماجی اور تاریخی جڑوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ کوئی کسان بیج بوتے وقت اناج کو کھانے نہیں لگتا۔

اگر تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہر حسین چیز انسان کے مجموعی مفاد سے وابستہ نظر آئے گی (خواہ وہ سماجی اور جسمانی مفاد ہو خواہ ذہنی اور اخلاقی) جو چیز مفید نہیں وہ حسین نہیں ہو سکتی۔ پھول سے انسان نے بیج حاصل کیے ہیں اور بیج سے غذا (رنگ اور عطر بہت دیر میں حاصل کیے گئے ہیں۔) دریاؤں سے اس نے اپنی پیاس بجھائی ہے اور اپنے کھیتوں کو سینچا ہے اور موجوں کے دوش پر سوار ہو کر مسافت طے کی ہے۔ شفق نور کی پہلی علامت ہے۔ وحشی انسان کی راتیں بڑی بھیانک ہوتی تھیں اور وہ اجالے کے لیے شفق کی پہلی سرخ لکیر کا منتظر رہتا تھا۔ قوسِ قزح (اندردھنش) میں کمان کا لوچ اور خم ہے اور کمان کی ایجاد انسان کے تہذیبی، تمدنی اور سماجی ارتقا میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ رنگوں کی تنظیم بھی روح میں ایک خاموش ترنم اور داخلی آہنگ پیدا

رہتا ہے۔ مگر یہ احساس بہت بعد کی چیز ہے۔) اس طرح ابتدا میں انسان ان چیزوں سے مانوس ہوا اور پھر صدیوں میں کہیں جا کر پھول حافظؔ اور کیٹس کا گلاب ہو سکا ہے۔ (جنگلی گلاب کو باغوں کا گلاب بنانے کے لیے انسان نے بڑی محنت کی ہے۔) جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں، پہلے ہمیشہ آدمی اور بندر کے لیے حسین سے حسین گلاب بھی رنگ و بو کا لطیف احساس نہیں بلکہ کھانے کی چیز ہے۔ وہ ویسا ہی اس لیے یہ محض جہالت اور توہم پرستی نہیں تھی کہ ہمارے بزرگوں نے تھر کو ارتہ دیوی اور دریا کو گنگا ماتا بنا دیا اور بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں نے انسانوں کی سی حسین و جمیل شکل اختیار کر کے آرٹ اور ادب کا روپ دھار لیا۔ پہلے انسان نے اسے آپ فطرت کی شکل میں دیکھا اور جانوروں اور درختوں سے وابستہ کیا اور اپنے جینے کے لیے۔ بعد میں جب ان کا تخیل کچھ اور ابھرا، انہوں نے فطرت کو انسانوں کی شکل میں دیکھا اور انسانوں کو دیوتا بنا دیا جو تمام اونچی خصوصیات کے حامل تھے۔ لیکن بالآخر طبقاتی سماج نے ان دیوتاؤں کو آسمانوں کے نیلے پردوں میں چھپا دیا اور وہ عوام اور ان کی محنت کے عمل سے جہاں سے انہیں خیالی روپ ملا تھا، ماورائیت کے دھندلکوں میں کھو گئے۔ اس وقت انسان نے اپنے دیوتاؤں کے مقابلے پر اپنے ہیرو لا کھڑے کیے۔ گورکی نے بتایا ہے کہ انسان نے پہلے دیومالا کے کرداروں کی تخلیق کی اور پھر ان کے مقابلے پر اپنے انسانوی ہیرو، جو عوام کی مجموعی صفات کا پیکر ہوتے ہیں۔

انیسویں صدی کا روسی مفکر اور نقاد پلیخانوف (PLEKHANOV) نے اپنی کتاب "تاریخی مادیت اور فنونِ لطیفہ" میں جمالیات پر بحث کرتے ہوئے ڈارون اور دوسرے جرمن عالم بوخر (BUCHER) کی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان کے ذوقِ جمال کے سرچشموں کا پتہ لگانے کے لیے سماجی علوم کی مدد لینا ضروری ہے۔ کیونکہ سماجی ماحول اور سماجی ترقی نے ہر انسانی گروہ (قبیلہ، سماج، قوم، طبقہ) کے ذوقِ جمال کی تربیت اور تشکیل کی ہے۔ اس سلسلے میں اس نے مختلف تہذیبی منزلوں اور مختلف تاریخی سماجوں سے بعض بڑی دلچسپ مثالیں پیش کی ہیں۔ مثلاً بعض نیم وحشی قبائل کے مرد جانوروں کی کھال اور سر اور ان کے دانتوں اور سینگوں سے اپنی آرائش کر کے اپنے آپ کو حسین سمجھنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ قبائل ہیں جن کی زندگی کا دار و مدار شکار پر ہے اور ان کے سماج کا ارتقا وہیں رک گیا ہے۔ ان کے حسن کے تصور کے پیچھے یہ تصور کارفرما ہے کہ طاقت ور (جانور) کو زیر کرنے والا (انسان) خود بھی طاقت ور ہوتا ہے اور طاقت ور حسین ہے۔ یہاں حسن طاقت کے تصور سے اپنے خط و خال حاصل کرتا ہے۔ اس طرح بعض دوسرے قبائل میں عورتیں لوہے کے زیورات پہنتی ہیں اور اسی سے اپنے حسن کی آرائش کرتی ہیں۔ حسن کا یہ تصور لوہے اور دھات کے زمانے کی یادگار ہے جس میں لوہا سب سے زیادہ مفید اور قیمتی دھات سمجھا جاتا تھا۔ افریقہ کے ایک حبشی قبیلے کی امیر عورتیں چھوٹی چھوٹی جوتیاں پہنتی ہیں جن میں ان کے پاؤں بمشکل سماتے ہیں۔ جب وہ یہ جوتیاں پہن کر چلتی ہیں تو ان کی چال میں ایک خاص قسم کا لوچ پیدا ہو جاتا ہے اور چال کا یہ لوچ حسین سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس قبیلے کی غریب عورتیں ایسی جوتیاں نہیں پہنتی ہیں کیونکہ انہیں کام کرنا پڑتا ہے اور انہیں اپنی چال میں سست رفتاری کا لوچ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
یہاں امیر عورتوں کے حسن کا تصور طبقاتی تقسیم کی وجہ سے کاہلی اور بیکاری سے وابستہ ہے۔

خود ہندوستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں آدیواسی قبیلوں کی زندگی کا مطالعہ اس نقطۂ نظر کی تصدیق کر دے گا۔ ٹنی اور بلاس پور کے درمیان پہاڑی علاقوں میں ایک چھوٹا سا آدیواسی قبیلہ آباد ہے جو آریوں سے بھی پرانا ہے۔ وہ لوگ لوہے، آگ اور کوئلے کی پرستش کرتے ہیں اور دم آگاریا کہلاتے ہیں۔ ان کی دیومالا میں صرف ایک دیوتا ہے۔ لوہ اسور

اگنی اسور اور کوئلہ اسور ان کے افسانوی ادب میں (اگر اسے ادب کہا جا سکے) ایک "لوکھنڈی راجہ" ہے اور ایک کردار جوالا مکھی ہے۔ ان کی کہانیاں اس قسم کی ہیں کہ پر مانے لوہا چرا لینا چاہا تو لوہا ساری دھرتی میں بکھر گیا۔ اس طرح ہر جگہ لوہے کی کانیں ملتی ہیں۔ یہ کہانی آریوں اور آگاریوں کی کشمکش کا پتہ دیتی ہے۔ ان کے زیورات، آرائش اور حسن کے تصور میں لوہا، کوئلہ اور آگ شامل ہے۔ ایک یوروپی پادری البرٹ وار ریر نے، جس نے اس قبیلے اور ایسے ہی دوسرے قبیلوں کی زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ لکھا ہے کہ جب شروع شروع میں وہاں ریل کی پٹریاں بچھائی گئیں تو آگاریوں نے انجن کو دیوتا سمجھ لیا جس کو آگ، لوہا اور کوئلہ مل کر بناتے ہیں اور طاقت بخشتے ہیں۔

ذوق جمال کا فرق تہذیب و تمدن کی مختلف سطحوں پر نظر آتا ہے جو سماجی ماحول کے ساتھ بدلتی ہیں۔ ہم مختصر طریقے سے انسانی تہذیب کے چار دور قرار دے سکتے ہیں جو ذرائع پیداوار، طریق پیداوار اور سماجی تنظیم کے چار دور ہیں اور ہر دور اپنے ساتھ اپنا مخصوص نظام سیاست، اخلاقیات، آرٹ اور ادب لے کر آیا ہے۔ ابتدائی قبائلی دور کے بعد جب انسان طبقوں میں تقسیم نہیں تھا۔ غلام داری کا دور آیا جس میں انسانیت آقاؤں اور غلاموں میں بٹ گئی (ہندوستان میں اس کی شکل یونان کی شکل سے مختلف تھی) پھر جاگیرداری دور آیا اور انسانیت جاگیردار اور کسان میں تقسیم ہو گئی۔ (اس کی بھی شکل ہندوستان میں یورپ سے کسی قدر مختلف تھی) تیسرا دور سرمایہ داری کا ہے جس میں سرمایہ دار اور مزدور متضاد طبقے ہیں۔ اب انسانیت اور سماج اپنی تہذیب کے چوتھے دور میں داخل ہو رہے ہیں جب طبقات کی تقسیم ختم ہو رہی ہے اور ایک نئی منظم انسانیت پیدا ہو رہی ہے۔ ہر دور کا اپنا اپنا ذوق جمال ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ ایک دور اور دوسرے دور کے ذوق جمال میں فرق ضرور ہوتا ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان لوہے کی دیوار نہیں کھڑی ہوتی۔ ہر دور کا ذوق جمال پچھلے دور کی بہترین قدروں کا حامل ہوتا ہے اور ان میں نئے اضافے کرتا ہے۔ ایک بھدی مثال سے یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ اجنتا کی تصویروں کے خطوط کا خاموش ترنم، انسانی جسموں کا لوچ، ان کا تناسب اور حسن ہمارے ذوق جمال کا ایک حصہ ہے لیکن مشین کے پرزوں کی متحرک حرکت، انجن اور ہوائی جہاز کے فولادی حسن کے خطوط اجنتا کے مصوروں کے ذوق جمال کا حصہ نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے۔ ممتاز حسین کے الفاظ میں "ہمارا علم یقیناً اضافی ہے لیکن ایک مخصوص دور کی صداقت مطلق بھی ہوا کرتی ہے۔ اگر صداقت کا یہ نظریہ نہ ہو تو ہماری تمام جد و جہد اور قدروں کے تحفظ کے لیے ہر شئے کا حوصلہ بالکل ہی بے معنی ہو جائے لیکن جب ہمارا علم بڑھتا ہے اور ہم کسی حقیقت کے نئے پہلو دریافت کرتے ہیں تو پرانی صداقت اضافی بن کر ایک نئی صداقت کو جنم دیتی ہے جو اپنے وقت کے لیے مطلق ہو جاتی ہے .... ہمارے علم کا اضافہ پرانی صداقت کو جھوٹ ثابت نہیں کرتا کیونکہ صداقت کی کوئی نہ کوئی جھلک ضرور باقی رہتی ہے۔ یہی ذوق جمال کا حال ہے۔" دوسری چیزوں کے علاوہ ذوق جمال کے فرق سے بھی ادب اور فن کے قومی اور طبقاتی کردار کا تعین ہوتا ہے اور صورت ذہنی کی تشکیل ہوتی ہے۔

لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یکساں سماجی اور تہذیبی ماحول سے تمام انسانوں کا ذوق جمال یکساں ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ کسی ایک سماجی اور تہذیبی ماحول کے انسانوں کا ذوق جمال مجموعی طور سے یکساں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بھی ہر شخص کے احساس اور ذوق کی انفرادی خصوصیات الگ الگ ہوں گی۔

جرمن مفکر فرینز مہرنگ (FRANZ MEHRING) کے الفاظ میں "یہ سوال کہ انسان کس طرح محسوس کرتا ہے۔ طبیعی علوم سے خصوصاً عضویات (علم انعال اعضا) کے دائرے میں آتا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ انسان کیا محسوس کرتا ہے، درحقیقت سماجی علوم خصوصاً جمالیات کے دائرے میں آتا ہے اگر آسٹریلیا کا ایک رنگین ربش میں [illegible] اور یورپ کا ایک مہذب آدمی ایک وقت بیتھوون (BEETHOVEN) کی سمفنی یا اوپیرا [illegible] کی تصویر دیکھیں تو عضویات طبیعی کے اعتبار سے دونوں کے محسوس کرنے کا عمل ایک سا ہوگا۔ لیکن جمالیاتی اعتبار سے دونوں [illegible] دونوں جو چیزیں محسوس کریں گے وہ مختلف ہوں گی کیونکہ سماج سے افراد کی [illegible] سے دونوں مختلف [illegible] ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہاں یہ بھی ہو [illegible] مثال کی ضرورت [illegible] [illegible] کی ایک طبقہ کے افراد [illegible] میں کے [illegible] احساسات یکساں ہوں۔ سماج خارجی [illegible] فرد [illegible] (FACTORS) [illegible] جو برابر ایک دوسرے کو کاٹتے رہتے ہیں اور [illegible] ہوئے رہتے ہیں [illegible] انسان کے احساس کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر شخص کا انفرادی ذوق ہوتا ہے۔

ہر شخص کے ذاتی تجربات الگ الگ ہوتے ہیں جو اس کے ذوقِ جمال پر رنگ چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ میں گلاب کا پھول دیکھ کر اپنی محبوبہ کا چہرہ یاد کرنے لگوں اور آپ گلاب کا پھول دیکھ کر انیسؔ کا شعر پڑھنے لگیں:

تھا چرخِ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
گویا چمن میں پھول کھلا ہے گلاب کا

اس طرح خیالات اور یادوں کا ایک کارواں ہمارے دل و دماغ سے گزرتا ہے اور جمالیاتی حظ کی شکل میں اپنے نقشِ قدم چھوڑ جاتا ہے۔ پرانے سے پرانے ادبی شہ پارے اور آرٹ کے نمونے بھی ہماری یادوں اور سوئے ہوئے خیالات کو جگاتے ہیں اور ہم شیکسپیئر کے ڈراموں میں اپنے عہد کی تصویر دیکھنے لگتے ہیں۔

جمالیاتی ذوق کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ اس کا یہ داخلی پن بھی تاریخ اور ماحول میں اس حد تک اسیر رہتا ہے کہ گلاب کا پھول دیکھ کر حبشی سماج میں نہ تو محبوبہ کا چہرہ یاد آسکتا ہے اور نہ انیسؔ کا شعر۔

جو لوگ جمالیاتی ذوق کو وجدانی یا داخلی اور بالکل انفرادی سمجھتے ہیں وہ خیال پرستی یا تصوریت [illegible] اور ماورائیت تک پہنچتے ہیں اور شعوری یا غیر شعوری طور سے رجعت پرستی کے لیے راستے کھولتے ہیں جن کے پیچ و خم بظاہر کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں مگر [illegible] ہوتے ہیں۔

وجدانی اور داخلی یادوں پر اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا کہ میرا جمالیاتی ذوق آپ کو کیوں محظوظ کرتا ہے۔ جب تک ادیب اور اس کے پڑھنے والوں کے درمیان مشترک جمالیاتی قدریں نہ ہوں گی، جب تک ان دونوں کے جمالیاتی ذوق کی سرحدیں کہیں نہ کہیں نہیں ملیں گی تب تک ادب سے نہ لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور نہ اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے جمالیاتی ذوق کو وجدانی قرار دینے کی کوشش ادب کو محدود کر دیتی ہے۔

آج کل کے زمانے میں جمالیات کا وجدانی تصور آرٹ اور ادب کو عام انسانوں اور زمین کی سطح سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر رکھ دیتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے چند برگزیدہ بندوں کے سوا اور کوئی شعر و فن کے اسرار و رموز سے واقف نہیں ہو سکتا اور عام انسان اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ آرٹ اور ادب کا یہ تصور فنکار اور عوام کے درمیان

صورتِ ذوق کی ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔ اور آرٹ اور ادب سے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی اس کا سماجی کردار چھین لیتا ہے۔ اس لیے یہ تصور مضر ہے۔ ہم کبھی کبھی غیر شعوری طور سے اس تصور کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے فن میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے خلاف شعوری جدوجہد ضروری ہے اور ہر اس ادیب کے لیے ضروری ہے جو عوام سے اپنا اور اپنے فن کا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔

اپنا ذوقِ جمال انسان نے بالکل اسی طرح حاصل کیا ہے جس طرح اُس نے اپنے ہاتھ اور اپنا دماغ حاصل کیا ہے۔ زندہ رہنے کی جدوجہد میں اُس نے درندگی چھوڑ کر انسانیت حاصل کی ہے اور انسان بننے کی جدوجہد میں فنونِ لطیفہ اور سائنس کو پیدا کیا ہے جس کی ابتدائی شکل جادو تھی۔ یہ جدوجہد آج بھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ اس لیے آرٹ، ادب اور سائنس انسان اور اس کی جدوجہد سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے اور الگ ہو کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ طبقاتی کشمکش اس جدوجہد کا نہایت اہم حصہ ہے۔ انسان کا شعور، احساس یا جذبہ اسی جدوجہد کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ جدوجہد انسان کے شعور کو متاثر بھی کرتی ہے اور اس سے متاثر بھی ہوتا ہے۔

ہمیں آج ذوقِ جمال کے سرچشموں اور مادی بنیادوں کا پتہ لگانے میں دشواری اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ طبقاتی سماج میں ادیبوں اور شاعروں کا پیداواری عمل سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ اس لیے براہِ راست تعلق ثابت کرنے کے لیے ابتدائی سماج اور قبائلی نظام سے مثالیں تلاش کرنی پڑتی ہیں جہاں سماجی عمل اتنا پیچیدہ نہیں تھا۔ اس بنیاد سے چل کر عہد بہ عہد کی ترقی اور تغیر کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ (یہ جائزہ میرے موضوع سے خارج ہے)

انسان کے ذوقِ جمال کو قوموں میں اور قوموں کے ذوقِ جمال کو ان کے تاریخی اور سماجی ادوار میں اور مختلف ادوار کے ذوقِ جمال کو ان ادوار کے طبقات میں اور طبقات کے ذوقِ جمال کو مختلف افراد کے انفرادی ذوقِ جمال میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح مختلف افراد، طبقات اور اقوام کے ذوقِ جمال کے فرق کو سمجھا بھی جا سکتا ہے اور بدذوقی کو جو مختلف اسباب مثلاً مواقع کی کمی یا لاعلمی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ذوقِ جمال کا علمی تجزیہ اور ذوقِ جمالیات، جسے الہامی اور وجدانی چیز سمجھا جاتا ہے۔ آرٹ اور ادب کی سائنس ہے جس پر ادب اور سماج ادیب اور عوام کے باہمی رشتے کا تعین اور صورت و معنی کے مختلف مسائل کے حل کرنے اور بہتر سے بہتر ادب کی تخلیق کرنے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اس لیے جمالیات تمام سماجی علوم سے اکتساب کرتی ہے اور فلسفے اور سائنس کی مشعل لے کر نکلتی ہے۔

ذوقِ جمال کی طرح ادب بھی سماج اور مادی سرچشموں کا پتہ لگانے کے لیے ہمیں پھر ابتدائی انسانی سماج اور جنگلوں میں بسنے والے آدی باسی قبیلوں کی زندگی کا جائزہ لینا پڑے گا جہاں آرٹ اور ادب کا تعلق طریقِ پیداوار سے براہِ راست ہے اور ہمارے طبقاتی سماج کی سی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔

ہندوستان میں اس موضوع پر اب تک کام نہیں کیا گیا ہے۔ اور ہماری ابتدائی تاریخ ــــــــــــ زمانہ ماقبل تاریخ ــ پر لاعلمی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن دوسرے ممالک کے مفکروں اور عالموں نے پچھلے سو برس میں اس موضوع پر بڑی محنت سے کام کیا ہے اور بڑے مفید نتیجے نکالے ہیں۔ اس سلسلے میں دو جدید انگریز مصنف خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ایک کاڈویل جس نے اپنی کتاب "خیال اور حقیقت" میں شاعری کے سرچشموں سے تفصیلی بحث کی ہے۔

سر ا مصنف جارج ٹامسن ہے جس نے اپنی کتاب میں قدیم یونانی سماج کا مطالعہ کیا ہے۔

شاعری انسان کا سب سے ابتدائی جمالیاتی عمل ہے اور جب شاعری ایک الگ صنف کی حیثیت سے نہیں ملتی تو وہ رقص، موسیقی، مذہب اور جادو کے ساتھ ملی ہوئی رہتی ہے اور اخلاقی، سماجی اور سیاسی اصولوں کی ترویج کے لیے استعمال کی جاتی ہے ۔ اسی لیے ساری دیو مالا شاعری کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے اور ابتدائی مذاہب کی کتابیں بھی شاعری کے انداز میں لکھی ہوئی ہیں۔

اس کے بعد کاڈویل نے لکھا ہے کہ شاعری اپنی بنیادی خصوصیت کے اعتبار سے آہنگ ہے اور آہنگ اپنی بنیادی خصوصیت کے اعتبار سے اپنے ترنم کی وجہ سے ایک ایسی چیز ہے جو مل کر گائی جائے اور اجتماعی جذبے کے اظہار کا ذریعہ بن جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قبیلے کو اس اجتماعی جذبے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر شیر یا دشمن حملہ کرتا ہے، زلزلہ آتا ہے یا کوئی اور مصیبت نازل ہوتی ہے تو پورا قبیلہ اس وقت کے حالات کے مطابق اس خطرے کے تدارک کے لیے فوراً اجتماعی اقدام کرتا ہے۔ اس وقت سب کا جذبہ ایک ہے۔ سب ڈرے ہوئے ہیں اس لیے کسی ایسے آلۂ کار کی ضرورت نہیں ہے جو اس موقع پر اجتماعی جذبہ پیدا کرے۔ خطرہ سامنے ہے اور پورا قبیلہ خوف زدہ ہرنوں کی ڈار کی طرح چونک پڑا ہے۔ لیکن ایسے آلۂ کار کی ضرورت اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس قسم کا کوئی خطرہ فوری طور سے سامنے نہ ہو لیکن اس کا امکان ضرور ہو۔ اس ضرورت کی بنا پر شاعری قبیلے کی معاشی زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح حقیقت خیال میں تبدیل ہو جاتی ہے اور شاعری جنم لیتی ہے۔

جانوروں کی زندگی کے برعکس، انتہائی پسماندہ قبیلے کی بھی زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسے اقدامات کرے جو جبلی نہیں ہوں، جن کا تقاضہ اس قبیلے کی غیر حیاتیاتی یعنی معاشی ضروریات کرتی ہیں۔ مثلاً فصل کاٹنا۔ یہ ضروری ہے کہ کسی سماجی طریقے سے جبلتوں کو فصل کاٹنے کی ضرورت کے ماتحت کر دیا جائے۔ اس طریقے کا ایک نہایت اہم جزو قبیلے کا اجتماعی تہوار ہے جو بند جذبات کو آزاد کر کے اجتماعی طور سے اُن کی شیرازہ بندی کر دیتا ہے۔ اصل چیز کھیت کی فصل ہے جو اس تہوار کے موقع پر خیالی چیز بن جاتی ہے۔ اصل چیز سامنے نہیں ہے۔ لیکن خیالی چیز موجود ہے۔ جو پورے قبیلے کے واہمے (PHANTASY) میں ابھر آتی ہے۔ رقص کی حرکات، موسیقی کی آوازوں اور شاعری کے ترنم کے ذریعے سے قبیلے کا ہر فرد واہمے کی اس دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں فصل لہلہا رہی ہے۔ یہ دنیا حقیقی دنیا سے بھی زیادہ حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ وہ فصل جو ابھی زمین میں بوئی بھی نہیں گئی ہے خیال کی دنیا میں سرسبز و شاداب ہے۔ سلہ اور یہ چیز قبیلے کو اس محنت پر آمادہ کرتی ہے جو فصل اگانے کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح شاعری، رقص، رسم (RITUAL) اور نغمے کے ساتھ مل کر ایک ایسی محرک بن جاتی ہے جو قبیلے کی جبلی طاقتوں کو اجتماعی عمل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اب یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعری براہِ راست انسان کی معاشی ضروریات اور عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

شعر اور معاشی نظام کے براہِ راست تعلق کی یادگاریں آج بھی نیچی سطح کے معاشی نظاموں میں افریقہ کے جنگلوں، ہندوستان کے آدیواسی قبیلوں اور دیہات کے کسانوں میں بڑی آسانی سے مل جائیں گی مثلاً گونڈ، بھیل، سنتھال، سینگ ماریا، بیگا، اگاریا اور ایسے ہی دوسرے قبائل کے فنونِ لطیفہ۔ ان کے گیت اور ناچ براہِ راست ان کے طریقِ پیداوار سے وابستہ ہیں

سلہ
دیدۂ ور آں کہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری | در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری (غالب)
دانہ را کہ بہ آغوشِ زمیں است ہنوز | شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم (اقبال)

ہیں گاؤں میں آج بھی کھیت بونے اور کھیت کاٹنے کے گیت، چکی اور اوکھلی کے گیت، مختلف فصلوں اور تہواروں کے گیت عام ہیں بہت سے تہوار براہِ راست معاشی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ گیت جو محنت کے وقت گائے جاتے ہیں محنت کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ مثلاً چکی کے گیت، مانجھیوں کے گیتوں کا ترنم، اتار چڑھاؤ، چپو چلانے کے حرکات اور وہی بہری آوازوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ گیت جو محنت سے الگ فرصت کے وقت گائے جاتے ہیں انسان کو جذباتی طور سے محنت کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اس کی بہت اچھی مثال جارج ٹامس نے دی ہے۔

ماوری نام کا ایک قبیلہ ہے جس کے ایک ناچ کا نام "آلو کا ناچ" ہے۔ لڑکیاں کھیتوں میں جاکر ناچتی ہیں اور بہت جسم کی حرکات و سکنات سے ہوا چلنے، پانی برسنے، انکھوے پھوٹنے اور پودے بڑھنے کی نقل کرتی ہیں۔ ناچتے ہوئے وہ گاتی جاتی ہیں اور ان کے گیتوں کے بول پودوں سے مخاطب ہو کر یہ کہتے ہیں کہ ہماری طرح اگو۔ یہ عملی تکنیک کی بجائے خیالی تکنیک ہے لیکن فضول اور بے معنی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ناچ اور گیت کا اثر آلو کے پودوں پر نہیں پڑتا لیکن ناچنے والی لڑکیوں پر ضرور پڑتا ہے۔ اس طرح جذباتی تقویت حاصل کر کے وہ لڑکیاں زیادہ بہتر کام کرتی ہیں اور فصل واقعی اچھی ہوتی ہے۔ لڑکیوں کا داخلی رویہ بدلتا ہے جو خارجی حقیقت کو بدل دیتا ہے۔ ان کے گیتوں کے نام بھی ان کی معاشی زندگی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک گیت کا نام پیلا پیلا ٹکڑا ہے اور دوسرے کا نام پھل ہے۔

ناچ گانا اور شاعری تینوں فن ایک ساتھ شروع ہوئے اور ابتدا میں ان کو الگ الگ کرنا ممکن نہیں تھا۔ جارج ٹامس کے الفاظ میں وہ اجتماعی محنت کے دوران میں انسانی جسموں کی مترنم حرکت سے پیدا ہوتے ہیں اس حرکت کے دو اجزا تھے۔ ایک اعضائی حرکت دوسرے گویائی حرکت کی پہلی قسم نے رقص کو جنم دیا، دوسری قسم نے زبان کو۔ یہی گویائی معمولی زبان اور شاعرانہ زبان میں تقسیم ہو گئی۔ جب اس اجتماعی فن میں سے رقص (جسمانی حرکت) خارج ہو گیا تو شاعری پیدا ہوئی۔ یہ گیت کی شکل میں تھی اس کی ہیئت موسیقی تھی پھر یہ دونوں بھی الگ الگ ہو گئے۔ الفاظ خارج ہو جانے کے بعد موسیقی رہ گئی۔ موسیقی کے بغیر شاعری کی ہیئت میں صرف اس کا مترنم ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ کاڈویل کا خیال یہ ہے کہ ترنم جادو کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔

اس ابتدائی شاعری میں کوئی کہانی کہی جاتی تھی جو بجائے خود داخلی طور سے مربوط ہوتی تھی اور شاعری کی مترنم ہیئت کی محتاج نہیں تھی۔ بعد کو اس بیانیہ شاعری سے نثر کی رومانوی داستان اور ناول پیدا ہوا جس میں شاعرانہ زبان کی جگہ عام گفتگو نے لے لی اور ظاہری شاعرانہ ترنم کی جگہ خود کہانی کے اندرونی توازن نے لے لی۔ (اس لیے ناول عہدِ جدید کا رزمیہ ہے۔ مشین اور چھاپہ خانہ نے گیت کا گلا گھونٹ دیا اور رزمیہ شاعری کی بنیاد ختم کر دی۔ اب اس کی جگہ ناول نے لے لی ہے) اس دوران میں موسیقی

۱؎ معاشی زندگی سے قربت کی وجہ سے قبائلی اور دیہاتی شاعر فی البدیہہ شعر کہتے ہیں جو ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ میں نے بنگال اور یوپی کے کسان شاعروں کو گھنٹوں گیت کہتے اور گاتے ہوئے سنا ہے۔ مجمع انہیں کوئی موضوع دے دیتا ہے۔ اور شاعر ایک دوسرے کے مقابلے پر گیت کہتے ہیں اور رات رات بھر گاتے رہتے۔ عرب کے ایامِ جاہلیت کی شاعری میں بھی فی البدیہہ شعر گوئی کی بڑی اہمیت تھی وہ قبائلی زندگی کی یادگار تھی۔

(SYMPHONY) سازوں کا یہ سنگیت ... ناول کی شکل
... میں ایک ایسی قسم نے بھی ترقی کر لی جو صرف سازوں سے پیدا کی جاتی ہے۔ ہے۔ ... ناول وہ گویائی ہے جس میں ترنم نہیں اور سنگیت وہ ترنم ہے جس میں گویائی نہیں۔ (جارج ٹامسن)

انیسویں صدی کے ایک جرمن عالم بوخر نے تحقیق کی ہے کہ ترنم محنت کے اجتماعی عمل سے پیدا ہوا ہے۔ پلیخانوف نے اپنی کتاب ... کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے بوخر کی تحقیق کی مدد سے یہ بتایا ہے کہ سازوں نے کس طرح جنم لیا۔ جسمانی محنت کے حرکاتی ... (RHYTHM) کے بیچ کے وقفوں سے ترنم اور موسیقی نے جنم لیا۔ ساز اور ... بھی اسی طرح پیدا ہوئے۔ انسان کے اوزار ... جو آوازیں پیدا کرتی تھیں ان میں خود ایک ترنم ہوتا تھا۔ انسان نے وقفوں میں تبدیلی پیدا کر کے تنوع اور تنوع پیدا کر کے ... اور آہنگ کو بدل دیا جس سے انسانی جذبات کے اظہار کا کام لیا گیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے اوزاروں کی بھی شکلیں بدلیں اور وہ سازوں میں تبدیل ہو گئے۔ سب سے پہلے اوزار جو تبدیل ہو کر ساز بنے وہ تھے جن سے پیٹنے اور چوٹ دینے کا کام لیا جاتا تھا۔ ڈھول سب سے پہلا ساز ہے جو تمام وحشی قبائل میں مقبول ہے۔ مردنگ، ... طبلہ ... اسی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔ ... تاروں کے ساز ڈھول کے بعد میں پیدا ہوئے۔ ان میں ابتدائی وہ ہیں جن کے تاروں پر انگلی یا ... سے ضرب ... ہے۔ ...

ایک مرتبہ جب سازوں نے ... توازن کی ترقی اور نشوونما آزادانہ طریقے سے ہونے لگی اور ان کی شکلیں بدلنے لگیں۔ آج ہمارے ... طرح کے ساز ہیں جن کے امتزاج سے ہم طرح طرح کے سنگیت بناتے ہیں۔ انسان نے فطرت اور عناصرِ فطرت پر اپنی جسمانی اور ذہنی دونوں طاقتوں سے حملہ کیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اوزار بنائے، ... درخت کاٹے، تیر کمان سے جانوروں کا شکار کیا، بھدے قسم کے بیلچوں اور کھرپیوں سے زمین کھودی، خاک سے پودے اگائے، درختوں کے تنوں سے کشتیاں تیار کیں، دیواریں اٹھائیں، چھتیں ڈالیں، اپنے آپ کو عناصرِ فطرت کی سفاکیوں سے محفوظ کیا اور فطرت کی بعض قوتوں پر قابو حاصل کیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کام کرتا تھا اور دل و دماغ کی چمکدار اور تیز تلوار سے فطرت کے وحشی عناصر پر وار کرتا تھا۔ یہ وار جادو، شاعری، رقص اور نغمے کی شکل اختیار کر لیتا تھا اور اس کے ہاتھوں کو مزید تقویت بخشتا تھا۔ اس کے دل کو نئے مقاصد کے لیے آمادہ کرتا تھا اس کے داخلی وجود کو خارجی عناصر سے زیادہ طاقتور بناتا تھا۔ انسان اپنے خیال کو پھیلا کر حقیقت کے دل میں پیوست کر دیتا تھا اور اپنی محنت میں ناقابلِ تسخیر قوتوں کو بھی تسخیر کر لیتا تھا۔ آرٹ جادو تھا جس کا مقصد فطرت اور ماحول کو تبدیل کر کے انسان کے لیے بہتر زندگی اور بہتر سماج کی تشکیل کرنا تھا۔ آرٹ آج بھی یہی فرض انجام دیتا ہے فطرت، سماج اور انسان کے درمیان جو تضاد ہے اس کو خوشگوار شکل میں حل کرنا آرٹ کا کام ہے۔ اس لیے آج بھی آرٹ کے لیے سحر کاری سب سے زیادہ ضروری شرط ہے جس کے لیے آج کل تاثیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ جس آرٹ اور ادب میں تاثیر نہیں وہ دو کوڑی کا ہے۔ تاثیر کے معنی یہ ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے کے سینے میں فن کار کا دل دھڑکنے لگے جو آرزوؤں، تمناؤں اور خوابوں سے معمور ...

جب انسانی سماج نے ترقی کی اور محنت میں سماجی تقسیم عمل میں آئی تو انسانیت طبقات میں تقسیم ہو گئی ——— آقا اور غلام، جاگیردار اور کسان، سرمایہ دار اور مزدور، مختصر یہ کہ حاکم اور محکوم ——— لیکن طبقاتی تقسیم کے ساتھ ساتھ ایک اور تقسیم بھی ہوئی اور وہ جسمانی اور ذہنی محنت کی، یہ تقسیم اس لیے ضروری تھی کہ ذرائع پیداوار اور سماجی طریق پیداوار اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ سماج کے تمام افراد کا پیٹ پوری طرح بھر سکے اور انسانوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ تھوڑا سا کام کر کے اتنا پیدا کر لیں کہ فراغت کے لیے وقت نکل سکے جو آرٹ، فلسفے، سائنس اور سیاست کے لیے دیا جا سکے۔ اس لیے ایک بہت بڑا گروہ جو تھوڑا سا کھا کر زندہ رہتا تھا اور اپنی معمولی ضروریات سے زیادہ سامان پیدا کرتا تھا صرف جسمانی محنت پر اکتفا کرنے لگا اور ایک چھوٹا سا گروہ جس کی زندگی کا دارومدار ایک بڑے گروہ کی محنت پر تھا، آرٹ اور فلسفے، سائنس اور سیاست کے لیے وقف ہو گیا اس لیے

قدیم یونان میں، غلاموں کو شہری حقوق حاصل نہیں تھے۔ ان کا کام صرف جانوروں کی طرح مشقت کرنا تھا۔

یہاں سے تہذیب و تمدن کا دور شروع ہوتا ہے جس میں آرٹ اور ادب تخلیقی سرچشموں سے دور ہو کر بلند ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت کے بعد سے شعور اپنے آپ کو یہ فریب دے سکتا ہے کہ وہ عمل سے الگ کوئی چیز ہے اور وہ خالص نظریہ، خالص فلسفہ اور خالص آرٹ اور ادب پیدا کر سکتا ہے۔ یہاں سے شعور اور سماج میں، ادب اور سماج میں، سماجی رشتوں اور سماجی تخلیقی قوتوں میں تضاد اور ٹکراؤ پیدا ہونے لگتا ہے۔

گورکی لکھتا ہے کہ "انسان کا تہذیبی اور سماجی ارتقا صرف اسی صورت میں صحت مند رہ سکتا ہے جب ہاتھ دماغ کی تربیت کریں اور یہ تربیت یافتہ دماغ ہاتھوں کی تربیت کرے اور یہ اور زیادہ تربیت یافتہ زیادہ اچھی طرح دماغ کی تربیت اور ترقی کا سامان کریں محنت کش انسان کی تہذیبی ترقی کا یہ صحت مند اور معمولی عمل زمانۂ قدیم میں رک گیا۔۔۔۔۔ دماغ ہاتھوں سے جدا ہو گیا اور فکر عمل سے کٹ گئی۔ پھر کام کرنے والوں کے درمیان سوچ بچار کرنے والے انسان نمودار ہوئے اور دنیا اور فکر کے ارتقا کے اصول مجرد اور ہوائی طریقے سے سمجھانے لگے۔

تب سے آرٹ اور ادب کے دو متوازی دھارے بہہ رہے ہیں۔ ایک عوامی ادب اور فن ہے جو تھکے ہوئے ہاتھوں اور پسینے سے تر دماغ کا مرہونِ منت ہے۔ محنت کش عوام صدیوں سے ضرب الامثال، حکایتوں، داستانوں اور گیتوں کی تخلیق کر رہے ہیں جو کہیں لکھے نہیں جاتے، کہیں جمع نہیں کیے جاتے اور جن کے مصنفین کا نام تک نہیں معلوم۔ سینہ بہ سینہ، نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہو رہے ہیں۔ اُن کو محفوظ کرنے کے لیے نہ کتابیں ہیں نہ کتب خانے۔ پھر بھی وہ جنتا کی یادوں میں محفوظ ہیں۔ یہ کہانیاں اور حکایتیں الاؤ کے گرد سنائی جاتی ہیں۔ یہ گیت چشموں کے کنارے، کھیتوں کے سینے پر اور جنگل کے گھنے درختوں کے سائے میں گائے جاتے ہیں۔ ان میں صدیوں کا رکھ رکھاؤ ہے۔ صدیوں کا تجربہ، دانش اور فراست محفوظ ہے ان میں عوام کے دلوں کی تمنائیں، ان کے محبوب اور حسین خواب، ان کی نفرتیں اور محبتیں ہیں ان میں ایسے عقلمند کے کردار ہیں جو ذرا سے میں بوکھلا جاتے ہیں۔ ایسے بیوقوفوں کے کردار ہیں جن پر سب ہنستے ہیں۔ لیکن وہ ہر مشکل سے باہر نکل آتے ہیں اور آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں لیلیٰ اور شیریں کی سی محبوبائیں ہیں، مجنوں اور فرہاد کے سے عاشق ہیں رستم کی طرح سورما اور پرومتھیوس کی طرح کے جیالے جو بادشاہوں اور دیوتاؤں سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس صدیوں کے عوامی ادب میں جیرائن کی گندگی، منٹو کی فحاشی اور حسن عسکری کی قنوطیت اور کلبیت نہیں ملے گی۔ اس میں زندگی کا حوصلہ اور امنگ ہے۔ محنت کے عمل کو ہلکا اور خوشگوار بنانے کی خواہش ہے۔ فطرت پر قابو پانے کی کوشش ہے۔ چرخے جو خود بخود چلتے ہیں، کھٹولے جو ہوا میں پریوں کو لے کر اڑتے ہیں، پانی کی سطح پر چلنے والے آدمی ہیں۔ اس میں چاند اور ستارے، پھول اور چڑیاں انسانوں سے ہمکلام ہوتی ہیں۔ ظالم ہمیشہ شکست کھاتے ہیں اور مظلوم ہمیشہ فتحیاب ہوتے ہیں۔ اس کا اخلاقی معیار بہت بلند ہے اور ہر ہر لفظ میں قبیلے، جماعت ـــــ انسان کے لافانی ہونے کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گورکی نے عوام کی ضرب الامثال، داستانوں، حکایتوں اور گیتوں کے مطالعے پر بہت زور دیا ہے جس کے بغیر نہ تو سماج کی تاریخ سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ادب اور فن کے مسائل ہی حل کیے جا سکتے ہیں۔

دو . ادھارا جسے ہم اپنی آسانی کے لیے "اعلیٰ" ادب اور فن کہہ سکتے ہیں ذرا اُونچی سطح پر ہوتا ہے اور افلاطون اور ارسطو کے
این ، مائیکل انجلو اور بیتھوون کے فن ، کالی داس اور غالب کے تخیل سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ علم کے خزانوں اور سائنس
، دوربین کو مستعار رہتا ہے۔ یہ دوہرا دھارا عوام کے تخلیقی سرچشموں اور پیداواری قوتوں سے تو ضرور دور ہو جاتا ہے۔ لیکن
، وجہ سے ادب اور سماج میں تضاد رہتا ہے) لیکن پہلے دھارے —— عوامی ادب —— سے بالکل منقطع نہیں ہوتا
، یہاں سے تقویت حاصل کرتا رہتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان لمحوں میں جب سماج اور زندگی کوئی تاریخی کروٹ
لیتی ہے اور عوام سیاست کے میدان میں اتر آتے ہیں اور بڑی بڑی اجتماعی تحریکیں اور بغاوتیں ہوتی ہیں تو دونوں دھارے
. . دو ے کا منہ چوم لیتے ہیں اور ایک پرشور سیلاب کی طرح چوڑے چکلے پاٹ میں بہنے لگتے ہیں۔
اس کی مثالیں دنیا کے موجودہ انقلابی ادب میں بے شمار ہیں۔ ہر زبان کی پچھلی تاریخ میں بھی اس کی مثالیں ملیں گی
، آج کے ادب کی وسعت اور گہرائی تاریخی حالات کی وجہ سے کہیں زیادہ ہے۔
فردوسی ، امیر خسرو ، عمر خیام کی شاعری جو ایرانی قوم کے جذبۂ آزادی اور کسانوں غلاموں اور دستکاروں کی
... دت کے ساتھ وابستہ ہے۔ کبیر اور تلسی داس کی شاعری جو ہندوستان کے کسانوں اور دستکاروں کے جذبات
کی آئینہ دار ہے۔ مراٹھی کسانوں کی بغاوت کے وقت مراٹھی شاعری خصوصاً اس کی صنف پواڑا) اور پٹھانوں کی شدت
کے وقت کی پشتو شاعری جس کا سب سے بڑا شاعر خوشحال خاں خٹک تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے بڑے بڑے
شاعروں اور ادیبوں کے بہترین کارنامے اور شاہکار اسی وقت وجود میں آئے ہیں جب انہوں نے عوامی تخیل سے بال
و پر حاصل کیے ہیں۔

گورکی نے لکھا ہے۔ حالانکہ روحانی طور سے مجبور اور جکڑے ہوئے عوام اب اس قابل نہیں تھے کہ شاعرانہ تخلیق
کی بلندیوں کو چھو سکتے پھر بھی وہ اپنی بھرپور اندرونی زندگی بسر کرتے رہے اور ہزاروں افسانے ، گیت ،
اور ضرب الامثال بناتے رہے۔ بعض اوقات انہوں نے ایسے قابل قدر کردار تخلیق کیے جیسے فاؤسٹ ، اس افسانے
کی تخلیق میں عوام نے گویا اس فرد کا روحانی کھوکھلا پن دکھایا ہے جو ایک عرصے سے عوام سے منحرف تھا۔ وہ ... کے
لذتیت کے نظریے پر بنے ہیں اور انہوں نے علم کے حدود سے باہر کی چیزوں کو دریافت کرنے کی فضول کوشش کا مذاق
اڑایا ہے۔ ہر ملک کے بہترین شاعروں نے اپنے شاہکاروں میں عوامی ادب و فن کے خزانے سے فائدہ اٹھایا ہے جن
میں ہر طرح کی نعمتیں ہر طرح کی تصویریں اور ٹائپ موجود ہیں۔
... رشک و حسد کا شکار آتھیلو ، مذبذب ہیملیٹ اور مایوس ڈان ژوان یہ سب وہ ٹائپ ہیں جنہیں عوام نے
شیکسپیئر اور بائرن کی پیدائش سے بہت پہلے تخلیق کیا تھا۔ ہسپانوی عوام نے کالڈرن سے بہت پہلے یہ گیت گائے ہیں
کہ زندگی ایک خواب ہے اور یہی بات موروں نے ہسپانوی عوام سے بھی پہلے کہی تھی۔ سروانٹس سے بہت پہلے عوامی
حکایتوں میں مہم جو بانکوں کا مذاق اڑایا گیا ہے اور اتنی ہی نفرت اور حقارت اور حزن و ملال کے ساتھ گورکی نے
جس کردار کی طرف اشارہ کیا ہے وہ سروانٹس کا ڈان کیوکزٹ ہے۔ اس سے ملتا جلتا کردار شیکسپیئر کا فالسٹاف
ہے اور رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد کا خوجی جس کے بارے میں احتشام حسین نے بہت دلچسپ مضمون لکھا ہے

• ملٹن ، ڈانٹے ، ملکی ، ڈکس ، گوئٹے اور شلر نے سب سے زیادہ بلند پردازی اس وقت دکھائی ہے جب انہوں نے جماعت (COMMUNITY) کی تخلیقی طاقت سے بال و پر مستعار لیے ، جب انہوں نے اپنا انسپریشن عوامی شاعری کے سرچشموں سے حاصل کیا۔ عوامی شاعری جو اتھاہ سمندر ہے۔ بے انتہا متنوع ، زور دار اور عقل و فراست سے بھری ہوئی۔

" یہ کہہ کر میں ان شاعروں کی بین الاقوامی شہرت کو کم نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اتنی بات کہہ رہا ہوں کہ انفرادی تخلیق کے بہترین نمونے قیمتی جواہرات ہیں جو بڑی خوبصورتی سے جڑے گئے ہیں لیکن ان جواہرات کی تخلیق عوامی قوت سے ہوتی ہے۔ آرٹ یقیناً فرد کی دسترس میں ہے لیکن سچی تخلیق صرف جماعت کر سکتی ہے۔ زیوس کی تخلیق یونانی عوام نے کی تھی۔ فڈیاس نے اسے صرف پتھر سے تراش کر نکال لیا۔"

میں گورکی کی فہرست میں فردوسی کے رستم ، نظامی گنجوی کے شیریں ، فرہاد ، لیلیٰ مجنوں ، کالی داس کی شکنتلا اور تلسی داس کے رام لچھمن ، سیتا اور راون کا اضافہ کروں گا۔ ہندوستانی نٹ راج کا مجسمہ بھی اسی فہرست میں آتا ہے۔

سردار جعفری

چھرو مانجھی

(یہ رپورتاژ دنیا کی آخری [illegible] میں شائع ہو چکا ہے)

ہوا بہت دھیمے سروں میں گا رہی تھی۔ دریا کا پانی آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے نغمہ بڑا پرشور تھا لیکن اب اس کی آخری تانیں مدھم پڑ چکی تھیں اور ایک نرم اور لطیف گنگناہٹ باقی رہ گئی تھی۔ وہ لہریں جو پہلے ساحل سے جا ٹکرا رہی تھیں، اب اپنے سیال ہاتھوں سے تھکے ہوئے ساحل کا جسم سہلا رہی تھیں۔ ہماری کشتی پانی کی لہروں کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ کنارے سے دور اتھلے پانی میں ماہی گیروں نے اپنے چھوٹے چھوٹے [illegible] چھوڑ دیئے تھے اور بار بار کھول دیتے تھے۔ اور سمندر کی طرف دوڑتی ہوئی [illegible] کشتی لے جانے کے لیے جا رہی تھیں۔ بادبان میں ہوا بھری ہوئی تھی اور اس کا سینہ فخر سے پھولا جاتا تھا۔ ہماری کشتی لمبی لمبی نازک اور نیلم سمپانوں کو، ان میں بیٹھے ہوئے انھیں کے گیتوں کو، بڑے سے سیاہ فام جہاز کو اور ساحل کے پاس شہر کی چمکتی ہوئی روشنی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بڑھتی جا رہی تھی۔ سمپانیں موجوں میں، ساحل اندھیرے میں اور روشنیاں ننھے ننھے خوبصورت ستاروں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

بوڑھے ماہی گیر نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "رات اچھی ہے۔ آج طوفان کا خطرہ نہیں ہے۔ ایک گھنٹے میں چاند نکل آئے گا۔"

نوجوان ماہی گیر نے جو اس کا بیٹا تھا کہا کہ "اتنی دیر میں ہم کھلے سمندر میں پہنچ جائیں گے۔" یہ وہ جگہ تھی جہاں دریائے کرنافلی خلیج بنگال میں جا کر ملتا ہے، جس کے کنارے چٹاگانگ کا شہر آباد ہے۔ سبز اور نیلی پہاڑیوں کے دامن میں شب رنگ کے خوب صورت اور چھریرے بدن کی دوشیزاؤں کی طرح نازک درختوں کے سائے ہیں۔ جب سمندر میں پانی چڑھتا ہے تو دریا کا دھارا الٹا بہنے لگتا ہے اور ماہی گیر اپنے جال دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ جب سمندر کا پانی اترتا ہے تو دریا پھر سمندر کی پھیلی ہوئی آغوش کی طرف لپکتا ہے اور ماہی گیر اپنی کشتیاں اور جال لے کر کھلے سمندر میں چلے جاتے ہیں اور ساحل کے کنارے کنارے کوکس بازار تک مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ گھروں پر ان کی بیویاں اور محبوبائیں ان کا انتظار کرتی ہیں اور سمندر میں ان کے گیت تیرتے ہیں۔ جنھیں سننے کے لیے دور دور کی مچھلیاں سمٹ آتی ہیں اور ان کے جال بھر جاتے ہیں اور کشتیاں بھاری ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے مضبوط بازوؤں کی قوت سے چپو چلاتے ہیں۔ ان کی سانس پھول جاتی ہے، گیتوں کا آہنگ وزنی ہو جاتا ہے۔

گلے کی رگیں اُبھر آتی ہیں، بازوؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتی ہیں، ہتھیلیاں لال ہو جاتی ہیں اور جب وہ اپنے گاؤں کے کنارے آکر شکار سے بھری کشتیوں کو خالی کرتے ہیں تو ان کی بیویوں اور محبوباؤں کی آنکھیں رنگ برنگی مچھلیوں کو دیکھ کر ہوا میں اُٹھتی ہیں اور وہ اپنا دل ہمیشہ کے لیے بہادر ماہی گیروں کو دے دیتی ہیں۔ اور رات کو جب تیل کی کمی سے چراغ کی مدھم روشنی ہلنے لگتی ہے اور ہوا کی ہلکی سی پھونک اسے بجھا دیتی ہے تو یہ تھکن سے چور ماہی گیر ان کے نیلگوں سینوں پر جن میں مچھلی کی بو آتی ہے اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں۔

لیکن جب سے لڑائی شروع ہوئی تھی اور جاپان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا تب سے ماہی گیروں کو عام طور سے سمندر میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کھلے سمندر میں جانے کے لیے انہیں فوجی افسروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا جو صرف چند امیر ماہی گیروں کو ملتا تھا کیونکہ دوسرے ماہی گیر رشوت دینے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اور کسی بازار جانے کے نام پر ستے بازار بند ہوگئے تھے۔ کیونکہ بندرگاہ بہت بڑی چھاؤنی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ بازار سے صرف فوجی لاریاں گزرتی تھیں اور سمندر سے صرف جنگی جہاز۔ مجھے اخباری نمائندے کی حیثیت سے خاص اجازت نامہ ملا تھا جس پر فوجی افسروں کے علاوہ ڈپٹی کمشنر کی بھی مہر لگی ہوئی تھی۔

بوڑھے ماہی گیر نے اپنی چلم سلگائی اور نوجوان ماہی گیر مچھیروں کا گیت گانے لگا۔ میں کشتی میں لیٹ کر خواب دیکھنے لگا۔ میری نگاہیں دُور تک سر پر سے گزرنے والے ہوائی جہازوں کی سُرخ اور سبز روشنیوں کا تعاقب کرتیں اور پھر آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں میں کھو جاتیں، جو نیلے آسمان کی گود میں دریائی موجوں کی طرح بہہ رہے تھے۔

بوڑھا ماہی گیر میرے پاس سرک آیا اور چلم میری طرف بڑھا دی۔ میں نے ایک لمبا سا کش لے کر پوچھا "تم اپنا جال ساتھ لاتے ہو؟"

"نہیں جال کا کیا ہوگا۔ جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، سمندر میں جال ڈالنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟"

"کہتے ہیں پانی میں بڑے بڑے بم ڈال دیئے گئے ہیں تاکہ دشمن کے جہاز نہ آسکیں اور میں سوچتا ہوں کہ سرکار کے جہاز کیسے چلتے ہیں!"

"بم تو سرکار ہی نے ڈالے ہیں،" بیٹے نے اپنا گیت بند کرکے جواب دیا۔ "انہیں معلوم ہے کہ بم کہاں کہاں پڑے ہیں اور وہ اپنے جہازوں کو بچا کر نکال لے جاتے ہیں۔"

"ہم تو تباہ ہوگئے"۔ بوڑھے نے اپنی داستان شروع کی۔ رات کے اندھیرے میں اس کا جھریوں پڑا چہرہ بڑا پُر وقار معلوم ہو رہا تھا، جس پر پچاس برسوں کی صعوبتوں کے نشان تھے۔

"پچاس برس سے دریا میں جال ڈال رہا ہوں۔ اس کے ایک ایک چپے کو جانتا ہوں۔ بہتی ہوئی موجوں کو دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ ان کے نیچے کتنی مچھلیاں ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں اور دریا کی مچھلیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ جب وہ چلتی ہیں تو موجوں کی رفتار میں فرق آجاتا ہے اور میں ایک نظر میں بھانپ لیتا ہوں کہ کون سی مچھلی جا رہی ہے۔ آسمان دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ موسم کتنی دیر میں بدل جائے گا۔ سمندر میں طوفان کب آئے گا اور دریا کا پانی الٹا کب بہے گا۔ پچاس برس سے

... کام کر رہا ہوں۔ کچھ نہیں تو لاکھوں ہی مچھلیاں تو پکڑ ڈالی ہوں گی۔ لیکن آج تک یہ پتہ نہ چلا کہ ہم جو محنت کرتے ہیں، وہ دولت کہاں جاتی ہے۔ ہم دریا میں خالی جال ڈالتے ہیں۔ جب اسے کھینچتے ہیں تو اس میں چاندی بھری ہوتی ہے۔ تڑپتی ہوئی چاندی اچھلتی چمکتی ہے۔ عورتیں اس چاندی کو اپنی ٹوکریوں میں بھر کر بازار لے جاتی ہیں اور اس کے بدلے تانبے کے پیسے، کھوٹے سکے اور کاغذ کے ٹکڑے لے آتی ہیں۔ ہم پھر دریا میں جال ڈالتے ہیں اور پھر اس میں سے تڑپتی ہوئی چاندی [illegible] ... یہ چاندی پھر تانبے، کھوٹ اور کاغذ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہمارے جسم سوکھتے چلے جاتے ہیں۔ آنکھیں [illegible] ... ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح خشک ہوتے جاتے ہیں۔ میں چالیس برس سے [illegible] ... اور لیکن مجھے تانبے اور کھوٹ کے ٹکڑوں اور کاغذ کے میلے پرزوں کے سوا [illegible] ... مچھلیاں تڑپ کر نکل جاتی ہیں، یہ ٹکڑے بھی ہماری ہتھیلیوں سے پھسل جاتے ہیں [illegible] بد رنگ ہو جاتی ہے۔

نوجوان ماہی گیر باپ کی داستان غم سے بے نیاز کشتی کے اگلے سرے پر بیٹھا ہوا ایک عشقیہ گیت گا رہا تھا۔

بوڑھے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "تم پڑھے لکھے [illegible] ... بتا سکتے ہو کہ ہماری دولت کہاں جاتی ہے؟"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بوڑھے ماہی گیر نے اس کا موقع نہیں دیا اور بہتی ہوئی موجوں کی طرف دیکھ کر اپنے [illegible] کا جواب دینے لگا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے۔

"یہ دریا ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے اور اس کا پانی سمندر میں گر رہا ہے۔ میری عمر ساٹھ برس کی ہونے کو آئی لیکن میں نے ایک دن بھی نہیں دیکھا کہ اس کی موجوں کا بہاؤ رک گیا ہو۔ ایک کے پیچھے دوسری موج دیوانہ وار سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ سمندر جس کی تہہ کا کچھ پتہ نہیں جو آکاش کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ہماری محنت بھی اسی طرح بہتی ہوئی کسی بڑے سے سمندر کی طرف چلی جا رہی ہے۔ کوئی اندھا سمندر ہے جو ہماری چاندی کی طرح چمکتی ہوئی محنت کو نگلے لے رہا ہے، چاندی ہی تو ہے جو بہہ رہی ہے۔ دیکھو یہ موجیں چاندی کی طرح چمک رہی ہیں۔ دریا کا رنگ سفید ہے اور سمندر کا رنگ نیلا اور یہ سفید چاندی نیلے سمندر میں جا کر کھو جاتی ہے۔"

میں نے موجوں کی طرف دیکھا جو واقعی بہتی ہوئی چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ہمارے بائیں طرف دور افق میں مہینے کی آخری راتوں کا چاند ابھر رہا تھا، جس کی نرم کرنیں فضا سے گزر کر دریا کے جسم پر پھیل گئی تھیں اور نیلے پانی کو سیال چاندی میں تبدیل کر رہی تھیں۔ بوڑھے کا سیاہی مائل چہرہ چاند کی ہلکی سی سرخی مائل روشنی میں چمک اٹھا تھا اور سفید بادبان بادل کا ایک خوبصورت ٹکڑا معلوم ہوتا تھا جو ہمیں چاندی کے دریا میں بہائے لئے جا رہا تھا۔

بوڑھے ماہی گیر نے نظر اٹھا کر چاند کی طرف دیکھا پھر بادبان کی طرف۔ بادبان کچھ ٹیڑھا ہو گیا تھا یا شاید ہوا کا رخ بدل گیا تھا اور اس لئے بادبان کا بھی رخ بدلنا ضروری تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ دونوں نے لپٹی ہوئی رسیاں کھولیں اور بادبان کا رخ بدل کر میرے پاس آ بیٹھے۔

"جب سے لڑائی شروع ہوئی ہے، مفلسی اور بڑھ گئی ہے۔ پہلے قحط پڑا پھر وبائیں پھیلیں، ایسا قحط اور ایسی

وبائیں تو ہم نے دیکھی نہیں تھیں۔ ہیضہ اور پھر کالا آزار، پھر بد چلنی، ہمارے گاؤں کے گاؤں اُجڑ گئے۔ بوڑھے اور بچے مر گئے لڑکے آوارہ ہو گئے اور لڑکیاں گھر بار چھوڑ کر چلی گئیں۔ پھر یہاں فوج آ گئی اور ہمارے لڑکے اور لڑکیاں ماہی گیری چھوڑ کر فوج میں مزدوری کرنے لگے۔ ماہی گیری کیسے کرتے، نہ جال تھے، نہ کشتیاں، سر چھپانے کے لئے گھر بھی نہیں تھا۔ یہ سب چیزیں تو قحط کے زمانے میں بک چکی تھیں۔ اب لڑکے بے حیا ہو گئے ہیں۔ لڑکیاں اور بھی زیادہ بے شرم ہو گئی ہیں۔ سپاہی انہیں روپے دیتے اور وہ سپاہیوں کو اپنا جسم بیچ دیتی ہیں۔ پہلے ہمیں جال کی مرمت کرنی پڑتی تھی۔ سر پر مچھلیوں کی ٹوکری رکھ کر بازار جانا پڑتا تھا۔ پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا تھا تو محنت سے جسم تندرست رہتے تھے۔ چہرے پر ایمان داری کی چمک ہوتی تھی۔ اور اب؟ اب کیا ہے۔ ذرا سی آنکھیں مٹکائیں۔ ذرا سا کولھا چلایا اور کام بن گیا۔ مجھ ہی کو دیکھو۔ میرے گاؤں میں تین سو گھر تھے۔ اب صرف آٹھ گھر رہ گئے ہیں۔ باقی سب اُجڑ گئے۔ اب ان کھنڈروں میں بیٹھ کر کتے روتے ہیں۔ میری بیوی قحط میں مر گئی۔ دو بیٹیاں تھیں، وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ سنا ہے کہ اراکان روڈ پر مزدوری کر رہی ہیں۔ مزدوری تو کیا کر رہی ہوں گی۔ یہ تو بہانہ ہے۔ ایک کا نام رادھا ہے اور دوسری کا ساوتری۔ یہ نام تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم گھومنے پھرنے والے آدمی ہو۔ شاید تمہیں اراکان روڈ پر وہ لڑکیاں مل جائیں تو ان سے کہہ دینا کہ تمہارا باپ زندہ ہے۔ نیا جھونپڑا ڈال لیا ہے۔ جال بھی ہے اور کشتی بھی اور دریا میں بہت سی مچھلیاں ہیں۔ رادھا اور ساوتری آ جائیں تو ہم خوب مچھلیاں پکڑیں گے۔ ہمارا ایک جال بھی ٹوٹا پڑا ہے۔ اس کی مرمت ان کے بغیر کیسے ہو گی۔

بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چپ ہو گیا اور بہتے ہوئے پانی کی موجیں گننے لگا۔ جیسے وہ ان موجوں کے آئینے میں اپنی ساری گزری ہوئی زندگی کا عکس ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا اُجڑا ہوا گاؤں، مرے ہوئے ساتھی، بیوی جو داغ مفارقت دے گئی۔ گھر چھوڑ کر بھاگ جانے والی بیٹیاں جو اسے اب بھی اتنی ہی پیاری تھیں۔ وہ سب ان موجوں میں تیر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھے ماہی گیر کی انگلیاں کانپ رہی ہیں اور آنکھوں سے بہہ کر آنسو اس کی جھریوں میں بھر گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہنے لگا "رادھا اور ساوتری ہی کو کیوں بُرا کہو۔ آج کل سب لڑکیاں ایسی ہی ہو گئی ہیں۔ ہمارے یہاں کالے گورے ہزاروں سپاہی آ گئے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے لیے موزے لاتے ہیں۔ سفید اور لال پاؤڈر سے بھرے ہوئے ڈبے لاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے آئینے لاتے ہیں اور لڑکیاں دیوانی ہو جاتی ہیں اور اپنا منہ رنگ کر ان کے پیچھے دوڑتی ہیں۔ سپاہی دریا میں اور تالابوں میں ننگے نہاتے ہیں اور لڑکیاں کنارے کھڑی ہو کر ان کا تماشہ دیکھتی ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے اور کئی بار سوچا کہ یہ سب لڑکیاں قحط اور وبا میں مر کیوں نہیں گئیں۔ مچھلیاں پکڑنا، کھیت بونا اچھا پیشہ ہے۔ مانا کہ اس میں غریبی دور نہیں ہوتی لیکن عزت تو باقی رہتی ہے۔ گھر بار تو رہتا ہے۔ لیکن یہ منہ پر رنگ پوت کے دیسی بدیسی سپاہیوں سے آنکھیں لڑانا کہاں کا پیشہ ہے لیکن اب جسے دیکھو وہ یہی کر رہی ہے۔ سپاہی اپنی موٹروں پر گزرتے ہیں تو سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی لڑکیوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیتے ہیں اور دو تین میل آگے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہاں سے دوسرے سپاہی انہیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ چٹ گاؤں سے ٹینکا اور ٹینکا سے رامو اور رامو سے کوکس بازار تک یہی سلسلہ ہے۔ سب لڑکیاں خراب ہو گئی ہیں۔ کوئی اچھی نہیں رہ گئی۔ میں سوچتا ہوں ہم پر جاپانی بم کیوں نہیں گرتے۔"

چیم کے ساحل پہ ایک گاؤں آباد تھا اور اس کے سرسبز درختوں کا جھنڈ چاندنی میں آہستہ آہستہ پیچھے سرک رہا تھا۔ بوڑھے ماہی گیر نے اپنی انگلی کا اشارہ کرکے کہا۔ "وہ گاؤں دیکھتے ہو۔ تھوڑے زمانے میں وہاں کے تمام آدمی مر گئے اور ان کی لاشیں پڑی رہیں اور گِدھوں نے کھائیں۔ اس سال درختوں میں پھل نہیں آئے بس شاخوں میں گدھ بیٹھے رہتے جو اکثر زندہ آدمیوں پر بھی جھپٹ پڑتے تھے کوئی آدمی اس طرف آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ ایک رات کیا ہوا کہ ٹھیک بارہ بجے کے وقت دوسرے گاؤں سے ایک شعلہ بلند ہوا اور اس گاؤں کی طرف چلا۔ تھوڑی دیر میں چیم کی طرف سے ایک اور شعلہ اُٹھا اور وہ بھی اس گاؤں کی طرف چلا اور پھر دونوں شعلے مل گئے۔ اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اب روز رات کے وقت بارہ بجے دو شعلے ناچتے ہوئے چلتے تھے۔ ایک پورب سے اور دوسرا پچھم سے اور دونوں اس گاؤں میں آکر مل جاتے تھے۔ کسی نے کہا بھوت ہیں۔ کسی نے کہا پریت ہیں اور تم تو جانتے ہی ہو کہ مرنے کے بعد انسان بھوت پریت بن جاتے ہیں اور یہاں تو ہزاروں مُردے پڑے تھے۔ جب میں نے پہلی بار ان بھوتوں کو دیکھا تو میرا دل کانپ اٹھا۔ میں ڈرپوک آدمی نہیں ہوں لیکن بھوت پریت سے تو سب ہی ڈرتے ہیں۔"

بیٹے نے باپ کو ٹوک دیا۔ "یوں نہیں ہوا تھا۔ میں سناتا ہوں۔ میں نے تو اُن شعلوں کو پکڑا تھا۔"

"سچ؟ تم نے ان شعلوں کو پکڑ لیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

بوڑھے نے خوش ہوکر کہا۔ "میرا بیٹا بڑا بہادر ہے۔" اور نوجوان ماہی گیر کا سینہ اور چوڑا ہوگیا اور بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اُٹھیں۔

اس نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا کہ "کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ ان بھوتوں کو پکڑے۔ ارد گرد کے تمام گاؤں تھر تھر کانپتے تھے، کوئی کہتا تھا بھوت ہیں۔ کوئی کہتا تھا پریت ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ انگریزوں نے ایسے بم بنائے ہیں جو رات بھر خود پہرہ دیتے رہتے ہیں اور دشمن کو پہچان کر اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ بات ہی ایسی تھی۔ اس سے پہلے چیٹ گاؤں کے کسی آدمی نے شعلوں کو چلتے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دل میں کچھ اور ہی آئی۔ میں نے کہا کہ جان رہے یا جائے، میں ضرور پتہ لگاؤں گا کہ یہ شعلے کیا ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟"

چاند اتنی دیر میں کافی اونچا ہوگیا تھا اور اس کی کرنوں کی پھوار ہوا کے جھونکوں کے ساتھ زمین پر گر رہی تھی۔ رات ٹھنڈی ہو چلی تھی۔ دونوں ماہی گیروں نے ایک چلم اور بھری اور باری باری اس کا کش لے کر میری طرف بڑھا دی۔

"میں کئی دن تک منصوبے باندھتا رہا لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ آخر ایک دن جی کڑا کرکے میں تیار ہوگیا۔ میں نے اپنی لنگوٹ کس کر باندھ لی اور ہاتھ میں بلم لے لیا اور رات کے گیارہ بجے سے جا کر راستے میں بیٹھ گیا۔ جہاں سے وہ دونوں شعلے گزرتے تھے۔ میرا دل میرے سینے سے نکل کر میرے کانوں میں آگیا تھا اور اس کی دھڑکن سے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ میں جس پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا، اس کی شاخیں میرے سر پر جھکتی چلی آرہی تھیں اور مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ اب مجھے کچل دیں گی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف گھاس میں دبکے ہوئے کیڑے مکوڑوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں یا کبھی کبھی کتے رونے لگتے تھے یا گیدڑ بولنے لگتے تھے یا پیڑوں پر بیٹھے ہوئے گدھ اپنے پر پھڑپھڑانے لگتے۔ گیارہ بجے، سوا گیارہ بجے۔ ساڑھے گیارہ بجے، پونے بارہ بجے، بس اب بارہ بجنے ہی والے تھے اور میرے ہاتھ پاؤں سنسنا رہے تھے اور خون معلوم

ہمرہ: تمھاری رگوں کو پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔

ٹھیک اس وقت جب شہر کے گھنٹے نے بارہ بجائے تو میں نے دیکھا کہ دُور میرے سامنے زمین سے ایک شعلہ اُٹھا اور میری طرف چلنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے دوسری طرف سے ایک اور شعلہ اُٹھا اور وہ بھی میری طرف بڑھنے لگا۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور تیز ہو گئیں۔ دونوں شعلے میرے قریب آتے جا رہے تھے اور میں آنکھیں پھاڑے ہوئے اپنے سامنے سے آتے ہوئے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں اس کی چمک بہت تیز تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ شعلہ زمین پر نہیں چل رہا ہے بلکہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ہوا میں معلق شعلہ میرے قریب آ گیا۔ میرا بدن سُن ہو گیا۔ زبان منہ میں اینٹھ گئی۔ جسم کو چھوا تو وہ کسی مُردے کا معلوم ہوا۔ میرے پیر زمین نے پکڑ لیے تھے اور اب مجھ میں اُٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں نے عمر میں پہلی بار یہ محسوس کیا کہ میں بزدل ہوں۔ مگر اب کیا ہوتا۔ موت میرے سر پر آ گئی تھی اور وہ شعلہ مجھ سے دو تین گز کے فاصلے پر تھا اور میں اس کے راستے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک میرے سارے جسم میں ایک آگ سی لگ گئی۔ خون جو رگوں میں جم گیا تھا پھر تیزی سے دوڑنے لگا اور کسی نے مجھے زمین سے اوپر اُچھال دیا اور میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کون ہے!"

نوجوان ماہی گیر چُپ ہو گیا اور بوڑھا ماہی گیر اپنی پھٹی ہوئی قمیص پر ایک پھٹی صدری پہننے لگا۔ رات کی خنکی بڑھ رہی تھی۔ ہم شاید سمندر کے قریب پہنچ رہے تھے کیونکہ بوڑھا ماہی گیر کشتی میں لیٹے ہوئے چپوؤں کو ادھر اُدھر لگا رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے بھی بھیگے ہوئے تھے اور ان میں ہلکے سے نمک کا ذائقہ تھا۔

میں نے حیرت   اور شوق سے پوچھا "پھر کیا ہوا؟"

نوجوان ماہی گیر نے اپنی چلم سے دو تین لمبے لمبے کش اور لیے اور پھر دریا میں چلم اُلٹ دی۔

"ہاں تو میرے منہ سے بے ساختہ نکلا کون ہے؟ اسی کے ساتھ فضا میں ایک چیخ بلند ہوئی اور زمین پر بہت سارے انگارے بکھر گئے۔ میرے سامنے ایک ننگ دھڑنگ عورت کھڑی ہوئی تھی جس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔"

"عورت؟" میں نے پوچھا، جیسے مجھے یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں عورت ۔۔۔۔ جوان عورت، ایسی ہی کوئی بیس برس کی اور سر سے پاؤں تک ننگی۔ میں نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔ اس نے اپنے کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہیں کی بلکہ میرے کندھے پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگی اور میرا سینہ اس کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ کوئی دس گز کے فاصلے پر انگاروں کا ایک ڈھیر ادھر پڑا تھا اور اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی بھاگتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا "تو کون ہے   اور سسکیوں کے سوا کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے پھر پوچھا، تو کون ہے۔ تو کون ہے۔ لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ آخر میں نے اس کا چہرا اپنے کندھے سے اٹھایا اور اسے غور سے دیکھا۔ ارے یہ تو چھرو تھی، عبداللہ چاچا کی بیٹی۔ میں نے کہا چھرو تجھے کیا ہو گیا ہے، یہ رو کیوں رہی ہے۔ منہ سے بولتی کیوں نہیں۔ میں بھلا تیرا کچھ بگاڑوں گا۔ میں گینش ہوں، گینش مچھیرا۔"

"ہاں!" اس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

"مجھے بڑی شرم آ رہی تھی کہ ایک ننگی عورت میری گود میں ہے۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن آنکھیں بند

[illegible] ستاروں کی روشنی میں میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بڑی خوبصورت تھی جیسے کوئی [illegible]
وہ اپنے گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی۔ عمر [illegible] کی ہو چکی تھی لیکن اب تک بیاہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے باپ [illegible] بیاہ کرنے کے لئے روپیہ تھا ہی نہیں۔ گاؤں کے تمام [illegible] رشتہ [illegible] تھی اور جب [illegible] نظر اٹھا کر دیکھ [illegible] ذرا سا مسکرا دیتی تھی، اس کا دل کسی [illegible] ۔ میں نے بھی اسے کئی بار [illegible] تھا اور [illegible] تھا کاش وہ مچھیری ہوتی یا میں مسلمان ہوتا میں اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ [illegible] میں آج رات کو بارہ بجے گاؤں کی یہ سب سے زیادہ خوبصورت لڑکی [illegible] میری گود میں تھی۔ چاروں طرف سے سڑتی ہوئی لاشوں کی بُو آ رہی تھی۔ [illegible] بھونکتے رو رہے تھے اور گیدڑ بول رہے تھے اور چھرو میرے سینے [illegible]

"میں چھرو کو لے کر کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا [illegible] اس کے سارے آنسو بہہ جائیں گے تب بات کروں گا۔"

بوڑھے ماہی گیر نے آواز دی۔ "سمندر آ گیا۔ چپو سنبھالو۔" گنیش [illegible] اس کا باپ آگے بیٹھ گیا [illegible] چلنے لگے۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دریا کی [illegible] غائب ہو چکی تھی اور اب ہمارے چاروں طرف پانی ہی [illegible] تھا۔ سمندر پر ایک غنودگی طاری تھی۔ لہریں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے [illegible] ہلکے تھے۔ ہماری [illegible] پورب کی طرف مڑ گئی تھی اور چاند ہمارے سر پر چمک رہا تھا۔ ایک خوب صورت چہرے کی طرح جو مکان کی سب [illegible] اونچی منزل کی کھڑکی سے جھانک رہا ہو اور راہ گیروں پر اپنے حسن کی بارش کر رہا ہو۔ دونوں ماہی گیر بڑی پھرتی اور صفائی سے چپو چلا رہے تھے۔ ان کے جسم ایک ساتھ آگے جھکتے تھے اور پھر سیدھے ہو جاتے تھے۔ سیدھے ہوتے وقت ان کے کندھے بلند ہوتے تھے اور سینے تن جاتے تھے۔ چپو بھی ان کے ہاتھ معلوم ہوتے تھے جو سمندر تک پھیلے ہوئے تھے اور موجوں کو اس طرح کاٹ رہے تھے، جیسے ہنسا دھان کے پکے کھیتوں کو کاٹتا ہے۔ ان کے بازوؤں کی جنبش [illegible] ایک خاموش ہم آہنگی اور ترنم تھا جو سمندر کی موجوں کے ترنم سے مل گیا تھا

وہ دونوں بڑی دیر تک کشتی کھیلتے رہے۔ یہاں تک کہ چاند پچھم کی طرف ڈھل گیا اور [illegible] سمندر کی سطح کے قریب لرزنے لگی۔ باپ اور بیٹا دونوں تھک کر چور ہو گئے اور ستانے کے لئے انھوں نے پھر چپو نکال کر کشتی میں لٹا دیئے۔ گنیش نے اپنی ہتھیلیاں ملیں بوڑھے ماہی گیر نے پھر چلم بھری اور کشتی کی [illegible] دیوار سے سہارا لے کر لیٹ گیا۔ بادبان میں بھری ہوئی ہوا کشتی کو آہستہ آہستہ چلا رہی تھی۔

میں نے گنیش کو آواز دی۔ وہ مسکرانے لگا۔ "تم چھرو کے بارے میں سوچ رہے ہو گے؟"

"ہاں!"

"میرے دل میں بھی چھرو ہی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کا نام گل چہر تھا اور وہ ایک بہت غریب کسان کی لڑکی تھی۔ سب لوگ اسے چھرو کہتے تھے۔ قحط میں اس کے ماں باپ، بھائی بہن سب مر گئے۔ وہ اکیلی رہ گئی۔ اس زمانے میں تو بھیک بھی نہیں ملتی تھی۔ فاقے کرنے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا لیکن چھرو خوب

عورت تھی اور اس کی ایک سپاہی سے آشنائی ہو گئی۔ کوئی پنجابی سپاہی تھا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ ملنے کی یہ انوکھی ترکیب نکالی کہ رات کے بارہ بجے دونوں ننگے ہو جاتے تھے اور سروں پر آگ کی تھالی بھر کر رکھ لیتے تھے اور اس گاؤں میں چلے جاتے تھے جہاں کسانوں کی لاشیں سڑ رہی تھیں۔"

"لیکن وہ اس طرح کیوں ملتے تھے؟"

"میں نے بھی چھرو سے یہی سوال کیا کہ تو نے یہ کیا تماشہ لیا ہے۔ رات کے بارہ بجے ننگی ہو کر چڑیلوں کی طرح کیوں نکلتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ لوگ سچ مچ مجھے چڑیل اور میرے سپاہی کو بھوت سمجھیں! میں نے کہا تو اس کے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتی تو اس نے بتایا کہ وہ ایک بار اپنے سپاہی کے ساتھ کیمپ میں گئی تھی تو فوجی افسروں نے اسے دیکھ لیا اور سپاہی کو سزا دی۔ پھر فوجی ٹھیکیداروں نے اس کے پاس آدمی بھیجے کہ چل تجھے بڑے افسروں کے پاس لے چلیں گے لیکن وہ بڑے افسروں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی وہ کوئی بیسوا تھوڑی تھی۔ اسے سچ مچ اپنے سپاہی سے محبت تھی۔ اس لئے رات کے بارہ بجے جب تمام گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں میں چھپ جاتے تھے تو وہ اپنے سر پر آگ سے بھری ہوئی تھال رکھ کر نکلتی تھی اور اپنے سپاہی سے مل کر واپس چلی جاتی تھی۔ سپاہی اس کو کھانے اور رہنے کا خرچ دیتا تھا۔ جب میں نے یہ سنا ——— تو مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میں نے اس سے معافی مانگی لیکن اس نے کہا کہ "اب میں اپنے سپاہی سے نفرت کرنے لگی ہوں"۔ میں نے پوچھا کیوں؟ تو بولی کہ "وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ڈرپوک کہیں کا۔ وہ تو کہو کہ تم تھے اور تم مجھے جانتے ہو کوئی اور ہوتا تو کیا ہوتا اور تم نے بھی مجھے ننگا دیکھا ہے۔ بتاؤ تمہیں میرا جسم دیکھنے کا کیا حق ہے؟ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں۔ تمہاری معشوقہ نہیں ہوں تم نے میرے جسم پر نگاہیں کیسے ڈالیں"۔ یہ کہہ کر چھرو مجھ سے لڑنے لگی۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور اس نے اپنے خوب صورت بالوں سے اپنا سینہ چھپا لیا تھا۔ میں نے کہا چلو میں تم کو گھر پہنچا آؤں لیکن اس نے انکار کر دیا۔ کیا سمجھتے ہو؟ میں ڈرتی ہوں۔ میں خود چلی جاؤں گی۔ جہاں میرا دل چاہے گا وہاں جاؤں گی میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ وہ دیر تک کھڑی ہوئی سانس لیتی رہی اور پھر خود ہی بڑی نرمی سے بولی "تم کسی سے کہو گے تو نہیں۔ میں نے وعدہ کیا تو وہ مسکرائی۔ اس سے میری ہمت بڑھی اور میں نے کہا "چھرو میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ مجھ سے بیاہ کرو گی"۔ وہ بہت زور سے ہنسی، قہقہہ مار کر۔ جس کی آواز سن کر گتے بھرر دینے لگے اور گدھ اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔ میں نے کہا "چھرو! میں سچ مچ تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔ آج سے نہیں بلکہ دو برس سے میں تمہارا دیوانہ ہوں"۔

چھرو پھر سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی "تم نے پہلے کیوں نہیں بیاہ کی بات کی، مجھے دو وقت کھانا دے سکو گے۔ میری بڑی بہن دس برس کی بیاہی تھی لیکن اس کے میاں نے اسے ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔ میری ماں نے مرنے سے پہلے اپنے تین برس کے بیٹے کو گھر سے دھکیل دیا۔ ایک مٹھی بھر چاول کے لئے میرا باپ گلا گھونٹنا چاہتا تھا۔ بتاؤ تم مجھ سے بیاہ کر کے مچھلی اور بھات کہاں سے دو گے۔ آج تم نے مجھے ننگا دیکھا ہے تو تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی۔ لیکن اس محبت سے تم چاول نہیں خرید سکو گے۔ چاول۔ چاول۔ دو روپیہ سیر بک رہا ہے دو روپیہ سیر"

...تی ہوئی وہ چلی گئی۔ چہرو چلی گئی اور اس کا خوب صورت جسم اندھیرے میں کھو لیا۔ میرے سامنے زمین پر ستاروں کا جھرمٹ
تھا جو رفتہ رفتہ بجھتے جا رہے تھے، وہ راتوں رات کہیں نکل گئی اور آج تک واپس نہیں آئی۔ اس وقت تک تو چپ بیٹھے
رہے ہیں۔ میں اپنے دل میں چہرو کی یاد لئے بیٹھا ہوں۔ جب بہت اداس ہوتا ہوں تو کشتی لے کر دریا میں نکل جاتا
ہوں۔ جسمانی محنت سے دل کا درد دور ہو جاتا ہے۔"

گینش تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر خاموشی سے اٹھ کر پتو چلانے لگا۔ ...ا ... جاب ... بز
... با تھا اور سمندر کی موجیں سسک رہی تھیں۔

میں بھی لیٹے لیٹے سو گیا۔ گینش رات بھر اکیلا چپو چلاتا رہا۔ ... صبح ... آنکھ کھلی تو ... ا
... موجیں ناچ ناچ کر گیت گا رہی تھیں۔ ہمارے پیچھے سبز رنگ کا زمردیں سمندر تھا۔ سامنے سنہرے رنگ کا
... کے کنارے کوکس بازار کا دل کش ساحل چمک رہا تھا ... سامنے ... جیسے
... سے نہا کر نکلے ہوں اور دھوپ میں اپنے بال سکھا رہے ہوں۔ ... تیز تیز چپو چلا رہے تھے اور
... کوکس بازار کے نقشے سے دریا کے دہانے میں ... ہو رہی تھی۔

اب ہم پتلے سے دریا کے اندر تھے اور ہمارے دونوں طرف ... سنہرے ... کا ساحل
تھا۔ ایک طرف ہزاروں فوجی موٹریں اور توپیں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف ... پر سینکڑوں جہاز بڑی بڑی ...
کی طرح اپنے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ کئی جہاز ... منڈلا رہے تھے۔ چار ... توپیں اپنے دہانے آسمان کی طرف
... ہوئے جاپانی جہازوں کا انتظار کر رہی تھیں اور بہت سے سپاہی، افسر اور مزدور ریت پر چل پھر رہے تھے۔
بیچ دریا میں لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ جس کے پاس کئی کشتیاں اور سمپانیں تیر رہی تھیں۔ ہماری کشتی بھی پل سے
... لگ کر کھڑی ہو گئی۔

یکایک گینش کی زبان سے نکلا۔ "چہرو"۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ پل پر ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے ... مخمل کی پتلون
اور سبز مخمل کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے کٹے ہوئے بال سمندر سے آنیوالی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ... تنی ہوئی تھیں
اور آنکھوں میں سورج کی کرنوں کی سی تیزی تھی۔ میں نے پھر نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے رخسار ... پاؤڈر
اور رنگ سے گلابی ہو رہے تھے اور ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ایک بڑی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ کی کلائی پر
گھڑی بندھی تھی اور داہنے میں ایک فوجی بید تھا۔

اس نے بید سے میری طرف اشارہ کر کے کہا "بھدر لوگ"، اور اس کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک ناچ اٹھی۔

بوڑھے ملاح نے جلدی سے کہا "پرمٹ دکھاؤ"۔

میں نے جیب سے پرمٹ نکالا اور کشتی میں کھڑے ہو کر چہرو کی طرف بڑھا دیا لیکن اس نے پرمٹ کی
طرف دیکھا بھی نہیں اور مجھ سے کہا "کشتی سے نیچے اترو"۔

میں نے پل پر چڑھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے اپنے بید سے ایک ٹھوکا دے کر کہا۔ "ادھر

مت چڑھو۔ کشتی سے نیچے اترو۔"

لیکن نیچے سیاہ رنگ کی کیچڑ تھی۔ میں حیران تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔

گنیش نے کہا "چھرو تو تمہی بدل گئی ہے۔ دیکھتی نہیں نیچے کیچڑ ہے۔"

"دیکھ رہی ہوں۔" چھرو نے گنیش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

"اسی لئے تو کہہ رہی ہوں کہ اُسے نیچے اتارو۔ یہ بھدر لوگ[1] ہے اور بھدر لوگ کو پُل پر چڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اسے کیچڑ میں چلاؤ تاکہ اس کے سفید کپڑے لت پت ہو جائیں۔ جلدی کرو۔ دوسری کشتیاں آ رہی ہیں۔"

چھرو کی آواز میں ایک قسم کا وقار تھا۔ آنکھوں میں وہی وحشی چمک، گنیش اور بوڑھے ملّاح کے چہروں پر پریشانی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا لمبی فوجی کشتیاں آ رہی تھیں۔

میں کیچڑ میں چلنے کو تیار ہو گیا اور اپنے جوتے اتارنے لگا۔ گنیش نے اپنے مضبوط بازوؤں کی جنبش سے میرا سارا سامان اٹھا کر ساحل پر پھینک دیا۔ بوڑھے ملّاح نے کہا "چھرو تو بڑی افسر ہو گئی ہے اور ہم سب کو بھول گئی ہے۔" پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "یہ بھدر لوگ نہیں ہیں۔ بمبئی سے آئے ہیں۔ غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔"

آخری جملہ سن کر چھرو کو غصہ آ گیا۔ اس کے ہونٹ تلخی سے اینٹھ گئے اور اس نے اپنی وحشی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا پھر بولی "سب بھدر لوک ایک سے ہوتے ہیں اور غریبوں کی سیوا کرتے ہیں۔ چاچا میں تمہیں بھولی نہیں ہوں اپنی ماں کی کوکھ کو کبھی نہیں بھولی ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں کون ہوں۔ تم مچھیرے ہو اور میں کسان کی لڑکی ہوں۔ میں ہر بھدر لوک کو اس کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ تم نے اسے سمندر میں ڈبو کیوں نہیں دیا۔ بھدر لوک کہیں کا۔"

میں اتنی دیر میں کیچڑ میں اتر چکا تھا اور جیب سے روپے نکال کر کشتی کا کرایہ ادا کر رہا تھا۔ میرے پیر گھٹنوں گھٹنوں تک سیاہ کیچڑ میں دھنس گئے تھے۔ پُل پر کھڑی ہوئی چھرو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور گنیش اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جب میں کیچڑ سے گزر کر ساحل پر پہنچا تو چھرو کا قہقہہ بلند ہوا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر گنیش کو پُل کے اوپر چڑھا لیا اور اس سے ہنس ہنس کر آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگی۔

گنیش نے پکار کر باپ سے کہا "بابا تم جاؤ۔ میں یہیں رہوں گا۔"

بوڑھے ملّاح نے ملامت بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور بولا "پاگل مت بن بیٹا۔ چھرو تیرے کام کی نہیں رہ گئی ہے۔"

چھرو نے مسکرا کر گنیش کے رخسارے پر اپنی ہتھیلی سے ایک ہلکی سی تھپکی دی اور اسے سہارا دے کر پُل سے نیچے کشتی میں اتارنے لگی۔ گنیش نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کود کر کشتی میں بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چپو اٹھا لئے اور انہیں تیز تیز چلاتا ہوا کشتی کو نکال لے گیا۔ چھرو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

---

[1] : بنگالی زبان میں درمیانی طبقے کے سفید پوش آدمی کو بھدر لوگ کہتے ہیں۔

میں ایک میلے فٹ پاتھ سے اپنے پیروں کی کیچڑ پونچھ رہا تھا کہ چھبو کہیں سے آ نکلی، میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور پوچھنے لگی

"یہاں سے آئے ہو؟ بمبئی سے؟"

"جہنم سے۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"میں کبھی کبھی بھدر لوک کو ہیٹ بھی دیتی ہوں اپنے پاس سے" چھبو کی آنکھوں میں شرارت تھی

میں نے گردن اٹھا کر اس عجیب و غریب لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ... بلا کا جادو تھا۔ میلی نفرت اور شرارت سے پڑی ہوئی ہلکی ہلکی شکنیں۔ اس نے خوبصورت ... چہرے ... معصومیت ... تار کا اور ذکر نہیں تھی۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کنیش کی کہانی نے میرا شوق ... بڑھا دیا تھا کہ یہ ... بڑے خطرناک تھے

مجھے زبان کھولنے کی اجازت ہی نہیں دیتے تھے۔

"مجھے گالی کیوں دیتی ہو۔ میں بھدر لوک نہیں ہوں" میں نے جھلا کر کہا

"اچھا تم بھدر لوک کو گالی سمجھتے ہو؟" وہ ہنسی "مگر تمہارے کپڑے ... دیتے ہیں"

"تمہارے کپڑے؟"

"یہ تو میں نے بھدر لوگوں کو جلانے کے لئے پہنے ہیں۔ مجھے اچھے ... لگتے ہیں"

"اور یہ چہرے پر رنگ جو تم نے پوت رکھا ہے؟"

"روزی کمانے کے لئے"

میں اس کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یہ بے حیائی تھی، بے باکی تھی یا انتقام کا جذبہ؟ میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا

"اچھا تو تم بھدر لوک نہیں ہو اور مزدوروں کی سیوا کرتے ہو؟" اس نے بڑے طنز سے پوچھا "... بازار کرتے ہو یا لڑکیاں بیچتے ہو؟"

اس کے ماتھے پر شکنیں اور گہری ہو گئیں اور تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ہونٹوں پر ایک تلخ سی ہنسی آئی اور وہ مجھے نفرت اور حقارت سے دیکھتی ہوئی چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ یہ کیسی لڑکی ہے جس میں کسانوں کی بو باس تک باقی نہیں رہ گئی ہے۔

یہ بغاوت اور انتقام نہیں ہے صرف نراج اور آوارگی ہے۔ یہ پارے سے بنی ہوئی لڑکی جس کی رگوں میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ خود اپنی ذات سے انتقام لے رہی ہے۔ اپنی فطرت اور اپنی نسوانیت سے بغاوت کر رہی ہے جیسے سمندر کوئی بے تاب موج طوفان کی آغوش سے نکل کر ساحل پر آ پڑی ہو اور اپنے تھپیڑے سے خشک ریت کو سمندر بنانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ننھے ننھے خاک کے ذرے اسے اپنا رزق سمجھ کر ایک ایک گھونٹ کر کے پی جائیں گے۔

کوکس بازار میں ہر ایک کی زبان پر چھبو مانجھی کا نام تھا۔ چھبو چوبیس برس کی کسان کی لڑکی تھی جس نے مزدوری کرتے کرتے مزدوروں کی سرداری حاصل کر لی تھی اور اب مانجھی کہلاتی تھی، جس نے تھابی[1] اور بازو اور کچھا ترک کر کے انگریزی لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ جو اپنے حسن کی وجہ سے فوجی افسروں کے منہ چڑھی ہوئی تھی، جو کسی سفید پوش آدمی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، جو ہر ایک کی بے عزتی کر دیتی تھی، جو درجنوں شریف آدمیوں کو کیچڑ میں چلا چکی تھی۔ عورتیں خاص طور سے اس سے نفرت کرتی تھیں۔

---

[1] تھابی: رنگین دھوتی کو کہتے ہیں جو چٹاگانگ کی مسلمان عورتیں باندھتی ہیں۔ بازو: چولی یا انگیا کو کہتے ہیں۔ اور کچھا دوپٹے کو۔

لیکن مرد بجھو بلبلاتے ہوئے لہجے میں اس کی مذمت کرتے تھے۔

دوسرے دن میں نے اسے ایک جیپ میں گزرتے دیکھا۔ اس کی گود میں پھولوں کا ایک بڑا سا گٹھا رکھا تھا۔

تیسرے دن وہ مجھے ایک چرنگ[1] کے پاس کھڑی ہوئی مل گئی اور مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔

میں نے کہا۔ "کیسی ہو چھرو۔"

"کیسی ہوں؟" اس کی آنکھیں پھر چھلک اٹھیں۔ "اچھا یہ بتاؤ، میں پتلون اور جیکٹ پہن کر کیسی لگتی ہوں۔"

"بالکل انگلستان کی شہزادی معلوم ہوتی ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کے دونوں رخساروں میں دو چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ گئے اور خوبصورت سفید دانتوں کی قطار چمکنے لگی۔ اتنے میں ایک فوجی ٹرک آیا۔ چھرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اچک کر اس میں بیٹھ گئی۔ جب ٹرک چلا تو وہ کھڑی تھی اور اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ گاڑی کے پہیوں سے اڑنے والی سرخ دھول نے جو سپاری کے درختوں تک بلند ہو گئی تھی اسے ڈھانپ لیا۔

شام کو سارے کوکس بازار میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ چھرو کو یہاں سے نکال دو۔ اس نے رامو روڈ پر ٹرک سے اتر کر کسی شریف آدمی کو مارتے مارتے لہولہان کر دیا تھا۔ ساری بستی اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ لیکن فوج کا خوف انہیں زبانی احتجاج سے آگے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔

رات کو یہ خبر آئی کہ فوجی افسروں نے اسے سزا دی ہے اور اب وہ ساحل کے علاقے سے باہر بستی میں نہیں نکلنے پائے گی۔ لوگ اطمینان کا سانس لے کر سو گئے اور پھر چھرو کے افسانے مزے لے لے کر بیان کرنے لگے۔

صبح ساحل پر چھرو مزدوروں کی ایک ٹولی کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ اس وقت سمندر میں پانی چڑھ رہا تھا اور لہریں دوڑ دوڑ کر ساحل کا منہ چوم رہی تھیں۔ بڑی بڑی سو سو گز لمبی لہریں روئی کے گالوں کی طرح بہتی ہوئی اور اپنی چاندی اچھالتی ہوئی آتی تھیں اور ریت پر جھاگ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ چھرو ایک نیلے رنگ کا چست لباس پہنے ہوئے تھی اور ابھی ابھی سمندر سے نہا کر نکلی تھی۔ اس کے دونوں بازو، آدھی رانیں اور پنڈلیاں ننگی تھیں، جن پر سمندر کے نمک کا باریک برادہ جما ہوا تھا۔ بھیگے ہوئے بال الجھے ہوئے تھے اور چھرو کا گندمی رنگ سمندر کے نمکین پانی سے دھل کر نکھر آیا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کے سڈول جسم کی دلکشی کا اندازہ کیا۔

وہ مجھے دیکھ کر ایک بار تن گئی اور اس کا سینہ سمندر کی کسی لہر کی طرح بلند ہو گیا۔ "کیا تم بھی مزدوری چاہتے ہو؟ میں نے کل شام تمہاری ہی طرح کے ایک بھدرلوک کو پیٹا تھا جو مجھے سڑک کے کنارے کھڑا ہوا گھور رہا تھا۔ کیا تمہاری بھی شامت آئی ہے؟"

"تمہیں بھدرلوک سے اتنی نفرت کیوں ہے؟"

"تم سے مطلب؟ تم ہوتے کون ہو؟"

"میں کیسے بتاؤں جب تم سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی ہو؟"

میں حیران رہ گیا۔ اس نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوڑتی ہوئی بالکل ساحل کے کنارے پہنچ گئی جہاں سمندر کی موجیں

---

[1] چرنگ:۔ لکڑی کا بنا ہوا ایک طرح کا جھونپڑا جو پبلک کے استعمال کے لئے سڑکوں کے کنارے بنا دیا جاتا ہے۔ لوگ اس میں بیٹھ کر سستاتے بھی ہیں اور بے گھر لوگ اکثر رات کو اس میں سوتے ہیں۔

ریت کا منہ دھو رہی تھیں۔ وہ بھیگی ہوئی تر ریت پر بیٹھ گئی۔ اپنے پیر سمندر کی طرف پھیلا دیئے اور کہنیاں نرم گیلی ریت پر ٹیک دیں۔

"مجھے ایک بات بتاؤ گے؟" اس نے ایسی محبت سے پوچھا جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔

"پوچھو!"

"گنیش نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"ہاں! وہ تم سے محبت کرتا ہے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا دوڑ گیا اور آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی اور لطافت آگئی جیسے کسی نے چاند کے نور سے اس کی وحشت اور شوخی کو بدل دیا ہو اور وہ اچانک حسین ہو گئی۔ سمندر کی ہوا اس کے بالوں سے کھیل رہی تھی اور ہوا کی نیم مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے دونوں ہاتھوں سے ریت کے گھروندے بناتی رہی اور بگاڑتی رہی۔ "مجھے اس ریت سے بڑی محبت ہے۔ میں اسی سے پیدا ہوئی ہوں۔ گنیش بھی اسی سے پیدا ہوا ہے۔ میں اکثر جب ریت کے ڈھیر میں لیٹ جاتی ہوں اور گھنٹوں خواب دیکھتی رہتی ہوں۔ بڑے بڑے دھان کے کھیت کاٹ رہی ہوں اور دھان کی بالیاں سمیٹ سمیٹ کر کھلیان میں جمع کر رہی ہوں۔ میں کٹے ہوئے کھیتوں کی منڈیروں پر گاتی ہوئی گھوم رہی ہوں۔ زمین گا رہی ہے۔ آسمان گا رہا ہے۔ ہوائیں گا رہی ہیں اور دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے۔ جس میں گنیش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے جال میں بڑی بڑی مچھلیاں تڑپ رہی ہیں جنہیں دیکھ کر چھوٹے چھوٹے بچے تالیاں بجا بجا کر ہنس رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں۔

وہ چپ ہو گئی اور ریت کے گھروندے کو اپنی مٹھی میں اٹھا لیا۔

"میں گنیش سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن اس کا باپ موجود تھا۔ بڈھا کھوسٹ۔ کہتا ہے کہ میں گنیش کے قابل نہیں رہ گئی ہوں اور وہ اپنے باپ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ بزدل کہیں کا۔ دیکھو نا مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" اس نے آخری جملہ بچوں کی طرح کہا۔

"مگر تم خود جو اسے چھوڑ کر چلی آئیں۔"

"محبت کرنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے۔ مجھے بزدل آدمیوں سے بڑی نفرت ہے۔ میں ایسے مرد کو پسند کرتی ہوں جو ہنستے ہوئے موت کے منہ میں چلے جائیں۔ دیکھو سمندر میں طوفان آ رہا ہے۔ پانی گرجوں اچھل رہا ہے۔ اگر میں گنیش سے اس وقت کشتی کھینے کے لئے کہوں تو وہ کبھی تیار نہ ہوگا۔ کنارے کھڑا ہوا جال پھینکے گا۔ مچھیرا ہے نا مچھیرا۔ مجھے بھی مچھلی کی طرح پکڑنا چاہتا ہے۔ بتاؤ میں مچھلی تو نہیں ہوں۔ بولو کیا میں مچھلی ہوں!"

"نہیں۔"

"میں مچھلی نہیں ہوں۔ میں عورت ہوں۔ چھرو ہوں۔ گل چھرو ہے میرا نام۔ مجھے کوئی مچھلی کی طرح نہیں پکڑ سکتا۔"

ایک مزدور دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا "چھرو ماجھی۔ چھرو ماجھی۔ تمہیں صاحب نے بلایا ہے۔"

"کہہ دو نہیں آتی۔"

"وہ بوتھی ڈانگ جا رہے ہیں۔ موٹر میں بیٹھے ہیں۔"

"بس کہدو ۔ نہیں آتی ۔ میں بوتھی ڈانگ نہیں جاؤں گی ۔ میں سمندر میں جارہی ہوں ۔"

مزدور چلا گیا ۔ میں نے پوچھا "کس نے بلایا ہے ؟"

"کوئی نہیں وہ لال منہ کا بندر ہے ۔ اس کا تبادلہ ہوگیا ہے اور مجھے بوتھی ڈانگ لے جانا چاہتا ہے ۔ میں نہیں جاتی ۔ اس نے جیسے ہزاروں یہاں ملیں گے ۔ کوئی میں ڈرتی تھوڑی ہوں ۔ کسی چیز سے نہیں ڈرتی ۔ آؤ طوفان میں کشتی چلائیں ۔ بڑا مزہ آئے گا ۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ کشتی الٹ جائے گی لیکن اس ڈر سے چپ رہا کہ وہ مجھے بزدل سمجھے گی ۔

اس نے ایک نازک سی سمپان کا انتخاب کیا اور پل پر چڑھ کر اس میں کود گئی ۔

میں نے پوچھا "میں بھدرلوک ہوں ۔ کیا کیچڑ میں چل کر آؤں ۔"

"پل سے ہوکر آجاؤ ۔ تم بھدرلوک نہیں ہو ۔ جب تم میرے کہنے سے بغیر احتجاج کئے کیچڑ میں چلنے کو تیار ہوگئے تب ہی سمجھ گئی تھی کہ تم بھدرلوک نہیں ہو ۔"

اس نے چپو سنبھال لئے اور سمپان کھینے لگی ۔ اس کے ہاتھ بڑی مشتاقی سے چل رہے تھے ۔ جب سمندر کا پانی چڑھ رہا ہو اس وقت کشتی کھینا مذاق نہیں ہے ۔ میرا دل کانپ رہا تھا کہ کہیں سمپان الٹ نہ جائے لیکن چھرو بڑے اطمینان سے چپو چلا رہی تھی ۔

"تمہیں چپو چلانا آتا ہے ؟" اس نے پوچھا ۔

"ہاں بمبئی میں سمندر میں کشتی کھے چکا ہوں ۔"

"اور تیرنا بھی آتا ہے ؟"

"ہاں کچھ یوں ہی سا ۔"

"پھر ڈر کی کوئی بات نہیں ۔" یہ کہہ کر وہ چپوؤں کو اور زیادہ تیز چلانے لگی ۔

کھلا ہوا سمندر جوش کھائے پانی کی طرح اُبل رہا تھا اور ہماری سمپان غصے میں بھری ہوئی موجوں پر ایک سوکھے پتے کی طرح لرز رہی تھی ۔ موجوں کے تھپیڑے بڑے سخت تھے اور سمپان بری طرح ڈگمگانے لگی تھی ۔ ایک موج کشتی کے اوپر سے گزر کر ہمیں بھگو گئی ۔

میں نے کہا "چپو مجھے دیدو ۔"

"تم مجھ سے اچھے چپو نہیں چلا سکتے ۔"

"تم سمپان واپس لے چلو ۔ الٹ جائیگی ۔"

"تم ڈر رہے ہو ۔"

میں نے لپک کر چپو پکڑ لئے ۔ چھرو نے انہیں میرے ہاتھوں سے چھڑانے کی کوشش کی ۔ ایک بار سمپان پھرکی کی طرح ناچ اٹھی اور ایک بڑی سی غضبناک موج نے آکر اسے دس بارہ فٹ اوپر اٹھا لیا اور ایک زبردست جھٹکے سے ساحل پر پھینک دیا ۔ ایک دوسری موج ہمارے اوپر سے گزر گئی اور سمندر غرانے لگا ۔ مجھے نہیں معلوم کہ چھرو کہاں گری اور میں

…یاں گرا۔ جب موج ہمارے اوپر سے گزر چکی تو میں ریت پر پڑا ہوا تھا اور چھیرو مجھ سے کئی گز دور کھڑی ہوئی تھی … تھی۔ وجود کے تھپیڑوں میں تھی۔ ایک پیر ریت میں دھنسا ہوا تھا اور دوسرا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے ہوئے فریاد کر …ہا۔

اس نے پکار کر پوچھا۔ "چوٹ تو نہیں لگی۔"

"نہیں ریت بہت نرم ہے۔" میں نے جواب دیا حالانکہ میرے گھٹنے اور کہنیاں چھل گئی تھیں۔

چھیرو پھر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی "میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی اس دنیا کو اسی طرح اٹھا کر پھینک دے۔ جب … میں طوفان آتا ہے تو میں خوشی سے دیوانی ہو جاتی ہوں اور سوچتی ہوں یہ طوفان بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ آسمان … زمین سب بیچ میں صرف سمندر ہی سمندر ہوگا۔ اس کی نیلی موجوں میں ہم تم، گنیش، چاند، سورج، ستارے سب ڈوب جائیں گے۔"

میں نے کہا "تم پگلی ہو چھیرو۔"

"ہاں میں سچ مچ پگلی ہوں۔ تم بھی پگلے ہو جو میرے پاس بیٹھے ہو۔ گنیش بھی پگلا ہے۔ جو مجھ سے محبت کرتا ہے اور وہ لاکھوں کسان اور مچھیرے سب پگلے تھے جو چار دانہ چاول کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گئے۔ صرف بھدر لوک پگلا نہیں ہے باقی سب پگلے ہیں۔"

"تمہیں بھدر لوک سے اتنی نفرت کیوں ہے۔" میں نے موقع پا کر پھر پوچھا۔

چھیرو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اس کی نظروں کی وحشی چمک اس کی آنکھوں میں واپس آگئی۔

"جانتے ہو، میں کیا کرتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔ "میں اپنا جسم بیچتی ہوں۔ اجنبی آدمی تم پہلے شخص ہو جس سے میں اس طرح باتیں کر رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت خوبصورت ہوں۔ مجھے بھی اپنی صورت اور اپنا جسم بہت اچھا لگتا ہے اور میں اسے بیچتی ہوں۔ ایک رات کے تیس روپے لیتی ہوں اور فوجی افسر مجھے اس سے زیادہ روپے دیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ نہیں میں تو کسان کی بیٹی ہوں، دھرتی کی طرح پاک۔ میں نے یہ پیشہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن جب میرے ماں باپ مر گئے اور سارا گاؤں اجڑ گیا اور میں ہزاروں لاشوں کے بیچ میں اکیلی رہ گئی اور لاشوں کے نوچ نوچ کر کھانے والے کتے مجھے دیکھ کر اپنے دانت پیستے تھے تو گیارہ دن کے فاقوں کے بعد میں لڑکھڑاتی ہوئی اپنے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئی۔ مٹھی بھر چاول بھیک مانگنے کے لئے۔ وہ چاول کا دھان میں نے پچھلی فصل میں اپنے ہاتھوں سے کاٹا تھا۔ زمیندار کے گھر میں چاول بھرا ہوا تھا۔ لاشوں کی طرح بوریاں گنجی ہوئی تھیں۔ وہ اس کا بیوپار کرتا تھا۔ کالے بازار کا بیوپار، جہاں وہ ہمارے کھیتوں کا پیدا کیا ہوا چاول ساٹھ روپے من بیچ رہا تھا۔ میں نے گیارہ دن کی بھوکی تھی اور دنیا میں کوئی سہارا نہیں تھا۔ کئی بار میں نے سڑی ہوئی لاشوں کا گوشت کھانے کا ارادہ کیا تھا لیکن گھن آگئی۔ میں نے زمیندار سے مٹھی بھر چاول مانگے۔ اس نے پوچھا کیا قیمت دو گی مگر میرے پاس کیا تھا۔ میں نے کہا خیرات دیدو۔ اس نے کہا میں کئی خیراتی اسکول اور یتیم خانے چلا رہا ہوں۔ چٹ گاؤں میں میرا خیراتی لنگر خانہ چل رہا ہے۔ آخر کہاں تک خیرات دوں۔ میں نے پوچھا پھر میں کیا کروں۔ چٹ گاؤں تک جانے کی سکت نہیں ہے۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا

کہا "تمہارے پاس جوانی ہے، خوبصورت چہرہ ہے، بھرا ہوا جسم ہے۔ اسے کہیں جاکر بیچ آؤ" لیکن میرا جسم چاولوں کی بوری تو نہیں تھا جو میں اسے بیچ دیتی۔ میں وہاں سے بھاگ آئی۔ لیکن دو دن کے بعد جب میں تین دن کی بھوکی تھی، میں اپنا جسم لاش کی طرح گھسیٹ کر زمیندار کے پاس لے گئی۔ میں نے کہا میں اپنا جسم مٹھی بھر چاول میں بیچنے آئی ہوں، اسے خرید لوگے؟ وہ خفا ہو گیا بھدر لوک بڑے عزت والے ہوتے ہیں۔ اس نے کہا میں کوئی دلال ہوں۔ میں نے کہا میں اپنا جسم کہاں بیچنے جاؤں۔ مجھ سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔ زمیندار نے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کا بیٹا جو مجھے گھسیٹ کر لایا تھا، سیر بھر چاول میں میرا جسم لے گیا۔ تب سے میں محسوس کرتی ہوں کہ میرا جسم میرے پاس نہیں ہے۔ میری جوانی نہیں ہے۔ میری خوب صورتی نہیں ہے۔ یہ سب تو سیر بھر کچے چاولوں میں بک چکی ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک سپاہی ملا وہ ڈرپوک تھا۔ پھر گنیش ملا وہ بھی بزدل نکلا۔ اور اب کوکس بازار میں میری حکومت ہے۔ یہاں جتنے آدمی ہیں۔ سب بزدل ہیں۔ یہاں بہت سے بھدر لوک آتے ہیں۔ اپنا بیوپار کرنے کے لئے، فوجی ٹھیکہ لینے کے لئے۔ میں انہیں کیچڑ میں چلاتی ہوں۔ کبھی کبھی کسی کو بیٹے بھی دیتی ہوں۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ الٹ کر میرے ایک تھپڑ مار دے۔ انہیں روپے کی ہوس اور لالچ نے بزدل بنا دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں فوجی افسروں کی منہ چڑھی ہوں اور وہ مجھے تھپڑ مار کر انہیں ناراض نہیں کر سکتے۔ انہیں روپیہ کی ضرورت ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی بہو بیٹیاں لاکر فوجی افسروں کے ہاتھ بیچ جاتے ہیں۔ تم سمندر کے راستے سے واپس مت جانا۔ اراکان روڈ سے ہو کر جانا۔ چٹ گاؤں سے اسّی میل دور ہے لیکن یہاں سے چٹ گاؤں تک تین لاکھ عورتیں ہیں جو میری طرح پیشہ کرتی ہیں اور ان کی کمائی بھدر لوک کھا رہے ہیں۔ تم بھدر لوک نہیں ہو، اس لئے میری بات سمجھ جاؤگے۔ وہ کہتے ہیں، چھرو مانجھی بدمعاش ہے، چھرو مانجھی آوارہ ہے۔ چھرو مانجھی بیسوا ہے لیکن بھدر لوک مجھ سے زیادہ آوارہ ہیں۔ وہ سب بیسوا ہیں، دلال ہیں۔ ان کی عزت، ان کا مذہب، ان کا دیوتا سب کچھ روپیہ ہے۔ اس کے لئے وہ اپنی ماؤں کو بیچ ڈالیں۔ اپنی بیٹیوں کو بیچ ڈالیں۔ ان کی عزت اور شرافت صرف ان کے کپڑوں میں ہے۔ کیا بمبئی میں بھی بھدر لوک ہوتے ہیں"۔

"بھدر لوک ہر جگہ ہوتے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ نہیں ہو سکتا۔ مجھے ان سے بڑی نفرت ہے" وہ بڑبڑائی۔

سورج کی کرنیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔ چھرو مانجھی کے گندمی رنگ چہرے پر پسینے کے موتی چمک رہے تھے۔ سمندر کی موجیں اس کے قدم چوم رہی تھیں اور ہوا کی غیر مرئی انگلیاں اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جیسے کوئی غنودگی کے عالم میں باتیں کر رہا ہو، زیر لب آہستہ آہستہ کہا:

"جب یہاں سے جانا تو گنیش سے کہہ دینا کہ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں اس زندگی سے تنگ آگئی ہوں"۔

(انجمن ترقی پسند مصنفین بمبئی کے جلسے میں پڑھا گیا)
بمبئی ۱۹۴۶ء


اپنی کار کی
جاپانی انفرادیت قائم رکھئے!
ہمیشہ کار میں
FB
آٹوموٹو بیٹری
نصب کیجئے
کیوں؟
اس وجہ سے کہ FB جاپان کی ممتاز آٹوموٹو بیٹری ہے۔ جسے طاقتور اطمینان بخش کارکردگی
کی ضمانت کی بنا پر بیشتر جاپانی کار بنانے والے ترجیح دیتے ہیں۔
ہر قسم کی گاڑیوں کی مختلف ضروریات کے لئے FB بیٹری پاکستان بھر میں دستیاب ہے۔ ملک بھر میں
FB بیٹری کے مالکان کی خدمت کے لئے ہمارے ڈیلروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔
بے شک جاپانی کاریں بہترین ہیں۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی برقرار رکھنے کے لئے ہمیشہ FB بیٹری نصب کیجئے۔
FB آٹوموٹو بیٹری طاقتور، اطمینان بخش کارکردگی۔
بیشتر جاپانی کار بنانے والوں کا انتخاب۔
AS-1-88
ASIATIC

پیغامات — تاثّرات

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

(لکھنؤ)

کاش دوسرے ترقی پسند ادیب اور شاعر ایسی ہی راہوں پر گامزن ہوں جو جعفری نے نکالی بلکہ تراشی ہیں تو میں ان کی تعریف میں بخل نہ کروں بلکہ ان کی ثنا و صفت کے ترانے گاؤں۔

احتشام حسین

(لکھنؤ)

"ایک خواب اور" ایک لطیف اور صحت مند ذہن کی تخلیق ہے۔ اس میں مسرت ہی مسرت، حسن ہی حسن، لطافت ہی لطافت ہے۔ اگر کہیں خواب بھیانک بھی ہیں تو ان کی تعبیر خوش گوار نظر آتی ہے.... سردار جعفری کا یہ مجموعہ فنی اور فکری ریاضی کا ایک نادر کرشمہ ہے۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

(کراچی)

اردو کا دور حاضر علی سردار جعفری کو ترقی پسند شاعر اور اشتراکی دانشور کی حیثیت سے جانتا ہے۔ ان کی شخصیت کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ خوش تقریر ہیں اور بقول خود انھوں نے یہ فن مجتہدوں سے سیکھا ہے۔ نظم میں زور بیان مرثیہ گو سخن وروں سے اور اسے پڑھنے کا انداز مرثیہ خوانوں سے حاصل کیا۔

اس میں شک نہیں کہ علی سردار جعفری دُھن کے پکے ہیں۔ عہد جوانی سے فکری و عملی اعتبار سے اشتراکیت سے جو رشتہ استوار کیا اسے تا ایں دم باقی رکھا۔ اچھے اچھوں نے اسے سنگ گراں سمجھ کر چوما اور چھوڑ دیا، لیکن علی سردار اپنے عہد وفا پر قائم ہیں۔ ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف سبھی کرتے ہیں البتہ ان کی تنقید میں تنقیص کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہے۔ شدت جذبات میں اپنے پرائے میں تمیز نہیں کرتے تاہم ان کے خلوص کا تقاضا ہے کہ اس فروگذاشت کو فراموش کر دیا جائے۔ کارل مارکس نے انسانی معاشرے کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو استحصال کرتا ہے دوسرا وہ جس کا استحصال کیا جاتا ہے۔ فرانسیسی مفکر ادیب کامو (CAMUS) نے اس تقسیم میں ایک تیسرے گروہ کا اضافہ کیا ہے جسے وہ باغی سے تعبیر کرتا ہے، مراد ان لوگوں سے ہے جو ظلم اور بے انصافی کے خلاف جہاد کو زندگی کا مقصد بناتے ہیں۔ علی سردار جعفری کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ماہنامہ افکار نے اپنی زندہ دوستی کی روایت کے اقرار میں علی سردار جعفری کے فکر و فن پر ایک خاص شمارہ ترتیب دیا۔

ممنون حسن خاں[1]

(بھوپال)

بڑی ہی مسرت کی بات ہے کہ آپ کی سرپرستی میں ماہنامہ "افکار" علی سردار جعفری نمبر شائع کر رہا ہے۔ سردار جعفری کا شمار ایسے ادیبوں اور دانشوروں میں ہوتا ہے جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ کاوشِ فکر و قلم کی نذر ہے۔ ان کی کاوشیں قابلِ ستائش ہیں۔ میں مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کی ادب دوستی کی بدولت ماہنامہ "افکار" کو یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ آپ کی یہ کوشش آپ کی خوش مذاقی اور ادب نوازی کی روشن مثال ہے۔

آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ میں بھی علی سردار جعفری کے کلام کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں نہ تو شاعر ہوں، نہ ادیب ہوں، نہ دانشور ہوں۔ بقول حافظ شیرازی:

نہ فقیہم، نہ مدرس، نہ محتسب، نہ فقیہ

میں تو در حقیقت ایک بے نام اور بے نشان سا آدمی ہوں، میرا حال تو یہ ہے کہ اپنی زندگی کے بارے میں یہ شعر پڑھا کرتا ہوں جو میری زندگی پر پوری طرح صادق آتا ہے:

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

جعفری صاحب کی کاوشِ فکر و قلم کا دائرہ تحریر میں ایک شاعر، ادیب یا دانشور ہی لا سکتا ہے۔ میں تو ایک "انبارِ گل" ہوں جو اپنی اس آخری عمر میں بھی آدمی نہیں بن سکا ہے۔ بہرحال چونکہ آپ سید والا گہر ہیں اور میں غلامِ غلامانِ آلِ رسول ہوں اور اس مبارک رشتے سے آپ کے حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے اس لیے سردار جعفری کے کلام کو بہت ہی مختصر طور پر اپنی محدود بساط کے مطابق بیان کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔ اعلیٰ فن اس اظہار کو کہتے ہیں جس کا سرچشمہ روشن زندگی ہو۔ ایک بڑا فن کار اس اظہار کو اپنے پاکیزہ احساس، قلبی سوز و ساز، جستجو، ہمدردی اور آرزو کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ یہ اظہار جتنا شدید ہوگا اتنی ہی شدت سے ایک فن کار کو زندگی کی مسلسل تخلیق کرتا رہنا ہوگا۔ فن میں تخلیق کا جتنا عنصر ہوگا اتنا ہی وہ پائیدار ہوگا۔ علی سردار جعفری ایسے ہی بڑے فن کار ہیں جو اپنی شاعری میں فن کی اس نادرہ حقیقت کو پہچاننے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ادب اور سماج دونوں کی صحت مند ترقی کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے احساس اور ادراک کے ذریعے اپنے اور سماج کے درمیان داخلی اور خارجی رشتہ قائم کیا ہے۔ اپنے کلام کے ذریعے وہ زندگی کو صحت مند، مسرت بخش اور ڈائنامک (DYNAMIC) بنانا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری نئے تجربات، نئی فکر، نئے تخیل اور جدید صحت مند ذہن سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں ایمانی کیفیات بھی ہیں، تاریخی شعور بھی ہے۔ نئی خلوص بھی ہے، حقیقت کی تلخی بھی ہے، ذوقِ جمال بھی ہے۔ ان کے اشعار اس احساس اور ادراک کے حامل ہیں جو شاعر اور قاری

---

[1] صدر نشین آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز۔ بھوپال

کے درمیان داخلی اور خارجی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ ان کا انداز بیان علامتی ہے اور لہجہ پرسوز ہے۔ انھوں نے کلاسکی ادب کی صحت مند روایات کو قائم رکھا ہے۔ ان کے بہت سے اشعار میں فرد اور سوسائٹی تار حریر دورنگ کی طرح لپٹے ہوئے ہیں۔ جعفری نے اپنی شاعری کے ذریعے انقلابی شعور پیدا کیا ہے۔ وہ ایسے ترقی پسند شاعر ہیں جس نے اپنے کلام میں زندگی کے جمالیاتی اور ادبی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور زندگی کے جدید تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرتے ہوئے ترقی پسندی نے توازن کو برقرار رکھا ہے۔ ان کے کلام میں انفرادیت بھی ہے اور اجتماعیت بھی ہے۔ وہ سوسائٹی کی عام سطح سے اوپر اٹھ کر نا۔ یہی کہ بہاؤ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ میری ناچیز رائے میں صحت مند اور متوازن ترقی پسند شاعری ان ہی صفات عالیہ کی حامل ہونا چاہیے۔ سردار جعفری ایک پہلودار شخصیت کے مالک ہیں اور بڑے ہی پیارے آدمی ہیں۔

سردار جعفری معاشرے کی طبقاتی کشمکش اور معاشی ناہمواری سے بہت متاثر ہیں۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے ادب اور سماج دونوں کو جدید صحت مند بنیادوں پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی میں ارتقا اور انسانیت کے خواہاں ہیں۔ وہ ایسی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جہاں نا انصافی نہ ہو، عدم توازن نہ ہو بلکہ محبت ہو، شرافت ہو، حسن ہو، طاقت ہو، صداقت ہو۔

علی سردار جعفری کی کاوش فکر و قلم کو پوری طرح بیان کرنے کے لیے تو ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے جس کو میں اپنی موجودہ کمزور صحت کی وجہ سے تیار نہیں کر سکتا۔ بہت مختصر طور پر یہ عرض ہے کہ "خون کی لکیر"، "نئی دنیا کو سلام"، "ایشیا جاگ اٹھا"، "پتھر کی دیوار"، "جمہور"، "امن کا ستارہ"، "لہو پکارتا ہے" ان کی صحت مند ترقی پسند شاعری کی مشہور و معروف تخلیقات ہیں۔ نثر میں ان کا اسلوب بیان بہت ہی دل کش ہے۔ "ترقی پسند ادب"، "لکھنؤ کی پانچ راتیں"، "پیغمبران سخن" اور "اقبال شناسی" نثر میں ان کے شاہکار ہیں۔ انھوں نے میر، غالب، کبیر اور میرا بائی کی عظیم شاعری کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کیا ہے۔ انھوں نے اقبال پر ایک لاجواب فلم بنائی ہے۔ اقبال کی مشہور عالم کتاب "جاوید نامہ" پر بھی وہ ایک فلم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انھوں نے اقبال کو بڑی کاوش سے پوری طرح دریافت کیا ہے۔ شروع میں وہ اقبال کے متعلق بڑی غلط فہمی میں تھے۔ لیکن بہت جلد "اقبال" ان کے ہاتھ آ ہی گیا۔

علی سردار جعفری کو ان کی علمی اور ادبی فتوحات کے لیے بہت سے انعامات مل چکے ہیں۔ ان کو اقبال ایوارڈ بھی مل چکا ہے جو دنیا میں اردو کا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ حکومت ہند نے سردار جعفری کو "پدم شری" کے خطاب سے نوازا ہے۔ میری رائے میں وہ اس سرکاری خطاب سے کہیں زیادہ بلند ہیں۔ وہ تو سیّد الاکبر بھی ہیں۔

میری دلی دعا ہے کہ ہمارے سردار جعفری اسی طرح علم و دانش کے افق پر ایک بہت ہی روشن ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں۔ رب کریم ان کے قلم اور زبان میں اور زیادہ طاقت اور ادبی صداقت عطا فرمائے۔ اللہ پاک ان کو صحت اور بہت لمبی عمر عطا فرمائے۔ حضرت امیر خسروؒ کے الفاظ میں ان کے لیے میری دعا ہے ؎

بخوبی ہمچو مہ تابندہ باشی
بملک دلبری پائندہ باشی

وامق جونپوری

بالا مئو۔ ڈاک خانہ کجگاؤں (ضلع جونپور)

۔ ستمبر ۱۹۸۸ء

پیارے صہبا لکھنوی — سلام شوق

تمہارا ۲۴ مئی ۱۹۸۸ء کا خط ۲۰ اگست کو ملا اور اس تدر تاخیر سے اس مختصر مدت میں طویل تو کیا کوئی مختصر مضمون بھی نہیں لکھا جاسکتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خط اب تک کہاں پڑا رہا۔ اگر یہ خط اب سے ایک مہینے قبل بھی مل جاتا تو میں تمہارے لیے سردار جعفری پر تفصیلی مضمون ضرور لکھتا۔ بہرکیف اس خط میں بھی مرا [illegible] تمنا تھا کہ اور تاریخی الفاظ [illegible] کچھ اور بھی لکھوں گا (ہمارے دیہات کی زبان میں) بہت برا ہوا۔ [illegible] سردار بحیثیت ایک ترقی پسند شاعر اور تحریک کے سربراہ ہونے کے ہمیشہ میرے [illegible] خاص موضوع رہے ہیں۔

؎ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے

ترقی پسند ادبی تحریک میں جس انہماک، شعور اور سپردگی کے ساتھ داخل ہوئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے اس کی تاریخ ادب میں کوئی جواب نہیں ملتا۔ مگر تم کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ تقسیم برصغیر کے بعد ہندوستان میں خود ترقی پسند تحریک کے چند سربراہوں اور ادیبوں نے اپنے ذاتی مفاد اور کھانے کمانے کے لیے جس دھڑلے سے تحریک دشمنی اور بے ضمیری کا ثبوت دیا ہے اس کا بھی تاریخ ادب میں کوئی جواب نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد یہاں ادبی ترقی پسند تحریک میں جو بحران آیا وہ سراسر مصنوعی تھا۔ اس کو اور اس کے انقلابی کردار کو ختم کرنے کے لیے جو گھناؤنے اور شرمناک طریقے استعمال کیے گئے وہ عبرت ناک ہیں جن کو اگر تفصیل سے بیان نہ کیا جائے تو بزدلی اور اخفائے واقعات کا الزام عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ جب اس مسئلے کے چہرے سے ماضی کا نقاب ہٹا کر اس کا جائزہ لیا جاتا ہے تو چند ایسے لوگوں کے نام سامنے آتے ہیں جو ہم میں اب نہیں رہے اور جو چند ابھی حیات ہیں ان میں سردار جعفری کا نام سرفہرست آتا ہے اور جو تحریک کی مصنوعی موت (CASUALTY) کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتے۔ چونکہ ترقی پسند مخلص ادیبوں کا جو اس سازش میں شریک کار نہ تھے ان ہاتھوں نے کن کن بہیمانہ طرز عمل سے استحصال کیا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گروہ بندی، دوست نوازی MUTUAL ADMIRATION SOCIETY خفیہ سازی اشتہار بازی اور طرح طرح کے پروپیگنڈا طرازی کے جال اس SUBTLE انداز میں بچھائے گئے تھے اور اب تک ان پر عمل درآمد ہے کہ تم جیسے دور افتادہ لوگ تو درکنار یہاں قریب سے دیکھنے والے دھوکا کھاتے رہے ہیں۔ جریدوں کی ادارت اور سرمایہ داروں کے بنائے ہوئے TRUSTS سے روزی روٹی پیدا کرنا ان لوگوں کا وتیرہ ہو گیا ہے اور بین الاقوامی سطح پر امن عالم کی ضرورت پر دو چار بیانات اور محنت کشوں کے حق میں دو چار مصرعے پڑھ دینا ان نام نہاد ادیبوں کی عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ یہ ہر موقع سے پورا فائدہ اٹھانے کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس صلاحیت میں ماہر ہیں۔

یہ بیچارے اخبار اور رسالے والے ان رموز سے کیا واقف ہو سکتے ہیں ۔ وہ تو ہر چیز کو اس کی FACE VALUE کی روشنی میں دیکھتے ہیں ۔ اصلیت یہ ہے کہ پروپیگنڈے کا فن آنا چاہیے جس میں سردار جعفری ماہر ہیں ۔ زندگی بھر انھوں نے کیا ہی کیا ۔ تحریک کے اس مصنوعی بحران پیدا کرنے میں علاوہ دوسری منفعتوں کے یہ بھی مقصد تھا کہ دو چار بھاری پتھر جو سدِّ راہ بن سکتے ہیں ان کو کسی طرح راستے سے ہٹا دیا جائے یعنی ترقی پسند ادیبوں کی فہرست مختصر سے مختصر تر ہو جائے مگر یہ دار کورٹ ید یہ خیال ہے ، ہاکہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے DEATH CERTIFICATE پر دستخط کر دینے سے تحریک جو باشعور اذہان میں گھر کر چکی ہے نہیں مر سکتی اور وہ ادیب جو مردہ سمجھ لیے گئے تھے ، کفن کی تجہیز و تکفین کے بعد بھی اعلیٰ ترقی پسند ادب تخلیق کرتے رہے ۔ مگر تنقید در ، تقریب اور تذکروں میں ان کو ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا رہا ۔ عرب کے زمانۂ جاہلیت کے بڑے شعراء سے دو چار ایسے لوگ منسلک رہا کرتے تھے جو ملک کے دور دراز حصوں میں جا کر ان کا کلام سناتے تھے اور ان کی عظمت کا اعلان کیا کرتے تھے اور وہ راوی کہلاتے تھے ۔ اس دور میں یہ ہوا کہ ان حضرات نے دو تین چار یا پانچ کا گروہ بنا لیا اور ایک دوسرے کو عظمت کی سند دینے لگے اور اس طرزِ عمل میں نازی مشہور ٹکٹ کے وضع کردہ طریقے پر چل نکلے کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اتنی مرتبہ دہراؤ کہ سننے والے اصلیت کو بھول جائیں ۔ چنانچہ اب سے تقریباً دو ڈھائی سال پہلے کیفی اعظمی نے یہ بیان دینا شروع کر دیا کہ سردار جعفری اس دور کے سب سے بڑے شاعر ہیں ۔ ہندوستان ، پاکستان ، سوویت روس وغیرہ کے اخبارات اس خبر کو لے اڑے ۔ در آنحالیکہ سنجیدہ ترقی پسند اہلِ ذوق و نظر کا یہ کہنا ہے کہ ہندوستان میں سردار سے کہیں زیادہ اچھے ترقی پسند شعرا موجود ہیں اور ان میں خود کیفی اعظمی کا نام بھی لیا جاتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ سردار نے تقسیم ملک کے بعد کوئی اوّل درجے کی تخلیق پیش نہیں کی اور اپنی پچاس سال کی شاعری میں اپنا کوئی اسلوب وضع نہیں کر سکے ۔ کبھی انیس کی نقالی کی ، کبھی جوش ملیح آبادی کی اور کبھی اقبال کی اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تمام نقلیں اصل کی سرحدوں کو نہ چھو سکیں ۔

نیاز حیدر نے ۲۶ اگست ۸۴ء کے قومی آواز لکھنؤ میں اپنے ایک مراسلاتی مضمون میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور علاوہ چند کے جملہ ترقی پسند شعرا کے ساتھ سردار کا جو معاندانہ اور غیر دیانت دارانہ رویہ بحیثیت تحریک کے ایک آرگنائزر کے رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے سردار جعفری کی خود شاعری کو جن الفاظ میں سمیٹ کر رکھ دیا ہے وہ تو ان کو صفِ شعرا سے ہی خارج کر دیتے ہیں ۔ علی سردار جعفری کی شاعری میں نہ جانے کتنے پہلو نزدما ، مائیکانسکی اور ناظم حکمت وغیرہ وغیرہ پوشیدہ ہیں جن کو وہ غالباً تاثر قبول کرنا کہتے ہیں ، لیکن حقیقت میں وہ سرقہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔ تو ہم سردار کو بحیثیت شاعر کے کس معیار پر جانچیں کہ آج کے سب سے بڑے شاعر مانے جا سکیں ۔ کیا وہ گفتگو کے اڈیٹر ہیں ۔ اس لیے وہ سب سے بڑے شاعر ہیں یا وہ اچھے مقرر ہیں اس لیے ۔ یا وہ اربابِ اقتدار کی خوشامد کرتے رہتے ہیں اس لیے یا اس لیے کہ ان کو بین الاقوامی سطح پر دوسری زبانوں کے ان نقادوں کا تعاون حاصل ہے جو اردو زبان اور بالخصوص اردو شاعری کے نکات اور مضمرات سے پوری طرح واقف نہیں ۔

بمبئی جب ایک ترقی پسند صاحب ذوق نے اردو کی چوٹی کی اور انتہائی محترم اور معتبر افسانہ نگار خاتون سے دریافت کیا کہ کیفی اعظمی کے اس بیان میں کتنی حقیقت ہے کہ سردار جعفری سب سے بڑے ترقی پسند شاعر ہیں تو موصوفہ نے اپنے خاص انشائیہ انداز میں جواب دیا کہ آج کیفی سردار کو سب سے بڑا شاعر کہتے ہیں تو اس شہرت کو

نمبر پڑھنے کے بعد سردار جعفری کو سب سے بڑا شاعر کہہ دیں گے اور حساب بیباق ہو جائے گا۔"

میں نے تم کو جو کچھ لکھا ہے اگر اس کی تفصیل تم چاہو اور دلائل کے ساتھ جاننا چاہتے ہو تو روزنامہ آواز لکھنؤ میں اگست ۱۹۸۴ء میں میرے تین قسطوں میں شائع شدہ مضمون "ترقی پسند تحریک کا المناک بحران" پڑھو تو سردار جعفری کی پوری شخصیت تم پر روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ اگر تم کہیں پڑھو تو ان کی دوست مدیر نیا زمانہ سید عزیز اندوری سے ڈاکٹر قاسمی اردو شعبہ الہ آباد یونیورسٹی۔ ڈاکٹر اقبال انتقاد شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی وغیرہ سے دریافت کر سکتے ہو۔ مجاز جاں نثار اختر، پرویز شاہدی، محی الدین تو مر گئے بول نہیں سکتے اور آج کے بیسیوں ترقی پسند ادیبوں، نقادوں اور صحافیوں سے پوچھو۔ اس وقت یہ پوری جماعت ان سے ترقی پسند ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ لینے میں منہمک ہے۔

پیارے عبا۔ تم سردار جعفری پر انکار کا فیصلہ شمار نہ کرنا کہ میرے اس کہنے پر ناراض ہو جاؤ کہ مسلہ نہیں ہے صاحب قلم کو تہذیب کی حدود میں رہ کر آزادی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے تنقید اور تجزیہ میں اختلاف کرنے والے پروپیگنڈہ لوگ PAD ASTEI بدمذاقی کا نام لگتے ہیں۔ جو ہمیں تو خود کوئی تعلق نہ ہو وہ ناراض ہوتے ہیں اور ان دونوں کو بدیانتی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اختلاف رائے ہر زبانوں میں ارتکاب جرم کے برابر مانا گیا ہے۔ تنقید و تبصرے کا بھی یہی اصول ہے اس لیے میں توقع کرتا ہوں کہ تم میرے اس خط کو اپنے اس خصوصی شمارے میں شامل کر کے اخلاقی جرأت کا ثبوت دو گے جو ایک دانشور صحافی میں ہونی چاہیے۔

امید ہے کہ تم مع جملہ متعلقین کے بخیر و عافیت سے ہو گے۔

شان الحق حقّی

(کراچی)

علی گڑھ میں میرے زمانۂ طالب علمی ۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۹ء میں جو ہمارا دوست نوجوانوں کا جو گروہ تھا اس میں اختر حسین رائے پوری، سید سبط حسن، اختر امام، اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، معین احسن جذبی اور علی سردار جعفری شامل تھے اور سبھی کم و بیش ترقی پسندی کی طرف مائل۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء سے وہاں کی ہوا بالکل بدل گئی اور ترقی پسندوں پر زندگی تنگ کر دی گئی۔ چنانچہ جعفری تو انہی دنوں یونیورسٹی سے چلتے کر دیے گئے تھے اور دلی جا کر ایک کالج میں داخل ہوئے تھے وہ جب سے اب تک ترقی پسندی کی شاہراہ پر ثابت قدم رہے ہیں۔ اسی طرح شاعری کے میدان کی یکہ تازی میں بھی پیش پیش۔ میں وہاں سے آنے کے بعد زیر عتاب آیا۔ سرکاری ملازمت سے تین ہی مہینے بعد چلتا کر دیا گیا تھا کیوں کہ علی گڑھ کی سی آئی ڈی کی رپورٹ موافق نہ تھی۔

علی گڑھ کے بعد جعفری سے دلی میں چند سرسری ملاقاتوں کے علاوہ یکسر دوری رہی۔ پھر جب ۱۹۷۱ء میں قلی قطب شاہ کے چار سو سالہ جشن ولادت کی تقریب میں ڈاکٹر زور مرحوم کی طلبی پر حیدرآباد گیا تو بمبئی میں مختصر قیام کیا اور یہ جعفری ہی تھے جنھوں نے بڑی محبت سے پذیرائی کی۔ میں انہی کے ساتھ جا کر مجروح سلطانپوری کے پاس ٹھہرا۔ پھر ۱۹۷۶ء میں لندن میں

انڈر لیا اور ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ چند مرتبہ بمبئی یا دلّی میں جب بھی ملنا ہوا گاڑھی چھنی مگر کم کم اور بڑے وقفوں سے ساتھ۔ ان کے لیے میرے دل میں جو پیار تھا وہ علی گڑھ سے اب تک قائم ہے۔ میرا خیال ہے ایسے تعلق کو کبھی زوال نہیں ہوتا جو نوعمری سے شروع ہوا اور جس میں ملاقات سے زیادہ حسرتِ ملاقات کو دخل ہو۔ پھر سیرت کا جمال بھی اتنا ہی دلکش ہوتا ہے جتنا کہ کمال کا نقش۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے ادب کے ساتھ انسانیت کی خدمت بھی کی ہے مجھے ان کے کلام پر فیض، اقبال اور قاضی نذرالاسلام کا ملاجلا پرتو نظر آتا ہے۔ نذرالاسلام کو اختر حسین رائے پوری نے پہلے پہل "پیامِ شباب" کے ذریعے اردو دنیا سے روشناس کرایا تھا اور جوش نے بھی اس کا فوری اثر قبول کیا تھا۔ جعفری نے زورِ کلام کے ساتھ حافظہ بھی غضب کا پایا ہے۔ علی گڑھ میں بھی مرثیوں کے بند کے بند اور لمبی لمبی نظمیں بے تکان سناتے چلے جاتے تھے۔ بعد میں بھی انھیں کبھی بیاض میں جھانکتے یا نوٹ بک ٹٹولتے نہیں پایا۔ علی سردار کا نام ہمارے دور کی ادبی تاریخ میں مستقل اور مستحکم ہے۔ مگر آدمی کو تو دل ہی جان سکتا ہے۔ یہ وہ خوش نصیبی ہے جس میں آئندہ لوگ ہمارے شریک نہ ہو سکیں گے۔ میرؔ نے خوب ہی کہا تھا کہ ؏

افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میں جعفری کے ساتھ صہبا لکھنوی کی صحت و سلامتی کا بھی دل سے دعاگو ہوں جنھوں نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اس خصوصی نمبر کی اشاعت کا بار اٹھایا، جو ان کے کارناموں میں ایک اور اضافہ ہے۔

سید محمد تقی

(کراچی)

انکار اور صہبا صاحب کا یہ احسان ہے تہذیبی قدروں سے محبت کرنے والوں پر کہ انھوں نے بعض ایسے دانشوروں کو ان کی زندگی میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کی روایت ڈالی ہے جن کا نام ہمارے ادبی سرمائے میں ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ اس سلسلے کا تازہ ترکارنامہ سردار جعفری کی یادگار تہذیبی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں انکار نمبر کی اشاعت ہے۔

علی سردار جعفری اردو تہذیبی منطقے کے ان محترم افراد میں شامل ہیں جن کی دانشوری نے ہمارے ادب اور ہمارے تہذیبی اثاثے میں جو اضافہ کیا ہے وہ ہماری نسل کے چند ہی افراد سے ممکن ہو سکا ہے۔ جعفری بیسویں صدی کے ان خرد کیشوں میں شامل ہیں جو نسلِ انسانی کو ایک ایسے معاشرے کو تشکیل دینے کی علمی، ادبی اور عملی جدوجہد کرتے رہے جو شرفا، کا ہمیشہ سے آئیڈیل رہا ہے۔ انھیں جائز طور پر یہ ذہنی سکون حاصل ہے کہ انھوں نے کیمونسٹ معاشرے کے قیام کے لیے عملی جدوجہد کی۔ ایک طاقتور ذہن رکھنے والے سردار یہ پوری طرح جانتے ہیں کہ نسلِ انسانی کے مسئلوں کا واحد حل وہی ہے جو مارکس بلکہ انارکسٹوں نے تجویز کیا تھا اور جب تک یہ حل نہ ہو آدم کی یہ اولاد اطمینان کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے جو طریقے تجویز کیے گئے تھے وہ وحشیانہ بھی تھے اور وہ فلسفہ جس پر اس کی اساس رکھی گئی وہ منطقی تضاد کا حامل اور زیادہ ٹھوس فکری بنیاد سے محروم بھی تھا۔ لیکن جو آئیڈیل

... رہا وہ مہذب تاریخ کا محبوب آئیڈیل رہا، پیغمبر ہوں یا فلسفی، دانشور ہوں یا ادیب، سب اسی آئیڈیل کو عمل میں لانے ... جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ یہ وہی آئیڈیل ہے جس کے لیے ترقی پسند ادیبوں نے جدوجہد کی اور اس لیے سردار نے مجھے ... اپنے کراچی کے دورے کے موقع پر یہ صحیح کہا کہ وہ اس زندگی سے بالکل مطمئن ہیں جو انھوں نے گزاری۔ واقعی ان ... کی ایک مقدس مشن کے حصول کے لیے گزرتی ہے جس کے ساتھ ادبی و فکری میدان کے وہ یادگار کارنامے بھی ہیں ... وہ ہمیشہ ایک صفِ اوّل کے دانشور کی حیثیت سے تاریخ میں محترم مقام دلانے کا سبب بنے رہیں گے۔ ہم سب ... چاہیے کہ وہ طویل عمر پائیں اور برِ صغیر کی تہذیبی زندگی کے ایک بزرگ دانشور کے طور پر ہماری تہذیبی رہنمائی کرتے رہیں۔

ٹرآننت

(نیویارک)

ایک ساتھی شاعر کے لیے

ہم اپنی جدوجہد کی وسعتوں میں کس طرح
ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے
ہم کہ جن کی زبانیں بہت عرصہ پہلے
بریدہ ہو چکی ہیں
ہم جو جھوٹ اور ریا کی اس ظالم دنیا میں
ہر نوع کے رشتۂ اخوت: بھائی چارہ (جنس کی نسبت آزاد)
انسانیت، مادرِ وطن اور عوام دوستی کے رشتوں سے بندھے ہوئے
بہر نوع بات کریں گے
ہم صبح کی کرنوں کی زبان میں بات کریں گے
جس طرح وہ خواب زدہ پتّوں کے ہونٹوں
پر شبنم کے قطرے ٹپکاتی ہیں
ہم اپنی بیداری کی "اذان" کے لہجے میں
بات کریں گے

میری خواہش ہے کہ مجھے تورنٹو میں پڑھے گئے اردو کے ترقی پسند شعرا کی بابت تمہارے مضمون کی کاپی حاصل ہو جائے۔ جواباً میں یہ پیش کش کرتا ہوں کہ میں کتاب کی قیمت کے علاوہ اپنے اوراق پریشاں (MANHATTAN POWS) روانہ کروں گا جو فیض احمد فیض کے دورِ جلاوطنی کی شاعری کی طرح اچھی نظموں پر مشتمل تو نہ ہوں گے یا پھر ظفر یا لورکا کے مجموعے (POET IN NEW YORK) کی طرح، لیکن پھر بھی تمہیں کچھ نہ کچھ پسند آئے گا۔

رام لعل

(لکھنؤ)

ترقی پسند تحریک کے اگر گیارہ بڑے قافلہ سالاروں کے نام گنوائے جائیں تو ان میں یقینی طور پر علی سردار جعفری شامل ہوں گے۔ دوسرے نام سجاد ظہیر، سید احتشام حسین، پریم چند، اختر حسین رائے پوری، ممتاز حسین، جوش، فراق، فیض، کرشن چندر، عبدالعلیم اور احمد ندیم قاسمی کے ہیں۔ سردار جعفری کا نام نظریاتی طور پر انتہا پسندوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن شخصی طور پر وہ انتہائی نرم دل، معاملہ فہم اور انسان دوست واقع ہوئے ہیں اس لیے ان سے مل کر نئے لکھنے والوں کو بھی دوری کا احساس نہیں ہوتا۔ اس میں ان کی شخصیت کی محبوبیت کا بھی خاصا دخل ہے۔

سردار جعفری کی پہلی محبت شاعری سے رہی ہے۔ انھوں نے تنقید بھی لکھی ہے، ادبی صحافت کے جوہر بھی دکھائے ہیں اور کچھ فلمیں بھی پروڈیوس کی ہیں۔ آج کل وہ اردو کے درجن بھر اہم ترین شعراء پر ٹی وی کے لیے کہکشاں کے نام سے ایک سیریل بنا رہے ہیں۔ ان کی جیسی ہمہ جہت شخصیت کے سینے پر ایک تمغہ افسانہ نگاری کا بھی آویزاں ہے، لیکن وہ ان کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے۔

ان کے ہم عصروں میں بیشتر اہلِ قلم کے بارے میں خاص نمبر شائع کیے جا چکے ہیں۔ افکار کو یہ طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے جوش، فیض، اختر حسین رائے پوری، اور احمد ندیم قاسمی کے ضخیم خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ اب وہ علی سردار جعفری نمبر بھی پیش کر رہا ہے۔ کسی بڑے ادیب کے بارے میں خاص نمبر شائع کرنے کا ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے تخلیقی کارناموں کا نہ صرف ایک معیاری انتخاب سامنے لایا جائے بلکہ اس کی شخصیت و فن کے وہ سارے پہلو بھی زیرِ بحث آ جائیں جن کی بدولت اس کا تشخص قائم ہوتا ہے۔

میں ادارۂ افکار کو اس اہم دستاویز کی تکمیل کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

یونس احمر

(کراچی)

سردار جعفری ترقی پسند تحریک کی علامت ہیں، اگرچہ ان کی جذباتیت اور ان کے شدید نظریات سے تحریک کو کسی حد تک نقصان بھی پہنچا، لیکن پھر جب ان کو اس بات کا احساس ہوا تو انھوں نے اپنے جذبات کی شدت پر قابو پا لیا۔ ان کی شاعری میں انسانیت سے محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ میری ان سے شناسائی کی عمر اتنی ہی ہے جتنی کہ اردو ادب میں میری آمد ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران ترقی پسند تحریک کو توانائی ملی اور اس تحریک کو توانا اور متحرک بنانے میں جعفری صاحب سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیا ادب اور قومی جنگ (ہفتہ وار) کے صفحات ان کے ترقی پسندانہ عقائد کی شہادت دیتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد جب فرقہ پرستی کے عفریت نے سر اٹھایا اور ہندوستان اور پاکستان میں تعصبات کے

نومبر ۱۹۴۹ء میں کلکتے میں امن کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اس کے انعقاد میں انجمن ترقی پسند مصنفین اور پیپلز تھیٹر نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے دفتر واقع دھرم تلہ اسٹریٹ میں ملک کے مختلف علاقوں سے مندوبین کا اجتماع ہوا۔ ایک دن میں اس دفتر میں گیا تو وہاں چند خواتین بھی موجود تھیں۔ میرے ایک ساتھی نے ایک خاتون کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان کو جانتے ہو؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بولے "یہ سردار جعفری کی بیگم سلطانہ ہیں۔ میں نے ان کا نام سن رکھا تھا۔ جعفری صاحب کو میں نے تلاش کیا وہ نہیں ملے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی اہم میٹنگ میں گئے ہوئے ہیں۔

دوسرے دن جنوبی کلکتہ کے ایک بہت بڑے پارک میں امن کانفرنس کا اختتامی جلسہ ہوا جس میں شرکت کے لیے دور دراز سے لوگ آئے تھے۔ پارک بھر چکا تھا اور تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ لوگ ان تقریروں کو سننے میں ہمہ تن گوش تھے۔ مقررین میں جعفری صاحب بھی تھے۔ ان کی تقریر بہت جوشیلی اور جذبات سے بھرپور تھی۔ لوگوں نے خوب داد دی۔

۱۹۵۲ء کے اواخر میں جب ہم نے کلکتے میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی تو ایک خط میں جعفری صاحب نے پرویز شاہدی (مرحوم) کو لکھا کہ وہ مجھ سے (پرویز احمد) مانک بنرجی کے مشہور زمانہ ناول FISHERMAN OF RIVER PADMA کا ترجمہ کروائیں۔ اس میں بنگال کے ماہی گیروں کی بڑی المناک داستان ہے۔ پرویز شاہدی صاحب نے ان کا پیغام مجھ تک پہنچایا۔ میں نے کہا کہ میں اس کا ترجمہ بنگلہ زبان سے کروں گا۔ کتاب اس وقت دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں نے جعفری صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ اس کام کے لیے انھوں نے میرا انتخاب کیا ہے۔ بہرحال دو چار سال کے بعد جب بنگلہ زبان میں ناول دستیاب ہوا جس کا نام تھا پدما ندیر مانجھی (پدما ندی کے مانجھی)، تو میں نے اس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ مانک بنرجی نے اس ناول کے ذریعے بنگال کے ماہی گیروں کی اس زندگی کی تصویر کشی کی ہے جو طوفانوں، قحط سالیوں اور بیماریوں سے بھرپور ہے۔ ان کی حقیقت پسندی کا اعتراف بڑے سے بڑے ناقدوں نے کیا ہے۔ میں نے اس ناول کا ترجمہ کیا، لیکن اس کے ساتھ جو المیہ پیش آیا وہ انتہائی دردناک ہے۔ ایک صاحب اس بہانے کہ وہ کتابی شکل میں اس کی اشاعت چاہتے ہیں مسودہ لے کر گئے اور پھر لوٹے ہی نہیں۔ ناول چونکہ مجھ کو بہت عزیز تھا اس لیے میں نے دوبارہ اس کا ترجمہ کیا۔ جابی صاحب نیا دور کا ناولٹ نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سے اس ناول کے بارے میں ذکر کیا تو وہ اس کو شریکِ اشاعت کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے مسودہ ان کے حوالے کر دیا اور اس طرح مانک بنرجی کا یہ ناول نیا دور کے ناولٹ نمبر میں محفوظ ہو گیا۔ کبھی موقع ملا اور کسی ناشر نے دلچسپی ظاہر کی تو اس کی اشاعت کتابی صورت میں کرانے کی کوشش کروں گا۔

جب ۱۹۴۹ء میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے میں کلکتے سے بمبئی گیا تو خوش تھا کہ جعفری صاحب سے ملاقات ہوگی اور ان کا شکریہ ادا کروں گا، لیکن بمبئی کی انتظامیہ نے ان کو نظر بند کر دیا تھا۔ ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی سال کلکتے میں اردو ہندی مشترکہ مشاعرے کا پروگرام بنا۔ اس میں بمبئی کے جن شعرا نے شرکت کی ان میں جوش ملیح آبادی، مجاز، جعفری، نیاز حیدر اور ساحر بھی تھے۔ اس موقع پر جعفری صاحب سے ادب کے بارے میں مفید باتیں ہوئیں۔ میں نے

ان سے کہا کہ مانک بنرجی کے ناول کا میں براہ راست بنگلہ سے ترجمہ کرنا چاہتا ہوں ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی انھوں نے میری ہمت افزائی کی۔ اس مشاعرے میں انھوں نے اپنا جو کلام سنایا اسے سن کر حاضرین نے خوب خوب داد دی۔ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ کا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

اس کے کافی عرصے بعد جعفری صاحب کراچی کے پریس کلب میں تشریف لائے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ میرے پاس ایک گروپ فوٹو ہے جس میں ساحر، نیاز حیدر، جعفری نمایاں ہیں۔ اس گروپ فوٹو کو میں نے سنبھال کر رکھا ہے۔ میں اس فوٹو کو قیمتی خزانہ سمجھتا ہوں۔ اس کو کلکتے سے ڈھاکہ، پھر کراچی، پھر اسلام آباد اور اسلام آباد سے پھر کراچی لے کر آیا ہوں۔ نیا ادب کے سارے پرچے جو میں نے سینت سینت کر رکھے تھے سب ضائع ہو گئے۔ اسی طرح قومی جنگ کے پرچے بھی اس الٹ پھیر میں ضائع ہو گئے۔ جعفری صاحب کی ان یادوں کو میں دل سے لگائے رکھتا ہوں۔ وہ بہت بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے اچھی جذبات آگیں شاعری کی وجہ سے بڑی اذیتیں سہی ہیں۔ لیکن قید و بند اور حکومت کی سختیوں سے ان کے نظریات متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ اپنی اکثر ۸۴ سالہ زندگی میں اب بھی چاق و چوبند اور سرگرم عمل ہیں ہماری دعا ہے کہ وہ تادیر زندہ رہیں۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

محمد احمد سبزواری

(کراچی)

برادرم صہبا تم اردو کے پیاروں کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہو کہ ۴۶ سال سے اس قدر پابندی سے افکار نکال رہے ہو جو ہمارے ادبی جرائد میں ایک مثال ہے پھر اس کا معیار ماہ بہ ماہ بلند ہی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ تمہاری خاص اشاعتیں بھی رسالے کی عمر کے برابر ہیں اور تم اس معاملے میں بھی بازی لے گئے کہ چھ مشاہیر یہاں ان کی زندگی میں ضخیم نمبر نکال کر ان کو خراج تحسین پیش کیا اور اب اردو کے بلند پایہ شاعر اور ادیب علی سردار جعفری پر خاص نمبر نکال رہے ہو مجھے تمہاری صلاحیتوں کی بنا پر یقین ہے کہ تمہارا یہ ساتواں نمبر گزشتہ نمبروں پر بھاری رہے گا۔

مجھے تو سردار جعفری سے صرف ایک ہی ملاقات کا شرف رہا جب اوائل ۱۹۴۶ء میں میں نے مخدوم کے ساتھ ایک رات پیپلز ہاؤس بمبئی میں گزاری تھی، یہ وہ دور تھا جب مخدوم "ماد ھورائے" بنے ہوئے بمبئی میں روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مخدوم نے وہاں چند ساتھیوں سے ملایا جن میں سردار (ان کے قریبی دوست ان کو سردار ہی کہتے ہیں) بھی شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کچھ دن پہلے بمبئی میں انڈین بحریہ کے ملاحوں نے بغاوت کی تھی، سردار نے باتوں میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ۱۸۵۷ء میں بنگال اور میرٹھ میں ہمارے سپاہیوں نے جو گولی چلائی تھی وہ کامیاب نہ ہو سکی مگر اب برٹش ایمپائر کی اینٹ سرک گئی ہے اور چند روز میں یہ عمارت دھڑام سے زمین پر آگرے گی۔"

سردار جعفری برصغیر کے ترقی پسندوں کے ہراول دستے میں شامل ہیں جنھوں نے سجاد ظہیر، مخدوم، مجاز اور سبط حسن وغیرہ کے ساتھ کام کیا مگر یہ ابتدا ہی سے تحریک کے پرجوش بلکہ شوریدہ سر گروپ میں شامل رہے۔ مثلاً بالکل ابتدائی دور میں جب

دنیا میں داخلی انتشار کے آثار نمودار ہوئے تو انھوں نے بعض ارکان کی شدید مخالفت کی۔ پھر یہ ردِعمل اسی موقع پر ظاہر ہوا۔ پھر جب تحریک کو محض ادبی حدود کے اندر رکھنے پر بحث ہوئی تو ۔۔۔ نے یہ بات مانی کہ سیاسی تحریکیں اور سیاسی تحریکوں سے الگ نہیں رہ سکتے۔

برصغیر میں ترقی پسندی انگریزی سامراج کے خلاف شروع ہوئی۔ ۔۔۔ کے خلاف ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ سجاد ظہیر و دیگر ترقی پسند تحریک ۔۔۔ کسی ۔۔۔ لندن اور یورپ میں اشتراکی ذہنوں اور مفکروں سے قریب ۔۔۔ کسانوں اور مزدوروں کا انقلاب ۔۔۔ ترقی پسند تحریک سے ۔۔۔ ایک بات ۔۔۔ چنانچہ برصغیر میں ترقی پسند تحریک نے اشتراکیت کا پرچار کرنے میں اہم ۔۔۔ سامراج اور ۔۔۔ سیاسی شعور اور بیداری کی بہت سی اسی کا نتیجہ ہیں۔ ۔۔۔ دینے سے اشتراکیت ختم ہو گئی زیادہ صحیح نہیں۔ ۔۔۔ جس کی آبادی ایک ارب سے زیادہ ہے، کیوبا اور دوسرے ملکوں نے اپنا ۔۔۔ یقین رکھتے ہیں۔ پھر ترقی پسندی تو ایک ذہنی رویہ ہے اور ذہنی رویے آسانی سے تبدیل نہیں ہوتے لہٰذا سردار جعفری کی ادبی حیثیت اور ذہنی رویہ اور ترقی پسندی مسلم ہے اور رہے گی۔ بہترین ماؤں کے ساتھ تمہاری کامیابی کا خواہاں۔

ساقی فاروقی

(لندن)

(لندن میں سردار جعفری کی ستر ویں سالگرہ کی تقریب کا ایک تاثر)

جناب والا! سب سے پہلے تو مجھے کہنے دیجیے کہ ستر ویں منزل پر پہنچ کر آپ نے وہ کام کیا جو میں کبھی نہیں کروں گا۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اکیسویں صدی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اس طویل سفر میں آپ نے دکھ بھی اٹھائے ہیں اور سکھ بھی دیکھے ہیں۔ اس عرصے میں وہ مزدور اور کسان جن کی تقدیر سے آپ کو کمٹ منٹ تھی ۔۔۔ ہو گئے ہیں۔ جنوبی افریقہ، جنوبی امریکہ اور مشرقِ وسطیٰ میں مغربی ممالک کی سنگ دلی بڑھ گئی ہے۔ اشتراکی ملکوں کی چادریں بھی ۔۔۔ دھبوں سے خالی نہیں ہیں۔ افسوس کہ دنیا کی ۵۰ فی صد آبادی ظلم سہہ رہی ہے۔ آپ نے اگر تمام نہیں تو بیشتر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی ہے، یہ بڑے جگرے کی بات ہے۔ ۵۰ سال تک ایک آدرش سے وفاداری حوصلا اور طاقت چاہتی ہے اور یہ ذخیرہ آپ کے پاس وافر ہے۔ اگر آپ دنیا کو بدل نہیں سکے تو اس میں آپ کا قصور کم ہے۔ اپنی تمام خوش گمانیوں کے باوجود شاعر تنہا نہ انقلاب لاتا ہے نہ قوموں کی تقدیر بدلتا ہے نہ یہ اس کا کام ہے۔ شاعر کوئی آسمانی چیز نہیں وہ اسی معاشرے میں سانس لیتا ہے جس میں سیاست داں بھی ہوتے ہیں اور پروفیسر بھی، ڈاکٹر بھی، انجینئر بھی، سائنس داں بھی اور علم کلام کے جاننے والے بھی، مزدور بھی، کسان بھی۔ یہ سب مل ملا کر معاشرے کو بدلنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شاعر اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اندر سے لوگوں کی تطہیر ضرور کرتا ہے یعنی وہ معاشرے کے ناسور اور کوڑھ کی نشان دہی کرتا ہے۔ ظلم سہتے ہوئے آدمی کے زخموں

اور دماغوں پر پڑی ہوئی دبیز گرد کو نظر کی سرچ لائٹ پھینکتا ہے اور انھیں منظرِ عام پر لا کر سوسائٹی کی بے حسی اور لاتعلقی کو چیلنج کرتا ہے۔

جناب والا، آپ نے یہ سارے کام اتنی خوش سلیقگی سے نپٹائے ہیں کہ آپ کی ہنرمندی کی داد نہ دینا آپ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ میں شاعر نہیں ہوں، مگر تصنع میرے مزاج میں ہے اور آج وقت یہ کہنے آیا ہوں کہ آپ کی شخصیت کا ہمیشہ قدرداں رہا ہوں اور یہ احساس مسلک بھی آپ سے جدا نہیں ہے کہ کمیٹیڈ سوشلسٹ ہوں بلکہ یہاں بسنے کے بعد اور بائیں کی طرف سرک گیا ہوں، مگر شاعری میں صرف ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے کو ماننے کا قائل نہیں کہ میری کمٹمنٹ صحافت سے ہے، شاعری سے ہے جو پوری ذات کا مکمل اظہار مانگتی ہے۔ یہی نہیں میں احمد فراز قماش کے شاعروں کو یہ تنبیہ بھی کرتا رہتا ہوں کہ فیض کے الفاظ، سردار کے انداز، ساحر کے لہجے اور مخدوم کے نغمے کی چوری نہ کریں۔ "سحر" "لہو" "پرچم" اور "مقتل" ہوئے بیشتر امکانات تو ۱۹۳۶ء والوں نے ختم کر دیے ہیں، نئے الفاظ اختیار کرو، نئے استعارے بناؤ، ورنہ مارے جاؤ گے۔

جناب والا پچھلے بارہ برس میں ہماری پانچ ملاقاتیں ہوئیں اور ہمارے درمیاں خطوں کا تبادلہ ہوا۔ میری بیوی کے نام آپ کے دو کارڈ اس کے علاوہ ہیں۔ ان خطوں اور ملاقاتوں میں آپ کی شاعری سے اگر میں نے اختلاف کیا تو اس کا بھی کوئی سبب ہے جو آپ کو بتا رہا ہوں۔

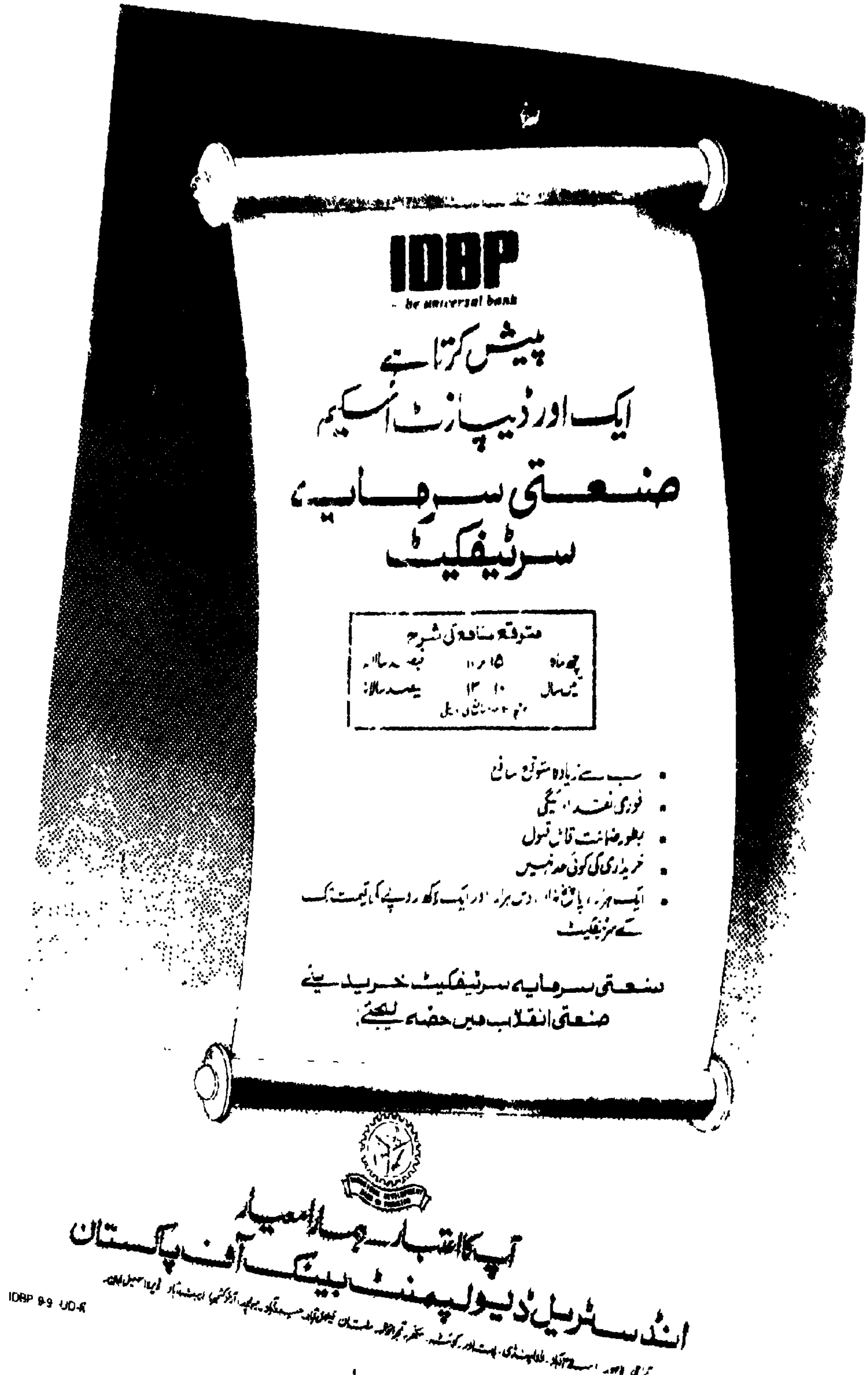
اس پہ، آپ کی پچھتر ویں سالگرہ پر مزید روشنی ڈالوں گا۔ آپ سے صرف یہ گزارش ہے کہ مجھے معاف کرتے رہیے کہ حق گوئی اور جنگ بازی میں نے آپ ہی جیسے لوگوں سے سیکھی ہے۔ آج آپ ہی کی ایک نظم کے چند مصرعوں پر یہ خراجِ محبت ختم کرتا ہوں ؎

میں ایک گریزاں لمحہ ہوں
ایّام کے افسوں خانے میں
میں ایک تڑپتا قطرہ ہوں
مصروفِ سفر جو رہتا ہے
ماضی کی صراحی کے دل سے
مستقبل کے پیمانے میں
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں


24HOUR
ANTI-DANDRUFF
Brylcreem
Omadine Clears dandruff
اینٹی ڈینڈرف
نئی
برل کریم
وہ کر دکھائے جو اینٹی ڈینڈرف شیمپو
نہ کر پائے
بیحد موثر
نئی اینٹی ڈینڈرف برل کریم، گرین ٹب میں زنک اوماڈائن
کے ساتھ۔ یہ موثر طور پر خشکی کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ یہ ڈینڈرف
شیمپو سے مختلف ہے کیونکہ برل کریم کا اثر آپ کے
بالوں میں ۲۴ گھنٹے رہتا ہے۔
گرین ٹب میں نئی برل کریم سے
خشکی کا خاتمہ اور بال خوشنما!
ASIATIC



کیسٹرول جی ٹی ایکس
اب
نیا
۳ لیٹر پیک!
GTX
انجن بند کرنے کے بعد بھی انجن کے ہر حصے میں دیر تک رہنے کی صلاحیت۔
SAE 20W/50 اور API SF/CC معیار کے عین مطابق
5000 کلومیٹر تک تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔
PSO
پاکستان اسٹیٹ آئل
PID Islamabad


IDBP
– be universal bank
پیش کرتا ہے
ایک اور ڈیپازٹ اسکیم
صنعتی سرمایہ
سرٹیفکیٹ
متوقع منافع کی شرح
چھ ماہ
تین سال
سب سے زیادہ متوقع منافع
فوری نقد ادائیگی
بطور ضمانت قابل قبول
خریداری کی کوئی حد نہیں
سرٹیفکیٹ
صنعتی سرمایہ سرٹیفکیٹ خریدیئے
صنعتی انقلاب میں حصہ لیجئے
آپ کا اعتبار ہمارا سرمایہ
انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان
IDBP 9-9 UD-R

افکار کی خاص اشاعتیں

ایک نظر میں

پہلا دور

۱۹۴۵ء : افکار کا اجرا (بھوپال سے)

۱۹۴۸ء : لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر (پہلی یادگار اشاعت)

۱۹۴۹ء : بھوپال اردو کانفرنس نمبر

۱۹۴۹ء : بھیمڑی ادبی کانفرنس نمبر

دوسرا دور
(پاکستان میں)

۱۹۵۱ء پہلا خاص نمبر کراچی سے

۱۹۵۲ء : خاص نمبر

۱۹۵۳ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۴ء : سالنامہ

۱۹۵۵ء : دس سالہ نمبر

۱۹۵۵ء : منٹو نمبر

۱۹۵۶ء : مجاز نمبر (دو ایڈیشن)

۱۹۵۸ء : سالگرہ نمبر

۱۹۵۸ء : آزادی نمبر

۱۹۵۹ء : رائٹرز کنونشن نمبر

۱۹۵۹ء : افسانہ نمبر

۱۹۵۹ء : انقلاب نمبر

۱۹۶۰ء : سالنامہ

۱۹۶۰ء : کہانی نمبر

۳ر اگست ۱۹۶۰ء کو بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی صدارت میں افکار کی سولہویں سالگرہ منائی گئی۔

۱۹۶۱ء : جوش نمبر (پہلا ایڈیشن)

۱۹۶۱ء : انقلاب نمبر

۵ر نومبر ۱۹۶۱ء کو جشن جوش منایا گیا، اور افکار نے ۱۵۰۰ ادیبوں کے اس یادگار اجتماع میں افکار کا جوش نمبر پیش کیا

۱۹۶۲ء : جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن باضافہ)

چھپتے چھپتے یہ اطلاع ملی کہ کراچی یونیورسٹی نے افکار کے جوش نمبر کو بی اے (آنرز) اور ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کر لیا ہے

۱۹۶۲ء : آزادی نمبر

۱۹۶۳ء : افسانہ نمبر

۱۹۶۳ء : حفیظ نمبر

۲۷ر ستمبر ۱۹۶۳ء کو زیر اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ جشن حفیظ منایا گیا اور کراچی کے نمائندہ ادیبوں کے اجتماع میں افکار نے حفیظ نمبر پیش کیا

۱۹۶۴ء : افسانہ نمبر

۱۹۶۴ء : نئی تخلیق نمبر

۱۳ر مئی ۱۹۶۴ء کو جناب الطاف گوہر کی صدارت میں افکار کی بیسویں سالگرہ منائی گئی

نذر زیدی ۱۹۸۹ء

جعفری نمبر ۱۹۹۱ء

۱۹۶۵ء : فیض نمبر

۱۹۶۵ء : جنگ اور ادب نمبر

۱۹۶۶ء : غالب نمبر

۱۹۶۶ء : نئی تخلیق نمبر

۱۹۶۸ء : سالنامہ

۲۲ر فروری ۱۹۶۸ء کو جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی صدارت میں افکار کی تیسویں سالگرہ منائی گئی

یادِ جوش ۱۹۸۲ء

یادِ فیض ۱۹۸۵ء

نذر اختر حسین رائے پوری ۱۹۹۲ء

۱۹۶۸ء : ڈراما نمبر

۱۹۶۸ء : انقلاب نمبر

۱۹۶۹ء : غالب نمبر

۱۹۶۹ء : اقبال نمبر

۱۹۷۰ء : جوبلی نمبر (۱۹۴۵-۷۰ء)

۱۹۷۵ء : ندیم نمبر

۱۹۷۵ء : امیر خسرو ایڈیشن

۱۹۷۷ء : کرشن چندر ایڈیشن

۱۹۷۷ء نذر اقبال

۱۹۷۸ء : [illegible] ایڈیشن

۱۹۸۱ء : برطانیہ میں اردو ایڈیشن



افکار فاؤنڈیشن کراچی

"ایک فلاحی ٹرسٹ"

اردو رسائل کی تاریخ میں پہلی بار اپنی نوعیت کے پہلے افکار فاؤنڈیشن نے بطور فلاحی ٹرسٹ یکم جنوری ۱۹۸۵ء سے اس کے بانی چیئرمین صہبا لکھنوی اور سرپرست اعلیٰ جناب حکیم محمد سعید اور ملک کے اٹھارہ ممتاز دانشوروں، اہلِ قلم حضرات اور صاحبانِ علم کی سرپرستی میں اپنے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔

افکار فاؤنڈیشن کے کئی مقاصد اور منصوبوں میں علمی، ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کا فروغ، تحقیق اور نادر دستاویزات کی تلاش و ترتیب اور اشاعت، مستحق اہلِ قلم، مریض، معذور اور ضعیف فنکاروں کے لیے بہبود فنڈ کا قیام، نوجوانانِ قوم، خواتین اور نئی نسل کے تعمیری منصوبوں میں اشتراک و تعاون شامل ہے۔ اس فاؤنڈیشن کی تمام تر کامیابی رفیقانِ افکار، محبانِ اردو اور علم و فن کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی رکھنے والوں کے پُرخلوص تعاون پر منحصر ہے۔ یہ بات زور دے کر کہنے کی نہیں کہ کوئی ادارہ مالی استحکام کے بغیر اپنے تعمیری منصوبوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ لہٰذا افکار فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے جو تجاویز منظور کی ہیں ان کی تفصیلات "تعارف نامہ" میں شائع کر دی گئی ہیں جو آپ ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

ان تجاویز کی رو سے "افکار فاؤنڈیشن" کے سرپرستوں کے لیے کم سے کم دس ہزار روپے، معاونینِ خصوصی کے لیے پانچ ہزار روپے مقرر کیے گئے ہیں جو دو قسطوں میں بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ رفیقانِ افکار جو عطیہ بھی سہولت سے ادا فرما دیں گے قبول کر لیا جائے گا۔ ذیل کا فارم پُر کر کے بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

میں افکار کی خدمات کا معترف ہوں اور مجھے افکار فاؤنڈیشن کے مقاصد سے اتفاق ہے اس لیے بطور تعاون مبلغ .... روپے بذریعہ کراس چیک / بنک ڈرافٹ ارسال ہیں۔
مجھے افکار کے سرپرستوں / معاونینِ خصوصی / رفیقانِ افکار میں شامل فرمائیے۔

نام ....

مکمل پتا ....

....

تاریخ ....

دستخط ....

فون: گھر .... فون: دفتر ....

نذرانے

کیفی اعظمی

تجھ سے

رہے، جو رہتا ہے بے زار باغباں تجھ سے / بہار تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے
سکوتِ غم کو ملی جراتِ بیاں تجھ سے / کلام تجھ سے، سخن تجھ سے، داستاں تجھ سے
ہر ایک صفحۂ قرطاس گلستاں تجھ سے / ہر ایک بلبلِ تصویر نغمہ خواں تجھ سے
نجوم تجھ سے، مہ و مہر و کہکشاں تجھ سے / ہوئی زمینِ سخن رشکِ آسماں تجھ سے
بہت سبک تھی ترازوئے شعر تجھ سے قبل / خوشا کہ آج ہے پلہ بہت گراں تجھ سے
فضائے تیرہ میں جگنو ترے ترانوں کے / ہر ایک قطرۂ شبنم شرر فشاں تجھ سے
فضا میں تونے بکھیرے ہیں انقلاب کے گیت / دیارِ گاندھی و لینن کی داستاں تجھ سے
ترا قلم کبھی برسا نہ دشت و صحرا میں / ہری بھری رہیں دہقاں کی کھیتیاں تجھ سے
رموزِ حکمت اقبال تونے سمجھائے / ہوا ہے عشق کا سرِّ نہاں عیاں تجھ سے
تجھے چمن میں کہیں آشیاں ملے نہ ملے / چلی روایتِ تعمیرِ آشیاں تجھ سے
غلامِ ہند ہو وہ یا سوتنتر بھارت ہو / خفا خفا رہے دونوں کے حکمراں تجھ سے
قریب اتنا ہوں تجھ سے کہ کہنا مشکل ہے / میں زندگی میں ملا ہوں کہاں کہاں تجھ سے
وہ آج ڈھونڈتے پھرتے ہیں تیرے نقشِ قدم / گزر رہے تھے جو کل تک کشاں کشاں تجھ سے

بس اس دعا پہ غزل یہ تمام ہوتی ہے
یونہی سجی رہے یہ بزمِ دوستاں تجھ سے

اختر سعید خاں

سردار جعفری

نازم بہ متاعِ غم، غمخوار نمی جویم
خود گرمیِ بازارم، بازار نمی جویم

از مرحمتِ رنداں، ایں فرقہ ترا اولیٰ
از مکرمتِ شاہاں، دستار نمی جویم

پروردۂ خاشاکم، در کوہ و دمن شادم
من لالۂ صحرائم، گلزار نمی جویم

از سایۂ شاخِ گل، منکر نتواں گشتن
کیوں ہمرہِ خورشیدم، دیوار نمی جویم

آں قطرہ کہ از چشمم، بر خاک فرو ریزد
ہرچند گہر باشد، زنہار نمی جویم

○

شبنم رومانی

سردار

بالوں پہ چھٹکی چاندنی
کہتی ہے مجھ کو چوم لو
گالوں پہ جلتی دوپہر
بیتے زمانوں کی خبر
نامِ دلِ مرحوم لو

پھولوں کی صورت ایڑیاں
سورج، سلاخوں کے اُدھر
پیروں میں بجتی بیڑیاں

شامیں، سہانی، سُرمئی
آنکھوں کی جھیلیں نیل گوں
جن میں نہاتی، کھیلتی
لمحوں کی جل پریاں کئی
اک گنگناتا لکھنؤ
اک جگمگاتی بمبئی

"آورشش میلہ" دور تک
لاکھوں پرستاروں میں بھی
شاعر اکیلا۔ دور تک

○

قمر ہاشمی

سردار جعفری

"ایشیا جاگ اُٹھا" نظم تھی بیداری کی
"نئی دنیا کو سلام" عہدِ جگرداری کی
دونوں شہکارِ ادب دونوں حقائق افروز
جن میں سردار کی جھلک حاملِ فکرِ امروز
انقلاب آفریں تحریک کی بڑھتی ہوئی رو
علی سردار کے آہنگ میں محسوس کرو
یہ تھی تاثیرِ بیاں شعر و ادب رقص میں تھے
جب حدی خواں ہوئے سردار تو سب رقص میں تھے
حافظے کا تھا یہ انداز کہ نظمیں از بر
انقلاب آشنا ایسے بہ نہایت خودسر
بہرِ تقریر جو آئے ہیں تو منبر جھوما
ان کی تقریر نے خود بڑھ کے لبوں کو چوما
بارہا دار و رسن محبسِ جاں تک پہنچے
زندگی نے مگر آ کے لگایا ہے گلے
دردمندی ہے خمیر اور تپاک ان کا مزاج
سخت کوشی سے ملا ہے انھیں بھرپور خراج
شاعری لفظوں کی خوشبو میں بسی ہے ان کی
دامنِ ذوق تک آئی دل و جاں تک مہکی
سچ تو یہ ہے کہ قمر علم و عمل ہیں یکجا
امتزاج ان کے یہاں نظریہ و فن کا ملا

نظم پڑھتی گئی انسان کے پھیلے سائے
عظمتِ آدمِ خاکی کے قصیدے لائے
کائنات اپنے تب و تاب کے ساتھ آتی گئی
کرۂ ارض پہ انسان کو پھیلاتی گئی
آدمیت نے محبت کا سبق دہرایا
کھیت لہرانے لگے امن کا ماحول آیا
میں نے سب نظمیں پڑھیں ان سے بہت کچھ سیکھا
اس لیے ہے مری نظموں کا تاثر تیکھا
نئی دنیا کے تمدن کی جھلک ملتی ہے
مشترک درد کی ہر دل میں کسک ملتی ہے
یہ کسک عالمی سچائی ہے انساں کی سرشت
اسی جذبے سے بنے گی نئے آدم کی بہشت
آدمی جنتِ ارضی کا تمنائی ہے
کیوں کہ اس نرک[1] میں جینا بڑی رسوائی ہے

۱؎ جہنم

حزیں لدھیانوی

علی سردار جعفری

سچ کی تلوار ہے، علی سردار	حسنِ کردار ہے، علی سردار
نفرتوں کے مہیب طوفاں ہیں	پیار ہی پیار ہے، علی سردار
شہر کا شہر سو رہا ہے مگر	پھر بھی بیدار ہے، علی سردار
بوئے گل ہے چمن چمن کے لیے	رنگِ گلزار ہے علی سردار
زر پرستوں، ہوس پرستوں کے	ذہن پر دار ہے علی سردار
ظالمو! ظلم ہے خس و خاشاک	اور اک نار ہے علی سردار
فقر کی سلطنت ہے اس کے پاس	نقشِ پندار ہے علی سردار
نکلا تھا کشتیٔ خرد لے کر	بحر کے پار ہے علی سردار
اس کو مفتوح کون کہتا ہے	فاتحِ دار ہے علی سردار
قصرِ زر کانپ کانپ اٹھتے ہیں	وقت کی دھار ہے علی سردار
اس کا ہر لفظ ہے خرد افروز	ایسا فن کار ہے علی سردار

چُپ کی گمبھیر تیرگی میں حزیں
شمعِ گفتار ہے علی سردار

○

مجیب خیرآبادی

ایک نام ایک دور

وہ قافلہ جو رواں تھا شکستہ راہوں پر
اُسے یہ شخص سرِ منزلِ سحر لایا

جگر کا خون دیا ہے زبان و لفظوں کو
بنامِ اہلِ جنوں مژدۂ سحر لایا

عروسِ شعر و سخن کو جمالِ فن بخشا
ادب کی مانگ میں افشاں چُنی، گہر لایا

گروہِ کم نظراں کو شعورِ فکر دیا
قلندرانہ نظر، جوہرِ ہنر لایا

امیرِ شہر کے در پر جبیں جھکی نہ کبھی
کلاہ کج ہی رہی، وہ دل و جگر لایا

یہ شخص نام ہے سردار جعفری جس کا
شبِ ستم میں نئی صبح کی خبر لایا

جنونِ دل کا قرینہ ہی اور ہے لوگو
یہ ایک نام نہیں، ایک دور ہے لوگو

صابر دت

نذرِ سردار جعفری

راستہ کوئی نہ تھا راہِ غمِ دل کے سوا
کوئی محفل نہیں دیکھی تری محفل کے سوا

دستِ قاتل ہے لہو رنگ یہی کیا کم ہے
دل بہلتا بھی کہاں کوچۂ قاتل کے سوا

حرفِ حق روزِ ازل سے ہے شکارِ دنیا
کون مجرم ہے یہاں ایک مرے دل کے سوا

قیس خود اپنے ہی سائے کے تعاقب میں رہا
ورنہ لیلیٰ تھی کہاں پردۂ محمل کے سوا

صرف تاریخ میں دو نام یزید اور حسین
زندگی اور تو کیا ہے حق و باطل کے سوا

○

منظور احمد اعجاز

علی سردار جعفری

الفاظ کے ساحر ہو، محبت کی زباں ہو
اس دور میں تخیل کی رفعت کے نشاں ہو
مال و زرِ دنیا کے طلبگار نہیں ہو
بازار میں بک جائے وہ فنکار نہیں ہو

شاعر بھی، مفکّر بھی ہو، تم عظمتِ فن ہو
بیباک ہو تم، آبروئے شعر و سخن ہو
تم دورِ غلامی سے بغاوت کے امیں ہو
تہذیب و تمدّن کے ثقافت کے امیں ہو

اخلاص کی تصویر، فقیرانہ صدا ہو
بے مہری حالات میں مانندِ صبا ہو
تقلید سے آزاد ترا نقدِ ہنر ہے
پیمانۂ اشعار میں صہبائے اثر ہے

O

افکار کا ایک منفرد ادبی سلسلہ

خودنوشت

برِ صغیر پاک و ہند میں افکار پہلا ادبی جریدہ ہے جس نے حسب ذیل مشاہیر کی خودنوشت سوانح عمریاں ۔ گزشتہ پچیس سال کے دوران شائع کر کے نہ صرف مقبولیت حاصل کی بلکہ نصف صدی کی تاریخی، تہذیبی، علمی و ادبی سرگرمیوں کا مستند مواد بھی مہیا کیا۔ ان مشاہیر میں • سیّد بادشاہ حسین • ڈاکٹر سیّد عبداللہ • ڈاکٹر عبادت بریلوی • پروفیسر مجنوں گورکھپوری • ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری • قدوس صہبائی • محمد احمد سبزواری • انور عنایت اللہ • یونس احمر • خلیق ابراہیم خلیق • ادا جعفری اور • شان الحق حقی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

افسوس کہ علالت کے سبب ادا جعفری اور مصروفیت کے باعث شان الحق حقی کی خودنوشت مکمل نہ ہو سکی۔ لیکن افکار دوستوں کو اس اطلاع سے خوشی ہوگی کہ شان الحق حقی نے ہماری درخواست پر خودنوشت کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا ہے اور ان کی پہلی قسط بہ عنوان :۔

تذکرہ تعلیم کا ــــــ کچھ ہنسنے اور رونے کی باتیں

افکار کے آئندہ شمارہ جنوری ۱۹۹۲ء میں ملاحظہ کیجیے۔ یہ سلسلہ انشاءاللہ جاری رہے گا۔

اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرا لیجیے

مدیر و ناشر: صہبا لکھنوی • طابع مشہور آفسٹ پریس۔ کراچی • دفتر: ۱۰۵/سی نیشنل آٹو پلازہ۔ مارسٹن روڈ۔ کراچی